معالم القرآن

جلد دہم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم وکتاب واٹس ایپ گروپ

انتساب

میں معالم القرآن کی جلد دہم کو جس میں اسلام کی اجتماعی زندگی کا بھرپور چہرہ پیش کرنے کے بعد دنیا میں اسے قائم کرنے، اس کے لیے محنت کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ بلکتی انسانیت کے فکری، اخلاقی، مالیاتی معاشی، سیاسی اور روحانی بیماریوں کا یہی واحد علاج ہے۔ اور اسلام کے ماننے والوں کے ایمان باللہ کا یہی حقیقی امتحان ہے۔ قابلِ صد احترام فضیلت مآب الحاج عبدالغنی صاحب زادت معالیہم اور ان کے صاحبزادگان جناب محمد اسماعیل صاحب اور جناب محمد عثمان صاحب مالکان "تاجر" گوجرانوالہ کے نام سے منسوب کرتا ہوں جن کی اسلام سے مخلصانہ ہمدردی اور اس کے لیے قربانی دریا دلی سے یہ جلد دہم زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر ہدیہ ناظرین ہو رہی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ سبحانہ اس جذبہ خیر کو تادیر سلامت رکھے اور ان کے اس مخلصانہ جذبہ سخاوت کو ان کی اولاد کے لیے برکتوں کا اور ان کے مرحوم والدین کے لیے رحمتوں کا ذریعہ بنائے اور اسے دنیا و آخرت میں ان کی کامیابی کا بہانہ کر دے۔ آمین

قاری عبدالرحمٰن ایم اے
ناظم ادارہ تعلیماتِ قرآن
دارالعلوم شہابیہ سیالکوٹ

ملکیت ——— ادارہ تعلیمات قرآن دارالعلوم الشہابیہ

عناوین ——— ۳۲۶

آیات ——— ۴۵ + ۹۲ = ۱۳۷

طابع ——— حافظ شبیر احمد عثمانی

تزئین و آرائش ——— السید انور حسین نفیس رقم

کتابت ——— محمد نواز عابد کیلانی حضرت کیلیانوالہ

ناشر ——— قاری عبدالرحمٰن ایم اے

صفحات ——— ۶۹۶

تاریخ اشاعت ——— جنوری ۱۹۸۸ء

مطبع ——— تجارت پرنٹرز ۱۴۱۔ ایبٹ روڈ لاہور

قیمت ——— ایک صد روپیہ

ملنے کا پتہ

ادارہ تعلیماتِ قرآن۔ دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

قرآنی اصطلاحات

ائمۃ الکفر ۔ امام کی جمع ہے ۔ امام فعال کے وزن پر امر یوم سے بنا ہے اس کے معنے ہیں جس کی اقتدا
کی جائے ۔ حدیث میں ہے انما جعل الامام لیوتم بہ امام ہوتا ہی اس لیے ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے
اَمَر کے معنے ارادہ کرنے کے آتے ہیں اس لیے من یوتم بہ جس کی اقتدا کا قصد کیا جائے امام کہلاتا ہے
کبھی نیکی اور اچھائی میں اقتدا کی جاتی ہے اور کبھی برائی میں ۔ دونوں قسم کے رہنماؤں کو امام کہتے ہیں ۔ یہاں کفر لا کر
بتایا ہے یہ کفر کے رہنما ہیں ۔ ائمہ کفر یہاں قریش کے زعما اور قائدین کے لیے آیا ہے ۔ دین کے معاملہ میں سا
عرب قریش کے تابع تھا ۔ پیشوائی اور سرداری کا مقام انہی کو حاصل تھا ۔ قریش کے لیے اس لقب کو اختیار کر کے
ان کے خلاف جہاد کی ترغیب ہے ۔ کہ سارے کفر کے سرغنہ و امام یہ ہیں ۔ اسلام کے خلاف طعن و طنز اور استہزا کے
جتنے تیر و نشتر اور جتنے ہتھیار ایجاد ہوتے تھے سب انہی کے کارخانے میں بنتے تھے ۔

اِتمام : اس کے معنے پورا کرنے کے ہیں ۔ پورا کرنا دو طرح کا ہوتا ہے ایک کمیت کے اعتبار سے ا
دوسرا کیفیت کے لحاظ سے ۔ کمیت کے اعتبار سے اگر اجزا پورے ہوں تو تمام کہلاتا ہے اور کیفیت کے لحاظ سے
اوصاف پورے ہوں تو کمال کہلاتا ہے ۔ ہر کامل تمام ہوتا ہے لیکن ہر تمام کے لیے کامل ہونا ضروری نہیں ۔

اَثخان : ثخن سے ہے ۔ اس کے معنے دشمن کو خوب اچھی طرح قتل کرنے کے ہیں ۔ یہ لفظ پارہ ۲۶ س
۴۷ میں آرہا ہے ۔ اور میدان جنگ ہی کے موضوع پر ہے حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد
اما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا ذالک ۔ جس میں بتایا ہے کہ حق و باطل کا مقابلہ تو رہتا ہی ہے ۔ جس وقت
مسلمانوں اور کافروں میں جنگ ہو جائے تو مسلمانوں کو پوری مضبوطی اور بہادری سے کام لینا چاہیے ۔ باطل کا زور جب
ہی ٹوٹے گا کہ بڑے بڑے شریر مارے جائیں ۔ اور ان کے جتھے ٹوٹ جائیں اس سے ہنگامہ کارزار میں کسل و
بزدلی اور توقف و تردد کو راہ نہ دو ۔ اور دشمنان خدا کی گردنیں مارنے میں کچھ باک نہ کرو ۔ خوب خوں ریزی کے بعد
تمہاری دھاک بیٹھ جائے اور ان کی قوت پاش پاش ہو جائے ۔ اس وقت قید کرنا بھی کفایت کرتا ہے ۔

اذان: یہ اذن یا اذن کا مصدر ہے لغت میں اس کے معنے اعلان اور منادی کے ہیں۔ اسی سے نماز کے اعلان کو بھی اذان کہتے ہیں۔ یہ اعلان چونکہ پکار کر اور بآواز بلند ہوتا ہے اس لیے اسے ندا بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں اس منادی کے معنے میں ہے کہ حج کے موقعہ پر اعلان کر دیا جائے کہ اللہ اور اس کا رسول معاہدوں سے بری الذمہ ہیں۔ معاہدوں کے خا... کے اعلان کو یہاں اذان کہا ہے۔

استطاعۃ: مادہ طوع ہے۔ قرآن میں تطوع بھی اسی مادہ سے آیا ہے طوع کے معنے خوشی سے اور رغبت کے ہیں اسی سے کرھاً ناخوشی کے مقابلہ میں طوعاً خوشی سے آتا ہے استطاعۃ کے معنی ہیں ان چیزوں کا تمام و کمال پایا جانا جن کی وجہ سے کام ہو سکے۔ علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے بصائر میں محققین کی طرف نسبت کر کے یہی معنے بتائے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ وہ چار چیزیں ہیں جن کے بتمام و کمال ہونے پر استطاعت ہونا موقوف ہے۔ فاعل کے لیے خاص ساخت، کام کی صورت قابلی۔ کام کی صورت مادی اور ذریعہ۔ ان میں سے اگر ایک بھی موجود نہ ہو تو استطاعت نہیں۔

اشہر الحرم: اشہر شہر کی جمع قلت ہے۔ جمع کثرت شہور آتی ہے۔ قرآن میں دونوں جمع آتی ہیں۔ ان... یعنی چار حرمت والے مہینے۔ یہ حرمت والے مہینے چار ہیں منھا اربعۃ حرم۔ حضور اقدس ﷺ کے ا... سے معلوم ہوا ہے کہ یہ چار حرمت والے مہینے محرم، رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اس پر ا... اتفاق ہے کہ:

حرمت والے مہینے یہ چار ہیں لیکن ان کی ترتیب میں اختلاف ہے۔ اہل کوفہ ان کی ترتیب اس طرح بتاتے ہیں۔ محرم ذوالقعدہ اور ذوالحجہ۔ اس ترتیب میں چاروں مہینے ایک سال میں آتے ہیں۔ اور اہل مدینہ ترتیب یوں بتاتے ہیں ذ... ذوالحجہ محرم اور رجب۔ یہ ترتیب ارشاد نبوت سے ہم آہنگ ہے۔ الجصاص لکھتے ہیں وھی التی بینھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم بانھا ذوالقعدہ وذوالحجہ والمحرم ورجب الجصاص ہی نے لکھا ہے کہ دو وجہ سے ا... کو حرمت والا قرار دیا ہے ایک یہ کہ ان میں قتال حرام ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مہینوں میں گناہوں کی سزائیں دوسرے... کے مقابلے میں زیادہ سنگینی آ جاتی ہے جیسے ان مہینوں میں کی گئی طاعت دوسرے مہینوں کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہو جاتی...

الّ: اس لفظ کے اصلی معنے قرابت، عہد اور حلف کے آتے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ عہد حلف اور قرابت... نمایاں حالت کا نام الّ ہے۔ جب کوئی چیز اس طرح چمکنے لگے کہ اس کا انکار نا ممکن ہو تو اس کے لیے تئل بو... امام رازی نے اپنی تفسیر میں اس کے چھ معنی لکھے ہیں۔ مثلاً

۱۔ عہد کے معنے میں شاعر کہتا ہے۔

وجدناھم کاذبا الھم وذو الال والعھد لا یکذب

اس شعر میں ال سے مراد عہد ہے۔ ہم نے ان کے عہد کو جھوٹا پایا حالانکہ عہد و پیمان کرنے والا جھوٹا نہیں ہوتا۔

۲۔ الٌ کے معنے قرابت کے ہیں حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

لعمرك ان الّك من قريش ... كال السقب من رأل النعام

تیری قسم تیری رشتہ داری قریش سے ایسی ہے جیسی کہ اونٹنی کے بچہ کی رشتہ داری شتر مرغ سے ہوتی ہے۔

۳۔ ال حلف کو کہتے ہیں۔

لولا بنو مالك والال مرقبة ... ومالك فيهم الآلاء والشرف

اگر بنو مالک ہوتے اور قسم کہ جس کی پابندی کی گئی ہے اور بنو مالک ہی میں بخششیں اور شرافت ہے۔

۴۔ ال اللہ سبحانہ کا نام ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسیلمہ کذاب کی یاوہ گوئی کو سن کر فرمایا تھا ان هذا الكلام لم يخرج من ال یہ بات اللہ سبحانہ کی نہیں ہو سکتی ہے۔ لیکن زجاج کو اس پر اعتراض ہے۔

۵۔ زجاج کہتے ہیں کہ میری رائے میں ال کی حقیقت لغت کی زبان میں کسی چیز کا تیز کرنا ہے۔ اسی سے پہاڑ کو الّہ کہتے ہیں تیزی اور استحکام کی رعایت سے عہد و قرابت کے معنے آتے ہیں۔

۶۔ امام زہری کی رائے ہے کہ یہ عبرانی ایل کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اسی ایل کی تعریب الّ ہے۔

۷۔ کچھ کے خیال میں یہ الّ یئول سے بنا ہے جو صفائی اور چمک کے لیے بولتے ہیں۔

اگرچہ تعداد میں سات ہیں مگر فی الواقع وہ ہی تین ہیں جن کی طرف ہم نے شروع میں اشارہ کیا ہے ال نام خدا کو محققین نے قبول [یا] امام ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ چونکہ لفظ ال ان تمام معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے اچھا یہی ہے کہ اسے [تم]ام معانی میں استعمال کیا جائے لا یرقبون فی مومن الا ولا ذمة کا ترجمہ یوں کرنا چاہیے کہ یہ مشرکین کسی مومن [کا] بھی نہ اللہ کا پاس کرتے ہیں نہ رشتہ داری کا نہ کسی عہد کا خیال کرتے ہیں اور نہ قسم کا۔

براءة - یہ برئ یبرأ کا اسم مصدر ہے۔ مصدر براء آتا ہے۔ اصل میں اس کے معنے ہر اس چیز سے جس کا پاس [لگ]تا ہو چھٹکارا ڈھونڈھنے کے ہیں۔ اسی سے صفت کا صیغہ بریئ آتا ہے اس کی جمع براء آتی ہے جیسے عقیل کی [عق]لاء — یہاں یہ ان معاہدات کی ذمہ داری سے دستکش ہونے کے معنے میں ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے [ہجر]ت فرمانے کے بعد مشرکین عرب کے مختلف قبائل سے موقت اور غیر موقت نوعیت کے لیے تھے۔

الجزیة: علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے البصائر میں جزا کے چھ معانی میں ایک معنی اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہریوں [کے ٹیکس] کے لکھے ہیں اور وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ یہ ٹیکس غیر مسلم شہریوں کی حفاظت کا بدلہ ہے اس لیے اسے جزیہ کہتے [ہیں۔ اس] کا مطلب یہ ہے کہ لفظ جزیہ عربی زبان میں جزي يجزي سے بنا ہے لیکن حال میں جو مولانا شبلی نے اس موضوع

پر دادِ تحقیق دی ہے وہ یہ ہے کہ لفظ عربی میں ایران سے آیا ہے فارسی لفظ گزیت کی تعریب ہے۔ عربی میں لفظ دو معنے میں آتا ہے خراج کے معنے میں جو اراضی سے وصول کیا جاتا ہے اور ٹیکس کے معنے میں جو اشخاص سے وصول کیا جاتا ہے جب جزیہ ٹیکس کے معنی میں ہو تو یہ دو قسم کا ہوتا ہے صلحی اور قہری۔ صلحی جزیہ ان لوگوں سے لیا جاتا ہے۔ جنھوں نے بغیر کسی جنگ کے بطور خود اپنی مرضی سے اسلامی مملکت کا شہری بن کر رہنا اختیار کیا ان کو فقہا کی زبان میں معاہد بھی کہا جاتا ہے اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے ان لوگوں کے ساتھ اسلامی مملکت اس عہدنامے کے مطابق معاملہ کرے گی جو ان کے اور حکومت کے مابین طے پاچکا ہے۔ ان لوگوں سے اسلامی حکومت جو معاہدہ کرے گی اسے توڑنے کی اسلام میں سخت ممانعت ہے۔ قہری یہ ہے کہ جنھوں نے حکومتِ اسلامی سے جنگ کی ہو اور جنگ میں مغلوب ہو کر طاعت پر مجبور ہوئے ان سے لیا جائے۔ اس کی مقدار افراد کی صلاحیت کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ نابالغ، بچوں، عورتوں، غلاموں معذوروں اور نکموں سے نہیں لیا جاتا ہے۔

الحج الاکبر: علماء کا اس موضوع پر اختلاف ہے کہ حج اکبر سے کیا مراد ہے۔ ملا علی قاری نے اس موضوع پر الحظ الاوفر فی الحج الاکبر کے نام سے رسالہ بھی لکھا ہے۔ اور حافظ ابن حزم ظاہری نے بھی اس پر دادِ تحقیق دی ہے امام مجاہد کہتے ہیں کہ حج قران حج اکبر ہے اور حج افراد حج اصغر ہے۔ محققین محدثین و فقہاء کی اکثریت نے اسی کو شرف پذیرائی رہا ہے۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما عرفہ کے دن کو حج اکبر بتاتے ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ یوم النحر الحج الاکبر ہے شاید یوم نحر کو حج اکبر سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ اعمال حج اس روز ہوتے ہیں۔ اصل میں اکبر اور اصغر اضافی ہیں۔ بلاشبہ جمعہ کا حج دوسرے دنوں کے حج سے اکبر ہے۔ حج قران حج افراد سے بھی اکبر ہے اور مطلق حج عمرہ سے اکبر ہے ان میں کوئی تعارض نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب معاہدہ حدیبیہ ۶ھ میں عمرہ ادا کیے بغیر لوٹ گئے تھے ذی قعدہ ۷ھ میں دوبارہ مکہ تشریف لے گئے اس مرتبہ آپ کے ساتھ دو ہزار صحابہ تھے۔ اونٹوں کے علاوہ گھوڑے بھی ساتھ تھے۔ اور ہدی کے لیے ۶۰ اونٹ ساتھ لیے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کیا اور مکہ میں تین دن قیام کیا۔ ۲۰ رمضان ۸ھ کو جمعہ کے روز مکہ فتح کیا۔ ذی قعدہ ۸ھ میں آپ نے جعرانہ سے واپسی پر عمرہ کیا۔ اور آپ عتاب بن اسید کو مکہ میں اپنا جانشین بنا کر مدینہ واپس تشریف لے گئے۔ ۹ھ میں آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج کی حیثیت سے روانہ کیا۔ اسی حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشرکین سے کیے گئے معاہدات کے خاتمہ کے لیے سورہ براءت کی ابتدائی آیات دے کر روانہ کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اسی حج کو عمرۃ القضاء ۷ھ اور عمرہ جعرانہ ۸ھ کے مقابلہ میں یوم الحج الاکبر فرمایا ہے۔ اس کی تائید طبرانی کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو سمرہ ابن جندب کے حوالہ سے ملا علی قاری نے الحظ الاوفر میں نقل کی ہے کہ حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یوم الحج الاکبر یوم حج ابو بکر بالناس حج اکبر کا دن وہ ہے جس روز ابوبکر نے لوگوں کو حج کرایا ہے۔ جمعہ کے دن وقوف عرفہ کو عام لوگ جو حج اکبر کہتے ہیں تو شائد اس کی وجہ یہ ہے جو مشہور

حدث امام زیلعی نے شرح کنز الدقائق میں پیش کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے بہترین دن وہ عرفہ ہے جو جمعہ کے روز ہے یہ دوسرے دنوں کے ستر حجوں سے زیادہ افضل ہے اخرجہ رزین بن معاویہ فی تجرید الصحاح من حدیث طلحہ بن عبید اللہ

سقایۃ الحاج: سقایۃ کے معنے پانی پلانا۔ پلانے کی جگہ، پینے کا برتن۔ سقایہ کے بارے میں شارحین اور اہلِ لغت کے خیالات میں بے حد انتشار ہے۔ کچھ اسے سقی یسقی کا مصدر بتاتے ہیں اور کچھ استقیٰ کا مصدر کہتے ہیں۔ کوئی اسم مصدر بتاتا ہے اور کوئی مصدر کو اسم فاعل کے معنے میں کہتا ہے۔ اور کوئی حاجیوں کو پانی پلانے کی جگہ کو سقایہ بتاتا ہے۔ علامہ سید رشید رضا نے اپنی تفسیر المنار میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ لیجئے آپ بھی مستفید ہو جائیے۔

سقایہ لغت میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی وغیرہ پلایا جاتا ہے۔ اسی معنے میں ہے جعل السقایۃ فی رحل اخیہ۔ رکھ دیا پینے کا پیالہ اپنے بھائی کے سامان میں۔ پیالہ رکھنے والے حضرت یوسفؑ ہیں اور سامان ان کے بھائی بن یمین کا ہے۔ بھائی کو عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ دل نہیں مانتا تھا کہ بھائی جدا ہو لیکن روک بھی نہیں سکتے تھے۔ اس خیال سے کہ بھائی کے پاس اپنی نشانی رہے۔ اس کے سامان میں چاندی کا کٹورا رکھ دیا۔ اور بھائیوں پر یہ بات ظاہر نہ کی۔ جب قافلہ روانہ ہو چکا تو محل کے کارندوں کو چاندی کا پیالہ نظر نہ آیا۔ بہت تلاش کیا نہ ملا۔ جب نہ ملا تو قافلہ والوں کا پیچھا کیا۔ ان کے سوا سرائے میں کوئی نہ ٹھہرا تھا۔ تلاشی کیا گیا تو بن یمین کے سامان سے نکل آیا۔ یہ غیب سے بن یمین کے ٹھہرنے کا سامان ہوا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے وہم میں بھی یہ بات نہ تھی۔ نہ کارندوں کو کوئی علم تھا کذالك كدنا ليوسف۔ اسے سقایہ اس لیے کہا گیا کہ اس سے پانی پلایا جاتا تھا اور صواع الملک اس لیے کہا گیا کہ صاع کی طرح اس سے ناپا جاتا تھا ـــــ اور سقایہ وہ جگہ ہے جہاں حج کے موقعہ پر لوگوں کو شربت پلایا جاتا تھا حدیث میں ہے ماثر الجاهلية تحت قدمی الاسقاية الحاج وسدانة البيت۔ جاہلیت کے سارے کارنامے میرے قدموں تلے ہیں سوائے حاجیوں کو پانی پلانے اور بیت اللہ کی پاسبانی کے ـــــ اور علامہ نووی الاسماء والصفات میں لکھتے ہیں سقایت العباس مسجد حرام میں ایک مقام ہے جس میں حاجیوں کے لیے پانی کا انتظام ہوتا ہے۔ اس کے اور زمزم کے درمیان چالیس ہاتھ کا فاصلہ ہے۔ ازرقی نے تاریخ مکہ میں بتایا ہے کہ سقایہ چمڑے کے حوض تھے جو قصی بن کلاب کے زمانے میں حرم کے صحن میں رکھے جاتے تھے اور ان میں اونٹوں کے ذریعے پانی بھرا جاتا۔ پھر قصی نے مرتے وقت سقایہ کا منصب عبد مناف کو دے دیا لفظ کی ساخت بتاتی ہے کہ اس میں پیشہ وری آگئی تھی۔ اسی طرح حجابہ جو بیت اللہ کی پاسبانی تھی۔ یہ دونوں پیشے قریش کے کارنامے تھے۔ اسلام نے دونوں کو برقرار رکھا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ کہنا انا صاحب السقایہ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اس کے متولی نگران اور ناظم تھے۔

صدقات: یہ صدقہ کی جمع ہے۔ راغب نے مفردات القرآن۔ فیروزآبادی نے بصائر ذوی التمیز فی لطائف کتاب العزیز میں لکھا ہے کہ صدقہ وہ ہے جو اپنے مال میں سے جسے آدمی بطور عبادت نکالتا ہے جیسے زکوٰۃ لیکن صدقہ اصل میں نفلی خیرات کے لیے بولا جاتا ہے اور زکوٰۃ واجب کے لیے۔ لیکن قرآن میں زکوٰۃ کو صدقہ کہا ہے۔ یا تو اس لیے کہ مال کی قربانی ایمان کی صداقت کی نشانی ہے اور یا اس لیے کہ صدقہ کرنے والا اپنے کردار کے صدق کا ارادہ کرتا ہے۔ صدق کے معنے اصل میں سچ کہنے اور سچ کر دکھانے کے ہیں۔ اسلامی نظام سے وفاداری کی صداقت زکوٰۃ سے ہوتی ہے اس لیے اسے صدقہ کہا۔ نکاح کی واقعاتی صداقت مہر سے ہوتی ہے اس لیے اسے صَدُقہ کہا گیا۔

صغار: عربی میں صغر یصغر کے معنے کمتر ہونے کے آتے ہیں۔ فقر کی حالت ہو یا محکومی و غلامی کی حالت دونوں کمتر ہیں۔ فیروزآبادی بصائر ذوی التمیز میں صاغرون پر لکھتے ہیں الراضی بالمنزلۃ الدنیئۃ صاغر ہر وہ شخص ہے جو کمتر رُتبہ پر راضی ہو جائے مطلب یہ ہے کہ جو اسلام کی محکومی اور غلامی پر خوش ہو بلکہ اسلامی مملکت کو ٹیکس ادا کریں۔ یعنی اپنی خوشی سے جزیہ دینا منظور کریں۔ امام شافعیؒ نے کتاب الام میں تصریح کی ہے کہ میں نے متعدد اہل علم سے سُنا ہے کہ وھم صاغرون کا مطلب یہ ہے کہ ان پر اسلام کے قوانین جاری ہو جائیں۔ یعنی اسلامی حکومت کے قوانین کے آگے جُھک جائیں۔

نسیئ: فعیل کے وزن پر مصدر ہے نکیر اور نذیر کی طرح۔ اس کے معنے دیر کرنا ہیں۔ بغیر ہمزہ نبی کی طرح نسا ہمزہ کے ساتھ بدا کی طرح اور نسا نذار کی طرح آیا ہے سب کے معنے دیر کرنے کے ہیں۔ فیروزآبادی نے فعیل بمعنے مفعول بتایا ہے۔ یعنی مؤخر کہا گیا جیسے قتیل بمعنی مقتول اور جریح بمعنے مجروح آتا ہے۔

نسیئ کیا ہے؟ خود قرآن نے بتا دیا ہے یحلونہ عاما و یحرمونہ عاما لیواطئوا عدۃ ماحرم اللہ ایک ماہ کو ایک سال حلال کر لیتے ہیں اور پھر اسی کو دوسرے برس حرام کر دیتے ہیں تا کہ اللہ کے حرام کردہ مہینوں کی گنتی کو اپنی گنتی کے مطابق کر لیں۔ عرب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ سے یہ بات چلی آتی تھی کہ سال کے چار مہینے امن کے مہینے ہیں۔ اس میں لڑائی نہیں ہونی چاہیے رجب ذوالقعدہ ذوالحجہ اور محرم اسی لیے انہیں اشہر الحرم کہتے ہیں۔ یعنی حرمت کے مہینے۔ نیز قمری مہینوں کے حساب سے کہ قدرتی حساب ہے حج کا مہینہ بھی متعین تھا۔ اور وہ اسی نام سے پکارا جاتا تھا یعنی ذی الحجہ اسی ماہ کی آٹھویں، نویں، دسویں حج کے اعمال و رسوم کے دن کہلاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ بات اسی طرح قائم رہی۔ چونکہ عرب جاہلیت دینی قیود اور علمی حدود سے ناآشنا تھی۔ اس لیے مطلب برآری کی راہ نکالنے میں انہیں دقت پیش آتی راہ یہ نکالی کہ امن کے مہینوں کا معاملہ ان کے قدرتی حساب پر موقوف نہ رکھا بلکہ اس کے لیے ایک خود ساختہ اعلان ضروری ٹھہرا لیا جو حج کے موقعہ پر کیا جاتا۔ مجدالدین لکھتے ہیں کہ منیٰ سے روانگی ہوتی تو بنی کنانہ کا ایک شخص کھڑے ہو کر اعلان کرتا۔

میرا فیصلہ ناقابل رد ہے۔ لوگ کہتے انسئنا شہرا مہینہ کو مؤخر کیجئے یعنی محرم کی حرمت کو ہم سے ہٹا کر صفر میں کر دیجئے اس اعلان کے ذریعے حسب ضرورت امن کے مہینے ہٹا دیتے تھے یا حج کا مہینہ مؤخر کر دیتے تھے۔ کرتے کرتے جب یہ فرق دو تک پہنچ جاتا اور محرم سال سے ختم ہو جاتا تو پھر لوٹانا شروع کر دیتے تھے۔ عمیر بن قیس اسی معاملہ کو فخریہ پیش کرتا ہے۔

السنا الناسئین علی معد　　شهور الحل نجعلها حراما

کیا ہم ہی نہیں وہ جو معد کے مقابلے میں حلت کے مہینوں کو ہٹا کر ان کو حلال بناتے تھے۔

چونکہ یہ طریقہ سراسر جہل و کوری پر مبنی تھا اور اس کی وجہ سے سارا تقویمی و تاریخی نظم درہم برہم ہو گیا تھا اس لیے ضروری تھا کہ اس ناخدا شناسی اور خدا کی بغاوت پر مبنی رسم کو یک قلم بند کیا جائے۔ اور حج کے لیے ایک معین اور قطعی وقت مقرر کیا جائے۔

نَفر: لغت میں فنفر القوم فی الامر کے معنے تیزی کے ساتھ کسی کام میں لگ جانے اور کرنے کے ہیں۔ اسی سے نفیر ہے وہ لوگ جو کام میں پہل کریں اور وہ بلاوا جو کام کے کرنے کے لیے ہو۔ قانون اسلام میں دفاع کی صورت کو نفیر عام کہتے ہیں۔ جہاد فرض کفایہ ہوتا ہے اگر حملہ و ہجوم کی صورت میں ہو اور فرض عین ہو جاتا ہے اگر دفاعی ہو۔ یہی نفیر عام ہے۔ ابن الہمام لکھتے ہیں اگر نفیر عام ہو کہ مسلمانوں کے شہروں پر دشمن حملہ آور ہو جائے تو جہاد فرض عین ہے۔ جہاد کی دعوت دینے والا سربراہ عادل ہو یا فاسق اور عنایہ میں ہے۔ اگر نفیر عام کی حالت ہو تو پھر جہاد فرض عین ہے۔

نفیر عام کا مطلب کیا ہے؟ یہ مطلب ہے کہ دفاع کی ضرورت پیش آجائے اور ہر شخص کو اس کا علم ہو جائے یا یہ مطلب ہے کہ جب تک کوئی بلانے والا نہ بلائے گا۔ نفیر عام کی حالت نہ پیدا ہو گی۔ اس کا جواب حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث رح نے مؤطا کی شرح میں دیا ہے۔ نزدیک استنفار جہاد فرض علی الاعیان می شود۔ استنفار را چوں منقح کنیم حاصل شود حالتے کہ بمقتضائے آں استنفار شدہ است از قصد کفار بلاد مارا و قیام حرب درمیان جیوش مسلمین و کافرین۔

حرفِ آغاز

باسمہٖ سبحانہٗ

یہ معالم القرآن کی دسویں جلد ہے۔ نویں جلد جنوری ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ آج پورے دو سال چار ماہ کے بعد یہ جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

اس میں بقیہ سورہ انفال اور تین حصے سورہ برارت ہے۔

سورہ انفال کا باقی حصہ اموال غنیمت کی تقسیم۔ اہل ایمان کی فوجوں اور مشرکین کی مڈبھیڑ۔ میدانِ جنگ میں اہل ایمان کو ثبات قدم اور ذکر اللہ کی تلقین۔ اللہ رسول کی اطاعت کا حکم۔ باہمی نزاع سے دور رہنے کا امر، کافروں کے چلن سے بچنے کی برارت، سراقہ کا ابتدا میں مشرکین کے ساتھ جانا اور لڑائی شروع ہوتے ہی بھاگ جانا۔ منافقین کی اہل ایمان پر دین کے نشہ میں مغرور ہونے کی پھبتی کسنا۔ عہد شکن لوگوں کو دوسروں کی عبرت کے لیے سزا دینا۔ اہل ایمان کو جنگ کے لیے تیاری کا حکم، دشمن کی جانب سے صلح کی درخواست کو پذیرائی دینا۔ اہل ایمان میں باہمی الفت انعام الٰہی ہے ایمان و کفر میں عددی مقابلہ کا پیمانہ۔ بدر کے قیدیوں کا حکم۔ معاہدین کی مدد کا قانون۔ میراث میں قرابت و رشتہ داری کو بطور بنیاد بنانا۔

سورہ برارت کا آغاز اور عہد شکن قبائل سے معاہدہ ختم۔ چار ماہ کی مہلت، اسلام سے آشنائی کا ارادہ رکھنے والوں کو قیام کی اجازت اور امن کا پروانہ۔ اعلانِ جنگ کے اسباب و علل۔ اہل ایمان کو اہل عرب سے قطع تعلقات کا حکم۔ حب ایمانی اور غیر ایمانی میں تقابلہ تو حب ایمانی کا مقام۔ حنین کا واقعہ اور عددی طاقت موجبات فتح میں سے نہیں بلکہ اصل چیز ایمانی قوت ہے حرم میں مشرکین کا داخلہ بند۔ اہل کتاب سے اعلانِ جنگ، وفادار غیر مسلم شہریوں سے جزیہ۔ یہود و نصاریٰ کے مشرکانہ ذہن کا مشرکین جاہلیت سے تقابلی مطالعہ۔ اسلام کی دعوت کی بنیاد توحید و رسالت ہے۔ رسالت کا مقصد وحید اللہ کے قانون کو دنیا کے سارے قوانین پر غالب کرنا ہے۔ رسالت کے قانون کی برتری میں دو اپوزیشنیں زمانہ جاہلیت کی اس جاہلانہ رسم کا خاتمہ جس کا حسابی معیار کوئی نہ تھا۔ غزوہ تبوک کے لیے جہاد کی ترغیب۔ واقعہ ہجرت کا تذکرہ۔ منافقین کا غزوہ تبوک

میں کردار تقسیم زکوٰۃ کا قانون۔ نفاق اور ایمان کی تنظیموں کا تقابلی مطالعہ حضور اقدس ﷺ کو منافقین کے لیے استغفار کی ممانعت۔ جہاد میں عذر لنگ پیش کرنے والے کا تذکرہ ——— بس ان ہی اجمالی باتوں کی اس دسویں جلد میں تشریحات ہیں ———

تاخیر سے اس جلد کے منظر عام پر آنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دارالعلوم الشہابیہ کے تعلیمی اور انتظامی کاروبار میں رکاوٹ بنتے رہے ——— اور اس پر مزید یہ کہ مولانا عبدالرحمٰن استاذ دارالعلوم الشہابیہ نے دارالعلوم کی گیارہویں جماعت کو فاضل عربی کے امتحان میں داخلہ کی ترغیب دے دی اور داخلہ روانہ کر دیا۔ یہ بات میرے مذاق کے خلاف تھی لیکن طلبہ کے میلان اور مولانا موصوف کی ترغیب کے سامنے میں بے بس ہو کر رہ گیا۔

تعلیمی کام کا سارا بوجھ دارالعلوم الشہابیہ کے صدر المدرسین مولانا منظور احمد پر پڑ گیا۔ اصولی طور پر میرا اخلاقی فرض ہو گیا کہ اس کام میں مولانا سے بھرپور تعاون کروں۔ مجھے سارے کام چھوڑ کر مولانا کا ہاتھ بٹانا پڑا۔ اور لگاتار چھ ماہ کی شب و روز محنت کے بعد دارالعلوم الشہابیہ کی گیارہویں جماعت اس قابل ہو گئی کہ فاضل عربی کے امیدوار کی حیثیت سے کمرہ امتحان میں بیٹھ سکے الحمد للہ کہ سات طلبہ کی پوری جماعت صرف ایک طالب علم کے سوا فاضل عربی کے امتحان میں کامیابی سے ہمکنار ہو گئی۔ مستثنیٰ طالب علم کی بھی کمپارٹ آئی۔ لیکن یہ بڑے دکھ اور درد کی بات ہے کہ فاضل عربی کے امتحان میں کامیاب ہونے والے طلبہ کی اس خوشی میں خود امتحان کے محرک اصلی حضرت مولانا عبدالرحمٰن کو شرکت کا موقعہ نہ ملا۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب جگر کی بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد لاہور کے واپڈا ہسپتال میں مورخہ ۹ ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۷ جولائی ۱۹۸۶ء اتوار کے دن بوقت ۸ بجے صبح اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تغمدہ اللہ برحمتہ۔

بس حالات کی یہی نیرنگیاں دسویں جلد کے لیے تاخیر کا باعث بنی ہیں۔

اس جلد میں مجھے جن علمی گہواروں سے استفادے کا موقعہ ملا ہے ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ بصائر ذوی التمیز	مجدالدین فیروزآبادی
۲۔ اعلاء السنن	مولانا ظفر احمد عثمانی
۳۔ التفہیمات الالٰہیہ	حکیم الامت شاہ ولی اللہ
۴۔ اتحاف السادۃ المتقین	علامہ السید مرتضیٰ الزبیدی
۵۔ الدرر فی اختصار المغازی والسیر	حافظ ابن عبدالبر المغربی
۶ البدایہ والنہایہ	حافظ ابن کثیر دمشقی
۷ التمہید علی الموطا	حافظ ابن عبدالبر

۸۔ زاد المسیر	ابن الجوزی
۹۔ مجموعہ الوثائق السیاسیہ	ڈاکٹر حمید اللہ
۱۰۔ ابوذر غفاری	مولانا مناظر حسن گیلانی
۱۱۔ النہایہ فی غریب الحدیث	لابن الاثیر الجزری
۱۲۔ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح	حافظ ابن تیمیہؒ
۱۳۔ ازالۃ الخفاء	حکیم الامت شاہ ولی اللہ
۱۴۔ قرۃ العینین	″ ″ ″
۱۵۔ آیات خلافت	مولانا عبدالشکور

یہ اللہ سبحانہ کا بے پایاں انعام ہے کہ اس نے معالم القرآن کی طباعت میں اخراجات کے کمر شکن بوجھ سے میرے دل دماغ کو بالکل یکسوئی عطا فرما دی۔ اللہ سبحانہ جزائے خیر عطاء فرمائے قابل صد احترام جناب الحاج عبدالغنی مالک وطن ا... کورٹ اور ان کے صاحبزادگان جناب محمد اسماعیل مالک "تاجر" گوجرانوالہ اور جناب محمد عثمان کو جن کی قرآن وسنت ... مخلصانہ وابستگی اور دریا دلی نے معالم القرآن کی طباعت کے تا تکمیل تمام مصارف کی ذمہ داری قبول فرما کر اپنے لیے او... صاحبزادگان کے لیے، اپنے والدین کے لیے قیامت تک اجر وثواب کا ایک دائمی اور ناپید اکنار سمندر قائم کر دیا۔ ... کے کلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کی نیکی وہ نیکی ہے جس کی جزا کا آخر کوئی نہیں ہے۔

یہ وقت کی اہم ترین ضرورت اور ایمان کا بلند ترین تقاضا ہے۔

اس عمل میں نیکی کے اعتبار سے لزوم بھی ہے اور تعدیہ بھی اور یہ رضائے الٰہی کا پیمانہ بھی ہے۔

دل کی پہنائیوں سے صرف مولف ہی نہیں بلکہ معالم القرآن کا ہر قاری حاجی صاحب اور ان کے صاحبزادگان ... جناب الٰہی میں دست بدعا رہے گا۔ اور جب تک معالم القرآن تکمیل کی منزلیں طے کرتی رہے گی بلکہ جب تک معالم ا... پڑھی جائے گی معالم القرآن کے ہر قاری کے علم وعمل کی جزا میں حاجی صاحب موصوف اور ان کے صاحبزادہ کا حصہ اور قائم رہے گا۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

پارہ دہم ایک نظر میں

اسلامی معاشرت

توحید

مساجد اللہ کی ہیں ان کی آباد کاری اہل ایمان کا کام ہے
اللہ کی رحمت اور اللہ کی رضا
نصرت کرنا اللہ کا کام ہے
اللہ کی جانب سے طمانیت وسکینت کا نزول
غنی بنانا اللہ کا کام ہے
تحریم کا قانون بنانا اللہ کا کام
یگانہ اللہ سبحانہ کی عبادت ہونی چاہیے
اللہ کی عبادت میں شرک نہ ہونا چاہیے
ہر انسداد اللہ کی جانب سے ہے۔
اللہ پر توکل ہونا چاہیے وہ ہی مولیٰ ہے
مومن کے لیے اللہ سبحانہ ہی غایت ومقصود ہے
ایمان کا تقاضا اللہ کی رضا جوئی ہے
سب سے بڑی نعمت اللہ کی رضا ہے

سیاسی قوانین

باہمی نزاع سے سیاسی زندگی کی ہوا اکھڑ جاتی ہے
سیاست میں بطر اور ریا ایمان کے منافی ہے
سیاسی زندگی میں عروج اور پستی کا قانون
سیاسی زندگی میں معاہدے ناگزیر ہیں لیکن بنیاد صداقت اور دیانت ہونی چاہیے
سیاسی زندگی میں دشمن اگر صلح کی طرف مائل ہو تو عواقب سے بے پرواہ ہو کر صلح کر لینی چاہیے
سیاسی زندگی میں باہمی الفت اخوت اور اتحاد جان ہے
اہل ایمان میں سیاسی ولایت کا قانون
اگر کوئی غیر مسلم اسلام آشنائی کے لیے سیاسی امن چاہیے تو دینا چاہیے۔
مسجد حرام پر اس سال کے بعد مشرکین کا سیاسی غلبہ ہمیشہ کے لیے ختم ہے۔

اجتماعی قوانین

دفاعی قوانین

دستوری قواعد

اخلاقی قوانین

اللہ سبحانہ کی صفات

اللہ کے احوال و شئون

آخرت کی زندگی

رسالت ونبوت

صحابہؓ کرام کا چہرہ

مالیاتی مسائل

اسلامی شعائر

مساجد کے آباد کار اور متولی صرف متقی اہل ایمان ہو سکتے ہیں۔ ۱۸
حاجیوں کو پانی پلانا اور مساجد کی آباد کاری نیکیاں ہیں لیکن ان کا مقام جہاد فی اللہ کے برابر نہیں ہے ۱۹
مشرکین کے لیے حرم کی تولیت ہمیشہ کے لیے ختم ۲۸

تاریخی واقعات

غزوہ بدر کبریٰ
بدر میں قیدیوں کا واقعہ
مسلمانوں میں ایمان و ہجرت کی بنیاد پر مواخات
ہجرت کی اساس پر دو مملکتوں کے مسلمانوں کے تعلقات
فتح مکہ کا تاریخی واقعہ
۹ھ عرب کے مختلف قبائل سے معاہدے ختم ہونے کا اعلان
مشرکین سے معاہدہ ختم اور چار ماہ کی مہلت
نسی کی رسم کے خاتمہ کا اعلان
اسلام میں غیر مسلم شہریوں پر ٹیکس کا نفاذ
واقعہ ہجرت کا تاریخی مقام
غزوہ حنین
غزوہ تبوک
زکوٰۃ کا سرکاری نظام
منافقین کا معاشرتی مقاطعہ اور نماز جنازہ کی ممانعت
غزوہ تبوک میں شریک ہونے پر بے بس اور بے سہارا اہل ایمان کا رونا۔

مقدمہ

باسمہ سبحانہ: الحمد للہ والسلام علیٰ عبدہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سورہ برارت کا زمانہ نزول ۹ سنہ ہجری ہے۔ یہ سورت دراصل امت اسلامیہ کے نام ایک آخری پیام ہے اوراس کے احکام ومواعظ سے اصل مقصود مستقبل میں پیش آنے والے واقعات ہیں نہ کہ پیش پا افتادہ۔ گویا امت کو آئندہ مرحلوں کے تیار کیا جارہا ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے۔ اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے آئی ہے کہ آخر سورۃ نزلت کاملۃ براءۃ سورہ برارت پوری کی پوری نزول میں سب سے آخری سورت ہے۔ شارحین حدیث کو حضرت براء کی بات جی کو نہیں لگتی ہے۔ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں ایک سے زیادہ تاویلیں کی ہیں۔ اور آخر میں لکھا ہے کہ صاف بات یہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ غزوہ تبوک میں نازل ہوا ہے کچھ نے یہ کہہ کر اپنے مخاطبوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

آغاز سورہ سے پانچویں رکوع تک کا زمانہ نزول آخر ذی قعدہ ۹ھ کے لگ بھگ ہے۔

رکوع ۶ سے رکوع ۹ تک کا زمانہ نزول رجب ۹ھ سے کچھ پہلے ہے۔

رکوع ۱۰ سے شروع ہو کر آخر تک کا زمانہ نزول غزوہ تبوک سے واپسی پر ہے۔ حافظ ابن حزم نے تبوک سے واپسی کی تاریخ رمضان ۹ھ بتائی ہے۔

خبر نہیں کہ صحیح روایت کی موجودگی میں ان دور از کار تاویلوں کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے بات صاف ہے کہ پوری سورت یکبارگی نازل ہوئی اور غزوہ تبوک سے واپسی پر دوران سفر نازل ہوئی ہے۔ غزوہ تبوک کے لیے آپ مدینہ سے رجب ۹ھ میں روانہ ہوئے اور رمضان ۹ھ میں تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی سال امیر حج بن کر روانہ ہوئے۔ حج کا زمانہ ذی الحجہ ہے۔

اس سورت میں پورے اسلامی نظام کا سیاسی نقشہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ نظام صرف مقامی

نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ بین الاقوامی ہونے کی حیثیت میں مسلمانوں کی اسلامی ذمہ داریاں۔ مسلمانوں کے مختلف قوموں سے تعلقات کی نوعیت اسلامی نظام کے مقابلے میں دوسرے نظاموں کی حد تک مسلمانوں کا طرزِ عمل۔ دفاع میں جہاد کی اہمیت۔ افراد کی جانچ پڑتال کا پیمانہ۔ اسلام کے قانونی نظام کا دوسرے نظاموں سے مقابلہ۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے مسائل سے اس سورت میں بحث کی گئی ہے اور یہ بھی آئندہ کے لیے بتایا گیا ہے کہ اب چونکہ نظم و نسق اہلِ ایمان کے پاس ہے اس لیے وہ طرزِ عمل واضح طور پر اختیار کیا جائے جو گہوارہ وحی یعنی عرب کو بھرپور طور پر دارالسّلام بنانے میں معین ہو۔ اس کے لیے یہ نظام عمل بتایا گیا کہ:

اوّلاً۔ عرب سے شرک اور اس کے آثار قطعاً مٹا دیئے جائیں۔ کفر کی ساری رسوم ختم کر دی جائیں۔ کفر کے اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام اور روحانی نظام کو زندگی کے ہر گوشہ سے نکال دیا جائے۔

ثانیاً: عرب کی تمدنی زندگی میں کفر و شرک کی جو رسمیں موجود ہیں ان کا فی الفور استیصال کر دیا جائے نسی کی رسم ان سب میں سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ اس پر براہ راست ضرب لگا کر مسلمانوں کو بتا دیا کہ مسلمانوں کو رسوم کفر کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے۔

ثالثاً: عرب کو اسلام کا مرکز بنانے کے بعد دنیا کے سارے نظاموں پر اسلام کے نظام کو غالب اور برتر کرنے کے کیا اقدام کرنا چاہیے۔ اس معاملہ میں روم و ایران کی سیاسی طاقتیں اسلام کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ عرب سے باہر جو لوگ دین حق کے پیرو نہیں ہیں ان کی خود مختارانہ فرماں روائی کو ختم کر کے لیظھرہ علی الدین کلہ کا عملی دنیا میں مظاہرہ کرو۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اللہ سبحانہ نے اس بارے میں اہلِ ایمان کی اجتماعی زندگی پر خاص طور سے زور دیا ہے مثلاً۔ اطیعوا اللہ و رسولہ و لا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم اور لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت من قلوبھم و لکن اللہ الف بینھم۔ سورہ براءت میں اسی اجتماعیت کا چہرہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ المومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ ویطیعون اللہ ورسولہ اولئک سیرحمھم اللہ

اسلام میں اجتماعیت کا شیرازہ نظام حکومت سے وابستہ ہے اس لیے اس بارے میں خاص اسلامی حکومت کے آمدنی کے وسائل پر توجہ دلائی ہے مثلاً اموالِ غنیمت، صدقات، زکوٰۃ، عشر، صدقۃ الفطر، کفارات، غیر مسلموں سے تحفظ کا ٹیکس ــ اور دفاع کے لیے ضروریات دفاع کی بجا آوری کے لیے انفاق کی اہمیت، دفاع کے لیے تیاری

کا حکم۔ نظام حکومت قائم ہو جانے کے بعد مملکتِ اسلامی کا بھرپور تصور، اسلامی مملکت سے غیر اسلامی ممالک کے معاہدے۔ بدعہدی کی صورت میں معاہدوں کے اختتام کا اعلان۔ سربراہ مملکت کی شخصیت اور مملکت میں اس کا مقام۔ مملکت کے وجود میں آنے کے بعد اسلامی مملکت کے نصب العین کا اعلان ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ۔ یہی اجتماعیت ہے جس کا نمونہ پانچ وقت کی نماز باجماعت میں پیش کیا گیا ہے۔ منشا یہی ہے کہ پوری زندگی علیٰ صفۃ الصلاۃ ہونی چاہیے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ
لِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ
السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا
يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٤١﴾

اور جان رکھو کہ مالِ غنیمت میں سے جو کچھ تمہیں میدانِ جنگ میں ملا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول کے لیے ہے اور رسول کے رشتہ داروں کے لیے یتیموں کے لیے مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے ہے[۵۳]۔ اگر تمہارا اللہ پر اور اس چیز پر ایمان رکھتے جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن نازل کی تھی یعنی جس روز دو جماعتیں ایک دوسرے سے بھڑ گئیں اور اللہ کو ہر چیز پر پوری دسترس حاصل ہے[۵۴]۔

مُفردات کے مُعانی

غنمتم: غنم سے بنایا ہے۔ غنم کے معنی مجدالدین فیروزآبادی نے یہ بتائے ہیں کہ وہ چیز جو آدمی کو بغیر محنت اور مشقت مل جائے لیکن یہ اس کے پورے معنی نہیں ہیں۔ کیونکہ جنگ میں جو مال ملتا ہے محنت اور مشقت تو اس میں بھی ہوتی ہے بلکہ زیادہ ہوتی ہے اس کے اصلی معنے مادی بدل کے بغیر کسی چیز کا مل جانا۔ تجارت میں جو کچھ منافع حاصل ہوتے ہیں وہ مال کا بدل ہوتے ہیں۔ اس لیے غرم اس کی ضد ہوتا ہے یعنی بغیر کسی جرم کے مالی سزا۔ بتانا یہ ہے کہ غنیمت میں محنت تو ہوتی ہے مگر بدل مادی نہیں ہوتا۔ اور اگر محنت بھی نہ ہو پھر کچھ دستیاب ہو جائے تو اسے غنیمت بارده کہتے ہیں

یوم الفرقان: جدائی کا دن یعنی جس روز حق و باطل میں جدائی ہو گئی۔ اور ایمان و کفر کے درمیان فیصلہ ہو گیا۔ یہ بدر کا دن ہے جو سترہ رمضان المبارک کو پیش آیا۔

العدوۃ الدنیا: عدوۃ کنارہ کو کہتے ہیں یہ لفظ بضم العین اور بکسر العین دونوں طرح آتا ہے۔ علامہ فیومی

نے مصباح میں تصریح کی ہے کہ قریش عین پر پیش بولتے ہیں اور قیس زبر دیتے ہیں۔ میدان بدر کے دوسرے کنارے کو جو مدینہ منورہ کی جانب تھا اور جہاں لشکر نبوی فروکش تھا العدوۃ الدنیا کہا ہے۔ دنیا ادنی کا مؤنث ہے۔ اور العدوہ کی صفت ہے۔ العدوۃ القصوی۔ قصوی اقصی کا مؤنث ہے اس کے معنی دور کا کنارہ ہیں۔ یہ میدان بدر کا پرلا کنارہ ہے جو کہ معظمہ کی طرف تھا اور جہاں کفار مکہ کی فوجیں فروکش تھیں۔ یاد رہے کہ بدر کے اطراف و جوانب میں جو پہاڑ ہیں ان میں سے جو دو سفید پہاڑ دُور سے ریت کے تودوں کی شکل میں نظر آتے ہیں اب بھی ان میں سے جو پہاڑی مدینہ منورہ کی جانب ہے اس کا نام العدوۃ الدنیا اور دوسری جو مکہ کی طرف ہے اسے العدوۃ القصویٰ ہے۔

الرکب : راکب کی جمع ہے جس کے معنے سوار کے ہیں۔ عرف میں اس کا استعمال شُتر سوار کے لیے ہوتا ہے۔ اہل عرب کے قافلے چونکہ بیشتر شتر سواروں پر مشتمل ہوتے تھے اس لیے کاروان کے معنے میں استعمال ہوتا ہے یہاں ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کو کہا گیا ہے جو شام سے سامان تجارت لے کر آ رہا تھا۔

جہاد اور اموالِ غنیمت

یہ آپ پہلے سُن چکے ہیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اہل ایمان کو پہلی بار اسلام کے مطالبہ پر غیر مسلموں سے لڑنے کا اتفاق ہوا۔ اس سے پہلے وہ قبائلی جنگیں لڑتے رہے۔ زمانہ جاہلیت کی لڑائیوں کے قانون سے وہ آشنا تھے لیکن ان کو اسلام میں جنگ اور اس سے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں اسلام کے قانون کا علم نہ تھا۔ دوسرے تمدنی مسائل کی طرح مسلمان ابھی تک جنگ کے معاملے میں بھی اکثر پرانے ہی تمدن کے تصورات لیے ہوئے تھے اس وجہ سے بدر کی لڑائی میں لوگوں کو جو اموال ملے قرآن نے سورت کے آغاز میں اس کا اجمالی ضابطہ بیان فرمایا ہے۔ یہاں اب اسی ضابطہ کی تفصیل بتائی جا رہی ہے پہلے اجمالاً اموالِ غنیمت کے بارے میں یہ قانون بتا دیا کہ یہ اموالِ قبضہ سے شخصی ملکیت نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ سب کے سب سرکاری املاک ہیں اس کے لیے تعبیر یہ اختیار فرمائی للہ والرسول۔ اور پھر غنائم کے لفظ کو چھوڑ کر انفال بولا۔ انفال جمع نفل کی ہے۔ اس تعبیر میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے دشمن سے جو مالِ غنیمت حاصل کرتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں ان کی محنتوں کی اُجرت نہیں ہے بلکہ بلا بدل ایک زائد انعام ہے۔ کیونکہ نفل کے معنے لغت میں اضافہ اور زیادتی کے ہیں۔ اسی سے نماز میں تطوع کو نوافل کہتے ہیں۔ جہاد کا جو اجر ہے وہ اس سے بالکل الگ ہے وہ پائیدار ہے اور دائمی ہے اور مستقلاً اللہ کی بارگاہ میں محفوظ ہے۔ آغاز میں صرف یہی بتایا تھا کہ اموالِ غنیمت سرکاری املاک ہیں۔ اس بات کو نہیں چھیڑا تھا کہ سرکاری املاک کے بعد ان کے مصارف کیا ہیں تاکہ پہلے تسلیم و طاعت مکمل ہو جائے اسلامی زندگی کے لیے ممنت۔ ان کی سرفروشی و قربانی اور جہاد کے بارے میں دوسرے

احکام بیان فرمائے اور بتایا کہ اسلامی زندگی کے عناصر ترکیبی کیا ہیں۔ اور بالکل آخر میں مقصدِ جہاد کو واضح الفاظ میں سمجھانے کے بعد اب بتایا ہے کہ ان سرکاری املاک کے قانونی مصارف کیا ہیں۔

مالِ غنیمت کے قانونی مصارف

(٥٢) اور جان رکھو کہ مالِ غنیمت میں جو کچھ تمہیں میدانِ جنگ میں ملا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے۔ اور رسول کے رشتہ داروں کے لیے، یتیموں اور مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے ہے۔

آغازِ سورت میں الانفال للہ والرسول فرمایا تھا۔ یہاں اس کی قدرے تفصیل بیان فرمائی ہے کہ جو مالِ غنیمت کافروں سے لڑ کر ہاتھ آئے اس میں کا پانچواں حصہ خدا کی نیاز ہے جسے اللہ کی نیابت کے طور پر پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام وصول کر کے پانچ جگہ خرچ کر سکتے ہیں۔

۱۔ اپنی ذات پر

۲۔ اپنے ان قرابت داروں پر (بنی ہاشم بنی المطلب) جنھوں نے قدیم سے آپ کی نصرت و امداد کی اور اسلام کی خاطر، محض قرابت کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیا۔ اور مدِ زکوٰۃ سے ان کے لیے لینا حرام ہوا۔

۳۔ یتیموں پر۔

۴۔ حاجت مند مسلمانوں پر۔

۵۔ مسافروں پر۔

پھر غنیمت میں جو چار حصے باقی رہے وہ لشکر پر تقسیم کیے جائیں۔ سوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک حضور اقدس ﷺ کے بعد خمس کے مصارف میں سے حنفیہ کے نزدیک صرف تین اخیر کے باقی رہ گئے۔ کیونکہ حضور کی رحلت کے بعد حضور کی ذات کا خرچ نہیں رہا اور نہ اہلِ قرابت کا وہ حصہ رہا جو ان کو حضور کی نصرت قدیمہ کی بنا پر ملتا تھا۔ البتہ مساکین و یتامیٰ کا جو حصہ ہے اس میں حضور کے قرابت دار مساکین اور اہلِ حاجت کو مقدم رکھا جانا چاہیے۔ بعض علماء کے نزدیک حضور ﷺ کے بعد امیر المؤمنین کو اپنے مصارف کے لیے خمس الخمس ملنا چاہیے واللہ اعلم بعض روایات میں ہے کہ جب غنیمت میں سے خمس (اللہ کے نام کا پانچواں حصہ) نکالا جاتا تھا تو نبی کریم ﷺ اول اس میں سے کچھ حصہ بیت اللہ کے لیے نکالتے تھے بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ جہاں سے کعبہ بعید ہے وہاں مساجد کے لیے نکالنا چاہیے۔[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یہاں غنیمت کے موضوع پر یہ بنیادی اور اہم باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

۱۔ غنیمت کیا ہے؟
۲۔ غنیمت کی حیثیت کیا ہے؟
۳۔ غنیمت کی حلت کے شرائط کیا ہیں؟
۴۔ غنیمت کے مصارف کیا ہیں؟

غنیمت اسلام کی قانونی زبان میں وہ املاک منقولہ ہیں جو میدان جنگ میں غیر مسلموں سے مسلمانوں کے قبضے میں آئیں یعنی وہ اموال منقولہ جن پر رقبہ جنگ میں اسلامی فوج اپنے اسلحہ کی طاقت سے قابض ہو جائے وہ اموال غنیمت ہیں۔

قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں غنیمت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

وہ اموال جو مسلمانوں کو اہلِ شرک کی فوجوں سے ہاتھ لگیں اور جو ساز و سامان اور اسلحہ اور جانوروں کی قسم سے ہوں یعنی اموالِ منقولہ۔

دوسری جگہ پر فرماتے ہیں؛

جو کچھ مسلمانوں کو اہلِ شرک کی فوجوں اور ان کے سامان ہتھیار وغیرہ سے ملے۔

اس سے معلوم ہوا کہ غنیمت کا اطلاق صرف ان اموالِ منقولہ پر ہوتا ہے جو جنگی کارروائی کے نتیجہ میں دشمن کے لشکروں کی مدد سے ہاتھ آئے۔ لشکروں کی مدد سے باہر عام آبادیوں کو لوٹتے مارتے پھرنا شریعت کی نگاہ میں درست نہیں ہے اگرچہ دارالحرب کے تمام اموال مباح ہیں۔ اور کوئی شخص غیر مستامن کے اموال سے تعرض کرے تو اس پر نہ کوئی ضمان ہوگا اور نہ مال واپس کیا جائے گا لیکن اس قسم کی لوٹ مار پسندیدہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کا سربراہ مملکت ممکن طریقہ سے اپنی فوجوں کو ایسی حرکات سے روکے گا۔ بہرحال اسلامی فوج کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مخالف ملک کی عام آبادی پر دست درازی کر کے مالِ غنیمت جمع کرے۔

یہ تو غنیمت کی تعریف ہوئی۔ لیکن اسلامی قانون میں غنیمت کے ساتھ کچھ اور بھی اصطلاحات ہیں۔ مثلاً فئی، نفل، سلب اور صفی۔

فئی، وہ اموال منقولہ و غیر منقولہ ہیں جو غنیم کے لشکر سے جنگ کے نتیجہ میں نہ ملے ہوں۔ بلکہ نتیجۃً فتح کے طور پر حکومت کے زیر تصرف آئیں۔ عام اس سے کہ غنیم کی رعایا کے املاک ہوں یا دشمن حکومت کے ہوں۔ اسلامی اصطلاح میں ایسے اموال کو فئے کہتے ہیں۔ ابو عبید القاسم بن اسلام نے کتاب الاموال میں غنیمت اور فئی میں یہ فرق بتایا ہے۔

غنیمت اور فئے میں یہ فرق ہے کہ جو کچھ کافروں سے جبراً چھینا جائے۔ اس وقت جبکہ عملاً جنگ قائم ہو وہ غنیمت

ہے — جو مال جنگ بند ہونے کے بعد اور اس ملک کے اسلامی ملک بن جانے کے بعد ان مفتوح لوگوں سے حاصل ہو وہ فیئے ہے — یہی نوعیت اس مال کی ہے جو جنگ شروع ہونے سے پہلے دشمن سے مل جائے[1]

لفظ فیئے کا کوئی اور مفہوم اس کے سوا نہیں ہے۔ اور کتب فقہ میں مجھ کو کہیں بھی کسی ایسی فیئے کا نشان نہیں جس کو ہر شخص بطور خود حاصل کرے اور اپنی ہی جیب میں رکھ لے۔ فقہاء قدم قدم پر فیئی للمسلمین اور فیئی یوضع فی بیت مال المسلمین اور فیئی لجماعۃ المسلمین لکھتے ہیں اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ ملتے ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ متقدمین اس فیئے سے واقف تھے جو جماعت کی ملک ہوتی ہے اور حکومت اسلامیہ کے زیر تصرف ہوتی ہے۔

غنیمت اور نہبہ میں فرق

غنیمت حاصل کرنے کا صرف ان لوگوں کو حق دیا گیا ہے جو اسلامی حکومت کے زیر حفاظت ہوں اور جن کو اسلامی حکومت کے سربراہ کی اجازت نصًا یا حکمًا ہو۔ ان کے سوا اگر عام مسلمان فرداً فرداً یا جماعت بنا کر بطور خود لوٹ مار کرنے لگیں تو ان کی حیثیت لٹیروں کی ہوگی! اور غنیمت غنیمت نہ ہوگی بلکہ نُہبہ (لوٹ) ہوگی۔ علامہ سرخسی رقم طراز ہیں۔

اگر ایسے لوگ جنہیں سربراہ مملکتِ اسلامی کی حمایت حاصل نہیں سربراہ کی اجازت کے بغیر غنیم کے علاقہ میں غیر ذمہ دارانہ طور پر داخل ہوں اور مال لوٹیں تو ہمارے نزدیک یہ مال غنیمت نہ ہوگا بلکہ وہ مال انہی کے لیے خاص ہوگا اس کی وجہ جو امام شمس الدین السرخسی نے لکھی ہے وہ بھی گوش گذار فرمالیجئے۔

سرماتے ہیں:

بات دراصل یہ ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ غنیمت اس مال کا نام ہے جو انتہا درجے کے پاک اور اشرف طریقے سے دستیاب ہوا اور وہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کے کلمہ کا بول بالا اور قانون کی برتری مقصود ہو۔ اسی لیے اس میں اللہ کا پانچواں حصّہ مقرر ہے یہ بات اس مال میں نہیں ہوتی جس کو ایک شخص چوروں کی طرح حاصل کرتا ہے کیونکہ اس کا مقصد صرف کسب مال ہوتا ہے[2]

بہرحال غنیمت اور نہبہ میں جوہری فرق ہے۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے رائے عامہ چند در چند غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

سلب: اس مال کو کہتے ہیں جو سربراہ یا قائمقام کسی سپاہی کو کسی خاص شخص کے بارے میں کہے جو اس کو مارے گا

[1] کتاب الاموال صفحہ ۲۵۴۔ [2] المبسوط ج ۱۰ ص ۴۷۔

تو اس کا سامان اور ہتھیار وغیرہ اس کے ہوں گے۔ ارشاد ہے:

جس شخص نے کسی کو قتل کیا اُس کا سامان اُسی کا ہوگا۔

امام عبداللہ بن محمود الموصلی لکھتے ہیں۔

مقتول کا سلب یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ ہتھیار، کپڑے، گھوڑا سامان اور وہ سب کچھ جو کپڑوں اور مال وغیرہ سے اس کے پاس ہوں۔

نفل: وہ مال ہے جو میدانِ جنگ میں دلیری اور تحریض کے لیے کسی کے لیے مزید کی غنیمت کے علاوہ پیش کش کی جائے۔

صفی: وہ مال ہے جسے مالِ غنیمت میں سے سربراہ تقسیم سے پہلے اپنے لیے مخصوص کرلے۔

غنیمت کی حیثیت کیا ہے

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز نے غنیمت کی حلت کی نظریاتی حیثیت جس انوکھے انداز میں خداداد علم کے ذریعے بیان فرمائی وہ اس قابل ہے کہ معالم القرآن کے قاریوں کے سامنے بطورِ سوغات پیش کی جائے فرماتے ہیں:

بنی آدم کی تخلیق کی بلند ترین اور بزرگترین غرض صرف عبادت ہے اور اموال قرآنی آیت کی روشنی میں انسانوں کے لیے ہیں۔ ان دونوں باتوں کو ملا کر اگر غور کیا جائے تو آپ کا ضمیر آپ کو یہ ضرور بتائے گا کہ اموال کی حیثیت اس زندگی میں سامان عبادت کی ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے کہ کھانے کے لئے روٹی پکائی جاتی ہے۔ اور دیگچی، چولہا، لکڑی، توا، چمٹا یہ سب کچھ روٹی پکانے کا سامان ہے جس طرح اگر روٹی پکانا مقصود نہ ہو تو دیگچی، توے اور چمٹے کی آپ کی نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر عبادت مقصود نہ ہو تو پھر ان مالوں کی خالق کی نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ اگر اللہ سبحانہ نبوت کے ذریعے یہ حکم دیں کہ جو لوگ مقصد تخلیق عبادت کی بجا آوری نہیں کر رہے ہیں ان سے جہاد کے ذریعے یہ سارا چھین لو۔ اور عبادت کے بجا آوری میں صرف کرو تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے۔ آخر اگر آپ زمین میں درخت پھل کے لیے لگاتے ہیں اور وہ درخت پھل نہیں دیتا ہے اور آپ اس درخت کو کاٹ کر دوسرا درخت پھلدار لگا دیں تو یہ تقاضائے عقل ہے یا نہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جہاد صرف اعلاء کلمۃ اللہ کا نام ہے بلکہ ان وسائل پر قبضہ کرنا بھی جہاد ہی ہے۔ جن کی قوت سے مقصد تخلیق عبادت

تباہ ہو رہا ہے۔ کفار کا ان باتوں پر اہلِ ایمان کے مقابلے پر قبضہ حیوانات کی طرح کا ہے۔

اس نظریئے کے تحت اگر مسلمان کفر کی جانوں پر قابو پائیں اور ان کے مالوں پر قبضہ کریں تو مقصدِ تخلیق کو پروان چڑھانے کی خاطر مسلمان ان کی جانوں میں جانوروں کی طرح تصرف کر سکتے ہیں۔ اور اسی نظریہ سے یہ بات بھی الم نشرح ہو گئی کہ اموال پر کفار کی ملکیت اہلِ ایمان کے مقابلے میں بے حد کمزور اور ناپائدار ہے۔

اصل میں مالِ غنیمت کی بنیاد یہی نظریہ ہے۔ اس نظریہ کا تقاضا تو صرف ہونا چاہیے تھا کہ کفر کے املاک اموال پر اہلِ ایمان کا قبضہ جائز ہو۔ اور اہلِ ایمان کے مالوں پر کفر کا قبضہ ناجائز اور غیر قانونی ہو لیکن یہ اسلام کی رواداری اور فراخ حوصلگی ہے کہ جس طرح غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے مملوکات پر مالکوں کی رضامندی کے بغیر قبضہ کر کے مسلمان ان کے قانونی مالک بن سکتے ہیں ٹھیک اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں کے اس حق کو بھی اسلام نے قانونی حق قرار دیا ہے یعنی اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے اموال پر العیاذ باللہ اگر غیر اسلامی حکومتوں کا قبضہ ہو جائے تو مالک کی رضامندی کے بغیر وہ بھی ان کے مالک ہو جاتے ہیں۔ اس کا تعلق قانونِ جنگ سے ہے اور اسی حیثیت میں غنیمت کی حلت کا راز ہے یعنی جس طرح مسلمانوں کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کی ملک میں صرف قبضہ سے داخل ہو جاتا ہے اسی طرح اسلامی حکومت کے باشندوں کے لیے بھی غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کا مال بھی مباح و جائز ہے یعنی قبضہ کے بعد مسلمان اس کے مالک بن جاتے ہیں غنیمت کے اموال کے قانونی مالک مسلمان اسی لیے ہو جاتے ہیں کہ ان کے اموال کو اسلام نے مسلمانوں کے لیے مباح قرار دیا ہے۔

غنیمت کے حلال ہونے کی شرطیں

غنیمت کے اموال کی حلت علی الاطلاق نہیں۔ اسلام نے اس کی حلت کی کچھ شرطیں بتائی ہیں۔ یعنی جنگ کے نتیجے میں جو اموال غیر اسلامی حکومت کے باشندوں سے بزور حاصل ہوں ان کے حلال ہونے کی چند ضروری شرطیں ہیں۔

(۵۴) سب سے بنیادی شرط مالِ غنیمت کے حلال ہونے کی قبضہ ہے۔ اور قبضہ کے معنے یہ ہیں کہ بلا شرکت غیرے اس کو اپنے کام میں لا سکتا ہو اس سے نفع اٹھا سکتا ہو، کسی دوسرے انسان کو اسے روکنے کا حق نہ ہو علمائے اسلام نے ملکیت کی تعریف میں اس مفہوم کو ادا کیا ہے۔ علامہ الامام القرافی کے الفاظ یہ ہیں۔

ملک شریعۃ کی زبان میں کسی چیز میں یا کسی چیز کے نفع میں ایک ایسی اجازت ہے جس کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ شخص جس کو یہ اجازت حاصل ہے۔ خاص اس چیز سے یا اس کی منفعت سے نفع حاصل کرے[1]

[1] انوار البروق فی انواع الفروق

لیکن غنیمت میں ملکیت کے دو درجے ہیں ایک حقیقت کا ثابت ہو جانا اور دوسرے حق کا مؤکد ہونا۔ قبضے سے حق ثابت ہوتا ہے۔ حق کا تاکد نہیں ہوتا ہے۔ یعنی قبضہ سے صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس میں لینے والے کا حق ہے مگر لینے والا کو اس سے نفع اٹھانے اور اس میں اپنی مرضی سے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے بالفاظ دیگر قبضہ تو ہے مگر ناتمام ہے۔

علامہ محمود موصلی لکھتے ہیں :

قانون یہ ہے کہ غنیمت میں صرف دسترس سے ملکیت نہیں ہوتی ہے۔ صرف حق ثابت ہوتا ہے ملکیت کے لیے ضروری ہے کہ احراز ہو۔ اور پھر تقسیم شرعی ہو[1]

علامہ شمس الدین السرخسی رقمطراز ہیں :

ہمارے نزدیک قبضہ سے صرف حق ثابت ہوتا ہے۔ دارالاسلام میں لے جانے سے یہ حق مضبوط ہوتا اور تقسیم سے اس کی تکمیل ہوتی ہے[2]

۲۔ دوسری اہم اور بنیادی شرط غنیمت کے حلال ہونے کی یہ ہے کہ اموال غنیمت دارالحرب سے دارالاسلام میں منتقل ہو جائیں۔ اسے قانون کی زبان میں احراز کہتے ہیں۔ احراز کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اموال غنیمت کو دارالاسلام پر منتقل کر دیا جائے۔ علامہ محمود لکھتے ہیں۔

اموال غنیمت کو دارالحرب میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ اسے دارالاسلام میں منتقل کریں۔ پھر تقسیم کریں۔

دوسرے فقہاء کی بھی یہی تصریحات ہیں کہ دارالحرب میں مال غنیمت کو تقسیم نہ کیا جائے۔ مسلمان فوج جب تک دارالحرب میں مقیم ہیں اس وقت تک وہ اموال غنیمت سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس قید سے صرف سامان خورد و نوش اور جانوروں کا چارہ مستثنیٰ ہے۔ یعنی دوران جنگ میں جس قدر ازوقہ اور چارہ فوجیوں کے ہاتھ لگے اس میں سے ہر مجاہد بقدر ضرورت لے سکتا ہے۔ اس کے سوا باقی تمام اموال غنیمت لشکر کے سربراہ کے پاس جمع کیا جائے اور ان کو غانمین میں اس وقت تک تقسیم نہ کیا جائے گا جب تک وہ دارالاسلام میں منتقل نہ کر دیئے جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک اموال غنیمت جب تک دارالحرب میں ہوں غانمین کی ملک ان پر مکمل نہیں ہوتی ہے۔ امام شافعی رح کی رائے اس کے خلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ محاربین کا مال مباح ہے اس لیے جس وقت مجاہدین اسلام اس پر قابض ہوئے اسی وقت اس کے مالک ہو گئے۔ مگر امام ابوحنیفہ رح اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ یہ ملک ضعیف ہے گو ہمارا قبضہ ہو چکا ہے لیکن ملک توان کا ہے جب تک مال ان کے ملک سے ہمارے ملک میں منتقل نہ ہو جائے ہم پوری طرح اس کے مالک نہیں ہوئے اس لیے کہ تکمیل ملک کے لیے صرف قبضہ کافی نہیں ہے۔

[1] الاختیار لتعلیل المختار۔

[2] المبسوط ج ۱۱

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

مسلمان جب تک دارالحرب میں ہے تو اس وقت تک قبضہ کلی کفار کا ہے اور مسلمان کا صرف قبضہ جزئی ہے اور تم جانتے ہو کہ جزئی قبضہ حرکت و سکون میں قبضہ کلی کے تابع ہوتا ہے اس لیے مسلمانوں کا جزئی قبضہ ناقابلِ اعتبار ہوگا۔ غرض جب تک مسلمان دارالحرب میں ہیں کفار کی طرف سے ان اموال کے مسلمانوں سے واپس لینے کا امکان ہے اور قبضہ کی تکمیل نہیں ہے اس لیے جب تک اموالِ غنیمت دارالحرب سے دارالاسلام میں منتقل نہ ہوں گے ایسا استخلاص نہ ہوگا جس کی بنیاد پر مسلمانوں کو مالک قابض اور متصرف کہہ سکیں[1]

احراز کی دوسری صورت یہ ہے کہ جس ملک کو مسلمانوں نے فتح کیا ہے اس کو بھی مسلمان دارالاسلام بنالیں۔

علامہ شمس الدین السرخسی رقمطراز ہیں کہ:

جس ملک میں مسلمان اُترے ہوں اس پر حقِ ملکیت اس وقت تک مؤکد و مضبوط نہ ہوگا جب تک اس ملک کو دارالاسلام نہ بنالیں گے[2]

اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اموالِ غنیمت میں اسلامی حکومت اس وقت تک پورا تصرف کا حق نہیں رکھتی ہے جب تک علاقہ مقبوضہ کو دارالاسلام نہ بنالیا جائے یا آج کی سیاسی زبان میں اپنے مقبوضات کے ساتھ اس کے الحاق کا باقاعدہ اعلان نہ کردیا جائے۔ دارالاسلام بن جانے کے بعد چونکہ قبضہ کی تکمیل ہو جاتی ہے اس لیے وہاں اب اموالِ غنیمت میں تصرف کرنے اور تقسیم کرنے کا اسلامی حکومت کو حق ہے

جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد و عمل اسی کی تائید کرتا ہے امام مکحول دمشقی فرماتے ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ نے اموالِ غنیمت کو دارالاسلام کے علاوہ کہیں تقسیم نہیں فرمایا۔

محمد بن اسحاق کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے حنین کے غنائم واپسی پر جعرانہ میں تقسیم فرمائے جو اس زمانے میں دارالاسلام کی سرحد پر تھا۔ خیبر کے اموال خیبر میں اس لیے تقسیم فرمائے کہ وہ دارالاسلام بن گیا تھا۔

حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد و عمل اور فقہاء کی تصریحات کہہ رہی ہیں کہ اموالِ غنیمت کو دارالاسلام میں تقسیم کیا جائے۔

۳۔ تیسری اہم شرط مالِ غنیمت کے حلال ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت کے مطابق اس کی تقسیم شرعی ہوئی ہو۔ فقہاء نے اس شرط کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ تقسیم سے پہلے مالِ غنیمت کی خرید و فروخت کو بھی ناجائز بتایا ہے۔ مالِ غنیمت میں تقسیم

---

[1] مکاتیب قاسمی

[2] المبسوط ج ۱۰

شرعی کے بعد حکومت کی جانب سے کسی کو کچھ بانٹنا بالکل ایک قانونی فعل ہے جیسے بیع و شرا اور ہبہ وغیرہ مالِ غنیمت کے حلال ہونے کی یہ اہم اور بنیادی شرطیں ہیں۔ مالِ غنیمت ہی میں جنگی قیدی اور غیر منقولہ جائیدادیں بھی داخل ہیں۔ غیر منقولہ جائداد مثلاً ملک کی زمینیں وغیرہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رح کے خیال میں زمینوں کا بھی یہی حکم ہے جو اموال منقولہ کا ہے لیکن امام ابو حنیفہ رح یہ فرماتے ہیں کہ تقسیم غنائم کا حکم اموال منقولہ کے بارے میں ہے املاک غیر منقولہ جائداد وغیرہ کو مجاہدین میں تقسیم کرنا واجب نہیں ہے یہ امیر مملکت کے اختیار پر موقوف ہے کہ ملکی مصالح اور اپنے صوابدید کے مطابق عمل کرے۔ چاہے تو تقسیم کر دے یا مسلمانوں کی مصالح کی خاطر روک لے یا سابق شہریوں کے پاس رہنے دے اور ان سے خراج وصول کرے اس کی تفصیل انشاء اللہ پارہ ۲۸ میں آئے گی۔

جنگی قیدیوں پر ہم معالم القرآن کی جلد پنجم میں ایک اجمالی تبصرہ کر چکے ہیں اس پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ ۲۶ پارہ میں آرہا ہے۔

اس تفصیل سے آپ اس نتیجہ پر ضرور پہنچے ہوں گے کہ اسلامی قانون جس طرح اسلامی مقبوضات پر اہلِ اسلام کے حقوق ملکیت تسلیم کرتا ہے اسی طرح غیر اسلامی مقبوضات پر اہلِ حرب تک کے مالکانہ حقوق تسلیم کرتا ہے۔ اگرچہ جنگ ان کے اموال کو ہمارے لیے مباح کر دیتی ہے مگر شریعت نے ہم کو اس اباحت سے فائدہ اٹھانے کی عام غیر مشروط اجازت نہیں دی؟ بلکہ ان کے ملک سے ہمارے ملک میں منتقل ہونے کی چند باضابطہ قانونی شکلیں مقرر کی ہیں۔ اور وہ ایسی شکلیں ہیں جن میں ہمارے اور اہلِ کفر کے درمیان پوری مساوات ہے۔ اسلامی قانون کہتا ہے کہ ہم ان کے اموال کے مالک اس وقت ہوں گے۔ جب باقاعدہ جنگ میں ان پر قبضہ کر کے دارالاسلام میں لے آئیں گے یا اس ملک کا دارالاسلام سے الحاق کرلیں گے اسی طرح وہ بھی جب ہمارے اموال پر جنگ کے ذریعے سے قابض ہو کر اپنے ملک میں لے جائیں گے اور ان کے ملک میں ان کے مالکانہ حقوق کا احترام کرنا ہم پر لازم ہوگا۔

امام شمس الدین سرخسی فرماتے ہیں ؛

> جب اموال پر قبضہ کر کے ملک میں پہنچا دیا گیا ہو تو یہ اس مال پر حقِ ملکیت کا پورا سبب ہے اور دنیا حاصل کرنے کے اسباب میں ہمارے اور کفار کے درمیان مساوات ہے بلکہ دنیا میں ان کا حصہ ہمارے حصہ سے کچھ زیادہ ہی ہے کیونکہ ان کے لیے تو صرف دنیا ہی ہے اور اخذ مال سے ان کا مقصود بجز اکتساب مال کے اور کچھ نہیں بخلاف اس کے کہ ہمارا مقصد اکتساب مال نہیں ہے[1]۔

آیئے اب قرآن کی آیت میں تقسیم غنیمت کے قانون کو پڑھیئے۔ قانون یہ بتاتا ہے کہ مالِ غنیمت کو ۵ پر تقسیم کیا

[1] المبسوط ج ۱۱

کیا جائے۔ چار حصّے تو مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جائیں اور پانچویں حصّے کو اس طرح تقسیم کیا جائے۔

اللہ کے لیے۔

اللہ کے رسول کے لیے۔

اللہ کے رسول کے رشتہ داروں کے لیے۔

یتیموں کے لیے۔

مسکینوں کے لیے۔

مسافروں کے لیے۔

مطلب یہ ہے کہ اموالِ غنیمت میں سے سب سے پہلے اس مال سے سرکاری حصّہ نکالنا چاہیئے۔ پہلے تو شروع میں تمام اموالِ غنیمت کو سرکاری قرار دیا تھا الانفال للہ والرسول لیکن یہاں یہ بتانے کے لیے کہ اس سرکاری حصّے میں خود جناب رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر خرچ کیا جائے گا لام کا اضافہ کرکے وللرسول فرمایا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن میں غنیمت کی شرح مقدار کے سوا زکوٰۃ عشر کی شرح مقدار نہیں بتائی گئی۔ اسلامی قانونِ مالیات میں اسی کو بنیاد بنا کر شرحیں مقرر کی گئی ہیں۔ زکوٰۃ کا نصاب چاندی میں دو صد درہم یا اس کے مماثل سونا ہے ان دو سو کو آپ پانچ پر تقسیم کریں تو چالیس روپے آئے گا۔ یہ کل زکوٰۃ کی شرحیں $\frac{1}{5}$ - $\frac{1}{10}$ - $\frac{1}{20}$ - $\frac{1}{40}$ دے کر دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا ڈبل ہوتی چلی گئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا غنیمت والے خمس کو بنیاد بنا کر یہ تقسیم و تحدید حساب اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

اسی خمس سے یہ نکتہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غنیمت ایسا سرمایہ ہے جو بلا بدل حاصل ہوا ہے۔ اور اس میں قرآن نے خمس مقدار مقرر کی ہے لہٰذا ایسا سرمایہ جو بلا بدل اتفاقاً ہاتھ آجائے اس میں بھی پانچواں حصّہ ہے۔ یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی بدل کے اتفاقاً کسی مسلماں کے ہاتھ آجائے۔ اس میں سے پانچواں حصہ سرکار کا ہے وہی ہے جس کی بنا پر رکاز میں پانچواں حصّہ سرکار کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

بہر حال غنیمت کے اموال میں سے پہلے پانچواں حصّہ سرکاری خزانہ میں داخل ہوگا۔ اس کے بعد ۴ حصّے مجاہدین میں تقسیم کیے جائیں گے

قرآن نے یہاں سب سے پہلے اس ۵/۱ کے مصارف بتلائے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے اللہ سبحانہ کا اسمِ گرامی ہے علماء کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ کا ذکر تبرکاً آیا ہے۔ اور علامہ آلوسی نے جمہور کی طرف نسبت

---

۵ المبسوط ج ۱۱

کر کے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ یہاں اللہ سبحانہ کا اسمِ گرامی حضور اقدس ﷺ کی عظمت شان ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے یہاں جو لطیف بات لکھی ہے وہ اس قابل ہے کہ آپ بھی لطف اندوز ہوں۔ فرماتے ہیں:

> انما غنمتم میں ما موصولہ ہے اور ما موصولہ ہونے کی وجہ سے جملہ میں معنی شرطی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کی جزا پر فا آئی ہے۔ اصل جزا یہ ہے فالحکم ان للہ خمسہ یعنی مالِ غنیمت جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی تمہیں ملا ہے اس کا حکم ہے کہ اس کا ۱/۵ خمس اللہ کی ملک ہے جنگی فوجیوں اور غنیمت لانے والوں کی ملکیت نہیں ہے۔ یہ خمس فاتحین پر زکوٰۃ کی طرح واجب نہیں بلکہ یہ خود بالذات غنیمت میں اللہ کا حق ہے۔ اسی وجہ سے یہ پیغمبر ﷺ کے لیے حلال ہے۔ لیکن زکوٰۃ آپ کے لیے حلال نہیں ہے۔

یہ بتانے کے بعد قرآن نے اللہ سبحانہ کی اس ملکیت کے مصارف بتائے ہیں ان مصارف میں اوّلین مصرف جناب رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ یہاں یہ سوال بہت اہمیت رکھتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کو یہ حصہ کس حیثیت میں ملتا تھا۔ رسول ہونے کی حیثیت میں یا سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت میں۔ قتادہ کی رائے ہے کہ حضور انور ﷺ کو یہ وظیفہ سربراہ ہونے کی وجہ سے ملتا تھا۔ حال کے شارحین قرآن میں سے کچھ نے اسی کو اپنایا ہے۔ امام ابو حنیفہ کی رائے اس موضوع پر یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو یہ حصہ منصبِ رسالت کی وجہ سے ملتا تھا۔ امام ابو حنیفہ رح کا استدلال یہ ہے کہ جب حکم کسی وصف پر مرتب ہوتا ہے وہ وصف اس کی علت ہوتا ہے یہاں للرسول قرآن میں موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ رسالت اس حصہ ملنے کی علت ہے اور چونکہ آپ کے بعد منصبِ رسالت ختم ہے آپ کو قرآن نے ہی خاتم النبیین کہا ہے اس لیے آپ کا یہ حصہ آپ کے وصال کے بعد ختم ہے۔ امام ابو حنیفہ رح کی یہ بات قرآن کے طالبعلم کو اپیل کرتی ہے۔ لیکن یہاں پہنچ کر یہ سوال خودبخود ذہن میں چٹکیاں لینے لگتا ہے کہ آپ کے وصال کے بعد اس آپ کے حصہ کا مصرف کیا ہے۔ ابوبکر الجصاص نے احناف کی ترجمانی کرتے ہوئے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضور اقدس کے اس حصے کو مالِ غنیمت ہی میں واپس کر دیا جائے گا۔ ابن کثیر رح نے لکھا ہے کہ حافظ ابن جریر کا میلان یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے اس حصے کو باقی چار قسموں ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور ابن السبیل پر صرف کیا جائے۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کو یہ حصہ سربراہ کی حیثیت سے ملتا تھا وہ اس کو آپ کے بعد سربراہ کا حصہ بتاتے ہیں۔ امام شافعی رح کی بھی یہی رائے ہے لیکن خلفائے راشدین کا تعامل اس کا مؤید نہیں ہے۔ انھوں نے حضور اقدس کا حصہ کبھی اپنی طرف منتقل نہیں کیا۔

دوسرا مصرف اس خمس کا ذوی القربیٰ ہیں۔ ذوی القربیٰ سے یہاں کون لوگ مراد ہیں؟ اس میں شروع ہی سے

اہلِ علم کے خیالات مختلف ہیں۔ کچھ کی رائے ہے کہ ذوی القربیٰ قریش بلا استثناء مراد ہیں، کچھ کہتے ہیں وہ مراد ہیں جن پر زکوٰۃ حرام ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ ہاشم اور مطلب کی اولاد مراد ہے۔ اور کچھ کی رائے میں صرف ہاشم کی اولاد مراد ہے حافظ ابنِ کثیر نے ہاشم اور مطلب کی اولاد کو یہ کہہ کر ترجیح دی ہے۔

ھذا قول جمھور العلماء انھم بنو ھاشم و بنو المطلب

یہی وہ قرابت دار ہیں جنھوں نے جناب رسول اللہ ﷺ کی جاہلیت اور آغازِ اسلام میں مدد کی تھی۔ یہی حضور اقدس کے ساتھ شعب ابی طالب میں قید تھے ظاہر ہے کہ ان کی کفالت کی ذمہ داری مدینہ میں آکر حضور اقدس ﷺ پر عائد ہوتی تھی خواہ یہ ذمہ داری عرفی اور شرعی نوعیت کی ہو یا اخلاقی انداز کی ہو۔ اس سے یہ بات خود بخود معلوم ہوتی ہے کہ ذوالقربیٰ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہر دور میں قرابت کی بنیاد پر حضور اقدس ﷺ کا ہاتھ بٹایا اور مدد کی اس مرحلہ پر یہ نظریاتی اختلاف خاص اہمیت رکھتا ہے کہ ان کو خمس میں سے حصہ ملنے کی بنیاد صرف قرابت ہے۔ یا نصرت ہے یا قرابت و نصرت دونوں ہیں۔ اور یا پھر قرابت اور فقر ہے۔ اس نظریاتی اختلاف کے نتیجہ میں حضور اقدس ﷺ کے وصال کے بعد ذوالقربیٰ کے اس حصے کے بارے میں اختلاف رونما ہوگیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اور دوسرے ائمہ قرابت کو اساس بنا کر ذوی القربیٰ کے اس حصے کو آپ کے وصال کے بعد بھی برقرار رکھا۔ اور امام ابوحنیفہ نے نصر کو بنیاد بنا کر ذوی القربیٰ کے حصہ کو ختم کر دیا اور بتایا کہ اس ۵/۱ کو تین یتامیٰ، مساکین اور مسافروں پر تقسیم کیا جائے۔ حضور ﷺ کے اقارب میں جو مساکین ہیں ان کو مساکین ہونے کی وجہ سے دیا جائے۔ صرف قرابت کی بنیاد پر ان کا قانونی طور پر کوئی حصہ نہیں۔ خلفائے راشدین بھی ان کو فقر اور محتاجی کی وجہ سے دیتے تھے۔

شیخ ابو منصور ماتریدی نے اس پر ایک مقنن کی حیثیت سے نگاہ ڈال کر یہ راز بتایا کہ ذوی القربیٰ کو قرابت کی وجہ سے نہیں بلکہ محتاجی اور فقر کی وجہ سے اس خمس میں سے حصہ ملتا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہو تو ان کو ذوی القربیٰ کے عنوان سے الگ کیوں ذکر کیا جب کہ یہ مقصد مساکین کے لفظ سے حاصل ہے۔ شیخ ابو منصور فرماتے ہیں اس لیے کہ شائد کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ حضور کے اقرباء کا اس میں کوئی حصہ نہیں کیونکہ یہ ۵/۱ ہی غنیمت کی زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ ذوی القربیٰ کے لیے حلال نہیں ہے۔ تصریح کر دی کہ یہ وہ زکوٰۃ نہیں ہے۔ بہر حال یہ تو قانونی نکتہ سنجیاں اور باریکیاں ہیں ہمیں اس مقام پر امام مالکؒ کی رائے زیادہ اچھی لگتی ہے کہ اس خمس کو خرچ کرنے کا مسئلہ سربراہ مملکت کے صوابدید اور اختیارِ تمیزی پر موقوف ہے جہاں وہ مصلحت دیکھے خرچ کرے۔ حافظ ابنِ تیمیہ فرماتے ہیں وھو اصح الاقوال۔

آخر میں تین حصے یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے ہیں سوچنے کی بات ہے کہ اسلامی خزانہ کی اس پہلی آمدنی کو پہلے پانچ حصوں پر تقسیم کیا گیا۔ پھر اس پانچویں حصے کو بھی زمانہ نبوت میں پانچ پر تقسیم کیا گیا کل ۲۵ روپے تھے ان کو

پانچ پر تقسیم کیا گیا پھر پانچ روپے کو پانچ پر تقسیم کیا گیا۔
ایک روپیہ اپنی ذات کا۔ ایک روپیہ آپ کے رشتہ داروں کا۔ ایک روپیہ یتیموں کا۔ ایک روپیہ مسکینوں کا اور ایک روپیہ مسافروں کا۔

پانچ روپے میں صرف ایک روپیہ اس قوت کے ذاتی مصارف کے لیے مقرر کیا گیا جس کے ذریعے یہ اقتدار حاصل ہوا یعنی حضور اقدس ﷺ اور ایک حصہ آپ کے جانثار رشتہ داروں کے لیے جنھوں نے مکہ سے مدینے تک آپ کا ہر حال میں ساتھ دیا تھا۔ باقی تین حصوں کو بجائے کشوری و فوجی مصارف کے ملک کے الیتامیٰ، المساکین اور ابن السبیل کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اور یہ تو شروع میں ہوا۔ پھر جب صرف پندرہ بیس سال کے تھوڑے عرصہ میں فتح کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ اس میں ساری ایرانی حکومت بازنطینی حکومت کا اکثر سما گیا اس وقت یہ پانچ بھی صرف تین کے لیے رہ گئے۔ مساکین۔ یتامیٰ اور ابن السبیل۔ حضور اقدس ﷺ کی ذات گرامی کے لیے جو قرآن نے پانچویں کا پانچواں رکھا۔ اس کا حال خود آپ کی حیات مبارکہ میں یہ تھا کہ آپ کی ضروریات سے جو بچ جاتا تھا۔ اس کو بھی آپ مسلمانوں ہی کے عام مصالح میں صرف فرما دیا کرتے تھے۔ علانیہ بھرے مجمعوں میں اعلان فرماتے :

اللہ سبحانہ نے جو آمدنی اے مسلمانو تمہیں غنیمت بنا کر دی ہے اس میں خود میرے لیے بجز اس خمس کے اور کچھ لینا جائز نہیں۔

پھر اس کے بعد فرماتے :

پھر یہ خمس بھی تم کو ہی واپس کر دیا جاتا ہے۔

اس فقرے کی شرح حضرت امام شافعیؒ سے یہ منقول ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی اس سے مراد آپ کا وہ حصہ تھا جو خمس سے آپ کو ملتا تھا۔ بعد کو آپ کے خلفائے راشدین نے جو عملی ثبوت اپنی خلافت کے زریں دور میں اسی سلسلے میں پیش کیے ہیں تاریخ کے اوراق ان سے بھرے ہوئے ہیں کہ مال غنیمت کے سارے خمس کو یتامیٰ۔ مساکین اور مسافروں کے لیے مقرر کر دیا۔ یہی اسلام کا انسانی دنیا میں وہ جدید اقدامی کارنامہ ہے جس کی انسانیت کی پوری تاریخ میں دنیا کی حکومتیں نظیر نہیں پیش کر سکتی ہیں۔

اموالِ غنیمت کے باقی چار حصص

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا ہے وہ قرآن کا ... ہے لیکن اس کا مدلول یہ بھی ہے کہ اموال غنیمت میں سے ۱/۵ نکالنے کے بعد باقی چار حصص کو ان فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے جو اس مال غنیمت حاصل کرنے کا ذریعہ بنے ہیں یہ

تقسیم کیے ہو صحابہ میں عمر بن الخطاب علی بن ابی طالب ؓ تابعین میں عمر بن عبد العزیز، ابن سیرین ؒ اور ائمہ مجتہدین میں امام مالک، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد امام سفیان الثوری، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابوثور، امام ابو یوسف، امام محمد بن الحسن ؒ فرماتے ہیں پیدل کو ایک حصہ دیا جائے اور سوار کو تین حصے دیئے جائیں ایک حصہ سوار کا دو حصے گھوڑے کے۔ صرف امام ابوحنیفہ ؒ کی رائے یہ ہے کہ سوار کو تین نہیں دو دیئے جائیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے دونوں کے دلائل کا موازنہ پیش کیا ہے اور جمہور کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔

بہرحال آیت قرآنی صراحۃً نہیں اشارۃً بتا رہی ہے کہ ۱/۵ نکالنے کے بعد باقی فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضور اقدس ﷺ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا تھا بعد میں خلفائے راشدین نے اسی طریقہ پر عمل کیا۔ بنوامیہ اور بنو عباس کے دورِ حکومت میں بھی غنیمت فوجیوں کے درمیان تقسیم کی جاتی رہی اور اسلامی فقہ کے تمام مکاتب اس بات پر متفق ہیں کہ مالِ غنیمت کے باقی چار حصے جنگ میں حصہ لینے والوں میں تقسیم کیے جائیں۔

دورِ جدید میں اموالِ غنیمت کی نوعیت بدل گئی۔ قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد بھی صدیوں تک غنیمت میں ہاتھ آنے والے اسلحہ ایسے ملتے جو افراد کے درمیان تقسیم کیے جا سکتے تھے لیکن دورِ جدید میں ایسے اسلحہ اور فوجی سامان بھی ہاتھ آسکتے ہیں جو افراد کے درمیان تقسیم نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ہوائی جہاز، بحری جہاز، غوطہ خور جہاز، ٹینک، جیپ گاڑیاں، ٹرک، مشین گنیں، توپ، راکٹ، اور دیگر ایٹمی سامانِ جنگ، ان میں سے بعض چیزیں بڑی اور قیمتی ہونے کی وجہ سے ناقابلِ تقسیم ہیں۔ اور تقریباً ساری چیزیں ایسی ہیں جن کو افراد کی ذاتی ملکیت میں دینا اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کے خلاف ہوگا۔ ان میں سے اکثر اسلحہ صرف بڑے پیمانے کی جنگ میں کام آسکتا ہے اور بڑے پیمانے پر جان و مال کی تباہی کی قوت رکھتا ہے ان کو افراد کی ذاتی ملکیت میں دینے سے فتنہ و فساد کے ملک میں رونما ہونے کا اندیشہ ہے۔ تمدنی مصالح کا تقاضا ہے کہ بڑے پیمانے پر جان و مال تباہ کرنے کی قوت صرف حکومت کے قبضہ میں ہو۔ اگر یہ طاقت افراد کے ہاتھ میں بھی رہے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ اسے اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے باہمی تنازعات میں یا کسی موقعہ پر حکومت کے خلاف بغاوت میں استعمال کر کے شہریوں کی زندگی کو خطرہ میں ڈال دیں۔

قرنِ اوّل میں عام طور پر افراد اپنے اسلحوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتے تھے۔ اس لیے غنیمت میں ملنے والے اسلحہ کی افراد کے درمیان تقسیم فوجی اعتبار سے ملک کے لیے مفید ہوتی تھی۔ جدید حالاتِ جنگ کا تقاضا ہے کہ اپنے سپاہیوں کو اسلحہ فراہم کرنے کی ذمہ داری خود حکومت لے۔ ان حالات میں غنیمت میں ملنے والے اسلحوں کو فوجی افراد کی ذاتی ملکیت میں دینا فوجی اعتبار سے بھی بے سود ہوگا کیونکہ ان کو جدید اسلحہ سے مسلح رکھنے کا کام اسلامی حکومت کو بہرحال ہی کرنا ہوگا۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ خطرناک بھاری اسلحہ کی ذاتی ملکیت کو قانوناً ممنوع قرار دینا زیادہ مناسب

ہوگا ـــــ

یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور ضرورت ہے کہ اُمت کے فقہائے مجتہدین اس موضوع پر کوئی رائے قائم کریں اور سوچیں کہ:

دورِ قدیم میں سپاہیوں کے اسلحہ ان کی ذاتی مِلک ہوتے تھے اور سامانِ جنگ کا انتظام ان کو خود کرنا ہوتا تھا۔

دورِ قدیم میں سپاہی کی تنخواہ نہ ہوتی تھی وہ جنگ میں رضاکارانہ جاتا تھا۔

اَب دورِ جدید میں اسلحہ کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے اور سپاہی حکومت سے تنخواہ یاب ہوتا ہے اور سپاہی کی ہر ضروریات کی حکومت کفالت کرتی ہے۔ ان بدلے ہوئے احوال کا احکام کی تبدیلی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ شاید حالات کے اسی تغیر کے پیشِ نظر یہاں قرآن نے یہ تصریح نہیں کی ہے کہ اموالِ غنیمت میں سے ۵/۱ نکالنے کے بعد چار حصے فوجیوں میں تقسیم کیے جائیں۔ غنائم دونوں ہیں منقولہ اور غیر منقولہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غیر منقولہ غنائم کے بارے میں فیصلہ تاریخ کی کتابوں، حدیث کی کتابوں، فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں اور اس کو پوری جماعت کا اجتماعی فیصلہ بنایا گیا ہے۔ اسی طرح سہم الرسول کے بارے میں فقہ کے چاروں اماموں کا فیصلہ آپ سُن چکے ہیں ذوالقربیٰ کے خمس میں سے حصے کے متعلق آپ فقہاء میں سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا فتویٰ پڑھ چکے ہیں۔ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر نص کے منطوق پر احوال و ظروف کے تغیر کا اثر پڑ سکتا ہے تو مدلول پر بدلے ہوئے حالات کا اثر کیوں نہیں پڑ سکتا ہے۔ اگر کسی مخصوص صورتِ حال میں شریعت کے کسی حکم پر عمل کے نتیجے میں ضرر و فساد پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ قوی ہو اور یہ ضرر و فساد اس ضرر و فساد سے بڑا ہو جو اس حکم پر عمل نہ کرنے سے پیدا ہوگا تو اس حکم پر عمل نہ کرنا چاہیے۔

ازالہ ضرر کے اصول سے فقہاء نے جو قاعدے مرتب کیے ہیں ان موضوع پر استفادہ کرنا چاہیے۔

إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَ
الرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي
الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ
مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ
اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٤٢﴾ إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ
وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ
وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٤٣﴾ وَ
إِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ
فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ
تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٤٤﴾ ع ٥ ١

یہ وُہ دن تھا کہ تم ادھر قریب کے ناکے پر تھے اور وہ یعنی دُشمن دُور کے ناکے پر۔ اور قافلہ تم سے نچلے حصّہ پر یعنی سمندر کے کنارے کی طرف تھا۔[۵۵] اور اگر تم نے باہم مقابلہ کا وعدہ کیا ہوتا تو ضرور تم جنگ سے پہلو تہی کرتے۔[۵۶] جو صُورتحال پیش آئی صرف اس لیے آئی کہ جو کچھ اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا اُس کا ظہور ہو جائے اور اس لیے تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ حُجّت پوری ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ اتمام حُجّت کے بعد زندہ رہے اور بلاشُبہ اللہ سب کچھ سُنتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے[۵۷] اور اے پیغمبر یہ وہ دن تھا کہ اللہ سُبحانہٗ نے آپ کو خواب میں ان کی تعداد تھوڑی کر کے دکھائی۔ اور اگر آپ کو خواب میں اللہ سُبحانہٗ ان کی تعداد

زیادہ دکھا دیتا تو مسلمانو! تم ضرور ہمت چھوڑ بیٹھتے۔ اور اس معاملہ میں باہم اُلجھ جاتے لیکن اللہ سُبحانہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ یقین کر لو کہ اللہ سینوں کے چھپے رازوں کو جانتا ہے۵۸ اور یہ بات بھی غور کی ہے کہ عین مقابلہ کے وقت میں اللہ ان کو تمہاری نظروں میں۔ اور تمہیں ان کی نگاہوں میں تھوڑا کر کے دکھا رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا تاکہ جس بات کا اللہ نے فیصلہ کر لیا ہے اس کو کر دکھائے۔ سارے کاموں کا دار و مدار اللہ سُبحانہ کی ذات پر ہے۵۹

بدر یوم الفرقان ہے

۴۔ اگر تمہارا اللہ پر اور اس چیز پر ایمان ہے جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن نازل کی تھی۔ یعنی جس روز دو جماعتیں ایک دوسرے سے بھڑ گئیں اور اللہ کو ہر چیز پر دسترس ہے۔ فیصلہ کے دن سے مراد یوم بدر ہے جس میں حق و باطل کی کشمکش کا کھلا ہوا فیصلہ ہو گیا۔ اس دن حق تعالیٰ نے اپنے کامل ترین بندے پر فتح و نصرت اُتاری فرشتوں کی امدادی کمک پہنچی اور سکون و اطمینان کی کیفیت نازل فرمائی تو جو لوگ خدا پر اور اس کی تائید غیبی پر ایمان رکھتے ہیں ان کو غنیمت میں سے خدا کے نام کا پانچواں حصہ نکالنا بھاری نہیں ہو سکتا۔ جیسے اس روز تم کو مظفر و منصور کیا۔ وہ قادر ہے کہ آئندہ بھی تم کو غلبہ اور فتوحات عنایت فرمائے [۱]

اس آیت میں جو جملہ شرطیہ کا پیمانہ ہے اس کی نوعیت زجر ہے توبیخ کی نہیں جیسا کہ کچھ نو خیز شارحین قرآن کا خیال ہے کہ:

> چونکہ روئے سخن ان نکتہ چینوں کی طرف خاص طور سے ہے جنھوں نے اموالِ غنیمت سے متعلق سوال اٹھایا تھا اس وجہ سے فرمایا اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

بلکہ اس کی نوعیت بالکل وہی ہے جیسے دوسرے مواقع پر ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر کی ہے۔ یہاں شرط کی جزاء محذوف ہے پوری بات اس طرح ہے کہ اگر تم اللہ اور ما انزلنا علی عبدنا پر ایمان رکھتے ہو تو خوب جان لو کہ اموالِ غنیمت میں خمس کا قانون بھی اللہ نے بنایا ہے اور اس کی تقسیم بھی اللہ کی بنائی ہوئی ہے جو جس کا ہے اس کے سپرد کر دو مطلب یہ ہے کہ ایمان کے ثبوت کے لیے نرا علم کافی نہیں ہے اس

[۱] افادات شیخ الاسلام

کے لیے عمل اور طاعت کی شہادت بھی ہونی چاہیے۔ اور قرآن نازک مواقع پر ایمان ہی کے حوالہ سے مخاطبوں میں طاعت کی انگیخت کرتا ہے۔

اور یہاں ان کنتم امنتم باللہ و رسولہ کی تعبیر چھوڑ کر ان کنتم امنتم باللہ وما انزلنا علیٰ عبدنا یوم الفرقان کی تعبیر بلیغ موقعہ و محل کے لحاظ سے اختیار کی ہے۔ بتایا ہے کہ بدر کے روز جو کچھ جتنی کچھ اور جیسی کچھ تمہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ تمہارا کارنامہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ سبحانہ کی کارسازی اور اللہ کی جانب سے اپنے رسول پر نازل کردہ برکات کا فیضان ہے۔ یہ فقرہ کہ جو کچھ ہم نے بدر کے دن اپنے بندے پر نازل کیا بڑا ہی معنی خیز ہے۔ بدر میں ہونے والے انعامات کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ ذرا غور فرمایئے اور ایک اچٹتی نظر ان انعامات پر ڈالیے۔

بدر میں پہلا انعام

پہلے پڑھ چکے ہو کہ بدر کے معرکہ سے پہلے قریش کا ایک تجارتی قافلہ مال و اسباب سے لدا ہوا شام سے مکہ جا رہا تھا۔ اور ادھر سے قریش کی فوج بڑے ساز و سامان کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کو نکلی تھی۔ مدینہ سے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے اس صورتحال سے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک چیز تم کو ملے گی یا تو یہ قافلہ اور یا پھر قریش کی فوج شکست کھائے گی اور تم کو مال غنیمت ملے گا چنانچہ بدر میں یہ ہی صورت واقعہ پیش آئی اور اللہ کا وعدہ پورا ہوا۔

دوسرا انعام بدر میں

بدر کے میدان میں جہاں مسلمانوں نے اپنی صفیں قائم کی تھیں وہ جگہ بلند تھی اور جہاں قریش کی فوج کا پڑاؤ تھا وہ جگہ نشیب میں تھی اللہ سبحانہ نے کفار کی شکست کا ایک مادی سبب پیدا کر دیا کہ عین اس وقت میدانِ جنگ میں موسلا دھار بارش ہو گئی جس نے ادھر تو مسلمانوں کی طرف گرد و غبار بٹھا کر ان کے پاؤں جما دیئے۔ اور ادھر کافروں کی طرف پانی کا سیلاب آ گیا کہ ان کو زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو گیا۔

بدر میں تیسرا انعام

مسلمانوں کی تعداد کم تھی اس کی تلافی اس طرح کی کہ ایک ہزار فرشتوں کی کمک آ گئی۔ ان فرشتوں کے آنے کی قرآن نے شکل یہ بتائی کہ ان کے دستے کے بعد دستے اور پرے کے بعد پرے نمایاں ہوں گے۔ میدانِ جنگ میں لڑنے والوں کی یہ سائیکالوجی ملحوظ رہے کہ جن کی حمایت میں کمک پر کمک آ رہی ہو ان کا حوصلہ ہر کمک پر دونا ہو جاتا ہے اور اسی اعتبار سے مدِ مقابل کے اعصاب کا تناؤ ڈھیلا ہوتا جاتا ہے۔

بدر میں چوتھا انعام

بدر دار و گیر کا معرکہ تھا۔ اس معرکہ میں جہاں سب پریشان تھے حضور اقدس ﷺ کی ذاتِ گرامی سکونِ دل اور سر بسجود پیشانی کے ساتھ ظاہری ہتھیاروں سے منزہ ہو کر دعاؤں میں مصروف تھی۔ آپ نے سر اٹھایا اس حیرتناک منظر پر نگاہ ڈالی اور زمین سے ایک مٹھی کنکری اور خاک اٹھا کر دشمن کی طرف پھینکی۔ یکبارگی باطل کا طلسم چور چور ہو گیا۔

بدر میں پانچواں انعام

رات کو جب مسلمان بدر کے پڑاؤ پر پہنچے تو انھیں یہ فکر ہوئی کہ قریش کے قافلہ کا پتہ لگایا جائے۔ چنانچہ مسلمان مخبر ادھر ادھر گئے اور ایک چرواہے کو پکڑ لائے اور اس سے قریش کے قافلہ کا حال پوچھنے لگے اس نے جواب دیا کہ قافلہ کا حال تو مجھے معلوم نہیں ہے البتہ ان کا فوجی لشکر ادھر پڑا ہے۔ یہ سن کر مسلمانوں نے اُسے مارا کہ صحیح حال نہیں بتایا ہے مار کھانے پر اس نے کہا کہ اچھا ٹھہرو بتاتا ہوں۔ جب لوگ چھوڑ دیتے تو وہ پھر یہی کہتا کہ قافلہ کا تو پتہ نہیں ہے البتہ یہ جانتا ہوں کہ قریش کا لشکر سامنے پڑا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نماز پڑھ رہے تھے نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ جب وہ جھوٹ کہتا ہے تو تم چھوڑ دیتے ہو اور جب وہ سچ بولتا ہے تو اسے مارتے ہو اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ قریش کی تباہی کا دن ہے۔ یہ ابو جہل کا مقتل ہے۔ یہ عتبہ کا ہے یہ ابی کا ہے وغیرہ۔ راوی کہتا ہے کہ آپ نے جس کا مقتل جہاں متعین فرمایا تھا۔ ایک نے بھی سرمو وہاں سے تجاوز نہ کیا۔ اور معرکہ جنگ میں وہ وہیں مرا پڑا ملا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو صحنِ حرم کی بددعا کے دن موجود تھے وہ کہتے ہیں کہ عرب کے ساتوں رئیس جن کے حق میں آپ نے بددعا کی تھی کل کے کل بدر کے میدان میں ڈھیر ہو گئے اور بطشۃ الکبریٰ کے انتقام کی پیش گوئی پوری ہو گئی۔

بدر میں چھٹا انعام

معرکہ جنگ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے بہادروں کی آنکھ سے نیند اڑ جاتی ہے مگر اللہ سبحانہ کی قدرت کی یہ کارسازی اور حضور اقدس ﷺ کا یہ اعجاز تھا کہ بدر کے کارزار میں مسلمان سپاہیوں کی بے خطری اور بے خوفی کے لیے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ کر دیا تاکہ کسی خوف و خطر کا خیال کیے بغیر وہ اپنا فرض انجام دے سکیں۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے انعامات کو جتانے کے لیے قرآن نے یہاں ما انزلنا علیٰ عبدنا یوم الفرقان کی بلیغ تعبیر اختیار فرمائی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ سبحانہ کو مانتے ہو اور اس کے جناب رسول اللہ ﷺ پر ان انعامات کی بارش نازل ہوتے آنکھوں سے دیکھ چکے ہو تو پھر دعویٰ ایمان کی پشت پر کردار کی شہادت میں کبھی تاخیر نہ کرنا اور یہ بات دھیان میں رکھنا کہ اللہ سبحانہ کی ذات ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کی قدرت کی نشانیوں کا تم بدر میں مشاہدہ کر چکے ہو۔ قرآنِ پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے۔ ہر اہم موقعہ پر

اس نے مسلمانوں کو یا یھا الذین امنوا کی ندا سے خطاب کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل پیرا ہوتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں۔ بہت سی جگہوں پر ان کنتم مومنین ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے اور وہی اس کے اہل اور سزاوار ہیں۔

بدر کا تاریخی چہرہ

درمیان ہیں یوم التقی الجمعان فرما کر بدر کا تاریخی چہرہ بھی پیش کر دیا دو جماعتوں سے مراد لشکر قریش اور مسلمانوں کی جماعت مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ اور مشرکین کے لشکر کی تعداد ۹۵۰ تھی۔

اہل ایمان کی اس تعداد ۳۱۳ میں بھی بڑی دلآویزی ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں حجۃ الوداع میں صحابہ کی تعداد ایک لاکھ ۲۲ ہزار بتائی ہے حضور اقدس ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں انبیاء کی تعداد بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی ہے اور ان میں اولوالعزم الرسل کی ۳۱۳ بتائی ہے۔ دونوں کا موازنہ کر کے دیکھو تو صحابہ کا مقام بالعموم اور اصحاب بدر کا مقام بالخصوص واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ ان دونوں جماعتوں کا باہم مقابلہ بدر پر ہوا۔ جمعہ کا دن، ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ تھی۔

جنگِ بدر کی جغرافیائی حیثیت

(۵۵) یہ وہ دن تھا کہ تم ادھر قریب کے ناکے پر تھے اور وہ یعنی دشمن دور کے ناکے پر تھا ـــــ اور قافلہ تم سے نچلے پر یعنی سمندر کے کنارے پر تھا۔ ورلے کنارے سے مراد میدانِ جنگ کی وہ جانب ہے جو مدینہ طیبہ سے قریب تھی اسی طرح پرلا کنارا وہ ہوگا جو مدینے سے بعید تھا اور نیچے یعنی ابو سفیان کا تجارتی قافلہ نیچے کی طرف ہٹ کر سمندر کے کنارے کنارے جا رہا تھا قافلہ اور مسلمانوں کے درمیان قریش کی فوج تھی[1]۔ یہ جنگِ بدر کا جغرافیہ بتایا ہے یمن سے شام تک ایک تجارتی شاہراہ تھی۔ تجارتی شاہراہ بدر سے گذر کر شام جاتی تھی اسی تجارتی شاہراہ پر جہاں بدر واقع تھا بدر کی حدود سے ذرا پہلے شمال و مغرب کی سمت ہیں شام کی جانب مدینے سے قریب ایک پہاڑی تھی جسے قرآن نے العدوۃ الدنیا کہا ہے۔ دوسری پہاڑی مدینے سے دور جنوب مشرق میں تھی جسے یہاں العدوۃ القصوی کہا ہے۔ اور تجارتی شاہراہ سے تین میل کے فاصلہ پر بحر احمر کا کنارہ تھا وہ تجارتی قافلہ جس کے تعاقب میں مسلمان مدینے سے چلے تھے اس تجارتی شاہراہ سے ہٹ کر مسلمانوں سے بچتا ہوا سمندر کے کنارے کنارے جا رہا تھا اسی کو یہاں قرآن نے الرکب اسفل منکم کہا ہے مکہ والوں کا خاص پیشہ تجارت تھا ان کے تجارتی قافلے شمال ہیں شام اور جنوب میں یمن سے تجارت کے لیے جاتے

[1] افادات شیخ الاسلام

تھے ان قافلوں کا راستہ بحر احمر کے کنارے کنارے مدینے کے پاس سے ہو کر گذرتا تھا۔ اس لحاظ سے مدینہ کو اس راہ پر ایک بہت ہی اہم چوکی کی حیثیت حاصل تھی۔ شعبان ۲ھ فروری یا مارچ ۶۲۳ء میں قریش کا ایک بہت بڑا قافلہ جس کے ساتھ تقریباً پچاس ہزار پونڈ کا مال تھا اور محافظ چالیس پچاس سے زائد نہ تھے۔ قافلے کا پس منظر تھا کہ اس کی آمدنی سے اسلحہ خرید کر مدینہ پر حملہ کیا جائے گا۔ حملہ کے لیے سب سے بڑی ضروری چیز مصارف جنگ کا بندوبست تھا اس لیے اس بار قریش کا جو کارواں تجارت شام کو روانہ ہوا وہ اس شان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی سب کی سب دے دی۔ ابن سعد نے ابوسفیان کی یہ بات لکھی بخدا مکہ میں کوئی قریشی مرد و عورت نہ تھا جس کی رقم ہمیں نہ ملی ہو ہمارے مورخین کو اسباب و نتائج کی جستجو نہیں ہوتی۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ اہل مکہ کو سارا سرمایہ تجارت میں لگانے کی ضرورت اس کے سوا کیا تھی کہ اس سرمائے سے جنگ کی تیاری کر کے مدینہ پر حملہ کیا جائے اور ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ یہی تجارتی قافلہ شام سے سامان تجارت لے کر واپس آرہا ہے۔ اسی کی روانگی کی خبر مدینہ میں حضور کو ہوئی تھی کہ قریش کی ایک جماعت مال تجارت لے کر شام جانے کے لیے مکہ سے روانہ ہو چکی ہے۔ اس کی تلاش میں آپ نکلے۔ ینبع کے قریب ایک مقام تک تشریف لے گئے جس کا نام ذی العشیرہ ہے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کئی روز پہلے یہ قافلہ یہاں سے روانہ ہو گیا۔ یہی جماعت جب شام سے سامان تجارت لے کر واپس آرہی تھی تو پھر آپ کو اطلاع ملی کہ قافلہ واپس آرہا ہے یہی قافلہ، ا رمضان ۲ھ مطابق مارچ، اپریل ۶۲۳ء سے پہلے کسی تاریخ میں بدر سے گذر رہا تھا اس کی آمد کی آپ کو اطلاع ہوئی۔ آپ اسی کو روکنے کے لیے مدینے سے بغیر جنگ کی تیاری کے ۳۱۳ سپاہیوں کو لے کر بدر کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن منظور الٰہی کچھ اور تھا۔ بدر میں آپ پہنچے تو آپ کے سامنے مشرکین کی فوج تھی۔ یعنی قافلہ اور آپ کے درمیان مشرکین کی فوج حائل تھی۔ آپ اور مشرکین کی فوج بالائی حصہ پر اور پہاڑوں کے درمیان وادی میں جبکہ قافلہ وادی سے دور ساحل کے قریب کے نیچے حصے سے گذر رہا تھا۔ سوچئے کہ اگر آپ قافلہ کے ارادے سے مدینے سے نہیں آرہے تھے تو قرآن کو یہاں قافلہ کا تذکرہ کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ قرآن یہاں تیسری بار قافلہ کا ذکر کر رہا ہے۔ پہلا موقعہ وہ ہے جب قرآن نے یہ بتایا کہ اذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین مسلمانو اللہ تم سے دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کرتا ہے۔ یہاں دو جماعتوں سے ایک تجارتی قافلہ، دوسرے مشرکین کی فوج مراد ہے دوسرا موقعہ وہ ہے جب قرآن نے یہ انکشاف کیا۔ وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم اور تمہارا پیش نہاد یہ تھا کہ تجارتی قافلہ تمہیں مل جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ مدینے سے قافلہ تجارت کے لیے نہیں نکلے تھے تو ان کی یہ خواہش کیسے اور کیوں ہوئی۔

یہ تیسرا موقعہ ہے کہ قرآن بتا رہا ہے کہ یہی قافلہ جس کے تعاقب کے لیے مدینے سے آئے تھے تمہارے سامنے وادی

کے زیریں حصے سے گذر رہا تھا۔ ان تینوں کو ملا کر اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مدینے سے نکلتے وقت صرف قافلہ پیشِ نظر تھا۔ جب فوج کی موجودگی کی ذفران میں جا کر اطلاع ملی تو اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ دونوں موجود ہیں ایک تمہیں ضرور ملے گا۔ اس وعدہ پر طبعی طور پر اور حالات کے پیشِ نظر سب کی خواہش یہی تھی کہ تجارتی قافلہ ملے لیکن حق کو حق کرنے کے لیے منظورِ الٰہی کچھ اور تھا۔

تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم ویرید اللہ ان یحق الحق

اب واقعہ کی نوعیت پر غور کر و واقعہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ مدینہ سے ۳۱۳ کی مختصر سی جماعت لے کر تجارتی قافلہ کو روکنے کے لیے نکلے۔ اگر مدینہ ہی سے جنگ کے لیے نکلے ہوتے تو قرآن یہ نہ کہتا کہ کما اخرجک ربک۔ تیرے رب نے تجھے نکالا یعنی جنگ کی خاطر تیرا نکلنا نہ تھا بلکہ تیرے ارادے کے بغیر تیرے رب نے تجھے نکالا۔ اگر مدینے سے جنگ کے لیے نکلتے تو تعبیر یہ ہوتی کما خرجت من بیتک۔ تو اپنے گھر سے نکلا۔ آیت میں الحق سے مراد امر واقعہ جنگ ہے۔ مدینے سے روانہ ہو کر جب ذفران میں پہنچے تو آپ کو معلوم ہوا کہ قافلہ تجارت کی حفاظت کے لیے قریش کا مسلح لشکر بھی ہے۔ اب صورتحال بالکل واضح تھی کہ تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لیے مشرکین کی فوج سامنے کھڑی ہے۔ اسی کو قرآن نے بعد ما تبین (باوجودیکہ معاملہ واضح تھا) سے بتایا ہے اگر مدینہ سے ہی جنگ کی تیاری کر کے نکلتے تو کسی کے ناگوار ناپسند ہونے کا سوال ہی نہ ہوتا۔ ناگواری اور ناپسندیدگی کا اظہار اگر کچھ نے کیا ہے تو صرف اس لیے کیا ہے کہ مدینے سے جنگ کی تیاری کر کے نہیں آئے تھے۔ اور یہ ناگواری ظاہر کرنے والے منافقین نہیں بلکہ سچے اور پکے مومن تھے قرآن نے خود ان کو المومنین کہا ہے۔ ان فریقا من المومنین لکارھون

ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے۔

جب ہم نے ایک دو روز کی مسافت طے کر لی تو حضور ﷺ نے فرمایا بتاؤ جنگ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ہم نے جواب میں عرض کیا کہ مالنا طاقۃ بقتال القوم ہم میں جنگ کی طاقت نہیں ہے۔ ہم تو قافلہ کے ارادے سے آئے تھے۔

قرآن بھی یہی کہتا ہے اور سب کے بارے میں کہتا ہے تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم تم سب کی خواہش یہ تھی کہ تجارتی قافلہ ملے۔

یہ کہنا بھی بے جان ہے کہ وان فریقا من المومنین میں واو حالیہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ کراہت اس وقت ہوئی جب حضور ﷺ مدینے سے نکل آئے تھے۔ قاضی بیضاوی نے اگرچہ یہی بات لکھی ہے لیکن اس موضوع پر محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ استیناف بیانی ہے اور اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب حضور اقدس

خود جنگ کے لیے نہیں نکلے بلکہ آپ کو اللہ نے نکالا ہے تو پھر مسلمانوں کا کیا حال تھا فرمایا کہ ان میں ایک مختصر سی جماعت لڑائی کو پسند نہ کرتی تھی اور لڑائی کے موضوع پر حضور اقدس ﷺ سے مبادلہ کر رہی تھی بتایا یہ ہے کہ جنگ کی صورت میں جو کچھ بھی پیش آیا ہے اس کا عالمِ مادی اور عالمِ اسباب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا ہے عالم غیب میں فیصلے کے مطابق ہوا ہے نہ پیغمبر خود نکلے اور نہ صحابہ جنگ کے لیے تیار تھے۔ نہ ان کے پاس افرادی قوت تھی اور نہ سامانِ جنگ تھا اور نہ ان کا جنگ کا کوئی ارادہ تھا۔ یہ سب کچھ اللہ سبحانہ نے اپنی قدرتِ غیبیہ سے کیا ہے۔

بہرحال یہاں " الرکب اسفل منکم" لا کر قرآن نے اشارا کر دیا کہ تم جس کے تعاقب میں مدینے سے نکلے تھے وہ تم سے دور زیرین حصے سے گذر رہا تھا۔ اور تمہیں اپنی توقعات کے خلاف فوج سے مقابلہ کرنا پڑا۔

جنگ کا وقت مقرر نہ تھا

(۵۶) اور اگر تم نے باہم مقابلہ کا وعدہ کیا ہوتا تو ضرور تم جنگ سے پہلو تہی کرتے یعنی اگر فریقین پہلے سے لڑائی کا کوئی وقت ٹھہرا کر جانا چاہتے تو ممکن تھا کہ اس میں اختلاف ہو جاتا یا وعدہ کے وقت پہنچنے میں ایک فریق پس و پیش کرتا کیوں کہ ادھر مسلمان کفار کی تعداد اور ظاہری ساز و سامان سے خائف تھے۔ ادھر کفار مسلمانوں کی حقانیت خدا پرستی اور بے جگری سے مرعوب رہتے تھے دونوں کو جنگ کی ذمہ داری لینے یا شرکت کرنے میں تردد ہو سکتا تھا[1] مطلب یہ ہے کہ عام دستور اور معمول تو یہ ہے کہ مقابلہ کے لیے فریقین اپنے ارادے اور مرضی سے جنگ کا میدان اور تاریخ مقرر کرتے ہیں۔ لیکن بدر میں ایسا نہیں ہوا نہ مسلمان مدینے سے جنگ کے لیے نکلے اور نہ مشرکین مکہ سے اس ارادہ سے آئے۔ مسلمانوں کا ارادہ تجارتی قافلہ کو روکنا تھا اور مشرکین کا خیال تجارتی قافلہ کی حفاظت تھی۔ یہ آیت اس بات میں قاطع ہے کہ مسلمان مدینہ سے جنگ کے ارادے سے نہیں آئے تھے اس کی تائید صحیح مسلم کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت کعبؓ کے حوالہ سے آئی ہے۔

حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا سوائے غزوۂ تبوک کے۔ اور ہاں غزوہ بدر میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس پر کسی کو کوئی عتاب نہیں ہوا۔ کیوں کہ ادھر حضور اقدس ﷺ جنگ کے لیے نہیں بلکہ تجارتی قافلہ کے لیے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اتفاقیہ آپ کی قریش سے مڈبھیڑ کرادی۔

اگر قریش کی فوج تجارتی قافلہ کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ جنگ کے لیے آتی تو قرآن یہ کیوں کہتا ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آیئے یہاں علامہ زمخشری کی زبانی ایک سوال کا جواب بھی گوش گذار فرمایئے۔

سوال یہ ہے کہ قرآن نے میدانِ جنگ کا جغرافیائی مقام اور جنگ کا توقیتی نقشہ کیوں پیش کیا ہے یہ کیوں بتایا ہے کہ بدر کی جنگ کسی پیشگی وقت کی تعیین کے بغیر پیش آئی جانبین سے اس سلسلے میں پہلے کچھ فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اور یہ کیوں انکشاف کیا ہے کہ دونوں جماعتوں کے میدانِ بدر میں تیامگاہ وادی کے دو کنارے تھے ایک کنارہ مدینے سے قریب دوسرا مدینے سے دُور تھا —— اور قافلہ تجارت وادی بدر سے تین میل دور نظر بچاکر جا رہا تھا۔

دراصل قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ مشرکین کے پاس عددی طاقت تھی۔ ان کو شوکت بھی حاصل تھی۔ اور کامیابی اور غلبہ کے سارے مادی وسائل ان کے ہمرکاب تھے۔ ادھر مسلمانوں کے پاس نہ عددی طاقت تھی نہ ان کو کوئی شوکت حاصل تھی۔ ان کے حالات ہر طرح سے بہت بڑی ابتری کا شکار تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کی کامیابی کا باعث مادی قطعاً نہیں بلکہ یہ محض اللہ سبحانہ کی قدرت کی کارسازی ہے جس نے میدانِ بدر میں مسلمانوں کو فتح سے ہمدوش کیا۔ سوچیئے وادی کا وہ کنارہ جہاں مشرکین نے قبضہ جمایا تھا وہاں پانی موجود تھا۔ زمین بھی پختہ تھی۔ برخلاف اس کنارے کے جہاں مسلمانوں نے ڈیرا لگایا تھا وہاں پانی نہ تھا اور زمین بھی ایسی ریتلی جہاں پاؤں دھنس جائیں آدمی بے تکلف چل بھی نہ سکے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ دشمن کی پشت پر پورے سازوسامان کے ساتھ تجارتی قافلہ تھا۔ عددی طاقت ان کی پہلے بھی زیادہ تھی۔ قافلہ کی پشت پناہی ان کے حوصلے اور بلند کررہی تھی۔ اور قافلہ کے بچاؤ کا احساس ان میں دلیری اور شجاعت فراہم کررہا تھا۔ ان حالات میں دونوں جماعتوں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان جنگ ہوئی اور نتیجہ میں حالات کی ناسازگاری اور واقعات کی ناہمواری کے باوجود اہلِ ایمان کامیابی اور فتح مندی سے ہمدوش ہوئے۔ کیوں ہوئے اور کیسے ہوئے۔ ذہن میں اٹھے ہوئے اس سوال کا جواب آگے ارشاد ہوا ہے۔

اللہ سبحانہ کی مخفی تدبیر کی کرشمہ سازی

(۵۷) لیکن جو صورتحال پیش آئی صرف اس لیے آئی کہ جو کچھ اللہ نے فیصلہ کرلیا تھا اس کا ظہور ہو جائے اور اس لیے کہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ حجت پوری ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ اتمامِ حجت کے بعد زندہ رہے اور بلاشبہ اللہ سب کچھ سننے والا ہے اور جاننے والا ہے۔ یعنی قریش قافلہ کی مدد کو آئے تھے اور تم قافلہ پر حملہ کرنے والے قافلہ بچ گیا اور دونوں فوجیں ایک میدان کے دو کناروں پر آپڑیں۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ یہ تدبیر اللہ کی تھی۔ اگر تم قصداً جاتے تو ایسا بروقت نہ پہنچتے۔ اور اس فتح کے بعد صداقتِ نبوت کھل کر سامنے آگئی۔ جو مرا وہ بھی یقین جان کر مرا۔ اور جو جیتا رہا وہ بھی حق پہچان کر تاکہ اللہ کا الزام پورا ہو کذا فی الموضح۔ اور ممکن ہے مرنے اور جینے سے کفر وایمان مراد ہوں۔ یعنی اب جو ایمان لائے

اور جو کفر پر جا رہے ۔ دونوں کا ایمان و کفر وضوح حق کے بعد ہو۔ ؎

آغاز میں اللہ سبحانہ نے اسی سورت میں بدر کی جنگ کی فلاسفی یہ بتائی تھی کہ لیحق اللہ الحق یعنی اللہ سبحانہ چاہتا ہے کہ حق کو اپنی باتوں سے مستحکم کردے۔ اور یہاں ابھی فرمایا تھا کہ یہ حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کا دن ہے یوم الفرقان اور اب آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ یقضی اللہ امرا کان مفعولا۔ تاکہ اللہ سبحانہ اس کام کو پورا کردے جسے ہونا رہنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کو یہ جنگ اس لیے منظور ہوئی کہ اس سے اسلام کا حق ہونا علی رؤس الاشہاد ظاہر ہو جائے اور دنیا دیکھ لے کہ اس قلتِ عدد، بے سروسامانی اور جنگ کے لیے نہ نکلنے کے باوجود اہلِ ایمان غالب آگئے۔ یہ ایک اعجازی کارنامہ ہے۔ دراصل حضور اقدس ﷺ نے قریش کے لیے اسی قسم کی بددعا مانگی تھی جیسی حضرت نوح علیہ السلام نے ——— طوفان سے پہلے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غرق سے پہلے اپنی اپنی قوم کے لیے دعا مانگی تھی حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ خداوندا اب زمین پر کوئی کافر جینے والا نہ چھوڑ۔ جب تک وہ زندہ رہیں گے تیرے نام کی تقدیس نہ ہوگی نہ ان کی نسل سے کوئی تیرا نام لینے والا پیدا ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا خداوندا ان کے دل سخت کردیئے کہ جب تک عذاب دیکھ لیں ایمان نہ لائیں گے۔ لیکن اس موقعہ پر حضور اقدس ﷺ کی زبان سے جو فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ:

خداوندا اپنا وعدہ پورا کر، اگر یہ مٹھی بھر مسلمان تباہ ہو گئے تو پھر تیرا کوئی نام لینے والا نہ ملے گا۔

حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے براہ راست اپنی قوم کی تباہی کی دعا مانگی لیکن حضور اقدس ﷺ نے جب بھی دعا مانگی تو صرف اہل اسلام کی فتح و نصرت کی۔ دشمنوں کی تباہی و بربادی کی نہیں۔ بہرحال بدر کی جنگ کی صورت میں حضور اقدس ﷺ کی دعا قبول ہوئی اور سب خارق عادت کے طور پر عالمِ غیب سے ظہور قدرت کی صورت میں ہوا۔ قرآن بدر کے موضوع پر کمال اختصار سے اس چیز کو بتا رہا ہے۔ کہ جو کچھ ہوا ہے یہ اعجاز ہے۔ اس کا مادی عالم سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بلکہ عالمِ غیب کے طے شدہ فیصلہ کے مطابق ہوا ہے۔ مفاتیح الغیب میں امام رازیؒ کی نگاہ اس نکتہ پر پہنچی ہے۔ فرماتے ہیں یہ حضور اقدس ﷺ کا سب سے بڑا اعجاز ہے جو لوگ بدر کی کامیابی میں مادی اسباب تلاش کرتے ہیں وہ روح قرآن سے بے خبر ہیں۔ واقعہ کے آغاز سے انجام تک قرآن نے جو تصویر پیش کی ہے اس کا بغور مطالعہ کرو۔ قرآن بتا رہا ہے کہ:

۱۔ حضور اقدس ﷺ بدر کی جنگ کے لیے خود نہیں آئے بلکہ اللہ لے کر آیا ہے۔

۲۔ ایک جماعت جنگ نہیں چاہتی تھی۔

۳۔ سب کو ان کی مرضی کے خلاف موت کے منہ لے جایا جا رہا تھا۔

؎ افادات شیخ الاسلام

۴۔ سب کا مطمح نظر تجارتی قافلہ تھا۔
۵۔ عددی طاقت موجود نہ تھی۔
۶۔ مادی وسائل ناپید تھے ہتھیار تک نہ تھے۔
۷۔ ساری کمزوریوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں زمین ریتلی تھی پانی نہ تھا۔

ان حالات میں انعامات یہ ہوئے۔

۱۔ عددی طاقت کی کمی کو فرشتوں سے پورا کیا گیا۔
۲۔ لڑائی کی رات میں سُلا کر دلوں میں اطمینان پیدا کیا گیا۔
۳۔ بارش کے ذریعے ریتلی زمین کو چلنے کے قابل بنا دیا اور پینے کے لیے پانی دیا۔
۴۔ دلوں کی ڈھارس بندھائی۔
۵۔ قدموں میں جماؤ پیدا کیا۔
۶۔ کافروں کے دل میں رعب ڈالا۔
۷۔ نبوت کی مُشتِ خاک کو دشمن کی آنکھوں تک پہنچایا۔

لڑائی ہوئی ـــــ اور نتیجہ یہ کہ مسلمانوں کے دس آدمی شہید ہوئے اور دشمن کے ستر آدمی مارے گئے اور اتنے ہی قید ہوئے۔ فرمائیے یہ اللہ کی مدد اور نبوت کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔ اس میں زندہ معجزہ کے بعد ایمان والے کا ایمان وضوحِ حق کے بعد ہوگا اور کافر کا کفر بھی حق کے نمایاں ہونے کے بعد ہوگا۔ اللہ کی حجت پوری ہوگئی ہے۔ صاحب نظام الفرقان نے یہاں یہ بات پتے کی لکھی ہے کہ ؛

میں اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اللہ سبحانہ کے کام معلل بالحکم والمقاصد والغایات ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات اشاعرہ نہیں مانتے ہیں۔

خواب میں کُفّار کا کم دیکھنا

(۵۸) اور اے پیغمبر یہ وہ دن تھا کہ اللہ سبحانہ نے آپ کو خواب میں ان کی تعداد تھوڑی کر کے دکھائی۔ اور اگر آپ کو خواب میں اللہ سبحانہ ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو مسلمانو تم ضرور ہمت چھوڑ بیٹھتے۔ اور اس معاملہ میں باہم اُلجھ جاتے۔ لیکن اللہ سبحانہ نے تمہیں اس سے بچا لیا یقین کرو کہ اللہ سینہ کے چھپے رازوں کو جانتا ہے۔ یعنی ان کو زیادہ سمجھ کر کوئی لڑنے کی ہمت کرتا کوئی نہ کرتا اس طرح اختلاف ہو کر کام کھنڈت میں پڑ جاتا۔ لیکن اللہ سبحانہ نے حضور اقدس ﷺ کو خواب میں تھوڑی تعداد

دکھا کر اس بزدلی اور نزاع سے بچا لیا وہ خوب جانتا ہے کہ کس چیز سے دلوں میں جرأت و شجاعت پیدا ہوتی ہے اور کس بات سے جبن و نامردی [1]

بدر کی جنگ چونکہ اسلام کی ہمیشہ کے لیے موت و حیات کی ساعت تھی اس لیے کارساز قدرت نے اپنی عجیب عجیب نشانیوں سے حق کو فتح اور باطل کو شکست دی۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ بدر سے پہلے آنحضرت کو اس معرکہ کا نقشہ عالم رویا میں دکھایا گیا تھا اور اس میں کفار کی تعداد بہت کم دکھائی گئی تھی۔ یہ ان کی ذلت اور شکست کی طرف اشارا تھا۔ مسلمانوں نے جب یہ خواب سنا تو ان کو ہمت ہوئی۔ اگر عالم رویا میں کفار کی کثرت دکھائی جاتی تو ان کے حوصلے پست ہو جاتے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ حضور اقدس نے یہ خواب کب دیکھا تھا عام شارحین قرآن نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ علامہ رشید رضا اس موقعہ پر یہ کہہ کر آگے نکل گئے کہ؛

یہ عجیب بات ہے کہ حدیث کے مشہور ذخیرے میں اس خواب کے موضوع پر کوئی حدیث نہیں ہے۔

حافظ ابن کثیر نے صرف امام مجاہد کا آغاز میں جو قول نقل کیا ہے اس میں بھی اس کی نشاندہی نہیں ہے۔ البتہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بغیر کسی روایتی سہارے کے یہ انکشاف کیا ہے کہ؛

> بدر کے دن حضور اقدس ﷺ نے لڑائی کے آغاز سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا کہ میری اجازت کے بغیر جنگ نہ کرنا۔ اگر دشمن تمہارے قریب آ جائے تو تیر اندازی کرنا۔ تلوار نہ اٹھانا یہ فرما کر آپ محو خواب ہو گئے تھوڑے عرصے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ یارسول اللہ ﷺ دشمن قریب ہو گیا اور ہم تک پہنچ گیا۔ آپ بیدار ہوئے۔ اور دیکھا ہوا خواب آپ نے لوگوں کو سنایا۔

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کو خواب میں کافر تھوڑے نظر آئے۔ پیغمبر کا خواب غلط نہیں چونکہ ان میں آخر تک کفر پر قائم رہنے والے تھوڑے ہی تھے اکثریت ان کی تھی جو بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے اس لیے حضور کو خواب میں کافر تھوڑے دکھائے گئے بس پیغمبر کا خواب حق ہے۔ اور کچھ کا کہنا ہے کہ خواب میں کبھی کوئی حقیقت مجاز کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کسی چیز کے ظاہر کے بجائے اس کی معنوی حقیقت بتائی جاتی ہے۔ یہاں یہی صورت ہے کفار کی فوج تعداد میں اگرچہ بہت زیادہ تھی لیکن معنوی اور اخلاقی اعتبار سے اس کی حیثیت بہت کم تھی۔ ان کی یہی معنوی قلت خواب میں قلتِ تعداد کی صورت میں دکھائی گئی۔ اسی لحاظ سے خواب میں تاویل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں قرآن نے لفظ قلیل بولا ہے اور معلوم ہے کہ یہ لفظ صرف عددی قلت کے لیے نہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

آتا ہے بلکہ بے حقیقت اور بے وزن کے معنے میں بھی آتا۔ ایک بہت مشہور شعر ہے۔

فان الك فی شرارکم قلیلاً　　　　نانی فی خیارکم کثیر

کثرت وقلّت تعداد کا نظارہ

(۵۹) اور یہ بات بھی غور کی ہے کہ عین مقابلہ کے وقت میں اللہ ان کو تمہاری نظروں میں تھوڑا اور تمہیں ان کی نظروں میں تھوڑا کر کے دکھا رہا تھا . . . . یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ جس بات کا اللہ نے فیصلہ کر لیا ہے اسے کر دکھائے۔ سارے کاموں کا دارومدار اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی سے ہے پیغمبر کو خواب میں کافر۔ اور مسلمانوں کو عین میدانِ جنگ میں تھوڑے دکھائی دیئے تاکہ مسلمان جرأت سے لڑیں اور پیغمبر کے خواب کی تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تھوڑی تعداد سے مقصود ان کی مغلوبیت ہو۔ باقی کفار کی نظر میں جو مسلمان تھوڑے دکھائی دیئے تو وہ واقعی تھوڑے تھے۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب دونوں فوجیں اول آمنے سامنے ہوئیں۔ پھر جب مسلمانوں نے دلیرانہ حملے کئے اور فرشتوں کا لشکر مدد کو پہنچ گیا اس وقت کفار کو مسلمان دگنے نظر آنے لگے۔ کمافی آلِ عمران واخری کافرۃ یرونھم مثلیھم رای العین [1] مطلب یہ ہے کہ دشمنوں کو تمہاری آنکھوں میں تھوڑا کر کے اس لیے دکھایا تاکہ حضور اقدس ﷺ نے جو خواب دیکھا تھا بیداری میں اس کا مشاہدہ ہو جائے اور تمہارا یقین، تمہارا حوصلہ اور ہمت بڑھ جائے چنانچہ جب مسلمان اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے سامنے آئے اور دونوں جماعتیں مدمقابل ہوئیں تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے پاس والے شخص سے کہنے لگے کہ غالباً یہ سارے ستر ہوں گے اس نے کہا کہ میرے خیال میں سو ہوں گے حالانکہ سُن آئے ہو کہ کافروں کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کا بددل ہونا لازمی تھا۔ اللہ سبحانہٗ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کر دیا کہ کافر مسلمانوں کو تھوڑے نظر آنے لگے۔ دوسری طرف ویقللکم فی اعینھم۔ کفار کو مسلمان تھوڑے نظر آنے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ رؤسائے کفار میدان سے بھاگ کر جانیں بچا کر نہ جانے پائیں۔ اس کی یہ تدبیر کی کہ مسلمان اصل تعداد سے بھی ان کو کم نظر آنے لگے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی فتح کو یقینی سمجھ کر حصولِ نتیجہ کے لیے نہ تو سرفروشانہ کوشش کی اور نہ بھاگنے کی کوئی ضرورت محسوس کی اور یہی بات مسلمانوں کے حق میں مفید ہو گئی پہلے تو اللہ سبحانہٗ نے کافروں کی نگاہ میں مسلمانوں کو کم کر کے دکھایا تاکہ کفار بے پروا ہو کر لڑ پڑیں پھر جب میدانِ جنگ میں دونوں جماعتوں میں گتھم گتھا ہو گئی تو اللہ سبحانہٗ کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کی نگاہ میں ان کی اپنی تعداد سے دونی نظر آنے لگی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ قریش نے ڈر کر ہمت ہار دی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تیسرے پارے میں اس پر تفصیل تبصرہ لکھ چکے ہیں۔ واخریٰ کافرۃ یرونھم مثلیھم رای العین آخر میں فرمایا لیقضی اللّٰہ امراً کان مفعولاً۔ تاکہ اللہ اس کام کو پورا کرے جو اس کے علم میں ہوا ہوا تھا۔ یعنی اللہ نے اپنی قدرت سے یہ کرشمہ اس لیے ظاہر کیا تاکہ اسلام کی حقانیت اور صداقت اور کفر کا باطل ہونا کھل کر سامنے آجائے۔ اور یہ جملہ بظاہر مکرر ہے لیکن بغور مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تکرار میں گہری معنویت ہے۔ پہلی آیت میں یہ فقرہ مومنوں کے کافروں پر فتح اور غلبہ پانے کی علت بن کر آیا تھا اور یہاں ایک جماعت کو دوسری جماعت کی نظروں میں کم دکھلانے کی علت بن کر آیا ہے۔

ذرا ٹھہر جائیے اور بدر کے میدان میں جو کچھ ہوا اس پر غور کیجئے۔ پہلے فرمایا تھا۔ لیحق اللّٰہ الحق ویبطل الباطل، پھر فرمایا لیقضی اللّٰہ امراً کان مفعولاً۔ اب تیسری بار فرمایا لیقضی اللّٰہ امراً کان مفعولاً والی اللّٰہ ترجع الامور۔ ان میں بار بار اور تکرار یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ بدر کی جنگ قومی برتری۔ ملک گیری، معاشی خوشحالی کی جنگ نہیں تھی بلکہ یہ صرف حق کی برتری کی جنگ تھا۔ حق کے علم برداروں کے پاس نہ افرادی قوت تھی نہ ساز و سامان جنگ تھا نہ وہ مادی وسائل سے ہم دوش تھے نہ ان میں مقابلہ کی طاقت تھی اور نہ وہ اپنی کمزوریوں کے پیش نظر جنگ کے لیے تیار تھے اور نہ وہ جنگ کی خاطر گھر سے آئے تھے۔ بس اللہ نے نبوت کی صداقت کو بتانے کے لیے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ان اہل ایمان کے ناتواں ہاتھوں، کمزور جسموں بھوکے اور نتنے نفوس کے ذریعہ دنیا میں حق کا بول بالا ہو جائے اور لوگوں پر واضح ہو جائے کہ حق کیا ہے۔ یہ کچھ اسباب کے تحت نہیں ہوا بلکہ اللہ سبحانہ نے اپنی قدرت کے ذریعے اسباب و حالات کے خلاف اہل ایمان کو کامیابی عطا فرمائی۔ اسی بات کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن نے اسی سورت میں تعبیرات اختیار کی ہیں اسے یوں سمجھئے کہ قرآن نے بدر میں صحابہ کی کامیابی سے اپنے مخاطبوں کو یہ تاثر دیا ہے کہ اگر مومنین صالحین کی ایک جماعت خالصتہً روحانی اخلاقی مقاصد کے لیے نظام حق کے قیام کی جدوجہد کر رہی ہو تو اس کی کامیابی یقینی ہے اور محض طبعی اسباب و عوامل یا مادی ساز و سامان اس کی کامیابی یا ناکامی پر اثر انداز نہ ہوں گے۔ بتانا یہ ہے کہ اگر کوئی گروہ ایمان و عمل صالح کے مقتضیات کو پورا کرے اور اپنی طرف سے سعی و تدبیر کی کوئی کوتاہی نہ کرے تو اس کی کامیابی محض اسی بنا پر مشتبہ نہ ہوگی کہ اسباب مادی یا کثرت تعداد کے لحاظ سے متقابل جماعتیں اس پر فوقیت رکھتی ہیں بلکہ متقابل قوتیں کتنی ہی زبردست الآت و اسباب سے مسلح ہوں کامیابی بہر حال اسی گروہ کی ہوگی جو اپنے قومی طبقات اور دنیوی مفادات کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی خاطر عالم انسانی کی فلاح کے لیے مصروف جدوجہد ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات عالم اپنے ظاہری طبعی وجود کے باوصف بالآخر روحانی قوانین کی محکوم ہے اور اس کی فطرت انسان کے اخلاقی تقاضوں اور روحانی مطالبات سے ہم آہنگ ہے اس لیے اس میں جو ظاہری اور مخفی قوتیں کارفرما ہیں وہ سب اس کی منتظر رہتی ہیں کہ کوئی گروہ انسانیت کے اخلاقی جذبات اور روحانی اُمنگوں کو لے کر عرصہ وجود پر نمودار

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی میں رہے تا آنکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بات واضح طور پر ثابت ہو گئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جزیرہ عرب میں دو دین اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ حضرت عمرؓ نے یہ ثابت ہو جانے کے بعد اعلان کیا جس کے پاس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی عہد نامہ ہو اسے وہ پیش کرنا چاہیے تاکہ اس کو نافذ کیا جا سکے ورنہ میں تمہیں ملک بدر کروں گا چنانچہ آپ نے ان کو ملک بدر کر دیا۔

ایک وسوسہ اور اس کا ازالہ

شائد آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ اگر علت یہی ہے کہ عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے تو اس کام کی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تکمیل کیوں نہیں کی؟

جواب یہ ہے کہ احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں ایک قسم ان احکام کی ہے جن کا تعلق افراد کی اصلاح و تزکیہ سے ہوتا ہے جیسے تمام اوامر و نواہی اور فرائض و واجبات دوسرے وہ ہیں جن کا تعلق افراد سے نہیں بلکہ امت کے قومی اور اجتماعی فرائض اور ملکی سیاسیات سے ہوتا ہے جیسے قوانین سیاسیہ اور فتح ممالک۔

سنت الٰہی یوں ہے کہ پہلی قسم کے احکام خود شارع کی زندگی ہی میں تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں اور وہ ان کی تکمیل کا اعلان کر کے دنیا سے جاتے ہیں لیکن دوسری قسم کے لئے ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ان کے نفاذ و وقوع کے لیے ایک خاص وقت مطلوب ہوتا ہے اور وہ شارع کے بعد بتدریج تکمیل و تنفیذ پاتے ہیں۔ پس ان کی نسبت یا تو بطور پیشین گوئی بتایا جاتا ہے یا اپنے جانشینوں کو وصیت کر دی جاتی ہے۔

یہ جلا وطنی کا مسئلہ اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ضروری نہ تھا کہ اس کا پورا پورا نفاذ خود حضور کی حیات مقدسہ میں ہو جاتا۔ آپ نے یہود کے اخراج سے عملاً نفاذ شروع کر دیا تھا۔ یہود خیبر سے آغاز ہی میں معاملہ کر لیا تھا کہ جب ضرورت ہو گی یہاں سے جلا وطن کر دیئے جاؤ گے۔ پھر اسی منصوبہ کی تکمیل کی اپنے جانشینوں کو وصیت کر دی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس کی تکمیل کا وقت آگیا۔ اور یہود خیبر نے اپنی شرارتوں سے خود ہی اس کا موقع فراہم کر دیا۔

ایک اور شبہ کا ازالہ

شاید آپ چبھن محسوس کریں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل خیبر کی شرارتوں اور واقعہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے ایسا کیوں نہیں کیا۔

بات ٹھیک ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تنفیذ وصیت سے پہلے تنفیذ وصیت پر تمکین حاصل ہونا ضروری ہے۔ حالات

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

اے امانتِ ایمان کے علمبردارو جب تمہارا کسی فوج سے آمنا سامنا ہو تو تم ثابت قدم رہو۔ اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ کامیابی سے تم ہمدوش ہو۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول کی۔ اور باہم نہ جھگڑو۔ (ایسا کرو گے) تو تم کمزور ہو جاؤ گے اور دُنیا میں تمہاری ہَوا اُکھڑ جائے گی۔ اور ڈٹے رہو اللہ سبحانہ ڈٹنے والوں کے ساتھ ہے۔

ہو تو وہ اس کی طرف دستِ تعاون دراز کرے۔ لیکن جب باوجود انتظار و امید کے کائنات کسی ایسی جماعت سے ناامید ہو جاتی ہے تو مجبور ہو کر عالمِ انسانیت کی ان جماعتوں کے سامنے جو دنیا کی سرداری اور پیشوائی کے لیے مصروفِ کشمکش ہوتی ہیں کامل جانبداری کے ساتھ راہ کامیابی کھول دیتی ہے اور بالآخر وہی جماعت اس کشمکش میں کامران و فتح مند نکلتی ہے جو طبعی اسباب مادی وسائل اور اہلیت کار کے لحاظ سے برتر ہوتی ہے۔

آخر میں جو بات ارشاد ہوئی ہے کہ والی اللہ ترجع الامور۔ سارے کاموں کا مرجع اللہ ہی ہے۔ اسباب کی تاثیر اسی کے ہاتھ میں ہے لہٰذا اگر وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے کسی وقت اپنے پیدا کیے ہوئے اسباب کا رُخ پھیر کر کوئی کرشمہ ظاہر کر دے تو وہ نہ تو تعجب والی بات ہے اور نہ قابلِ تردد ہے۔ اسباب بالذات مؤثر نہیں بلکہ ان کی تاثیر اللہ سبحانہ کے ارادہ اور مشیت کے تابع ہے کیونکہ وہ مسبب الاسباب ہے کوئی سبب اس کے ارادہ اور مشیت سے الگ ہو کر کام نہیں کرتا۔ اس لیے بدر میں جو کچھ ہوا وہ اسباب و وسائل سے نہیں بلکہ محض اللہ کی مشیت اور قدرت سے ہوا ہے۔

جنگ میں کامیابی کا سرچشمہ

پہلے وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ و ... ن الدین کلہ للہ میں یہاں تک جہاد کرو کہ فتنہ نہ رہے

اوردین سب کا سب اللہ کا ہو جائے۔ یہ بات کھول کر بتادی تھی کہ اسلام صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ یہ زندگی کا پورا نظام ہے۔ انفرادی زندگی کا بھی اور اجتماعی کا بھی۔ یگانہ معبود کی پرستش کا بھی اور اجتماعی زندگی میں اللہ کی بندگی اس میں روح کی طمانیت کے ساتھ اخلاق کی درستگی، خاندان کی اصلاح سوسائٹی اور معاشرہ کی راست روی۔ اقتصادی اور معاشی زندگی کی ناہمواریوں کا علاج اقتدار و حکومت کا نظام اور دستور و قانون کے مسائل سب کچھ موجود ہیں۔ یہ کل کا کل اسلام ہے اور اس کل کو دنیا میں قائم کرنا اور سب پر برتر کرنا ایک مسلمان کے ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے اس راہ میں محنت کرنے، قرابت کو چھوڑنے۔ مفادات کو نظرانداز کرنے مال لٹانے اور جان کھپانے کا نام جہاد ہے۔ اس محنت میں بدر کی طرح مستقبل میں قتال کی نوبت آئے گی۔ مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس موقعہ پر کامیابی کے وسائل کیا ہیں۔ ان آیات میں قرآن ان ہی وسائل کی نشاندہی کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ یہ معاشی، وطنی، قومی جنگ نہیں ہے۔ یہ صرف دنیا سے برائی کو مٹانے اور نیکی کو قائم اور بپا کرنے کی جدوجہد ہے اس کی کامیابی کا راز صرف اس میں ہے کہ اللہ سبحانہ سے اوّلاً محبانہ تعلق ہو۔ اس کی یاد سے زبان و دل معمور ہوں۔ زندگی کے کسی گوشہ میں اللہ اور اس کے رسول کی بغاوت نہ ہو۔ باہم یک جہتی اور ہم آہنگی ہو تنازع اور افتراق نہ ہو۔ مصائب کو سہنے۔ گناہوں سے رُکنے اور عبادت پر جمنے کی روح جماعت میں بھرپور ہو۔ ان ہی وسائل پر ان آیات میں تبصرہ ہے اور مستقبل میں فلاح و کامیابی کا راز اس میں ہے۔

ثباتِ قدم اور ثباتِ قلب

(۶۰) اے امانت ایمان کے علمبردارو جب تمہارا کسی فوج سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم کامیابی سے ہمدوش ہو اس میں نماز دعا، تکبیر اور ہر قسم کا ذکر اللہ شامل ہے۔ ذکر اللہ کی تاثیر یہ ہے کہ ذاکر کا دل مضبوط اور مطمئن ہوتا ہے جس کی جہاد میں سب سے زیادہ ضرورت ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سب کا بڑا ہتھیار یہی تھا۔ والذین اٰمنوا وتطمئن قلوبھم بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب[1]۔

اس آیت میں دفاعی اصول بتائے گئے ہیں اور بتایا ہے کہ اذا لقیتم فئۃ۔ جب تمہاری کسی جماعت سے مڈبھیڑ ہو جائے۔ لقیتم کا مصدر لقاء ہے۔ اس کا بیشتر استعمال میدانِ جنگ میں فوجوں کے آمنے سامنے ہونے کے لیے ہے زمخشری نے یہی لکھا ہے کہ زیادہ استعمال یہی ہے۔ لفظ فئۃ کا بیشتر استعمال محاربین کے لیے ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ان معنی ہی میں استعمال ہوا ہے۔ قرینہ موجود ہے۔ اس لیے فئۃ کی صفت کا ذکر نہیں کیا اور اس لیے بھی بے قید رکھا ہے تاکہ باغی طبقہ بھی اس میں داخل ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تمہارا میدانِ جنگ میں دشمن کی فوجوں سے مقابلہ ہو تو جنگ میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اولین طور پر تمہاری فوج میں دو چیزیں ضروری موجود ہوں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اوّل یہ کہ جنگ ہونے کی صورت میں میدان جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی رہنی چاہیے۔ اہلِ حق کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اس ثابت قدمی کی روحانی قوت سے ہوتی ہے۔ تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدہ ہے اکثر گذرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کو شکست دے دی۔ قرآن نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جاں نثاروں کو سمجھا دیا تھا جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی زیادہ تھی میدانِ کارزار میں مسلمانوں کو حکم ہوا تھا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پرواہ نہ کریں اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے سے دوچند کا مقابلہ کریں اور ان کو یہ دعا بتائی گئی تھی ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا۔ حافظ ابن کثیر نے یہاں مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث نقل کی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے دشمن سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو۔ اللہ سے عافیت مانگو لیکن اگر مقابلہ ہو جائے تو ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو اور اللہ کو خوب یاد کرو۔ دشمن اگر شور و شغب کریں تو تم بالکل خاموشی اختیار کرو۔

دوسری بات جس کا دشمن سے مقابلہ کے وقت اہلِ ایمان کی فوج میں ہونا ضروری ہے وہ اللہ سبحانہ کا بہت ذکر ہے۔ واذکروا اللہ کثیرا قرآن نے حق سبحانہ سے بندوں کے تعلقات دو گونہ بتائے ہیں ایک اللہ سبحانہ کی محبوبیت کے دوسرے اللہ سبحانہ کی حاکمیت کے۔ قرآن ان دونوں میں ہم آہنگی چاہتا ہے جدائی نہیں چاہتا ہے عین میدانِ جنگ میں جہاں ایک سپاہی خالص اللہ کی حاکمیت کی خاطر اپنی جان کا تحفہ پیش کر رہا ہے اسے حکم ہو رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنے محبوب مطلوب اور مقصود کو یاد رکھو۔ صرف میدانِ جنگ میں ہی نہیں قرآن نے ایسے تمام مواقع پر جنہیں دنیا اور صرف دنیا کہا جاتا ہے اللہ کو بہت یاد کرنے کا حکم دیا ہے قرآن میں نماز جمعہ ختم ہونے پر کاروبار میں مشغول ہونے کا حکم ہو رہا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی حکم ہو رہا ہے کہ واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ قرآن اللہ سبحانہ کے ان دونوں حاکمیت اور محبوبیت کے تعلقات میں یکجائی اور ہم آہنگی چاہتا ہے۔ قرآن حکیم کے نزدیک جو چیز دین ہے وہ اللہ سبحانہ کی حاکمیت اور محبوبیت دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ یعنی محبوب ہونے کی حیثیت میں اس کی پرستش اور حاکم ہونے کی حیثیت میں اس کی بندگی ہے۔ اس میں تفریق یہودیت اور نصرانیت ہے محبوب ہونے کی حیثیت میں صرف پرستش کو اختیار کر لینا اگر عیسائیت ہے تو حاکم ہونے کی حیثیت میں صرف بندگی کو اپنا لینا یہودیت ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام تفریق فی الدین ہے۔ اور اسی کے تفرق سے وہ بار بار روکتا ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب میدانِ جنگ میں ہو تو اللہ کو بہت یاد کرو۔ اللہ کو یاد کرنا اس کی محبت کا تقاضا ہے اس سے تمہارے دلوں میں سکون و اطمینان آئے گا۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے الوابل الصیب میں ذکر کے فوائد پر مبسوط بحث کی ہے اور لکھا ہے وفی الذکر اکثر من مائۃ فائدہ ذکر کے سو سے زیادہ فائدے ہیں۔ پھر ان کی تفصیل بتائی ہے۔ بلاشبہ اللہ کو یاد کرنا اللہ سبحانہ کی محبوبیت کا تقاضا ہے اور میدانِ جنگ میں محنت کرنا اللہ کی حاکمیت کا تقاضہ ہے۔ محبت کے تقاضے کے تحت اللہ سبحانہ کے لیے اعمال اگر پرستش ہیں جس کا نام ولایت ہے تو حاکمیت کے تقاضے

کے تحت اعمال کی بجا آوری اللہ کی بندگی ہے جس کا نام خلافت ہے دونوں میں بنیاد اور عمارت کی نسبت ہے پرستش اساس ہے بندگی اسی بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت ہے ولایت اساس ہے تو خلافت عمارت ہے۔ ایسی ہر عمارت جس کی اساس نہ ہو اسلام کا مقصود نہیں ہے پہلے اساس بناؤ پھر اس پر عمارت اٹھاؤ۔ حضور اقدس ﷺ کی سیرت گواہ ہے کہ پہلے آپ نے پورے تیرہ سال اساس بنانے میں صرف کیے ہیں۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ میدانِ جنگ میں ان دو باتوں کو اپناؤ تاکہ تم فلاح سے ہمدوش ہو جاؤ لعلکم تفلحون۔ یعنی ہمارے اس حکم کی حکمت، مصلحت یہ ہے کہ اس راہ سے تم کو فلاح ملے گی۔

معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کے لیے فلاح کی لازمی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ثبات قدم کے ساتھ ان کے اللہ سبحانہ سے عابدانہ تعلقات ہوں اور ان تعلقات میں ایسی پختگی ہو کہ تلواروں کی چمک میں تیروں کی بارش میں، مصائب کے ہجوم میں وہ اللہ کو بہت یاد کرنے والے ہوں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ سے عابدانہ تعلقات کے بغیر صرف آخرت کی نہیں دنیا کی فلاح بھی ہاتھ نہیں آتی ہے یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے۔ کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

اس معاملے میں اہلِ ایمان کو دوسروں پر قیاس کرنا درست نہیں ہے دوسری قومیں اپنی ساری نافرمانیوں کے باوجود اونچے سے اونچا مقام حاصل کر سکتی ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے ایسا کوئی امکان نہیں۔ ان کے لیے عزت و اقتدار پانے کی بنیادی شرط بس ایک ہی ہے کہ ان کے اللہ سبحانہ سے عابدانہ تعلقات استوار ہوں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے لیے عروج و زوال کا قانون اللہ تعالیٰ نے وہ نہیں رکھا ہے جو دوسری قوموں کے لیے مقرر ہے۔

تین چیزیں اور جن پر فلاح موقوف ہے

(۶۱) اور اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اور باہم نہ جھگڑو ایسا کرو گے تو کمزور ہو جاؤ گے اور دنیا میں تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور ڈٹے رہو اللہ ڈٹنے والوں کے ساتھ ہے۔ یعنی ہوا خیزی ہو کر اقبال اور رعب کم ہو جائے گا بے رعبی کے بعد فتح و ظفر کیسے حاصل کر سکو گے۔ جو سختیاں اور شدائد جہاد کے وقت پیش آئیں۔ ان کو صبر و استقامت سے برداشت کرو ہمت نہ ہارو مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو بتلا دیا گیا کہ کامیابی کی کنجی کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ دولت شکر اور سیگزین وغیرہ سے فتح و نصرت حاصل نہیں ہوتی۔ ثابت قدمی صبر و استقلال قوت و طمانیت قلب یاد الٰہی، خدا اور رسولؐ اور اس کے قائمقام کی اطاعت و فرمانبرداری اور باہمی اتفاق و اتحاد سے حاصل ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے متعلق ابنِ کثیر رحمہ کے چند الفاظ نقل کر دوں جو اخلاص و ایمان کی انتہائی گہرائی سے نکلے ہوئے ہیں۔

شجاعت خدا اور رسول کے احکام پاسچائی اور رہنمائی کے قبول کرنے میں جو مقام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے وہ ماضی اور مستقبل کی قوموں میں سے دنیا کی کسی قوم کا نہیں ہے۔ انھوں نے حضور اقدس ﷺ کی برکت اور آپ کی طاعت کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب میں قلت تعداد کے باوجود ملکوں کو فتح کیا، روم، ایران، ترک صقالیہ بربر سوڈان اور مصر سب مقہور و مغلوب ہو گئے اللہ کے قانون کا بول بالا ہوا اور اللہ کا دین سارے ادیان پر غالب ہو گیا۔ اسلامی ممالک کی حدود مشارق و مغارب میں تیس سال سے کم مدت میں پھیل گئیں۔ اللہ ان سے خوش ہوا اور اللہ نے ان کو خوش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان میں ہی کر دے وہ بڑا مہربان اور توبہ قبول کرنے والا ہے [1]

یہاں سب سے اہم اور بنیادی بات اللہ اور اس کے رسول کی طاعت ہے۔ اللہ کی اطاعت بالذات ہے اور رسول کی اطاعت خدا کا رسول ہونے کی وجہ سے ہے۔ زندگی میں نبی کی اطاعت ضروری ہے اور ایسا سمجھنا شرطِ ایمان ہے دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چوں نہ کرے اور خواہ اس کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے بہر صورت یہ یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہے۔

اتباع وطاعت نبی میں فرق

قرآن نے حضور اقدس ﷺ کے بارے میں دو حکم دیئے ہیں ایک اطاعت کا اور دوسرے اتباع کا۔ جیسا کہ پہلے سن آئے ہو کہ اللہ سبحانہ کے بندوں سے تعلقات دو گونہ ہیں ایک محبوبیت کے دوسرے حاکمیت کے، محبوب ہونے کی حیثیت میں اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اور حاکم ہونے کی حیثیت میں اللہ کی طاعت کی جاتی ہے محبوبیت کی حدود میں قرآن نے حضور اقدس ﷺ کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ اتباع کے معنی پیروی کرنا، سیکھنے تاکے۔ بانٹنا۔ کاپی کرنا اور نقل کرنا۔ حکم ہے۔ صلوا کما رایتمونی اصلی جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو نماز پڑھو اور حاکمیت کی حدود میں قرآن نے حضور اقدس ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ نبی کی یہ حیثیت خود قرآن نے مقرر کی ہے۔ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔ اور اس اطاعت کا قرآن نے صرف مطالبہ ہی نہیں کیا بلکہ بتایا ہے کہ یہ اطاعت دل کی پوری رضامندی سے ہونی چاہیے۔ ارشاد ہے۔

فلا وربك لا یؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ ابن کثیر کی اصل عبارت شیخ الاسلام کے تفسیری حواشی میں تھی۔ ہم نے ناظرین معالم القرآن کے لیے عربی عبارت کا اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔

حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔

اے نبیؐ — تیرا رب گواہ ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے آپس کے نزاعی امور میں تمہیں فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں اور پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں۔ بلکہ اسے پوری آمادگی کے ساتھ قبول کر لیں۔

اور ایسا ہونا بہرحال ضروری ہی ہے۔ عقل انسانی اس کے سوا ایک نبی کے لیے اور کچھ باور بھی نہیں کرتی۔ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو ماننے اور اس کے احکام کی اطاعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی بندگی کا طریقہ معلوم کرنے اور اس کے احکام کو جاننے کا واحد ذریعہ صرف نبی ہی ہے تو نبی کی کامل اطاعت اور پیروی کے بغیر اللہ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل ممکن ہی نہیں۔ اگر راستہ چلے بغیر آپ منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور آلات پرواز کے بغیر فضائی سفر نہیں کر سکتے تو نبی کی اطاعت کے بغیر آپ اللہ کی بندگی بھی نہیں کر سکتے ایسی حالت میں نبی کی اطاعت فی الواقع اللہ سبحانہ کی اطاعت ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ کیونکہ — طاعت اللہ سبحانہ کی حاکمیت کا تقاضا ہے اور حاکمیت میں قرآن نے نیابت بتائی ہے۔ اذ قال ربك للملائكة انی جاعل فی الارض خلیفہ۔ چونکہ حاکمیت میں نیابت ہوتی ہے اس لیے قرآن نے طاعت کے دائرے کو وسیع کر دیا ہے ارشاد ہے۔ یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ لیکن اتباع چونکہ اللہ سبحانہ کی محبوبیت کا تقاضا ہے اور وہ اعمال میں ہوتی ہے اس لیے اس کو ذاتِ پیغمبر اور خلفائے راشدین تک محدود کر دیا۔ اور ان کی سنت کو بھی سنت کہا اور اس کی اتباع کا حکم دیا۔ ارشاد ہے۔ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین عضوا علیھا بالنواجذ۔ چونکہ خلافت راشدہ ٹھیک ٹھیک طریق نبوت پر قائم ہونے والی تھی۔ اس لیے آپؐ نے اُمت کو وصیت کی کہ نہ صرف ان کی اطاعت کی جائے۔ بلکہ ان کے تمام اجتماعی کاموں کو مثل اعمالِ نبوت کے سُنت سمجھا جائے اور اس کی اتباع کی جائے۔ جو لوگ اتباع اور اطاعت میں فرق نہیں سمجھے ان کو اسلامی زندگی کے معاملہ میں دشوار گذار گھاٹیوں سے گذرنا پڑا۔ حالانکہ دونوں الگ الگ ہیں ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان کسی کو اپنا جماعتی سربراہ اور حاکم مان لیں اور ایک امیر کی جیسی فرمانبرداری شہریوں کو کرنی چاہیے ٹھیک ٹھیک ویسی ہی فرمانبرداری کریں۔ کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے ثابت ہو کہ اسے اپنا حاکم نہیں سمجھتے اس کا نام طاعت ہے دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کو اپنے دینی و اخلاقی اعتقاد و عمل میں پیشوا مان لیا جائے اور راستی و ہدایت کے اعتبار سے اس کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنائے اور اس کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرے اس کا نام اتباع ہے۔ دونوں صورتیں الگ الگ ہیں۔ بلاشبہ اطاعت ایک عام حالت ہے۔ اور اس میں اتباع کی حالت بھی داخل ہے لیکن اتباع اطاعت سے زیادہ خاص ہے اور ضروری نہیں کہ ہر اطاعت اتباع ہی ہو خلفائے راشدین کے

بارے میں امت کو اطاعت اور اتباع دونوں کا حکم دیا گیا ہے جب کہ بعد میں سلاطین اور ارباب حکومت کے لیے صرف اطاعت کا حکم ہے۔ اگر بزرگوں کی اس جوہری فرق پر نظر ہوتی تو ان کو تراویح کے بیس ہونے۔ جمعہ میں اذان کے اضافے۔ اور طلاق ثلاثہ بیک مجلس بیک بار جیسے مسائل میں کوئی تردد نہ ہوتا۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ نے اتباع اور اطاعت کے جوہری فرق کو خوب سمجھا ہے اور بتایا ہے کہ اتباع کا دائرہ خلافت راشدہ تک محدود ہے اس کے بعد اتباع نہیں صرف اطاعت ہے۔ ازالۃ الخفاء میں فرماتے ہیں :۔

ہر نماز ے وزکو تے او معروفے و نہی منکرے کہ از ممکنان ظاہر شود نمود و محل رضا است

اور خلافت خاصہ کے لوازم میں یہ بات خاص طور پر بتائی ہے کہ :

قول خلیفہ در دین حجت باشد نہ باآں معنی کہ تقلید عوام مسلمین او را صحیح باشد زیرا کہ این معنے از لوازم اجتہاد است در خلافت بیان ان گذشت و نہ بان معنے کہ خلیفہ فی نفسہ بے اعتماد بر تنبیہ آنحضرت ﷺ واجب الطاعۃ باشد زیرا کہ این معنی غیر نبی را میسر نیست بلکہ مراد انجا منزلتی است بین المنزلتین

خلیفہ کی بات دین میں حجت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی زندگی کی رائے عامہ کو ان کی تقلید کرنی چاہیے یہ بات لوازم اجتہاد میں سے ہے اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ خلیفہ کی بات بالذات حضور اقدس ﷺ سے الگ ہو کر قابل اتباع ہے کیونکہ یہ مقام غیر نبی کے لیے ہرگز نہیں ہے بلکہ یہاں ان دونوں کے درمیان مقام مراد ہے یعنی مادون التشریع وما فوق الاجتہاد۔

اور اس مقام کی جو تفصیل بتائی ہے وہ بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی زبانی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں :

تفصیل اس کی یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کچھ کاموں کو کچھ لوگوں کا نام لے کر ان کے حوالہ کیا ہے۔ اس لیے ان کا اتباع ضروری ہے جیسا کہ حضور کے مقرر کردہ امرا کی اطاعت ضروری ہے۔ خلفائے راشدین میں یہ خوبی ایسی ہی ہے جیسے فرائض میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بات کا دوسرے مجتہدین کے مقابلہ میں وزن ہے اور جیسے فقہ و قرات میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بات کا اور قرات میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی بات کا وزن ہے ___ حضور اقدس کو بذریعہ وحی معلوم ہوا کہ آپ کے بعد کچھ مسائل میں اختلاف ہوگا۔ حضور نے امت کو اسی گرداب سے نکالنے کے لیے خلفائے راشدین کو معیار مقرر کر دیا۔

بہرحال حضور نے اتباع کو صرف خلافت راشدہ تک محدود کیا اور اطاعت کو ہر سربراہ مملکت، ہر حکمران تک پھیلا دیا اور یہ قید لگا دی کہ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔

اس موقعہ پر طاعت کا مفہوم یہ ہے کہ دشمن کے مقابلے پر بھرپور نظم اور کامل ڈسپلن کا مظاہرہ کرو جو حکم اللہ سبحانہ نے

دیا ہے اس کی بھی طاعت کرو اور جو حکم رسول دے اس کی بھی بے چون وچرا تعمیل کرو۔ جس طرح یاد الٰہی سے خالی ہو کر انسان انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر جماعت کی طاعت میں ڈھیل ہو تو جماعتی نظم درہم برہم ہو جاتا ہے۔

اتحاد و اتفاق

اس ارشاد میں دوسری بات یہ بتائی ہے لا تنازعوا آپس میں نہ جھگڑو۔ تنازع کا مطلب یہ ہے کہ جماعت اور اطاعت کی زندگی کو ہمیشہ قائم رکھو۔ یہی اسلامی زندگی ہے اور اس کا عکس اسلام کی نہیں جاہلیت کی زندگی ہے۔ جاہلیت کی زندگی میں ہلاکت کا اصل تخم تفرقہ اور باہم تنازع اور کسی ایک مرکزی قوت سے وابستہ نہ ہونا تھا۔ قرآن نے آ کر جس زندگی سے آشنا کیا وہ کیا تھی؟ یہی کہ باہمی اتحاد و اتفاق اور تمام منتشر افراد میں یگانگت رونما ہو کر بعض احد کی طرح ان سب کے سر ایک ہی چوکھٹ پر جھکیں۔ سب کی زندگی کا مقصد ایک ہو۔ قرآن نے اسی کو نعمت کہا ہے۔ واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔ اسی لیے تمام احادیث میں یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے کہ جماعت سے مقصود یہ ہے کہ اہل ایمان کی اجتماعی اور ملی زندگی کے لیے ایک مرکزی وجود ہو۔ اس کی محبت اس کی رفاقت اس کی اطاعت اس کی حرکت پر حرکت اس کے سکون پر سکون، اس کی طلب پر لبیک اس کی دعوت پر جان و مال لگانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ایسا فرض جس کے بغیر وہ جاہلیت کی تاریکی سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں نہیں آ سکتا۔ اسلام کی اصطلاح میں اسی اجتماعی مرکز کا نام امام اور خلیفہ ہے اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے جب تک وابستہ ہے ہر مسلمان پر اس کی طاعت و اعانت فرض ہے۔ اسلام کی زبان میں اسی کا نام جماعت ہے۔ احادیث میں واضح کیا گیا ہے کہ جو شخص جماعت اور طاعت امام سے الگ ہو گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا اس کی موت اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیت پر ہوگی۔ اس موضوع پر اس کثرت سے ارشاداتِ نبوت موجود ہیں اور زمانہ صحابہؓ سے لے کر تدوین کتب کے زمانے تک اس قدر ان کی شہرت ہے کہ اسلام کے عقیدہ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی اور چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہو۔

سب سے پہلے مسند امام احمد کی ایک روایت پیش کرتا ہوں:

حضرت حارث اشعری کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ میں تم کو ان پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت، اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔ اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی سے جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

لوگوں نے عرض کیا کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا۔ اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو فرمایا ہاں اگرچہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے یہ ارشاد نبوت آیا ہے کہ:

اگر ایک حقیر صورت غلام حبشی بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے تو تمہیں چاہیے کہ اس کی سنو اور طاعت کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اور کثرت سے اپنی تقریروں میں فرماتے تھے۔ اسی لیے مختلف لفظوں میں مختلف مواقع پر یہ بیان نقل ہو کر آیا ہے۔ حجۃ الوداع کے عظیم الشان اور یادگارِ عالم موقعہ پر فرمایا کہ:

اگر ایک حبشی غلام بھی تمہارا سربراہ ہو اور کتاب اللہ کے ذریعے تم پر حکومت کرے تو اس کی سنو اور طاعت کرو۔

صحیح بخاری اور مسلم میں ہے۔

جس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا اور سربراہ مملکت کی طاعت سے باہر ہو گیا اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

اسلام سے پہلے اہل عرب پر غیر جماعتی قبائلی عصبیت ناخدا شناسی پر مبنی جو زمانہ گذرا ہے اس کو جاہلیت کہتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے امیر کو ایسی بات کرتے دیکھے جو اسے پسند نہ ہو تو چاہیے کہ صبر کرے اس کی طاعت سے باہر نہ ہو کیونکہ جو شخص مسلمان سربراہ سے بالشت بھر بھی باہر ہوا اور اسی حالت پر مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی حالت پر ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے۔

جس نے مسلمان سربراہ کی طاعت سے ہاتھ کھینچ لیا تو روز قیامت وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوگا۔ اور اس کے لیے بچاؤ کا کوئی سامان نہ ہوگا۔ اور جو مسلمان دنیا سے اس طرح رخصت ہوا کہ مسلمان سربراہ کی طاعت کے حلقے سے اس کی گردن خالی تھی تو یقین کرو کہ اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

ان کے علاوہ بے شمار احادیث اس موضوع پر آئی ہیں سب کا حاصل یہ ہے کہ اطاعتِ امیر میں جماعتی زندگی اختیار کرو۔ افتراق وانتشار کے شکار نہ ہو۔ اگر تم نے افتراق و تشتت کو اپنا لیا تو یاد رکھو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے اور دوسری طرف تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور تمہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

صبر کا دامن تھام کر رکھو

بالکل آخر میں ارشاد ہوا۔ واصبروا ان اللہ مع الصابرین۔ صبر کرو یعنی اپنے جذبات پر پورا قابو رکھو۔ جلد بازی

گھبراہٹ، طمع اور نامناسب جوش سے بچو۔ ٹھنڈے دل اور جمی تلی قوتِ فیصلہ کے ساتھ کام کرو۔ خطرات اور مشکلات سامنے ہوں تو تمہارے قدموں میں لغزش نہ آئے۔ اشتعال انگیز مواقع پیش آئیں تو غیظ و غضب کا ہیجان تم سے کوئی بے محل حرکت سرزد نہ کرائے۔ مصائب کے ہجوم ہوں اور حالات میں ناسازگاری ہو تو پریشانی میں تمہارے حواس پراگندہ نہ ہو جائیں۔ حصولِ مقصد کے شوق سے بے قرار ہو کر یا نیم پختہ تدبیر کو سرسری نظر میں کارگر دیکھ کر تمہارے ارادے شتاب کاری سے مغلوب نہ ہوں۔ اور اگر کبھی دنیوی فوائد و منافع اور لذات نفس کی ترغیبات تمہیں اپنی طرف لے جا رہی ہوں تو ان کے مقابلے میں بھی تمہارا نفس اس درجہ کمزور نہ ہو کہ بے اختیار ان کی طرف کھنچ جاؤ۔

صبر کے لغوی معنے روکنے، سہارنے کے ہیں یعنی اپنے آپ کو گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے۔ یعنی اس کے معنے بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں۔ قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی معنے میں آیا ہے اگرچہ حالات کی تبدیلی سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے باایں ہمہ سب کا مرجع ایک ہے یعنی ثابت قدمی، استقامت۔ صبر کے وہ مختلف مفہوم جن میں قرآن نے اس کو استعمال کیا ہے یہ ہیں۔ صبر کا پہلا مفہوم یہ ہے۔ کہ وقت مناسب کا انتظار کرنا فاصبر ان العاقبۃ للمتقین۔ یعنی ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا۔ اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی، بیچارگی اور بے بسی پاؤں کو ڈگمگا رہی ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری امید رکھنی چاہیے ایسا نہ ہو کہ وعدہ الٰہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو۔ اور باطل کے گروہ میں مل جاؤ۔

فاصبر لحکم ربك ولا تطع منهم آثما او کفورا۔

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بے قراری نہ ہو بلکہ ان کو اللہ سبحانہ کا حکم سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرمائے گا۔ اللہ سبحانہٗ نے ایسے لوگوں کی مدح فرمائی ہے۔

والصابرین علی ما اصابہم اور جو مصیبت میں صبر کریں۔

صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزلِ مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں۔ دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں اور مخالفین جو طعن و طنز کریں ان میں سے کسی چیز کو خاطر میں نہ لائے اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو۔ بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے مگر انھوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے حضور اقدس ﷺ کو دوسری مرتبہ کی وحی میں جب

وتبلیغ کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی باخبر کر دیا گیا۔ ولربک فاصبر۔

صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز اور جو بدخواہی سے پیش آئے اور تکلیفیں دے اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقاً پامردی دکھائی جائے۔

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے یا کسی اور سبب سے نہ ہو بلکہ صرف خدا کے لیے ہو۔

صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے۔ قرآن حکیم نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے اور زیرِ نظر آیت میں بھی ان ہی معنے میں آیا ہے اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے آراستہ ہوں صادق القول راست باز بتایا ہے۔

میدانِ جنگ میں کامیابی کی چار شرطوں میں سے ایک اہم شرط بہادرانہ صبر و استقامت ہے۔ حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و استقامت کی روحانی قوت سے ہوتی ہے۔ تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گذرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دے دی۔ اللہ نے یہ نکتہ اس آیت میں اپنے ماننے والوں کو سمجھایا ہے۔

اس آیت میں صبر کی فضیلت میں فرمایا ہے۔ ان اللہ مع الصابرین۔ صبر کرنے والوں کو اللہ کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ یہ محبت خداوندی خود ضامن نصرت ہے کہیں ارشاد ہوتا ہے۔ واللہ یحب الصابرین۔ اللہ سبحانہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوئی بلکہ ستر مسلمان شہید ہو جاتے ہیں کچھ مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوئی اللہ سبحانہ نے اس حزن و ملال کے ازالہ کے لیے پچھلے پیغمبروں کی داستان سنائی ہے۔

وکاین من نبی قاتل معہ ربیون کثیر فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصابرین۔

کتنے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں۔ پھر اللہ کے راستہ میں تکلیف اٹھا کر انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ان کے دل بودے ہوئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے ان تہ بر تہ پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرے پر پڑے ہیں اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کی مجبورانہ درگزر کا نہیں بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت

کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات و مصائب کو اللہ سبحانہ کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام صبر ہے۔ ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے تصور کو جو اس کی کمی یا زیادتی سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ
وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُونَ
مُحِيطٌ ﴿٤٧﴾ وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ
لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا
تَرَاءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ
مِّنْكُمْ إِنِّي أَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٤٨﴾ إِذْ يَقُولُ الْمُنٰفِقُونَ وَالَّذِينَ ع
فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰؤُلَاءِ دِينُهُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ
عَلَى اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٩﴾

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کی نگاہوں میں نمائش کرتے ہوئے نکلے اور جن کا حال یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ اور یہ لوگ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اللہ سبحانہ کی ذات اس پر چھائی ہوئی ہے[62] اور جب شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے سامنے سجا کر پیش کیا اور بول پڑا آج لوگوں میں سے تم پر برتر ہونے والا کوئی نہیں ہے اور میں تمہاری پشت پناہ ہوں۔ پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو الٹے پاؤں واپس ہوا اور کہا کہ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہے مجھے وہ کچھ نظر آرہا ہے جو تم نہیں دیکھتے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ کی سزا سنگین ہے[6] اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہنے لگے کہ ان مسلمانوں کو دین کا نشہ

چڑھا ہوا ہے اور جو بھی اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو بلا شبہ اللہ تعالیٰ بہت بڑے دبدبہ والا اور
حکیم ہے ؎٦

کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات و مصائب کو اللہ سبحانہ کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام صبر ہے ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے اور اللہ سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی یا زیادتی سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے ۔

معانی مفردات

بطر اترانا، فخر کرنا ہیں زجاج کہتے ہیں ہر نعمت میں سرکش ہوجانے کا نام ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ دولت اگر ہم چشموں میں منافرت اور گھمنڈ کا ذریعہ بن جائے تو یہی بطر ہے۔ قرطبی لکھتے ہیں کہ اللہ کی نعمتوں کے بل بوتے پر معاصی میں چھوٹ ہونے کا نام بطر ہے۔ اس کی نمائش گفتار، کردار، لباس، حرکات و سکنات میں ہوتی ہے۔ رئاء دکھاوا، دکھانا، خودنمائی باب مفاعلہ کا مصدر ہے اس کے معنے ہیں دوسرے کے دکھاوے کے لیے کام کرنا۔ کسی کام کو اس لیے کرنا کہ لوگ دیکھ کر تعریف کریں۔ یصدون یہ صد سے ہے جمع مذکر غائب فعل مضارع کا۔ اس کے دو مصدر ہیں صد اور صدود۔ صد اگر مصدر ہے تو باب نصر سے متعدی ہے معنی ہیں روکنا اور اگر مصدر صدود ہو تو اس کے معنے رکنا بھی ہیں یہ لازم ہے شیطان عربی زبان میں ہر سرکش شیطان ہے جن ہو یا انسان۔ اور یا چوپایہ۔ سیبویہ نے کبھی اس کے نون کو زائد بتایا ہے۔ اور کبھی اصلی۔ کیونکہ اس کے بارے میں اختلاف ہے جو لوگ اس کا مادہ شطن بتاتے ہیں وہ شیطان کو فیعال کے وزن پر کہتے ہیں اس صورت میں نون اصلی ہے اور جو لوگ اسے شاط یشیط سے مشتق کہتے ہیں وہ شیطان کو فعلان کے وزن پر بتاتے ہیں۔ شطن کے معنے دور ہونے کے ہیں شیطان وہ جو رحمت سے دور ہو اور شیط کے معنے جلنے ہلاک ہونے کے باطل ہونے کے ہیں اور سرکش و متمرد میں یہ ساری صفتیں ہوتی ہیں۔

دولت اور طاقت کی نمائش

ریا کے لغوی معنے دکھاوا اور نمائش کے ہیں۔ انسانی اعمال کی اصل حقیقت ان کی نیت اور غرض پر مبنی ہے اس لیے درستی نادرستی اور اچھائی و برائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے۔ ارشاد نبوت ہے انما الاعمال بالنیات۔ اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کھوکھلی کر دیتی ہے۔ جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے۔ نمائش،

کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی خوبیوں کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا بنا کر پیش کرے۔ غرور بھی اسی ولولہ کا جذبہ ہے اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ نہیں اسی لئے قرآن نے دونوں کو یک جان پیش کیا ہے اور ان کی برائی بیان کی۔ دنیا کی قومیں میدان جنگ میں ساری برائیوں کو جائز سمجھتی ہیں لیکن قرآن نے خالص جنگ کے موضوع پر اہل ایمان کو یہ ہدایت دی ہے کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری جنگ کا مقصد نہ ہو بلکہ حق کی حمایت اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا نصب العین ہونا چاہیے۔

(۶۲) اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کی نگاہوں میں نمائش کرتے ہوئے نکلے اور جن کا حال یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں اور یہ لوگ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اللہ سبحانہ کی ذات گرامی اس پر چھائی ہوئی ہے ابوجہل لشکر لے کر بڑی دھوم دھام اور باجے گاجے کے ساتھ نکلا تھا تاکہ مسلمان مرعوب ہو جائیں۔ اور دوسرے قبائل عرب پر مشرکین کی دھاک بیٹھ جائے۔ راستہ میں اس کو ابوسفیان کا پیغام پہنچا کہ قافلہ سخت خطرہ سے باہر نکل چکا ہے اب تم مکہ کو لوٹ جاؤ۔ ابوجہل نے نہایت غرور سے کہا کہ ہم اس وقت واپس جا سکتے ہیں جبکہ بدر کے چشمہ پر پہنچ کر مجلس طرب و نشاط منعقد کریں۔ گانے والی عورتیں خوشی اور کامیابی کے گیت گائیں۔ شرابیں نوش کریں، مزے اڑائیں اور تین روز تک اُونٹ ذبح کر کے قبائل عرب کی ضیافت کریں تاکہ یہ دن ہمیشہ کے لیے ہماری یادگار رہے۔ اور آئندہ کے لیے ان مٹھی بھر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں کہ پھر کبھی ہمارے مقابلہ کی جرات نہ کریں اسے کیا خبر تھی کہ جو منصوبے باندھ رہے ہیں اور تجویزیں سوچ رہے ہیں وہ سب اللہ سبحانہ کے قبضہ میں ہیں چلنے دے یا نہ چلنے دے بلکہ چاہے تو انہی پر اُلٹ دے چنانچہ یہی ہوا بدر کے پانی اور جام شراب کی جگہ انہیں موت کا پیالہ پینا پڑا محفل سرود و نشاط تو منعقد نہ کر سکے ہاں نوحہ اور ماتم کی صفیں بدر سے مکہ تک بچھ گئیں۔ جو مال تفاخر و نمائش میں خروج کرنا چاہتے تھے وہ مسلمانوں کے لیے مال غنیمت بنا۔ ایمان و توحید کے غلبہ کا بنیادی تیر بدر میں نصب ہو گیا گویا ایک طرح اس چھوٹے سے قطعۂ زمین میں اللہ سبحانہ نے رُوئے زمین کی ملل و اقوام کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیا۔ بہرحال اس آیت میں مسلمانوں کو آگاہ فرمایا ہے کہ جہاد محض ہنگامہ کشت و خون کا نام نہیں ہے بلکہ عظیم الشان عبادت ہے۔ عبادت اتراوے یا دکھاوے کو کرے تو قبول نہیں لہذا تم فخر و غرور اور نمود و نمائش میں کفار کی چال نہ چلو۔ [1]

اسلامی زندگی کو پروان چڑھانے کے لیے جو محنت کی جاتی ہے دشمن کے مقابلے میں اسے کامیاب بنانے کے لیے چھ باتوں پر زور دیا ہے کہ فتح و کامیابی کا اصل سرچشمہ یہ ہیں۔

۱۔ ثابت قدم رہو۔ کیونکہ میدان کی ساری کامیابی کا انحصار اسی پر ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

۲۔ بہ ہر زیادہ اللہ کو یاد کرو۔ کیونکہ قدم کا جماؤ دل کے ثبات پر موقوف ہے اور دل کے اطمینان کا بہترین ذریعہ ذکر اللہ ہے۔

۳۔ اللہ ورسول کی طاعت کرو کیونکہ بغیر طاعت کوئی جماعت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ نافرمانی ناکامی کا واضح اور کھلا راستہ ہے۔

یہاں تک مثبت باتیں ہیں یعنی یہ کام کرنے کے ہیں۔ منفی باتیں یعنی نہ کرنے والے کام یہ ہیں۔

۴۔ باہمی نزاع نہ ہو۔ انتشار وافتراق اس دنیا میں امتوں کے لیے عذاب عظیم ہے۔

۵۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو کتنی ہی مشکلات سے دوچار ہو۔ برداشت کرتے رہو۔

اسی سلسلہ کی آخری ہدایت اس آیت میں دی گئی ہے کہ اہل ایمان کو ایسا کردار اختیار نہ کرنا چاہیے جو وہ لوگ اپناتے ہیں جو اللہ سے غافل اور اس کے دین سے روگرداں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ ہدایت جنگ بدر کے واقعات پر تبصرہ کرنے کے بعد دی جارہی ہے۔ بدر کی لڑائی کے لیے جب قریش مکہ سے مدینہ کی طرف چلے تو کچھ عجیب آن بان اور شان سے چلے۔ گانے بجانے والی لونڈیاں ساتھ تھیں۔ جگہ جگہ ناچ ورنگ کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ شراب کا دور چلتا تھا اور ہر ایک اس گھمنڈ میں تھا کہ اب ہماری اتنی بڑی طاقت کے سامنے کون آئے گا۔ اور آئے گا تو کب ٹھہرے گا۔ راستہ میں جن جن قبیلوں کے پاس سے گذرتے تھے ان پر اپنے ساز وسامان اور طاقت کا رعب جماتے تھے اور یہ ڈینگیں مارتے تھے کہ بھلا اب ہمارے سامنے کون سر اٹھا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو بتایا جارہا ہے کہ وہ ایسے گندے اخلاق سے بچیں۔ طاقت بس اللہ کی طاقت ہے۔ فتح اور شکست اس کے ہاتھ ہے۔ گھمنڈ اور غرور اسے پسند نہیں ہے۔ اترانے والوں کو اکثر منہ کی کھانی پڑتی ہے اور بڑے بول کا سر نیچا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جب وہ اللہ کی راہ میں جان اور مال قربان کرنے کے لیے نکلیں تو اچھے سے اچھے اخلاق ان سے ظاہر ہوں۔ اللہ کو یاد رکھیں۔

اصل ارشاد میں لفظ بطر آیا ہے اس کے معنے حق سے اکڑنے اور اس سے متکبرانہ روگردانی کرنے کے ہیں۔ قرآن نے یہاں اس بدمستی اور سرکشی کے لیے استعمال کیا جو حق سبحانہ کی نعمتیں پاکر کسی شخص یا گروہ میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ نیاز مندی کی جگہ غرور اور سرکشی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ وکم اھلکنا من قریۃ بطرت معیشتھا۔ اور کتنی بستیاں ہیں جو اپنے وسائل معیشت کی فراوانی پر اکڑنے لگی تھیں۔ دراصل بطر یہاں ذکر کے مقابلے پر آیا ہے بتایا یہ جارہا ہے کہ مسلمانو! تمہیں میدان جنگ میں اللہ سے لگاؤ رکھنا چاہیے ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جو دنیا میں پڑنے کے بعد یاد الٰہی سے بیگانہ ہوکر اپنی دولت کی فراوانی پر مچل جاتے ہیں۔ دولت کا یہ بطر قوموں کے لیے دنیا میں ہلاکت کا سامان ہے۔ کثرت تعداد اور اسباب وسائل کی بہتات پر مچلنا اہل ایمان اور اللہ سے تعلق رکھنے والوں کا کام نہیں ہے۔ اہل ایمان کا کام بندگی کی تواضع

اور عبدیت کی فروتنی ہے۔ اگرچہ یہاں بالذات مسلمانوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی جنگ جنگ نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت ہے۔ شانِ عبادت اس میں نمایاں رہنی چاہیے۔ ڈھول ڈھمکے۔ تماشے ناچ۔ ناچ گانے۔ عورتوں مردوں کا اختلاط وہ احوال ہیں جو عبادت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اس میں اس طرف بھی اشارا ہے کہ آئندہ مسلمانوں کے سامنے ایسے حالات آنے والے ہیں کہ اگر وہ خبردار نہ رہے تو وہ بھی اس قسم کے فتنوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اسی سے کچھ محققین نے ہماری معاشرتی زندگی کے بارے میں یہ نکتہ بھی معلوم کیا جیسا کہ حضرت نواب صاحب نے حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے حوالے سے بتایا ہے کہ لوگ جو جلوس بارات ڈھول ڈھمکوں کے ساتھ شادیوں کے موقع پر نکالتے ہیں وہ قرآن کی اس آیت کی روشنی میں ناجائز ہے اللہ اکبر کیا وقتِ نظر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ہدایت صرف میدانِ جنگ کے لیے نہیں بلکہ پوری اسلامی زندگی کے لیے ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بیجا نہیں ہے کہ یہ ہدایت صرف اسی زمانہ کے لیے نہیں بلکہ آج کے لیے بھی ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ میدان جنگ میں کفر کی زندگی جس انداز سے اس وقت چل رہی تھی آج بھی ویسے ہی چل رہی ہے۔ قحبہ خانے اور فواحش کے اڈے اور شراب کے پیپے ان کی زندگی کا قیمتی حصہ ہیں۔ خفیہ طور پر نہیں بلکہ علانیہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ وہ عورتوں اور شراب کا زیادہ سے زیادہ درشن مانگتے ہیں اور ان کے سپاہیوں کو خود اپنی قوم ہی سے یہ مطالبہ کرنے میں باک نہیں ہوتا کہ وہ بہو بیٹیوں کو بڑی سے بڑی تعداد میں ان کی ہوس رانیوں کا شکار ہونے کے لیے پیش کریں پھر بھلا کوئی دوسری قوم ان سے کیا توقع کر سکتی ہے کہ یہ اس کو اپنی اخلاقی گندگی کا سنڈاس بنانے میں کوئی کسر اٹھا رکھیں گے۔

آیت میں بطر کے ساتھ دوسرا لفظ رئاء الناس آیا ہے۔ اس کے معنے لوگوں کو دکھانا ہیں۔ انسانی اعمال کی اصل حقیقت نیت اور غرض پر مبنی ہے۔ اس لیے اعمال کی درستی و نادرستی اچھائی اور برائی کا مدار نیت اور غرض پر ہے۔ ریا اسی نیت یعنی اعمال کے مصدر کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیتی ہے جس سے عمل کی ساری اٹھی ہوئی عمارت کمزور ہو جاتی ہے نمائش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی اور بڑائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسنِ ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا بنانے، فخر، گھمنڈ دولت پر مچلنا بھی اسی شوق کا جذبہ ہے کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لیے قرآن نے یہاں دونوں کو یکجا کر کے ان کی برائی کی ہے۔ بتانا یہ ہے کہ مسلمانو! اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش مشرکین مکہ کی طرح تمہاری جنگ کا مقصد نہیں ہے بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہے۔ اسلام کی اصطلاحی زبان میں کفر کے بعد نفاق کا درجہ ہے، نفاق کیا ہے؟ ایمان کی جھوٹی نمائش دل میں کچھ اور زبان پر کچھ۔ چونکہ ریا اور نمائش اعمال کی اصلی روح کو بگاڑ دیتی ہے اس لیے حضور اقدس ﷺ نے قرآنی ہدایات کی روشنی میں اس کے ہر ایک ریشہ کی بیخ کنی کی ہے۔ عبادات میں، انفاق میں، راہ خدا میں محنت کرنے میں اور سارے دوسرے اعمال میں اس پر قدغن قائم کی ہے۔

آیت میں کفار قریش کی طرف اشارا کر کے مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ تم ان کی طرح نہ ہونا جو مکہ سے اس شان، ۔

نکلے تھے کہ گانے بجانے والی لونڈیاں ساتھ تھیں۔ جگہ جگہ ٹھہر کر رقص و سرود اور شراب نوشی کی مجلسیں جماتے تھے جو جو قبیلے اور بستیاں راستہ میں تھے ان پر اپنی طاقت و شوکت اور اپنی کثرتِ تعداد اور اپنے ساز و سامان کا رعب جماتے تھے اور نعرے لگاتے تھے کہ ہمارا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ یہ تھی ان کی اخلاقی حالت۔ مسلمانو! تم دنیا میں علمبردارِ حق بن کر آئے ہو تم کبھی ان کی کاپی نہ کرنا۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں آیت کا منشا مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ بطر اور ریا میں تم ان کی کاپی نہ کرنا۔ بلکہ اخلاص و تقویٰ کی مثالی زندگی اپنانا۔ علامہ نسفیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ خبردار تم اہلِ مکہ کی طرح طاقت پر نہ مچلنا اور اپنے کردار کی نمائش نہ کرنا بلکہ اس کے برعکس تمہیں اللہ کے ڈر سے رنج و غم کی تصویر اور سیر و تقویٰ کی مثال بن کر لوگوں کے سامنے آنا چاہیے۔

آگے ارشاد ہوا ہے ویصدون عن سبیل اللہ یعنی ان اخلاقی نجاستوں سے زیادہ ناپاک ان کے مقاصدِ جنگ ہیں۔ ان کی طاقت کی نمائش اور اس ساری شان و شوکت کے مظاہرہ کا بنیادی مقصد یہ اور صرف یہ ہے۔ کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکیں وہ چاہتے ہیں کہ خدا نے اپنی زمین میں جو کچھ سارے انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے اس پر وہ تنہا قابض و متصرف ہوں اور کوئی ان کا شریک و سہیم نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس ساری کارروائی سے ان کا منشا یہ ہے کہ لوگوں کو محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے ہٹائیں۔ ان نادانوں کو پتہ نہیں ہے کہ انسان خواہ کتنی وسعتوں اور پھیلاؤ کے ساتھ اپنی تدابیر میں مگن ہو جائے اس کی ہر چیز ہر وقت اللہ سبحانہ کے قبضہ میں ہے اور اس کی ساری جولانیوں کے اردگرد اللہ کی باڑ لگی ہوئی ہے۔

امام رازی نے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ ایک ہی فقرہ میں ان کی اخلاقی نجاستوں کو اسم کے ذریعے اور ان کے مقصدِ جنگ کو فعل کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے یعنی بطر اور ریاء اسم ہیں اور یصدون فعل ہے۔ زجاج نحوی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اسم کے ساتھ جو ان کا کردار ظاہر کیا ہے وہ کردار کے دوام اور ہمیشگی کو جتانے کے لیے ہے اور فعل کے ذریعہ ان کے کردار کا تذکرہ وقتی اور ہنگامی پیش پا افتادہ حالت کو بتانے کے لیے ہے بتانا یہ ہے کہ طاقت کی نمائش اور دولت پر گھمنڈ تو ان کی دائمی سرشت ہے اور اسلام سے لوگوں کا روکنا یہ ایک وقتی اور ہنگامی حادثہ ہے۔ علامہ آلوسی نے اسی بات کو اس طرح بتایا ہے ان البطر والریاء دابھم والصد تجدد ھم یعنی طاقت کا غرور اور اس کی نمائش تو ان کی عادت ہے۔ لیکن اسلام کی مخالفت یہ وقتی حادثہ ہے۔

اس آیت میں یہ بات بہت زیادہ غور کے قابل ہے۔ آیت کے مخاطب مسلمان بلاشبہ بطر، ریاء الناس میں مبتلا نہ تھے۔ لیکن یہاں ان کو کھلے اور واشگاف لفظوں میں مشرکین کے ساتھ مشابہت سے روکا جا رہا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم مسلمان ہو کر اور ولایت کے دعوے کر کے کن کن چیزوں میں اور کیسی کیسی حرام و مکروہ چیزوں میں کافروں اور اللہ کے

دشمنوں سے مشابہت کرتے ہیں۔
اس آیت کا یہ بھی مدلول ہے کہ کارِ خیر میں ریاکاری کی نیت نہ ہونی چاہیے اور نہ اس پر اترانا چاہیے بلکہ ہر کام اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے ہونا چاہیے شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاد عبادت ہے۔ عبادت اترانے اور دکھاوے کو کرے تو قبول نہیں ہے۔ ساری عبادات کا حکم یہی ہے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، سارے صدقات سب کی قبولیت کی بنیادی شرط اخلاص ہے۔ یاد رہے کہ اخلاص قبولیت کی شرط ہے صحت کی شرط نہیں۔ صحت کا تعلق عالم شہادت سے ہے جبکہ قبولیت کا تعلق عالمِ غیب سے ہے۔ ایک شخص نے وضو مکمل کیا ہے پاک کپڑے اور پاک جگہ ہے اور نماز دستور کے مطابق ادا کر رہا ہے لیکن نماز اللہ کے لیے نہیں مخلوق کی خاطر پڑھ رہا ہے۔ قانون میں اس کی نماز درست اور صحیح ہے لیکن عند اللہ اسے شرفِ قبولیت حاصل نہ ہو گا۔ یہی حال دوسرے اعمال کا ہے۔

بدر میں شیطان کا مشرکین کو اکسانا

(۶۲) اور جب شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے سامنے سجا کر پیش کیا اور بول پڑا کہ آج لوگوں میں سے تم پر برتر ہونے والا کوئی نہیں ہے اور میں تمہاری پشت پناہ ہوں۔ پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو الٹے پاؤں واپس ہوا۔ اور کہا کہ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں مجھے وہ کچھ نظر آ رہا ہے جو تم نہیں دیکھتے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ کی سزا سنگین ہے۔ قریش اپنی جمعیت پر مغرور تھے لیکن بنی کنانہ سے ان کی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ خطرہ یہ ہوا کہ کہیں بنی کنانہ کامیابی کے راستہ میں آڑے نہ آجائیں۔ فوراً شیطان ان کی پیٹھ ٹھونکنے کے لیے کنانہ کے سردار اعظم سراقہ ابن مالک کی صورت میں اپنی ذریت کی فوج لے کر نمودار ہوا اور ابوجہل وغیرہ کو اطمینان دلایا کہ ہم سب تمہاری مدد حمایت پر ہیں۔ کنانہ کی طرف سے بے فکر رہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب بدر میں زور کا رن پڑا۔ اور شیطان کو جبرئیل وغیرہ نظر آئے تو ابوجہل کے ہاتھ میں سے ہاتھ چھڑا کر الٹے پاؤں بھاگا۔ ابوجہل نے کہا کہ سراقہ! عین وقت پر دغا دے کر کہاں جاتے ہو۔ کہنے لگا میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ مجھے وہ چیزیں دکھائی دے رہی ہیں جو تمہیں نظر نہیں آتی ہیں یعنی فرشتے خدا کے یعنی اس خدائی فوج کے ڈر سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ اب ٹھہرنے کی ہمت نہیں ہے کہیں کسی سخت عذاب یا آفت میں نہ پکڑا جاؤں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ملعون نے جھوٹ بولا۔ اس کے دل میں اللہ کا ڈر نہ تھا۔ ہاں وہ جانتا تھا کہ اب قریش کا لشکر ہلاکت میں گھر چکا ہے۔ کوئی قوت بچا نہیں سکتی ہے یہ اس کی قدیم عادت ہے کہ اپنے متبعین کو دھوکہ دے کر اور ہلاکت میں پھنسا کر عین وقت میں کھسک جاتا ہے اسی کے موافق بیان بھی کیا ہے۔ الشیطان یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء۔ اور یعدھم ویمنیھم وما یعدھم الشیطان الا غرورا۔ اور کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بریئ منک

انی اخاف اللہ رب العالمین اور وقال الشیطان لما قضی الامر ان اللہ وعدکم وعد الحق و

وعدتکم فاخلفتکم وما کان لی علیکم من سلطان۔ الخ[1]

آیت کی جو تشریح شیخ الاسلام نے کی ہے شارحین قرآن کے ایک گروہ کی یہی رائے ہے۔ دراصل علمائے تفسیر کے اس آیت کی تشریح میں دو قول ہیں۔

۱۔ اول یہ کہ آیت قرآنی میں مجازی معنے مراد ہیں یعنی یہ کہ شیطان نے قریش مکہ کے دلوں میں یہ وسوسہ اور خیال پیدا کیا تھا کہ آج تم مغلوب نہیں غالب رہوگے۔ میں تمہارا حمایتی ہوں۔ تمہاری تعداد زیادہ ہے۔ ساز و سامان بکثرت ہے تمہارے عقائد تمہیں پناہ دیں گے۔ علامہ زمخشری نے بھی یہی مطلب بتایا ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ آیت قرآنی میں حقیقی معنے مراد ہیں۔ شیطان نے ان سے واقعی یہ کہا تھا۔ بنی کنانہ کے سردار کا نام سراقہ ابن مالک ابن جعشم تھا۔ شیطان اس کی صورت کا لبادہ پہن کر قریش کے پاس آیا تھا اور وہ باتیں کہیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔ یہ سوال کہ اس نے ایسا کیوں کیا شارحین قرآن نے اسے اس طرح سمجھایا ہے کہ اس زمانے میں قریش کی بنی بکر سے کچھ اَن بن اور چشمک تھی۔ قریش کو ہر وقت ان کی جانب سے حملہ کا خطرہ رہتا تھا۔ اسی لیے قریش بدر کی طرف جانے اور مسلمانوں پر حملہ کرنے میں تردد کر رہے تھے۔ شیطان سراقہ کی صورت بنا کر آیا اور کہنے لگا کہ آج تم پر کوئی نہیں آسکتا۔ میں اپنی جماعت سمیت تمہارے ساتھ ہوں۔ بنی بکر سے تم کوئی اندیشہ نہ کرو میں پوری ذمہ داری لیتا ہوں کہ وہ تم پر کوئی حملہ نہ کریں گے۔ اس کی ان باتوں سے قریش کو دلیری ہوگئی اور بدر کی طرف چل دیئے۔ سراقہ بھی ان کے ساتھ تھا جب میدانِ کارزار گرم ہوا اور ابلیس نے فرشتوں کو دیکھا تو اس وقت شیطان گھبرایا۔ حارث ابن ہشام کا ہاتھ پکڑے ہوئے کھڑا تھا اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور چل دیا۔ حارث چلاتا ہی رہا کہ سراقہ اس حالت میں ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو مگر اس نے سنی اَن سنی کر دی اور ایک نہ مانی اور کہنے لگا میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ تمہیں نظر نہیں آتا ہے یہ کہہ کر حارث کی چھاتی پر مکہ مار کر چل دیا۔ ابوجہل نے آگے بڑھ کر لوگوں کو تسلی دی۔ اور بتایا کہ سراقہ دراصل درپردہ محمد ﷺ سے ملا ہوا ہے۔ لات و عزیٰ کی قسم ہم واپس نہ ہوں گے۔ جب تک مسلمانوں کو قیدی بنا کر نہ لے جائیں اور ان کو مزہ نہ چکھائیں بدر میں مشرکین مکہ شکست سے دوچار ہو کر مکہ واپس ہوئے تو سراقہ کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ اس نے ہمیں شکست سے دوچار کیا۔ سراقہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بولا بخدا مجھے تو تمہارے جانے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ جب تم بدر سے شکست کھا کر آگئے تو پھر تمہاری جنگ کی خبر ملی۔ ان ہی مکہ والوں میں سے جب کچھ لوگ بعد میں مسلمان ہوئے تو ان کو یقین ہوا کہ سراقہ اصل میں سراقہ نہ تھا۔ شیطان تھا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلی تشریح کی بھی ابن کثیر اور ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کے حوالہ سے پیش کی ہے۔ ارشاد ہے
عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بدر کے دن ابلیس اپنا جھنڈا اور لشکر لے کر آیا اور مشرکین کے
ساتھ تھا۔ مشرکین کے دلوں میں اس نے یہ بات ڈالی کہ آج تم پر کوئی غالب آئے گا میں تمہارے ساتھ ہوں
جب مسلمان اور مشرکین کا مقابلہ شروع ہوا اور شیطان کو فرشتے نظر آئے تو بھاگ اٹھا اور بولا جو کچھ مجھے نظر
آرہا ہے تم نہیں دیکھتے ہو۔

ابن کثیر رح نے اسی کو پہلے پیش کیا اس کا واضح اور صاف مطلب ہے کہ عالم غیب کی دونوں روحانی قوتیں طیب اور خبیث اپنا اپنا کام کر رہی تھیں اہل ایمان کی حوصلہ افزائی اگر فرشتے کر رہے تھے تو اہل کفر کو شیاطین دلیری دے رہے تھے آخر اس میں حیرت کی کونسی بات ہے جب قرآن خود بتا رہا ہے کہ:

ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین۔

جو بھی یاد الٰہی سے آنکھیں چرا لیتا ہے تو ہم اس کے پیچھے ایک شیطان لگا دیتے ہیں پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔

شیطان کیا ہے صرف اللہ سبحانہ کا ایک انتقامی تازیانہ ہے اللہ سبحانہ نے انسان کو جس مقصد کی تکمیل کے لیے زمین میں بسایا ہے جو بھی جس حد تک اس قدرتی نصب العین سے ہٹتا ہے نہ رکنے والے کوڑے کی شکل میں وہی ان پر برستا رہتا ہے۔ ٹھیک جیسے بل سے نکلنے والے چوہے کو بلی دبوچ لیتی ہے۔ اپنے نصب العین سے ہٹنے والوں کو الشیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے، اس کو اسی لیے بنایا گیا ہے۔ یہی اس کا کام ہے ایک جگہ نہیں قرآن میں مختلف مقامات میں یہی بات بتائی گئی ہے۔

ان عبادی لیس لک علیھم سلطن　　　میرے بندوں پر تجھے کوئی قابو حاصل نہیں ہے۔

اور اس کے ساتھ یہ اعلان بھی ہے۔

واجلب علیھم بخیلک و رجلک و　　　اور چڑھ جا ان پر اپنے سوار اور پیادوں کے ساتھ
شارکھم فی الاموال والاولاد وعدھم　　　اور ساجھی بن جا ان کے مالوں اور بچوں میں اور وعدے
ومایعدھم الشیطان الاغرورا　　　کر ان سے اور شیطان کے وعدے تو دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے

اللہ سبحانہ کی بغاوت پر زندگی جو بڑھتی اور چڑھتی جاتی ہے دراصل وہ خود نہیں بڑھتی ہے بلکہ شیطان جو ان کو قابو میں کیے ہوئے ہے وہ ہی بڑھاتا اور چڑھاتا ہے۔ اسی موقعہ پر شیطان کی زبانی قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اس نے آدم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا لاحتنکن ذریتہ الاقلیلا میں ڈھائی لگاؤں گا اس کی اولاد کو۔ گدہوں اور گھوڑوں کے منہ پر جاتے

لگام کے رسی باندھ کر کبھی کھینچتے ہیں اسی کو عربی اختناک اور اردو میں ڈہائی لگانا کہتے ہیں۔شیطان کا کام یہ ہے کہ جس چیز میں کامیابی نہیں وہ باور کراتا ہے کہ اسی میں کامیابی ہے۔ دوام کی خاصیت سے جو واقع میں محروم ہے دھوکہ دیتا ہے کہ وہ خلود بخش ہے۔جن اعمال و افعال کا بالآخر کوئی نتیجہ نہیں باور کراتا رہتا ہے یہی نتیجہ خیز ہیں۔جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا سکھاتا رہتا ہے کہ سب کچھ اسی راہ میں ملتا ہے۔الغرض جو ہے شیطان کی تسلط کے بعد نظر آتا ہے کہ وہ ہی نہیں اور جو نہیں ہے وہی ہے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

فرشتوں اور شیاطین کی غیبی قوتوں کو جب عالم غیب کی خدا کی بنائی ہوئی قوتیں مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ روحوں کی پاکیزگی میں اگر فرشتے ذریعہ ہیں تو روحوں کی گندگی کا شیاطین سبب ہیں آخر اجسام کی صحت اور بیماری کے لئے آپ حیاتین اور جراثیم کو مانتے ہیں تو پھر روحوں کی صحت اور بیماری کے اسباب کا آپ کیسے انکار کر سکتے ہیں۔فرق صرف یہی ہے کہ حیاتین اور جراثیم کو آپ کا ڈاکٹر خوردبین کے ذریعے جانتا ہے اور آپ کو بتاتا ہے اور ملائکہ اور شیاطین کا اللہ کا رسول نور نبوت کے ذریعے ادراک کر لیتا ہے اور آپ کو بتاتا ہے۔افسوس ہے کہ جن ان دیکھے اسباب و علل کو بتانے کے لیے نبوت آتی ہے ان ہی ان دیکھی باتوں کو بنیاد بنا کر آپ نبی کی قوت میں شک اندازی کرتے ہیں طبیب کے پاس مریض اسی لیے تو جاتا ہے کہ مرض کے جن اسباب کا اسے پتہ نہیں طبیب ان کا علم حاصل کرے اور اسی کے مطابق علاج کرے لیکن بیماری کے جن پوشیدہ اسباب کی حکیم نشاندہی کرتا ہے۔اگر مریض ان ہی پوشیدہ اسباب کو دلیل بنا کر طبیب کی طبابت کا انکار کرنے لگے تو اب ایسے مریض کو کیا کہیں گے۔بتائیے اس قسم کے مریضوں کا علاج دنیا کا کون حکیم کر سکتا ہے۔بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حواس اور عقل کے ذریعے جن چیزوں تک رسائی ممکن نہ تھی ان ہی کو بتانے کے لیے وحی آتی ہے۔

اس لیے آیت کا مطلب عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ کی تشریح کے مطابق یہ ہے کہ شیطان نے مشرکین مکہ میں یہ وسوسہ اندازی کی کہ تم جو کچھ کر رہے ہو بالکل درست ہے حالات تمہارے لیے سازگار ہیں۔میں تمہارا مددگار ہوں۔جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں اور شیطان کو مسلمانوں کی سمت میں فرشتے نظر آئے تو شیطان نے راہ فرار اختیار کر لی۔اور بول پڑا کہ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے مجھے وہ کچھ نظر آرہا ہے جو تم نہیں دیکھتے ہو مجھے اندیشہ ہے کہ ملائکہ کی گرفت میں آجاؤں!اور قیامت سے پہلے ہی میرا کام تمام ہو جائے۔اللہ کی ذات شدید العقاب ہے۔قیامت تک مہلت کے باوجود اس عذاب سے دوچار ہو سکتا ہوں

یہ آیت قرآنی کی وہ تشریح ہے جو ابن جریج نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے بتائی ہے اس صورت میں آیت قرآنی میں آئے ہوئے افعال تزیین، قول، نکوص میں اسناد مجازی ہوگی۔

اور اگر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ کی اس تشریح کو آیت کی تفسیر میں اپنایا جائے جسے ابن کثیر اور

ابن جریر نے بحوالہ علی ابن ابی طلحہ رحمۃ اللہ پیش کیا ہے۔ اور جسے محمد بن اسحاق نے بحوالہ کلبی عن ابی صالح پیش کیا ہے۔ کلبی کی روایات تو محدثین کے یہاں قابلِ پذیرائی نہیں ہیں۔ علی ابن ابی طلحہ کے تفسیری نوٹ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اگرچہ معتبر ہیں مگر انقطاع کا دھبہ ان کی پیشانی پر بھی ہے۔ محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ علی ابن ابی طلحہ رحمۃ اللہ کا خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ پھر بدر میں خود حضرت عبداللہ بن عباس کی عمر ۳ سال ہے یہ بھی ارسال کی نشاندہی کرتی ہے بہرحال روایت کی تاریخی حیثیت کچھ ہو اس کی بنیاد پر اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ شیطان بدر کے روز سراقہ ابن مالک کا لبادہ پہن کر آیا۔ شیاطین کا تمثل ہے۔ ملائکہ کا تمثل قرآن سے ثابت ہے۔ فتمثل لھا بشرا سویا۔ ارواحِ طیبہ کے تمثل کو مان لینے کے بعد ارواحِ خبیثہ میں کونسا استحالہ ہے شیطان کی روحِ خبیث نے سراقہ ابن مالک کی صورت اختیار کر لی۔ بعد کو اس نے میدانِ جنگ سے گریز پائی اختیار کر لی۔ مشرکین کو شکست ہوئی۔ اہلِ مکہ کا شکست کے بعد تأثر یہ تھا کہ ہماری ناکامی کا باعث سراقہ ابن مالک ہے۔ سراقہ نے ہمیں ہرا دیا۔ امام رازی نے یہ بات بہت اونچی لکھی ہے کہ فیہ معجزۃ عظیمۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ شیطان کے سراقہ کے لبادہ پہن کر آنے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاندار معجزہ ہے۔

تاریخِ انسانی کا عجیب واقعہ

(۴۹) اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھے کہنے لگے کہ ان مسلمانوں کو دین کا نشہ چڑھا ہوا ہے اور جو بھی اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو بلاشبہ اللہ بڑے دبدبہ والا اور حکیم ہے۔ مسلمانوں کی تھوڑی جمعیت اور بے سروسامانی اور اس پر ایسی دلیری و شجاعت کو دیکھتے ہوئے منافقین اور ضعیف القلب لوگ کہنے لگے تھے کہ یہ مسلمان اپنے دین کی حقانیت پر مغرور ہیں جو اس طرح اپنے کو موت کے منہ میں ڈال دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ یہ غرور نہیں توکل ہے جس کو اللہ سبحانہ کی زبردست قوت پر اعتماد ہو اور یقین رکھے کہ جو کچھ اوپر سے ہوگا عین حکمت و صواب ہوگا وہ حق کے معاملہ میں ایسا ہی بے جگر اور دلیر ہو جاتا ہے [1]

مشرکین کے تذکرے کے بعد اب منافقین اور حاسدین کا ذکر ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ حقائق سے بے خبر اور مادہ پرست لوگ دین میں سرشاریوں کو دیکھ کر کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ اس دور کے دانشوروں یا ترقی پسندوں کا اہلِ ایمان کے بارے میں تاثر تھا کہ غر ھولاء دینھم۔ ان کو ان کے دین نے دھوکہ دے دیا ہے۔ گویا وہ اپنے خیال میں ان لوگوں کو بیوقوف اور احمق سمجھ رہے تھے جو سچائی کے ساتھ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو تکلیفوں مشقتوں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اور خطرات میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کی رائے میں یہ سراسر احمقانہ فعل تھا کہ محض حق پرستی کی خاطر تمام دنیا کی دشمنی مول لی جائے البقرہ کے شروع میں ان ہی منافقین اور دل کے بیماروں کا یہ نعرہ پڑھ چکے ہو۔ انو من کما آمن السفہاء کیا ہم بھی ان بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں۔ یہاں بھی یہی کہہ رہے ہیں صرف تعبیر کا اختلاف ہے غر ھولاء دینھم اور تعبیر کا یہ اختلاف حالات کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ آج بھی دنیا چودہ صدیاں گذر نے پر صدر اول کے مسلمانوں کی کامیابی پر حیران ہے صرف بدر ہی نہیں بلاشبہ صدر اول میں مسلمانوں کے حالات کا یہ انقلاب شرمناک اور رسواکن ضعف و ذلت کے بعد یہ زبردست طاقت اور سربلندی یاس و نو میدی کے بعد یہ زندگی اور تازگی خواب غفلت کے بعد یہ بیداری مقہوری، مجبوری اور مظلومی کی حالت میں کامیابی تاریخ کا ایک نادر اور انوکھا واقعہ ہے۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ تاریخ انسانی میں اس سے زیادہ عجیب و غریب واقعہ پیش نہیں آیا۔ صرف بدر ہی نہیں بلکہ پوری اسلامی زندگی کی کامیابی پر دنیا حیران ہے۔ اس وقت کے ترقی پسندوں نے تو غر ھولاء دینھم کہہ کر اپنے کو مطمئن کر لیا تھا لیکن اس زمانہ کے دانشور اور ترقی پسند اس کامیابی پر کیسے حیران ہیں یہ ان کی زبانی سنئے۔

اسٹوڈرڈ امریکی اپنی کتاب جدید دنیائے اسلام میں لکھتا ہے۔

> تاریخ انسانی میں جس قدر واقعات ہوئے ہیں اسلام کے ظہور کا واقعہ شاید ان سب سے زیادہ عجیب ہے۔ اسلام کا ظہور اس قوم میں ہوا جو بالکل غیر منظم اور پراگندہ تھی اس ملک میں جو انحطاط کی آخری حد کو پہنچا ہوا تھا لیکن ابھی پوری ایک صدی نہ گذری تھی کہ اسلام نصف کرۂ ارض میں پھیل چکا تھا۔ بلند اور طاقتور ممالک کو اس نے زیر وزبر کر کے دکھا دیا تھا۔ قدیم ترین مذاہب کو جو صدیوں بلکہ ہزاروں سال پیشتر سے قائم تھے ڈھا دیا۔ انسانوں اور قوموں کی ذہنیتیں بدل دیں۔ اور ایک نئی دنیا کی طرح ڈال دی جو انتہائی مضبوط اور طاقتور تھی۔ یہی عالم اسلام ہے۔

یہی مصنف اسی کتاب میں لکھتا ہے۔

> اسلام کی اس عظیم الشان کامیابی پر جس قدر ہم غور کرتے ہیں اسی قدر تعجب میں اضافہ ہوتا ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب نے نشوونما پائی اور مشکلات ورکاوٹوں کا مقابلہ کرنے میں بہت سست رفتار سے کامیابی حاصل کی۔

مشہور مؤرخ گبن لکھتا ہے۔

> عربوں نے بہت معمولی قوت سے شاہان روم و ایران کے خلاف محاذ قائم کیا اور یہ دونوں عظیم الشان حکومتیں دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسے دشمن کا شکار ہو گئیں جسے یہ دونوں صدیوں سے حقیر سمجھتی تھیں۔

مارکس مارموف اپنی کتاب العالم الاسلامی میں لکھتا ہے۔

ہمارے لیے یہ سمجھنا تقریباً ناممکن ہے کہ کس طرح عربوں نے جو مختلف قبائل میں تقسیم تھے اور جن کے پاس ضروری جنگی سامان نہ تھا۔ اس قدر قلیل مدت میں رومیوں اور ایرانیوں کو شکست دے دی۔

بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی کامیابی پر صرف مدینے کے منافقین ہی حیران و ششدر نہ تھے بلکہ آج تک پوری دنیائے دانش و بینش حیران ہے۔ وہ بھی کہتے تھے۔ غر هٰؤلاء دینهم اور آج بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ تعبیرات مختلف ہیں روح دونوں جگہ ایک ہے۔

قرآن نے یہاں اس کا جواب دیا ہے۔ و من یتوکل علی اللہ الخ آیت کی تشریح میں حضرت شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا کہ یہ غرور نہیں توکل ہے اور مولانا عثمانی فرماتے ہیں جس کو اللہ سبحانہ کی زبردست قوت پر اعتماد ہو وہ حق کے معاملہ میں ایسا ہی بے جگرا اور دلیر ہوتا ہے۔ آیئے ان دونوں بزرگوں نے جو کچھ اجمال و اختصار سے فرمایا ہے اس کی تشریح سن لیجئے۔ بتایا جا رہا ہے کہ ان شاندار فتوحات کا راز اور اس حیرت انگیز انقلاب کی وجہ یہ اور صرف یہ تھی کہ حضور اقدس ﷺ کی تعلیم کی برکت سے عربوں میں ایک نئی روح اور نیا ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح بے خدا اور غیر منظم نہ تھے بلکہ وہ ایک زندہ نظام حیات کے حامل اور زبردست قوت کے مالک تھے۔ ان کو از سر نو زندگی ملی تھی۔ ان کی دفاعی تربیت بالکل نئے طریقہ پر ہوئی تھی۔ ان کی ذہنیتوں میں انقلاب آ چکا تھا دنیا ان کے لیے اور وہ دنیا کے لیے بالکل بدل چکے تھے۔ انہیں احساس ہوا کہ اللہ نے ان کو اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائیں اور انسانوں کی بندگی چھڑا کر خدا کی بندگی پر آمادہ کریں۔ انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر کشادگی کی طرف لائیں اور ادیان کو کجروی اور بے اعتدالی سے نکال کر اسلام کی صاف صراطِ مستقیم پر لگائیں۔ ان کو یقین غالب تھا کہ اللہ سبحانہ ان کی مدد کا ضامن ہے اس نے ان سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے۔ اور خدا کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ انہیں اللہ سبحانہ اور اس کے وعدوں پر یقین تھا۔ قلت اور کثرت کا سوال ان کے لیے ہیچ ہو گیا۔ خطرات کا خوف ان کے دل سے جاتا رہا۔ ان کو اللہ سبحانہ کا یہ ارشاد یاد رہا۔

ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم و ان یخذ لکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ۔
وعلی اللہ فلیتوکل المومنون۔

مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ وہ اللہ سبحانہ کے قانون کے فروغ کی جدوجہد اور عام انسانوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ اللہ ان کا مددگار ہے اور ان کی کامیابی کا ذمہ دار ہے۔ ان کے دلوں کا اطمینان اور اللہ پر اعتماد اسی اعتقاد کا نتیجہ تھا۔ اس عقیدہ کی بدولت مسلمانوں میں عجیب و غریب بے خوفی پیدا ہو گئی تھی وہ اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر ایسے کام

کر گذرتے تھے جو انسانی طاقت سے باہر ہیں۔اس عقیدہ نے مسلمانوں میں بے پناہ قوت پیدا کر دی تھی۔کیسے ہی ناخوشگوار حالات پیش آتے ان کے عزم و ارادے میں کوئی ضعف نہ آتا ان کے سکون و اطمینان میں کوئی فرق نہ پڑتا۔تعداد اور ساز و سامان کو وہ ہیچ سمجھنے لگے تھے اور اسباب کی پرستش سے وہ بے نیاز ہو گئے تھے ان کے دل مضبوط تھے۔ہمتیں بلند تھیں عزائم پختہ تھے ان کی نظروں میں دین و اخلاق کی اتنی عظمت تھی کہ دنیا اور دنیا کی ساری زینتیں ان کی نگاہوں میں ہیچ ہو گئیں تھیں۔میدان جنگ میں ان کے سب سے بڑے مددگار ان کے اخلاق عالیہ اور ان کی ایمانی صفات تھیں۔ان کا سب سے بڑا اثاثہ اللہ پر اعتماد و توکل اور اللہ سبحانہ کی عزت و حکمت کا یقین تھا اسی کو یہاں قرآن نے و من یتوکل علی اللہ فان اللہ عزیز حکیم کہا یعنی کہنے والا ان کی فتوحات کو دین کا نشہ بتا رہا ہے۔نشہ کی حالت اچھی نہیں ہوتی یہ دین کا نشہ نہیں بلکہ پورے شعور اور کامل دانائی کے ساتھ اللہ سبحانہ پر بھرپور اعتماد و توکل ہے۔

یہ کہنے والے کون تھے کہ غر ھؤلاء دینھم ان کو دین نے مغرور بنا دیا ہے اس میں شارحین قرآن نے مختلف باتیں کہی ہیں۔قرآن تو صرف یہ بتا رہا ہے کہ کہنے والے منافقین اور دل کے مریض تھے۔ابن کثیر نے علی ابن ابی طلحہ رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ کی رائے نقل کی ہے کہ یہ کہنے والے مشرکین مکہ تھے۔قتادہ کہتے ہیں کہ ابوجہل اور اس کے ہمنوا تھے۔ابن جریج کہتے ہیں کہ مکہ میں کچھ منافقین تھے۔مجاہد کہتے ہیں کہ قریش کے سربرآوردہ حضرات تھے الحسن بصری کہتے ہیں کہ وہ لوگ تھے جو بدر میں شریک نہیں ہوئے یعنی مسلمان بہرحال اسی قسم کے خیالات ان منافقین کے بارے میں شارحین قرآن نے ظاہر کیے ہیں اوروں کا پتہ نہیں قرآن کا انداز بیان بتا رہا ہے کہ یہ مسلمانوں میں سے نہیں ہیں مشرکین کو قرآن نے منافق نہیں کافر ہی کہا ہے اس لیے بلاشبہ ان منافقین سے مراد مدینے کے وہ یہود ہیں جنھوں نے اسلام کا بھیس بدل رکھا تھا۔انھوں نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکہ دے رکھا ہے ہیں تو مٹھی بھر مگر مقابلہ کرنے گئے ہیں قریش کی مسلح فوج کا۔یہ باتیں جب ان لوگوں کی جانب سے ہوں جو مردم شماری میں مسلمان ہوں اور حالات بھی وہ ہوں جو بدر میں تھے تو اس کے اثرات بہت خطرناک ہو سکتے ہیں لیکن اللہ نے اہل ایمان کو ان کے زہر سے محفوظ رکھا۔

وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ يَتَوَفَّى ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ
وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَٰرَهُمْ ۚ وَذُوقُوا۟ عَذَابَ ٱلْحَرِيقِ ۝ ذَٰلِكَ
بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ ٱللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّٰمٍ لِّلْعَبِيدِ ۝
كَدَأْبِ ءَالِ فِرْعَوْنَ ۙ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَفَرُوا۟ بِـَٔايَٰتِ
ٱللَّهِ فَأَخَذَهُمُ ٱللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ قَوِىٌّ شَدِيدُ
ٱلْعِقَابِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ ٱللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا
عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا۟ مَا بِأَنفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ
عَلِيمٌ ۝ كَدَأْبِ ءَالِ فِرْعَوْنَ ۙ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ
كَذَّبُوا۟ بِـَٔايَٰتِ رَبِّهِمْ فَأَهْلَكْنَٰهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَغْرَقْنَآ
ءَالَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوا۟ ظَٰلِمِينَ ۝

اور اگر تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آجاتا جب فرشتے ان کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے اور ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر یہ کہتے ہوئے مار رہے تھے کہ اب جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو ـــــ تو یہ ایک خوفناک منظر ہوتا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تمہارے ہاتھوں نے اعمال کے ذریعے اس کے اسباب آگے روانہ کیے تھے اور اس لیے ہوا کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ یہ صورتحال آلِ فرعون اور ان کے پیشرؤں کے دستور کے مطابق ہے جنھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تھا تو اللہ ان کے

گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا تھا بلاشبہ اللہ طاقتور سخت پاداش والا ہے[67] یہ اس لیے ہوا کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو نعمت کسی قوم کو عطا کر دیتا ہے اسے اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ انعام یافتہ لوگ خود اپنے اعمال کو نہ بدل ڈالیں اور اس لیے بھی کہ اللہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے[68]۔ ان کے ساتھ بھی معاملہ ایسا ہی ہوا ہے جیسا آلِ فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کے ساتھ ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے مالک کی آیات کی تکذیب کی تھی ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر ڈالا اور آلِ فرعون کو ہم نے دریا برد کر دیا اور وہ ظلم پیشہ لوگ تھے[69]۔

مُفردات کے معانی

یتوفی۔ توفی سے مضارع ہے توفی کے لغت میں اصل معنے پورا لینے اور اس پر پورا قبضہ کر لینے کے ہیں نیند کی حالت میں آدمی کا ہوش پورا اٹھا لیا جاتا ہے اور موت کے وقت میں آدمی کی روح پورے طور پر قبض کر لی جاتی ہے۔ اس لیے مجازاً قرینے کی موجودگی میں نیند اور موت کو توفی کہہ دیتے ہیں۔ یہاں ملائکہ کا ذکر قرینہ ہے اس بات کا کہ توفی موت کے معنے میں ہے علامہ گازرانی تفسیر بیضاوی کے حاشیہ میں لکھتے ہیں —— توفی کا لفظ نیند کے لیے مجازاً استعمال ہوا ہے کیونکہ وہ بھی ایک طرح کا پورا لینا ہے۔ جن لوگوں کا مذاق عربیت پختہ نہیں ہے وہ جب دیکھتے ہیں کہ عام لوگ توفی کو موت کے معنے میں لیتے ہیں —— تو وہ اسی کو توفی کے حقیقی معنے سمجھ لیتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔ بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ بلغاء کے محاورات میں توفی کا استعمال اس کے حقیقی معنی میں ہوتا ہے۔ علامہ ابوالبقاء کلیات میں رقمطراز ہیں کہ توفی کے دو معنے ہیں مجازی اور حقیقی موت دینا مجازی ہیں اور یہ عام لوگوں کا استعمال ہے اور حقیقی معنے پورا لینا ہے اور یہ بلاغت کار لوگوں کا استعمال ہے۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں کہ کبھی موت اور نیند کو بھی توفی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

حریق۔ آگ، جلانے والا، جلا ہوا حرق سے جس کے معنے جلانے کے ہیں بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ فاعل اور مفعول دونوں کے معنے دیتا ہے یہاں بمعنے فاعل آگ کے معنے میں ہے۔

ظلام ظلم کرنے والا ظلم سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذاتِ گرامی سے نفی ظلم کے سلسلے میں یہاں مبالغہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ ظلام میں مبالغہ کمیت کے اعتبار سے ہے کیفیت کے لحاظ سے ہرگز نہیں اللہ سبحانہ ذرا بھی ظلم نہیں کرتا یہ مطلب نہیں کہ زیادہ ظلم نہیں کرتا تھوڑا کرتا ہے۔ نیز یہ بھی خیال رہے کہ ظلام اسم نسبت بھی ہے۔ اور عطار کی طرح آتا ہے یعنی جس طرح کھجور کی نسبت سے تمار۔ اور عطر کی نسبت سے عطار بولتے ہیں ایسے ہی ظلم کی نسبت سے ظلام بولتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ کی طرف ظلم کی نسبت ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

دأب حال عادت، رسم دستور اس عادت مستمرہ کا نام کہ جو ہمیشہ ایک حالت پر رہے داب ہے یہ اصل میں داب یداب کا مصدر ہے جس کے معنے لگاتار کسی کام میں لگنے کے ہیں اور اسی سے اس کا استعمال عادت اور طریقہ کے معنے میں ہوتا ہے۔

ذنب گناہ ذنوب جمع اصل میں ذنب کے معنے کسی چیز کی دُم پکڑنے کے ہیں اور دم کے اعتبار سے ہی اس کا استعمال ہر اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جس کا انجام برا ہو۔ اور اسی وجہ سے برے انجام کا نام ذنب ہے اور چونکہ گناہ کا انجام برا ہوتا ہے اس لیے اسے ذنب کہتے ہیں۔

آل فرعون یہ بات بار بار بتائی جا چکی ہے کہ آل کا لفظ صرف اولاد کے معنے میں نہیں ہوتا بلکہ اس کا اطلاق قوم اور اتباع سب پر ہوتا ہے۔ آل فرعون سے مراد قوم اور فرعون کے اتباع ہیں اسی روشنی میں ان آیات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

قریش کی بدر میں ہلاکت کی تشبیہہ

جس طرح دوسری قوموں کے لیے عذاب کے مختلف معجزات ظاہر ہوئے اسی طرح قریش کے لیے بدر معجزۂ عذاب ہلاکت تھا۔ اسی کو قرآن نے مکہ ہی میں البطشۃ الکبریٰ کہہ کر ڈرایا تھا۔ ہجرت سے پہلے حضور اقدس ﷺ کی دعا سے قریش پر قحط کا عذاب آیا جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا۔ بعض رؤسائے قریش نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر کہا کہ محمد تم رحمت و شفقت اور صلہ رحم کی دعوت دیتے ہو، تم دیکھتے ہو کہ اس قحط سے قریش کا کیا حال ہے حضور اقدس ﷺ نے دعا فرمائی اور یہ بلا دُور ہوئی۔ مگر پھر قریش کی سرگردانی کا وہی حال ہو گیا تو ان کے لیے معجزہ عذاب کے سوا کوئی طریقہ علاج باقی نہ رہا چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا البطشۃ کبریٰ (بڑی پکڑ) ان کے لیے ہلاکت کی نشانی قرار پائی۔ قرآن حکیم نے ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں اپنا یہ اعلانِ عام سنا دیا تھا۔ جس میں پہلے قحط کی۔ پھر ان کے گڑگڑانے کی اور اس کے بعد غزوۂ بدر کی پیشین گوئی تھی۔

فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین یغشی الناس ھٰذا عذاب الیم ربنا اکشف عنا العذاب انا مومنون انّٰی لھم الذکرٰی وقد جاءھم رسول مبین ثم تولوا عنہ وقالوا معلم مجنون انا کاشفوا العذاب قلیلا انکم عائدون یوم نبطش البطشۃ الکبرٰی انا منتقمون ولقد فتنا قبلھم قوم فرعون۔

اس روز کا انتظار کرو جب آسمان کھلے طور پر ایسا دھواں لے کر آئے جو لوگوں کو اپنے اندر ڈھانپ لے یہی تو سب سے دردانگیز سزا ہے۔ اس وقت وہ کہیں گے۔ اے ہمارے آقا و مولیٰ تو ہم سے یہ عذاب ہٹا لے ہم سب کچھ مان لیں گے (مگر) ان کو سمجھ کہاں ہے حالانکہ ان کے پاس کھلے طور پر خدا کا فرستادہ آچکا ہے پھر بھی اس سے روگرداں ہیں اور کہہ رہے ہیں پڑھایا گیا پاگل ہے۔ بلاشبہ ہم عذاب کو تھوڑا سا ہٹائیں تم ضرور پھر وہی کچھ کرکے رہو گے۔ اس دن کا انتظار کرو جب ہماری پکڑ رونما ہوگی۔ بلاشبہ ہم بدلہ لینے والے ہیں۔ اور ان سے پہلے ہم فرعون کی قوم کو آزما چکے ہیں۔

ان آیاتِ کریمہ میں پورے واقعہ کی تصویر کھینچ دی گئی ہے اور آخر میں یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ بطش اکبر ان رؤسائے قریش کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو فرعون کے لیے غرقِ بحر کی حیثیت تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے بیان کیا ہے کہ یہ آیتیں قریش کی شان میں نازل ہوئی ہیں قریش نے جب نافرمانی کی تو آنحضرت ﷺ نے اللہ سبحانہ سے دعاء کی کہ اے اللہ ان پر حضرت یوسف علیہ السلام کے سات برس والے قحط کی طرح قحط نازل فرما۔ چنانچہ مکہ میں سخت قحط پڑا یہاں تک کہ بھوک سے آسمان اور قریش کی آنکھوں کے درمیان دھواں سا اٹھتا نظر آتا تھا۔ انھوں نے حضورِ اقدس ﷺ سے آکر دعاء کی درخواست کی چنانچہ آپ نے دعاء کی اور بارش ہوئی۔ اللہ سبحانہ نے فرمایا کہ وہ پھر اپنی حالت پر آجائیں گے یعنی ایمان قبول نہ کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بطشۃ الکبریٰ کا دن مقرر فرمایا یعنی بدر۔

مرنے کے وقت کا سماں

(۶۵) اور اگر تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آجاتا جب فرشتے ان کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے اور ان کے چہروں اور پیٹھوں پر یہ کہتے ہوئے مار رہے تھے کہ اب جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو تو یہ ایک خوفناک منظر ہوتا۔ یعنی مار کر کہتے ہیں کہ ابھی تو یہ لو اور عذابِ جہنم کا مزہ آیندہ چکھنا۔ بہت سے مفسرین نے اس کو بھی بدر کے واقعہ میں داخل

کیا ہے یعنی اُس وقت جو کافر مارے جا رہے تھے ان کے ساتھ فرشتوں کا یہ معاملہ تھا مگر آیت کے الفاظ سب کافروں کو عام ہیں اس لیے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ عالم برزخ کا ہے اب بدر کے واقعات سے تعلق یہ ہوگا کہ دنیا میں ان کافروں کی یہ گت بنی برزخ میں یہ ہو رہا ہے اور آخرت کے عذاب کا تو کہنا ہی کیا ہے [1]

حافظ ابن کثیر نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے کہ آیات کا سیاق اگرچہ کفار بدر کی روح نکالے جانے کے متعلق ہے مگر مرنے کے وقت ہر کافر کا یہی حال ہوتا ہے اسی لیے آیت میں کفار بدر کی تخصیص نہیں بلکہ سورۃ انعام میں سب کافروں کے بارے میں یہی بات بتائی ہے۔

ولو ترىٰ اذ الظالمون فی غمرات الموت والملائكة باسطوا ايديهم اخرجوا انفسكم۔

اور اگر تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آجائے جب سب ظلم کار لوگ جانکنی کی بے ہوشیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں باہر نکالو پکڑیں تو آپ حیران ہو جائیں گے۔

یعنی موت کی باطنی اور روحانی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے روح قبض کرنے اور سزا دینے کو ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے

سورہ محمد ﷺ میں موت کے وقت کا حال بیان ہوا ہے کہ جب فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں۔ فرمایا

فكيف اذا توفتهم الملائكة يضربون وجوههم و ادبارهم۔

پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو پورا پورا لیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے۔

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت سے پہلے کے واقعات ہیں اور اسی وقفہ کا نام برزخ ہے۔ ان آیات میں برزخ ہی کے عذاب کا چہرہ پیش ہو رہا ہے۔

زیر تشریح آیت سے جہاں یہ معلوم ہو رہا ہے کہ کافروں پر موت کے بعد ہی عذاب شروع ہو جاتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ عذاب ان پر ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر مار کی صورت میں ہوتا ہے مگر یہ منہ اور پیٹھ وہ نہیں جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے بلکہ اس آیت میں نہایت بلیغ انداز میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکانے وقت کبھی آگے منہ پر اور کبھی پیچھے پیٹھ پر مارتے ہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

اسی طرح گویا کافر کی روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو۔

صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآن عزیز کی متعدد آیات میں برزخ کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ احادیث صحیحہ میں بھی عالم برزخ کی تفصیلات آئی ہیں۔ لیکن احادیث میں برزخ کے حالات عموماً قبر کی اصطلاح میں بیان کیے گئے ہیں مگر لفظ قبر سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں ہے جس کے نیچے کسی مردے کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں اور وہ ارواح و نفوس کی دنیا ہے مادی عناصر کی نہیں۔ اسی لئے اللہ سبحانہ نے قرآن پاک میں اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ نفوس اور نفس کو خطاب کیا ہے ان ہی کے عذاب و ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر ہے۔ اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والے کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنی ہوتا ہے۔ تم نیند میں ہو اور تمہارا نیم مردہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے۔ یا باغ و بہار کی لذتوں میں مصروف ہے تم کو اس سے وہ ہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف و راحت سے مل سکتی ہے اس خواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے اسی طرح موت کے خواب میں تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہو گا۔ اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب و راحت سے متاثر ہو گی کہ اعمال کی اصل ذمہ دار روح ہے۔ جسم خاکی نہیں۔ فرمایا کل نفس بما کسبت رھینۃ۔ یعنی ہر جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرد ہے اس لیے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں ہے۔ جسم بمنزلہ آلہ کے ہے۔ دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا۔ برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہو گا جو مادہ اور مادیات سے پاک ہو گا۔ تاہم اس کو اپنے جسم خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہو گی اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں۔

اس آیت میں یضربون وجوھھم وادبارھم سے امام رازی نے یہ لطیف بات نکالی ہے کہ کافر کی روح جب دنیا سے روانہ ہوتی ہے تو دنیا کے چھوٹنے کا تو اسے صدمہ ہوتا ہی ہے ادھر آخرت پر جب نظر کرتا ہے۔ تو ادھر بھی تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے اگاڑی اور پچھاڑی دونوں ہی میں تباہی دیکھتا ہے۔

جزا و سزا کا قانون

(۶۶) یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تمہارے ہاتھوں نے اعمال کے ذریعے اس کے اسباب آگے روانہ کیے تھے اور اس

لیے ہوا کہ اللہ سبحانہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا ہے۔ یعنی یہ سب تمہارے کرتوت کی سزا ہے ورنہ خدا کے یہاں ظلم کی کوئی صورت نہیں اگر معاذ اللہ ذرہ بھر سے رتی برابر بھی ظلم کا امکان ہوتا تو پھر وہ اپنی عظمت شان کے مطابق ظالم نہیں ظلام ہی ہوتا کیونکہ کامل کی ہر صفت کامل ہی ہونی چاہیئے کچھ کہتے ہیں کہ ظلام میں مبالغہ کمیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کیفیت کے لحاظ سے یعنی ذرا سا بھی ظلم نہیں کرتا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ زیادہ ظلم نہیں کرتا اور تھوڑا کرتا ہے۔ لیکن شیخ الاسلام جو بات فرما رہے ہیں اس میں گہری معنویت ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی ذات مجمع کمالات ہے اگر ظلم کا اس کی درجہ میں امکان ہوتا تو اللہ سبحانہ کی دوسری صفات کی طرح اس میں بھی کمال ہوتا وہ ظالم نہیں بلکہ ظلام ہوتا جیسے دوسری صفات اسے کمال ہے اس میں بھی کمال ہوتا۔ اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ ظلام عطار کی طرح اسم نسبت ہے معنے یہ ہیں کہ اس کی طرف سرے سے ظلم کی نسبت ہی نہیں ہو سکتی ہے۔

دراصل اس آیت میں اللہ سبحانہ نے جزا و سزا کا قانون اور اس کے اصول کی نشاندہی فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے جسے دانشور لوگ قانون قدرت اور زبان نبوت میں تقدیر کہتے ہیں۔ اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے۔ ہم غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اصول صرف مادیات تک محدود ہیں۔ حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، عملیات ہوں یا علمیات۔ ہر ایک میں یہ یکساں جاری وساری ہیں۔ جس طرح یہ قانون فطرت ہے کہ زہر کھانے سے جسمانی ہلاکت ہوتی ہے اسی طرح یہ بھی قانون ہے کہ گناہ سے روح انسانی مر جاتی ہے۔ اور جس طرح اصول حفظان سے لاپروائی کا نتیجہ بیماری ہے اسی طرح اصول تزکیہ قلب کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے اور پھر جس طرح اصول حفظان صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تدابیر[1] علاج کے ذریعے ہی وہ شفایاب ہوتا ہے۔

اعمال کے خواص و آثار

جس طرح دنیا میں ہر چیز کی خاصیت ہے اور وہ جب جہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت کے بھی اصول ہیں ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء کا کام ہے۔ علم النفس اور علم الاجتماع کی تحقیقاتی پہنائیوں نے اس بات کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ عالم دنیا میں اولاً عالم برزخ میں ثانیاً اور بالآخر عالم آخرت میں جو کچھ اور جتنا کچھ ہوگا وہ

[1] افادات شیخ الاسلام

تمہارے کردار کا نتیجہ ہے۔ جس طرح دنیا میں ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسانوں کو اپنے اعمال کا ایک لازمی نتیجہ عالم برزخ اور عالم آخرت میں ملنے والا ہے۔ جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے۔ اسی طرح یہ سوال بھی ہم نہیں کر سکتے کہ ہم کو اعمال کے ان نتائج سے عالم برزخ اور عالم آخرت میں کیوں دوچار ہونا پڑا ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے اشیاء کی طرح اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا ہے ہم اس کے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا پھر نبوت کی راہنمائی ارزانی فرمائی۔ اس پر انسان اگر باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کرے تو انسان کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے؟۔ اللہ سبحانہ کے یہاں اشیاء کی طرح نتائج اعمال کا یہی قانون ہے۔

گویا اس آیت میں دو اہم اور بنیادی باتیں کھول کر بتا دی گئی ہیں ایک اصلی دوسری ضمنی۔ اصلاً تو یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جزاو سزا انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ قرآن نے اس ضابطہ کو متعدد بار متعدد عنوانوں سے پیش کیا ہے۔ ضمناً یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اللہ کے یہاں عدل ہی عدل ہے؟ ظلم کا وہاں کسی درجہ میں امکان نہیں ہے۔ مجرمین کو سزا دینا اس کے عدل کا تقاضا ہے اللہ سبحانہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا ہے یہ سزا تمہارے اعمال ہی کی صورت ہے۔ لیس بظلام للعبید۔ میں مبالغہ کی نفی نہیں بلکہ نفی میں مبالغہ ہے۔ لوگوں نے قابل سزا اعمال کر کے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی تمام نقائص سے منزہ ہے۔ اسی قسم کی آیت آل عمران کے آخر میں بھی گذر چکی ہے وہاں بھی ہم نے اس پر بحث کی ہے۔

تاریخ کی شہادت

(٦٧) یہ صورتحال آل فرعون اور ان کے پیشروؤں کے دستور کے مطابق ہے جنھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تھا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا تھا بلاشبہ اللہ طاقتور سخت پاداش والا ہے۔ یعنی قدیم سے یہی دستور رہا ہے کہ جب لوگ آیات اللہ کی تکذیب و انکار یا انبیاء سے جنگ پر مصر ہوئے تو اللہ نے ان کو کسی نہ کسی عذاب میں پکڑ لیا[1]

یہاں بھی بدر کے ذکر میں فرعونیوں کا کداب آل فرعون کے عنوان سے ذکر کیا ہے اور آل عمران میں بھی بدر ہی کے ذکر میں فرعونیوں کا ذکر ہوا ہے۔ یہاں بھی تشبیہ ہے اور وہاں بھی تشبیہ ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی اقوام دنیا میں عادت مستمرہ یہی ہے۔ داب کے معنے عربی میں عادت مستمرہ ہی کے آتے ہیں علامہ آلوسی نے یہ بات خوب

[1] افادات شیخ الاسلام

لکھی ہے۔

ان کے اعمال اوران اعمال کے نتائج کی نمائش کا حال بالکل وہی ہے جو آلِ فرعون کے اعمال اور اعمال کے نتائج کا حال تھا۔

آلِ عمران میں بدر کے حالات کا اجمال ہے لیکن یہاں انفال میں بدر کے حالات کی تفصیل ہے۔ان دونوں جگہوں میں ہم آہنگی ہے۔ یہ بات الم نشرح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ بدر کی حیثیت مشرکین عرب کے لیے ٹھیک وہی ہے جو فرعونیوں کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں تھی۔یعنی سنت الٰہی یوں ہے کہ جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی بھگتتا ہے اس سے پہلے دوسری قوموں نے مثلاً فرعون وغیرہ نے اللہ کے احکام سے سرتابی کی اور آیات اللہ کی تکذیب کی اللہ نے ان کے قصور کی پاداش میں ان کی گرفت کی۔ان مشرکین مکہ کی حالت بھی ویسی ہی ہے۔لھذا اللہ سبحانہ نے ان کی گرفت بھی فرمائی۔

مطلب یہ ہے کہ نبوت کے مقابلے میں کفر و تکذیب کا رویہ جو ان مشرکین مکہ نے اختیار کیا ہے یہ کوئی نیا نہیں بلکہ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ان کے کفر و تکذیب کا رشتہ تاریخ میں فرعونیوں سے ملتا ہے۔ان کا طرزِ عمل بالکل وہی ہے جو فرعونیوں اور فرعون سے پہلی قوموں کا تھا۔انھوں نے جان بوجھ کر دنیا کی محبت کی خاطر نبوت کو جھٹلایا۔ اور اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ان کو بھی نشہ تھا کہ نحن اکثر اموالاً و اولاداً لیکن ان کا مال و اولاد ان کے کچھ بھی کام نہ آیا۔اسی طرح ان کے حق میں یہ مادی سہارے کچھ کام نہ آئیں گے۔تاریخ کی یہ ہم آہنگی اس بات کی شہادت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام دونوں کے مخاطبوں کا کفر کفر تکذیب تھا۔جب جرائم دونوں کے مشترک ہیں۔بلاشبہ سزا میں بھی ہم آہنگی ہے۔گویا اشارہ کر دیا کہ قوموں کی موت و حیات کے لیے اللہ سبحانہ کے یہاں مقررہ قوانین ہیں۔اور ان کے نتائج اٹل ہیں۔جب ایک جماعت کا کفر اور اس کی تکذیب اس حد تک پہنچ جاتی ہے جو جماعتوں کی ہلاکت کے لیے مقرر ہے تو پھر نتائج کا ظہور بھی یکساں ہوتا ہے اور یہ بھی بتادیا کہ انسان زور و اقتدار میں کتنا ہی بڑھ جائے مگر وہ حق کا راستہ کبھی نہیں روک سکتا اسے مغلوب ہی ہونا پڑے گا۔ فاخذھم اللہ بذنوبھم میں واضح کر دیا کہ دنیا میں ہر قوم خود ہی اپنی زندگی کا گھوارہ بناتی ہے اور پھر خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر بھی کھودتی ہے یعنی بالآخر اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا۔اور جب پکڑ لیا تو پھر ان کی کوئی چیز بھی ان کو اللہ کی گرفت سے نہ بچا سکی اس فقرے میں پہلے فاء لائے جو نتیجہ کے معنے دیتی ہے پھر بذنوبھم میں باء سببیہ لاکر اشارہ کر دیا کہ جو کچھ ہوا اس کا سبب ان کے گناہ تھے اور یہ نتیجہ تھا ان اعمالِ کفر کا جو وہ کرتے رہے ہیں آخر میں فرمایا ان اللہ قوی شدید العقاب یعنی جو گرفت آئی وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی اور جس طرح وہ پکڑے گئے

تے تمہاری بھی پکڑ ہوئی۔

قرآن کا تاریخی استدلال

اس آیت میں قرآن نے اجمالی طور پر گذشتہ قوموں کے واقعات سے استشہاد کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح یہاں ہر بات کے لیے مقررہ قوانین ہیں اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی سعادت وشقاوت اور زندگی وموت کا بھی ایک قانون ہے۔ اور جس طرح اللہ سبحانہ کے تمام قوانین یکساں ہیں، عالمگیر ہیں، غیر مبدل ہیں اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے۔ اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام ونتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی۔ جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں کھایا جائے اسی طرح اس قانون کے احکام ونتائج بھی یکساں ہی ہوں گے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں پیش آئیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اب سے ہزار سال پہلے تو سنکھیا کا خاصہ ہلاکت رہا ہو اور اب زندگی ہو جائے۔ بس جو کچھ ماضی میں پیش آ چکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ کے قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں۔ قرآن نے جا بجا اس قانون کو سنۃ اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

قرآن نے روسائے قریش کی طرف اشارا کر کے پوچھا۔

فھل ینظرون الا سنۃ الاولین

چنانچہ گذشتہ قوموں کے قانون پورا ہونے کے دن آ گئے۔ کفار قریش کو جو اس قانون کے تماشائی بننے کے مشتاق تھے بدر کے آنے سے پہلے ہی یہ جتا دیا گیا تھا۔

سنۃ من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا

تم سے پہلے رسول جو گذر چکے ہیں ان کی سنۃ یہی ہے اور ہماری سنۃ کو تم ٹلتا ہوا نہ پاؤ گے۔

سنتِ الٰہی کے مطابق آپ کو ہجرت کی یہ دعا ر بتائی گئی۔

رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا

اے میرے کارساز مجھے خوبی سے کہیں پہنچا اور خوبی سے نکال اور اپنے پاس سے ایک مدد کرنے والی طاقت عطا فرما۔

انبیاء کی سنت کے مطابق حضور اقدس ﷺ نے اپنے متبعین کے ساتھ ہجرت کی اور جس دن کا انتظار تھا وہ آ گیا۔ ہجرت کے دوسرے سال رمضان میں بدر کا واقعہ پیش آیا۔ اسی کو قرآن نے بطش اکبر کہا تھا۔ جب آپ غزوۂ بدر

کے لیے مسلمانوں کو لے کر نکلے تو اس وقت جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں، مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جمعیتیں تھیں، ایک قریش کا شامی قافلہ جو بدر کی راہ سے گذر کر مکہ جا رہا تھا۔ دوسرا قریش کا جنگی لشکر جو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے مکہ سے آ رہا تھا۔ اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان دو جمعیتوں میں سے ایک ان کے ہاتھ لگے گی عام مسلمان یہی سمجھے تھے کہ تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ آئے گا لیکن حضور اقدس ﷺ کو وحی الٰہی کی روشنی میں اچھی طرح معلوم تھا کہ آج معمولی فتح و شکست کا دن نہیں بلکہ اس بطشۃ الکبریٰ کا دن ہے جس کا بارگاہ الٰہی میں مدت سے وعدہ تھا۔

اس سورت میں جس میں بدر کے تمام واقعات کا ذکر ہے اس میں اللہ سبحانہ نے ظاہر کر دیا کہ یہی وہ فیصلہ کا دن تھا جس کا انتظار تھا۔

ما انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان ۔

اور یہ کچھ اس لیے ہوا کہ ایسا ہو کر رہنا تھا۔

وکان امر اللہ مفعولا۔

آخر میں فرمایا کہ :

کداب آل فرعون والذین من قبلھم کفروا بایات اللہ

یہ اس بات کی طرف اشارا ہے کہ بدر قریش کے لیے ویسا ہی حضور اقدس ﷺ کا معجزۂ ہلاکت ہے جیسے فرعونیوں کے لیے غرق بحر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزۂ ہلاکت تھا۔

قوموں کی سعادت و شقاوت کا قانون

(۶۸) یہ اس لیے ہوا کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو نعمت کسی قوم کو عطا کر دیتا ہے اسے اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ انعام یافتہ لوگ خود اپنے اعمال کو نہ بدل ڈالیں اور اس لئے بھی کہ اللہ سبحانہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ یعنی جب لوگ اپنی بے اعتدالی اور غلط کاری سے نیکی کی فطری قوتوں اور استعداد کو بدل ڈالتے ہیں۔ اور خدا کی بخشی ہوئی داخلی یا خارجی نعمتوں کو اس کے بتلائے ہوئے کام میں ٹھیک موقعہ پر خرچ نہیں کرتے بلکہ الٹے اس کی مخالفت میں صرف کرنے لگتے ہیں تو حق تعالیٰ اپنی نعمتیں ان سے چھین لیتا ہے اور شان انعام کو انتقام سے بدل دیتا ہے وہ بندوں کی ساری باتوں کو سنتا اور تمام احوال کو جانتا ہے۔ کوئی چیز اس سے پردے میں نہیں۔ لہٰذا جس سے جو معاملہ کرے گا نہایت ٹھیک اور برمحل ہوگا حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ نیت اور اعتقاد جب تک نہ بدلے تو اللہ کی بخشی ہوئی نعمت چھینی نہیں جاتی، گویا بانفسھم سے خاص نیت اور اعتقاد مراد لیا ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ قوموں اور جماعتوں کے عروج و زوال اور ان کی موت و حیات کا قانون کیا ہے فرمایا کہ یہ اللہ سبحانہ کا مقررہ قانون ہے کہ جب وہ کسی گروہ کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے تو اس میں بھی تغیر نہیں کرتا جب تک کہ خود اس گروہ کے افراد خود اپنی حالت متغیر نہیں کر دیتے۔ یعنی عادت الٰہی یوں ہی ہے اور قانون عدل اسی طرح نافذ ہے کہ جو قوم اپنی حالت خود بدلتی ہے۔ خدا داد نعمت کا شکر ادا کرنے کی جگہ کفر کرتی ہے۔ راہ ہدایت کو چھوڑ کر کجروی اختیار کرتی ہے۔ انصاف و عدل کی جگہ حق تلفی کرنے لگتی ہے تو اللہ سبحانہ بھی اپنی دی ہوئی نعمت اس سے چھین لیتا ہے عزت کی جگہ ذلت حکومت کی جگہ محکومی، حریت و آزادی کی جگہ غلامی، دولت کی جگہ افلاس اور راحت کی جگہ مصائب نازل کرتا ہے اور انجام کاریوں ہی برباد کر دیتا ہے ورنہ خدا خود کسی سے اپنی دی ہوئی نعمتیں نہیں چھینتا ہے۔ اور خواہ مخواہ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا ہے۔

دراصل اس آیت میں حکمت بیان کی جا رہی ہے اس بات کی کہ اللہ سبحانہ قوموں کی گرفت کیوں فرماتا ہے۔ فرمایا کہ جب اللہ سبحانہ کسی قوم پر انعام کی فراوانی فرماتا ہے تو یوں ہی نہیں فرماتا بلکہ اس کی نوازشیں کچھ صفات و کردار پر مبنی ہوتی ہیں۔ اسی طرح جب وہ کسی قوم کو انعام سے محروم کرتا ہے تو یوں ہی محروم نہیں کر دیتا بلکہ وہ یہ دیکھ کر کرتا ہے کہ قوم نے اپنے آپ کو ان صفات و اخلاق سے محروم کر لیا جن کی بنیاد پر اس کو انعام کا مستحق ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ جب انعام یافتہ خرابیوں میں مبتلا ہو تو ان پر اللہ کی جانب سے گرفت آئے اور اس طرح اللہ اپنی حجت تمام کر دے۔ اس گرفت کے بعد اگر قوم بیدار ہو جاتی ہے تو اس کا استحقاق باقی رہتا ہے اگر بیدار نہیں ہوتی تو وہ انعام الٰہی سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہ گویا قریش کو تنبیہ ہے کہ اب بھی موقع ہے فائدہ اٹھالو۔ اللہ سبحانہ نے تم پر جو انعام فرمایا تھا وہ تم سے چھیننا نہیں چاہتا ہے بلکہ تمہارے اعمال و اخلاق کے بگاڑ نے اس کے اسباب پیدا کیے ہیں۔ تم اپنے آپ کو بدل کر اور اصلاح کر کے پھر اپنے استحقاق کو بحال کر سکتے ہو۔

اہم قانون اجتماع

یہ آیت قرآنی بتا رہی ہے کہ جس طرح ہر بات کے لیے اللہ سبحانہ کے مقررہ قوانین ہیں اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے لیے بھی ایک مقررہ قانون ہے۔ قوموں کی سعادت و شقاوت اور ان کی موت و حیات کا بھی ایک ضابطہ ہے۔ اور جس طرح اللہ سبحانہ کے تمام قوانین یکساں ہیں عالمگیر ہیں۔ اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے اور ہمیشہ ایک طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی قوموں کے لیے سعادت، سیادت، عزت، رفعت اور برتری کی اساس، صفات و اخلاق ہیں۔ اگر وہ اچھے

افکار اچھے اعمال اور اچھے اخلاق سے مالا مال ہوتی ہے تو ان پر انعامات الٰہی کی ارزانی ہوتی ہے۔ اور اگر اچھے افکار اچھے اعمال اور اچھے اخلاق میں دوام ہوتا ہے تو انعامات میں بھی دوام ہوتا ہے۔ اشخاص کی تبدیلی سے انعامات میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے بلکہ افکار، اعمال اور اخلاق کی تبدیلی سے انعامات میں تبدیلی ہوتی ہے۔ جب تک اعمال و اخلاق اور افکار صالحہ موجود ہیں، عزت و سعادت اور سیادت و رفعت بھی موجود رہتی ہے۔ قوموں کی سعادت و سیادت اور عزت و رفعت کا مادی طاقت کی فراوانی اور عددی طاقت کی بہتات سے دور کا بھی واسطہ نہیں جیسا کہ مشرک قوموں کا تصور ہے نحن اکثر اموالا و اولادا۔ اور نہ ہی رفعت و عزت اور سعادت کا نسب اور نسبت سے کوئی رابطہ ہے جیسا کہ عام یہودی تصور ہے نحن ابناء اللہ واحباءہ۔

قرآن نے ما بانفسھم کی بلیغ تعبیر کے ذریعے اپنے مخاطبوں کے کوزہ ذہن میں یہ بات اتار دی ہے کہ اعمال، اخلاق اور افکار صالحہ سے تہی دامن ہو کر عددی طاقت مالی طاقت کو کامیابی کا ذریعہ سمجھنا اپنے آپ کو دھوکہ میں رکھنا ہے۔ جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں کھایا جائے اسی طرح اس قانون کے احکام و نتائج بھی یکساں ہی ہوں گے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں پیش آئیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ فرعونیوں کے لیے تو سنکھیا کا نتیجہ ہلاکت ہو اور قریش کے لیے زندگی ہو جائے۔ جو کچھ ماضی میں پیش آچکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اللہ کے قوانین میں تبدیلی نہیں ہے۔

قریش اور فرعونیوں میں ہم آہنگی

(۶۹) ان کے ساتھ بھی معاملہ ایسا ہی ہوا ہے جیسا آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کے ساتھ ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے مالک کی آیات کی تکذیب کی تھی۔ ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر ڈالا۔ اور آل فرعون کو ہم نے دریا برد کر دیا اور وہ ظلم پیشہ لوگ تھے فرعونیوں اور ان سے پہلی قوموں کو ان کے جرائم کی پاداش میں ہلاک کیا۔ اور خصوصیت کے ساتھ فرعونیوں کا بیڑا غرق کر دیا۔ یہ سب اس وقت ہوا جب انھوں نے اللہ سبحانہ سے بغاوت کر کے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ ورنہ اللہ سبحانہ کو کسی مخلوق سے ذاتی عداوت نہیں ہے [۱]

اسی انداز کی تعبیر پہلے بھی آچکی ہے۔ لیکن دونوں میں جوہری فرق ہے۔

۱- پہلی آیت میں کفروا بایات اللہ ہے جب کہ دوسری میں کذبوا بایات ربھم ہے

۲- پہلی آیت میں اخذھم اللہ بذنوبھم ہے جب کہ دوسری آیت میں فاھلکناھم بذنوبھم

[۱] افادات شیخ الاسلام

واغرقنا آل فرعون وکل کانوا ہے۔
تعبیر کا تنوع اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ فرعونیوں نے ذاتی طور پر جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہ اللہ کی آیات کا کفر تھا۔ یعنی دستاویز جرم میں جس چیز کی نمائش کی گئی وہ کفر تھا۔ اسی کفر کے نتیجہ میں ان میں فکری، اخلاقی اور عملی برائیاں رونما ہوتیں۔ ان برائیوں کے لیے قرآن نے ذنوب کی تعبیر اختیار کی ہے ان برائیوں کے نتیجے میں ان سے نعمتیں چھین لی گئیں اور آیندہ تباہی کے لیے یہ کہہ کر تنبیہہ کر دی۔ ان اللہ قوی شدید العقاب۔
دوسری آیت میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ہم نے ان کو نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔ ہم نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر روانہ کیا۔ انھوں نے بجائے قدر کرنے کے اس نعمت کی ناقدری کی اور اپنے مربی کی آیات کی تکذیب کی۔ اور اس طرح اللہ سبحانہ کی دی ہوئی نعمتوں کا رُخ اللہ سبحانہ کی تکذیب کی طرف پھیر دیا۔
اب ان کے دامن میں صرف گناہوں کے دھبے نہ تھے بلکہ بغاوت وسرکشی کا طوفان تھا۔ اب ہم نے ان سے صرف اپنی نعمتیں ہی نہیں چھینیں بلکہ ان کو ان کی بغاوتوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور فرعونیوں کو دریا برد کر دیا۔ یہ سب کے سب ظالم تھے۔
اس روشنی میں دونوں آیتوں میں کوئی تکرار نہیں ہے۔ پہلی آیت میں یہ واضح کیا کہ قریش مکہ کا حال کفر میں فرعونیوں کی طرح ہے۔ فرعون کی بھی پکڑ ہوئی اور قریش مکہ کی بھی پکڑ ہوئی۔ فرعونیوں کی پکڑ بھی معاشی بدحالی کی صورت میں پہلے ہوئی۔ فارسلنا علیھم الطوفان والجراد اور قریش مکہ کی پکڑ بھی قحط سالی کی صورت میں مکہ میں ہوئی۔ اور دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ قریش کا حال بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کے غلط استعمال اور حضور اقدس کا طاقت کے نشہ میں مقابلہ کرنے کی وجہ سے بدر میں ویسا ہی ہوا جیسا کہ فرعونیوں کا حال موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں دریا برد کر کے ہوا۔ دونوں میں دونوں جگہ پوری پوری ہم آہنگی ہے۔
قرآن کے اس طرز استدلال نے ایک زیادہ عام حقیقت کی طرف بھی ارشاد کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخ کا صحیح استعمال کیا ہونا چاہیے اس سے معلوم ہوا کہ تاریخ و وقائع کا مطالعہ اس لیے کرنا چاہیے کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل ہو۔ یعنی جو کچھ گذر چکا ہے وہ آئندہ کے لیے ذخیرۂ بصیرت ہو اور ماضی کے آئینے میں مستقبل کا چہرہ دیکھا جا سکے۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا
يُؤْمِنُونَ ﴿٥٥﴾ الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ
عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ﴿٥٦﴾
فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ
إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ﴿٥٨﴾ وَلَا ع
يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿٥٩﴾

اللہ کے نزدیک جانداروں میں بدترین انسانوں کا وہ گروہ ہے جس نے راہ کفر اختیار کی ہے پس وہ کسی طرح بھی ایمان کی راہ اختیار نہیں کرتے ہیں[۵۵]۔ یعنی وہ لوگ جن سے آپ نے عہد و پیمان کیا تھا۔ پھر ہر بار عہد شکنی کرتے ہیں اور ان میں قطعاً خدا ترسی کا نام و نشان نہیں ہے[۵۶] لہٰذا اگر تم ان کو لڑائی میں کہیں پاؤ تو ان کو ایسی سزا دو کہ ان کی پشت پناہی کرنے والے بھی حواس باختہ ہو جائیں تاکہ وہ بدعہدی کے انجام سے کچھ سبق لیں[۵۷]۔ اور اگر تمہیں کچھ لوگوں سے دغا اور بدعہدی کا اندیشہ ہو تو تمہیں چاہیے کہ ان کا عہد ان کی طرف اس طرح پھینک دو کہ تم اور وہ دونوں برابر ہو جاؤ۔ بلاریب اللہ سبحانہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔ اور یاد رکھو منکرین اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے۔ وہ کبھی اللہ کو ہرا نہیں سکتے ہیں[۵۸-۵۹]

معانی مفردات

عہد قول، قرار، پیمان، معاہدہ عہود جمع امام راغب فرماتے ہیں عہد اللہ یعنی خدائی عہد و پیمان تو کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اس بات کو ہماری عقلوں میں بٹھا دیتا ہے اور کبھی یہ شکل ہوتی ہے کہ اس کے پیغمبر کتاب و سنۃ کے ذریعے اس بات کا ہم کو حکم دیتے ہیں۔ اور کبھی خود اپنے التزام کی بنا پر ایک شے جو اصل شرع کے اعتبار سے ہم پر پہلے لازم نہ تھی اب لازم ہو جاتی ہے جیسے کہ نذر وغیرہ۔

تثقفنهم مضارع مؤکد ثقف سے ہے یہ باب سمع سے آتا ہے ثقف کے معنے کسی چیز کے ادراک کرنے اور اس کے انجام دینے میں مہارت کے ہیں لیکن بعد میں صرف ادراک کے معنے میں آیا ہے۔

شرد۔ یہ تشرید سے امر ہے اس کے معنے ایسی سزا دینے کے ہیں جسے دوسرے دیکھ کر بھاگ جائیں۔ شردہ کے معنے متفرق اور تتر بتر ہونے کے ہیں اسی سے الابل الشاردہ بولا جاتا ہے۔

سواء برابر اسم مصدر ہے بمعنے استواء یعنی دونوں طرف سے بالکل برابر۔ اس کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا ہے علامہ سیوطی الاتقان میں لکھتے ہیں سواء بمعنے مستوی برابر کے معنے میں ہے کسرہ کے ساتھ یہ اسم متصور ہوگا۔ جیسے مکانا سوی جگہ برابر یعنی صاف اور ہموار اور فتحہ کے ساتھ جیسے سواء علیهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم اور بمعنے وسط بھی آتا ہے اس صورت میں بھی فتحہ کے ساتھ ہوگا جیسے فی سواء الجحیم اور بمعنے تمام بھی آتا ہے جیسے فی اربعة ایام سواء قرآن میں یہ لفظ بمعنے غیر نہیں آیا ہے۔

سبقوا سبق سے ماضی کا جمع مذکر ہے باب ضرب انھوں نے سبقت کی وہ آگے نکل گئے۔ بچ گئے۔

دشمنوں سے ایفائے عہد کی تاکید

یہاں تک مشرکین مکہ کی داستان تھی اب روئے سخن مدینہ کے یہود کی طرف ہو رہا ہے۔ حضور اقدس ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہودیوں کی تین بستیاں تھیں۔ بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ حضور اقدس ﷺ نے ان سب سے صلح و امن اور باہم دگر اعانت کا معاہدہ کیا۔ معاہدہ کی ایک شرط یہ تھی کہ تمام جماعتیں مل کر رہیں گی اور اگر کسی فریق پر اس کے دشمن حملہ کریں گے تو سب اس کی مدد کریں گے لیکن ابھی معاہدہ کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ یہودیوں نے خلاف ورزی شروع کر دی۔ اور قریش سے مل کر مسلمانوں کی تباہی کی سازشیں کرنے لگے۔ حتیٰ کہ خود حضور اقدس ﷺ کو ہلاک کرنے کی تدبیروں میں لگ گئے۔ ان آیات میں بتایا ہے

کہ اب ایسے دغاباز لوگوں کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا جو کھلم کھلا ڑیں ان کا مقابلہ کرو۔ جو ایسا نہ کریں اور غدر و فریب کا ان کا اندیشہ ہو تو ان کو کھلے طور پر خبر دے دو کہ اب معاہدہ فسخ ہو گیا۔ لیکن فرمایا کہ یہ بات اس طرح کی کہ دوسرے فریق کو نقصان پہنچے یعنی وقت سے پہلے فسخ معاہدہ سے خبردار ہو جائے اور اگر تیاری کرنا چاہے تو ہماری طرح تیاری کا اسے بھی موقعہ مل جائے۔

یہاں سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن نے ہر معاملہ حتیٰ کہ جنگ کے معاملے میں بھی سچائی اور دیانت داری کا جو معیار قائم کیا ہے وہ کس قدر بلند ہے۔ کہیں بھی اس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں اخلاقی کمزوری کو پھلنے اور پھولنے کا موقع ملے۔ کیا دنیا میں اس وقت تک کسی قوم نے احکام جنگ کو اس درجہ بلند اخلاقی کے معیار پر رکھا ہے نہیں اور قطعاً نہیں۔

بدترین خلائق لوگ

(۷۰) اللہ کے نزدیک جانداروں میں بدترین انسانوں کا وہ گروہ ہے جس نے راہ کفر اختیار کی ہے پس وہ کسی طرح بھی ایمان کی راہ کو نہیں اپناتے ہیں۔ جو لوگ ہمیشہ کے لیے کفر اور بے ایمانی پر تل گئے۔ اور انجام سے بالکل بے خوف ہو کر غداری اور بدعہدی کے خوگر ہو رہے ہیں وہ اللہ سبحانہ کے نزدیک بدترین جانور ہیں۔ فرعونیوں کا حال بدعہدی اور غداری کا یہ ہی تھا۔

ولما وقع علیھم الرجز قالوا یا موسیٰ ادع لنا ربك بما عھد عندك لئن کشفت عنا الرجز لنؤمنن لك ولنرسلن معك بنی اسرائیل۔ فلما کشفنا عنھم الرجز الی اجل ھم بالغوہ اذا ھم ینکثون۔

اور جب ان پر عذاب کی سختی آن پڑی تو کہنے لگے کہ اے موسیٰ تیرے پروردگار نے تجھ سے جو عہد کیا ہے تو اس کی بنا پر ہمارے لیے دعا کر۔ اگر تیری دعا سے عذاب ٹل گیا تو ضرور ہم تیرے معتقد ہو جائیں گے اور بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے کہ تیرے ساتھ چلے جائیں لیکن پھر جب ایسا ہوا کہ ہم نے ایک خاص وقت تک کے لیے کہ انہیں اس تک پہنچنا تھا عذاب ٹال دیا تو اچانک وہ اپنی بات سے پھر گئے [1]

اصل ارشاد میں شر الدواب آیا ہے۔ یہ انداز بیان ان لوگوں کے لیے آیا ہے جو سوچنے اور سمجھنے کی

[1] افادات شیخ الاسلام

ساری صلاحیتوں کو تج کر بیٹھتے ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کی قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک ان میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت باقی ہے جن میں سوچنے کی صلاحیت ہی ناپید ہو جائے وہ نہ پہلے ایمان لائے اور نہ ان سے آیندہ ایمان لانے کی کوئی آس ہے۔ اب وہ صرف گندگی کا ایک ڈھیر ہیں۔ اللہ کی زمین پر ان کے باقی رہنے میں اب کوئی خیر نہیں ہے۔ نبوت اللہ سبحانہ کی آخری حجت ہوتی ہے جن کی آنکھوں کے پردے رسول آنے کے بعد بھی نہیں اٹھتے۔ ان کا اندھاپن لاعلاج ہے۔ اور زمین پر ان کا باقی رہنا قطعًا بے معنے ہے اللہ تعالیٰ کسی کو جینے کی جو مہلت دیتا ہے صرف جینے کے لیے نہیں دیتا بلکہ تعقل و تفکر اور تدبر و تذکر اور زندگی سنوارنے اور سدھارنے کے لیے دیتا ہے۔

قرآن کی یہ تعبیر بتا رہی ہے کہ عقل و حواس سے ٹھیک طرح کام نہ لینا اور اندھوں کی طرح چلنا انسانیت کے درجہ سے گر جانا ہے۔ قرآن اسی اندھے پن کے نتیجہ کو کفر کہتا ہے۔ لہٰذا ایمان کی راہ عقل و بصیرت کی راہ ہے اور کفر اندھے پن کا دوسرا نام ہے۔

معاہدہ کن سے ہوا؟

(۱) یعنی وہ لوگ جن سے آپ نے عہد و پیمان کیا۔ پھر ہر بار عہد شکنی کرتے ہیں۔ اور ان میں قطعًا خدا ترسی کا نام و نشان نہیں ہے حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں مدینہ کے یہود فرعونوں کی طرح آپ سے عہد کر لیتے کہ ہم مشرکین مکہ کو مدد نہ دیں گے پھر ان کی امداد کرتے اور کہہ دیتے کہ ہم کو عہد یاد نہ رہا تھا بار بار ایسا ہی کرتے رہے آگے بتلایا جا رہا ہے کہ ایسے غداروں کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے [۱]

جن لوگوں کے بارے میں شر الدواب کہہ کر پہلے ایمان نہ لانے کی خبر دی گئی ہے یہ ان کا ذکر ہے اور الذین عاھدت منھم۔ کا فقرہ پہلے جملہ الذین کفروا سے بدل ہے۔ یہ مدینے کے یہود ہیں۔ نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے سب سے پہلے مدینہ کے یہودیوں سے حسن جوار اور باہمی تعاون کا معاہدہ کیا تھا۔ اس آیت میں اسی معاہدہ کی طرف اشارہ ہے۔ جن سے یہ معاہدہ ہوا یہ کون تھے۔ اس پر مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ یہودی تھے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہودی نسلًا تھے یا صرف مذہبًا تھے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ان سے جو معاہدہ ہوا وہ کیا تھا۔

مدینہ منورہ میں ہجرت کے وقت آبادی میں یہودی کم و بیش ۴۰ یا ۵۰ فی صد تھے۔ لیکن باقی عرب آبادی کے

[۱] افادات شیخ الاسلام

مقابلے میں ان کی دولت مندی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ابن النجار کی تاریخ مدینہ کے مطابق ان یہودیوں کی اگر ۵۹ گڑھیاں تھیں تو عربوں کے قبضے میں صرف ۱۳ تھیں۔ یہ یہودی زیادہ تر تین قبیلوں بنی قینقاع، بنی النضیر اور بنو قریظہ میں منقسم تھے۔ ان میں آپس میں اتنی پھوٹ تھی کہ بعض قبیلے اگر قبیلہ اوس کے حلیف تھے تو دوسرے قبیلے قبیلہ خزرج کے حلیف تھے اور باہم لڑتے رہتے تھے۔ ان تینوں میں قینقاع عزت وحرمت میں سب سے ممتاز تھے غالباً اس کی وجہ ان کا تمول تھا۔ قینقاع کے معنے سنار کے ہیں اور بظاہر ان کا پیشہ زرگری زیور سازی، زیور فروشی اور سودی قرض دینا تھا۔ نضیر تر و تازہ درخت یا پودے کو کہتے ہیں۔ اور یہ قبیلہ نخلستانوں کا مالک اور زراعت پیشہ تھا۔ قریظہ اس درخت کو کہتے ہیں جو عرب میں دباغت کے لیے خاص طور پر کام آتا ہے گویا یہ پیشہ ور چمار تھے اور جوتے وغیرہ بناتے تھے۔ ان کو کم ذات اور حقیر سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ مورخین عرب کا بیان یہی ہے کہ یہ تینوں قبیلے نسلاً یہودی تھے لیکن تاریخی قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہودی اگرچہ ساری دنیا میں مارے مارے پھرے لیکن انھوں نے اپنے نام کہیں نہیں بدلے۔ آج بھی وہ جہاں ہیں اسرائیلی نام رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے مدینہ کے یہودیوں کے نام۔ نضیر، قینقاع اور قریظہ وغیرہ ہیں جو خالص عربی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑے مورخ یعقوبی نے صاف تصریح کی ہے کہ قریظہ اور نضیر عرب تھے جو یہودی بن گئے تھے (یعقوبی جلد ۲) نیز مسعودی نے بھی کتاب الاشراف والتنبیہ میں ایک روایت لکھی ہے کہ یہ جذام کے قبیلے سے تھے کسی زمانہ میں عمالقہ اور ان کی بُت پرستی سے بیزار ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور شام سے نقل مکانی کر کے حجاز آگئے۔ یہ تین قبیلے قینقاع، نضیر اور قریظہ مدینہ کے اطراف میں آباد تھے اس لیے باوجود دولت مندی کے ان یہودیوں کی حیثیت مدینہ میں نو وارد مہمانوں کی معلوم ہوتی ہے اصل باشندوں کی نہیں کیونکہ جب ۱ھ میں شہری مملکت مدینے میں قائم ہوئی اور یہ یہودی قبائل بھی اس میں شہری طور پر شامل ہوئے تو الگ وحدتوں کے طور پر نہیں بلکہ خالص عرب کے موالی کے طور پر شامل ہوئے۔

معاہدہ کیا تھا؟

حضور اقدس نے ہجرت مدینہ کے بعد اہل مدینہ سے معاہدہ کیا۔ یہ تو ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ شہری مملکت مدینہ کا دستور کب مرتب اور نافذ ہوا لیکن تاریخ الخمیس ص۳۹۵ ج ا میں تصریح ہے کہ یہ دستور ہجرت کے پانچ ماہ بعد مرتب ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ رجب یا شعبان ۱ھ میں یہ دستور مرتب ہوا۔ مفصل معاہدہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ اور سیرۃ ابن ہشام میں محمد ابن اسحاق کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ ہم ناظرین معالم القرآن کی ضیافت طبع کے لیے پورا معاہدہ دفعات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ کا تحریری معاہدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ تحریری معاہدہ ہے مدینے کے مندرجہ ذیل طبقوں کے درمیان

الف۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ب۔ مسلمان مہاجرین ساکنین شہر مکہ

ج۔ مدینہ کے مسلمان

د۔ مدینہ کے یہودی

ہ۔ مدینہ کے نصرانی

ذ۔ مدینہ کے غیر مسلم

دفعہ ا۔

متذکرۃ الصدر ہر شش گروہ سیاسی طور پر ایک جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دفعہ ۲۔

ان میں سے ہر گروہ فرداً فرداً مندرجہ ذیل امور کا ذمہ دار ہے۔

قریش اپنے قبائل کی طرف سے قدیمی طے شدہ اور اسلام کی طرف سے مصدقہ دیت کی ادائیگی میں انصاف و عدل کے ذمہ دار ہیں۔ اور اس دفعہ میں مدینے کے مندرجہ ذیل گروہ بھی شامل ہیں۔

۱۔ بنو عوف۔

۲۔ بنو حارث از قبیلہ خزرج۔

۳۔ بنو ساعدہ۔

۴۔ بنو جشم۔

۵۔ بنو نجار۔

۶۔ بنو عمرو بن عوف

۷۔ بنو ثعلب۔

۸۔ بنو اوس۔

دفعہ ۳۔

۱۔ کوئی گروہ دیت کی مقررہ حدوں میں تخفیف کی راہ نہ پیدا کرے۔

۲۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان کے مظلوم حلیف کے مقابلے میں اپنے حلیف کی بےجا حمایت نہ کرے۔

۳۔ جو شخص باہم ادائے دیت میں سفارش کی راہ پیدا کرنے کی سعی کرے اس شخص کے خلاف دوسرے مسلمانوں کو تمام ورثاء کی مناسب طرفداری کرنا ہوگی۔

۴۔ جو مسلمان خود یا اس کا بیٹا جماعت میں فساد اور تفرقہ پیدا کرنے میں ساعی ہو۔ اس کے خلاف تمام مسلمانوں کو یکجا ہو کر یہ فتنہ فرو کرنا چاہیے۔

۵۔ اگر کسی مسلمان کے ہاتھ سے کوئی غیر مسلم مارا جائے تو دوسرے مسلمان کا غیر مسلم کی حمایت میں مسلمان پر جور و تعدی کرنا خلافِ معاہدہ ہوگا۔

۶۔ اگر غیر مسلم مسلمان کے درپے ہو تو کسی مسلمان کو ایسے کافر کی حمایت نہ کرنا ہوگی۔

۷۔ مسلمانوں کا ہر فرد یکساں طور پر خدا کی پناہ میں ہے اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

دفعہ ۴۔

۱۔ مسلمان کے لیے کسی یہودی کے ایسے معاملے میں مدد کرنے پر کوئی حرج نہیں ہے جس سے وہ یہودی مسلمان کے انصاف پر اطمینان حاصل کر سکے۔

۲۔ مسلمان کی لڑائی میں شہید ہونے کے بعد ایک دوسرے مسلمان پر اس کی ذمہ داری عائد نہ کی جائے گی۔

۳۔ تمام مسلمان اسلام کے احسن اور اقوم طریق پر ثابت قدم رہیں گے۔

۴۔ کوئی مسلمان کسی مشرک کو مسلمان کے خلاف پناہ نہ دے گا نہ کسی ایسے مال کا ضامن ہوگا جو مشرک نے ناجائز طور پر مسلمان کے مال سے حاصل کیا ہو اور نہ کوئی مسلمان مشرک کی حمایت میں مسلمان کے درپے ہوگا۔

۵۔ مسلمان کے قتل ناحق پر اگر مقتول کے ورثاء رضامندی سے دیت لینے پر مائل نہ ہوں تو قاتل کو جلاد کے حوالے کیا جائے گا۔

۶۔ جو مسلمان اس معاہدے میں شامل ہے اگر وہ دل سے خدا تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان لا چکا ہے تو اسے کسی مفسد کی حمایت کرنا ہوگی۔ مفسد کو پناہ دینا بھی اس کی حمایت میں شامل ہے ایسے بے انصاف مسلمان پر دنیا و آخرت میں دونوں میں خدا کی لعنت اور عذاب ہے۔ جس عذاب کے بدلے میں اس سے کوئی معاوضہ قبول نہ کیا جائے گا۔

دفعہ ۵۔

مسلمان اپنے باہمی تنازعات میں خدا اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنے کے پابند ہوں گے۔

دفعہ ۶۔

۱۔ مسلمانوں کی جنگوں میں ان کی مالی اعانت کرنا ہر یہودی پر واجب ہوگا۔

۲۔ قبیلہ بنو عوف کے تمام یہود کو مسلمانوں کے ساتھ ایک فریق کی حیثیت سے مل کر رہنا ہوگا۔ مسلمان اور یہودی دونوں اپنے اپنے مذہب کے پابند ہوں گے۔

۳۔ یہ ذمہ داری بنو عوف کے غلاموں پر بھی ہوگی اور عدم پابندی کی صورت میں ان کے آقا ان کی طرف سے جواب دہ ہوں گے سرکشی کی صورت میں نہ صرف بنو عوف کے مرد بلکہ ان کے بال بچوں پر مواخذہ کیا جا سکتا ہے

۴۔ اس دفعہ میں مدینہ کے مندرجہ ذیل یہودی بھی شامل ہوں گے

۱۔ بنو نجار۔

۲۔ بنو حارث۔

۳۔ بنو ساعدہ۔

۴۔ بنو جشم۔

۵۔ بنو ثعلبہ اور ان کے حلیف۔

۶۔ جفنہ جو بنو ثعلبہ کی شاخ ہے۔

۷۔ بنو شطیبہ۔

الغرض یہ دفعہ یہودی قبیلے کے حلیفوں پر لاگو ہے۔

۵۔ ان میں سے کوئی فرد یا شاخ یا قبیلہ اس دفعہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

۶۔ ان میں سے کوئی فرد یا جماعت کسی کو مجروح کرنے پر مواخذہ سے بری نہیں ہو سکتا۔

۷۔ ان میں سے جو فرد یا جماعت قتل ناحق کا ارتکاب کرے اس کا وبال اس پر اور اہل و عیال سب پر آ سکتا ہے۔

۸۔ ان یہودیوں میں سے کسی پر ناحق ایسی تہمت پر اس کا ناصر اور حامی اللہ ہے۔

۹۔ مسلمان اور یہود دونوں اپنے مصارف زندگی کے خود کفیل ہوں گے۔

۱۰۔ دونوں فریق میں سے جو فرد اس قرارداد سے منحرف ہوگا دوسرا فریق اس باغی پر قابو حاصل کرنے میں پہلے فریق کا

معاون ہوگا۔

۱۱۔ یہود اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے گروہ اور فرد کے ساتھ صلح اور نصیحت پر عمل کریں گے اور صلح و نصیحت میں کسی قسم کی رخنہ اندازی نہ ہونے دیں گے۔

۱۲۔ فریقین میں سے کوئی فرد یا جماعت دوسرے فریق کی حق تلفی گوارا نہ کرے گا بلکہ ایک دوسرے کے مظلوم کی حمایت کرنا اس کا فرض ہوگا۔

۱۳۔ مسلمان جب تک اپنے دشمنوں سے برسرپیکار رہیں یہود ان کی اعانت کرتے رہیں گے۔

۱۴۔ شہر مدینہ میں ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرنا حرام ہے۔

۱۵۔ ہر فرد اپنے ہمسایہ کی طرفداری اپنے نفس کی مانند کرے گا۔

۱۶۔ اس معاہدہ کے پابند افراد اور گروہ باہمی اختلاف اور تنازع کا مقدمہ خدا اور اس کے رسول محمد ﷺ کے سامنے پیش کریں گے۔

۱۷۔ شرکائے معاہدہ میں سے کوئی فرد یا جماعت قریش مکہ کو اپنے ہاں پناہ نہ دے گی اور نہ قریش مکہ کے کسی حلیف کی حمایت کرے گی۔

۱۸۔ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں شرکائے معاہدہ میں سے ہر فرد اور جماعت حملہ آور کی مداخلت کے خلاف دوسرے فریق کی حمایتی ہوگی۔

۱۹۔ شرکائے قرارداد کسی جماعت کی طرف سے دشمن کے ساتھ مصالحت میں دوسرے گروہ میں شریک ہوں گے۔

۲۰۔ دشمن سے صلح کی صورت میں اگر کسی نوع کی منفعت ہوگی تو مسلمانوں کی طرح دوسرے شرکائے قرارداد بھی اس سے منتفع ہوں گے۔

۲۱۔ ہاں جو اپنے دین سے منحرف ہو جائے اس کے لیے یہ دروازہ بند رہے گا۔

۲۲۔ حالت جنگ میں معاہدہ فریق کے ہر فرد کو مالی اعانت میں اپنا حصہ ادا کرنا ہوگا۔

۲۳۔ قبیلہ اوس کے یہود اور ان کے موالی بھی اس قرارداد کے اسی طرح پابند ہیں جس طرح وہ قبائل جن کے نام آچکے ہیں۔

حرفِ آخر

۱۔ اس معاہدے کی خلاف ورزی ظالم اور مفسد کے سوا اور کوئی شخص نہیں کرسکتا۔

۲۔ جو شخص مدینہ میں خلوص اور امن کے ساتھ سکونت رکھے اور وہ جو مدینے سے خلوص اور امن کے ساتھ کسی اور جگہ نقل مکانی کرنا چاہے۔ ان دونوں پر کوئی مواخذہ نہیں لیکن فساد اور شرارت کرنے کے لیے قیام مدینہ اور یہاں

ترکِ اقامت دونوں قابلِ گرفت ہیں۔

۴۔ جو شخص دوسروں کے بھلائی کا طلبگار ہے اللہ سبحانہ اور محمد رسول اللہ ﷺ بھی اس کے خیراندیش ہیں۔

یہ ہے وہ معاہدہ جو رسول اللہ ﷺ نے ہجرتِ مدینہ کے پہلے سال میں اہلِ مدینہ سے کیا۔ قاضی سلیمان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

اس مبارک ارادے کی تکمیل کے لیے اگر کافی وقت مل جاتا تو دنیا کو پتہ لگ جاتا کہ رحمۃ للعالمین دنیا میں صلح پھیلانے اور امن قائم کرنے کے لیے تشریف لائے۔ (رحمۃ للعالمین ص۱۳۰ ج۱)

زیرِ نظر آیت الذین عاھدت منھم کی تشریح اس حد تک بے غبار ہو کر سامنے آگئی کہ حضورِ اقدس ﷺ نے کن لوگوں سے معاہدہ کیا اور اس معاہدہ کی تاریخ میں تفصیلات کیا ہیں؟

قوموں کی سیاسی اور قانونی تقسیم

اس آیت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مدینہ میں تشریف آوری کے بعد آپ کے غیر مسلم مخاطبوں نے قانونی حیثیت سے تین روپ اختیار کر لیے تھے۔ یہ تقسیم مدینہ میں اسلامی اسٹیٹ قائم ہونے کے بعد وجود میں آئی۔

۱۔ وہ لوگ جن سے آپ نے معاہدہ کیا۔

۲۔ دوم وہ لوگ جن سے آپ نے اعلانِ جنگ کیا۔

۳۔ سوم وہ لوگ جو نہ معاہد تھے اور نہ محارب۔

ان تینوں سے آپ نے وحی کی روشنی میں معاملہ فرمایا۔ یہ تقسیم سیاسی حالات کی تخلیق تھی۔ ورنہ دعوت کی بنیاد پر حضور اقدس ﷺ نے دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق مقرر فرمائے۔

۱۔ مسلمان جو قرآن اور دوسری کتابوں کو کتابِ الٰہی یقین کرتے ہیں ان میں ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور برائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں۔ اسلام میں ان کے حقوق برابر ہیں۔

۲۔ اہلِ کتاب یعنی ان کتابوں کے ماننے والے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے وہ اسلامی حکومت کے شہری بن سکتے ہیں ان کے معابد محفوظ رہتے ہیں اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس ادا کرنے پر مسلمان ان کی جان و مال اور آبرو کے محافظ ہوتے ہیں ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں۔ ان کا جائز کھانا مسلمان کھا سکتے ہیں اور اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

۳۔ شبہ اہل الکتاب۔ یعنی وہ لوگ جو ان کتابوں کو نہیں مانتے جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابئی جو ایک آسمانی کتاب کے دعوے کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوسی یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج، آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں ہندوستان اور سندھ کی فتح کے موقعہ پر علمائے اسلام نے انہی پر قیاس کر کے ہندو مَت اور برہمنوں وغیرہ کو بھی اسی صنف میں داخل کیا۔ مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے باقی تمام حقوق ان کو حاصل ہوں گے۔

۴۔ کفار و مشرکین یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دین الہٰی کی طرف منسوب ہیں۔

دونوں تقسیموں کے احکام الگ الگ ہیں ان میں خلط سے کام نہ لینا چاہیئے۔ بلاشبہ قرآن کی یہ آیت رہنما ہے کہ غیر مسلموں کی قوت کو ختم کرنے اور ان کی مدافعت کی خاطر کچھ غیر مسلموں سے معاہدہ کرنا اور ان سے تعاون حاصل کرنا جائز ہے جیسا کہ بعض بزرگوں نے آیت قرآنی اور حضور اقدس ﷺ کے معاہدہ اہل مدینہ سے استنباط کیا ہے۔ لیکن صورتیں دو ہیں۔

ایک یہ کہ اسلامی اسٹیٹ خود کچھ غیر مسلموں سے یہ سیاسی معاہدہ کرے۔ یعنی معاہد اسلامی اسٹیٹ ہو اور جن سے معاہدہ کیا جا رہا ہے وہ غیر مسلم ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معاہد مسلمان ہوں لیکن ان کا کوئی سیاسی مقام نہ ہو بلکہ سیاست میں دوسروں کے رحم و کرم پر ہوں جیسے پہلی صورت کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ایسے ہی دوسری صورت کے ناجائز ہونے کا معاملہ قطعاً بے غبار ہے۔

معاہدین کی جانب سے عہد شکنی

اس کے بعد ارشاد ہے ثم ینقضون عھدھم فی کل مرۃ یعنی پھر وہ اپنا ہر بار عہد توڑتے ہیں۔ مضارع کی تعبیر یہ بتلانے کے لیے کہ نقض عہد میں تعدد اور زیادتی ہے۔ یہ گویا عہد کے بعد ان کی غداری اور دغا بازی کی داستان ہے۔ نقض عہد کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے۔ قرآن عزیز اس کو خیانت بتاتا ہے۔ عربی میں اس کو عام طور پر غدر بھی کہتے ہیں۔ قرآن نے اس کی شدید برائی بیان کی ہے اس آیت میں ان یہودیوں کا ذکر ہے جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغا بازی کرتے تھے مگر یہ بات اس میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ بدعہدی سراسر تقویٰ کے خلاف ہے۔

یہ ان معاہدین کے عہد توڑنے کی کہانی ہے۔ تینوں یہودی قبائل قینقاع، نضیر اور قریظہ میں سے سب سے پہلے مخالفت کے میدان میں قینقاع نے قدم رکھا اور ابن سعد کے بیان کے مطابق جنگ بدر ہو چکی تو انہوں نے حسد و بغاوت کا مظاہرہ کیا۔ عہد و پیمان توڑ ڈالے اور یہودیوں میں ان سے بہادر کوئی گروہ نہ تھا۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۹)

بنو قینقاع

کشمکش کی ابتداء بنو قینقاع ہی سے ہوئی ایک عرب خاتون کسی یہودی دوکاندار سے سودا لینے گئی۔ دوکان پر اور بھی یہودی بیٹھے تھے۔ کسی نے خاتون کی بے خبری میں اس کے لباس کے زیریں حصے کا ایک گوشہ کا نٹے سے اوپر کے کپڑوں میں ٹانک دیا۔ وہ چلی تو برہنہ ہو گئی اور اس نے چیخ ماری۔ یہودی اس پر ہنسنے لگے۔ ایک مسلمان نے یہ کیفیت دیکھی تو شریروں کو مارنے کے لیے دوڑا۔ یہودی دوکاندار کشمکش میں مارا گیا۔ باقی یہودیوں نے غیور مسلمان کو شہید کر دیا۔ حضور اقدس ﷺ کو اس افسوسناک واقعہ کی خبر ملی تو قینقاع کے اکابر کو جمع کر کے نرمی سے سمجھایا کہ آپ لوگوں نے جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے یہ اچھا نہیں۔ شرارتیں چھوڑ دو اور خدا سے ڈرو۔ وہ لوگ اپنے آدمیوں کی حرکت پر اظہارِ ندامت کے بجائے جو شرافت کا بدیہی تقاضا تھا۔ غرور و تکبر پر اتر آئے اور بولے کہ بدر کی فتح پر مغرور نہ ہو جانا ہم سے سابقہ پڑے گا تو پتہ لگ جائے گا کہ لڑائی کیا ہوتی ہے اور لڑنے والے کیسے ہوتے ہیں۔

یقین ہے کہ بنو قینقاع نے یہ روش بنو نضیر اور بنو قریظہ، اور منافقین مدینہ کی شہ پر اختیار کی ہوگی۔ اور ان کو بھروسہ ہوگا کہ اگر مسلمانوں نے جنگ کی تو تمام یہودیوں اور منافقوں کی طرف سے پوری امداد ملے گی۔ آخر حضور اقدس ﷺ کو حکم دینا پڑا کہ بنو قینقاع کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا جائے۔ انجام کار ان لوگوں کے تکبر و شجاعت کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ ایک انگلی بھی ان کی حمایت میں نہ اٹھ سکی۔ اور وہ اس پر راضی ہو گئے کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ فرمائیں گے انہیں منظور ہوگا۔

عبداللہ بن ابی نے جو بظاہر مسلمان اور دل سے یہودیوں کا حامی تھا درخواست کی کہ انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ درخواست منظور ہو گئی۔ اور بنو قینقاع مدینہ منورہ سے نکل کر بلقا کے ایک مقام اذرعات میں جا بسے۔ وہ تاجر بازگر تھے جہاں بھی جاتے اپنا کاروبار جاری رکھ سکتے تھے۔ ان میں سات سو جنگجو تھے اور تین سو کے پاس فولادی زرہیں تھیں یہ واقعہ جنگ بدر سے چند روز ایک مہینہ بعد پیش آیا۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ بدر کے بعد مدینہ کو دو جنگیں پیش آئیں اول اُحد دوم خندق۔ بدر کے بعد بنو قینقاع نکلے اُحد کے بعد بنو نضیر کو جلا وطن کیا گیا اور خندق کے بعد بنو قریظہ کا فیصلہ ہو گیا۔

کعب بن اشرف

کعب بن اشرف ابتدائی اسلامی دور میں مدینہ منورہ کا ایک بہت بڑا فتنہ تھا جو شر و فساد پھیلانے میں تنہا ایک بڑے گروہ اور کثیر الافراد قبیلے سے کم نہ تھا۔ اس کا باپ قبیلہ طے سے تھا جس نے بنو نضیر کے رئیس سلام بن الحقیق کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔ اسی نضری یہودی عورت کا بیٹا کعب تھا جس نے بنو نضیر کی آبادی سے جنوبی جانب ایک ٹیلے پر ایک قلعہ بنا لیا تھا۔ وہ دولت مند تھا۔ باپ کی وجہ سے عربوں اور ماں کی وجہ سے یہودیوں میں اسے وسیع اثر رسوخ حاصل تھا۔ سب سے آخر میں یہ کہ مشہور شاعر تھا اور اس زمانے میں شاعروں کو عموماً سب لوگ قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ زندگی کے ظاہری اسباب کی سازگاری کے ساتھ بہت بد اخلاق، خود پسند، متکبر اور اسلام دشمن تھا۔ یہودی علماء کے لیے اس نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ ایک موقعہ پر انھوں نے کہا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی ہیں جس کے آنے کی خبر یہودیوں کے صحیفوں میں دی گئی ہے تو کعب نے ان کے وظیفے بند کر دیئے۔ جب ان علماء نے اپنی غلطی کا اقرار کیا تو وظیفے جاری کیے۔ اگرچہ وہ بھی مدینہ منورہ کے ابتدائی عہد نامہ صلح و امن میں شریک تھا مگر شروع ہی سے اس نے قریش مکہ اور دوسرے اسلام دشمن عناصر سے خاص روابط پیدا کر لیے تھے۔ قریش کے جو سردار بدر میں مارے گئے تھے۔ ان کے مرثیے لکھ کر چالیس آدمیوں کے ساتھ مکہ مکرمہ گیا۔ مرثیے پڑھ کر خود بھی رویا اور قریش کو بھی رلایا ساتھ ہی قریش سے عہد لیا کہ اس جنگ کا بدلہ لیں گے۔ واپس آکر رسول اللہ کی ہجو میں اشعار کہے۔ شعر کہہ کر لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتا تھا اپنے قصیدوں کی تشبیب میں مسلم خواتین کا ذکر نہایت نازیبا طریق پر کرتا۔ دولت مند اور با اقتدار شخص کی اخلاقی حس مر جائے اور خوف خدا اس کے دل سے نکل جائے تو وہ سب کے لیے آفت کا پرکالہ بن جاتا ہے۔
مولانا شبلی مرحوم نے تاریخ یعقوبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کعب نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ سے قتل کرنا چاہا تھا۔ اس روایت کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں عکرمہ کی سند سے نقل کی ہے کہ:

> کعب نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دعوت پر بلایا اور لوگوں کو متعین کر دیا کہ جب آپ تشریف لائیں تو دھوکہ سے آپ کو ہلاک کر دیں۔

کعب بن اشرف کا قتل

اس فتنہ عظیمہ کا خاتمہ ناگزیر ہو گیا تو محمد بن مسلمہ نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے ساتھ یہ حضرات بھی تھے۔

۱۔ ابونائلہ سلکان بن سلامہ بن دقش۔
۲۔ حارث بن اوس بن معاذ۔
۳۔ ابو عبس بن جبیر۔

ابونائلہ سلکان بن سلامہ کعب کے رضاعی بھائی تھے۔ سب سے پہلے وہی دن کے وقت کعب سے ملے اور کہا کہ ہمارے صاحب یعنی حضور اقدس ﷺ ہم سے صدقہ مانگتے ہیں اور ہم تنگ دست ہیں براہ نوازش ہمیں وسق دو وسق غلہ دیجئے کعب یہ سن کر خوشی سے پھول گیا اور بولا کہ ابھی کیا ہوا ہے۔ وہ دن دور نہیں ہے جب تم بیزار ہو کر اسے چھوڑ دو گے۔

ابونائلہ۔ خیر اب تو محمد کی اتباع اختیار کر چکے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ قرض دو گے کہ نہیں۔

کعب۔ دے دوں گا بشرطیکہ کوئی چیز رہن رکھو۔

ابونائلہ۔ کیا چیز؟

کعب۔ اپنی عورتیں رہن رکھ دو۔

ابونائلہ۔ تمہارے حسن و جمال کے سبب ہمیں اپنی عورتوں پر اعتماد نہیں ہے۔

کعب۔ پھر بچے رہن رکھ دو۔

ابونائلہ۔ اس سے تو ہم عرب میں بدنام ہو جائیں گے کہ وسق دو وسق غلے کے لیے بچے رہن رکھ دیئے۔ البتہ ہتھیار رہن رکھ سکتے ہیں حالانکہ ہمیں ان کی آج کل بہت ضرورت ہے۔

کعب اس پر راضی ہو گیا۔ ابونائلہ نے واپس آکر رفیقوں کو سب کچھ بتا دیا۔ چاندنی رات میں یہ سب نکل کر کعب کے قلعے کے پاس پہنچے اسے آواز دی۔ بیوی نے روکا کہ رات کو کہاں جا رہے ہو بولا کہ میرا بھائی ابونائلہ اور محمد بن مسلمہ ہیں۔ قلعہ سے باہر نکل کر تمام رفیق کعب کے ساتھ ٹہلتے رہے۔ کعب نے عطر لگا رکھا تھا جس کی لپٹیں دور دور تک جا رہی تھیں۔ محمد بن مسلمہ نے کہا تمہارے سر سے بڑی عمدہ خوشبو آرہی ہے اجازت دو تو ذرا سونگھ لوں۔ کعب نے کہا کہ سونگھ لو پس اس کا سر پکڑتے ہی ساتھیوں سے کہا کہ اب اسے ختم کر دو۔ چنانچہ تلواریں اس پر پڑیں اور وہ ختم ہو گیا۔ جانبازوں نے سر کاٹ لیا۔ مرتے وقت کعب نے اس زور سے چیخ ماری کہ اردگرد کے یہودی قلعوں میں آگ روشن ہو گئی۔ اسی وقت ابونائلہ اور محمد بن مسلمہ اور دوسرے ساتھی لمبا چکر لگاتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مہم کے کامیاب انجام کی کیفیت پیش کر دی۔

یہودی دوسرے روز کعب کے مارے جانے کی شکایت لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ

نے کعب کی تمام فتنہ انگیزیاں ایک ایک کر کے گنا دیں۔ چنانچہ وہ چپ چاپ لوٹ گئے۔ یہ بھی واضح تھا کہ اگر کعب کو کھلم کھلا قتل کی کوشش کی جاتی تو جنگ چھڑ جاتی اور خدا جانے اس میں کتنی جانیں جاتیں۔ پھر کعب اسی طرح مارا گیا جس طرح وہ رسول اللہ ﷺ کی جان لینے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے وفد سے یہ بھی فرما دیا تھا کہ بہتر ہو اگر تم لوگ آئندہ امن و امان سے رہنے پر آمادہ ہو جاؤ اور فتنہ و فساد کی تخم ریزی سے بچ کر رہو۔ چنانچہ ان کی رضامندی سے نیا معاہدہ لکھا گیا جس میں یہودیوں نے امن و امان سے رہنے کا اقرار نئے سرے سے کیا ہے[1]

عہد شکنی کرنے والوں کا انجام

(۵۷) لہٰذا اگر تم ان کو لڑائی میں کہیں پاؤ تو تم ان کو ایسی سزا دو کہ پشت پناہی کرنے والے بھی حواس باختہ ہو جائیں تاکہ وہ بدعہدی کے انجام سے سبق سیکھ لیں یعنی اگر یہ غدار معاہدے کو علانیہ پس پشت ڈال کر آپ کے مقابل میدان جنگ میں آ جائیں تو ان کو ایسی سخت سزا دیجئے جسے دیکھ کر ان کے پیچھے آنے والے یا ان کے بعد آنے والی نسلیں بھی عبرت حاصل کریں اور عہد شکنی کی کوئی جرأت نہ کر سکیں[2]

عربی میں ثقف کے معنے پالینے کے اور تشرید کے معنے تتر بتر کرنے کے آتے ہیں۔ امام رازی اور علامہ قرطبی نے یہی معنے لکھے ہیں۔

مدینے کے آس پاس رہنے والے یہودیوں نے جس طرح اپنے عہد و قرار توڑے تھے اس کا حال آپ پڑھ چکے ہیں اس سلسلے میں اب مسلمانوں کو ہدایات دی جا رہی ہیں۔

پہلی ہدایت یہ دی گئی ہے کہ اگر باوجود عہد کے یہ لوگ لڑائی کے لیے نکل آئیں اور تمہارے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں یا تمہارے کسی دشمن کا ساتھ دے کر لڑائی کے میدان میں تمہارے سامنے آ جائیں تو پھر اس وقت انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا جائے اور ان کا سر اچھی طرح کچل دیا جائے تاکہ ان کی دیکھا دیکھی کہیں وہ لوگ بھی اپنے معاہدوں سے نہ پھر جائیں جو ابھی تک میدان میں نہیں آ رہے ہیں اور انہیں ہمت نہ ہو کہ وہ تمہارے مقابلے کے لیے اتر آئیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قوم سے ہمارا معاہدہ ہو اور پھر وہ اپنی معاہدانہ ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر ہمارے خلاف کسی جنگ میں حصہ لے تو ہم بھی معاہدے کی اخلاقی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جائیں گے اور ہمیں حق ہو گا کہ اس سے جنگ کریں۔ نیز اگر کسی قوم سے ہماری لڑائی ہو رہی ہے اور ہم دیکھیں کہ دشمن کے ساتھ ایسی قوم کے افراد بھی شریک جنگ ہو گئے۔ جس سے

---

[1] طبقات ابن سعد۔ ابو داؤد باب کیف کان اخراج الیہود
[2] افادات شیخ الاسلام

ہمارا معاہدہ ہے تو ہم کو ان کے قتل کرنے اور ان سے دشمن کا سا معاملہ کرنے میں ہرگز تامل نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی انفرادی حیثیت میں اپنی قوم کے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق قرار دے دیا ہے کہ ان کی جان و مال کے معاملہ میں اس معاہدہ کا احترام ملحوظ نہ رکھا جائے جو ہمارے اور ان کی قوم کے درمیان ہے۔ بتانا یہ ہے کہ ابھی تو یہ جو کچھ کر رہے ہیں پردے میں کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی سامنے آنے کی جرأت نہیں کر رہا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی گروہ سامنے آنے کی جرات کرے اور جنگ کے میدان میں تمہیں مل جائے تو ان کو ایسی سزا دو کہ ان کے پرخچے اڑ جائیں اور جو ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے آنکھیں دکھا رہے ہیں ان کے بھی ہوش اڑ جائیں۔

پہلی آیت کے آخر میں ارشاد ہوا تھا هُمْ لَا يَتَّقُونَ یعنی ان کے دلوں میں اللہ کا ڈر نہیں ہے۔ اس کے ذریعے اشارا کیا تھا کہ دراصل ہر قسم کی اخلاقی خرابی کی جڑ یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے نڈر ہو جائے اسے جواب دہی اور اپنے بُرے انجام کا خوف نہ رہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے نڈر ہو کر اور آخرت کی زندگی کو نظر انداز کر کے چاہتے ہیں کہ انسانیت کے لیے اخلاق اور انسانیت کا کوئی قانون بنالیں اور محض قانون کی قوت پر انسان کو بھلا مانس بنالیں وہ سخت دھوکے میں ہیں۔ اور ان کے تجربے ہمیشہ ناکام رہیں گے۔ افراد کو تو چھوڑیئے آج کل بڑی بڑی حکومتیں اپنے ذرا سے ملکی اور قومی فائدے کے لیے معاہدوں کو ٹھکرا دیتی ہیں۔ اور بڑے بڑے صلحنامے چارٹر اور معاہدے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ آج یہ حال ان قوموں کا ہے جو اخلاق اور انسانیت کے بڑے بڑے دعوے لے کر میدان میں آئی ہیں اور جو اپنے کو دنیا کے سامنے معلم اخلاق کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں اس خرابی کی بنیادی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ هُمْ لَا يَتَّقُونَ ان کو کسی کے سامنے جواب دہی کا ڈر نہیں ہے۔ اغراض و مفادات کی پرستاری ان کا نصب العین ہے۔ اس اخلاقی فساد کی بنیادی وجہ ایک اور صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ هُمْ لَا يَتَّقُونَ ان کو کسی کے سامنے جوابدہی کا اندیشہ نہیں۔

یہاں قرآن نے اس موضوع پر جو ہدایت دی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے لوگ اگر باوجود عہد کے لڑائی کے لیے نکل آئیں اور تمہارے مقابلہ کی تیاری کریں یا تمہارے کسی دشمن کے حمایتی بن کر تمہارے سامنے آجائیں تو پھر انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور ان کی بھرپور سرکوبی کی جائے لیکن اس کارگذاری اور اس دردناک سزا کا مقصد انتقام لینا نہیں یا اپنے غصہ کو فرو کرنا نہیں بلکہ مقصد یہ اور صرف یہ ہے کہ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ شائد یہ صورتحال دیکھ کر ان کو کچھ عبرت ہو اور اپنے کیے پر پشیمان ہو کر اپنی اصلاح کریں اور آئندہ قتال کی جرات نہ کریں اور معاہدوں کو توڑنے کا کوئی ارادہ نہ کریں۔

یہاں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام جنگ کو بالذات پسند نہیں کرتا ہے۔ پسند کی چیز جنگ نہیں امن اور عافیت ہے صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ ایام جنگ ہی میں حضور اقدس ﷺ مسلمانوں کو یہ بات بتائی تھی کہ۔

لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنائیں نہ کرو۔ اللہ سے عافیت مانگو لیکن اگر تمہارا مقابلہ ہو جائے تو ڈٹ جاؤ۔
اور یقین کرو کہ جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔

جنگ تو ایک اجتماعی ضرورت ہے اس کا مقصد فساد و عدوان کو روکنا اور کلمۂ حق کا بول بالا کرنا ہے۔
اسلام میں جنگ کا مقصد انتقام اور غصہ کو فرو کرنا نہیں۔ خدا کی مخلوق کو ذلیل کرنا اور اموال واملاک پر قبضہ کرنا نہیں بلکہ اللہ کے بندوں کو برائی سے بچانا اور عدل وانصاف کی راہ پر لگانا ہے اسی بنیادی اور اہم بات کی طرف لعلھم یذکرون میں اشارا کیا ہے حافظ ابن کثیر نے سدی کے حوالہ سے یہی مطلب نقل کیا ہے۔ لعلھم یحذرون تاکہ وہ مستقبل میں ان برائیوں سے بچ کر رہیں۔ متاخرین شارحین قرآن میں سے قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی یہی بات سمجھی ہے کہ یتعظون فلا ینقضون العھد آئندہ ان کو عبرت ہو اور عہد شکنی سے باز آجائیں۔

معاہدین کے بارے میں ضابطہ اخلاق

(۵۸) اور اگر تمہیں کچھ لوگوں سے دغا اور بدعہدی کا اندیشہ ہو تو تمہیں چاہیے کہ ان کا عہد ان کی طرف اس طرح پھینک دو کہ تم اور وہ دونوں برابر ہو جاؤ بلاریب اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔ اور منکرین اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے۔ بلاشبہ اللہ کو کبھی نہیں ہرا سکتے۔

پہلے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ اگر کوئی معاہد فریق باوجود عہد کے تم سے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے یا تمہارے کسی دشمن کا ساتھ دے کر تمہارے مقابلہ میں آجائے تو پھر عدل وانصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور ان کو سنگین سزا دی جائے تاکہ مستقبل میں پھر وہ یہ حرکت نہ کریں۔ اب اس آیت میں یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ اگر کسی قوم کے بارے میں تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ اس کی نیت اچھی نہیں ہے اور وہ بھی اس انتظار میں ہے کہ جب موقع پائے تمہیں نقصان پہنچائے۔ اگر حالات کا اندازہ کرنے کے بعد تم اس نتیجے پر پہنچے ہو کہ وہ قوم اپنے معاہدے کو ہرگز نہیں نبھائے گی تو تمہارا کام ہے کہ اسے صاف صاف بتا دو کہ اب ان کے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں رہا ہے۔ تمہارے لیے کسی حال میں بھی جائز نہیں کہ دوسرے فریق کو انجان رکھتے ہوئے دھوکہ کے ساتھ اس پر حملہ کر دو۔ خیانت کرنے والے کے ساتھ خیانت کرنا تمہارا کام نہیں اور تم دنیا میں برائیوں کی کاپی کے لیے نہیں آئے ہو دوسرے کے غلط کام تمہارے لیے غلط کو جائز نہیں بنا سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی معاہد کی جانب سے تمہیں خیانت یعنی عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ تم معاہدہ کی پابندی کو بدستور قائم رکھو لیکن یہ بھی جائز نہیں کہ معاہدے کو صاف طور پر ختم کر دینے سے پہلے تم ان کے خلاف کوئی اقدام کرو بلکہ ایسے موقع پر ضروری ہے کہ ان کو آگاہ کر دیا جائے کہ تمہاری بدنیتی کا ہمیں علم ہو چکا ہے

یا تمہاری خلاف ورزی ہمیں معلوم ہو چکی ہے یا یہ کہ تمہارے معاملات ہمیں مشتبہ نظر آتے ہیں اس لیے آیندہ ہم معاہدے کے پابند نہیں ہیں۔ تم کو بھی اختیار ہے کہ ہمارے خلاف جو کارروائی چاہو کرو۔ آیت قرآنی کے الفاظ یہ ہیں۔

اما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علی سواء

یعنی اگر ایک گروہ ابھی میدان جنگ میں تو نہیں نکلا ہے لیکن اس سے تمہیں دغا کا اندیشہ ہے تو چاہیے کہ اس کا عہد اسی پر لوٹا دو یعنی عہد فسخ کر دو۔

اس طرح کہ دونوں جانب یکساں حالت میں ہو جائیں یعنی ایسا نہ کیا جائے کہ اچانک شکست عہد کی انہیں خبر دی جائے بلکہ پہلے سے ان کو خبردار کر دینا چاہیے تاکہ دونوں فریقوں کو یکساں طور پر تیاری کا وقت مل جائے مطلب یہ ہے کہ اگر ایک قوم نے علانیہ بدعہدی نہیں کی ہاں آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ عہد شکنی پر آمادہ ہے تو آپ کو اجازت ہے کہ مصلحت سمجھیں تو ان کا عہد واپس کر دیں اور معاہدہ سے دست برداری کی اطلاع کر کے مناسب کارروائی کریں تاکہ فریقین پچھلے معاہدات کے بارے میں شک و اشتباہ میں نہ رہیں دونوں مساویانہ طور پر آگاہ ہو کر اپنی تیاری اور حفاظت میں مشغول ہوں آپ کی جانب سے کوئی چوری اور خیانت نہ ہو۔ سب معاملہ صاف صاف ہو حق تعالیٰ خیانت کی کارروائی کو خواہ کفار کے ساتھ ہو پسند نہیں کرتا ہے۔[1]

امام رازی نے تفسیر کبیر میں بتایا ہے کہ اگر معاہد فریق کی جانب سے تمہیں عہد شکنی کا اندیشہ ہو تو اسے اچھی طرح آگاہ کر دو کہ آج سے ہمارا تمہارا معاہدہ منسوخ ہے یعنی مسلمان سربراہ مملکت نے جن لوگوں سے معاہدہ کیا ہے اگر ان کی جانب سے عہد شکنی کے آثار ظاہر ہوں تو اور نقض عہد کا احتمال ہو تو معاہدہ کو ختم کرنے کی اطلاع کر دینی واجب ہے لیکن اگر معاہدے کی خلاف ورزی علانیہ ہو تو فسخ معاہدے کی اطلاع دینی ضروری نہیں ہے۔

حافظ ابن جریر نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے۔

اے پیغمبر اگر تمہیں اس دشمن سے نقض عہد کا اندیشہ ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہے تو لڑائی سے پہلے اس معاہد کو اطلاع دے دو کہ تمہارے اور اس کے درمیان معاہدہ ختم ہو گیا ہے تاکہ تم اور تمہارا دشمن دونوں یکساں طور پر باخبر ہو جائیں کہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے اور جنگ کی تیاری کر لے اور آپ پر بدعہدی کا الزام نہ آئے۔

اس کے بعد ابن جریر نے بتایا ہے کہ علی سواء کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اور تمہارے دشمن دونوں کا علم اس موضوع پر برابر اور یکساں ہو جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے محارب ہیں عہد و پیمان اور صلح و امان کا زمانہ ختم ہو چکا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

حافظ ابن کثیر نے علی سواء کا مطلب یہ بتایا ہے کہ تم ان کو مطلع کر دو کہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے تاکہ تمہارا اور تمہارے دشمن کا اس موضوع پر علم یکساں ہو جائے کہ تم ان سے اور وہ تم سے محارب ہیں معاہد نہیں ہیں اور تمہارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہے متاخرین میں سے علامہ آلوسی نے آیت میں علی سواء کی یہ تشریح کی ہے کہ —— "یہ درمیانی اور برابری کی راہ اختیار کر و اور وہ یہ ہے کہ تم ان کو صاف اور علانیہ بتا دو کہ تمہارے اور دشمن کے درمیان مدت معاہدہ ختم ہو چکی ہے۔ ان سے ایسی حالت میں جنگ نہ کرو کہ ان کو معاہدہ کے ختم ہونے کی اطلاع نہ ہو اور وہ سمجھ رہے ہوں کہ معاہدہ موجود ہے تمہیں خیانت تو در کنار شائبہ خیانت سے بھی بچنا چاہیے۔

مشہور مفسر قرآن محدث امام بغوی نے معالم التنزیل میں علی سواء کا یہی مطلب بتایا ہے کہ آپ لڑائی سے پہلے معاہدین کو فسخ معاہدے کی اطلاع کر دیں تاکہ فسخ معاہدے کے موضوع پر آپ کا اور آپ کے معاہدین کا علم یکساں اور برابر ہو جائے۔ بہر حال سب شارحین قرآن نے آیت کا مطلب یہی بتایا ہے کہ اگر آپ کو کسی معاہد جماعت سے خیانت اور بد عہدی کا اندیشہ ہو اور قرائن سے یہ محسوس ہو کہ لوگ در پردہ کوئی شرارت کرنا چاہتے ہیں تو آپ ان کو فسخ عہد کی اطلاع کر دیں اور اس اطلاع سے تم اور وہ دونوں علم میں برابر ہو جائیں۔ محض اندیشہ اور خطرہ کی بنا پر بغیر اطلاع دشمن پر حملہ کرنا ایک قسم کی خیانت ہے

آیت کی اس تشریح میں متقدمین اور متاخرین شارحین قرآن کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ خبر نہیں صاحب تدبر قرآن نے آیت کے معنے میں یہ نکتہ آفرینی کیسے کر ڈالی کہ:

> علی سواء کا مفہوم یہ ہے کہ انہی کے برابر کا اقدام تم بھی کرنے کے مجاز ہو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دینا چاہیے۔

آیت قرآنی کا نہ یہ منطوق ہے نہ مدلول ہے اور نہ مفہوم ہے۔ خبر نہیں صاحب تدبر قرآن اپنے مخاطبوں کو اس انداز سخن کے ذریعے کیا سمجھانا چاہتے ہیں؟ کیا وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآنی آیت کا اہل ایمان سے مطالبہ یہ ہے کہ میدان جنگ میں اگر تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو اینٹ کا جواب پتھر سے نہ ہو بلکہ جواب ہم وزن ہو۔ کیا معاہدہ ختم ہونے کے آثار ان کی جانب سے دیکھ کر معاہدہ فسخ ہونے کی ان کو اطلاع دینا اینٹ کا جواب پتھر ہے۔ یہ اینٹ کا جواب پتھر نہیں بلکہ برابر کا اقدام ہے۔ اگر آپ ان کو اطلاع نہ دیں گے اور بغیر اطلاع ان پر حملہ آور ہوں گے یہ ہے اینٹ کا جواب پتھر سے یہ بات اس طرح کی جائے کہ دوسرے فریق کو نقصان نہ پہنچے یعنی وقت سے پہلے فسخ معاہدہ سے باخبر ہو جائے۔ اگر طیاری کرنا چاہے تو ہماری طرح اسے بھی طیاری کا پورا موقعہ ملے۔ اسی ارشاد الٰہی کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اصول مقرر کیا تھا۔

من کان بینہ وبین قوم عہد فلا یشد عقدہ ولا یحلہا حتی ینقضی امدھا

انبذ الیہم عہدھم علی سواء

جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اسے چاہیے کہ معاہدے کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے یا ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔

اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنے زمانہ حکومت میں اسی قانون کو بین الاقوامی معاملات میں استعمال کیا۔ چنانچہ امام احمدؒ نے بروایت سلیم بن عامر بیان کیا ہے کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روم پر چڑھائی کی تو اسلامی فوجوں اور رومی فوجوں میں ایک خاص مدت تک کے لیے صلح ہو گئی۔ جب معاہدے کی مدت ختم ہونے کے قریب ہوئی تو مسلمانوں نے سرحد پر صف بندی کر دی تاکہ مدت ختم ہو جانے پر بغیر اطلاع دیئے رومیوں پر حملہ کر دیں۔ اتفاقاً حضرت عنبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھوڑے پر سوار نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے آئے اور پکار کر کہنے لگے وفاء لا غدر عہد پورا کرو بدعہدی نہ کرو کیوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گرہ نہ باندی جائے نہ کھولی جائے یعنی اس میں کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوجیں واپس بلالیں [1]

غور کی بات یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔ اسی سے ہمارے فقہاء نے یہ بات سمجھی ہے کہ بدعہدی کرنا تو در کنار غدر اور بدعہدی کی صورت بھی حرام ہے۔

بہرحال اس آیت کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی شخص یا گروہ سے ان کا معاہدہ ہو اور ان کو اس کے طرز عمل سے یہ شکایت لاحق ہو جائے کہ وہ عہد کی پابندی میں کوتاہی برت رہا ہے یا یہ اندیشہ ہو جائے کہ وہ موقعہ پاتے ہی ان سے غداری کرے گا تو ان کو اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لینے کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے کہ ان کے اور دشمن گروہ کے درمیان معاہدہ نہیں رہا بلکہ وہ اس کے پابند ہیں کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو معاہد کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اس کو صاف صاف بتادیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اب معاہدہ باقی نہیں رہا تاکہ فسخ معاہدہ کا فریقین کو یکساں علم ہو جائے۔

اس موقع پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلامی قانون اس آیت کی روشنی میں صرف ایک صورت میں بغیر اطلاع حملہ کرنے کو جائز قرار دیتا ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ فریق ثانی علی الاعلان معاہدہ کو توڑ چکا ہو اور اس نے کھلم کھلا مسلمانوں

[1] سنن ابی داؤد باب الوفاء بالعہد۔

کے خلاف معاندانہ کارروائی کی ہو۔ ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس آیت قرآنی کے مطابق فسخ معاہدہ کا نوٹس دیں۔ بلکہ ہمیں اس کے خلاف بلا اطلاع کارروائی کرنے کا حق حاصل ہے۔ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ عہد شکنی کی اطلاع دینا اس وقت واجب ہے کہ جب قرائن اور علامات سے یہ معلوم ہو کہ وہ عہد شکنی کرنے والے ہیں لیکن اگر انہوں نے فی الواقع عہد شکنی کر دی ہے تو پھر فسخ معاہدہ کی اطلاع کی ضرورت نہیں ہے۔ بغیر اطلاع کے ان پر حملہ کرنا جائز ہے جیسا کہ قریش نے جب صلح حدیبیہ کو توڑا تو حضور اقدس ﷺ نے بغیر اطلاع قریش پر حملہ کر دیا اور مکہ فتح کر لیا۔ خبر نہیں کہ مولانا دریابادی نے فقہاء کا نام لے کر یہ بات کیسے لکھ دی ہے کہ:

یعنی اس قوم نے بد عہدی عملاً نہ کی ہو لیکن قرائن سے صاف معلوم اور ظاہر ہو رہا ہو کہ وہ بد عہدی کرنے والے ہیں فانبذ الیھم علی سواء یعنی اس طرح اس عہد کے باقی نہ رہنے کی اطلاع اس فریق کو کر دیں فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ امر واجب نہیں تخییری ہے اور امام کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے [1]

حالانکہ فقہاء نے ایسی بات کہیں نہیں بتائی ہے۔ فقہاء تو غدر اور بد عہدی کی صورت کو بھی مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے صاف لکھا ہے کہ لا بد من النبذ تحرزاً عن الغدر المنھی عنہ یعنی معاہد کو فسخ معاہدہ کی اطلاع دینی ضروری ہے اس غداری اور بد عہدی سے بچنے کے لیے جس سے اللہ سبحانہ نے منع کیا ہے[2]۔ بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ اطلاع کے لیے اس قدر عرصہ اور مدت شرط ہے جس میں اطلاع کا پہنچنا ممکن ہو۔ و یشترط مدۃ یبلغ خبر النبذ الی جماعتھم۔

جنگ میں بلند اخلاقی کا معیار

قرآن نے ہر معاملہ میں حتیٰ کہ جنگ میں بھی سچائی اور دیانت کا جو معیار قائم کیا ہے وہ کس قدر بلند ہے۔ زندگی میں کہیں کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا ہے جہاں اخلاقی کمزوری کو ابھرنے کا موقعہ دیا گیا ہو۔ جنگ و صلح کی حالت میں انسان کا نظام اخلاق دفعۃً بدل جاتا ہے ایک شخص بذاتِ خود نہایت رحمدل ہے لیکن میدانِ جنگ میں جا کر نہایت بے رحم ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ذاتی معاملات میں نہایت حلیم الطبع ہے۔ لیکن کسی فوج میں شامل ہو کر سخت مشتعل اور مغلوب الغضب ہو جاتا ہے ایک شخص امن و صلح کے زمانے میں نہایت صادق القول اور پابندِ عہد ہے لیکن زمانہ جنگ میں اتنا ہی غدار اور عہد شکن ہو جاتا ہے۔ ایک جماعت، ایک قوم، ایک ملک امن و سکون کے دور میں انسانیت کا بہتر سے بہتر نمونہ ہوتا ہے لیکن جنگی اغراض طامعانہ اقدامات اور حربی مصالح کے عہدِ فساد میں آ کر چارپایوں سے زیادہ وحشی اور درندوں

---

[1] تفسیر ماجدی

[2] الاختیار لتعلیل المختار

زیادہ خونخوار ہوجاتا ہے۔ اسی بنا پر حکما کہتے ہیں کہ سیاست اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتی ہے ——— لیکن دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسی زندہ ہستی ہے۔ جو اپنے پہلو میں دل اور دل میں ایک غیر ممکن التغیر اخلاقی طاقت رکھتی ہے۔ اس پر عوارض خارجیہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ظاہر و باطن شخصیت و جمہوریت افتراق و اجتماع جنگ و صلح اس کے لیے تمام حالتیں یکساں ہیں۔ اس کا معیارِ اخلاق جس طرح امن و صلح کی حالت میں قائم رہا اسی طرح استحکام و استواری کے ساتھ جنگ کے سیلاب اور آتش و خون کے طوفان میں بھی قائم و ثابت رہا۔

السید رشید رضا نے یہ بات بالکل برموقعہ لکھی۔

اس آیت اور اس کے ہم معنے احادیث و آثار میں یہ بات پوری وضاحت اور قوت سے بتا دی گئی ہے کہ اسلام عین جنگ کی حالت میں بھی حق و عدل اور اخلاق کا نگران ہے موجودہ سیاسی دنیا میں اور ماضی میں سیاسی قوانین میں اسلام کے قانونِ عدل کی کوئی مثال نہیں ہے۔ بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ اس کے باوجود عیسائی دنیا اسلام کو بے انصافی کا طعنہ دیتی ہے اور حضور اقدس ﷺ کی پاکیزہ اور بے داغ زندگی کو اپنی حرف گیریوں کا نشانہ بناتی ہے۔

قرآنِ حکیم کی یہ آیت جن سیاسی قوانین کی نشاندہی کر رہی ہے آیئے ان کا بھی مطالعہ کر لیجئے۔

۱۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ حکومتِ اسلامی کا سربراہ اگر مسلمانوں کی اجتماعی مصالح کے پیشِ نظر کافروں کی حکومت سے معاہدہ کرنا چاہے تو اسے ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ اور اس معاہدہ کا ایفا واجب ہے بشرطیکہ کافروں کی جانب سے بدعہدی کے آثار نہ ہوں۔

۲۔ اگر بدعہدی کے آثار محسوس ہوں تو فسخِ عہد کرنا جائز ہے اور ان کو فسخِ عہد کی اطلاع ضروری ہے تاکہ مسلمانوں پر بدعہدی کا الزام نہ ہو۔ اور یہ الزام کافروں کے لیے اسلام سے دوری کا ذریعہ بن جائے۔

۳۔ فسخِ عہد کی اطلاع کے لیے اتنی مدت ضروری ہے کہ ان کو خبر ہوجائے۔

۴۔ غداری، دغابازی اور بدعہدی انسان کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے۔ اور اس کی ناخوشی کا سبب ہے

۵۔ ایفائے عہد میں مسلم و کافر میں کوئی فرق نہیں دونوں برابر ہیں امام بیہقی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے شعب الایمان میں میمون بن مہران کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ تین باتوں میں مسلمان اور کافر کا حکم ایک ہے۔

۱۔ جس سے تم معاہدہ کرو اس کو پورا کرو مسلمان ہو یا کافر عہد اللہ کا ہے۔

۲۔ رشتہ دار سے صلہ رحمی کرو مسلمان ہو یا کافر۔

۳۔ جب کوئی تمہارے پاس امانت رکھے اس کی ادائیگی کرو مسلمان ہو یا کافر۔

حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا یعنی اس سے اس کی بد عہدی اور غداری کی تشہیر ہوگی۔

مالکیہ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسلمان اگر سربراہ مملکت سے بد عہدی کرے تو اس کے جرم کی سنگینی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ ولا یحسبن الذین کفروا سبقوا انھم لا یعجزون۔ کافر یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ وہ بچ گئے ہیں بلاشبہ وہ اللہ کو کبھی ہرا نہیں سکتے۔ نیز عہد کا جو حکم اوپر مذکور ہوا ممکن تھا کہ کافر اس کو مسلمانوں کی سادہ لوحی پر محمول کر کے خوش ہوتے کہ جب ان کے یہاں خیانت و غدر جائز نہیں تو ہم کو خبردار اور بیدار ہونے کے بعد پورا موقع اپنے بچاؤ اور مسلمانوں کے خلاف تیاری کرنے کا ملے گا اس کا جواب دیا ہے کہ کتنی ہی تیاری اور انتظام کر لو جب مسلمانوں کے ہاتھوں خدا تم کو مغلوب اور رسوا کرنا اور دنیا یا آخرت میں سزا دینا چاہے گا تو تم کسی تدبیر سے اس کو عاجز نہ کر سکو گے نہ اس کے احاطہ قدرت و تسلط سے نکل کر بھاگ سکو گے گویا مسلمان کو تسلی کر دی کہ وہ خدا پر بھروسہ کر کے اس کے احکام کا امتثال کریں تو سب پر غالب آ جائیں گے [1]

مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے ارشاد ہوا تھا کہ اگر معاہدے کی خلاف ورزی کی علامات ظاہر ہو جائیں تو تمہیں بھی معاہدہ فسخ کرنے کی اجازت ہے لیکن تمہیں اس فسخ معاہدے کی دشمن کو اطلاع دینی چاہیے چونکہ وہ پہلے پکے معاہدہ ہوتے ہوئے معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہا ہے اس لیے تم بھی ایسا ہی کرو۔ اس کی اجازت تمہیں نہیں ہے تمہیں فسخ معاہدے کی اطلاع کر دینی چاہیے۔ کیونکہ اطلاع نہ دینا اور خاموشی سے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا خیانت ہے اور اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اخلاقی اعتبار سے مسلمانوں کی جانب سے اس طرز عمل کا مظاہرہ اگرچہ بہت بڑی اخلاقی برتری ہے لیکن سیاسی اعتبار سے دشمن مسلمانوں کے اس موقف کو کمزوری پر محمول کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فسخ معاہدہ کی دشمن کو اطلاع دینا اسے ہوشیار اور بیدار کر دینا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میدان مسلمانوں کے ہاتھ نہ رہے گا۔ اسی شبہ کو اس آیت میں دور کیا ہے کہ واقعی ایسا کرنا بظاہر سیاسی خسارہ ہے لیکن اگر تم میدان جنگ میں اخلاق کی نمائندگی کرو گے تو وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ بلکہ مقہور و مغلوب ہی رہیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیاست میں قرآن نے جو اخلاقی برتری کا پلڑا اونچا رکھا ہے اور عین میدان جنگ میں مسلمانوں کو مخالفین کے مقابلے میں عہد کی پابندی کو ضروری اور خیانت کو حرام قرار دیا ہے تو اس کی وجہ کوئی مصلحت یا مسلمانوں کی بیچارگی نہیں بلکہ اس کی علت دراصل یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں امۃ وسطا بہترین امت اور خیر امت سب سے اچھی امت بن کر

[1] افادات شیخ الاسلام

آتے ہیں ان کے بہتر ہونے اور خیر ہونے کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ہر حال میں دنیا میں خیر کی نمائندگی کریں۔ کمزوری کے زمانہ میں تو سب اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو حکم ہو رہا ہے کہ طاقتور ہو کر عدل و انصاف خیر و صلاح کا مظاہرہ کرو۔ برائی میں کسی کی کاپی نہ کرو۔ خوب سمجھ لو کہ دشمن بچ کر نہیں جا سکتا اور وہ تمہیں ہرا نہیں سکتا۔

یہاں یہ بات عام شارحین نے لکھی ہے کہ اس آیت میں دو قرائتیں ہیں ایک صیغہ خطاب کے ساتھ لا تحسبن الذین کفروا سبقوا اس کا مطلب تو کھلا ہے کہ اے پیغمبر تم ان کافروں کے بارے میں یہ خیال نہ کرو کہ بچ گئے ہیں اس صورت میں الذین کفروا مفعول اوّل ہے اور سبقوا مفعول دوم ہے اور انھم لا یعجزون ایک اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ دوسری قرائت یعنی لا یحسبن میں الذین کفروا فاعل ہے اور لا یحسبن کا مفعول اوّل انفسھم محذوف ہے اور دوسرا سبقوا مذکور ہے اور مطلب یہ ہے کہ کافر اپنے تئیں بچا ہوا خیال نہ کریں۔ یا یوں کہہ دیجئے کہ فاعل محذوف ہے ولا یحسبن حاسب الذین کفروا سبقوا مطلب یہ ہے کوئی خیال کرنے والا کافروں کے بارے میں ہرگز یہ خیال نہ کرے کہ وہ اپنے معاہدوں میں خیانت کی وجہ سے ہماری گرفت سے بچ گئے۔

قرآن میں دوسرے مواقع پر بھی اس قسم کی تعبیرات آئی ہیں مثلاً لا تحسبن الذین کفروا معجزین فی الارض۔ اور ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان یسبقونا۔ حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس آیت میں الذین کفروا سے وہ لوگ مراد ہیں جو بدر کے دن بچ گئے تھے لیکن آیاتِ قرآنی کا سیاق بتا رہا ہے کہ خاص لوگ مراد نہیں ہیں۔ قاضی بیضاوی کا میلان بھی یہی ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ
لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَاِنْ
جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ﴿٦١﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ
اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ وَاَلَّفَ
بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ
بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٣﴾

اور مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے زیادہ سے زیادہ طاقت پیدا کر کے اور گھوڑے طیار کر کے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے سامان مہیا رکھو۔ اس طرح تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ہراساں کر سکو گے اور کچھ اور دشمنوں پر بھی تمہاری دھاک بیٹھ جائے گی جن کا تمہیں علم نہیں۔ اللہ ان کو خوب جانتا ہے اور دیکھو اللہ کی راہ میں تم جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا اور تمہاری کوئی حق تلفی نہ ہوگی۔ اور اے پیغمبر اگر آپ کے مخالفین صلح و آشتی کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جایئے اور مستقبل کے لیے اللہ پر بھروسہ کیجئے اللہ ہی کی ذات سب کچھ سننے اور جاننے والی ہے۔ اور اگر اے پیغمبر وہ آپ کو دھوکا

دینا چاہیں گے تو بلا شبہ اللہ سبحانہ آپ کو کافی ہے وہی تو ہے جس نے ماضی میں اپنی مدد سے
اور اہل ایمان کی عددی طاقت سے آپ کو قوت دی۔ اور اہل ایمان کے دلوں میں
باہم اُلفت و محبت کی سرشاریاں نمایاں کیں۔ اگر آپ رُوئے زمین کی ساری دولت
بھی خرچ کر دیتے پھر بھی آپ ان کے دِلوں میں محبت کی سرشاریاں نہ پیدا کر سکتے
لیکن یہ تو اللہ کی ذات ہے جس نے ان میں باہم محبت و اُلفت کے جذبات نمایاں
کیے۔ بلا شبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

مُفردات کے معانی

رباط الخیل ۔ رباط باندھنا سرحد پر چوکی دینا۔ باب مفاعلت کا مصدر ہے اور مجرد میں ربط کا بھی مصدر ہے جس کے معنے مضبوط اور مستحکم باندھنے کے ہیں۔ نیز اسم بھی آتا ہے۔ اس چیز کے معنے میں جس کے ساتھ دل یا گھوڑے باندھے جائیں۔ اور اس جگہ کے معنے میں بھی جہاں دشمن کے دفاع کے لیے لشکر کا پڑاؤ ہوتا ہے جیسے مورچہ چھاؤنی۔ یہاں اس کا استعمال مصدر ہی کے معنے میں ہوا ہے گھوڑے باندھنا۔ علامہ خازن لکھتے ہیں۔

رابطہ کی اصل یہ ہے کہ ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اور ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اس طرح باندھ لیں کہ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے سے جنگ کے لیے تیار رہے۔ بعد میں ہر اس شخص کو جو سرحد پر اقامت گزین ہو کر سرحد پار کرے خواہ اس کے پاس سواری ہو یا نہ ہو۔

کچھ بزرگوں نے اسے مشترک قرار دیا ہے اس لیے رباط الخیل میں اضافت بیانی ہوگی۔ جیسے عین الشمس۔

الخیل۔ گھوڑوں کو کہتے ہیں۔ گھوڑہ سوار کو بھی کہتے ہیں۔

سلم۔ صلح، انقیاد۔ اور طاعت کو کہتے ہیں۔ تسلیم سے بنا ہے۔ عربی میں یہ بھی مؤنث استعمال ہوتا ہے اس کی ضد حرب بھی مؤنث استعمال ہوتا ہے ایک شاعر نے دونوں کو مؤنث استعمال کیا ہے۔

السلم تاخذ منها ما رضیت به
والحرب تكفيد من انفاسها جوع

خدع۔ دھوکا دینا فریب دینا اصل ارشاد میں ان یرید وا ان یخدعوك آیا ہے۔ شرط کی جزا محذوف

ہے یعنی لمصالحھم۔ آگے اس کی دلیل ہے۔

حسبك۔ حسب صفت مشبہ بمعنے کافی اور مددگار کاف محل جر میں ہے

الزجاج نے اسے اسمائے افعال میں سے بتایا ہے لیکن ابوحیان اندلسی نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ کافی کے معنے

میں اسے شعراء نے بھی استعمال کیا ہے۔

اذا کانت الھیجاء وانشقت العصا

فحسبك والضحاك سیف مھند

أَیَّدَ۔ اید سے ہے۔ تائید کے معنے قوت دینے کے ہیں اید قوت اور طاقت کو کہتے ہیں بے شمار موقعوں پر قرآن

میں ان معنے میں آیا ہے أَلَّفَ الف مادہ ہے یہ تالیف سے ماضی ہے اس کے معنے اس نے محبت ڈالی۔

فوج اور اس کے لیے چھاؤنی بنانے کا حکم

نویں پارے کے آخر میں مسلمانوں کو حکم ہوا تھا کہ عدل وحق کی راہ روکنے والوں سے مسلح جنگ کی جائے اور اس وقت تک کی جائے جب تک وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہ جائیں اسے قتال کہتے ہیں۔ عملی طور پر یہ جہاد کی سب سے اعلیٰ شکل اور صبر آزما ہم ہے لیکن انسانیت میں حق وعدل کے بقاء کے لیے بہت ضروری ہے۔ نویں پارے ہی میں اس قتال کی غایت بھی بتادی گئی تھی وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ یعنی جنگ کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ اللہ کا نام لینے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گذارنے کی راہ صاف ہو جائے اور فتنے کی حالت ختم ہو جائے۔

یہاں بتایا جارہا ہے کہ کفر وایمان کی یہ آویزش وقتی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وقتی اور انفرادی محنت کارگر اور مفید نہیں بلکہ اجتماعی اور دائمی محنت کی ضرورت ہے۔ اس دائمی اور اجتماعی محنت کی قرآن نے یہاں صورت یہ بتائی اعدوالھم مااستطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل کہ اپنی بساط کے مطابق طاقت کو فراہم کیا جائے اور اسے منظم کیا جائے۔ اس کے لیے فوج میں انفرادی قوت کے ساتھ مادی قوت بہم پہنچائی جائے۔ پھر اس انفرادی اور مادی طاقت کی پوری طرح تنظیم کی جائے۔ ایسا حکم کیوں ہے اس لیے کہ اسلام ساری دنیا کے لیے ہے وہی دنیا میں حق اور آخرت میں شرط نجات ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے باطل ہے یا اللہ کے نزدیک ناقابل پذیرائی ہے۔ مسلمان اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ اسلام کی اس حیثیت کے تقاضے پورے کریں اسے ساری دنیا تک پہنچائیں۔ اس کے حق ہونے کی شہادت دیں اور بہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کریں کہ خدا کے بندے فی الواقع اس کے بندے اور فرمانبردار بن جائیں۔

اور یہ کام اجتماعی محنت کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ اجتماعی محنت کی صورت اجتماعی سیاسی نظام کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ اس لیے بدر کی جنگ کے بعد مسلمانوں کو حکم ہو رہا ہے کہ اب یہ کام پوری سیاسی تنظیم کے ذریعے کیا جائے فوجی قوت پیدا کی جائے سامان جنگ فراہم کیا جائے اور فوج میں نظم و نسق کے لیے باقاعدہ چھاؤنیاں بنائی جائیں۔ صحابہؓ نے اس آیت کی روح کو سمجھ کر اپنے کو ہر پہلو سے منظم کیا۔ اس کے نتیجے میں وہ پورے عالم پر بھاری ہو گئے اور دنیا میں کہیں بھی کسی غیر اسلامی نظام کو نافذ رہنے کا حقدار تسلیم نہیں کیا۔

فوج اور سامانِ جنگ کی تیاری

(۴) اور مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے زیادہ سے زیادہ طاقت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار کر کے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے سامان مہیا رکھو۔ یعنی خدا پر بھروسہ کرنے کے یہ معنے نہیں کہ اسباب ضروریہ مشروعہ کو ترک کر دیا جائے نہیں۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاں تک قدرت ہو۔ سامانِ جہاد فراہم کریں۔ نبی کریم ﷺ کے عہدِ مبارک میں گھوڑے کی سواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی وغیرہ کی مشق کرنا سامانِ جہاد تھا۔ آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، آہن پوش کروزر وغیرہ تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنونِ حربیہ کا سیکھنا بلکہ ورزش وغیرہ کرنا سب سامانِ جہاد ہے۔ اسی طرح آیندہ جو اسلحہ و آلات حرب و ضرب تیار ہوں انشاء اللہ وہ سب اس آیت کے منشاء میں داخل ہیں باقی گھوڑے کے متعلق تو آپ خود بھی فرما چکے ہیں الخیل معقود فی نواصیھا الخیر الی یوم القیامۃ قیامت تک کے لیے گھوڑوں کی پیشانیوں میں خیر رکھ دی گئی ہے۔ اور احادیث میں ہے کہ جو شخص گھوڑا جہاد کی نیت سے پالتا ہے اس کے کھانے پینے بلکہ ہر قدم اٹھانے میں اجر ملتا ہے اور اس کی خوراک وغیرہ تک قیامت کے دن ترازو میں وزن کی جائے گی [1]

مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس سامانِ جنگ اور ایک مستقل فوج ہر وقت تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقت ضرورت فوراً جنگی کارروائی کر سکو۔ یہ نہ ہو کہ خطرہ سامنے آنے پر گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضاکار اور اسلحہ، سامانِ رسد جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس اثناء میں کہ یہ تیاری مکمل ہو دشمن اپنا کام کر جائے۔ آیت میں ما استطعتم جو کچھ تمہارے بس میں ہو لا کر بتا دیا کہ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ کوئی جماعت اس طرح کا سروسامان کر سکے جو ہر اعتبار سے مکمل ہو اس لیے فرمایا کہ اپنے مقدور کے مطابق جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔ اور ادائے فرض کے لیے آمادہ ہو جاؤ یہ بات نہیں کہ جب تک

[1] افادات شیخ الاسلام

دنیا بھر کا سازو سامان نہ ہو۔ دفاع کا کام نہ کیا جائے اور بے بسی کا عذر کرتے رہیں۔

دوسرا لفظ من قوۃ نکرہ لاکر بتایا ہے کہ ہر قسم کی قوت فراہم کرنی چاہیے عددی قوت، سامان جنگ کی قوت آلات حرب کی قوت رسل و رسائل کی قوت حمل و نقل کی قوت اور رسد کی قوت لفظ قوت سب کو شامل ہے۔ الا ان القوۃ الرمی میں تیراندازی کو قوت بتایا ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے آج کے دور میں صرف تیراندازی قوت نہیں آج قوت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ یہ ایک باقاعدہ فن ہے اور ہر روز اس میں نت نئی ترقی ہو رہی ہے۔ علامہ محمود آلوسی نے درست لکھا ہے:

آج تیراندازی مقصد برآری کے لیے مفید نہیں ہے۔ آج تیر کی جگہ بندوق اور توپ نے لے لی ہے۔

ظاہر ہے کہ بندوق اور توپ کا مقابلہ تیر سے نہیں ہو سکتا۔

صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر کے حوالہ سے جو ارشادِ نبوت آیا ہے کہ آپؐ بر سرِ منبر فرمایا کہ اعدوالھم ما استطعتم من قوۃ من قوۃ سے مراد تیراندازی ہے۔

الا ان القوۃ الرمی الا ان القوۃ الرمی

الا ان القوۃ الرمی تو اس کا منشا یہی بتانا ہے کہ دفاع میں جو چیز وقت کا تقاضا پورے کرے اس کو اپنانا قوت ہے آج تیر انداز کی نیابت بندوق کا نشانہ۔ توپ کا گولہ ہوائی جہازوں سے بمباری اور اس کے علاوہ وہ تمام چیزیں جو اس مقصد کو پورا کرتی ہوں۔ ارشادِ نبوت بطور تمثیل ہے کیونکہ حضورؐ کے زمانے میں دشمن کی مدافعت کا یہی سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اس زمانے میں تیر کی جگہ بندوق کی گولی، توپوں کی گولہ باری۔ جہازوں کی بمباری نے لے لی۔ احادیث میں جو فضائل تیراندازی کے بیان ہوئے ہیں آج وہی فضائل بندوق۔ توپ۔ ٹینک اور بمباری کے ہیں۔ آگے ارشاد ہے ومن رباط الخیل اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو خاص جنگ کے لیے تربیت دیئے جاتے ہیں اور اسی غرض کے لیے محفوظ اور تیار رکھے جائیں۔ جنگ میں ہر قسم کے گھوڑے کام نہیں آتے ہیں۔ اس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں ہی کی خاص اہمیت تھی اور عرب کی مخصوص آب و ہوا کے لحاظ سے ان کے یہاں گھوڑوں کی تربیت کا خاص اہتمام بھی تھا اسی چیز کی قرآن یہاں مسلمانوں کو ہدایت دے رہا ہے کہ جہاد کے لیے تیراندازی کی تنظیم کرو اور تربیت دیئے ہوئے گھوڑے بھی تیار کرو۔ یہ تو منطوق قرآن ہے اس کے مدلول میں یہ بات خود بخود داخل ہے کہ تیر انداز کے لیے تیر انداز اور گھوڑوں کے لیے شہ سواروں کی تنظیم کرو کیونکہ صرف گھوڑا اور صرف تیر تو بغیر شہ سوار اور تیرانداز کے بے معنے ہے۔ تیاری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ افرادی قوت اور سامانِ جنگ کی باقاعدہ تنظیم کرو اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ تو یہ ہے کہ جب کسی جنگی مہم کی صورت پیش آتی عرب کے عام دستور کے مطابق ہر سپاہی جو سامان اسے میسر ہوتا اس کو لے کر تیار ہو جاتا۔ لیکن اس آیت میں مسلمانوں

کو ہدایت کی جارہی ہے کہ اپنی فوجی قوت نفری کے اعتبار سے بھی اور اسلحہ وسامان جنگ کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ بڑھائیں اس زمانے میں گھوڑوں کی وہی اہمیت تھی جو ہمارے زمانے میں ٹینک ہوائی جہاز آبدوز کشتیوں کو حاصل ہے۔ علامہ خفاجی کی یہاں یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ:

یہاں تیاری کا حکم اس لیے دیا ہے کہ بدر میں تیاری نہ تھی اتفاقیہ جنگ کی صورت پیش آگئی تھی۔ اللہ کی مدد نے فتح کی صورت بنادی بتایا ہے اور تنبیہ کی ہے کہ اللہ سبحانہ کی مدد بغیر مادی تیاری کے ہر وقت نہ آئے گی۔

ہر حال آیت قرآنی کا مطالبہ ہے کہ دفاع کے لیے دفاعی قوتوں کی تنظیم کرو اس میں افرادی قوت کے ساتھ سامان جنگ، خوراک وغیرہ سب داخل ہیں۔ مفتی محمد شفیع نے یہ بات خوب فرمائی ہے۔

اس میں تمام جنگی سامان اسلحہ، سواری وغیرہ داخل ہیں۔ اپنے بدن کی ورزش، فنونِ حربیہ کا سیکھنا، قرآن عزیز نے اس جگہ اس زمانہ کے مروجہ ہتھیاروں کا ذکر نہیں کیا بلکہ قوت کا عام لفظ لاکر اس طرف اشارا کر دیا کہ یہ قوت ہر زمانے اور ہر ملک و قوم کے اعتبار سے مختلف ہوسکتی ہے اس زمانے کے اسلحہ تیر تلوار اور نیزے تھے اس کے بعد بندوق اور توپ کا زمانہ آیا اور آج بموں اور راکٹوں کا وقت ہے لفظ قوت ان سب کو شامل ہے اس لیے آج کے مسلمانوں کو بقدرِ استطاعت ایٹمی قوت ٹینک اور لڑاکا طیارے آبدوز کشتیاں جمع کرنی چاہئیں۔ کیونکہ یہی قوت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اور اس کے لیے جس علم و فن کو سیکھنا پڑے۔ ان سب کا حکم جہاد کا ہے بشرطیکہ مقصد اسلام اور مسلمانوں کا دفاع ہو۔

اسی لیے تمام شارحین قرآن نے قوۃ کی تفسیر میں بتایا ہے کہ ہر وہ جو جنگ میں طاقتور بنائے خواہ کچھ ہو۔ قاضی بیضاوی علامہ آلوسی، علامہ شوکانی وغیرہ سب ایک زبان ہیں۔

حضرت مولانا محمد ادریس نے اس آیت کے تقاضے کو سمجھ کر دنیا بھر کی اسلامی حکومتوں کو مشورہ دیا ہے کہ:

اس آیت کی رو سے مسلمان حکومتوں پر جدید اسلحہ کی تیاری اور ان کے کارخانوں کا قائم کرنا فرض ہوگا۔ اس لیے کہ اس آیت میں قیامت تک کے لیے ہر زمان و مکان کے مناسب قوت و طاقت کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے۔ جس طرح کافروں نے تباہ کن ہتھیار تیار کئے ہیں۔ ہم پر بھی اسی قسم کے تباہ کن ہتھیاروں کا تیار کرنا فرض ہوگا تاکہ کفر و شرک کا مقابلہ کرسکیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں کچھ ان لوگوں کو جن کی اسلامی قانون پر نگاہ گہری نہیں ہے یہ شبہ ہوا ہے کہ اس دور میں جس قدر آتشیں اسلحہ

تیار ہو رہا ہے بندوق کی گولی سے بم راکٹ اور ایٹمی اسلحہ تک ان کا استعمال جنگ میں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کیونکہ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ان النار لا یعذب بھا الا اللہ۔

آگ سے سزا اللہ کے سوا کوئی نہیں دیتا ہے۔

علامہ آلوسی کی تفسیر روح المعانی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے ۱۲۷۰ھ میں کچھ علماء کا یہ تاثر تھا کہ اسلام کے لیے اس ارشاد نبوت کی روشنی میں آتشیں اسلحہ کا استعمال جائز نہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

میری رائے میں آتشیں اسلحہ کا استعمال ضرورت کی بنا پر ہے اور یہ ذریعہ ہے مقصد میں کامیابی کا۔

علامہ آلوسی نے بات کو کھول کر نہیں پیش کیا دراصل مسئلے دو ہیں ایک جہاد کا اور دوسرا جرائم کی سزا کا۔ اس ارشاد نبوت کا تعلق جرائم کی سزا سے ہے نہ کہ جہاد سے۔ جہاد کے بارے میں قرآن کا فیصلہ ہے۔

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم بہ

اور مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو تو چاہیے کہ ویسی ہی اور اتنی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی۔

یہ آیت مسلمانوں کو بتا رہی ہے کہ میدان جنگ میں مسلمان بھی وہی ہتھیار استعمال کریں جو دشمن کر رہا ہے۔ ہاں جرائم کی سزا میں مجرموں کو آگ کی سزا دینا جیسا کہ جابر اور ظالم حکمران کرتے ہیں ناجائز ہے۔ جرائم کی سزا پر میدان جنگ کے ہتھیاروں کو قیاس کرنا بیہودہ قیاس ہے۔

اس آیت نے بتایا ہے کہ:

۱۔ فوجی تنظیم کرنا۔ اس کے لیے چھاؤنیاں بنانا مسلمانوں کے فرائض میں داخل ہیں۔

۲۔ وقت کی ضرورت کے مطابق ہتھیار مہیا کرنا اس کے لیے کارخانے اور فیکٹریاں بنانا مسلمانوں کا ملی فریضہ ہے۔

فوجی تنظیم کا مقصد

(۷۵) اس طرح تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ہراساں کر سکو گے اور کچھ اور دشمنوں پر بھی تمہاری دھاک بیٹھ جائے گی جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ یعنی یہ سب سامان اور تیاری دشمنوں پر رعب جمانے اور دھاک بٹھلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ باقی فتح و ظفر کا اصل سبب تو اللہ سبحانہ کی مدد ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور وہ لوگ جن کو بالتعیین تم نہیں جانتے منافقین ہیں جو مسلمانی کے پردے میں تھے یا یہود بنی قریظہ یا روم و فارس وغیرہ وہ سب قومیں جن سے آئندہ مقابلہ ہونے والا تھا۔ (افادات شیخ الاسلام)

اس آیت میں اس دفاعی اور فوجی تنظیم کا مقصد بتایا جارہا ہے جس کے لیے پہلی آیت میں تیاری کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اس تیاری کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے اور خدا کے دشمنوں پر تمہارا رعب ہو جائے۔ دنیا کو جنگ سے روکنے والی چیز صرف جنگ کی تیاری ہے۔ اس رعب کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہارے دشمنوں کو موقع نہیں ملے گا کہ تمہارے مخالفین کی مدد کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ تمہارے مخالفوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوگا۔ تیسرے یہ کہ تمہاری طاقت کی تیاری ان کے اسلام میں داخل ہونے کا ذریعہ بن جائے گی۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانو تم اپنی مقدور کے مطابق بھرپور تیاری کرو۔ فوج بناؤ۔ اسلحہ فراہم کرو۔ فوج صرف پیادہ نہ ہو بلکہ پیادہ کے ساتھ سوار فوج مہیا کرو اور اس تیاری کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے دشمن پر تمہاری دھاک بیٹھ جائے فرمایا جو اللہ کا دشمن ہے وہ تمہارا دشمن ہے اور جو تمہارا دشمن ہے وہ اللہ کا دشمن ہے اس لیے کہ مسلمان کی جنگ جس سے بھی تھی وہ اللہ کے دین کی خاطر تھی۔ یہ دشمن کون تھے امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ بدر کے واقعہ کے بعد مشرکین مکہ اور ان کے حلفاء اس کا مصداق تھے۔ صرف مشرکین اور ان کے حلفاء نہیں بلکہ وہ تمام اسلام کے مخالفین اس میں داخل ہیں جن کا معاندانہ طرزِ عمل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نمایاں ہو کر سامنے آ گیا تھا۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ:

> اللہ سبحانہ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ اس تیاری کا مقصد یہ ہے کہ تم اللہ کے اور اپنے دشمن کو ڈراؤ اور یہ اس طرح ہوگا کہ جب مخالفین کو مسلمانوں کی تیاری کا پتہ چلے گا تو ان پر رعب پڑ جائے گا اور اس رعب کا فائدہ یہ ہوگا کہ ان میں دارالاسلام کی طرف نگاہ اٹھانے کی جرأت نہ ہوگی دوسرے یہ کہ وہ جزیہ کی ادائیگی کی پابندی کریں گے۔ تیسرے یہ کہ بسا اوقات یہ چیز ان کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب بن جائے گی چوتھے یہ کہ ان کو مسلمانوں کے مخالف گروہ کی امداد کی جرأت نہ ہوگی پانچویں یہ کہ اسلامی حکومت کی مزید شوکت کا سبب ہوگی۔

بہرحال عدو اللہ و عدوکم سے مراد اہلِ مکہ اور ان کے حلفاء ہیں۔ اور ان میں یہود بھی تھے کہ ان کی عداوت بھی بدر کے بعد کھل کر سامنے آ گئی تھی آخر میں فرمایا ہے واخرین من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم یعنی کچھ تمہارے مخالفین وہ لوگ بھی ہیں جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ جانتا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں۔ اس میں شارحین قرآن کی آراء مختلف ہیں مجاہد اور مقاتل کی رائے ہیں بنو قریظہ ہیں سدی ایرانی بتاتے ہیں۔ اور ابن زید اور الحسن منافقین بتاتے ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ کفار جن مراد ہیں۔ آخری بات ایک حدیث کے سہارے کہی گئی ہے لیکن ابن کثیر نے اس حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ دے کر پوری عمارت گرا دی۔ هذا الحديث منكر لا يصح متنه ولا اسناده اس حدیث کی نہ سند صحیح

ہے اور نہ متن۔ قرین قیاس یہی ہے کہ اس سے مراد بیرونی طاقتیں ہیں رومی غسانی اور ایرانی جن کا مخالف اسلام ہونا نزول آیت کے زمانے میں مسلمانوں کو معلوم نہ تھا جو بعد میں اس وقت سامنے آئیں جب اسلام نے پورے عرب کو زیر نگیں کر لیا۔ قرآن نے یہاں مسلمانوں کو پیش پا افتادہ حالات کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے ان دشمنوں کی طرف بھی اشارا کر دیا۔ جو مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں سامنے آنے والے ہیں تاکہ مسلمان اچھی طرح دور تک نگاہ رکھ کر اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور یہ خیال نہ کریں کہ یہ وقتی حادثہ تھا جو آیا گذر گیا۔

اشاروں اشاروں میں مسلمانوں کو ان کی ذمہ داری بتادی گئی کہ تم دوسری امتوں کی طرح کی امت نہیں ہو۔ پہلی امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی تھیں اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کریں تو مسلمانوں کی اس عام ذمہ داری کے ساتھ ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کو اس طرح پیش کریں جیسا پیش کرنے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ جناب رسول اللہ ﷺ ان کے سامنے رکھ گئے ہیں۔ اسی ذمہ داری کو بتانے کے لیے واخرین من دونھم کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔

فوجی تیاری کے لیے سرمایہ کی ضرورت

(۷۶) اور دیکھو اللہ کی راہ میں تم جو کچھ خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا اور تمہاری کوئی حق تلفی نہ ہوگی۔ یہ مال جہاد کی طرف اشارہ ہے یعنی جہاد کی تیاری میں جو مال خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا یعنی ایک درہم کے سات سو درہم واللہ یضاعف لمن یشاء اور بسا اوقات دنیا ہی میں اس سے کہیں زیادہ معاوضہ مل جاتا ہے [1]

چونکہ جنگ کی تیاری بغیر مال کے نہیں ہو سکتی تھی اس لیے اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا۔ اور بتا دیا کہ جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ خرچ کرو گے اس کا اجر پورا پورا ملے گا۔ مال کے خرچ کرنے میں نفس کو پریشانی اسی بات کی ہوتی ہے کہ یہ ضائع ہو رہا ہے اور اس کے معاوضہ میں کچھ حاصل نہ ہوگا یہاں اسی خیال کی جڑ کاٹ دی اور اطمینان دلایا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کھوئیں گے کچھ بھی نہیں بلکہ سب وہاں پر حاصل کر لیں گے اور ان کے اجر میں ذرا بھی کمی نہ ہوگی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت سے یہ بات استنباط فرمائی ہے کہ سرکاری خزانہ کو بھرا ہوا رکھنا ضروری ہے تاکہ دشمن سے مقابلہ کے موقعہ پر کام آسکے۔

قرآن میں جگہ جگہ اور قدم قدم پر مسلمانوں سے انفاق کا جو مطالبہ ہو رہا ہے یہ اس ذہنیت کے لیے بہت بڑا تازیانہ ہے کہ صحابہ کا معاشرہ فقر و ناداری کا معاشرہ تھا۔ ان کے پاس سرمایہ نہ تھا تو قرآن ان کو انفاق کی دعوت کیوں دے

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے قرآن نے صرف انفاق کی دعوت نہیں دی بلکہ بتایا ہے کہ نیکی حاصل نہیں ہوسکتی اگر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت راسخ نہ ہو جائے لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون گویا حکومت اور قانون کو درمیان میں لائے بغیر قرآن انسان کے اخلاقی احساس کو اتنا مضبوط دیکھنا چاہتا ہے کہ جہاں خارج سے اس پر کوئی دباؤ اور دنیا کی ملامت و سرزنش کا کوئی موقع نہ ہو۔ وہاں بھی ایک انسان دوسرے کی اعانت و دستگیری اور اجتماعی کاموں میں ہاتھ بٹانے کو اپنا فرض منصبی خیال کرے پورا قرآن انفاق کی تاکید سے بھرا پڑا ہے۔ اگر وہ سب آیات جمع کر دی جائیں جن میں انفاق کا حکم دیا گیا ہے تو معلوم ہوگا کہ نماز روزہ کے بعد اگر کسی عمل کی تکرار تلقین کی گئی ہے تو وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ اخلاقی فضیلت رکھنے کے علاوہ معاشی اہمیت کا بھی سرمایہ دار ہے۔ جس جماعت میں انفاق کی روح کارفرما ہوگی اس میں غربت و افلاس اور درد و مصیبت کی صدائیں مشکل سے سنی جائیں گی۔ جس سوسائٹی میں غریبوں کی دستگیری محتاجوں کی اعانت یتیموں کی خبرگیری اور اقربا کی ہمدردی کا جذبہ برسرِکار ہوگا وہاں معاشی تنگدستی کی شکایت ناپید ہوگی۔ جہاں انفاق کی سرگرمیاں ہوں وہاں گردشِ زر میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوسکتی۔ اور جہاں اس میں رکاوٹ نہ ہوگی وہاں معاشی خرابیوں کا ایک بڑا دروازہ آپ سے آپ بند رہے گا۔ کیونکہ دنیا کے اکثر و بیشتر معاشی مفسدات اسی راہ سے آتے ہیں۔ گردشِ زر جس قدر مکمل ہوگی معاشی زندگی اسی قدر پُرسکون ہوگی۔

دعوتِ امن کا اعلان

(۶۱) اور اے پیغمبر اگر آپ کے مخالفین صلح و آشتی کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جائیے اور مستقبل کے لئے اللہ پر بھروسہ کیجئے۔ اللہ ہی کی ذات سب کچھ سننے والی اور جاننے والی ہے مسلمانوں کی تیاری اور مجاہدانہ قربانیوں کو دیکھ کر بہت ممکن ہے کہ کفار مرعوب ہو کر صلح و آشتی کے خواستگار ہوں تو آپ کو ارشاد ہے کہ حسب صوابدید آپ بھی صلح کا ہاتھ بڑھا دیں۔ کیونکہ جہاد سے خونریزی نہیں۔ اعلاء کلمۃ اللہ اور دفع فتنہ مقصود ہے۔ اگر بدون خونریزی کے یہ مقصد حاصل ہو جائے تو خواہ مخواہ خون بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر یہ احتمال ہو کہ شائد کفار صلح کے پردے میں ہم کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں تو کچھ پروا نہ کیجئے اللہ پر بھروسہ رکھیئے وہ ان کی نیتوں کو جانتا اور ان کے اندرونی مشوروں کو سنتا ہے اس کی حمایت کے سامنے ان کی بدنیتی نہ چل سکے گی آپ اپنی نیت صاف رکھیئے [1]

اس آیت میں قطعی لفظوں میں قرآن کی دعوتِ امن کا اعلان ہوا ہے۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کہ جنگِ بدر کے فیصلے نے مسلمانوں کی فتح مندی آشکارا کر دی تھی اور تمام جزیرۂ عرب ان کی طاقت سے متاثر ہونے لگا تھا تاہم حکم ہوا

[1] افادات شیخ الاسلام

جب کبھی دشمن امن و صلح کی طرف جھکے چاہیے کہ بلا تامل تم بھی جھک جاؤ۔ اگر ان کی نیت میں فتور ہو گا تو ہوا کرے۔ اس کی وجہ سے صلح و امن کے قیام میں ایک لمحے کے لیے بھی دیر نہ کرنی چاہیے۔

یہاں صاحب تفہیم القرآن کی یہ تشریح بے حد لطیف اور دلاویز ہے کہ:

بین الاقوامی معاملات میں تمہاری پالیسی بزدلانہ نہیں ہونی چاہیے بلکہ خدا کے بھروسہ پر بہادرانہ اور دلیرانہ ہونی چاہیے۔ دشمن جب گفتگوئے مصالحت کی خواہش ظاہر کرے بے تکلف اس کے لیے تیار ہو جاؤ اور صلح کے لیے ہاتھ بڑھانے سے صرف اس بنا پر انکار نہ کرو کہ وہ نیک نیتی سے صلح کرنا نہیں چاہتا بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔ کسی کی نیت بہر حال یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ واقعی صلح ہی کی نیت رکھتا ہو تو تم خواہ مخواہ اس کی نیت پر شبہ کر کے خونریزی کو طول کیوں دو۔ اگر وہ غدر کی نیت رکھتا ہو تو تمہیں خدا کے بھروسہ پر بہادر ہونا چاہیے۔ صلح کے لیے بڑھنے والے ہاتھ کے جواب میں ہاتھ بڑھاؤ تاکہ تمہاری اخلاقی برتری ثابت ہو۔ اور لڑائی کے لیے اٹھنے والے ہاتھ کو اپنی قوت بازو سے توڑ کر پھینک دو تاکہ کبھی کوئی غدار تم کو نرم چارہ سمجھنے کی جرأت نہ کرے۔

سمجھنے والوں کے لیے یہ کیسی گہری اور لطیف بات ہے کہ قرآن ابھی تیار رہا تھا اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل۔ وہی قرآن اب ہدایت دے رہا ہے وان جنحوا للسلم فاجنح لھا۔ اور امن اور جنگ دو متضاد حالتیں ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام میں متقابل میلانات کے مابین ایک عجیب و غریب مصالحت پائی جاتی ہے۔ یہاں ہر تصور کے ساتھ اس کا مخالف بھی موجود ہے۔ بلاشبہ اسلام دنیا میں امن و سلامتی کی دعوت لے کر آیا ہے۔ لیکن امن پسندی میں اس نے کبھی اس قدر غلو نہیں کیا کہ جنگ کی ضرورت سے بالکل انکار کر دیتا۔ اس نے صاف اعلان کر دیا کہ بعض حالات و مواقع پر اور بعض مقاصد کے لیے جنگ اتنی ہی ضروری ہے جتنا عام حالات میں امن ضروری ہے۔ اس نے فتنہ و فساد مٹانے کے لیے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ اس وقت تک جنگ کرو جب تک فتنہ و فساد کا سر کچل نہ دیا جائے وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ قیام امن کے لیے جنگ ضروری ہے۔ وہ امن کا اتنا شیدائی نہیں ہے کہ کسی صورت میں جنگ کو روا ہی نہ رکھے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ امن کبھی قائم نہ ہوتا یعنی خود تصور امن کی نفی ہو جاتی اسلام نے قتل کو ممنوع اور شدید ترین معصیت قرار دیا ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق۔ لیکن اسی قتل کو قصاص کی صورت میں نہ صرف جائز کیا بلکہ لازم قرار دیا اور اسے زندگی بتایا ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب (اے عقلمند قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے) ان دو متضاد تصورات کو سامنے رکھیے۔

اول یہ کہ قتل نفس شدید جرم ہے۔
دوسرے یہ کہ قتل نفس ایک ضروری فعل ہے اور اسی میں تمہارے لیے زندگی ہے۔ اب خود ہی فیصلہ کیجئے کہ اسلام نے دو متضاد احکام دیتے ہوئے کس خوبی سے ان میں مصالحت کی ہے۔

اسی طرح اگرچہ اس نے اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کیا ہے کہ اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل. مقدور بھر طاقت فراہم کرو اور ہر قسم کی طاقت اور گھوڑے سواروں کی فوج مگر اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا وان جنحوا للسلم فاجنح لھا۔ یہاں بھی جنگ اور امن دو متضاد تصورات ہیں۔ اگر امن میں غلو کیا جائے تو ظالموں اور شریروں کو عقوبت کا کوئی خوف نہ رہے گا اور اگر جنگ کا حکم نہ دیا جائے تو دنیا میں بدامنی اور خونریزی کا بازار گرم ہو جائے گا اسلام نے ان دونوں میں اس طرح مصالحت کی کہ امن کی حالت کو ایک مستحسن اور قابل قدر مقصد قرار دیا اور جنگ کو امن قائم کرنے کا ذریعہ بنایا ——— غرض اسلامی تعلیمات کے جس پہلو پر غور کرو گے متضاد تصورات اور متصادم میلانات کو اس طرح سمویا ہوا پاؤ گے۔ صحیح معنی میں اسلامی زندگی بسر نہیں ہو سکتی جب تک مسلمان اپنے عمل کی وحدت میں ان اضداد کو حل نہ کرے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام کا اولین مقصد یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دنیا کے ہر دوسرے وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقاء کا آرزومند ہے۔ اور کش مکش حیات میں مبتلا ہے اور اس میدان میں اسلام اس کا تنہا مدمقابل ہے۔ کیونکہ وہ اپنی نظرت کے اعتبار سے کفر کی ضد ہے اسلام اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی مستقل قائم ہے۔ یہ لڑائی دنیا کی دوسری تمام لڑائیوں پر حاوی اور ان سے زیادہ ہے۔ کفر کی طاقتیں اسلام کے سفر ارتقاء میں مزاحم ہوتی ہیں لیکن ان کی یہ مزاحمت حق و صداقت کی سعی کمال کا سبب بن جاتی ہے۔ کفر و اسلام کا یہ تصادم اور ان دونوں کی ازلی پیکار اسلام کی قوت حیات کی افزونی اور کفر کے ضعف و شکست پر منتج ہوتی ہے۔ اس لیے جن بزرگوں نے یہ بات لکھی ہے کہ اصل فریضہ دنیا سے محنت و کوشش اور جہاد کے ذریعہ کفر کو مٹانا ہے۔ ضرورت اور مصلحت کی وجہ سے کفر سے صلح کی اجازت ہے حکم نہیں۔ اس کا پس منظر یہی نظریہ ہے۔

شرح السیر الکبیر میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں کافروں کے مقابلہ کی طاقت اور قوت ہو تو پھر ان سے صلح کرنا کسی طرح مناسب اور زیبا نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے کافروں سے جہاد کا حکم دیا ہے اور صلح کی صورت میں یہ فریضہ ادا نہ ہوگا یا اس کی ادائیگی میں تاخیر ہوگی۔ اور مسلمان سربراہ مملکت کے لیے

کسی طرح مناسب نہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں سے بغیر ضرورت صلح کرے کیونکہ اللہ سبحانہ کا
ارشاد ہے لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین. سست نہ ہو
اور غمگین نہ ہو تم ہی سربلند ہو گے اگر ایمان والے ہو ـــــ اور اگر مسلمانوں میں کافروں کے مقابلہ کی قوت
نہ ہو پھر صلح کر لینے میں کوئی حرج نہیں .... کیونکہ ایسی
حالت میں صلح کر لینے میں ہی مسلمانوں کے لیے خیر ہے۔ ارشاد ہے وان جنحوا للسلم فاجنح
لھا۔ اگر کافر صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو جاؤ نیز ایسی حالت میں صلح کرنا ہی تنال
کی تدبیر ہے۔ قوت فراہم کرنے کے بعد پھر مقابلہ کیا جائے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں اسی لیے حضور اقدس ﷺ نے حدیبیہ کے سال میں مشرکین کے مطالبہ پر دعوت صلح کو
شرف پذیرائی دیا تھا اور جن شرائط پر صلح ہوئی تھی وہ سب کو معلوم ہیں۔

اگرچہ امام مجاہد نے آیت کا پس منظر بنو قریظہ کے یہودیوں کو بتایا ہے۔ لیکن ابن کثیر نے یہ کہہ کر اس کا انکار کر دیا
لان السیاق کلہ فی وقعۃ بدر۔
قرآنی سیاق سارا کا سارا بدر سے متعلق ہے۔
اصل یہ ہے کہ کوئی تخصیص نہیں ہے آیت عام ہے۔ اس لیے سب سے صلح ہو سکتی ہے۔

بین الاقوامی معاملات میں حق کا احترام

(۶۸) اور اے پیغمبر اگر وہ آپ کو دھوکا دینا چاہیں گے تو بلاشبہ اللہ سبحانہ آپ کو کافی ہے۔ وہی تو ہے جس نے ماضی میں
اپنی مدد سے اور اہلِ ایمان کی عددی طاقت سے آپ کو قوت دی۔ اگر صلح کر کے وہ لوگ دغابازی اور عہد شکنی کا ارادہ کریں
تو فکر نہ کیجئے۔ اللہ سبحانہ آپ کی مدد کے لیے کافی ہے ان کے سب فریب و خداع بے کار کر دے گا۔ اسی نے بدر میں آپ
کی غیبی امداد فرمائی اور ظاہری طور پر جان نثار و سرفروش مسلمانوں سے آپ کی تائید کی[۱]۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا دشمن
تمہیں دھوکا دینے کے لیے تم سے صلح کر رہا ہے اور دل میں یہ ارادہ کیے ہوئے ہے کہ موقع پاتے ہی تم پر ہاتھ صاف کرے
گا تو اس بات کا بالکل اندیشہ نہ کرو۔ تمہیں دل کا حال کیا معلوم۔ اگر تمہارے دشمن کی نیت خراب ہے تو اللہ تعالیٰ اسے خوب
جانتا ہے۔ تمہیں اس پر بھروسہ کرنا چاہیئے جب تک اس کی مہربانی تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارے دشمن کی چالیں تمہارا کچھ
بگاڑ نہ سکیں گی۔ تم کو تو صرف ایک بات کی فکر کرنا چاہیے۔ اور وہ یہ کہ اللہ سے تمہارا تعلق زیادہ سے زیادہ مضبوط رہے تم آپ کو

[۱] افادات شیخ الاسلام

زیادہ سے زیادہ اس کی امداد کا حقدار بنالو۔ اس کے احکام اور ہدایات کی زیادہ سے زیادہ پیروی کرنا نتائج کے بارے میں پورے طور پر مطمئن رہنا چاہیئے کہ وہ تمہارا ساتھ دیں گے کیونکہ اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اللہ کی ذات تمہیں کافی ہے۔ یہاں فان حسبك الله کا فقرہ بڑا بلیغ اور گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔ قلم اس کی معنویت اور بلاغت بیان کرنے سے قاصر ہے خاص طور پر غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ قرآن حق وانصاف کے جس اصول کی تلقین انسان کو اس کی انفرادی زندگی کے لیے کرتا ہے اسی کی تلقین اس کی اجتماعی زندگی کے لیے بھی کرتا ہے اور اسی کی تلقین اس کی بین الاقوامی زندگی کے لیے بھی کرتا ہے۔ اور اس تصریح کے ساتھ کرتا ہے کہ اگر اس میں کچھ خطرہ اور اندیشہ بھی ہو، جب بھی کسی خیر کی پیشکش ٹھکرانی نہ چاہیے بلکہ اللہ پر بھروسہ کرکے قبول کرلینی چاہیے۔ آپ اگر اس کی عملی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو صلح حدیبیہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ آپ مستقبل کو شک کی نگاہوں سے نہ دیکھیں اگر وہ صلح میں آپ کو کوئی دھوکہ دینا چاہیں گے تو آپ کی حمایت کے لیے اللہ کافی ہے۔ اس کے بعد ایک واقعاتی حقیقت کی طرف یہ کہہ کر اشارا کیا کہ ھو الذی ایدك بنصرہ و بالمومنین یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے آپ کی بدر میں مدد فرمائی تھی۔ اور اہل ایمان کی جماعت کو آپ کی پشت پناہی کے لیے کھڑا کر دیا تھا دونوں قسم کی امدادوں کا ذکر فرمایا ظاہری اور باطنی۔ ظاہری مسلمانوں کی عددی طاقت کے ذریعے باطنی یعنی امداد کے ذریعے یہ دونوں قسم کی امداد من اللہ کے کافی ہونے کی دلیل ہیں۔

تزکیہ اخلاق کا بہترین عمل

(۷۹) اور اہل ایمان کے دلوں میں باہم محبت والفت کی سرشاریاں نمایاں کیں اگر آپ روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر دیتے پھر بھی آپ ان کے دلوں میں محبت کی سرشاریاں نہ پیدا کر سکتے۔ لیکن یہ تو اللہ کی ذات ہے جس نے ان میں باہم محبت والفت کے جذبات نمایاں کیے۔ بلاشبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اسلام سے پہلے عرب میں جدال وقتال اور نفاق وشقاق کا بازار گرم تھا۔ ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر قبائل آپس میں ٹکراتے رہتے تھے۔ دو جماعتوں میں جب لڑائی شروع ہو جاتی تو صدیوں تک اس کی آگ ٹھنڈی نہ ہوتی تھی مدینے کے دو زبردست قبیلوں اوس وخزرج کی حریفانہ نبرد آزمائی اور دلیرانہ بغض وعداوت کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور عزت وآبرو کا بھوکا تھا۔ ان حالات میں آقائے نامدار جناب محمد رسول اللہ ﷺ توحید ومعرفت اور اتحاد واخوت کا عالمگیر پیغام لے کر مبعوث ہوئے۔ لوگوں نے ان کو بھی ایک فریق ٹھہرالیا اور سب نے مل کر خلاف وشقاق کا رُخ ادھر پھیر دیا پرانے کینے اور عداوتیں چھوڑ کر ہر قسم کی دشمنی کے لیے حضور کی ذات قدسی صفات کو مطمح نظر بنالیا۔ وہ آپ کی پند ونصیحت سے گھبراتے تھے اور آپ کے سایہ سے بھاگتے تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت نہ تھی جو درندوں کی بھیڑ اور بہائم کے گلہ میں معرفت

الٰہی اور حب نبوی کی روح پھونک کر اور شراب توحید کا متوالا بنا کر سب کو ایکدم اخوت و الفت باہمی کی زنجیر میں جکڑ دی تھی اور اس مقدس وجود کا ورم ناخریدہ غلام اور عاشق جان نثار بنا دیتی جس سے زیادہ چند روز پہلے ان کے نزدیک کوئی مبغوض ہستی نہ تھی۔ بلاشبہ روئے زمین کے خزانے خرچ کر کے بھی یہ مقصد حاصل نہ کیا جا سکتا۔ جو اللہ کی رحمت و اعانت سے ایسی سہولت کے ساتھ حاصل ہو گیا۔ اللہ سبحانہ نے حقیقی بھائیوں سے زیادہ ایک کی الفت دوسرے کے دل میں ڈال دی اور پھر سب کی الفتوں کا مرکز حضور انور ﷺ کی ذات منبع البرکات کو بنا دیا قلوب کو دفعۃً ایسا پلٹ دینا اللہ سبحانہ کی زبردست قدرت کا کرشمہ ہے اور ایسی شدید ضرورت کے وقت سب کو محبت و الفت کے ایک نقطہ پر جمع کر دینا اس کے کمال حکمت کی دلیل ہے۔[1]

اس موقعہ پر اہل ایمان کو مطمئن کرنے کے لیے اللہ سبحانہ نے ایک بڑے انعام کو یاد دلایا ہے۔ عرب کے مختلف خاندان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اور ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے رہتے یہ محض اللہ سبحانہ کا فضل و احسان ہے کہ جونہی اللہ کے دین کے رشتہ میں منسلک ہوئے تو ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے اور ان میں ایسی محبت رونما ہوئی جو کبھی سگے بھائیوں میں بھی نہیں دیکھی گئی۔ وہ سب ایک دوسرے کے جان نثار اور بھائی بن گئے۔ یہ اتنی بڑی نعمت تھی کہ اگر دنیا کا سارا خزانہ صرف کر کے اس نعمت کو حاصل کرنا چاہتے تو حاصل نہ ہوتا ـــــ اللہ تعالیٰ اپنے اس بے پایاں انعام کو یاد دلا کر اہل ایمان کو اطمینان دلا رہا ہے کہ جس خدا نے یہ سب کچھ کر دیا ہے وہ ہی سارے کام بنانے کے لیے کافی ہے۔ اہل ایمان کو زندگی کے سارے معاملات میں اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور کسی موقعہ پر اس اندیشہ سے کہ کل کیا ہو گا اپنی اخلاقی برتری کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔

عام شارحین قرآن کی نظر صرف الف بین قلوبھم میں اٹک کر رہ گئی اس لیے انھوں نے صرف یہ کہنا کافی سمجھا کہ۔

اس کے ساتھ اس آیت میں یہ بھی تبلا دیا گیا کہ مختلف لوگوں کے دلوں کو جوڑ کر ان میں الفت و محبت پیدا کرنا کسی انسان کے بس کا کام نہیں صرف اس ذات کا کام ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی انسان ساری دنیا کی دولت بھی اس کام کے لیے خرچ کر ڈالے کہ باہم منافرت رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں الفت پیدا کر دے تو وہ کبھی اس پر قابو نہیں پا سکتا۔[2]

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ خاص تائید غیبی کا کرشمہ ہے کسی شیطانی مقصد کے لیے کسی بھیڑ کا اکٹھا کر لینا تو مشکل نہیں ہوتا۔ ہر نعرہ باز یہ کر سکتا ہے لیکن خاص اللہ کے کام کے لیے جس میں خدا کی خوشنودی اور آخرت کی

[1] افادات شیخ الاسلام

[2] معارف القرآن مفتی صاحب

طلب کے سوا کسی بھی دوسری چیز کا کوئی ادنیٰ شائبہ نہ ہو کلمہ حق پر جان نثاروں کی ایک جمعیت کا فراہم ہو جانا بغیر اس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تائید کی اور اس کی توفیق بخشی اور رہنمائی کی۔ جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمع ہوئے تھے اپنی یہ نئی زندگی اختیار کرنے سے پہلے دورِ جاہلیت کی تمام برائیوں میں آلودہ تھے۔ اور ان کے قبیلے جدا جدا تھے اور ان میں شدید قسم کے تعصبات تھے۔ اور ان کے دیوتا الگ الگ تھے اور یہ آنکھیں بند کر کے ان کی پرستش کرتے۔ ان کے مفادات باہم متصادم تھے اور یہ ان کے حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز اور عدل و ظلم کے تمام حدود و قیود سے آزاد تھے اس قسم کے لوگوں کو ان کے تمام تعصبات و مفادات اور تمام رسوم و عادات سے چھڑا کر بالکل ایک نئے سانچے میں ڈھال دینا اور اس سانچے کو ان کی نگاہوں میں اتنا محبوب بنا دینا کہ اس کی خاطر وہ قوم وطن، خاندان، جائیداد اور بیوی بچے سب چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں۔ یہ خدا ہی کے لیے ممکن ہے کوئی انسان یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ اگرچہ وہ دنیا جہاں کے سارے وسائل اس پر صرف کر ڈالے۔[1]

اشارات اس بھائی چارے اور الفت و محبت کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے اہلِ عرب کے درمیان پیدا کر کے ان کو ایک مضبوط جتھا بنا دیا تھا۔ حالانکہ اس جتھے کے افراد ان مختلف قبیلوں سے نکلے تھے جن کے درمیان صدیوں سے دشمنیاں چلی آ رہی تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ اللہ کا یہ فضل اوس و خزرج کے معاملے میں تو سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ یہ دونوں قبیلے دو ہی سال پہلے تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اور مشہور جنگ بعاث کو کچھ زیادہ دن نہیں گذرے تھے جس میں اوس نے خزرج کو اور خزرج نے اوس کو گویا صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ایسی شدید عداوتوں کو دو تین سال کے اندر گہری دوستی میں تبدیل کر دینا اور ان متنافر اجزاء کو جوڑ کر ایسی ایک بنیان مرصوص بنا دینا جیسی کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں اسلامی جماعت تھی یقیناً انسان کی طاقت سے بالاتر تھا۔ اور دنیوی اسباب کی مدد سے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام نہیں پا سکتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہماری تائید و نصرت نے یہ کچھ کر دکھایا ہے تو آئندہ بھی تمہاری نظر دنیوی اسباب پر نہیں بلکہ خدا کی تائید پر ہونی چاہیے کہ جو کچھ کام بنے گا اسی سے بنے گا۔[2]

دنیا میں کوئی کام انسان کے لیے اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ بکھرے ہوئے انسانی دلوں کو ایک رشتہ الفت میں پرو دے اور یہ کام تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے جب معاملہ ایسے انسانوں کا ہو جو صدیوں سے باہم جنگ و جدال کی آب و ہوا میں پرورش پاتے رہے ہوں اور جن کے نفسیاتی سانچوں میں باہمی آمیزش و ائتلاف کا کوئی ڈھنگ باقی نہ رہا ہو۔ پیغمبر اسلام کا ظہور ایسے ہی لوگوں میں ہوا تھا مگر ابھی ان کی دعوت پر بارہ برس ہی گذرے تھے کہ مدینہ میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا

---

[1] تدبر قرآن

[2] تفہیم القرآن

جو اس اعتبار سے بالکل ایک نئی قسم کی مخلوق تھی۔ وہ جب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے باہمی کینہ و انتقام کے مجسمے تھے لیکن جونہی مسلمان ہوئے محبت و سازگاری کی ایسی پاک و قدوسیت ابھر آئی کہ ان میں کا ہر فرد دوسرے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے مستعد ہو گیا۔ فی الحقیقت یہی وہ تزکیہ اخلاق کا عمل ہے جو ایک پیغمبرانہ عمل تھا اور جو حضور اقدس کی تعلیم و تربیت نے انجام دیا[1]

یہ تھے اردو شارحین قرآن آیئے ذرا عربی میں لکھنے والوں کے تاثرات بھی کچھ استفادہ کر لیجئے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

اہل عرب میں بغض و عداوت کا ایک تسلسل قائم تھا۔ انصار بھی باہم آویزش کا شکار تھے اوس و خزرج کے درمیان زمانہ جاہلیت کی جنگیں سب کو معلوم ہیں اللہ سبحانہ نے نور ایمان کے ذریعے اس مسلسل آویزش کو ختم کیا۔ جیسا کہ قرآن میں دوسرے موقع پر بتایا ہے واذکروا نعمة الله علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا۔ اور صحیح بخاری، صحیح مسلم میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع انصار میں یہ تقریر فرمائی اے گروہ انصار کیا تم گمراہ نہ تھے اللہ نے میرے ذریعے تم کو ہدایت دی۔ کیا تم معاشی اعتبار سے تنگ دست نہ تھے اللہ نے میرے ذریعے تمہیں غنی بنایا اور کیا تم منتشر نہ تھے اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ایک رشتہ الفت میں پرو دیا[2]

علامہ زمخشری فرماتے ہیں۔

اہل ایمان کے دلوں میں محبت ڈالنا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک عظیم معجزہ ہے کیوں کہ معمولی سی بات پر دشمنی کینہ اور حمیت و عصبیت کے خوگر تھے۔ حمیت و عصبیت ہی ان کا قومی نصب العین تھا انتقام کے بغیر ان کو کبھی چین نہ آتا تھا۔ دو دل کبھی باہم نہ ملتے تھے حضور اقدس کی اتباع کے صدقے ان میں باہم محبت ہوئی ان میں یگانگت آئی۔ کہ گویا ایک کمان سے تیر اندازی کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو رشتہ محبت میں پرو دیا۔ ان میں اجتماعیت آئی۔ اور ان میں باہم اس قدر محبت ہو گئی کہ بغض و عناد کا نام و نشان نہ رہا یہ کام اس ذات کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ جو دلوں کا مالک ہے اور دلوں کو جیسے چاہے پلٹتا رہتا ہے[3]

ابو حیان اندلسی فرماتے ہیں کہ

آیت عام ہے اس میں اوس خزرج کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اہل عرب حمیت اور عصبیت کی بیماری میں مبتلا تھے۔ چھوٹی سی چھوٹی چیز پر اس کا مظاہرہ کرتے۔ ان میں کوئی چیز اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ نہ تھی اللہ سبحانہ نے ان کے دلوں میں اتباع رسالت کا ولولہ پیدا کر دیا اور یہی ولولہ ان کی باہمی محبت کا ذریعہ بن گیا۔ اس کی خاطر انھوں نے اپنی جانوں

[1] ترجمان القرآن　[2] ابن کثیر　[3] کشاف

ماں کی قربانی دی. اصل بات یہ ہے کہ محبت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب محبوب سے خیر حاصل ہونے کا تصور ہوتا ہے۔ اگر محبت کا سبب جلدی ختم ہو جانے والا ہوتا ہے تو محبت بھی جلدی ختم ہو جاتی ہے معشوق عاشق کو مال کی وجہ سے چاہتا ہے اور عاشق معشوق کو مزہ کی خاطر ملتا ہے۔ جب دونوں کی مراد پوری ہوتی ہے دونوں میں محبت ہو جاتی ہے اگر مراد پوری نہ ہو تو بغض و عناد رونما ہو جاتا ہے۔ لیکن محبت ہونے کا سبب کمال روحانی ہو تو اس میں کبھی زوال نہیں آتا ہے حضور اقدس ﷺ نے عرب کا اسی حقیقی کمال روحانی سے تعلق پیدا کیا اس کے نتیجے میں وہ بھائی بھائی ہو گئے۔[1]

اصل ارشاد میں الف بین قلوبھم آیا ہے یہ الف سے ہے اس کے معنے امام راغب نے یہ بتائے ہیں۔
مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب سے اکٹھا ہو جانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیے وہ جگہ اس کو ملے جو پہلے ہونے کا حقدار ہے وہ پہلے رہے اور جس کو آخری جگہ ملنی چاہیے وہ آخری جگہ پائے۔
آیئے امام راغب کی بات ان کی زبانی سن لیجئے۔

ماجمع من اجزاء مختلفۃ ورتب ترتیبا قدم فیہ ما حقہ ان یقدم واخر فیہ ما حقہ ان یؤخر۔

آپ کچھ سمجھیں مگر میں تو اس سے یہی سمجھا ہوں کہ اہل ایمان میں تالیف سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود ایک طاقت اور ایک فرد واحد پر اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب سے اکٹھی ہو جائیں اور مقام مراد، قومی، اعمال اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو گیا تا آنکہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہم گرجڑا ہوا۔ ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی۔ ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد ہے۔ کسی چیز کسی گوشہ کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی انتشار الگ الگ، جز جز فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت نہیں رہتی۔

مادے میں جب یہ اجتماع اور انضمام ہوتا ہے تو اسی سے تخلیق و تکوین کے تمام مراتب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لہذا زندگی اور وجود نام ہے اجتماع و تالیف کا۔ یہی حالت جب اخلاق پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اسے خیر اور قانون کی اصطلاح میں اسے عمل صالح کہتے ہیں جب انسان پر یہ حالت طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں اسے صحت اور تندرستی کہتے ہیں۔ اور پھر یہی حالت جب قومی و اجتماعی زندگی کی قوتوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام حیات اجتماعی اور جماعت ہوتا ہے اور اس کا ظہور جماعتی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی صورت میں دنیا دیکھتی ہے قرآن نے یہاں مسلمانوں کو جنگ کی تیاری میں طاقت کی بہم رسانی افرادی طاقت، اسلحہ اور اس کے لیے مال خرچ

[1] نظام القرآن

کرنے کی تاکید کے بعد جو الف بین قلوبھم کے انعام کا ذکر کیا ہے تو صرف یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ اجتماع و ائتلاف اسلامی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد ہے اور یہ بھی بتلا دیا کہ اہل ایمان میں اس اجتماع و ائتلاف کی صالح و حقیقی زندگی پیدا کرنا محض انسانی تدبیر سے ممکن نہیں۔ دنیا میں کوئی انسانی تدبیر امت نہیں پیدا کر سکتی یہ کام صرف اللہ ہی کی توفیق اور رحمت اور اس کی وحی و تنزیل کا ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بنا دیا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہاں الف بین قلوبھم لا کر قرآن صرف الفت و محبت کی بات نہیں بتا رہا ہے بلکہ وہ مسلمانوں کو سمجھا رہا ہے کہ اسلامی زندگی یہ ہے کہ اتحاد ہو ائتلاف ہو اور امتزاج و نظم ہو۔ اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اعمال حیات میں منتشر نہ ہوں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ اور ان کے تمام اعمال مل کر انجام پائیں۔ کسی گوشہ عمل میں پھوٹ نہ ہو ائتلاف کا مرتبہ اتحاد سے بلند تر ہے اتحاد صرف باہم مل جانا ہے لیکن ائتلاف سے مقصود ایسا اتحاد ہے جو محض اتحاد نہ ہو بلکہ ایک صحیح اور مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و قوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے وہی جگہ اسے ملی ہو۔ اور ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے جتنی مقدار میں دخل پانے کی اس میں استعداد ہو۔ ایسا نہ ہو کہ رشید کو سردار ہونا چاہیے اور اس سے چاکری کا کام لیا جائے اور حمید کی قابلیت کا عنصر صرف چھٹانک بھر جزو جماعت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو سیر بھر قرار دیا جائے۔

امتزاج ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے۔ یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے ایسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملا دیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ دو ایسے آدمیوں کو ملا دیا گیا جن کی طبیعت و خصلت اور استعداد و صلاحیت باہم گر میل نہیں کھا سکتی اور اس لیے خواہ کتنا ہی دونوں کو ملاؤ لیکن تیل پانی کی طرح ہمیشہ الگ ہی نظر آئیں گے باہم مل کر یک جان نہ ہوں گے اللہ سبحانہ نے جیسے عناصر کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ باہم اگر مل کر ایک نئے مرکب وجود میں متشکل ہوں: اسی طرح افراد انسانی کو بھی اس نے پیدا کیا تا کہ ان کے باہم ملنے سے جماعت پیدا ہو۔ جماعت ایک مرکب وجود ہے۔ افراد اس کے عناصر ہیں۔ فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا۔ محض ایک مٹی ہے اور جب تک اپنے بقیہ ٹکڑوں سے مل نہ جائے کامل وجود نہیں پا سکتا۔ لیکن یہ باہم ملنا امتزاج کے ساتھ ہونا چاہیے تا کہ ہر ٹکڑا اپنے صحیح و مناسب ٹکڑے کے ساتھ مل کر اس طرح جڑ جائے کہ معلوم ہو کہ یہ نگینہ اس انگشتری کے لیے تھا۔

نظم: سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و تقویمی حالت ہے جب اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم اپنے اپنے دائرے میں محدود اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

یہ تینوں خود بخود الفت کا ناگزیر تقاضا ہیں۔ الفت کا ان کے بغیر وجود ہی نہیں ہے۔ الفت کے یہ سہ گانہ عناصر وجود میں آ نہیں سکتے اور نہ قائم رہ سکتے ہیں جب تک کہ کوئی بالاتر فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد، مؤتلف ممزوج اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔ لہذا ایک امام کا وجود ناگزیر ہوا اس لیے ناگزیر ہے کہ سب سے پہلے تمام افراد ایک ایسے شخص کو اپنا امام و مطاع تسلیم کریں جو بکھرے ہوئے افراد کو اتحاد و ائتلاف امتزاج و نظم کے ساتھ جوڑ دینے سے ایک حی و قائم جماعتی وجود پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اصل مرکز جماعتی طاقت کا امام ہے۔

اسی بناپر حضور اقدس ﷺ نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت رکھا ہے۔ اور جماعت سے علیحدگی کو جاہلیت اور حیات جاہلی کہا ہے۔ اور اسی وجہ سے بکثرت احادیث و آثار میں ہر مسلمان کو ہر حال میں التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا ہے اگرچہ وہ غیر مستحق ہو نا اہل ہو فاسق ظالم ہو بشرطیکہ مسلمان ہو اور نماز قائم رکھے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ آیت میں صرف محبت ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ جس چیز کا قرآن یہاں انعام بتا رہا ہے وہ مسلمانوں کا نظام جماعت ہے۔ جن کاموں کے کرنے کا پہلے حکم دیا گیا ہے۔ ان میں ایک کام بھی بغیر جماعت کے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ سورت کا موضوع غزوۂ بدر ہے۔ اس سورت میں مسلمانوں کو اجتماعی احکام دیئے جا رہے سب سے پہلے حکم ہوا کہ:

۱۔ قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ

۲۔ اذا لقیتم فئۃ فاثبتوا واذکروا اللہ کثیرا

۳۔ لا تنازعوا فتفشلوا واصبروا

۴۔ لا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا

۵۔ فاما تثقفنھم فی الحرب فشرد بھم من خلفھم

۶۔ اما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم

۷۔ اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ

۸۔ ما تنفقوا من شئی فی سبیل اللہ

۹۔ وان جنحوا للسلم فاجنح لھا

۱۰۔ ان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ۔

آپ خود سوچیئے کہ کیا اس زمین میں یہ بات کوئی وزن رکھتی ہے کہ اللہ کا اے مسلمانو! یہ انعام ہے کہ اس نے

حقیقی بھائیوں سے زیادہ تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی ہے —— یا اس کے مقابلے میں یہ بات وزن رکھتی ہے کہ ان احکام کی بجا آوری کا مدار یہ ہے کہ اللہ نے تم کو ایسی جماعت بنا دیا ہے کہ تم میں اتحاد ہے اختلاف ہے انتشار ہے اور تنظیم ہے۔ یہ اللہ کا تم پر خاص انعام ہے۔ ایسا انعام کہ کہیں کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ اسی پارے میں آرہی ہے۔ سردست ان ہی اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔ جماعت کے موضوع پر احادیث۔ ائمہ کی تصریحات آگے آرہی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس تشریح میں منفرد ہوں لیکن مجھے خوشی ہے کہ قرآن کے سیاق وسباق کی مجھے تائید حاصل ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾
يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ
مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ
مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ
لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ
فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا
مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ
اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

اے نبی اللہ تجھے اور ان لوگوں کو جنھوں نے تیرا اتباع کیا کافی ہے ۸۰؎ اے نبی مسلمانوں کو لڑائی کا شوق دلا مسلمانو! ـــــ اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے۔ اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے۔ یہ اس لیے کہ کافر بصیرت سے محروم ہیں ۸۱؎ مسلمانو! اب اللہ سبحانہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اسے علم ہے کہ تم میں کمزوری ہے اب اگر تم ثابت قدم ایک سو ہوگے تو دو سو پر غالب آؤ گے اور تم ہزار ہو گئے تو دو ہزار کو مغلوب کرو گے بلاشبہ اللہ سبحانہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے ۸۲؎

مُفردات کے مَعانی

حرض :۔ تحریض سے امر ہے مادہ حرض ہے۔ لغت میں ہلاکت کے قریب

ہونے کو کہتے ہیں جس میں کوئی خیر نہ ہو اسے بھی حرض کہتے ہیں اور تحریض کے امام راغب نے معنی یہ بتائے کہ کسی چیز کی طرف زیادہ خوبصورت اور آسان حصول بنا کر ترغیب دلانا اس طرح گویا تحریض کے معنے ہلاکت کو مٹانا جیسے تمریض کے معنے بیماری کو دور کرنا ہیں۔

لَا یَفْقَھُوْنَ - نہیں سمجھتے ہیں فقہ جس کے معنے سمجھنے کے اور دریافت کرنے کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں۔ شاہد کے ذریعے علم غائب تک پہنچنے کا نام فقہ ہے لہذا فقہ علم سے خاص ہے۔ اور اصطلاح شریعت میں فقہ احکام شریعت کے علم کو کہتے ہیں۔ پہلے معنے میں جب اس کا استعمال ہوتا ہے تو باب سمع سے آتا ہے اور مصدر فقہ اور فقہ آتا ہے اور جب دوسرے معنے میں آتا ہے تو باب کرم سے آتا ہے اور مصدر فقاہت آتا ہے۔ دو چیزیں ہیں اور دونوں الگ الگ ہیں ایک اعمال ہیں دوسرے مقاصد ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی نگاہ صرف اعمال تک رہتی ہے اور کچھ وہ ہوتے ہیں جن کے پیش نظر اعمال میں مقاصد ہوتے ہیں۔ پہلی حالت کا نام علم ہے دوسری حالت کو فقہ کہتے ہیں مثلاً آپ نماز پڑھتے ہیں آپ کو نماز کے اعمال کا علم ہے اور نماز کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اگر نماز کے عمل میں آپ کی نگاہ مقصد پر ہے آپ صاحب بصیرت اور فقیہہ ہیں۔ اگر مقصد پیش نظر نہیں تو آپ صاحب بصارت اور عالم ہیں۔ کافر جنگ کے موضوع پر صاحب بصارت اور عالم ہوتا ہے لیکن صاحب بصیرت اور فقیہہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک سادہ سا عام فرق ہے امام غزالی نے اسے نہایت اچھے انداز میں احیاء العلوم میں سمجھایا ہے۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی نے شرح احیاء میں امام غزالی کی بات میں جان ڈال دی ہے تفصیل کے شائقین اس کا مطالعہ کریں۔

مومن کی طاقت کا اصلی راز

لڑائی میں سب سے بڑی طاقت وہ اخلاقی قوت ہے جو لڑنے والوں میں موجود ہو۔ دل کے جماؤ اور پورے اطمینان کے بغیر جو لڑائی لڑی جائے گی اس میں کامیابی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ مقابل کی فوجی طاقت بے انتہا کمزور ہو۔ لڑنے والوں کے دل کے جماؤ اور اطمینان کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اپنے مقصد کا شعور ہو ہر سپاہی یہ جانتا ہو کہ اسے کس لیے لڑنا ہے اور کیوں لڑنا ہے جس قدر یہ شعور زیادہ ہو گا اتنی طاقت کے ساتھ سپاہی مقابلہ کر سکیں گے رہے وہ لوگ جنہیں کسی مقصد کا شعور ہی نہ ہو اور وہ محض بیگاریوں کی طرح لڑائی کے لیے آ گئے ہوں ان کے پاؤں بہت جلد معمولی دباؤ سے اکھڑ جاتے ہیں اور کسی مقابلے میں ڈٹ کر جم نہیں سکتے۔ کوئی شخص اس وقت تک اپنی جان کی بازی نہیں لگا سکتا جب تک اسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ جس مقصد کے لیے وہ لڑ رہا ہے اس کی قیمت اس کی اپنی زندگی سے کہیں زیادہ ہے اور اگر وہ مقصد حاصل نہ ہو سکے تو پھر اس کا زندہ رہنا بے کار ہے جو لوگ کسی خاص قوم کی سربلندی یا کسی ملک کی آزادی یا کسی خاص طبقہ کی فلاح کے لیے لڑتے ہیں اور جو اپنی لڑائی کا مقصد اچھی

طرح سمجھتے ہیں اور اس مقصد کو اپنی زندگی سے قیمتی جانتے ہیں وہ ان سپاہیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور ثابت ہوتے ہیں جو محض کرائے پر حاصل کیے جاتے ہیں۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک مومن کی اصل طاقت کا راز کیا ہے کہ اس کا اور اللہ سبحانہ کا تعلق کیا ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات پر اس کا ایمان ہوتا ہے۔ اس کی قوت پر وہ پورا بھروسہ کرتا ہے اپنی زندگی کی حقیقت کو جانتا ہے۔ اس عارضی زندگی کے بعد جو ہمیشہ رہنے والی زندگی اسے ملنے والی ہے اسے اچھی طرح سمجھتا ہے حق و باطل کے فرق کو بھی جانتا ہے اور اسے پورا یقین ہوتا ہے کہ کامیابی آخر کار حق ہی کا حصہ ہے اس شعور بالغ کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کا سب سے بہتر مصرف یہی سمجھتا ہے۔ اسی قوت کی وجہ سے ایک جیسی جسمانی اور مادی قوت والے گروہوں میں ایک اور دس کی نسبت ہو جاتی ہے۔

مقابلہ میں اللہ ہی کافی ہے

(۸۰) اے نبی اللہ تجھے اور ان لوگوں کو جنھوں نے تیرا اتباع کیا کافی ہے اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ اکثر سلف کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ اے پیغمبر خدا تجھے اور تیرے ساتھیوں کو کافی ہے۔ یعنی قلت عدد اور بے سروسامانی سے گھبرانا نہ چاہیے۔ اور بعض علماء نے یہ معنے لیے ہیں کہ اے پیغمبر فی الحقیقت اللہ اکیلا کافی ہے اور ظاہر اسباب کے اعتبار سے مخلص مسلمانوں کی جماعت خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو کافی ہے [1]

حافظ ابن القیم نے زاد المعاد کے مقدمہ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

آیت میں اعرابی صورتیں چار ہیں۔

اول یہ کہ واو کو عاطفہ قرار دیا جائے حسبک کی ضمیر متصل کو معطوف علیہ اور من تبعک کو معطوف قرار دیا جائے اور معنے یہ ہوں کہ اے پیغمبر تجھے اور تیری پیروی کرنے والوں کو اللہ کافی ہے اس کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی کی احتیاج نہیں ہے۔ جنگ کی حالت ہو یا صلح کی۔ صلح میں دشمن خیانت سے کام لے یا دیانت سے ہر حال میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اللہ کافی ہے۔ قرآن میں حو تلہ اور حسبلہ توکل کے عنوان میں اور توکل اللہ کے سوا کسی پر توحید کے خلاف ہے۔

حافظ ابن کثیر نے مشہور امام شعبی عبد الرحمٰن بن زید اور عطا خراسانی جیسے اساطین تفسیر سے یہی معنے نقل کیے ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حسبک اللہ وحسب من تبعک من المؤمنین آپ کو اور آپ کے ساتھ جو موجود ہیں ان کو اللہ کافی ہے۔

دوسرا یہ کہ ومن اتبعک میں واؤ عاطفہ نہیں بلکہ بمعنے مع ہے اور مفعول معہ ہونے کی وجہ سے من اتبعک منصوب ہے مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر تجھے تیرے ساتھیوں سمیت اللہ کافی ہے مشہور امام زجاج کا یہی خیال ہے۔ انہوں نے اس کی تائید میں یہ شعر پڑھا ہے۔

اذا كانت الهيجاء و اشتجرالقنا

فحسبك والضحاك سيف مهند

لیکن ابوحیان اندلسی اسے صحیح نہیں مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سیبویہ کے خلاف ہے۔ سیبویہ نے حسبک و زید درہم میں کفی مقدر مانا ہے۔ مشہور نحوی فراء بھی زجاج کے ہمنوا ہیں۔ مگر ابوحیان اندلسی کو سیبویہ کی بات کی درستگی پر اصرار ہے۔ اور اصرار بھی معمولی نہیں بلکہ اتنا کہ حافظ عسقلانی نے درر کامنہ میں امام ذہبی سے نقل کیا ہے کہ جب حافظ ابن تیمیہ مصر گئے۔ تو شیخ ابوحیان سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ہی مجلس میں وہ کچھ ایسے وارفتہ ہو گئے کہ فی البدیہہ کچھ اشعار کہے ایک یہ ہے۔

كنا نحدث عن حبر يجيئ منها

انت الامام الذی قد كان ينتظر

اور بول پڑے واللہ ما رأت عيناى مثل هذا الرجل بخدا میری آنکھوں نے اس جیسا نہیں دیکھا۔ لیکن بعد کو صحبت سازگار نہ ہوئی۔ نحو کے اسی مسئلہ کی نسبت ابوحیان نے سیبویہ کا حوالہ دیا ابن تیمیہ نے کہا کہ سیبویہ نحو میں نبی اور معصوم نہیں ہے اس نے اپنی کتاب میں ۸۰ غلطیاں کی ہیں۔ یہ ان میں سے ایک ہے۔ اس پر ابوحیان برہم ہو گئے اور پھر آخر تک مخالف رہے حافظ عسقلانی لکھتے ہیں وصیر ذالك ذنبا لا يغفر ابوحیان کی بارگاہ میں یہ ابن تیمیہ کا ناقابل معافی گناہ تھا۔ بہرحال یہ تو معاصرانہ چشمک ہے۔ اصل بات وہی ہے جو زجاج اور فراء نے بتائی ہے۔

تیسرا یہ کہ من اتبعک من المومنین مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع قرار دو اور اس کی خبر محذوف ہو یعنی حسبهم الله مطلب یہ ہے کہ آپ کو اللہ کافی ہے اور ان لوگوں جو آپ کی پیروی کر رہے ہیں اللہ کافی ہے۔ یہ بھی بے غبار اور اسلام کے پیش کردہ تصور توحید کے مطابق ہے۔

چوتھا یہ کہ یہ من اتبعک من المومنین کا عطف اللہ پر ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے پیغمبر تجھے خدا اور اہل ایمان کافی ہیں۔ اگرچہ کچھ بزرگوں نے یہ مطلب بھی بتایا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ حسبلہ، جو تلہ در کفایت توکل، تقوی اور عبادت کی طرح اللہ سبحانہ کے لیے خاص ہے۔ قرآن نے اس سے پہلی آیت میں تقابل مطالعہ پیش کیا ہے۔

وان یریدوا ان یخدعوك فان حسبك الله. هو الذی ایدك بنصرہ وبالمومنین

اس میں حسب اور تائید کو بالمقابل پیش کیا ہے اور بتایا کہ کفایت تو صرف یگانہ خدا کے لیے ہے اور تائید اہل ایمان کے ذریعے ہے۔ قرآن میں ہر جگہ اہل ایمان کا نعرہ حسبنا اللہ آیا ہے کہیں بھی حسبنا اللہ ورسولہ نہیں آیا ہے آپ پوچھ سکتے ہیں کہ عین میدان جنگ میں قرآن کا اس پر زور کیوں ہے۔ کہ اے پیغمبر تمھے اور اہل ایمان کو اللہ کافی ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام کے تمام اجزا جس مرکز سے حرکت اور زندگی حاصل کرتے ہیں وہ اللہ سبحانہ کی ذات وصفات کا تصور ہے۔ اسلام کے جملہ اعتقادات اور سارے اعمال واقدار اسی تصور کی بنیاد پر قائم ہیں اسلام نے صفات الٰہی کی توضیح وتصریح میں جس جامعیت اور ہمہ گیری سے کام لیا ہے وہ دنیا کے دوسرے مذاہب میں مفقود ہے۔ اس کے تمام خارجی ادارے اور تمام نظامات اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں اسلامی مملکت کا تصور، اسلام کا قانونی نظام رسول کی شخصیت اور اس کا منصب، اسلامی معاشرے کا اخلاقی ضابطہ اعمال وفرائض کی تمام شاخیں غرض کہ اسلامی نظام کا ہر معمولی سے معمولی جزء بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ اس مرکزی تخیل سے ہے۔ اس بنیادی تصور کو نکال دیجئے تو اسلامی زندگی کا کوئی جزء بھی اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ میدان جنگ ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ اسلامی زندگی کے منصہ شہود پر آنے کی وجہ یہی ہے کہ شخصیت کے نشوونما اور اجتماعی سیرۃ کی تعمیر کے راستہ میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی ہیں انہیں دور کرے اور وہ تمام ترہیبات وترغیبات فراہم کرے جو اس مقصد کے حصول میں مددگار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی مملکت کا تصور اللہ سبحانہ کی ذات وصفات کے بنیادی اور مرکزی تصور سے ماخوذ ہے۔

اہل ایمان کو جہاد کی ترغیب

(۸۱) اے نبی مسلمانوں کو لڑائی کا شوق دلا۔ مسلمانو! اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم ہوں تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں گے۔ تو ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں گے۔ یہ اس لیے کہ کافر بصیرت سے محروم ہیں۔ یہ مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی ہے کہ تھوڑے بھی ہوں تو جی نہ چھوڑیں۔ خدا کی رحمت سے دس گنے دشمنوں پر غالب آئیں گے سبب یہ ہے کہ مسلمان کی جنگ محض خدا کے لیے ہے وہ خدا کو اور اس کی مرضی کو پہچان کر اور یہ سمجھ کر میدان جنگ میں قدم رکھتا ہے کہ اللہ سبحانہ کے راستہ میں مرنا اصلی زندگی ہے۔ اس کو یقین ہے کہ میری تمام قربانیوں کا ثمرہ آخرت میں ملنے والا ہے خواہ میں غالب ہوں یا مغلوب اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جو تکلیف اٹھاتا ہوں وہ فی الحقیقت مجھے دائمی خوشی اور ابدی مسرت سے ہمکنار کرنے والی ہے۔ مسلمان جب یہ سمجھ کر جنگ کرتا ہے تو

تائید ایزدی مددگار ہوتی ہے اور موت سے وحشت نہیں ہوتی۔ اسی لیے پوری دلیری اور بے جگری سے لڑتا ہے کافر چونکہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا اس لیے محض حقیر اور فانی اغراض کے لیے بہائم کی طرح لڑتا ہے۔ اور قوت قلبی اور امداد غیبی سے محروم رہتا ہے۔ بناء علیہ خبر اور بشارت کے رنگ میں حکم دیا گیا کہ مومنین کو اپنے سے دس گنے دشمنوں کے مقابلے میں ثابت قدمی سے لڑنا چاہیے۔ اگر مسلمان بیس ہوں تو دو سو کے مقابلہ سے نہ ہٹیں اور سو ہوں تو ہزار کو پیٹھ نہ دکھلائیں (تنبیھہ) بیس اور سو دو عدد شاید اس لیے بیان فرمائے کہ اس وقت مسلمان تعداد کے لحاظ سے "سریہ" میں کم از کم بیس اور جیش میں ایک سو سپاہی ہوتے ہوں گے۔ اگلی آیت مدت کے بعد اتری اس وقت مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اس لیے سریہ کم از کم ایک سو کا اور جیش ایک ہزار کا ہوگا۔ دونوں آیتوں میں یہاں نسبت کے وقت اعداد کا یہ تفاوت ظاہر کرتا ہے کہ اگلی آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں کی مردم شماری بڑھ گئی تھی [1]

اس آیت میں سب سے پہلے اور اہم بات تحریض علی القتال کی ہے حکم ہوا ہے کہ اے نبی مسلمانوں کو جنگ کا شوق دلا۔ ترغیب دے یعنی مسلمانوں کو ترغیب دے کہ اللہ کے کلمہ بلند کرنے اور کفر کے شر و فساد کو ختم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ حث اور تحقیق کی عام عربی کو چھوڑ کر تحریض کی تعبیر یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس میں تمہارا بچاؤ ہے اگر ایسا نہ کروگے تو تمہاری ہلاکت ہے۔ اور ایسا کہنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں داخل ہونا اپنے نفس کے جملہ حقوق سے دست بردار ہونا ہے۔ کیونکہ اسلام کے لفظی معنے ہیں کہ اپنے تئیں کسی کے حوالہ کر دینا اور اس کی پوری پوری طاعت بجا لانا ایک شخص جب مسلمان ہوتا ہے تو وہ اس بات کا وعدہ کرتا ہے اس کا ارادہ اس کی عقل اس کے جذبات و خواہشات قانونِ الہی اور احکامِ خداوندی کی اطاعت میں حائل نہ ہو سکیں گے اور خدا کے حکم کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی دینے پر آمادہ رہے گا۔ اس اطاعت و سپردگی کے معاوضہ میں اسے رضائے الہی اور تقربِ خداوندی کی بشارت دی جاتی ہے۔ اس پورے معاملہ کو قرآن نے انتہائی بلاغت کے ساتھ چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ

بس اسی بنا پر بیان فرمایا ہے کہ اے پیغمبر ان لوگوں کو جو اللہ سے ایمان کے نام پر معاہدہ کر چکے ہیں ان کو قتال کا شوق دلائیے اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کو ترغیب دینا ہی ایک مستقل فریضہ ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عین میدانِ جنگ میں یہی ترغیب دی ہے۔ غزوہ بدر میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا۔ قوموا الی جنۃ عرضھا السموات والارض آگے بڑھو ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان و زمین سے کہیں زیادہ ہے۔ اور متقیوں کے لیے بنائی گئی ہے۔ حضرت عمیر بن الحمام ایک صحابی ہیں وہ بھی سن رہے تھے کہنے لگے واہ واہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واہ واہ

[1] افادات شیخ الاسلام

کس بات پر عرض کیا کہ یارسول اللہ مجھے یہ تمنا ہے کہ میں بھی ان میں سے ہوتا۔ آپ نے فرمایا تم بھی ان میں سے ہو۔ اس کے بعد جھولی میں سے چند کھجوریں نکالیں اور کھانے لگے۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ ان کھجوروں کے ختم ہونے کا انتظار جو ہاتھ میں ہیں بڑی لمبی زندگی ہے۔ کہاں تک انتظار کروں گا۔ یہ کہہ کر ان کو پھینک دیا اور تلوار لے کر مجمع میں گھس گئے اور شہید ہونے تک لڑتے رہے۔[1]

دوسری بات اس آیت میں ایک اور دس کی نسبت کے بارے میں ارشاد ہوتی ہے یعنی تمہیں جم کر میدان میں مقابلہ کرنا چاہیے اگر تم بیس ہو گے تو دو سو پر غالب ہو گے۔ یعنی ایک مسلمان دس کافروں پر غالب ہو گا۔ یہ اگرچہ خبر ہے اور اس لحاظ سے بشارت ہے لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی ہے کہ اگر مسلمان بیس ہوں تو دو سو کا مقابلہ کریں مطلب یہ ہے کہ اگر کسی جگہ اسی نسبت سے ان سے مقابلہ کی نوبت آ جائے تو قلت تعداد کو بہانہ بنا کر پیٹھ دکھانا جائز نہیں ہے۔ پیٹھ دکھانے کا گناہ سنگین ہے۔

یاایھا الذین اٰمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفا فلا تولوھم الادبار۔

مسلمانو! جب کافروں کے لشکر سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو تم انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ۔

اس لیے قدرتی طور پر مسلمانوں نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا ہو گا۔ اور اسی احساس کے ساتھ اس کو ادا کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ایمان و کفر کے مقابلے میں اگر ایک اور دس کی بھی نسبت ہو تو ایمان کو غالب ہونا چاہیے اور کفر کو مغلوب ہونا چاہیے ——— ایمان کو غالب اور کفر کو کیوں مغلوب ہونا چاہیے یعنی اس ایک اور دس کی نسبت میں آگے آیت میں اس کی توضیح ہے۔ ارشاد ہے۔ بانھم قوم لا یفقھون۔ یعنی ایمان و کفر میں ایک اور دس کی نسبت اگر ہو تو ایمان کی کامیابی کا راز یہ ہے ——— کہ ایمان اپنے مقصد کا شعور رکھتا ہے اور ٹھنڈے دل سے خوب سوچ سمجھ کر اس سے لڑ رہا ہے کہ جس چیز کے لیے وہ جان کی بازی لگانے آیا ہے وہ اس کی انفرادی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کے ضائع ہو جانے کے بعد جینا بے قیمت ہے وہ کفر کے ساتھ لڑنے والے آدمی سے کئی گنی زیادہ طاقت رکھتا ہے اگر جسمانی طاقت میں کافر اور مومن کے درمیان کوئی فرق نہ ہو۔ پھر ایمان کو جب حقیقت کا شعور حاصل ہو جو اپنی ہستی اور اللہ سبحانہ کی ذات گرامی اور اللہ سبحانہ کے ساتھ اپنے تعلق اور حیات دنیا کی حقیقت اور موت کی حقیقت اور آخرت کو اچھی طرح جانتا ہو اور جسے حق و باطل کے فرق اور غلبہ باطل کے نتائج کا بھی صحیح ادراک ہو اس کی طاقت کو وہ لوگ بھی نہیں پہنچ سکتے جو قومیت یا وطنیت یا روٹی کپڑے مکان کا شعور لے کر میدان میں آئیں۔ قرآن نے ایک موقع پر ایمان کا چہرہ یہ پیش کیا ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد مسلم کتاب الامارہ

والذین اذا ذکروا بایات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا۔

جب ان کو ان کے رب کی باتیں سمجھائی جائیں تو ان پر وہ بہرے اندھے ہوکر نہیں گرتے ہیں۔

بلکہ نہایت فکر و تدبر اور دھیان سے سنتے ہیں اور سن کر متاثر ہوتے ہیں اس میں تذکیر کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ آپ کے مخاطب صرف جذباتی نہیں بلکہ انتہائی عقل مند اور مدبر ہیں اور اپنے رب کی باتوں کو خوب سوچ سمجھ کر اپناتے ہیں۔ یہاں نبوت کی تحریض کا یہ نتیجہ بتایا جا رہا ہے کہ اہل ایمان ارباب بصیرت ہیں۔ ان کو مقصد کا پورا پورا شعور حاصل ہے۔ اس شعور کے ساتھ جب مومن میدان جنگ میں نکلتا ہے تو وہ اپنے نہاد وجود کے اندر ایک لشکر کی قوت محسوس کرتا ہے اس کو اپنے دائیں بائیں اللہ سبحانہ کی نصرت نظر آتی ہے موت اس کو زندگی سے زیادہ محبوب ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس کی بصیرت اس کے سامنے اس منزل کو روشن کر کے دکھاتی ہے جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہی بصیرت اس کے اندر وہ ثبات پیدا کرتی ہے جو اس کو تنہا اس بصیرت سے لڑنے میں دس آدمیوں پر غالب کر دیتی ہے۔

اس سے آپ کو نبوت کی تذکیر اور تحریض دونوں کے اہل ایمان میں نتائج نمایاں محسوس ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی دعوت فکر و غور دانش و بینش، عقل و شعور کی دعوت ہے نہ کہ دیوانگی۔ اور بے عقلی کی۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ آگے آ رہی ہے۔

اس سے یہ نکتہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اہل ایمان کو کافروں سے زیادہ ہر علم و فن میں جانکار ہونا چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کا رتبہ اصلی تو یہی ہے کہ مقابلہ کے وقت مومن و کافر میں ایک اور دس کی نسبت ہو۔ اسی کو عزیمت کہتے ہیں عزیمت کے ساتھ رخصت بھی بتا دی۔

جنگ میں اہل ایمان کے لیے رخصت

(۸۲) مسلمانو! اب اللہ سبحانہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اسے علم ہے کہ تم میں کمزوری ہے۔ اب اگر تم ثابت قدم ایک سو ہو گے تو دو سو پر غالب ہو گے۔ اور تم ہزار ہو گے تو دو ہزار کو مغلوب کر دو گے بلاشبہ اللہ سبحانہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ گذشتہ آیت جس میں مسلمانوں کو دس گنا کافروں کے مقابلے پر ثابت قدم رہنے کا حکم تھا۔ جب لوگوں کو بھاری معلوم ہوئی تو اس کے بعد یہ آیت اتری الان خفف اللہ عنکم۔ یعنی خدا نے تمہاری ایک قسم کی کمزوری اور سستی کو دیکھ کر پہلا حکم اٹھا لیا۔ اب صرف اپنے سے دگنی تعداد کے

مقابلے میں ثابت قدم رہنا ضروری اور بھاگنا حرام ہے۔ یہ کمزوری اور سستی جس کی وجہ سے حکم میں تخفیف ہوئی کئی وجوہ سے ہو سکتی ہے۔ ابتدائے ہجرت میں گنے چنے مسلمان تھے جن کو قوت و جلادت معلوم تھی کچھ مدت کے بعد ان کے بہت سے افراد بوڑھے اور کمزور ہو گئے اور جو نئی پود آئی ان میں پرانے مہاجرین و انصار جیسی بصیرت استقامت اور تسلیم و تفویض نہ تھی۔ اور تعداد بڑھ جانے سے کسی درجہ میں اپنی کثرت پر نظر اور توکل علی اللہ میں قدرے کمی ہوئی ہو گی۔ اور ویسے بھی طبیعت انسانی کا خاصہ ہے کہ جو سخت کام تھوڑے آدمیوں پر پڑ جائے تو کرنے والوں میں جوش عمل ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کرتا ہے لیکن وہی کام جب بڑے مجمع پر ڈال دیا جائے تو ہر ایک دوسرے کا منتظر رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ آخر کچھ میں ہی تنہا اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اسی قدر جوش حرارت اور ہمت میں کمی ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے۔ ان پر حکم ہوا تھا کہ اپنے سے دس گنے کافروں پر جہاد کریں۔ پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے تب یہی حکم ہوا کہ دگنوں پر جہاد کریں۔ یہی حکم اب بھی باقی ہے اگر دو سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔ حضرت کے وقت میں ہزار مسلمان اسی ہزار سے لڑے ہیں۔ غزوہ موتہ میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ اس طرح کے واقعات سے اسلام کی تاریخ پُر ہے[1]

اس سے پہلی آیت میں اہل ایمان اور اہل کفر میں ایک اور دس کی نسبت بتائی گئی تھی۔ اب یہاں ایک اور دو کی نسبت بتائی جا رہی ہے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان طاقت کی نسبت ایک اور دس ہی کی ہے لیکن چونکہ مسلمانوں میں اب کچھ کمزوری ہے اس لیے اب اس عزیمت میں یہ رخصت دے دی گئی ہے کہ ایک مسلمان دو کافروں کا مقابلہ کرے۔ دونوں حکم ہیں ایک عزیمت ہے اور دوسرا رخصت ہے پڑھ آئے ہو کہ سورۂ انفال کچھ آیتوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد ساری یکبار نازل ہوئی ہے اور غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس آیت میں رخصت کی علت وعلم ان فیکم ضعفاً میں ضعف کو قرار دیا تھا۔ یہ ضعف کیا تھا۔ شارحین قرآن نے ایک سے زیادہ باتیں بتائی ہیں۔ کسی نے کہا کہ بدنی قوت ہے۔ کسی نے بتایا کہ بصیرت کی کمی ہے کوئی بولا کہ توکل اور اعتماد علی اللہ کی قلت ہے لیکن یہ سب مفروضات ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بدر پہلی جنگ تھی۔ اور اتفاقی حادثہ کے طور پر پیش آ گئی تھی۔ اہل ایمان کی پیش نظر مقصد کے مطابق تربیت کم ہوئی تھی۔ تربیت کی کمی کی اس سورت میں قرآن نے نشاندہی کی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے جنگ ختم ہوتے ہی کچھ لوگ مال غنیمت لوٹنے اور قیدیوں کو پکڑنے میں لگ گئے۔ قرآن نے تریدون عرض الدنیا کہہ کر اس طرف اشارا کیا۔ پھر مال غنیمت جمع ہوا تو اس کی تقسیم پر باہم جھگڑا ہو گیا قرآن نے الانفال للہ والرسول فاتقوا اللہ واصلحوا ذات بینکم کہہ کر اشارا کیا۔ اور اس پر مزید یہ کہ معلوم ہو جانے

[1] افادات شیخ الاسلام

کے باوجود کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ دو میں سے ایک ملے گا مشرکین کی فوج یا تجارتی قافلہ۔ عام نگاہیں تجارتی قافلے کی فکر میں تھیں قرآن نے اس طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم یہی وہ کمزوریاں ہیں جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا اور بتایا ہے کہ ان کمزوریوں کی وجہ سے اللہ سبحانہ نے رخصت دے دی ہے یعنی عزیمت تو یہ ہے کہ ایک اور دس کی نسبت ہو رخصت یہ ہے کہ ایک اور دو کی نسبت ہو تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد جب اہل ایمان کی نبوت نے بھرپور تربیت کر دی تو اہل ایمان نے صرف ایک اور دس کی نسبت ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ نسبتیں قائم کر کے فتوحات حاصل کی ہیں۔ جنگ موتہ میں حضور اقدس ﷺ نے جو لشکر روانہ کیا تھا اس کی تعداد صرف ... ۳ ہزار تھی لشکر اسلام مدینہ سے روانہ ہوا۔ ادھر خود ہرقل قیصر روم ایک لاکھ فوج کے ساتھ مآب میں موجود تھا اور ایک لاکھ جنگ جو لخم۔ جذام وغیرہ قبائل میں سے جمع ہو گئے۔ اور روایات میں پورے لشکر کی تعداد کم از کم ڈیڑھ لاکھ بتائی ہے۔ صحیح بخاری میں خود حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جنگ موتہ میں میرے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹی ہیں۔ یرموک کا واقعہ اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے صحابہ کرام کی تعداد چوبیس ہزار ہے اور رومیوں کی دو لاکھ ہے رومیوں کے مقتولین کی تعداد ستر ہزار ہے۔ سوچئے نبوت کی ۲۳ سالہ تربیت کے بعد کفر و ایمان کے درمیان ایک اور دس سے بڑھ کر تناسب کیا ہوا کیا ایک نے آٹھ ہزار سے مقابلہ نہیں کیا ہے۔

اس لیے آیت میں تخفیف کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے ایک اور دس کی نسبت تھی اور اب ایک اور دو کی نسبت ہے بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اصولی اور معیاری حیثیت سے تو اہل ایمان اور کفار میں ایک اور دس ہی کی نسبت ہے لیکن چونکہ ابھی تربیت مکمل نہیں ہوئی ہے اس لیے سردست صرف یہی مطالبہ ہے کہ اپنے سے دگنی طاقت سے ٹکرانے میں تمہیں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔ اسلام کی عمر آزاد ماحول میں صرف دو سال کی ہوئی تھی اور اہل ایمان کی اجتماعی تربیت بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ کہ بدر کا حادثہ پیش آگیا۔ اس کے بعد آپ کی تربیت کاملہ کے نتیجہ میں زمانہ نبوت ہی میں صحابہ کمال تربیت کا بہترین نمونہ بن گئے۔ اکثر دوگنی تگنی اور بعض وقت دس گنی طاقت سے مقابلہ ہوا اور قریب قریب ہمیشہ ہی فتح حاصل ہوئی۔ چند محلوں پر مشتمل ایک شہری مملکت سے جو آغاز ہوا وہ روزانہ ۲۷۴ میل مربع کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی ہے اور دس سال بعد جب حضور اقدس ﷺ رحلت فرمائے دار بقا ہوئے تو دس لاکھ میل سے زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیر اقتدار آ چکا تھا۔ یہ اسی اجتماعی تربیت کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ دنیا جانتی ہے۔

کیا یہ آیت ناسخ ہے

عام خیال یہی ہے کہ یہ آیت جس میں ایک . دو کی نسبت بتائی گئی ہے پہلی آیت کو منسوخ کر رہی ہے جس میں

اہل ایمان اور اہل کفر کے لیے ایک اور دس کی نسبت بتائی گئی تھی۔ اس کی تائید میں عام شارحین قرآن حضرت عبداللہ ابن عباس کا وہ اثر پیش کرتے ہیں جو امام بخاری نے صحیح میں نقل کیا ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ جب یہ آیت قرآنی ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین۔ نازل ہوئی۔ تو مسلمانوں کو یہ خیال کر کے کہ ایک مسلمان کو دس کافروں کے مقابلہ سے روگردانی ناجائز ہے بہت گرانی ہوئی تو یہ آیت تخفیف نازل ہوئی الآن خفف اللہ عنکم اللہ نے گنتی میں کمی کر دی اور اسی نسبت سے صبر میں بھی کمی کر دی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ ابن المبارک اور وہب بن جریر کی روایت میں نقص من الصبر کی جگہ نقص من النصر آیا ہے۔ پہلی روایت کا مطلب یہ ہے کہ جس جماؤ کا ایک اور دو کی نسبت میں مطالبہ ہے وہ ایک اور دس کی نسبت سے کمتر ہے یعنی مقابل کی جتنی عددی طاقت کم ہوئی اسی قدر مومن کے صبر میں کمی آگئی اور دوسری روایت کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر نصرت اللہ کی جانب سے ایک اور دس کے مقابلہ میں ہو گی اتنی ایک اور دو کے مقابلہ میں نہ ہو گی مطلب یہ ہے کہ اسباب و وسائل جس قدر زیادہ ہوتے جاتے ہیں اللہ سبحانہ کی براہ راست مدد اسی نسبت سے کم ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ کی نصرت کا استحقاق اپنے اندر صفت صبر پیدا کرنے سے ہوتا ہے۔ صفت صبر پیدا کیے بغیر نصرت نہیں آتی ہے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک اور دس کا مقابلہ عزیمت ہے ایک اور دو کا مقابلہ رخصت ہے۔ ہاں امام محمد بن اسحاق کی روایت میں حضرت عطاء کے حوالہ سے ابن عباس رضی کے یہ الفاظ آئے ہیں فنسخہا بالایۃ الاولی۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں اس کی سند میں اتصال نہیں ہے۔ اور یہ نسخ بھی اصطلاحی نہیں ہے۔ اصل بات وہی ہے جو پہلے بتائی جا چکی ہے کہ پہلی آیت میں عزیمت بتائی گئی ہے جب کہ دوسری آیت میں رخصت ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے مسافر کے لیے سفر میں روزہ رکھنا عزیمت ہے اور چھوڑ دینا رخصت ہے۔

علامہ قرطبی نے یہ بات خوب لکھی ہے۔

حدیث ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتاتی ہے کہ ایک اور دس کی نسبت ضروری تھی لیکن اس فرض کو ایک اور دو کی نسبت دے کر تخفیف کر دی اور اب یہ ضروری ہو گیا کہ ایک سو مسلمان دو سو کافروں کے مقابلہ سے روگردانی نہ کریں لہذا یہ تخفیف ہوئی نہ کہ نسخ

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اپنے سے زیادہ تعداد پر غالب آنے کی وجہ جو دونوں آیتوں میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں صفت صبر موجود ہے۔ پہلی آیت میں ان یکن منکم عشرون صابرون اور

آیت تخفیف میں فان یکن منکم مائۃ صابرۃ یغلبوا مائتین اور اصول کا قاعدہ ہے کہ صفت کا صیغہ کلام میں علت کا کام دیتا ہے جیسے السارق والسارقۃ فاقطعوا میں قطع ید کی علت چوری ہے ٹھیک اسی طرح یہاں غلبہ کی علت صبر ہے۔ صبر کے لغوی معنے روکنے اور سہارنے کے ہیں۔ اسی سے جماؤ اور ثابت قدمی کے معنے میں آیا ہے یعنی لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا۔ قرآن نے اس لفظ کو اس معنے میں بے شمار مواقع پر استعمال کیا ہے۔ ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے۔ یہی وہ صفت ہے جسے قرآن اپنے ماننے والوں میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اول دن سے لے کر دعوت و تبلیغ کی انتہائی منزلوں تک مومن کو اس کی ضرورت ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو اسے تنہائیوں میں گھر کی چار دیواری میں بازاروں میں میدان جنگ میں اور حکومت کے تخت پر ہر جگہ اللہ کے دین پر قائم رکھ سکتی ہے صبر کے اس مفہوم کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ مومنین کی تھوڑی تعداد اہل کفر کی زیادہ تعداد پر کس طرح غالب آسکتی ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٧﴾ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٦٨﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ڭ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾

ع ۵

نبی کے یہ بات شایان نہیں ہے کہ ملک میں غلبہ حاصل ہوئے بغیر قیدی بنالے مسلمانو! تمہاری نگاہیں دنیا کا سامان دیکھ رہی ہیں اور اللہ سبحانہ کے پیشِ نظر تمہارے لیے آخرت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے ۸۳ ۔ اگر پہلے سے نوشتہ خداوندنہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے تو اس کی پاداش میں تمہیں سنگین سزا ملتی لہٰذا اب جو کچھ تمہیں غنیمت میں ملا ہے حلال و طیب ہے اسے استعمال کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو ۔ بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۸۵ ۔

مفردات کے معانی

اسریٰ یہ اسر سے ہے اسیر کی جمع ہے جیسے جریح اور قتیل کی جمع جرحیٰ اور قتلیٰ آتی ہے۔ اسیر کی جمع اساریٰ بھی آتی ہے ۔ ابو جعفر نے یہاں اساریٰ بھی پڑھا ہے ۔ اسار اصل میں پیر کی بیڑی کو کہتے ہیں اور قیدیوں کو بیڑیوں سے باندھتے تھے اس لیے ہر جنگ میں گرفتار کو اسیر کہنے لگے خواہ پیر میں بیڑی نہ بھی ہو ۔ ابو عمرو بن العلاء نے اسریٰ اور اساریٰ میں ایک لطیف فرق بتایا ہے گرفتاری کے وقت جن قیدیوں کو باندھا نہ جائے وہ اسریٰ ہیں اور جن

کو گرفتاری کے وقت باندھ دیا جائے اساری ہیں۔

یثخن۔ یہ مضارع ہے۔ اثخان سے۔ اصل ثخن ہے ثخانتہ دبیز اور موٹائی کو کہتے ہیں ہر موٹی چیز اور سخت چیز کو ثخین کہتے ہیں۔ جرابوں میں مسح کے لیے فقہاء نے ثخانتہ کو شرط قرار دیا۔ علامہ موصلی المختار میں لکھتے ہیں۔ یجوز المسح علی الجوربین اذا کانا ثخینین۔ بطور استعارہ فعل میں زیادتی اور مبالغہ کو کہتے ہیں۔ شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ نقل و حرکت سے روک کر آدمی کو سخت بنا دیتا ہے۔ اسی سے اثخنہ المرض بولا جاتا ہے جب بیماری طاقتور کو بیمار کو لاچار کر دے۔ اسی لیے امام واحدی نے اثخان کے معنے قوت اور شدت کے بتائے ہیں۔ عرض سامان جو وقتی ہو اسی سے الدنیا عرض حاضر بولا جاتا ہے اسی سے متکلمین جوہر کے مدمقابل کو بطور استعارہ عرض کہتے ہیں نقد کے مقابلے پر جو سامان ہوتا ہے اسے بھی عرض کہتے ہیں۔ امام راغب فرماتے ہیں عرض وہ ہے جسے ثبات نہ ہو۔ علامہ السید مرتضی زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں عرض کے معنے دنیا کے مٹ جانے والے سامان کے ہیں اور عرض بسکون راء سونے چاندی کے علاوہ ساز و سامان کو کہتے ہیں اس کی جمع عروض آتی ہے۔ دنیوی اثاثہ کو عرض کیوں کہتے ہیں اس کی وجہ علامہ شوکانی نے یہ بتائی ہے کہ وہ عارضی فانی اور ناپائدار ہوتا ہے اور عرض بکسر العین کے معنے آبرو کے ہیں۔ سعد بن ناشب کہتا ہے۔

واذھل من داری واجعل ھدمھا

لعرضی من باقی المذمۃ حاجبا

ابراہیم بن کنیف النبہانی کہتا ہے۔

وقینا بحسن الصبر منا نفوسنا

فصحت لنا الاعراض والناس ھزل

آبرو کو عرض ہی اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کو ثبات نہیں ہوتا ہے۔ بہر حال عرض کے معنے عارضی، وقتی، ہنگامی اور بے ثباتی کے ہیں۔

جہاد کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے

جو عمل سب سے اونچا ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اجر بھی سب سے اونچا نہ ہو قرآن کی آیات اور ارشادات نبوت میں اس کے کھلے اشارات ہیں بلکہ وضاحتیں موجود ہیں۔ مزید اطمینان کے لیے جناب رسول اللہ ﷺ کے یہ ارشادات بھی سنیے۔

دو آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی۔ ایک وہ جو اللہ کے خوف سے رو پڑی۔ دوسری وہ جس نے اللہ کی راہ میں پہرہ دیتے ہوئے رات گذاری ہو۔ (ترمذی)

جہاد فی سبیل اللہ کی گرد اور جہنم کا دھواں یہ دونوں چیزیں کسی بھی شخص کے لیے جمع نہیں ہو سکتی ہیں۔ (ترمذی)

غزوہ بدر میں جن لوگوں نے شرکت کی۔ ان کے بارے میں آپ نے ایک موقعہ پر فرمایا۔

تمہیں کیا معلوم شاید کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی طرف دیکھ کر فرما دیا ہو، جو چاہے کرو میں نے تمہیں بخش دیا ہے۔

مطلب اس کا یہ نہیں ہے کہ یہ مستقبل میں گناہ کرنے کا پروانہ ہے بلکہ منشا یہ ہے جیسا کہ علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ اللہ سبحانہ بدر میں شرکت کرنے والوں کو مستقبل میں طاعت کی توفیق عطا فرمائے گا اگر ان سے کوئی غلطی ہو جائے گی تو اس کو معاف کر دے گا اور ایمان کی اس نعمت سے مالا مال رکھے گا جن سے ان کے سینے بھرے ہوئے ہیں۔

جہاد کو اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں جو اتنا اونچا مقام حاصل ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بندگی ایک مومن کا مقصدِ حیات ہے اور امتِ مسلمہ کا منشا تخلیق یہ اور صرف یہ ہے کہ اس مقصدِ حیات سے دنیا کو روشناس کرائے اور اس کی شہادت دے۔ اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے جو اپنی جان دے کر پیش کی جائے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسلمان کے وجود کا جو مقصد ہے یہ مسلح جہاد اس کے حصول کی سب سے اونچی اور معیاری کوشش ہے۔ اس مقصد کی اونچائی۔ اس کی بلندی، اس کی رفعت ایک بے غبار حقیقت ہے اصول کی بات ہے کہ جو چیز بہت ارفع اور شاندار ہوتی ہے وہ اسی قدر نازک بھی ہوتی ہے۔ مقصد کے حصول کے لیے جہاد ایک ناگزیر ضرورت ہے لیکن بے حد نازک ہے ضرورت کا علم تو جلدی ہو جاتا ہے لیکن نزاکت کے لیے بہت بڑی طویل تربیت کی ضرورت ہے۔ بدر اسی مقصد کے حصول کی ایک معیاری کوشش تھی۔ لیکن یہ کوشش بغیر ارادے کے ہنگامی طور پر سامنے آگئی تھی۔ اور خواص کو چھوڑ کر کچھ کو اس کی نزاکت کا علم نہ تھا۔ نزاکت یہ کہ جہاد کا مقصد دولت کی فراہمی نہیں ہے بلکہ اللہ کے کلمہ کا بول بالا کرنا اور کفر کا زور توڑنا ہے۔ ضرورت تو سب کے علم میں تھی لیکن نزاکت کا احساس سب کو نہ تھا۔ اس کی وجہ سے بدر میں وہ کمزوریاں سامنے آئیں جن کی قرآن نے نشاندہی کی ہے مثلاً یہ

تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم

تم چاہتے تھے کہ تجارتی قافلہ ملے لشکر سے جنگ نہ کرنی پڑے۔

یہ بات اس لیے رونما ہوئی کہ نبوت نے کفر کی شوکت کا خاتمہ کرنے کے لیے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ بزور قریشی

قافلوں کی آمدورفت کو اپنے زیر اثر علاقہ میں روک لیا جائے۔ یہی بدر کی لڑائی کا باعث ہے لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ دولت کی فراہمی مقصود ہے حالانکہ یہ مقصود نہیں مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے۔ وسائل اور مقاصد کی تمیز طویل صحبت اور بڑی تربیت سے پیدا ہوتی ہے اس کے نتیجے میں ساری کمزوریاں رُونما ہوگئیں۔

اول۔ جنگ کی دعوت کے موقعہ پر تجارتی قافلہ کی بات کرنے لگے۔

دوم۔ لڑائی ختم ہونے پر فوج کا تعاقب کرنے کی جگہ مالِ غنیمت سمیٹنے اور قیدیوں کو گرفتار کرنے میں لگ گئے یعنی جب بدر میں کفار کے پاؤں اکھڑے اور وہ وہاں سے بھاگ نکلے تو بجائے اس کے کہ مسلمان اسی جوش و خروش سے ان کا تعاقب کرتے اور کفر کے ان سرغنوں کو موت کے گھاٹ اُتارتے تاکہ کفر کی کمر ٹوٹ جاتی اور اس کے سرغنہ لیڈروں کی قوت و نخوت کافور ہو جاتی مگر وہ مالِ غنیمت اکٹھا کرنے اور قیدیوں کو گرفتار کرنے میں لگ گئے۔ اجلہ صحابہ حضرت سعد بن معاذ، حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کو یہ انداز ناگوار ہوا۔

سوم یہ کہ جنگ ختم ہونے کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم پر جھگڑ پڑے جیسا کہ سورہ کے آغاز میں آپ پڑھ آئے ہیں۔

یہ سب باتیں اس لیے رونما ہوئیں کہ ان لوگوں کو پہلی مرتبہ پرچمِ اسلام کے نیچے لڑنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ اسلام میں جنگ اور اس سے پیدا شدہ مسائل کے متعلق ضابطہ کیا ہے۔ کچھ ابتدائی ہدایات سورہ بقرہ اور سورہ محمد میں دی جا چکی تھیں۔ لیکن اسلامی جنگ کی بنیاد رکھنی ابھی باقی تھی۔ بہت سے تمدنی مسائل کی طرح مسلمان ابھی تک جنگ کے معاملہ میں بھی اکثر پُرانی رسوم اور رواجوں کے تصورات لیے ہوئے تھے۔

اس آیت میں بھی جنگ کے موضوع پر ایک غیر اسلامی طرزِ عمل کی اصلاح کی گئی ہے۔

جہاد کا اوّلین مقصد کفر کا خاتمہ ہے

(۸۳) نبی کے یہ بات شایانِ شان نہیں ہے کہ ملک میں غلبہ حاصل ہوئے بغیر قیدی بنالے۔ مسلمانو تمہاری نگاہیں دنیا کا سامان دیکھ رہی ہیں اور اللہ سبحانہ کے پیشِ نظر تمہارے لیے آخرت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

بدر کی لڑائی سے ستر کافر مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہو کر آئے حق تعالیٰ ان کے متعلق دو صورتیں مسلمانوں کے سامنے پیش کیں قتل کر دینا یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا۔ اس شرط پر کہ آئندہ سال اسی تعداد میں تمہارے آدمی قتل کیے جائیں گے۔ حقیقت میں اللہ سبحانہ کی جانب سے ان دو صورتوں کا انتخاب کے لیے پیش کرنا۔ امتحان ر

و آزمائش کے طریقہ پر تھا کہ ظاہر ہوجائے کہ مسلمان اپنی رائے اور طبیعت سے کس طرف جھکتے ہیں جیسے ازواج مطہرات کو دونوں صورتوں میں تخییر دی گئی تھی۔

ان کنتن تردن الحیاۃ الدنیا و زینتھا فتعالین امتعکن و اسرحکن سراحًا جمیلا۔ (الاحزاب ع)

یا معراج میں آپ کے سامنے خمر و لبن دودھ شراب کے دو برتن پیش کیے گئے تھے آپ نے دودھ کو اختیار فرمایا تھا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ اگر بالفرض آپ شراب کو اختیار فرمالیتے تو آپ کی امت بہک جاتی۔ بہرحال آپ نے صحابہؓ سے اس معاملہ میں رائے طلب کی۔ ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب قیدی اپنے خویش و اقارب ہیں۔ بہتر ہے کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔ اس نرم سلوک اور احسان کے بعد ممکن ہے کچھ لوگ مسلمان ہوکر وہ خود ان کی اولاد و اتباع ہمارے دست و بازو بن جائیں اور جو مال بالفعل ہاتھ آئے اس سے جہاد وغیرہ دینی کاموں میں سہارا ملے باقی آئندہ سال ہمارے ستر آدمی شہید ہوجائیں تو مضائقہ نہیں ہے درجہ شہادت ملے گا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان بھی فطری رحمدلی اور شفقت و صلہ رحمی کی بناپر اسی رائے کی طرف تھا بلکہ صحابہؓ کی عام رائے اسی طرف تھی۔ بہت سے ان ہی وجوہ کی بناپر جو ابوبکرؓ نے بیان کیں۔ اور بعض محض مالی فائدے کو دیکھتے ہوئے اس رائے پر متفق تھے کما یظھر من قولہ تعالیٰ تریدون عرض الدنیا صرح بہ الحافظ ابن حجر وابن القیم۔ حضرت عمر اور سعد بن معاذ نے اس سے اختلاف کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قیدی کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں۔ ان کو ختم کردیا جائے تو کفر و شرک کا سر ٹوٹ جائے گا۔ تمام مشرکین پر ہیبت پڑجائے گی آئندہ مسلمانوں کو ستانے اور خدا کے راستہ سے ہٹانے اور روکنے کا حوصلہ نہ رہے گا۔ خدا کے آگے مشرکین سے ہماری انتہائی نفرت و بغض اور کامل بیزاری کا اظہار ہوجائے گا کہ ہم نے خدا کے معاملہ میں اپنی قرابتوں اور مالی فوائد کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ اس لیے مناسب ہے کہ ان قیدیوں میں سے جو کوئی ہم میں سے کسی کا عزیز و قریب ہو وہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ الغرض بحث و تمحیص کے بعد ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورہ پر عمل ہوا۔ کیونکہ کثرت رائے اُدھر تھی۔ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طبعی رافت و رحمت کی بناپر اسی طرف مائل تھے اور ویسے بھی اخلاقی اور کلی حیثیت سے عام حالات میں وہی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسلام اس وقت جن حالات سے گذر رہا تھا ان پر نظر کرتے ہوئے وقتی مصالح کا تقاضا یہ تھا کہ کفار کے مقابلہ میں سخت کمرشکن کارروائی کی جائے۔ تیرہ سال کے ستم کشوں کو طاغوت کے پرستاروں پر یہ ثابت کردینے کا پہلا موقعہ ملا تھا کہ تمہارے تعلقات قرابت، اموال، جتھے اور طاقتیں اب کوئی چیز تم کو خدا کی شمشیر انتقام سے پناہ نہیں دے سکتی۔ ابتداءً ایک مرتبہ ظالم مشرکین پر رعب و ہیبت بٹھلا دینے کے بعد نرم خوئی اور صلہ رحمی کے استعمال کے لیے آئندہ بہت سے مواقع باقی رہتے

تھے اور ستر مسلمانوں کے قتل پر آمادہ ہو جانا معمولی بات نہ تھی اسی لیے اس رائے کو اختیار فرمانا وقتی مصالح اور ہنگامی حیثیت سے حق تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ نہ ہوا۔ ماکان لنبی ان یکون لہ اسریٰ حتی یثخن فی الارض میں اسی ناپسندیدگی کی طرف اشارا ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یہ ایک سخت خطرناک غلطی اجتہادی قرار دی گئی۔ اور جن بعض لوگوں نے زیادہ مالی فوائد پر نظر کر کے اس سے اتفاق کیا تھا۔ ان کو صاف طور پر تریدون عرض الدنیا سے خطاب کیا گیا یعنی دنیا کے فانی اسباب پر نظر کر رہے ہو۔ حالانکہ مومن کی نظر انجام پر ہونی چاہیئے خدا کی حکمت مقتضی ہو تو وہ تمہارا کام اپنے زور قدرت سے ظاہری سامان کے بغیر ہی کر سکتا ہے بہرحال فدیہ لے کر چھوڑ دینا اس وقت کے حالات کے اعتبار سے بڑی بھاری غلطی قرار دی گئی۔ اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ روایات سے حضور کی نسبت صرف اس قدر ثابت ہے کہ محض صلہ رحمی اور رحمدلی کی بنا پر آپ کا رجحان اس رائے کی طرف تھا البتہ صحابہ میں بعض صرف مالی فوائد کو پیش نظر رکھ کر اور اکثر حضرات دوسری مصالح دینیہ اور اخلاقی داعیہ کے ساتھ مالی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھ کر یہ رائے پیش کر رہے تھے۔ گویا صحابہؓ کے مشورے میں کلاً یا جزواً مالی حیثیت ضرور پیش نظر تھی کسی درجے میں مالی فوائد کے خیال سے بغض فی اللہ میں کوتاہی کرنا اور اصل مقصد جہاد سے غفلت برتنا اور ستر مسلمانوں کے قتل پر اپنے اختیار سے رضامند ہو جانا صحابہ جیسے مقربین کے مقام رفیع اور منصب جلیل کے منافی سمجھا گیا۔ اسی لیے ان آیات میں سخت عتاب آمیز لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ لڑائی میں ایک شخص کو سر پر زخم آیا اسے غسل کی حاجت ہوئی۔ پانی سر پر استعمال کرنا سخت مہلک تھا۔ ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا انہوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لیے گنجائش نہیں پاتے اس نے غسل کر لیا اور فوت ہو گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی فرمایا قتلوہ قتلھم اللہ (الحدیث) اس سے ظاہر ہوا کہ اجتہادی غلطی اگر زیادہ واضح اور خطرناک ہو تو اس پر عتاب ہو سکتا ہے گویا یہ سمجھا جاتا ہے کہ مجتہد نے پوری کوشش صرف کرنے میں کوتاہی کی۔[1]

حضرت شیخ الاسلام نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں بنیادی اور اہم بات جس پر مطالب کی پوری عمارت اٹھائی گئی ہے یہ ہے کہ بدر میں جو لوگ گرفتار ہو کر آئے تھے ان کے بارے میں اللہ سبحانہ نے حضور اقدس کی وساطت سے مسلمانوں کو بتایا تھا کہ:

۱۔ ان کو قتل کر دو۔

۲۔ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دو۔

اس شرط پر کہ آیندہ سال مسلمانوں میں ستر کو شہید کرانے کے لیے تیار ہو جاؤ یعنی اگر فدیہ لے کر چھوڑا تو آئندہ سال

[1] افادات شیخ الاسلام

ستر مسلمانوں کی قربانی دینی ہوگی اس طرح مسلمانوں کو ان دو باتوں سے ایک کو اپنانے کا اللہ سبحانہ نے اختیار دیا تھا۔ مسلمانوں نے فدیہ لینے کی صورت کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا عتاب آیا۔

مولانا نے یہ بات جس بنیاد پر ارشاد فرمائی ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے۔ جو بقول حافظ ابن کثیر، ترمذی، نسائی اور ابن حبان نے روایت کی ہے۔ حدیث یہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور بولے کہ اپنے صحابہ کو اختیار دے دیجئے چاہیں تو قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔ اور چاہیں تو قتل کر دیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ آیندہ سال مسلمانوں میں ستر قتل ہوں گے۔ صحابہ کرام نے آیندہ سال اپنے میں سے ستر کا شہید ہونا اور فدیہ قبول کر لیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے حافظ ابن کثیر رح نے اس روایت کو یہ کہہ کر ھذا حدیث غریب جداً اپنے کو صحت کی ذمہ داری سے سبکدوش کر لیا۔ غرابت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس حدیث کے بیان کرنے میں راوی عام واقعہ نگاروں سے الگ اور ممتاز ہے۔ شائد امام احمد سے ایسی ہی احادیث کے بارے میں منقول ہے ان غرائب نہ لکھا کرو یہ مناکیر ہیں۔ ان کے راوی ضعیف ہوتے ہیں۔ بہرحال حدیث روایتی نقطۂ نظر سے کچھ ہو مگر اس کی روشنی میں قرآن کی اس آیت کا جو مطلب سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کو قیدیوں کے قتل اور فدیہ لینے میں اللہ کی جانب سے اختیار دیا گیا تھا۔ انھوں نے بجائے قتل کے فدیہ لینا پسند کیا اس پر عتاب الٰہی آیا۔

یہاں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہی تخییر کا مسئلہ قرآن کے مطابق جنگِ بدر سے پہلے اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا۔

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انھا لکم

مسلمانو! اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ دشمن کی دو جماعتوں میں سے کوئی ایک ضرور تمہارے ہاتھ آئے گی۔

خدا کا چاہنا یہ تھا کہ قریش کے لشکر سے مسلمانوں کا مقابلہ ہو لیکن مسلمانوں کی چاہت کیا تھی۔ قرآن ہی نے بتایا ہے۔

وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم

تم چاہتے تھے کہ جس جماعت میں لڑائی کی طاقت نہ تھی وہ ملے

قرآن آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ قرآن نے اس پر ایک لفظ بھی عتاب کا نہیں فرمایا۔ کیونکہ تکوین کے مرحلے

پر تربیت سے پہلے اس قسم کے حالات سے جماعت کو گذرنا ہی پڑتا ہے۔ غزوہ بدر مسلمانوں کی تاریخ میں پہلا ہنگامی حادثہ ہے۔ ہنگامی حالات میں اونچ نیچ یمین ویسار کی کیفیتیں ناگزیر ہیں۔ اور پھر اگر تشریح کے لیے اس حدیث کو بنیاد بنایا جائے تو تریدون عرض الحیاۃ الدنیا کی زد میں جمہور صحابہ آجاتے ہیں۔ عمر اور سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو چھوڑ کر سب کا نقطہ نظر یہی تھا کہ فدیہ لیا جائے۔ اوروں کا پتہ نہیں میں تو اس کے تصور سے بھی کانپ جاتا ہوں۔ اور پھر اس روایت کا عام شارحین قرآن نے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔

آیئے اب وہ روایات بھی گوش گذار فرما لیجیے جو اس آیت گرامی کے پس منظر میں عام شارحین نے لکھی ہیں۔

پہلی روایت امام مسلم نے کتاب الجہاد والسیر میں پیش کی ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جب مسلمانوں نے بدر کے دن قیدی بنائے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے فرمایا بتاؤ ان قیدیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ لوگ آپ کے چچازاد بھائی اور خاندان ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ ان سے فدیہ لے لیجئے اور چھوڑ دیجئے فدیہ کی رقم کفار کے مقابلہ میں کام آئے گی اور ممکن ہے کہ اللہ ان کو مسلمان ہونے کی توفیق دے دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف روئے سخن کر کے دریافت کیا عمر تمہاری کیا رائے ہے حضرت بولے بخدا میری رائے وہ نہیں ہے جو ابوبکر نے پیش کی میرا خیال ہے کہ اب ان کو ہمارے سپرد کیجئے تاکہ ہم ان کو قتل کر دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے ان کے بھائی عقیل کیجئے وہ اسے قتل کرے۔ مجھے میرا رشتہ دار دیجئے میں اسے ماروں۔ یہ لوگ تو رہنمایان کفر اور اس کے لیڈر ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان ابوبکر کی طرف تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دوسرے روز میں آیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دونوں بیٹھے رو رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں۔ اگر رونا آئے تو میں بھی روؤں۔ ورنہ آپ کے ساتھ رونے والوں کی صورت بنا لوں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ قیدیوں کے فدیہ کے بارے میں جو تیرے ساتھیوں نے فدیہ کا مشورہ دیا تھا اس پر اللہ کی طرف سے جو عذاب کی نمائش ہوئی اس پر رو رہا ہوں۔

اور امام ترمذی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے حوالے سے اسی واقعہ کی تصویر اس طرح پیش کی ہے کہ، جب بدر کے روز قیدی لائے گئے تو ابوبکرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ کی قوم ہے

آپ کا خاندان ہے ان پر رحم کیجئے شاید اللہ ان کو ایمان کی توفیق دے دے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ یہ لوگ تو آپ کے مکذبین ہیں آپ کو گھر سے نکالنے والے اور آپ کے قاتلین ہیں۔ ان کو قتل کر دیجئے۔ عبداللہ بن رواحہ بولے کوئی لکڑیوں والی وادی دیکھئے اور ان کو آگ میں ڈال دیجئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی قیدی تھے سب کی باتیں سن رہے تھے بولے کیا آپ قطع رحمی کریں گے۔ حضور ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا آپ اندر تشریف لے گئے لوگوں کے قیاس مختلف تھے کچھ کہہ رہے تھے کہ حضور ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے اپنائیں گے کچھ کا خیال تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ کی بات پر عمل کریں گے حضور اقدس ﷺ باہر تشریف لائے اور بولے اللہ سبحانہ نے کچھ دل نرم بنائے ہیں۔ دودھ سے بھی زیادہ نرم وگداز اور کچھ دل سخت بنائے ہیں پتھر سے بھی زیادہ سخت۔ اے ابوبکر تیری حالت بالکل حضرت ابراہیم ع جیسی ہے فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی فانك غفور رحیم اور حضرت عیسیٰ کی طرح ہے۔ ان تعذبھم فانھم عبادك اے عمر تیری حیثیت حضرت نوح علیہ السلام جیسی ہے رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیاراً۔ اور تیرا معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے۔ ربنا اطمس علی اموالھم تم نادار اور تنگدست ہو کوئی قیدی فدیہ اور گردن زنی کے بغیر نہ جائے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے کہا کہ یارسول اللہ سہیل بن بیضاء کو مستثنیٰ کر دیجئے وہ تو اسلام کا ذکر کرتا رہتا ہے فرمایا اچھا وہ نہیں۔

ایک اور بھی روایت مسند امام احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے آئی ہے۔ روایات اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ان واقعات کے ہونے میں کوئی شبہ نہیں مگر سوال یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت گرامی کا یہ پس منظر ہیں اور یا آیت قرآنی کے لیے یہ واقعات سبب نزول ہیں۔ اس آیت میں قیدیوں کے قتل کی بات ہی نہیں ہے۔ آیت میں تو صرف یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب تک میدان جنگ میں خونریزی نہ ہو جائے قیدی بنانا مناسب نہیں ہے۔ ما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض کسی نبی کے یہ شایان نہیں ہے کہ خوب خونریزی سے پہلے لوگوں کو قیدی بنائے مطلب یہ ہے کہ غلبہ سے پہلے قیدی بنانا ٹھیک نہیں ہے حتی یثخن فی الارض کے معنے یہ نہیں کہ جب تک زمین خون آلود نہ ہو جائے بلکہ معنے یہ ہیں کہ جب تک فاتح کی حیثیت سے دبدبہ قائم نہ ہو جائے۔ امام بخاری نے اس کے معنے حتی یغلب فی الارض اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے حتی یظھر

علی الارض کہے ہیں دونوں کی مراد ایک ہے۔ بدر میں غلطی یہ ہوئی تھی کہ شکست کے بعد بجائے دشمن کا تعاقب کرنے کے مال غنیمت سمیٹنے اور قیدی پکڑنے میں لگ گئے اگر اس وقت ہی تعاقب کر کے دشمن کا خاتمہ کر دیتے تو مستقبل میں جس قدر حوادث فتح مکہ تک پیش آئے ایک بھی رونما نہ ہوتا۔ چند روز بعد ہی فتح مکہ کا آفتاب طلوع ہو جاتا۔ تریدون عرض الدنیا کی تعریض بھی اسی لیے ہے۔ اسی لیے حضور اقدس ﷺ کا ذکر علیحدہ کیا ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ ذات نبوت اس میں داخل نہیں ہے۔

انداز سخن ایسا گرم اختیار کرنے کی اس کے سوا کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس پر قرآن میں پہلے تاکید کے ساتھ ہدایت آ چکی تھی۔ سورۂ محمد میں ہے۔

اذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا۔

اس آیت میں اثخان کو ضرب الرقاب کے لیے غایت مقرر کیا تھا۔ اور بدر میں ضرب الرقاب کو اثخان تک نہیں پہنچایا یعنی حق کا بول بالا اور دشمن کا منہ کالا نہیں ہوا تھا کہ غنیمت سمیٹنے اور قیدی بنانے میں لگ گئے اس لیے اللہ کی جانب سے عتاب ہوا۔ قیدی بنانے کے بعد قیدیوں سے فدیہ لینا وجہ عتاب نہیں ہے۔ اور روایات میں جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سعد بن معاذ کی تصریح آئی ہے کہ اگر عذاب آتا تو ان دو کے سوا کوئی نہ بچتا اس کی وجہ بھی یہی ہے علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔

یہ آیت بدر کے روز نازل ہوئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر اللہ سبحانہ کی ناراضگی کی نشانی بن کر آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے اس قسم کا کردار مناسب نہ تھا جس کے نتیجے میں نبوت کے لیے غلبہ اور دبدبہ سے پہلے قیدی ہو گئے اور صحابہ بھی تریدون عرض الدنیا میں مخاطب ہیں ورنہ لڑائی کے وقت میں کسی کو چھوڑنے کا حکم نہیں دیا تھا اور آپ کے حاشیہ خیال میں سامان دینا نہ تھا۔ جو کچھ کیا جنگ میں کام کرنے والوں نے کیا —— حضور اقدس ﷺ کا ذکر صرف اس لیے آیا ہے کہ آپ نے میدان جنگ میں عریش سے ایسا کرتے دیکھا تو روکا کیوں نہیں۔ سعد بن معاذ، عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بات ناگوار ہو رہی تھی کہ تعاقب چھوڑ کر کیوں غنیمت کے پیچھے پڑے ہیں حالات کے یکبارگی انقلاب اور مدد الٰہی کے نزول میں حضور اقدس ﷺ اس قدر مصروف تھے کہ لوگوں کو روک نہ سکے اسی وجہ سے آیات کے نزول کے

رت حضور اقدس ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو ئے۔

بہرحال آیت بدر میں جنگ کے بارے میں فروگذاشت پر تنبیہہ کر رہی ہے قیدیوں کے قتل سے آیت قرآنی لفظاً خاموش ہے۔

یہاں دو حقیقتیں ہیں اور دونوں اپنی جگہ صحیح ہیں۔

ایک یہ کہ بدر میں مسلمان فوجی غلبے سے پہلے مال غنیمت اور قیدیوں کی گرفتاری میں لگ گئے۔ جو حکم قرآنی حتی اذا اثخنتموھم کے خلاف اقدام تھا۔

دوسرے یہ کہ بدر میں جو لوگ قید ہو کر آئے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے اس بارے میں قرآن کی واضح ہدایت پہلے سے موجود تھی فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء اس پر عتاب کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لیے آیت کی واقعات کی روشنی میں تشریح یہی ہے کہ بدر کی لڑائی سے پہلے سورہ محمد جسے سورہ قتال بھی کہتے ہیں نازل ہو چکی تھی۔ اسی لیے امام ابوحنیفہ سورہ محمد کی اس آیت فاما منا بعد کو سورہ انفال کی آیت فاما تثقفنھم فی الحرب سے منسوخ بتاتے ہیں قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں۔ ھذہ الایۃ منسوخۃ بقولہ تعالیٰ فاما تثقفنھم فی الحرب —— سورہ محمد ﷺ میں جنگِ بدر سے پہلے جنگ کے بارے میں جو ابتدائی ہدایات تھیں ان میں بتا دیا گیا تھا کہ

فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا ذالك ولو یشاء اللہ لانتصر منھم ولکن لیبلو بعضکم ببعض۔

جب تمہاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک جب تم ان کا خون بہا دو اور تمہارا غلبہ ہو جائے تو ان کو قید کر لو۔ قید کرنے کے بعد تم چاہو تو احسان کرو اور مفت چھوڑ دو اور چاہو تو فدیہ لے کر چھوڑ دو۔

اس آیت میں جنگی قیدیوں سے فدیہ وصول کرنے کی اجازت ہے لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگا دی گئی ہے کہ پہلے دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل دیا جائے۔ شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں جب تک کافروں کا زور نہ ٹوٹے قتل ہی چاہیے اور جب زور ٹوٹ جائے تب قید ہی کافی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے کفر کا زور توڑا جائے پھر قیدی بنانے کی فکر کی جائے اس حکم کی وجہ سے مسلمانوں نے بدر میں جو قیدی گرفتار کیے اور اس کے بعد ان سے جو فدیہ لیا وہ تھا تو قرآن کے حکم کے مطابق مگر غلطی یہ ہوئی کہ دشمن کی طاقت کو کچل دینے کی جو شرط لگائی تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ جنگ میں جب

دشمن میدان چھوڑ گیا تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ غنیمت کی فکر میں ہو گیا اور کچھ مسلمان قریشیوں کو گرفتار کرنے میں لگ گئے اور بہت کم مسلمانوں نے دشمنوں کا کچھ دور تک پیچھا کیا اگر مسلمان بدر میں بھر پور تعاقب کرتے تو قریش کی طاقت کا اسی روز خاتمہ ہو جاتا۔ لیکن بجائے تعاقب کرنے کے کچھ لوگ قیدی پکڑنے اور کچھ مال اکٹھا کرنے میں مشغول ہو گئے یہ عمل چونکہ اثخان سے پہلے رونما ہوا۔ اسی پر یہ عتاب نازل ہوا۔ یہاں قرآن کا یہ انداز بلیغ بڑا ہی لطیف ہے کہ عتاب کا رُخ حضور اقدس ﷺ کی طرف نہیں ہے بلکہ مسلمان فوجیوں کی طرف ہے تریدون عرض الدنیا۔ حضور ﷺ کا ذکر اس انداز میں ہوا ہے کہ محسوس ہو رہا ہے کہ جو کچھ ہوا اس میں آپ کا کوئی دخل نہیں۔ ما کان لنبی ان یکون له نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ اثخان فی الارض یعنی غلبے سے پہلے پہلے اس کے لیے قیدی ہوں۔ یعنی قید کرنے والے اور ہیں نبی تو صرف جنگ کی کمان کر رہا تھا۔ آیت قرآنی یہ بتا رہی ہے کہ جن لوگوں نے لیا کیا انھوں نے اپنے رسم و رواج کے مطابق کیا نبوت کے مشن کو سمجھ کر نہیں کیا۔ نبوت کا مشن یہ نہیں کہ اموال جمع کرے اور خزانے بھرے نبی کا کام تو یہ ہے کہ کفر کی طاقت ختم ہو اور اللہ کے کلمہ کا بول بالا ہو۔ شائد عمر بن عبدالعزیز نے اپنے گورنروں کو جب لکھا کہ لوگوں کو دعوت اسلام دو۔ اور انھوں نے جواباً کہا کہ اس سے خزانہ شاہی متاثر ہو گا۔ کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد جزیہ کی آمدنی نہ رہے گی۔ تو جواب میں یہ بات جو لکھی تھی۔ ما کان محمد رسول اللہ جابئیاو لکن کان داعیًا حضور اقدس ﷺ خزانہ بھرنے نہیں بلکہ اسلام کی دعوت دینے آئے تھے۔ اسی آیت سے استنباط کر کے لکھی تھی۔

قرآن یہاں سمجھا رہا ہے کہ یہ تم سے غلطی ہوئی ہے اور اسی غلطی پر یہ عتاب ہوا ہے۔
اس موضوع پر جو روایات آئی ہیں ان میں کچھ اختلاط ہوا ہے۔ واقعات کی حد تک سب باتیں درست ہیں لیکن ہر بات آیت کا سبب نزول نہیں ہے۔ کچھ روایات آپ سن چکے ہیں اور کچھ آ رہی ہیں

اِجازت خداوندی نہ ہوتی تو......

(۸۴) اگر پہلے سے نوشتہ خداوندی نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس کی پاداش میں تمہیں سنگین سزا ملتی۔ یہ غلطی تو فی حد ذاتہ ایسی تھی کہ سخت سزا ان لوگوں کو دی جاتی۔ جنھوں نے دنیوی سامان کا خیال کر کے ایسا مشورہ دیا مگر سزا دینے سے وہ چیز مانع ہے جو خدا پہلے سے لکھ چکا ہے اور طے کر چکا ہے اور وہ کئی باتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ مجتہد کو اس قسم کی خطا پر عذاب نہ ہو گا۔

۲۔ جب تک اللہ سبحانہ امراً و نہیاً کسی چیز کا صاف حکم بیان نہ فرمائے اس وقت تک اس کے مرتکب کو عذاب

نہیں ہوتا۔

۳۔ اہل بدر کی خطاؤں کو خدا معاف کر چکا ہے۔

۴۔ غلطی سے جو رویہ قبل از وقت اختیار کر لیا گیا یعنی فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کر دینا ـــ اللہ سبحانہ کے علم میں طے شدہ تھا۔ آئندہ اس کی اجازت ہو جائے گی۔ فاما منا بعد واما فداء۔

۵۔ یہ بھی طے شدہ ہے کہ جب تک پیغمبر ان میں موجود ہے یا لوگ صدق دل سے استغفار کرتے ہیں عذاب نہ آئے گا۔

۶۔ ان قیدیوں میں سے بہتوں کی قسمت میں ایمان لانا لکھا گیا ہے الغرض اس قسم کے موانع اگر نہ ہوتے تو یہ غلطی اتنی عظیم و ثقیل تھی کہ سخت عذاب نازل ہو جانا چاہیے تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس قولی تنبیہ کے بعد وہ عذاب جو اس طرح کی خوفناک غلطی پر آسکتا تھا۔ آپ کے سامنے نہایت قریب کر کے دکھایا گیا۔ گویا یہ قولی تنبیہ کو زیادہ موثر بنانے کی ایک صورت تھی۔ آپ اس پس منظر کو دیکھ کر وفف گریہ و بکا ہو گئے۔ حضرت عمر رضی نے سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ میرے سامنے ان کا عذاب پیش کیا گیا ہے یعنی جس کا آنا ان پر ممکن تھا اگر مذکورہ بالا موانع نہ ہوتے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ آپ کے سامنے عذاب کی نمائش ایسی تھی۔ جیسے صلوٰۃ کسوف ادا کرتے وقت آپ کے سامنے جنت و دوزخ دیوار قبلہ میں متمثل کر دی گئی تھی یعنی اس متوقع عذاب کا صرف نظارا کرانا تھا اور بس۔[1]

شیخ الاسلام نے جو کچھ بتایا ہے۔ یہی کچھ عام شارحین قرآن نے لکھا ہے لیکن یہ تفسیر نہیں بلکہ تاویل کا ایسا لبادہ ہے کہ اس کی رو سے حضور اقدس ﷺ سمیت ساری جماعت گنہ گار قرار پاتی ہے اور ایسی تاویل کو محض روایات کی بنا پر قبول کر لینا بڑا سنگین معاملہ ہے۔

آیت قرآنی کا ہماری تشریح کے مطابق مطلب واضح اور صاف ہے کہ اگر ہم سورۂ محمد میں اس سے پہلے فدیہ قبول کرنے کی اجازت نہ دے چکے ہوتے تو ہم اس غلطی پر تمہیں سنگین سزا دیتے۔ الجصاص رقمطراز ہیں۔

بدر کے روز مسلمانوں کو مشرکین کے قتل کرنے کا حکم تھا۔ اللہ سبحانہ نے فرمایا تھا۔ فاضربوا فوق الاعناق واضربوا منهم كل بنان اور یہ بھی حکم تھا اذا لقيتم الذين كفروا فضرب الرقاب حتى اذا اثخنتموهم فشدوا الوثاق اس لیے بدر میں امت کا اولین فرض یہ تھا کہ مشرکین کو تہ تیغ کیا جائے خونریزی کے بعد جب غلبہ ہو جائے تو پھر گرفتار شدہ قیدیوں کا فدیہ لیا جائے۔ خونریزی اور غلبہ سے پہلے قید کرنا اور ان کا فدیہ لینا ممنوع تھا مسلمانوں نے بدر کے دن غنیمت سمیٹنی شروع

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کر دی اور مشرکین کو قید کر لیا اور بعد کو ان کا فدیہ لیا۔ مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل کتاب اللہ کے خلاف تھا اس لیے اللہ نے عتاب فرمایا[1]

یہ تصریح بتا رہی ہے کتاب من اللہ سے مراد سورۂ محمد کی آیت ہے یعنی اگر قرآن میں فدیہ لینے کی اجازت نہ ہوتی تو موجودہ صورتِ حال کا تقاضا یہ تھا کہ خدا کی جانب سے تمہیں سخت سزا ملتی۔ قیدیوں کا فدیہ لینا جرم نہ تھا بلکہ اصل گناہ یہ تھا کہ دشمن پر غلبہ پائے بغیر قیدی بنائے گئے۔ اور مالِ غنیمت کے لیے کوشش کی گئی نہ مالِ غنیمت لینا جرم ہے اور نہ قیدیوں سے فدیہ لینا جرم ہے۔ جرم تو یہ ہے کہ اثخان فی الارض کے بغیر مالِ غنیمت کی فکر ہوئی اور قیدی بنائے گئے۔ فیما اخذ تم کہہ کر قرآن نے بات کھول دی ہے کہ بدر میں اثخان فی الارض کے بغیر جو کچھ تم نے لیا خواہ غنائم ہوں یا قیدی ہوں یہ غلط تھا۔ ورنہ مالِ غنیمت ہو یا قیدی ہوں ان میں سے کوئی چیز ممنوع نہیں ہے۔ سیرۃ ابنِ ہشام میں فیما اخذ تم کی تشریح من الاساری و الغنائم سے کی ہے۔ یہ واقعہ میدانِ جنگ اور بدر کا ہے۔ قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑنے اور اس کے متعلق میٹنگ ہونے کا مسئلہ بدر کا نہیں بلکہ مدینہ کا ہے۔ راویوں نے واقعات میں خلط کر دیا ہے۔ ان آیات کی تشریح میں شارحینِ قرآن نے جو روایات بیان کی ہیں وہ کچھ آپ سن چکے ہیں۔ کچھ اور سن لیجئے۔

ابن المنذر، ابو الشیخ اور ابن مردویہ بحوالہ نافع حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ بیان لکھا ہے کہ، لوگوں کا بدر کے قیدیوں میں اختلاف ہوا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر و عمر سے مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ فدیہ لے لیجئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ ان کو قتل کر دیجئے کوئی بولا کہ یہ لوگ تو وہ ہیں جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا اور اسلام کی عمارت گرانے کے درپے تھے اور حضرت ابوبکرؓ ان کا فدیہ لینا چاہتے ہیں اور کوئی بولا کہ اگر ان میں حضرت عمرؓ کے والد یا بھائی ہوتے تو عمرؓ قتل کی بات نہ کرتے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کی بات کو شرفِ پذیرائی دیا۔ قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔ لولا کتاب من اللہ حضورؐ نے فرمایا کہ عمرؓ کی مخالفت کے نتیجہ میں ہم سب عذاب کی لپیٹ میں آجاتے۔ اگر عذاب آتا تو عمرؓ کے سوا کوئی نہ بچتا۔

حافظ ابنِ جریر نے ابنِ زید کے حوالے سے بتایا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ:

اللہ کے دین کی نصرت کرنے والوں میں سوائے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سب کی نگاہ غنیمت پر تھی۔ عمرؓ کے سامنے جو قیدی آتا وہ گردن اڑا دیتے۔ اور کہتے یا رسول اللہؐ ہمارا مشن یہ ہے کہ ہم

[1] احکام القرآن

اللہ کے قانون کے لیے جہاد اس وقت تک کریں کہ یگانہ خدا کی عبادت ہو۔ ہمارا غنائم سے کیا تعلق ہے۔
حضورؐ نے فرمایا کہ اے عمرؓ اس معاملہ میں اگر عذاب آتا تو تیرے سوا کوئی نہ بچتا۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے
آیندہ ایسا نہ کرنا کہ میری اجازت کے بغیر کسی چیز کو حلال سمجھو۔

ابن اسحٰق کہتے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا اگر آسمان سے عذاب نازل ہوتا۔ تو سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا کوئی نہ بچتا۔

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی تخصیص کیوں ہے۔ یہ گتھی بھی خود ان ہی نے سلجھادی ہے سیرۃ ابن ہشام میں ہے کہ:

جب لوگ میدانِ جنگ میں دشمن کو قیدی بنالے لگے اس وقت حضور اقدس ﷺ عریش[۱] میں تھے اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ عریش کے دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرے پر کچھ ناگواری کے آثار دیکھ کر فرمایا بخدا سعدؓ تجھے لوگوں کا کردار کچھ پسند نہیں ہے۔ سعدؓ بولے جی ہاں بخدا یارسول اللہ یہ پہلا موقعہ اللہ نے اہلِ شرک کو ختم کرنے کا مہیا کیا ہے۔ مجھے تو مشرکین کا قتل کے ذریعے خون بہادینا ان کو گرفتار کرنے سے زیادہ پسند ہے۔

ان روایات میں دونوں باتوں میں اختلاط ہوگیا میدانِ جنگ میں غنائم اور گرفتاری ——— اور مدینہ میں قیدیوں کی رہائی۔ عام شارحین قرآن نے ان آیات کو قیدیوں کی رہائی اور ان کے فدیہ سے متعلق سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ ان آیات کا تعلق بدر کی جنگ میں پکڑ دھکڑ اور غنیمت کا مال سمیٹنے سے ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قیدیوں کا مسئلہ کوئی پیش نہیں آیا۔ ضرور پیش آیا ہے اور پیش آنا چاہیے۔ جب قیدی بنالیے گئے تو اس کا حل بھی ان کو سوچنا ہے اور اس سلسلے میں میٹنگ بھی ہوئی ہے اور اس میں صحابہؓ نے مشورے بھی دیئے ہیں۔ اور اس میں قیدیوں کے بارے میں فیصلہ بھی ہوا۔ فیصلہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے کے مطابق ہوا۔ اور قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کیا گیا۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعادؒ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کو راجح قرار دیا ہے۔ اگرچہ دوسرے علماء نے اس کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

قیدیوں کے فدیہ کی حلت

(۸۵) لہٰذا اب جو کچھ تمہیں غنیمت میں ملا ہے وہ حلال و طیب ہے اسے استعمال کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک

---

[۱] عریش جھونپڑی کو کہتے ہیں یہ ایک ٹیلہ پر بنائی گئی تھی۔ یہاں سے جنگ کا میدان صاف نظر آتا تھا۔ اس عریش کا منشا کچھ تو دھوپ سے بچنا تھا اور دشمن کے تیر حملے کے بچاؤ کے پیش نظر ایسا کیا ہوگا۔ یہاں چند تیز رفتار اونٹنیاں تھیں۔ فوج کو اطلاعات بھیجنے کا ان سے کام لیا جاتا تھا۔

اللہ بخشنے والا مہربان ہے پچھلے عتاب وتہدید سے مسلمان ڈر گئے کہ مال غنیمت کو جس میں فدیہ اساری بھی شامل ہے اب ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ اس آیت میں تسلی فرمادی کہ وہ اللہ کی عطا ہے خوشی سے کھاؤ۔ ہاں جہاد کے سلسلے میں مال غنیمت کو مطمع نظر بنانا یا اس قدر اہمیت دینا نہیں چاہیے کہ مقاصد عالیہ اور مصالح کلیہ سے اغماض ہونے لگے۔ بے شک وقتی حالات و مصالح کے اعتبار سے تم نے ایک غلط طریق کار اختیار کیا مگر نفس مال میں کوئی خبث نہیں خدا سے ڈرتے رہو گے تو وہ اپنی رحمت سے غلطیوں کو معاف کر دے گا[1]

اموال غنیمت و اعلموا انما غنمتم من شئی فان للہ خمسہ میں حلال ہو چکے ہیں۔ اب یہاں اس آیت میں وہ اموال حلال کر دیئے گئے ہیں جو قیدیوں سے فدیہ میں وصول ہوئے ہیں اور ان کو بھی اموال غنیمت ہی میں شمار کر لیا۔ پوری بات اس طرح تھی کہ چونکہ پہلے فدیہ لینے کی اجازت دی جا چکی ہے اس لیے اب سنگین غلطی کے باوجود فدیہ میں لیے ہوئے اموال تمہارے لیے حلال و طیب ہیں مال خبیث نہیں اسے استعمال کرو اور باقی کو اجتماعی مصالح میں صرف کرو مگر آیندہ اس قسم کی روش اختیار نہ کرنا کہ غلبہ اور اثخان سے پہلے قیدی بناؤ یا مال غنیمت کی طرف متوجہ ہو یہ بات کہ اس سے مراد مال غنیمت نہیں بلکہ وہ اموال ہیں جو قیدیوں سے فدیہ میں حاصل ہوئے شارحین قرآن میں سے کچھ نے سمجھی ہے۔ محی السنۃ علامہ بغوی معالم التنزیل میں فرماتے ہیں۔

جب یہ آیت پہلے نازل ہوئی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم فدیہ کے مال لینے سے رک گئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس لیے ما غنمتم سے مراد فدیہ میں آئے ہوئے اموال ہیں یا مال غنیمت۔ اور مقصود قیدیوں کے فدیہ میں آئے ہوئے اموال کا حکم بتانا ہے ورنہ اموال غنیمت کی حلت تو پہلے واعلموا انما غنمتم سے معلوم ہو چکی ہے۔

اور صاحب روح المعانی علامہ آلوسی نے بھی اس آیت کو قیدیوں کے فدیہ کے لیے محمل بتایا ہے۔ اور ابو ہریرۃ کی روایت کو اس کا مؤید قرار دیا ہے۔

بدر میں قریش کے قیدی

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تین روز بدر میں قیام فرما رہے۔ پھر قیدیوں اور مال غنیمت کے ساتھ منزل بمنزل مراجعت فرمائی۔ اسیران قریش میں سے دو دین کے بڑے دشمن تھے اور ان سے مسلمانوں کو بے حد اذیت پہنچ چکی تھی۔ انہیں موت کی سزا دی۔ صفرا میں پہنچے تو مال غنیمت تقسیم فرمایا۔ اپنا حصہ بھی صحابہ کے برابر رکھا

[1] افادات شیخ الاسلام

مدینہ منورہ پہلے ہی دو قاصد روانہ کر دیئے تھے مدینہ کے لیے زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عالیہ کے لیے عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ پہنچے تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے لوگ حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تدفین سے فارغ ہو چکے تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی طرف روانہ ہوئے تو حضور م کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اہلیہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار تھیں۔ اس وجہ سے حضرت عثمانؓ کو اہلیہ کی بیمارداری کے لیے چھوڑنا پڑا۔ اور پھر مدینہ سے چلتے وقت لڑائی کا کوئی ارادہ بھی نہ تھا۔ جیسا کہ قرآن کی آیت۔

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم و تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم۔

اور جب اللہ تم سے دو گروہ میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گا اور تمہاری تمنا یہ تھی کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔

یہ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ مدینے سے چلتے وقت مسلمانوں کو یقین نہ تھا کہ ان کی مڈبھیڑ قریش کے لشکر سے ہو گی۔ ہاں یہ امکان ضرور تھا کہ چونکہ قریشی تجارتی قافلہ ایک ہزار اونٹوں پر دس ہزار دینار کا سامان لے کر آ رہا ہے اس لیے اس کی حفاظت کے لیے قریش ضرور کوئی قدم اٹھائیں گے۔ صحیح مسلم میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان بھی اس کا مؤید ہے۔

کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا سوائے غزوہ تبوک کے اور ہاں میں غزوہ بدر میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔ لیکن غزوہ بدر میں شریک نہ ہونے والوں پر کوئی عتاب نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے تجارتی قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ ہنگامی طور پر لڑائی پیش آ گئی۔

لڑائی کا فیصلہ مدینہ میں نہیں ذفران کی مجلس مشاورت میں ہوا جب قریش کے لشکر کی اطلاع ملی۔ بے کسی، بے بسی بے سروسامان سے خالی اور نفری صرف ۳۱۳۔ اس کے باوجود جنگ کا فیصلہ کیا قرآن نے اس فیصلہ کے بعد ذفران سے بدر کی طرف صحابہ کی روانگی کا بڑے بلیغ انداز میں ذکر کیا ہے۔ کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون گویا ان کو موت کی طرف ہانکا جا رہا تھا اور موت کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ لڑائی ہوئی قریش کے ستر آدمی مارے گئے۔ ستر گرفتار ہوئے۔ غنیمت تو بدر ہی میں تقسیم ہو گئی لیکن قیدی مدینہ منورہ لائے گئے۔

قیدیوں سے حسن سلوک

اسیران جنگ دو دو اور چار چار صحابہ میں تقسیم کر دیئے گئے اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں۔ صحا

نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے اور خود کھجور کھاتے تھے۔ ان قیدیوں میں ابو عزیز بھی تھے جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھائی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے قید رکھا تھا وہ جب صبح و شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھے واپس کر دیتے۔ یہ اس بنا پر تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔

بدر کے قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو ـــــ تھا جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجموں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریر کرتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت دیجئے کہ میں اس کے دو نیچے کے دانت توڑ دوں کہ پھر اچھا بول نہ سکے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اگر اس کے عضو کو بگاڑوں گا تو اگرچہ میں نبی ہوں مگر خدا اس کے بدلہ میں میرے اعضاء بھی بگاڑ دے گا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بدن پر کرتہ نہ تھا۔ لیکن ان کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کرتہ ان کے بدن پر ٹھیک نہ آتا تھا۔ عبداللہ ابن ابی رئیس المنافقین نے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ہم قامت تھا اپنا کرتہ منگوا کر دیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کے کفن کے لیے جو اپنا کرتہ عنایت فرمایا تھا وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا۔

عام روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آکر صحابہ سے مشورہ کیا جیسا کہ مسلم وغیرہ حدیث کی کتابوں میں آتا ہے جس کی تفصیل آپ پہلے سن چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشورہ دیا کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک اسلام کے مسئلہ میں دشمن عزیز یگانے اور بیگانے برابر تھے انھوں نے یہ رائے دی کہ سب کو قتل کر دیا جائے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔

فدیہ کی مختلف صورتیں

غور و فکر اور مشورے کے بعد قرار پایا کہ ؛

۱۔ اسیروں سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔

۲۔ فدیہ کی زیادہ سے زیادہ رقم چار ہزار درہم تھی۔ لیکن اتنی استطاعت صرف چند میں تھی۔

۳۔ اس بڑی رقم کے بعد کچھ کے لیے تین ہزار۔ کچھ کے لیے دو ہزار اور کچھ کے لیے ایک ہزار مقرر کیے گئے۔

۴۔ جن کی استطاعت اتنی بھی نہ تھی مگر وہ پڑھے لکھے تھے ان سے کہا گیا کہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو رہا کر دیئے جائیں گے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔

۵۔ جو کچھ بھی نہ دے سکتے تھے انہیں محض احسان کر کے چھوڑ دیا گیا۔

چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خاندانی افراد سے بھی باقاعدہ فدیہ لیا گیا۔ ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد یعنی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر بھی قیدیوں میں شامل تھے اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ انھوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو کہلا بھیجا اس رقم میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا وہ ہار بھی آیا تھا جو موصوفہ نے بیٹی کو شادی کے موقعہ پر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہار پر نظر پڑی تو بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں چشم مبارک سے بے اختیار آنسو بہہ پڑے فرمایا۔ تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دو۔ چنانچہ سب نے تائید کی ہار واپس کر دیا گیا اور اس کی قیمت ابوالعاص کے فدیہ میں محسوب کر لی گئی۔ ابوالعاص پھر سامان تجارت لے کر شام گئے۔ اس وقت حضرت زینب رضی اللہ عنہا مدینہ منورہ آ چکی تھیں۔ واپسی کے وقت ان کا قافلہ لٹ گیا۔ لیکن ان کی ایک ایک چیز محفوظ رہی۔ ابوالعاص مدینہ پہنچ کر زینب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر ان کی ہر چیز واپس کر دی گئی۔ وہ مکہ مکرمہ گئے۔ سب کی ایک ایک چیز لوٹائی۔ اور خود واپس آ کر مسلمان ہو گئے۔

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ فدیہ وصول کرنے کی اجازت اس سے پہلے تمہیں دی جا چکی ہے اس لیے تمہاری اس کوتاہی پر کہ تم دشمن کی طاقت کو کچلنے کی شرط کو پورا کیے بغیر مال اور قیدیوں کی طرف لپک پڑے تھے تم کو تنبیہہ کی جاتی ہے اور اب جو کچھ تم نے لے لیا ہے اسے خرچ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے لیکن تمہاری یہ روش اللہ کو سخت ناپسند ہے آئندہ تم اس سے بچتے رہو۔ ہر معاملہ میں وہ روش اختیار کرو جو تقویٰ کا تقاضا ہے۔ اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگو اللہ یقیناً معاف کرنے والا ہے۔

اس آیت کی تشریح حقائق و واقعات کی روشنی میں آپ سن چکے ہیں۔ روایات میں راویوں کے بیان سے شارحین قرآن کی تشریح میں اختلاف ہو گیا ہے۔ عام شارحین قرآن نے آیت کا پس منظر اسی مجلس شوریٰ کا فیصلہ بتایا ہے جو مدینہ میں منعقد ہوئی اور جس میں اکثریت نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہمنوائی میں رائے دی کہ قیدیوں سے فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے۔ اس مجلس شوریٰ کا انعقاد بدر سے واپسی پر مدینہ میں ہوا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تین روز بدر میں قیام پذیر رہے۔ پھر قیدیوں اور مال غنیمت کے ساتھ منزل بمنزل مراجعت فرمائی صفرا میں پہنچے مال غنیمت تقسیم کیا۔ دشمن کو سزا دی جو قید ہوئے ان کو اپنی نگرانی میں مدینہ روانہ کیا گیا اور ظاہر ہے کہ پیدل روانہ ہوئے مدینہ منورہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پہلے پہنچ گئے تھے۔ بعد کو قیدی پہنچے۔ قیدی پہنچے تو آپ نے ان کو مختلف اصحاب میں تقسیم

کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس تمام کارگذاری میں کم از کم دس روز لگ گئے ہوں گے۔ دس روز کے بعد وہ مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس کا ذکر عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایات میں ہے۔ اس مجلس شوریٰ نے مشورہ کے بعد فیصلہ کیا کہ قیدیوں سے فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے۔ اس آیت کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ آیت اس وقت نازل ہوتی ہے جب بدر میں میدانِ جنگ گرم ہے۔ دشمن کے ستر آدمی مر گئے اور دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور اس کے نتیجے میں دشمن کی فوجوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ مسلمان فوجی بجائے اس کے کہ دشمن کا تعاقب کر کے اس کی قوت کو ختم کرتے قیدیوں کو پکڑنے میں لگ گئے، اسی صورتِ حال کی تصویر یہ آیت پیش کر رہی ہے یہ آیت بدر ہی میں نازل ہوئی ہے اور اسی وقت تنبیہہ کی گئی ہے اس آیت کا قیدیوں کے قتل اور ان کے فدیہ لینے سے کوئی تعلق نہیں اگرچہ شارحین قرآن کی اکثریت اس کا پسِ منظر قیدیوں کا فدیہ بتاتی ہے۔ لیکن یہاں یہ کہنا کہ آیت کے مخاطب مسلمان نہیں بلکہ خود قریش مکہ ہیں جیسا کہ بعض نئے مصری اور پاکستانی شارحین قرآن کا میلان ہے قطعاً درست نہیں ہے۔ نہ واقعات اس کی تائید میں ہیں اور نہ عربی ادب کا ذوق بلاغت اس کی اجازت دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم مِّنَ الْأَسْرَىٰ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٧٠﴾ وَإِن يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِن قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٧١﴾

اے پیغمبر لڑائی کے قیدیوں میں سے جو تمہارے قبضہ میں ہیں ان سے کہہ دو کہ[86] اگر اللہ کے علم میں تمہارے دلوں میں کوئی نیکی ہوگی تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بدرجہا بہتر تمہیں اللہ عطا فرمائے گا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا اور اللہ ماضی کے گناہوں کو معاف کرنے والا اور آئندہ رحمت کرنے والا ہے[87]۔ اور اگر ان کا ارادہ آپ کو دغا دینے کا ہے تو اس سے پہلے وہ اللہ کو دغا دے چکے ہیں اس کے نتیجے میں اللہ نے آپ کو ان پر قابو دیا ہے اور اللہ بڑے علم والا حکمت والا ہے[88]۔

معانی مفردات

امکن۔ امکان سے ماضی ہے۔ امکان اور تمکین دونوں کا مادہ مکن ہے اور دونوں کے معنے میں ہم آہنگی بنا دینا قدرت دینا۔ اس کا مفعول محذوف ہے۔ پوری عبارت یوں ہے۔ امکنک منھم۔ تجھے ان پر قابو دے دیا۔

اسلام میں جنگ کے قیدی

اسلام سے پہلے جس طرح جنگ کے طریقے وحشیانہ تھے اسی طرح جنگی قیدیوں کے ساتھ بھی انتہائی بدسلوکی کی جاتی تھی۔

انہیں قتل کر ڈالنا۔ درندوں کے آگے ڈلوا دینا۔ زندہ جلا دینا یا پھر انتہائی ذلت کے ساتھ ان سے عمر بھر غلامی کرانا بالکل عام بات تھی۔ اسلام نے ان سب طریقوں کی اصلاح کی۔ جنگی قیدیوں کے لیے آسان اور منصفانہ اصول بنائے۔ سوسائٹی میں ان کا مقام مقرر کیا۔ اور انہیں اس بات کا موقع دیا کہ اگر وہ اپنی شرارت سے باز آجائیں اور توبہ کریں تو انہیں برابری کے حقوق دیئے جائیں گے۔ اسلام نے جنگی قیدیوں کو جو جو رعایات دی ہیں ان سب کا ذکر تو یہاں نہیں کیا جاسکتا اس آیت میں صاف صاف بتایا جا رہا ہے کہ اگر جنگی قیدیوں کی نیت درست ہو اور وہ شرارت سے باز آجائیں تو یہ ان کے لیے اچھا ہے اس طرح ایک طرف تو وہ اللہ کی مغفرت اور اس کی رحمت کے حقدار بنیں گے دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ اس دنیا میں ان سے جو کچھ چھن گیا ہے اس سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ انہیں دے دے۔ پھر ان کو یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ اب تک انہوں نے جو روش اختیار کی ہے اس کا نتیجہ تو انھوں نے دیکھ لیا ہے کہ آج وہ مسلمانوں کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔ آیندہ کے بارے میں انہیں سوچ لینا چاہیے۔

قیدیوں کو دعوتِ ایمان

(۸۶) اے پیغمبر لڑائی کے قیدیوں میں سے جو تمہارے قبضے میں ہیں ان سے کہہ دو۔ آیت میں اسریٰ جمع اسیر کی ہے مطلب یہ ہے کہ جن قیدیوں سے تم نے فدیہ لے لیا ہے۔ ابن سعد اور ابن عساکر کی تصریح کے مطابق سارے قیدیوں کے بارے میں ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی اسے سب قیدیوں کے بارے میں جمع کا صیغہ ہونے کی وجہ سے کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کچھ شارحین قرآن نے یہ انکشاف کیا ہے کہ اس آیت میں اسریٰ مراد عباس اور ان کے ساتھی ہیں۔ لیکن آیت میں روئے سخن عام ہے۔

صحیح بخاری کے حوالہ سے حافظ ابن کثیر نے بدر کے قیدیوں کی تعداد ستر بتائی ہے۔ ابن ہشام نے سیرۃ میں ان قیدیوں کے یہ نام بتائے ہیں۔

۱۔ عقیل بن ابی طالب
۲۔ نوفل بن الحارث
۳۔ السائب بن عبید
۴۔ عثمان بن عمرو
۵۔ الحارث بن ابی وجزہ
۶۔ عمرو بن ابی سفیان
۷۔ ابوالعاص بن الربیع
۸۔ ابوالعاص بن نوفل
۹۔ ابووداعہ بن ابی عمرو
۱۰۔ عمرو بن الزراق
۱۱۔ عقبہ بن عبدالحارث
۱۲۔ عدی بن الخیار

۱۳۔ عثمان بن عبد شمس
۱۴۔ ابو ثور
۱۵۔ ابو عزیز بن عمیر
۱۶۔ الاسود بن عامر
۱۷۔ السائب بن ابی حبیش
۱۸۔ الحویرث بن عباد
۱۹۔ سالم بن شماخ
۲۰۔ خالد بن ہشام
۲۱۔ امیہ ابن ابی حذیفہ
۲۲۔ ولید بن الولید
۲۳۔ عثمان بن عبداللہ
۲۴۔ صیفی ابن وفار
۲۵۔ ابو المنذر بن ابی رفاعہ
۲۶۔ ابو عطاء عبداللہ بن الحارث
۲۷۔ مطلب بن حنطب
۲۸۔ خالد بن الاعلم
۲۹۔ ابو ذر عمر بن نجیرہ
۳۰۔ فردۃ بن قیس
۳۱۔ حنظلۃ بن قبیصہ
۳۲۔ الحجاج بن الحارث
۳۳۔ عبداللہ بن ابی
۳۴۔ ابو عزہ عمرو بن عبد
۳۵۔ الفاکہ مولی امیہ
۳۶۔ رب بن عمیر
۳۷۔ سہیل بن عمرو
۳۸۔ ربیعہ بن دراج
۳۹۔ عبد بن زمعہ
۴۰۔ عبدالرحمٰن بن مشنوم
۴۱۔ الطفیل ابن ابی قنیع
۴۲۔ عتبہ بن عمرو بن مجدم
۴۳۔ بے نام
۴۴۔ عتبہ
۴۵۔ عقیل بن عمرو
۴۶۔ تیم بن عمرو
۴۷۔ خالد بن اسید
۴۸۔ ابو الغریض بن یسار
۴۹۔ بنہان
۵۰۔ عبداللہ بن حمید
۵۱۔ عقیل
۵۲۔ سائب بن عیاض
۵۳۔ جابر بن الزبیر
۵۴۔ قیس بن السائب
۵۵۔ عمرو بن ابی بن خلف
۵۶۔ ابو رہم بن عبداللہ
۵۷۔ نسطاس
۵۸۔ ابو رافع
۵۹۔ اسلم
۶۰۔ حبیب بن جابر

۶۱۔ السائب بن مالک۔　　۶۶۔ بے نام
۶۲۔ نافع　　۶۷۔ بے نام
۶۳۔ نفیع　　۶۸۔ بے نام
۶۴۔ ابن تیم بن عمرو　　۶۹۔ بے نام
۶۵۔ العباس بن عبدالمطلب　　۷۰۔ بے نام

قیدیوں کے یہ وہ نام ہیں جن کا ذکر ابنِ ہشام نے کیا ہے۔ ان میں حضرت العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہیں ہیں ان کو بھی شمار کر لیا جائے تو یہ کل ۶۵ نام ہوئے۔ محمد بن اسحاق نے صرف ۴۳ نام بتائے باقی ابنِ ہشام کا اضافہ ہے۔
حافظ ابوالقاسم السہیلی نے ان قیدیوں میں سے ان کو نام بنام بتایا ہے جو مسلمان ہو گئے تھے مثلاً

۱۔ العباس بن عبدالمطلب　　۹۔ المطلب بن حنطب
۲۔ عقیل بن ابی طالب　　۱۰۔ ابو وداعہ بن الحارث
۳۔ نوفل بن الحارث　　۱۱۔ عبداللہ ابن ابی
۴۔ ابوالعاص الربیع　　۱۲۔ وہب بن عمیر
۵۔ ابوعزیز بن عمیر العبدوری　　۱۳۔ سہیل بن عمرو
۶۔ السائب بن حبیش　　۱۴۔ عبد بن زمعہ
۷۔ خالد بن ہشام　　۱۵۔ قیس بن السائب
۸۔ عبداللہ بن السائب　　۱۶۔ نسطاس

دلوں کی صفائی پر توفیق آتی ہے

(۸۷) کہ اگر اللہ کے علم میں تمہارے دلوں میں کوئی نیکی ہوگی تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بدرجہا بہتر تمہیں اللہ عطا فرمائے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور اللہ ماضی کے گناہوں کو معاف کرنے والا اور آئندہ رحمت کرنے والا ہے۔ کچھ قیدیوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا مثلاً حضرت العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ ان سے کہا گیا کہ اللہ دیکھے گا کہ واقعی تمہارے دل میں ایمان و تصدیق موجود ہے تو جو کچھ زرِ فدیہ تم نے دیا ہے اور تم سے وصول کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ اور کہیں بہتر تم کو مرحمت فرمائے گا اور پچھلی خطاؤں سے درگذر کرے گا[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ سبحانہ کی جانب سے بدر کے ان قیدیوں کی طرف یہ پیغام ہے کہ تم سے جو فدیہ لیا گیا ہے اس سے دل گرفتہ ہونے کے جگہ نہیں اللہ ورسول کا احسان مند ہونا چاہیے۔ اور اس احسان کا حق یہ ہے کہ تم اپنی روش کو تبدیل کرو۔ اگر تم نے اپنے کو بدل لیا اور اس انعام کی قدر کی تو اللہ کی رحمت اور اس کی توفیق تمہارا ساتھ دے گی اور اس زر فدیہ سے جو تم سے لیا گیا ہے کہیں بڑھ کر وہ تمہیں اسلام کی نعمت سے نوازے گا۔ اور تمہاری مغفرت فرما دے گا۔

جن قیدیوں نے فدیہ دیا تھا ان کی کافی تعداد تھی۔ زیادہ سے زیادہ فدیہ کی رقم چار ہزار درہم اور کم از کم ایک ہزار تھی۔ ایسے بھی تھے جن سے کوئی کام لیا گیا اور ایسے بھی تھے جن پر احسان کیا گیا اور چھوڑ دیئے گئے لیکن تاریخ نے اس آیت کے پس منظر میں جو عملی مثال محفوظ رکھی ہے وہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے۔ لکھا ہے کہ قریش نے اپنے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا اور رہا کرا لیا۔ حضرت العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی بدر کے ان قیدیوں میں تھے انھوں نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں تو مسلمان تھا۔ فرمایا تمہارے اسلام کا حال خدا جانے۔ بظاہر تم جنگ میں آئے تھے۔ لہٰذا اپنا اور اپنے دونوں بھتیجوں نوفل بن حارث اور عقیل بن ابی طالب کا اور اپنے حلیف عتبۃ بن عمرو کا فدیہ ادا کرو۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ اتنا مال میرے پاس کہاں ہے۔ فرمایا وہ مال کہاں گیا جو ام الفضل اور تم نے زمین میں گاڑا ہے۔ اور تم نے ام الفضل سے کہا تھا کہ خبر نہیں کہ اس سفر میں کیا پیش آئے۔ اگر میں نہ لوٹا تو یہ دفینہ مال میرے بچوں فضل، عبداللہ اور قثم کے لیے ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب میں یقینی طور پر سمجھ گیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں کیوں کہ میں نے آدھی رات کے وقت وہ مال دفن کیا تھا اور ام الفضل کے سوا کسی کو اس کی خبر نہیں ہے اب میں فدیہ دیتا ہوں لیکن بیس اوقیہ سونا جو میرے پاس تھا اور غنیمت میں لے لیا گیا وہ میرے حساب میں لگا لیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں وہ تو اللہ نے ہمیں عطا کیا ہے۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا اور اپنے دونوں بیٹوں اور اپنے حلیف کا فدیہ دیا۔ حضرت عباس نے یہ بھی انکشاف فرمایا کہ اللہ سبحانہ کے اس ارشاد یوتکم خیرا مما اخذ منکم کی صحیح تفسیر میں ہوں ۲۰ اوقیہ کی جگہ مسلمان ہونے کے بعد مجھے بیس غلام ملے۔ جو خود بھی قیمتی ہیں اور پھر ہر غلام میرے لیے کاروبار کرتا تھا۔ متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضرت عباس مسلمان ہونے کے بعد بہت مالدار ہو گئے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ انصار نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت عباس ہمارے بھانجے ہیں۔ ہم ان کا فدیہ چھوڑ دیتے ہیں لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات کی بنا پر گوارا نہیں فرمایا اور ان کو بھی فدیہ ادا کرنا پڑا۔ فدیہ کی عام مقدار ۴ ہزار درہم تھی لیکن امراء سے زیادہ لیا گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ زیادہ دولت مند تھے اس لیے ان سے بھی زیادہ رقم لی گئی انھوں نے حضورؐ سے شکایت کی لیکن ان کو کیا معلوم تھا

کہ اسلام نے جو مساوات قائم کی۔ اس میں قریب و بعید۔ عزیز و بیگانہ خاص و عام کے تمام تفرقے مٹ چکے تھے، لیکن ایک طرف ترازو کے فرض کی یہ مساوات تھی دوسری طرف محبت کا یہ تقاضا تھا کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کراہ سن کر رات کو آپ آرام نہ فرما سکے لوگوں نے ان کی گرہ کھول تو آپ نے آرام فرمایا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص بھی اسیرانِ جنگ میں تھے۔ ان کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جو ان کی زوجہ تھیں اور مکہ میں تھیں کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیجدیں۔ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جب نکاح ہوا تھا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جہیز میں ایک قیمتی ہار دیا تھا۔ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے زرِ فدیہ کے لیے ہار ہی گلے سے اتار کر روانہ کر دیا۔ حضور اقدسؐ نے دیکھا تو ۲۵ برس کی محبت بھری یادیں تازہ ہو گئیں۔ آپؐ بے اختیار رو پڑے اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دوں سب نے تسلیم کی گردنیں جھکا دیں اور وہ ہار واپس کر دیا گیا۔ یہ تھی تکم خیراً کی عملی تفسیر دیکھیے۔ ابوالعاص رہا ہو کر آئے۔ اور حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مدینہ بھیج دیا۔ ابوالعاص بہت بڑے تاجر تھے چند سالوں کے بعد بڑے ساز و سامان کے ساتھ شام کی طرف مالِ تجارت لے کر نکلے واپسی میں مسلمان لشکر نے ان کو مع ان کے تمام سامان کے گرفتار کر لیا سامان سارا تقسیم ہو چکا تھا۔ یہ چھپ کر حضرت زینبؓ کے پاس پہنچے انھوں نے پناہ دی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پھر فرمایا کہ مناسب سمجھو تو ابوالعاص کا سامان واپس کر دو پھر طاعت کی گردنیں جھک گئیں۔ اور سپاہیوں نے ایک ایک دھاگا لا کر واپس کر دیا۔ اب یہ وار ایسا نہ تھا کہ کارگر نہ ہوتا۔ ابوالعاص مکہ آئے۔ اور تمام شرکا کو حساب سمجھا کر دے دیا۔ اور دولتِ اسلام سے مالا مال ہو گئے۔

ذرا اس آیت کو بنظرِ عمیق پڑھیے آپ محسوس کریں گے کہ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا اللہ سبحانہ کو اس قدر پسند تھا کہ ان قیدیوں کو اپنے نبی کے ذریعے یہ پیغام بھیجا کہ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اگر تم نے اس احسان کی قدر کی تو اس سے تمہارے لیے اسلام کے قبول کرنے اور گناہوں کی مغفرت کی راہ کھل جائے گی۔ کہاں قرآن کا قیدیوں کے بارے یہ تصورِ ہدایت اور کہاں قیدیوں سے فدیہ لینے کا خیال کر یہ ایسا سنگین جرم ہے کہ لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم۔ ان دونوں باتوں میں کوئی جوڑ نہیں ہے بلکہ حقیقت یہی ہے کہ تنبیہہ قیدیوں کے فدیہ پر نہیں ہے بلکہ بدر کے میدان میں دشمن کا تعاقب کرنے اور غنیمت سمیٹنے پر ہے اگر فدیہ لینا قرآن کے نزدیک جرم ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے قیدیوں کو یہ پیغام کبھی نہ آتا کہ فدیہ تمہارے اسلام کا ذریعہ بن جائے گا۔

مستقبل آپ کا تاباں ہے

(۸۸) اگر ان کا ارادہ آپ کو دغا دینے کا ہے تو اس سے پہلے وہ اللہ کو دغا دے چکے ہیں اس کے نتیجے میں اللہ نے

آپ کو ان پر قابو دیا ہے اور اللہ بڑے علم والا اور حکمت والا ہے۔ اور اگر اظہار اسلام سے مقصود صرف پیغمبر کو دھوکا دینا ہے یا دغابازی کرنے کا ارادہ ہے تو پیشتر وہ خدا سے دغابازی کر چکے ہیں یعنی فطری عہد الست کے خلاف کفر و شرک اختیار کیا۔ بعض بنی ہاشم جو ابوطالب کی زندگی میں عہد کر کے حضور اقدس ﷺ کی حمایت پر متفق ہوئے تھے۔ اب کافروں کے ساتھ ہو کر آئے اس کا انجام دیکھ لیا کہ آج کس طرح مسلمانوں کی قید اور قابو میں ہیں آیندہ بھی دغابازی کی ایسی ہی سزا مل سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ سے اپنے دلوں اور نیتوں کو چھپا نہیں سکتے اور نہ اس کے حکیمانہ انتظامات کو روک سکتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں خدا کا وعدہ پورا ہوا ان میں جو مسلمان ہوئے حق تعالیٰ نے بے شمار دولت بخشی جو نہ ہوئے خراب ہو کر تباہ ہوئے [1]

مطلب یہ ہے کہ اگر ان کی نیت خالص بھی نہ ہو اور ان کا مقصود آپ کو دھوکا ہی دینا ہو تو جب بھی آپ تشویش نہ کیجئے۔ اللہ ان کی چال چلنے نہ دے گا اور انہیں آپ کے ہاتھ میں گرفتار کرا دے گا جیسا کہ اس سے پہلے بدر میں کرا چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں ان سے بدعہدی کے اندیشے ایمان کی دعوت میں رکاوٹ نہ ہونے چاہئیں اصل کام تو لوگوں کو ایمان کی دعوت دینا ہے۔ اور حضور اقدس ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی کے لیے وقف رہا چونکہ آپ کی دعوت عالمی تھی اس لیے دعوت کے انتظامات بھی خاص اہتمام چاہتے تھے۔ مگر قریش کے جوش عداوت نے آغاز ہی میں ایسے افسوسناک حالات پیدا کر دیئے تھے کہ پہلے مسلمانوں کی ایک جماعت کو وطن چھوڑ کر حبش میں پناہ لینی پڑی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کے لیے اہل مدینہ کے دل کھول دیئے اور مسلمانوں کے لیے ایک نیا مامن میسر آگیا۔ حضور اقدس دعوت کا اصل کام پورا کرنے کے لیے وہاں چلے گئے۔ قریش نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اور رزم و پیکار کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا۔ حضور اقدس ﷺ نے مشکلات کے اس ہجوم میں دعوت کا سلسلہ جاری رکھا مگر دلجمعی اور یکسوئی لازم تھی اس کا کوئی موقعہ بھی ہاتھ سے نہ دیا۔ اس نیک مقصد کی خاطر کامیابی کے مسلمانوں کو گر بتائے جا رہے ہیں۔

فاثبتوا۔ جم کر رہو۔

اذکروا اللہ کثیرا۔ اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔

اطیعوا اللہ ورسولہ۔ اللہ و رسول کی اطاعت کرو۔

لاتنازعوا۔ باہم آویزش پیدا نہ کرو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اصبروا۔ مشکلات کو برداشت کرو۔

لاتکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطراً و رئاء الناس "ان کی طرح نہ ہو جو ایمان وراستی کی جگہ گھمنڈ اور دکھاوے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں"۔ کہیں نبوت کو حکم ہو رہا ہے کہ

اما تخافن من قوم خیانۃ۔ اگر کسی قوم سے تمہیں خیانت کا اندیشہ ہو تو تم بدعہدی نہ کرو۔

کہیں ہدایت ہو رہی ہے۔

ان جنحوا للسلم۔ اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی یہ موقعہ ہاتھ سے نہ دو صلح کرلو۔

صلح میں اگر وہ تمہیں دھوکا دینا چاہیں پھر بھی تم ایمان وراستی کو ہاتھ نہ دو اللہ پر اعتماد کرو۔

یہاں کہا گیا کہ قیدیوں سے کہہ دو کہ اگر تم اسلام قبول کرو گے تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے کہیں اچھا تم کو ملے گا اور وہ آپ کو اسلام کے نام پر دھوکہ دینا چاہیں تو آپ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کریں۔

مقصد یہ ہے کہ دعوت کو کسی مرحلہ پر ہاتھ سے نہ جانے دیں کہ اصل مقصود اللہ کے بندوں کو جہنم کی لپٹوں سے بچانا ہے۔

بدر نے تاریخ کا رُخ بدل دیا

مورخین اور اصحاب سیر نے بھی بدر کی تاریخی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ معرکہ بدر ایک ہنگامی معرکہ تھا بلکہ اس نے قریش مکہ کی قوت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور مسلمانوں کے لیے دعوت کی راہیں کھول دیں۔ لیکن وہ بھی اس حقیقتِ حال سے شاید بے خبر ہیں کہ معرکہ بدر صرف مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی آویزش حق و باطل کا معرکہ نہیں تھا بلکہ جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اس وقت دنیا ایک موڑ پر کھڑی تھی۔ اور تاریخ عالم کا اشہب تیز گام اس موڑ پر حیران سرگردان کھڑا تھا کہ کس جانب رُخ کرے اس لیے بدر کا انقلاب عالمگیر انقلاب تھا۔

صفحۂ عالم پر اگر بدر کا معرکہ پیش نہ آتا اور مشرکین مکہ کی طاقت کو شکست وریخت سے دوچار نہ کیا جاتا تو بلاشبہ پوری دنیا ظلم وفساد کا گہوارہ بن جاتی۔ انسانی ضمیر کی خودکشی ہوتی اور بنیادی حقوق کا نام ونشان نہ رہتا۔ مشرکین مکہ کی طاغوتی قوت ختم ہوئی تو دنیا میں عدل وانصاف حق پرستی اور نکوکاری کی ہوائیں چل پڑیں اس لیے اللہ سبحانہ کا یہ عظیم الشان احسان کہ بدر میں مسلمان کامیاب ہوئے صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہ تھا بلکہ تمام کائنات انسانی پر احسان تھا۔

اس موقعہ پر مولانا ابوالکلام آزاد رح نے خوب فرمایا ہے۔

بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ جنگ واٹرلو کے تمام مورخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷ اور ۱۸ جون کی درمیانی شب میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا کیونکہ اس صورت میں خشک ہونے کا بارہ بجے تک انتظار نہ کرنا پڑتا سویرے ہی لڑائی شروع کر دیتا نتیجہ یہ نکلتا کہ بلوشر کے پہنچنے سے پہلے ولنگٹن کو شکست ہو جاتی واٹرلو میں اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا ـــــ لیکن اگر بدر میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ - تمام روئے زمین کی ہدایت و سعادت کا نقشہ الٹ جاتا۔ اسی طرف حضور اقدس ﷺ نے اپنی دعا میں اشارا کیا۔ اللھم ان تھلك ھذہ العصابۃ فلا تعبد فی الارض - خدایا اگر خدام حق کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہوگئی تو کرۂ ارضی میں تیرا سچا عبادت گذار کوئی نہ رہے گا [1]

مولانا کا ارشاد اس واقعہ کی طرف ہے جہاں بدر کے میدان میں مسلمانوں نے اپنی صفیں قائم کی تھیں وہ جگہ بلند تھی اور جہاں سے قریش کی فوج لڑ رہی تھی وہ جگہ نشیب میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی شکست کا ایک ظاہری سامان کر دیا کہ عین اس وقت میدان جنگ میں موسلا دھار بارش کر دی۔ جس نے ادہر تو مسلمانوں کی طرف گرد و غبار بٹھا کر ان کے پاؤں جما دیئے اور ادھر کافروں کی طرف پانی کا ریلا بھیج کر ان کو زمین پر قدم رکھنا مشکل کر دیا۔ ارشاد ہے۔

وینزل علیکم من السماء ماء لیطھرکم بہ ویذھب عنکم رجز الشیطان ولیربط علی قلوبکم ویثبت بہ الاقدام۔

اور خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب وہ آسمان سے پانی برسا رہا تھا تاکہ تم کو اس پانی سے پاک کر دے اور ناپاکی تم سے دور کر دے تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور اس سے تمہارے قدموں کو جما دے۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ مسلمان اترتی ہوتی بالو پر اترے تھے بارش ہوئی جس سے وہ کوہ صفا کی مانند ہوگئی۔ لوگ اس پر آسانی سے دوڑ سکتے تھے قریش کا پڑاؤ نشیب میں ہونے کے باعث دلدل کی شکل اختیار کر گیا۔

---

[1] ترجمان القرآن

غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

غزوۂ بدر کی تفصیلات تو آپ کے سامنے کھل کر آ چکی ہیں۔ ان مباحث میں سب سے اہم مبحث یہ ہے کہ بدر کی لڑائی کسی پلاننگ کے تحت ہوئی یا اتفاقیہ ہو گئی۔ حضور اقدس ﷺ مدینہ سے لڑائی کے ارادے سے چلے تھے یا قریش مکہ پر معاشی دباؤ ڈالنے اور بزور قریشی قافلوں کی آمد و رفت کو اپنے زیر اثر علاقہ میں روک دینے کے لیے۔

شارحین قرآن، محدثین اور مورخین کی رائے عامہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ مدینہ سے جنگ کے ارادے سے نہیں بلکہ مشرکین مکہ کے تجارتی قافلہ کو روکنے کے لیے چلے تھے۔ اس کے برعکس مولانا شبلی مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کا خیال یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ مدینہ سے جنگ کے لیے چلے تھے اور جنگ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ ان کے اس موقف کے بارے میں ہم نویں جلد میں کچھ اشارات کر چکے ہیں لیکن موضوع کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس پر مبسوط بحث کی جائے۔ یہ خوشی کا مقام ہے کہ اس موضوع پر سیر حاصل بحث مولانا حفظ الرحمٰن قصص القرآن میں کر چکے ہیں۔ ہم ناظرین معالم کی تفریح طبع کے لیے مولانا موصوف کی تحقیق پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں لیکن تعبیر و اضافات کی چند مقامات پر ذمہ داری میری ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:۔

> غزوہ بدر سے متعلق بیان کردہ تفصیلات جمہور علمائے اسلام کے نزدیک مسلم ہیں۔ خصوصاً اس مسئلہ میں تو سلف و خلف میں سے کسی کی بھی دو رائیں نہیں ہیں کہ مسلمان جب مدینہ سے نکلے تو صرف قافلہ پر حملہ مقصود تھا۔ لیکن وادی زفران میں پہنچ کر قدرتی حادثہ نے ایک دوسرے کو مقابلہ سے دوچار کر دیا۔ اور یہ مشرکین مکہ کی وہ پوزیشن تھی جو مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ظہور میں آئی تھی۔

عیر و نفیر

اب مسلمانوں کو عیر اور نفیر دو کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ اس لیے بھی وہ مقام ہے۔ جہاں مسلمانوں کو بشارت دی گئی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کے سپرد کیا جائے گا۔ اور بعض مسلمانوں نے اگرچہ حالات کی بنا پر نفیر کو عیر کے مقابلہ میں ناپسند کیا لیکن حضور اقدس ﷺ کو اللہ سبحانہ نے بذریعہ وحی مطلع کر دیا تھا کہ اللہ سبحانہ نفیر کے مقابلہ کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس لیے حضور اقدس ﷺ کا رجحان نفیر

کی جانب ہوا اور مشورے کے بعد وہی فیصلہ ہوا جو خدا اور خدا کے رسول کی مرضی تھی۔ قرآن کی ان آیات میں اسی حقیقت کا کھلا اعلان ہے۔ کما اخرجك ربك من بيتك بالحق اور اذ انتم بالعدوۃ الدنيا وهم بالعدوۃ القصوىٰ۔ لیکن مؤرخین اور محدثین کی رائے عامہ کے خلاف مولانا شبلی نے سیرۃ النبی م جلد اول میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ:۔

مسلمان شروع ہی میں مدینے سے صرف نفیر کے لیے نکلے تھے اور خدا کے وعدہ عیر و نفیر کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیر و نفیر کے متعلق جو کچھ مشورہ کیا اور صحابہ نے جو تقریریں کیں وہ سب وادی ذفران میں نہیں بلکہ مدینہ میں ہو چکا تھا

مولانا مرحوم نے اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے طویل بحث فرمائی۔ اور احادیث و سیر کی بیان کردہ ترتیب کا اس لیے انکار کر دیا کہ وہ اس کو قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں۔

چونکہ یہ مسئلہ علم و تحقیق سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ خالص علمی انداز میں اس پر محاکمہ کیا جائے تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آئے۔

بے غبار حقیقت

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ قرآن حکیم نے اس واقعہ کی تفصیلات بتاتے ہوئے دو جگہ بصراحت اس حقیقت کا اعلان کہ نفیر کا معاملہ مدینے سے عیر کی خاطر نکلنے کے بعد اچانک پیش آیا اور اس لیے بعض مسلمانوں نے نفیر کے مقابلہ کو ابتداءً خطرہ کی گھنٹی سمجھا۔

۱۔ پہلا مقام سورہ انفال کی یہ آیات ہیں جو کما اخرجك سے شروع ہو کر واضربوا منهم كل بنان تک چلی گئی ہیں یہ تقریباً ۸ آیات ہیں۔

قرآن عزیز نے ان آیات میں اس پورے واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے جو معرکہ بدر میں از اول تا آخر پیش آیا یعنی مدینے سے نکلنے پر مسلمانوں کے سامنے جو جو صورتیں آئیں ان سب کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے بیان کیا ہے۔ جس طرح کما اخرجك ربك من بيتك کے ساتھ وان فريقا من المؤمنين لكارهون کا تعلق ہے۔ ٹھیک اسی طرح واذ يعدكم الله اور اذ تستغيثون ربكم اور اذ يغشيكم النعاس امنة منه وينزل عليكم من السماء وغیرہ واقعات کا بھی تعلق ہے۔

ظاہر ہے کہ مولانا شبلی مرحوم بھی جمہور کے ساتھ اس سے متفق ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا درگاہ الٰہی

میں استغاثہ۔ ملائکہ کی مدد کا آنا مسلمانوں پر اونگھ کا طاری کر کے ان کو تازہ دم کر دینا۔ آسمان سے بارش ہو کر مسلمانوں کے حق میں رحمت ہونا یہ سب حالات آنِ واحد میں ظہور پذیر نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ تھا جو ایک مدت میں پیش آیا۔

مولانا موصوف فرماتے ہیں :

ترکیب نحوی میں وان فریقا من المومنین میں واو حالیہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ مسلمانوں کا جو گروہ لڑائی سے جی چرا رہا ہے یہ موقعہ عین وہ موقع ہے جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ آگے بڑھے کیونکہ واو حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہونا چاہیے (سیرۃ النبیؐ)

لہذا اگر بقول مولانا آیت کما اخرجك ربك میں اس آن کے سوا جو مدینہ سے خروج کے ساتھ مراد ہے اور کچھ مراد نہیں ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ باقی وہ تمام واقعات جو اس آیت کے ساتھ مربوط کر کے بیان ہوئے ہیں وہ سب بھی ایک ہی آن سے متعلق ہونے چاہئیں۔ اگرچہ ان کی حیثیت استیناف کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا کہنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔

آیت کا صریح اور صاف مطلب یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہ نے تم کو ایک مرتبہ مدینہ سے حق کی خاطر نکالا تھا اور تمہارے سامنے ایسی صورتحال پیش کر دی تھی کہ تم پر یہ گراں گذرنے لگا تھا کہ کیوں ہم مدینہ سے نکلے کہ آخر کار ہمارے سامنے یہ صورت گراں بار آگئی اور یہ وقت تھا کہ عیر و نفیر میں سے ایک کا تم سے وعدہ کیا۔[۱]

اسی وجہ سے تمام شارحین قرآن نے وان فریقا من المومنین لکارھون پر یہ نوٹ لکھا ہے۔
اور یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے اور حال بھی حال مقدرہ ہے کیونکہ جس کراہت کا ذکر ہو رہا ہے۔
وہ مدینہ سے نکلنے کے بعد پیش آئی ہے جیسا کہ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا اس لیے یہاں
اخراج سے زمانہ ممتد مراد ہے آنی مراد نہیں۔ (روح المعانی)

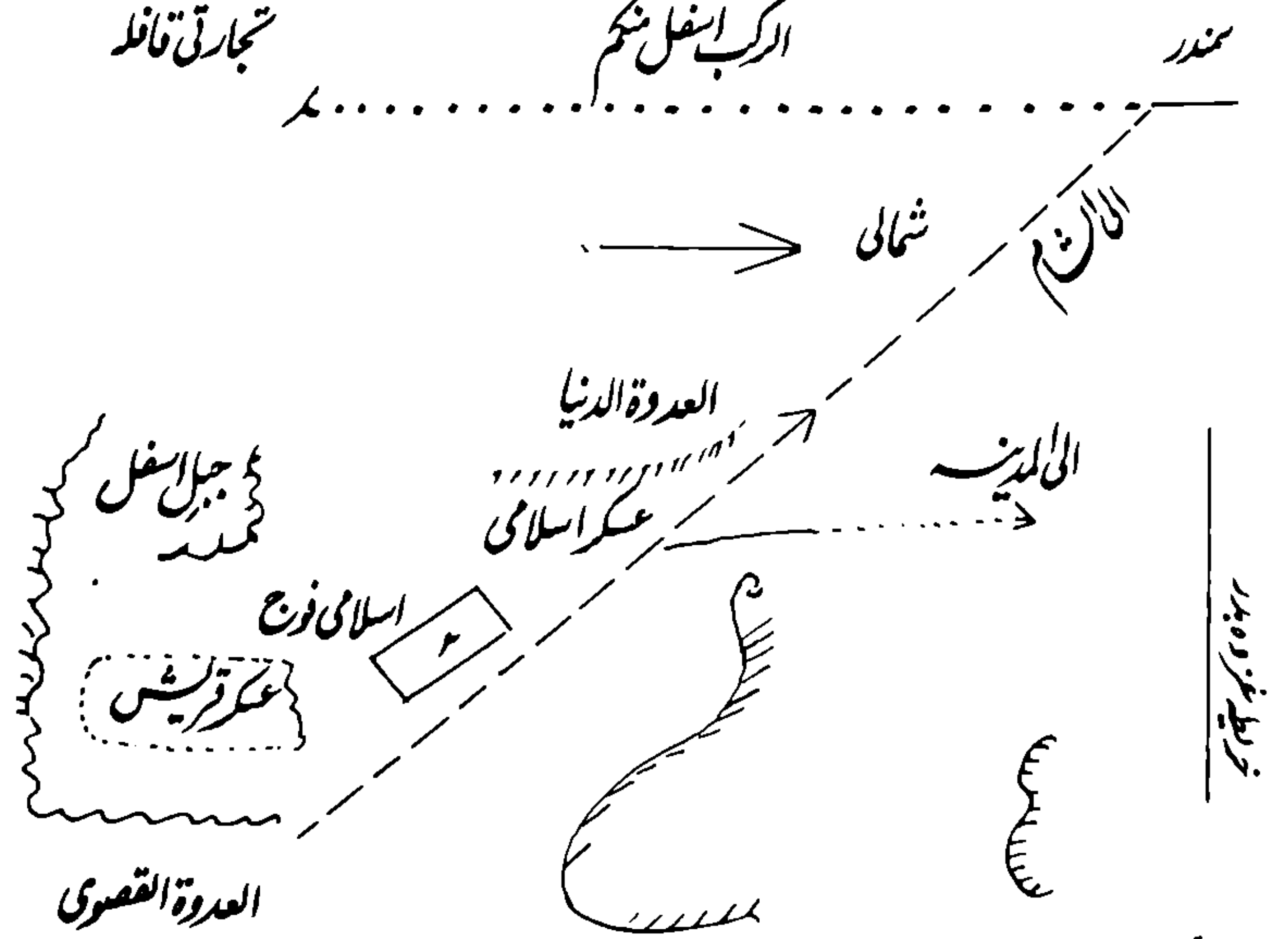
بیضاوی کے مشہور حاشیے عنایۃ القاضی میں ہے۔

والحال مقدرۃ۔ لان الکراھۃ وقعت بعد الخروج بوادی ذفران۔

[۱] ڈاکٹر محمد حمید اللہ فرماتے ہیں واذ یعدکم اللہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مدینے سے چلتے وقت مسلمانوں کو یقین نہ تھا کہ وہ قافلے سے ملیں گے یا بدر کی دستے سے دونوں امکانات تھے ڈاکٹر صاحب کا کہنا بالکل بجا لیکن مدینہ سے نکلنے کے وقت سب کا ارادہ قافلہ کا تھا۔ اگر قریش کی فوج کا یقین ہوتا تو مسلمان ۳۱۳ کی تعداد میں بغیر سامان جنگ کے کبھی مدینہ سے روانہ نہ ہوتے۔ تعداد بھی زیادہ ہوتی سامانِ جنگ بھی ہوتا۔

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ جو شخص نکار ہون میں مذکورہ واقعہ کراہت کو آنی قرار دیتا ہے اور اس کو مدینہ میں
ثابت کرتا ہے۔ اس کے پاس ایک احتمال کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور احتمال بھی ایسا جس کا ثبوت ان
قرآن سے نہیں ملتا جو آیات میں موجود ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص یہ کہتا ہے کہ اخرجك میں اخراج آنی اور
دفتی نہیں بلکہ وہ مدت دراز مراد ہے جس میں یہ معرکہ پیش آیا۔ تو اس دعوے کی پشت پر بعد کی آیات قرآنی واضح
ثبوت ہیں اور اس دعوی کی تصویب کرتی ہیں۔

۲۔ دوسرا مقام سورہ انفال ہی کی وہ آیات ہیں جو ما انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان سے شروع ہو کر الی اللہ
ترجع الامور پر ختم ہوتی ہیں۔ ان آیات میں قرآن حکیم نے سب سے پہلے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ہونے
والی جنگ کے لیے میدانِ جنگ کا نقشہ اس طرح بتایا ہے کہ مسلمانوں کا محاذِ جنگ مدینہ سے قریب وادی میں تھا۔
اذ انتم بالعدوة الدنیا۔ اور مشرکین مکہ کی فوج ان کے بالمقابل جانب بعید کی وادی میں پڑاؤ کیے ہوئے تھی۔
وھم بالعدوة القصویٰ اور اس وقت ابوسفیان کا تجارتی قافلہ مسلمانوں کی وادی سے نیچے سمندر کے
کنارے گذر رہا تھا گویا مسلمان جہاں قیام پذیر تھے وہاں پوزیشن کچھ اس طرح تھی کہ مسلمانوں کے سامنے مشرکین
مکہ کی فوج نشیب کی وادی میں تھی اور مسلمانوں کے پیچھے ابوسفیان کا تجارتی قافلہ نشیب میں سمندر کے کنارے
پر تھا نقشہ کچھ اس طرح تھا۔



یہ صورتحال مسلمانوں کے لیے اس قدر ناسازگار تھی کہ اگر مسلمانوں پر لڑائی کی بات چھوڑ دی جاتی تو مسلمانوں میں

اس موضوع پر اختلاف ہوجاتا۔ کیوں کہ ان کی فوجی پوزیشن ہرگز جنگ کے حق میں نہ تھی۔ یہ جو کچھ ہوا تمہارے سوچے سمجھے میلان کے تحت نہیں ہوا بلکہ ایسا کرنے کا بس اللہ نے فیصلہ فرمالیا تھا۔ یقضی اللہ امرًا کان مفعولا

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اگر مشرکین مکہ کی فوج کشی کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہوجاتا اور حضور اقدس ﷺ نے مدینہ ہی میں اس موضوع پر مسلمانوں سے مشورہ کیا ہوتا اور اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے مدینہ میں ہی احدی الطائفتین کا وعدہ کیا ہوتا تو پھر عقل انسانی یہاں حیران رہ جاتی ہے اور یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ ان سب معاملات کے طے ہوجانے کے باوجود مسلمان خود کو کس لیے بے سروسامان سمجھ رہے تھے اور جنگ سے جی کیوں چرا رہے تھے جبکہ مدینہ میں مسلمانوں کے پاس ہزاروں اونٹ موجود تھے۔ گھوڑے بھی ان کے سو پچاس گھوڑوں کا مہیا ہونا معمولی بات تھی۔ تلواروں اور نیزوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی اور ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ جب ان کو دشمن کی عددی طاقت کا بھی صحیح اندازہ تھا تو آخر وہ کیا سبب تھا کہ مسلمان جن میں انصاری بھی ہیں اور مہاجرین بھی ـــــ صرف ۳۱۳ ہی کی تعداد میں کیوں نکلے۔ اور اس بے سروسامانی میں نکلے کہ نیزے اور تلوار تک بھی ان کے پاس موجود نہ تھے۔ چہ جائے کہ باقی سامان حرب و ضرب مکمل ہوتا۔ اور یہ بھی سوچئے کہ بدر کے اس غزوہ کے علاوہ کسی بھی غزوہ یا سریہ کا حوالہ دیا جاسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے لیے مدینہ میں بیٹھ کر تیاری فرمائی اور مسلمانوں میں دشمن سے مقابلہ کے لیے وہ ہراسانی پیدا ہوئی ہو جس کا ذکر قرآن اس انداز سے کرتا ہے وان فریقا من المومنین لکارھون یجادلونک فی الحق بعد ما تبین کانما یساقون الی الموت کیا ہمارے سامنے غزوہ تبوک کی مثال نہیں ہے کہ دشمن کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے اور مشرکین مکہ جیسے غیر متمدن نہیں ہیں بلکہ متمدن عیسائی طاقت سے مقابلہ ہے جو ہر قسم کے متمدن ساز و سامان سے مسلح ہے اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نہیں۔ مدینہ کے قرب و جوار میں نہیں بلکہ خود دشمن کے گھر جاکر معرکہ حق و باطل گرم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک مسلمان بھی ہراساں نہیں۔ گراں خاطر نہیں بلکہ پروانہ وار نثار ہونے کو تیار ہیں اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے مدینہ سے تبوک کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔

بات بالکل صاف ہے کہ مسلمان درحقیقت اس بے سروسامانی کے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ قافلہ پر قبضہ کرنے کے لیے گئے تھے اور قافلہ کے لیے یہ جمعیت اور یہ سامان کافی تھا لیکن بدر کے قریب پہنچ کر اچانک صورتحال تبدیل ہوگئی۔ اور مسلمانوں کو دو باتوں کا ایک ساتھ علم ہوا۔ ابوجہل مکہ سے لشکر لے کر سامنے موجود ہے اور ابوسفیان کا قافلہ بدر کو چھوڑ کر سمندر کے کنارے جارہا ہے۔ اذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصوی والرکب اسفل منکم۔ اب مسلمان دونوں کے درمیان ہیں۔ اس اچانک حالات کی تبدیلی نے

مسلمانوں کو جنگ کے لیے مجبور کر دیا اور صورتحال وہ ہو گئی جس کی تصویر قرآن نے پیش کی ہے۔ وان فریقا من المومنین لکارھون ــــ اور کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون۔

بہرحال ان ہر دو مقامات کا متبادر، کلام الہی کا سیاق و سباق اور آیات کے اندر موجود قرائن و دلائل کے ہوتے ہوئے مولانا شبلی کا کما اخرجک ربک کے اجمال سے بے دلیل دعویٰ کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

یہ حال مقدرہ ہے

آیت قرآن وان فریقا من المومنین میں واو حالیہ ہونے کی وجہ سے حال ضرور ہے مگر یہ حال مقدر ہے۔ حال مقدر کے لیے بقاعدہ عربیت ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ حال اور ذوالحال کا زمانہ ایک ہو کر دونوں آن واحد میں واقع ہوں بلکہ زمانہ کا امتداد نہ صرف ممکن بلکہ اکثر ہوتا ہے۔ حال مقدرہ کی عربی زبان میں مثالیں موجود ہیں۔ حال مقدرہ کا مطلب یہ ہے کہ جو واقعہ کسی وجہ سے مستقبل میں ہونے والا ہے اس کو بر سبیل تقدیر واؤ حالیہ کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ گویا وہ اسی آن میں پیش آتا ہے کیونکہ اس کا پیش آنا یقینی ہے۔ اور اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ مدینہ سے خروج اس حالت میں پیش آیا کہ مستقبل میں تمہیں ان حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

کاروانِ تجارت کا تعاقب

یہ بات واضح نہیں ہے کہ کاروانِ تجارت مسلمانوں کے ہاتھ سے اس طرح بچکر نکل گیا تھا کہ مسلمان اس کا تعاقب نہ کر سکیں قرآن میں ارشادِ ربانی۔ والرکب اسفل منکم صاف بتا رہا ہے کہ قافلہ تجارت اس جگہ سے جہاں مسلمانوں کا قیام تھا ترائی میں گذر رہا تھا یعنی مسلمانوں کے نشانے کی زد پر تھا بلکہ انداز بتا رہا ہے کہ مسلمان اسے دیکھ رہے تھے جب کہ مسلمان بلندی پر تھے اور وہ نیچے تھا اس سے وہ وادی ذفران میں مشورے کے وقت بھی کاروانِ تجارت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اور یہ وعدہ کہ دونوں میں سے ایک تم کو ملے گا۔ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دونوں موجود ہوں اللہ نے حضور اقدس ﷺ کو یہ بتلا دیا تھا کہ عیر سے نہیں بلکہ تمہارا سابقہ نفیر سے ہوگا۔

اس صورت حال کو ہمارے اصحاب سیرۃ نے واضح نہیں کیا مگر بعض نے اس حقیقت کو مستند روایات سے ثابت کیا ہے حافظ ابن کثیر نے تفسیر اور البدایہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حافظ بدرالدین

عینی نے عمدۃ القاری میں بسند اس واقعہ کو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔

ہم مدینہ میں تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ ابو سفیان کا کاروان تجارت شام سے آرہا ہے کیا تم تیار ہو کہ اس کو اپنی گرفت میں لے لو ممکن ہے کہ اللہ سبحانہ اس بہانے ہم کو مال غنیمت دے دے۔ ہم نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ بھی روانہ ہوئے اور ہم بھی۔ ابھی ہم نے ایک یا دو روز کا سفر کیا تھا کہ آپ نے ہمیں بتایا کہ اہل مکہ فوج کشی کے ارادے سے آرہے ہیں اب کیا ارادہ ہے۔ تب ہم نے عرض کی یارسول اللہ قسم بخدا موجودہ حالت میں دشمن کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے البتہ قافلہ پر حملہ کا ارادہ ضرور ہے۔

اس سے بھی قرآن کی تائید ہوتی ہے کہ تجارتی قافلہ اور مشرکین کی فوج دونوں منظر عام پر آچکی تھیں لیکن مسلمان مدینے سے جنگ کے لیے نہیں تجارتی قافلہ کے لیے آئے تھے۔ اگر مشرکین کی فوج سامنے نہ ہوتی تو حضور یہ نہ فرماتے ما ترون فی قتال القوم فوج سے مقابلہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے اور قرآن یہ نہ کہتا۔ و ھم بالعدوۃ القصویٰ اور اگر تجارتی قافلہ سامنے نہ ہوتا تو ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ نہ فرماتے اردنا العیر ہم تو قافلہ کا ارادہ کر کے آئے ہیں اور قرآن یہ نہ کہتا۔ والرکب اسفل منکم۔

مولانا شبلی کا جذباتی نعرہ

جہاں قرآن مسلمانوں سے بات ایسی کہتا ہے جس میں ذات نبی کو شریک نہیں کرتا تو قرآن کا دستور یہی ہے کہ ذات نبوت کا پہلے ذکر کر دیتا ہے اور پھر مسلمانوں کو مخاطب کرتا ہے۔ مثلاً بدر میں فوجی تعاقب کو چھوڑ کر مسلمان مال غنیمت سمیٹنے اور قیدی گرفتار کرنے میں لگ گئے تو مسلمانوں کو یہ کہہ کر تنبیہہ کی تریدون عرض الدنیا لیکن ذات نبوت کا ما کان لنبی ان یکون لہ اسریٰ کہہ کر پہلے ذکر کر دیا اسی طرح عیر اور نفیر کے بارے میں صحابہ کے میلانات کا ذکر ان لفظوں میں کیا تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس سے پہلے کما اخرجک ربک من بیتک بالحق میں پرشکوہ طریقہ پر کیا اور بتادیا کہ اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم داخل نہ تھے۔ اسی سے جمہور امت کی رائے یہ قائم ہوئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چاہت وہ ہی تھی جو اللہ سبحانہ کی تھی یعنی عیر نہیں بلکہ مقابلہ نفیر سے ہونا چاہیے۔ اس واقعہ اور حقیقت کے باوجود خبر نہیں مولانا شبلی عالمانہ روش سے ہٹ کر جذبات میں کیوں بہ گئے

سوال یہ ہے کہ آپ ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا

جواب ہو گا میں تو اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔ (سیرۃ النبی جلد اول)
واقعہ کی وہ نوعیت نہیں جو مولانا شبلی پیش کر رہے ہیں۔ واقعہ کی نوعیت وہ ہے جسے ہم نے بصراحت پیش کیا ہے اور جسے تسلیم کرنے کے بعد شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ واقعہ کا چہرہ خود داغدار بنایا جائے اور اپنے لگائے ہوئے داغوں پر سوالات قائم کر کے دوسروں کو پریشان کیا جائے۔ یہ کوئی علمی کارنامہ نہیں ہے۔

مولانا شبلی کا ایک بے جان شبہ

مولانا شبلی نے اپنے اس موقف پر کہ حضور اقدس ﷺ اور صحابہ عیر کے لیے نہیں بلکہ مدینہ ہی سے جنگ کے ارادے سے تشریف لے گئے تھے۔
قرآن کی اس آیت:
لایستوی القاعدون من المومنین غیر اولی الضرر والمجاھدون فی سبیل اللہ باموالھم و انفسھم سے عجیب استدلال کیا ہے۔
ان کا کہنا ہے۔
صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل کیا ہے یعنی وہ لوگ جو بدر میں شریک نہیں ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے برابر نہیں۔ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے۔ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے غیر اولی الضرر کا جملہ نہ تھا۔ یہ آیت سن کر عبداللہ ابن ام مکتوم رض آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے اندھے پن کا عذر کیا اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا غیر اولی الضرر۔ یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔ (سیرۃ النبی)
بے شک صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے یعنی وہ لوگ جو بدر میں شریک نہیں ہوئے وہ ان کے برابر نہیں ہو سکتے جو بدر میں شریک ہوئے۔ یہ عبداللہ بن عباس رض کی بیان فرمودہ تشریح ہے۔ آیت کا سبب نزول نہیں ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود بدر میں دو سال کے تھے۔ ان کے والد محترم بدر کے قیدیوں میں تھے جن کی تفصیل پہلے سن چکے ہو اس لیے اس بیان کا تعلق واقعہ سے نہیں۔ یہ ایک تفسیری توضیح ہے۔
اور یہ بھی صحیح ہے کہ صحیح بخاری میں یہ ہے کہ پہلے آیت میں غیر اولی الضرر نہ تھا۔ عبداللہ بن ام مکتوم رض

خدمت اقدس حاضر ہوئے اور اپنے نابینا ہونے کا عذر پیش کیا اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا۔

ان دونوں باتوں کو جوڑ دینا اور اس فن کاری کے ذریعے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ:

قافلہ پر حملہ کرنا نہیں ہے۔

ہاتھ کی صفائی ہے۔ کیونکہ اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق دو صحابہ سے روایات آئی ہیں ایک زید بن ثابت دوسرے براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ سے اور یہ دونوں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ اور دونوں اس آیت کا شانِ نزول غزوہ بدر نہیں بتاتے۔ لیجئے آپ بھی سن لیجئے۔

زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس آیت کا املا کرایا لا یستوی القاعدون تو عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ آگئے۔ حضور املا کرا رہے تھے۔ عبداللہ بولے یارسول اللہ خدا کی قسم اگر مجھ میں جہاد کی استطاعت ہوتی تو میں ضرور آپ کی ہمرکابی کرتا۔ یہ بیچارے نابینا تھے اسی وقت غیر اولی الضرر کی استثناء نازل ہوئی اس نزول کے وقت آپ کا گھٹنا میرے گھٹنے پر تھا میں کہہ نہیں سکتا کہ مجھ پر کیا بیتی۔ اتنا بوجھ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ میرا گھٹنا چکنا چور ہو جائے گا۔

براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ کی روایت بھی صحیح بخاری میں ہے۔

براء کہتے ہیں کہ جب آیت قرآنی لا یستوی القاعدون نازل ہوئی تو حضورؐ نے زیدؓ کو کتابت کے لیے بلایا زیدرضؓ نے یہ آیت لکھی۔ عبداللہ ابن مکتومؓ آگئے۔ انھوں نے بارگاہ رسالت میں نابینا ہونے کی شکایت کی تو غیر اولی الضرر کا فقرہ نازل ہوا۔

ان دونوں روایتوں میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ نزول آیت کے سلسلے میں بدر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ان دونوں روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد امام بخاری نے عبداللہ ابن عباسؓ کا یہ تفسیری نوٹ پیش کیا ہے کہ:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے کہ بدر میں شرکت نہ کرنے والے بدر میں شرکت کرنے والوں کے برابر نہیں ہیں۔

یعنی اس آیت میں بتائے ہوئے ضابطہ کا یہ بھی مصداق ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ آیت کا پس منظر غزوہ بدر ہے۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ کے اس تفسیری نوٹ کی شارحین بخاری نے وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ عام قاعدہ ہے کہ اگرچہ آیت قرآنی کا تاریخی پس منظر کوئی واقعہ ہو لیکن اس آیت کے مدلول اور مفہوم کا جو حالات مصداق بن سکتے ہیں صحابہ کرامؓ ان سب

کا ذکر کر دیتے ہیں۔ حافظ عسقلانی نے مشہور شارح بخاری ابن التین کا تاثر بتایا ہے۔

القرآن ینزل فی الشئ و یشتمل علی ما فی معناہ

مولانا شبلی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تفسیری نوٹ کو بطور واقعہ پیش کیا اور دوسری روایات سے جن میں بدر کا ذکر نہیں۔ عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی کہانی کو لے کر دونوں کی پیوندکاری کر دی اور فیصلہ فرمادیا —— پتہ چل گیا کہ مدینہ ہی میں علم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں ہے۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی حالانکہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں یہ بات بھی صحیح ہے کہ :

۱۔ لایستوی القاعدون کا سبب نزول غزوہ بدر کا واقعہ نہیں ہے۔ جیسا کہ بخاری کی دو روایتوں سے معلوم ہوا اور یہ بھی صحیح ہے کہ :

۲۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفسیر کے مطابق بدر میں حصہ لینے والے اور نہ لینے والے برابر نہیں ہیں۔

ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے —— مولانا شبلی نے دونوں میں تضاد پیدا کر دیا۔

مولانا شبلی کا ایک انوکھا استدلال

مولانا نے قرآن کی یہ آیت نقل کی ہے۔

ولاتکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا و رئاء الناس —— اور اس کو بنیاد بنا کر اس پر عمارت یہ اٹھائی ہے کہ :

اگر قریش صرف قافلہ تجارت کو بچانے کے لیے نکلتے تو خدا کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان دکھاوے کے لیے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔

یہ بھی مولانا کا عجیب استدلال ہے اس لیے کہ جن روایات میں یہ ہے کہ کفار قریش قافلہ تجارت کو بچانے کے لیے نکلے۔ ان ہی روایات میں یہ بھی بصراحت موجود ہے کہ جب ابوسفیان نے قاصد کے ہاتھ لکھا کہ ہم مسلمانوں کی زد سے بچ گئے۔ تم اب واپس مکہ چلے جاؤ۔ ابوجہل نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اب تو ہم مسلمانوں کا صفایا کر کے ہی جائیں گے۔ اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے کفار قریش کو بدر کی جانب اس نخوت کے ساتھ پیش قدمی پر ابھارا تھا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ قریش جنگ پر تلے بیٹھے تھے اور اس کے لیے مصارف کی تجویز یہ سوچی گئی کہ اہل مکہ کے پاس جو سرمایہ ہے وہ شام جانے والے قافلے کے حوالے کر دیا جائے اور اس سفر تجارت میں جتنا منافع ہو وہ پورے کا پورا مسلمانوں کے خلاف سروسامان جنگ کی تیاری میں صرف کیا جائے یہی تجارتی قافلہ تھا جس میں حافظ عسقلانی کی تصریح

کے مطابق ایک ہزار اونٹ تھے اور پچاس ہزار دینار کا سامان تجارت تھا اور بقول مولانا شبلی نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بر کاروبار تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں ان کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا۔ ابن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بر ابوسفیان جو قافلہ کا سردار تھا۔ اس کے حوالہ سے لکھا ہے۔

واللہ ما بمکۃ من قرشی ولا قرشیۃ لہ نش وصاعداً الا بعث بہ معنا مکہ میں کوئی مرد اور عورت ایسی نہ تھی جس کا حصہ اس میں نہ ہو۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں۔

ہمارے مورخین کو اسباب و نتائج کی جستجو نہیں ہوتی اس لیے انھوں نے اس واقعہ کو محض واقعہ کی حیثیت سے لکھ دیا لیکن ان کو احساس نہیں ہوا کہ مکہ کو تمام سرمایہ اگل دینے کی کیا ضرورت تھی۔

نہ صرف مؤرخین و محدثین نے ان اسباب و نتائج سے بحث کی ہے بلکہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن ہی نتائج کے پیش نظر اس قافلہ کو روکنے کی کوشش فرمائی۔ مکہ سے روانگی کے وقت بھی اور شام سے واپسی کے وقت بھی اسی تجارتی قافلے کے روکنے کو مولانا شبلی لوٹ اور ڈاکہ فرما رہے ہیں۔ کیا دو حکومتوں میں کشیدگی پر ہر فریق دوسرے کو نقصان پہنچانے کا حقدار نہیں ہوتا۔ کیا کوئی ذی ہوش سیاستدان یہ جانتے ہوئے کہ یہ سب کچھ ہمارے خاتمہ کی پلاننگ ہو رہی ہے سب سے پہلی ضرب اس پر نہ لگائے گا۔ مکہ سے ابو جہل اسی قافلہ کی حفاظت کے لیے آیا تھا اور جب قافلہ مسلمانوں کی زد سے محفوظ ہو کر نکل گیا تو ابو جہل کامیابی کے نشہ میں مخمور ہو کر واپسی کے لیے تیار نہ ہوا اور بول پڑا کہ اب تو ہم یہاں جشن منا کر جائیں گے اور اسلام کا خاتمہ کر کے رہیں گے اسی نشہ میں مخمور حالت کا قرآن اس آیت میں ذکر کر رہا ہے اور

خوشتر آن باشد اسر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

صحابہ کو بتایا جا رہا ہے کہ تم میں متقیانہ سیرت ہو۔

حدیث کعبؓ اور مولانا شبلی

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث جو اسناد و روایت کے اعتبار سے اونچا مقام رکھتی ہے اور مضمون کے لحاظ سے مولانا شبلی کے اس موقف پر ضرب کاری ہے۔

حدیث یہ ہے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا۔ بجز غزوہ تبوک کے۔ اور ہاں غزوہ بدر میں بھی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اور جو اس میں شریک نہیں ہوا تھا اس پر کوئی عتاب نہیں ہوا۔ کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے لیے گئے تھے کہ اچانک خدا نے دونوں فریق کو جمع کر دیا۔ (صحیح مسلم)

مولانا نے اس روایت پر سب سے پہلے یہ تنقید کی ہے کہ سارے دفتر حدیث میں اس کی مؤید کوئی حدیث نہیں ہے۔ حالانکہ صورتحال بالکل اس کے برعکس ہے۔ اس حدیث کی دوسری روایات سے بھی تائید ہوتی ہے مثلاً آپ پہلے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث پڑھ آئے ہیں جسے حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حافظ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ اس میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اول مدینے سے ابوسفیان کے قافلہ کے لیے نکلے اور جب ایک یا دو دن کی مسافت پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کفار مکہ کا لشکر مقابلہ کے لیے آرہا ہے تب آپ نے پھر مشورہ کیا۔ اور اسی مشورہ میں کچھ مسلمانوں نے جنگ کے حق میں گرانی کا اظہار کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذخیرہ حدیث میں حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے علاوہ کوئی روایت اس کو ظاہر نہیں کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کے لیے نکلے تھے۔

حدیثِ کعبؓ پر مولانا شبلی کا ایک اور شبہ

مولانا نے حدیث کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک اور شبہ بھی کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ کعب بن مالکؓ کی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کے بھی خلاف ہے جو صحیح مسلم اور مصنف ابن ابی شیبہ میں آئی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ابوسفیان کے قافلہ کی آمد کا علم ہوا تو آپ نے مشورہ کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تقریر کی آپ نے توجہ نہ کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تقریر کی آپ نے توجہ نہ کی۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور بولے یارسول اللہ کیا آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے یعنی انصار کی طرف خدا کی قسم کہ اگر ہم کو سمندر میں گھس جانے کا آپ حکم دیں گے تو سمندر میں کود پڑیں گے۔

اس کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں کہ:

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت آپ نے

مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی اس بنا پر یہ ثابت ہوگیا کہ اس غزوہ میں شرکت کے لیے آپ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی"

مگر مولانا کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ اس روایت میں راوی نے بہت بڑی غلطی کی۔ وہ یہ کہ اس نے انصار مقررین میں سے سعد بن عبادہ کا نام لیا ہے۔ حالانکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ "حضرت سعد بن عبادہ ﷜ کی تقریر نہیں بلکہ حضرت مقداد ﷜ کی تھی اور یہی صحیح ہے۔ سعد بن عبادہ نے اسی قسم کی تقریر حدیبیہ میں کی تھی، جس کا ذکر روایات میں بکثرت موجود ہے۔ اصل میں راوی سے غلط ہوگیا ہے۔ اور حدیث کے ابتدائی جملوں میں بھی راوی سے غلط ہوگیا کہ مدینے کے ابتدائی مشورے اور وادی ذفران کے مشہور تاریخی مشورے میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ اس بات کی حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں نشاندہی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

اور مسلم میں ہے کہ سعد بن عبادہ ﷜ نے وہ تقریر کی جو مقداد کی طرف منسوب ہے اور اس پر اعتراض یہ ہے کہ سعد بن عبادہ ﷜ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے ہاں دونوں حدیثوں میں باہم مفاہمت اس طرح ہو سکتی ہے کہ دراصل بدر کے معاملہ میں دو بار مشورہ ہوا پہلا مشورہ ابوسفیان کے قافلہ کی خبر آنے پر اور دوسرا مشورہ ذفران میں مشرکین کے لشکر آنے پر۔ طبرانی میں ہے کہ سعد بن عبادہ ﷜ نے حدیبیہ میں تقریر کی تھی یہی درست ہے۔

رہا یہ سوال کہ انصار جب قافلہ کے لیے مدینے سے نکل چکے تھے تو وادی ذفران میں دوبارہ ان سے مشورہ لینے کی کیا ضرورت تھی۔ مدینہ میں انصار سے مشورہ اس لیے کیا گیا تھا کہ قافلہ کی خاطر جانے میں وہ بھی شریک ہونا چاہتے ہیں یا نہیں۔ وادی ذفران میں جنگ کی صورتِ حال پیش آنے پر دوبارہ ان سے مشورہ اس لیے کیا کہ انصار سے بیعت میں صرف یہ بات داخل تھی کہ صرف مدینہ میں آپ کی نصرت کریں گے۔ اب صورتحال بدل چکی تھی اور مدینے سے باہر وقت۔۔ کا سوال بن کر سامنے آگیا اس لیے آپ نے ان سے دریافت کیا۔ حافظ ابنِ حجر نے اس عقدہ کو فتح الباری میں واضح لفظوں میں کھولا ہے۔

حضور ﷺ کو انصار کی جانب سے اندیشہ تھا کہ غالباً وہ ہمنوائی نہ کریں گے کیونکہ انصار نے صرف مدینہ میں رہتے ہوئے نصرت کی بیعت کی تھی۔ مدینے سے باہر جا کر جنگ کے لیے بیعت نہ کی تھی۔

اس لیے اس نازک حالت میں انصار سے مشورہ ضروری تھا کہ اس حالت میں بھی وہ مدینے سے باہر معرکہ آرائی کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔ بہرحال بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی اور دیگر کتب حدیث میں مذکور غزوہ بدر سے متعلق روایات کے خلاف مسلم کی روایت انس کے آخری ٹکڑوں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اسی مشورے سے متعلق ہے جو وادی

ذفران میں مدینہ سے باہر ہوا تھا اور تمام صحیح روایات کے خلاف یہ راوی کا وہم ہے کہ اس نے پہلے ٹکڑے کے ساتھ دوسرے ٹکڑے کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ گویا یہ سب کچھ ابوسفیان کے قافلہ کے وقت ہی پیش آیا تھا اور اس پر بھی مستزاد یہ کہ اس روایت میں کفار قریش سے جنگ کا اشارۃً تک موجود نہیں ہے کہ مولانا کے لیے دلیل ہو سکے بلکہ ابوسفیان کے قافلہ ہی کا ذکر ہے اسی لیے مولانا کو اس روایت کے ٹکڑوں کو اپنے موافق بنانے میں تکلفات سے کام لینا پڑا ہے۔

حدیثِ کعبؓ پر مولانا کی انوکھی تنقید

حدیث کعبؓ پر مولانا شبلی نے یہ بے محل تنقید بھی کی ہے کہ :

چونکہ کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوہ بدر میں شریک نہ تھے اس لیے ان کی روایات اس موقعہ پر مشاہدہ واقفیت کی روایت نہیں۔

استدلال کے موقعہ پر یہ عجیب دلیل ہے۔ اس لیے کہ جب مولانا موصوف کا یہ دعویٰ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہی میں کفار قریش سے جنگ کے ارادے سے نکلے تھے۔ اور مدینہ ہی میں مشہور تاریخی مشورہ فرمایا تھا۔ تو کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ خواہ غزوہ بدر میں شریک نہ ہوئے ہوں لیکن مدینہ میں بہرحال موجود تھے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انصار و مہاجرین سے مشورہ فرمائیں اور موجودہ صحابہ شرکت نہ کریں۔ اس لیے حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کو مشاہدہ کی روایت نہ ماننا بالکل بے جوڑ بات ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ جنگ کے بارے میں مشورہ مدینہ سے باہر ذفران میں ہوا جیسا کہ جمہور کا خیال ہے اور جس کی مولانا شبلی نفی کر رہے ہیں تو بات میں کچھ جان پڑ سکتی ہے کہ اگر کعبؓ اس مشورے کے متعلق فرمائیں تو وہ مشاہدہ کی روایت نہیں ہے کیونکہ وہ غزوہ بدر میں شریک نہیں تھے۔

اور مولانا شبلی نے کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس واقعہ کی روایت سے ان کا مقصد یہ ہے کہ غزوہ بدر کی اہمیت کم ہو جائے۔

مولانا کا ایک صحابی کے متعلق یہ سوءِ ظن بھی قطعاً بے سند اور بے دلیل ہے اس لیے کہ حضرت کعب بدر کی اہمیت کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہی ان کو اس پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنی عدم شرکت کے لیے یہ معذرت پیش کریں کہ ان کو یہ سعادت اس لیے نصیب نہ ہو سکی کہ جب مسلمان مدینے سے نکلے تھے اس لیے سب کی شرکت ضروری نہیں تھی۔ تاہم جو نکلے ان کو وہ بے نظیر شرف ہاتھ آ گیا جس سے ہم محروم ہو گئے۔

ایک باریک نکتہ

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت میں ایک اور باریک نکتہ ہے جو مولانا شبلی کے دعوے کو بار بار رد کرتا ہے وہ یہ کہ حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس جانب بھی توجہ دلا رہے ہیں کہ اگر غزوہ بدر تبوک کی طرح مدینے کے اندر ہی طے ہوتا اور اس کے متعلق تبوک کی طرح مدینہ ہی میں مشورہ ہوتا اور حضور اقدس ﷺ مدینہ ہی سے جنگ کے لیے جاتے تو یہ ناممکن تھا کہ اس قدر اہم اور عظیم الشان غزوہ کے لیے نفیر عام نہ ہوتا اور جو لوگ جان چرا کر بیٹھ جاتے واپسی پر ان سے باز پرس نہ ہوتی۔ جبکہ غزوہ تبوک میں کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے دو رفقاء پر عدم شرکت کی وجہ سے عتاب اور سنگین باز پرس ہوئی۔ اور بدر میں ان پر عتاب نہ ہونا اور ان سے کوئی باز پرس نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ معرکہ بدر ارادی اور کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں بلکہ اتفاقی تھا بالکل اچانک بطور حادثہ پیش آگیا اور در حقیقت نبی اکرم ﷺ اور مسلمان مدینے سے "عیر" کے لیے نکلے تھے۔ غرض حضرت کعب رضی اللہ عنہ غزوہ بدر کی حیثیت کو کم کرنا نہیں چاہتے ہیں۔

پھر یہ عجیب بات ہے کہ مولانا شبلی تو یہ معلوم کر سکیں کہ قرآن ناطق ہے کہ نبی کریم ﷺ مدینہ ہی سے کفار قریش کے مقابلہ کے لیے نکلے اور بقول ان کے احادیث بھی یہی صراحت کر رہی ہیں لیکن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ پر ساری عمر یہ حقیقت آشکارا نہ ہوئی۔

کیا مولانا کے خیال میں کعب معاذ اللہ جان بوجھ کر اپنی برتری ظاہر کرنے کے لیے کذب بیانی سے کام لے رہے تھے یہ بات مولانا تو سوچ سکتے ہیں مگر میں تو اس کے تصور سے بھی کانپ جاتا ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیان سے غلط استدلال

اسی طرح مولانا مرحوم کا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس بیان سے استدلال صحیح نہیں ہے جس میں بدر کے واقعہ کا اس انداز میں ذکر ہے۔

> جب ہم مدینے آئے تو وہاں وہ پھل کھانے کو ملے جو ہمارے مزاج کے موافق نہ تھے اس سے ہم بیمار ہو گئے۔ حضور اقدس ﷺ بدر کے بارے میں دریافت کرتے رہے جب ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آ رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ بدر کو چلے۔ بدر ایک کنوئیں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

یہ روایت طویل ہے مگر اس میں ابتدائی واقعات کو نظر انداز کر کے صرف معرکہ کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اس میں نہ مدینے میں مشورے کا ذکر ہے نہ بعض مسلمانوں کی کراہت اور گرانی کا ذکر ہے۔ اور نہ مہاجرین وانصار کی ولولہ انگیز تقریروں کا اشارہ ہے۔ حتی کہ مسلمانوں کی تعداد اور بے سروسامانی کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ مہاجرین کی آمد کے وقت مدینہ کی ناموافق آب و ہوا کا ذکر کر کے بدر کے واقعہ کو شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ فاصلہ دو سال کا ہے۔ اور اس عرصہ میں بہت تاریخی واقعات ہوتے ہیں۔ یہ واقعات تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں مشہور ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت قافلہ کے ذکر سے خاموش ہے اور اس وجہ سے یہ دعویٰ کیا جائے کہ قافلہ کا وہاں مدینہ میں کوئی ذکر ہی نہ تھا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ سے روانگی قافلہ کے لیے نہیں ہوئی تو کیا اسی بنیاد پر تاریخ کے ان واقعات کا بھی انکار کیا جائے جو ان دو سالوں میں پیش آئے ہیں اور جن کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ذکر نہیں ہے حالانکہ قرآن اور حدیث کی کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔

روایت و درایت کا مسئلہ۔ انھوں نے کہا کہ جب ایک ہی واقعہ کے متعلق مفصل و مجمل دونوں قسم کی روایات ہوں تو ہمیشہ مجمل کی تشریح کے لیے مفصل کا سہارا لیا جائے گا۔

اسی وجہ سے ابن جریر نے اپنی تاریخ میں امام احمدؒ نے مسند میں ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور بیہقی نے دلائل میں بدر کی مفصل و مجمل روایات کے ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کا ذکر کیا ہے۔ اور محدثین کا یہی طریقہ ہے کہ موضوع سے متعلق سارا سرمایہ یک جا رکھ دیتے ہیں جس میں اجمال و تفصیل دونوں ہوتے ہیں۔ صرف اجمال کو لے لینا اور تفصیل کو اپنی غرض کی خاطر نظر انداز کر دینا محققانہ انداز نہیں ہے۔ بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت اگر قافلہ کے ذکر سے خاموش ہے تو دوسری روایات میں قافلہ کا ذکر موجود ہے کسی خاص روایت میں کسی واقعہ کا ذکر نہ ہونا یہ ہرگز اس کے عدم کی دلیل نہیں ہے۔

جہاں تک مولانا شبلی مرحوم کے دلائل نقلیہ کا ذکر ہے۔ مولانا نے اسی پر بس نہیں کی ہے بلکہ اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لیے کچھ عقلی دلائل بھی پیش کیے ہیں آیئے ان کا مطالعہ بھی کر لیجئے وہ فرماتے ہیں۔

انصار کیوں شریک ہوئے

ان کا سب سے پہلا وسوسہ یہ ہے کہ اگر مدینہ سے روانگی قافلہ کے لیے تھی تو انصار کیوں شریک ہوئے حالانکہ بدر سے پہلے جس قدر سرایا اس مقصد کے لیے گئے اس میں کبھی کوئی انصاری نہیں گیا۔

لیکن یہ استدلال درست نہیں ہے کیونکہ کاروان تجارت کا یہ معاملہ زیادہ اہم نہیں تھا اور دشمن میں مقابلہ کی تاب نہ

تھی اس لیے حضور اقدس ﷺ نے خیال فرمایا کہ جو مال غنیمت ملے اس میں انصار کا بھی حصہ ہو لیکن انصار کے معاہدہ کے پیشِ نظر اس بات کی ضرورت تھی کہ ان سے مشورہ لیا جائے کہ وہ جانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ کاروانِ تجارت کے سلسلے میں مدینے کے اندر مشورہ کیا گیا۔ جس میں انصار نے بخوشی رفاقت کو منظور کیا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں بتایا ہے کہ:

حضور اقدس ﷺ نے جب شام سے ابوسفیان کے کاروانِ تجارت کا حال سنا تو مسلمانوں کو کاروانِ تجارت کے لیے دعوت دی اور فرمایا کہ قریش کا تجارتی قافلہ سرمایہ سے بھرپور آرہا ہے اس کے لیے چلو شائد اللہ سبحانہ یہ مالِ غنیمت تمہیں عطا کر دے۔ لوگ تیار ہو گئے۔ بعض تو خوشی خوشی ساتھ ہو گئے اور بعض نے جانا اس لیے پسند نہیں کیا کہ ان کے خیال میں حضور ﷺ کسی جنگی مہم پر نہیں جا رہے تھے۔

اس روایت میں یہ الفاظ شائد تمہیں مالِ غنیمت ہاتھ آجائے اور یہ کہ ان کو لڑائی کا گمان نہ تھا صاف بتا رہے ہیں کہ انصار صرف اس لیے مدینے سے نکلے کہ ان کو جنگ کا کوئی اندیشہ نہ تھا اور مالِ غنیمت کی توقع تھی۔

قافلہ کو روکنے کے لیے بدر کیوں گئے

مولانا شبلی کو یہ بھی وسوسہ ہوا ہے کہ مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لیے شام جاتا تھا مدینے کے پاس سے گذر کر جاتا تھا۔ کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا۔ یہ بالکل خلافِ قیاس ہے کہ کاروانِ تجارت شام سے آرہا ہے، آپ بجائے شام کی طرف جانے کے مکہ کی طرف جا رہے ہیں۔

بلاشبہ اس شام سے آنے والے قافلہ کو جناب رسول اللہ ﷺ مدینے کے شمال یا مغرب میں روک سکتے تھے۔ لیکن شام سے اس کے نکلنے کی اطلاع موجودہ زمانہ نہیں تھا کہ تار یا ٹیلیفون پر وقت کے وقت مل جاتی۔ اونٹوں کے قافلہ کی اطلاع اونٹ سوار ہی دے سکتے تھے اور بمشکل دو ایک روز اوّل مدینے سے ساحل جانے میں دو تین دن ضرور لگ جاتے ہیں۔ ایک بڑا قافلہ بلاشبہ آہستہ آہستہ ہی چلتا ہے۔

بدر ایسا مقام تھا جو ساحل سے قریب بڑا مقام تھا۔ سارے قافلے وہیں سے گذرتے تھے۔ مکہ اور مدینہ کا قریب ترین مقام اتصال بھی وہی تھا اس کی توقع تھی کہ مسلمان اس کو وہاں جالیں گے۔ مغرب کی طرف ساحل کو جاتے تو قافلہ نکل جاتا۔ اور ہوا بھی یہی۔ یعنی قافلہ کی آمد سے بمشکل چند گھنٹے پہلے آپ بدر گئے۔ مقصد غیر معروف راستوں پر چل کر چکر لگا کر پہنچنا تھا۔ تاکہ حریف کو پتہ نہ لگ سکے — — — —

بدر کے قریب پہنچ کر متعدد سانڈنی سوار بھیجے تاکہ اس کا پتہ چلائیں کہ قافلہ کہاں ہے جو سانڈنی سوار شمال مغرب میں شام کے راستے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے واپس آکر غالباً حضور اقدس ﷺ کو یہ اطلاع ضرور دی ہوگی کہ قافلہ اب آیا ہی چاہتا

ہے اور اس اطلاع پر یہ خیال کر کے کہ قافلہ بدر سے گذرے گا۔ حضور اقدس ﷺ نے عین راستہ کی وادی کے مدخل کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ قافلے کو اطلاع مل گئی تھی کیونکہ خود شام کو جاتے وقت مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ اس سے پہلے چھ سات قریشی قافلوں کو بھی تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لیے قافلہ چوکنا تھا۔ قافلے عموماً رات کو چلتے ہیں اور صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر آرام کرتے ہیں۔ بدر کی خطرناک وادی سے قریش واقف تھے اسی لیے پہنچنے سے کافی مسافت پہلے قافلہ رک جاتا ہے اور ابو سفیان ٹوہ لینے نکلتا ہے۔

بہرحال کسی کارروائی کے لیے بدر کا انتخاب پوری تنظیم سے ہوا تھا یہ بات کہ چونکہ شام کی طرف نہیں گئے اس لیے پیش نظر قافلہ نہیں دلیل اور واقعات کی ترازو میں بے وزن ہے۔ اور جب ارادہ الٰہی یہ ہو چکا تھا کہ بدر میں معرکہ حق و باطل اس طرح برپا ہو تو تقدیر الٰہی کے سامنے ساری انسانی تدبیریں بیکار ہو جاتی ہیں۔

آخر یہ معذرت آمیز انداز کیوں؟

اصل میں کسی بھی معاملے کے متعلق معذرت آمیز انداز اختیار کرنا ضعف موقف کا نشان ہوتا ہے اور جب موقف ضعیف اختیار کر لیا جائے تو اسے دلائل کے زور سے اور الفاظ کی فراوانی سے مستحکم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر جب مسئلہ کے بنیادی حقائق آفتاب جہاں تاب کی طرح درخشاں ہوں تو ان کی طرف سے آنکھیں بند کر کے معذرت کا پہلو اختیار کرنا سراسر حیرت افزا ہے۔

بات یہ ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے آرنلڈ کی رہنمائی میں یا اس کی تقلید میں اس واقعہ کا تمام نقشہ جمہور امت کے خلاف اس لیے پیش کرنے کی کوشش کی کہ وقت کے عیسائی مستشرقین کے اس اعتراض سے مرعوب ہو گئے تھے کہ قافلہ کا لوٹنا انتہائی معیوب بات ہے لہٰذا جو شخص نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے وہ ایسا کردار کیسے پیش کر سکتا ہے حالانکہ یہ بات مرعوب ہونے کی اور معذرت پیش کرنے کی نہ تھی بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ تاریخی حقائق کی روشنی میں بتایا جاتا کہ کاروان تجارت کو روکنا اس وقت کی سیاسی حکمت عملی تھی۔ اور اس حکمت کا اختیار کرنا جنگی نقطہ نظر اور مسلمانوں کے بقاء و تحفظ کے لیے ناگزیر تھا۔۔۔۔

صورتحال یہ تھی کہ حضور اقدس ﷺ اور مسلمان مکہ چھوڑ کر مدینہ آ گئے تاکہ اطمینان سے دین حق کی تبلیغ کریں لیکن قریش کی عداوتوں نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ قریش نے سب سے پہلے عبداللہ بن اُبی اور اس کے ہمنواؤں سے ساز باز کی۔ ابوداؤد میں ہے:

نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو بدر کے واقعہ سے بہت پہلے کفار قریش نے عبداللہ ابن ابی

اوراس کے بت پرست ساتھیوں کو جواوس و خزرج میں باقی رہ گئے تھے یہ لکھا ہے کہ تم نے ہمارے صاحب کو پناہ دی ہے اور ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم ان سے لڑو یا ان کو نکال دو ورنہ ہم سب تم پر چڑھ آئیں گے اور تمہارے جوانوں کو قتل کر دیں گے اور تمہاری عورتوں کو باندیاں بنالیں گے لے

پھر معاملہ صرف دھمکیوں تک نہیں رہا بلکہ تجارتی قافلوں کی آڑ میں یہود مدینہ سے برابر مسلمانوں کے استیصال کے لیے ساز باز کرتے رہے اور صرف یہی نہیں بلکہ کاروان تجارت کا نصب العین ہی اسلام کا خاتمہ اور مسلمانوں کا استیصال بن گیا ـــــ ایسی حالت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے تھا دشمن کو اپنے خلاف اور اپنے استیصال کے لیے سازش کُنے مقابلہ کی تیاریوں میں مشغول رہنے . کاروانِ تجارت کے ذریعے مدینہ میں مقیم دشمنوں کے ساتھ مشرکین کو معاندانہ خط و کتابت جاری رکھنے اور کاروانِ تجارت کے ذریعے اپنی تباہی کے لیے سرمایہ فراہم کرنے اور اس سے سامان جنگ خریدنے کے لیے آزاد چھوڑ دینا اور اس طرح ہمیشہ کے لیے اپنی موت کو دعوت دینا یا ان تمام ذرائع پر ضرب کاری لگانا اور اس فتنہ کا سر کچل دینے کی کوشش کرنا ۔!

اب سوچئے کہ آپ کیا کریں گے ؟ اس سوال کا جواب اس کے سوا کیا ہے کہ وہی کچھ کریں گے جو اس وقت مسلمانوں نے کیا ۔ عقل تدبیر اور سیاست کا تقاضا یہی ہے ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے مشرکین کی تجارت کو روکنے کے لیے سب سے پہلے حضرت حمزہ کو تیس سواروں کے ساتھ عیص کی جانب ساحل بحر پر روانہ کیا ان کی مڈبھیڑ قریش مکہ کے تین سو سواروں سے ہو گئی ۔ ابوجہل قیادت کر رہا تھا لیکن لڑائی نہ ہوئی ۔ بہر حال یہ فوجی دستہ کاروان تجارت کو روکنے کے لیے نکلا تھا ۔ زرقانی علی المواہب میں ہے ۔

مسلمانوں کا یہ دستہ قریش کے کاروان تجارت کو روکنے کے لیے نکلا ۔ جو شام سے مکہ جا رہا تھا یعنی مسلمان چاہتے تھے کہ جس مقصد کی خاطر ان تجارتی قافلوں کی حرکت ہے ان پر غلبہ کر کے اس مقصد کو پورا نہ ہونے دیں ۔ ۲

اور ابوسفیان کے جس کاروانِ تجارت کے واقعے سے بدر کے معرکہ کا تعلق ہے اس کے متعلق تو تمام ارباب سیر و تاریخ ایک زبان ہیں کہ قریش میں اہل ایمان کے استیصال کے لیے جوش و خروش اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ جب ابوسفیان کا کاروان تجارت مکہ سے چلا ہے تو کوئی قریشی مرد اور عورت ایسی نہ تھی جس نے اس میں حصہ نہ لیا ہو اور اپنا سرمایہ قافلہ کے سپرد نہ کیا ہو ۔ زرقانی میں ہے ۔

کاروانِ تجارت کے ساتھ پچاس ہزار دینار تھے ۔

لہ ابوداؤد

۲ زرقانی علی المواہب ج ا

اور ہر قریشی مرد و عورت جس کے پاس ایک مثقال سونا تھا اس کا سرمایہ اس میں موجود تھا۔
ابوسفیان کا یہ تجارتی کارواں صرف کاروان تجارت نہیں بلکہ جنگ کی تیاری کے لیے بس کی گانٹھ کی حیثیت رکھتا تھا۔
اس سے حرب و ضرب کا سامان خریدنا اور اس سامان کے ذریعے مدینہ پر حملہ کرنا تھا اس کا اندازہ ابوجہل کی اس تقریر سے
ہوتا ہے جو اس نے قافلہ کے خطرہ میں آنے کی خبر کے بعد اہل مکہ کے سامنے کی۔

بچاؤ، بچاؤ انتہائی ذلت اور دشواریوں کا سامنا کر کے بھی بچاؤ۔ کاروان تجارت صرف کاروان نہیں بلکہ تمہارے مال و دولت کا خزانہ ہے اگر محمد ﷺ اس پر قابض ہو گئے تو تم ہمیشہ کے لیے ناکام و نامراد ہو جاؤ گے۔

کیا ابوجہل کا یہ خطرہ صرف کاروان تجارت کے لٹ جانے پر ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ دراصل وہ جانتا تھا کہ یہ کاروان تجارت نہیں بلکہ سامان جنگ کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی حفاظت کے لیے آج کی مہذب اور متمدن دنیا میں فیصلہ کن لڑائیاں ہوتی ہیں۔

خدا لگتی اور انصاف کی کہیے کہ اس قسم کے کاروان تجارت کو کسی حکومت کا روک دینا اور اس کے خلاف فوجی کارروائی کرنا کونسا گناہ ہے، جس کے لیے ہم دوسروں کی ہرزہ سرائی سے مرعوب ہو کر حقائق کا انکار کریں۔

یہ عوام کا قافلہ کو لوٹنا نہیں بلکہ یہ اسلامی حکومت کی کفر کی حکومت کے خلاف فوجی کارروائی ہے۔ اس میں قانونی، سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے کوئی قباحت نہیں ہے۔

اب آخر میں صرف ایک سوال پر میں اس ساری بحث کو ختم کرتا ہوں کہ اگر معرکہ بدر میں ابتدا ہی سے بذریعہ وحی مدینہ میں بتا دیا گیا تھا کہ مشرکین سے تمہیں جنگی مقابلہ کرنا ہے اور قافلہ پر حملہ کرنے کا تصور ہی گناہ عظیم اور شان اسلام کے خلاف ہے تو قرآن ہی نے اس تصور کی احدی الطائفتین کہہ کر حوصلہ افزائی کیوں کی اور کیوں صاف صاف یہ نہیں کہہ دیا کہ اللہ سبحانہ ایک لمحہ کے لیے بھی تم کو قافلہ پر قابو پانے کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کا تصور ہی گناہ عظیم ہے تو کیا قرآن عزیز کا احدی الطائفتین۔ کا اس طرح ذکر کرنا اس بات کی کھلی گواہی نہیں ہے کہ معرکہ بدر سے قبل چند اکابر کی یہ جماعت قافلہ کے لیے نکلی تھی مگر اچانک جب کفار مکہ سے سابقہ پڑا اور مسلمانوں کی بے سروسامانی دیکھ کر قافلہ پر قبضہ کرنا چاہا تو اللہ تعالے نے اول یہ وعدہ دیا کہ ان دونوں عیر و نفیر میں سے ایک ضرور تم کو دیں گے۔ اور پھر حضور اقدس ﷺ کو بذریعہ وحی بتا دیا کہ اللہ سبحانہ کی مرضی یہ ہے کہ وہ اب قافلہ کی بجائے معرکہ حق و باطل میں مسلمانوں کو کامیابی عطا کر کے ہمیشہ کے لیے تاریخ ظلم کا رُخ عدل کی جانب پھیر دینا چاہتا ہے۔

بہرحال قرآن عزیز، حدیث اور تاریخی حقائق کی روشنی میں معرکہ حق و باطل غزوہ بدر کے متعلق جمہور علمائے

اسلام کا مسلک ہی صحیح ہے اور بلاشبہ واقعات کی صحیح و مستند تفصیلات کسی طرح بھی شان نبوت کے خلاف نہیں اور نہ علم الاخلاق علم الاجتماع اور حق و صدق پر مبنی سیاسیات مدن کے منافی ہیں۔ ھذا ھو الحق والحق احق ان یتبع۔

اگرچہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کا بھی یہی موقف ہے لیکن ہم نے مولانا شبلی کے بیان کردہ دلائل کا جائزہ لیا ہے۔ دوسرے بزرگوں نے جو راہ اپنائی ہے وہ مولانا شبلی ہی کی بتائی ہوئی ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

آمین یارب العالمین

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا
لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ
اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى
قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۷۲
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ
تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۝۷۳ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ
اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ
وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۷۴ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَ
جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ
ربع ع ۱۰ / ۶ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۷۵

جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا۔ اور جن لوگوں نے (مہاجرین کو (مدینہ) میں جگہ دی اور ان کی مدد کی یہی لوگ باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور وہ لوگ جو نعمتِ ایمان سے مالا مال ہوئے مگر انھوں

نے ہجرت نہیں کی تو ان سے تمہاری رفاقت کا کوئی علاقہ نہیں جب تک وہ ہجرت کر کے
نہ آئیں۔ ہاں اگر دین کے بارے میں وہ تم سے مدد کے خواہاں ہوں تو بلاشبہ تم پر ان کی
مددگاری لازم ہے۔ لیکن اگر وہ کسی ایسی قوم کے خلاف تم سے مدد کے خواہاں ہوں
جن سے تمہارا عہد و پیمان ہے (تو پھر تم مدد نہیں کر سکتے) اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس
کو دیکھ رہا ہے۔ ۹۰ اور جنھوں نے راہ کفر اختیار کی وہ باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں
اگر تم ایسا نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ اور بہت بڑی گڑبڑ رونما ہو جائے گی ۹۱ اور وہ لوگ
جو ایمان کی حالت میں ہجرت اور راہ خدا میں جہاد کا فرض ادا کر چکے ہیں یہی پکے اور
سچے مسلمان ہیں ان کے لیے بخشش اور عزت و آبرو والی روزی ہے ۹۲ اور وہ لوگ جو
اس کے بعد نعمت ایمان سے مالا مال ہوئے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمہاری ہمرکابی
میں جہاد کیا وہ بھی تم ہی میں سے ہیں۔ اور رشتہ دار اللہ کی کتاب میں باہم زیادہ حقدار
ہیں۔ بلاشبہ اللہ کو سب باتوں کا پورا پورا علم ہے ۹۳۔

معانی مفردات

ھاجروا یہ باب مفاعلۃ سے ماضی کا جمع مذکر غائب ہے۔ یہ ہجر سے بنا ہے۔ اسی سے فعلۃ کے وزن پر ہجرۃ آتا ہے۔ ہجر کے معنے چھوڑ دینے کے ہیں امام راغب لکھتے ہیں۔ الھجر والھجران مفارقۃ الانسان غیرہ اما بالبدن او باللسان او بالقلب یعنی ہجر نام ہے انسان کا کسی بدن زبان اور دل سے جدائی اختیار کر لینا قرآن وسنت کی زبان میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت وصداقت کے کسی مقصد اصل کے لیے اپنی دنیوی محبوبات ومالوفات کو ترک کر دے مثلاً دولت کو آرام کو عزیز واقربا کے قرب کو تو اس کا نام ہجرت ہے۔ خدا کے ہر رسول اور ان کے پیرووں کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑتی ہے۔ انی مہاجر الی ربی۔ چونکہ وطن ومکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل وعیال مال ومتاع دوست واحباب ہر طرح کے علاقوں کو ترک کرنا پڑتا ہے

اس لیے ترکِ وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہوئی۔ اور زیادہ تر ہجرت کا اطلاق تارکین وطن ہی پر ہوا۔

جاھدوا باب مفاعلۃ سے ماضی کا جمع مذکر غائب ہے۔ جہاد اور مجاہدہ اس کا مصدر آتا ہے۔ جہد سے بنا ہے اس کے معنے امام راغب نے استفراغ الوسع فی مدافعۃ العدو ظاھرا و باطنا لکھے ہیں یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کو دور کرنے میں انتہاء درجہ کی کوشش کرنا۔ یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے مال سے بھی اور جان سے بھی ہوتی ہے۔ جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

آوَوا یہ باب افعال سے ماضی کا جمع مذکر غائب ہے اس کا مصدر ایواء ہوتا ہے۔ یہ آوی سے بنا ہے اسی سے ٹھکانے کے معنے میں ماوی آتا ہے اوی یاوی باب ضرب سے ہے ولایۃ یہ بھی مصدر ہے بالکسر سیاست کے ہم وزن اور ہم معنے ہے علامہ آلوسی لکھتے ہیں۔ ولایۃ السلطان اور زجاج نے بھی بالکسر کے معنے امارۃ کے بتائے ہیں۔ فعالہ بالکسر کا وزن اسموں میں محیط و شامل کے لیے جیسے عمامہ اور مصادر میں صنعتوں کے لیے آتا ہے جیسے کتابۃ خیاطۃ وغیرہ اور ولایت بالفتح فعالہ کے وزن پر مدد اور سازگاری اور رفاقت کے معنے میں آتا ہے۔ نسب کے تعلقات پر ولایت بولا جاتا ہے۔

اولوا الارحام۔ دونوں لفظ جمع ہیں اولو ذو کی جمع ہے ارحام رحم کی جمع ہے رحم عورت کے پیٹ کا وہ حصہ جس میں بچہ ہوتا ہے یعنی بچہ دانی اور مجازاً قرابت کے معنے میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ اہل قرابت ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔ زیادہ ماں کے پیٹ سے تعلق رکھنے والے رشتوں پر بولا جاتا ہے۔ اور فرائض کے فن میں اولوالارحام وہ رشتہ دار کہلاتے ہیں جن کا قرآن نے فرضاً حصہ نہ بنایا ہو اور جو عصبہ نہ ہوں یہ دس قسمیں ہیں۔ ماموں۔ خالہ۔ ماں کا دادا۔ ماں کے بھائی کا بیٹا۔ بیٹی کا لڑکا۔ بہن کا لڑکا۔ بھائی کی بیٹی چچا اور چچی کی بیٹی۔ ماں کا چچا۔

اولیٰ زیادہ اوفق، زیادہ مستحق۔ اسم تفضیل ہے۔ اگر ولی سے ہو تو اس کے معنی زیادہ قریب کے ہیں اور اگر ولایت سے ہو تو اس کے معنی زیادہ مستحق کے ہیں۔ ولی کے اصلی معنے پے در پے اور مسلسل واقع ہونے کے ہیں۔ اسی لحاظ سے قریب ہونے کے معنے میں یہ استعمال ہوتا ہے اس کا صلہ جب لام آئے تو یہ ڈانٹ اور دھمکی کے لیے آتا ہے۔

تعمیرِ ملت کا سنگِ بنیاد

زمانۂ نبوت میں مسلمان چار قسموں میں منقسم تھے۔

۱۔ مہاجرین اولین وہ لوگ جو ترکِ وطن کر کے صلح حدیبیہ سے [illegible] تک مدینہ طیبہ کی اسلامی حکومت میں آئے۔

۲۔ مدینہ طیبہ کے اصلی مسلمان باشندے جو انصار کے نام سے مشہور ہوئے۔

۳۔ وہ مسلمان جنہوں نے ہجرت کی سعادت حاصل نہیں کی۔
۴۔ وہ مسلمان جنہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ ہجرت کی۔

ان آیات قرآنی میں ان چاروں کا چہرہ اوران کے قانونی روابط اوران کے احکام بیان ہورہے ہیں اور ساتھ ہی اس مواخات کا بھی ضمنی تذکرہ ہے جو حضور اقدس ﷺ نے مدینہ میں مسلمانوں میں قائم فرمائی تھی۔ حافظ عسقلانی نے حافظ ابن عبدالبر کے حوالے سے یہ انکشاف کیا ہے کہ مواخات دوبار ہوئی۔ ایک مکہ میں دوسری مرتبہ مدینہ میں مکہ میں جو مواخات ہوئی تھی وہ صرف ان مسلمانوں کے درمیان تھی جو یہیں مقیم تھے۔ اور مدینہ میں جو مواخات ہوئی وہ مہاجرین اور انصار کے مابین ہوئی۔

حافظ عسقلانی ہی نے ابوالقاسم السہیلی کے حوالہ سے فتح الباری میں مواخات کا پس منظر یہ بتایا ہے۔

حضور اقدس ﷺ نے انصار و مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ اس لیے قائم کیا تاکہ مسافر مہاجرین میں سے مسافر ہونے کا احساس ختم ہو اور گھر بار اور خاندان کی جدائی کا غم غلط ہو اور باہم ایک دوسرے کا سہارا اور ایک دوسرے کے غم خوار بن کر رہیں۔

یعنی دراصل مہاجرین کا تعلق مکہ سے تھا۔ ان میں سے اکثریت کی تعلیم و تربیت ہو چکی تھی۔ وہ مصائب کے ان خوفناک طوفانوں میں زندگی گذار چکے تھے جن کا ایک معمولی سا ریلا بھی انسان کو زیادہ سے زیادہ بلند ہمت اور پختہ کار بنا دینے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ وہ خوددار اور غیور انسان تھے۔ حوصلے فلک بوس۔ عزائم مستحکم مقاصد کی قدر و قیمت پر یقین کامل۔ ایسے لوگوں کے سامنے زندگی کا کوئی نقشہ بھی آجاتا۔ انہیں اپنے لیے مناسب مقام پیدا کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ انسانی زندگی کا جو نظام وہ بروئے کار لانا چاہتے ہیں اسے ہر حال میں کامیاب ہونا چاہیے اور عالم انسانیت کے لیے خیرات و برکات کی بہاروں کے ایک ایسے مبارک دور کا آغاز ہو جائے گا جس کی کوئی نشانی اس وقت تک تاریخی یادداشتوں میں نہ تھی۔ ان کی ذاتی ضرورتیں اس درجہ قلیل و مختصر تھیں کہ کوئی بھی حالت پیش آجاتی انہیں قطعاً پریشانیوں سے سابقہ نہ ہوتا وہ اس غرض سے گھر بار اور املاک چھوڑ کر نہیں آئے تھے کہ نئی سرزمین میں پہنچتے ہی ویسی ہی املاک مل جائیں گی البتہ وہ ہر خطے کے آدمیوں کو جلد سے جلد حقیقی انسان بنتے دیکھنے کے لیے یقیناً مضطرب و بے قرار تھے اور اسلام کا مقصد یہی تھا۔ اس کے سوا کچھ نہ تھا۔

اگرچہ انصار کو اسلام سے وابستگی اختیار کیے ہوئے مختصر سی مدت گذری تھی۔ لیکن وہ کسی بھی خصوصیت میں مہاجرین سے کم نہ تھے بلکہ ان کی روح میں ایثار و قربانی نے بے تامل جن جن شکلوں میں ظہور کیا اس سے زمانہ بھر پر آشکارا ہو گیا کہ انصار کی کوئی نظیر نہ ان سے پیشتر کسی آبادی دیکھی گئی نہ اس کے کسی خطے میں ایسا قدوسی گروہ نظر آیا شاید یہی روح ایثار انصار کی برگزیدگی کا اصل سبب ٹھہری اور ان کو اسلام اور مسلمانوں کی پناہ گاہ بننے کا دائمی شرف حاصل ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ انسان اخلاقی و روحانی ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے کتنی ہی بلندیاں حاصل کرلیں تاہم وہ خویش وقرابت کے مقررہ سہاروں سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ کسی نہ کسی وقت روح کی گہرائیوں سے ایسی لہریں اٹھ کر سطح پر آجاتی ہیں جنہیں ہم انسانیت کے احساس کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کرسکتے۔ غالباً روح انسانی کی یہی پیاس تھی جس کی سیرابی کا مواخات کے ذریعے انتظام فرمایا گیا۔

اسلام میں نصرت کی بنیاد ایمان ہے

(۹۰) جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو انہیں جگہ دی اور ان کی مدد کی یہی لوگ باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ قیدیوں میں کچھ ایسے تھے جو دل سے مسلمان تھے مگر حضرت کے ساتھ مکہ سے ہجرت نہ کر سکے اور بادلِ ناخواستہ کفار کے ساتھ ہو کر بدر میں آئے ان آیات میں یہ بتلانا ہے کہ ایسے مسلمانوں کا کیا حکم ہے حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت کے اصحاب دو فرقے تھے مہاجرین و انصار۔ مہاجرین کنبہ اور گھر چھوڑنے والے اور انصار جگہ دینے والے اور مدد کرنے والے ان دونوں میں آنحضرتؐ نے بھائی چارہ قائم کر دیا تھا آیت کا مضمون یہ ہوا کہ جتنے مسلمان حضرت کے ساتھ حاضر ہیں ان سب کی صلح و جنگ ایک ہے۔ ایک کا موافق سب کا موافق۔ ایک کا مخالف سب کا مخالف بلکہ آغازِ ہجرت میں رشتہ مواخات کے اعتبار سے ایک دوسرے کا وارث بھی ہوتا تھا۔[۱]

اس آیت میں چند مباحث ہیں۔

مسجد نبوی کی تعمیر مکمل ہوئی تو حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں رسول اللہ نے انصار و مہاجرین کو جمع کیا۔ اس اجتماع میں نوے یا ایک سو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم شریک ہوئے۔ لیکن اس اجتماع کی تاریخ میں اختلاف ہے ایک رائے تو یہی ہے کہ مسجد کی تعمیر سے فراغت کے بعد آپ نے مواخات کا آغاز کیا۔ کچھ کی رائے میں مسجد بنانے سے پہلے یہ کام کیا۔ کچھ کی رائے ہے کہ ہجرت سے پانچ ماہ بعد کچھ نو ماہ بعد۔ اور کچھ ایک سال تین ماہ بدر سے پہلے بتاتے ہیں۔ یہ سب باتیں درست ہیں کام کا آغاز تو ہجرت کے بعد ہی کر دیا تھا یعنی پانچ ماہ بعد اس عرصہ میں مسجد بن چکی تھی ——— اور یہ کام شروع ہونے کے بعد ایک عرصہ تک جاری رہا۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجتماع میں صحابہ کے سامنے تجویز پیش کی۔ تآخوا فی اللہ اخوین اخوین اللہ کی خاطر دو دو آدمی بھائی بھائی بن جائیں ناموں کی پوری فہرست کہیں نہیں ملی جو نام مختلف

۱ فوائد شیخ الاسلام

روایتوں میں آئے ہیں وہ درج ذیل ہیں

مہاجرین	انصار
ابوبکر الصدیق	خارجہ بن زید
عمر فاروق	عتبان بن مالک
ابوعبیدہ ابن الجراح	سعد بن معاذ
عبدالرحمن بن عوف	سعد بن الربیع
زبیر بن العوام	سلمہ ابن سلامہ
علقمہ بن عبیداللہ	کعب بن مالک
عثمان بن عفان	انس بن ثابت
سعید بن زید	ابی بن کعب
مصعب بن عمیر	ابوایوب انصاری
ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ	عباد بن بشیر
عمار بن یاسر	حذیفہ بن الیمان
ابوذر غفاری	منذر بن عمرو
حاطب بن ابی بلتعہ	عویم بن ساعدہ
سلمان فارسی	ابوالدرداء
بلال	ابورویحہ بن عبداللہ

بعض ناموں کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور فرمایا ھذا اخی۔ یہ میرا بھائی ہے۔ پھر حمزہ اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی مواخات کا ذکر کیا ہے۔ اور جعفر بن ابی طالب اور معاذ بن جبل کی مواخات کا ذکر ہے۔ ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بیان درست نہیں کیونکہ جعفر بن ابی طالب اس وقت مدینہ میں موجود نہ تھے اصل میں محمد بن اسحاق نے مکی مواخات اور مدنی مواخات میں خلط کر دیا ہے مکی مواخات میں تو ہو سکتا ہے مدنی مواخات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضور ﷺ کے درمیان مواخات کی روایات ضعیف ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے بھی اس کا انکار کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے ایک روایت کے سہارے حافظ ابن تیمیہ کا تعاقب کیا ہے۔ وہ روایت امام حاکم

نے بحوالہ جمیع بن عمیر پیش کی ہے جس میں حضور ﷺ سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مواخات کا ذکر ہے اول تو حاکم کی ذات ہی روایت کو مشتبہ بناتی ہے پھر جس کے حوالہ سے وہ روایت پیش کر رہے ہیں یعنی جمیع بن عمیر وہ بھی محدثین کے نزدیک پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ ابن نمیر کہتے ہیں کہ اکذب الناس ہے ابن حبان کا انکشاف ہے کہ رافضی ہے اور جھوٹی حدیثیں گڑھتا تھا۔ کم سے کم بات اس کے بارے میں جو کہی گئی ہے وہ امام بخاری کی ہے۔ ان کا ارشاد ہے فیہ نظر۔

ہر خونی رشتہ سے بڑھ کر

مواخات ہو چکی تو ہر انصاری نے اپنے مہاجر بھائی کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا اور کہہ دیا کہ اس میں نصف آپ کا اور نصف ہمارا ہے مثلاً عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ کے بھائی بنائے گئے جو انصار میں سب سے زیادہ مالدار تھے۔ انھوں نے اپنے بھائی مہاجر سے یہ بھی کہہ دیا کہ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جسے آپ پسند کریں میں طلاق دے دیتا ہوں عدت گذرنے پر اس سے آپ شادی کر لیں لیکن عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے۔ چنانچہ بنو قینقاع کے بازار میں گھی اور پنیر کی دوکان کھول لی۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارت میں اتنی ترقی ہوئی کہ وہ خود ہی فرماتے تھے کہ مٹی پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے ان کا سامان تجارت سات سات سو اونٹوں پر لدتے تھے اور کاروان تجارت جس روز مدینہ پہنچتا تھا تو سارے شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔

مولانا شبلی نے یہ بات بہت برموقعہ لکھی ہے۔

انصار نے مہاجرین کی بھائی اور برادری کا جو حق ادا کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

بہرحال فریقین مہاجر و انصار محبت کا ایک عجیب و غریب جذبہ برانگیختہ کر دیا تھا۔ مولانا آزاد مرحوم فرماتے ہیں۔

مسلمانوں میں اسلامی مواخات کا ایسا ولولہ پیدا ہو گیا تھا کہ خون کے عزیزوں سے کہیں زیادہ رشتہ ایمان کے ان عزیزوں کے ساتھ سمجھنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ اگر ایک مر جاتا تو رشتہ مواخات کا بھائی اس کا وارث سمجھا جاتا۔ انھوں نے سارے پرانے رشتے بھلا دیئے تھے۔ صرف ایک ہی رشتہ کی لگن باقی رہ گئی تھی۔ یعنی سب اللہ کے رسول کے فدائی اور سب اسی کے حسن جہاں آرا پر سب کچھ نثار کر دینے والے ہیں۔

تو نخل خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن ہمہ ز خویش برید و بہ تو پیوستند

یہاں آیت کے اس حصے پر بھی ذرا ایک نظر ڈال لیجئے کہ بعضھم اولیاء بعض۔ یعنی یہ مہاجر و انصار باہم ایک دوسرے کے ولی ہیں اس ولایت کا مطلب کیا ہے؟

ولایت کے دو معنے بتائے گئے ہیں ایک توارث دوسرے حمایت و نصرت جن لوگوں نے آیت قرآنی میں ولایت کو توارث کے معنے میں لیا ہے اُن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں وراثت نسبی قرابت کی بنا پر نہیں بلکہ مہاجرین و انصار میں مواخات کی بنا پر ہوگی۔ چنانچہ فرماتے ہیں

یہ آیت میراث کے موضوع پر ہے۔ ہجرت کی بنیاد پر وراثت ملتی تھی۔ مہاجرین غیر رشتہ داروں کے وارث ہوتے تھے ایمان رکھتے ہوئے اگر کوئی ہجرت نہ کرتا تو وہ اپنے مہاجر رشتہ دار کا وارث نہ ہوتا تھا۔ فتح مکہ پر ہجرت ختم ہوگی تو ہجرت کی بنیاد پر وراثت کا بھی خـــتم ہوگیا۔ اب وراثت رشتہ اور قرابت کی بنیاد پر قائم ہوگئی اور یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

علامہ خفاجی نے امام مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہمنوا بتایا ہے اور لکھا ہے کہ، مہاجر اپنے بھائی انصاری کا وارث ہوتا تھا جبکہ مدینہ میں اس کا کوئی مہاجر رشتہ دار نہ تھا اور مسلمان غیر مہاجر سے اس کا وراثت میں کوئی تعلق نہ ہوتا۔ یہی صورتحال فتح مکہ تک باقی رہی ہجرت ختم ہونے پر وراثت کو قرابت کی بنیاد پر قائم کر دیا گیا۔ ولی آیت میں قریبی اور مددگار دونوں معنے میں ہے۔ اصل میں تو یہ لفظ قرب مکانی کے لیے ہے۔ پھر معنوی قرب جیسے رشتہ داری ایمان اور مددگاری کے لیے بولا جانے لگا۔ آغاز اسلام میں حضور اقدس ؐ نے رشتہ ایمان کے نام پر اخوت قائم کی اور میراث وغیرہ میں اسی اخوت ایمانی کو اخوۃ قرابت کا درجہ دے دیا اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس تفسیر کے ولایت کے لغوی معنے ساتھ نہیں دیتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ولایت اگر بمعنی توارث ہے تو یہ آیت منسوخ ہے۔ چنانچہ ابن عربی مالکی نے احکام القرآن میں تصریح کی ہے۔

پھر اللہ سبحانہ نے فتح مکہ اور قانون وراثت کے ذریعہ اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ خواہ وارث دار الحرب میں ہو یا دار الاسلام میں ہو کیونکہ سُنت سے ہجرت کی فرضیت ختم ہو چکی ہے۔

اس کے معنے یہ ہوئے کہ سورہ نساء میں جب قانون وراثت آ گیا تو یہ حکم منسوخ ہو گیا جیسا کہ واو لوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ میں اس طرف اشارا ہے۔ ابوبکر الجصاص کا بھی یہی موقف ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ ہجرت اور مواخات کی بنیاد پر وراثت قائم ہوئی تھی نسبی رشتوں کی بنیاد پر نہیں

مہاجر اور غیر مہاجر مسلمانوں کے درمیان رشتہ وراثت ختم ہو گیا تھا۔

اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

کہ فرض ہجرت ختم ہونے کے ساتھ توارث بالہجرۃ بھی ختم ہو گیا اب توارث کی بنیاد رشتہ داریاں اور انساب ہیں۔

یہ ان بزرگوں کا موقف ہے جو آیت میں ولایت کو توارث کے معنے میں لے کر اس کے منسوخ ہونے کے علمبردار ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہاں عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک خاص انداز اختیار کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

میری رائے میں یہ آیت منسوخ نہیں ہے خواہ ولایت بمعنے توارث ہو۔ جب تک دونوں آیتوں میں مفاہمت ممکن ہو نسخ کو اپنانا ٹھیک نہیں ہے۔ میرے خیال میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کافر رشتہ دار مسلمان مہاجرین کے اختلاف دین کی وجہ سے وارث نہیں ہوتے۔ اور مسلمان غیر مہاجر اپنے مسلمان بھائی کا اختلاف دارین کی بنا پر وارث نہیں ہوتا ہے یہ صورتحال فتح مکہ تک قائم رہی۔ مگر فتح ہوا ہجرت ختم ہو گئی تو وراثت کی بنیاد قرابت ہو گئی۔ انصاری مہاجر کی میراث عقد موالات کی وجہ سے لیتا تھا اور عقد موالات خود وراثت کے اسباب میں سے ایک بنیادی سبب ہے جبکہ میت کا کوئی سببی یا نسبی وارث نہ ہو یہ صورت اب بھی موجود ہے لہذا نسخ کا سوال ہی نہیں ہے ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی مہاجر نے انصاری کی میراث لی ہو یا انصاری نے مہاجر کی میراث لی ہو مسلمان رشتہ دار ہوتے ہوئے۔ اور نہ آیت کا موضوع یہ مسئلہ ہے ——

قاضی صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مواخات کے نام پر جو توارث اس آیت میں پیش کیا جا رہا ہے دراصل وہ عقدِ موالات ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا مواخات والے جو وراثت پاتے تھے وہ قرآن کی اس آیت کی وجہ سے پاتے تھے جیسا کہ عام شارحین بتا رہے ہیں یا اس موالات کی وجہ سے پاتے تھے جو عرب میں رائج تھی اور جسے قرآن نے یہاں بعضہم اولیاء بعض کہہ کر قائم رکھا پھر قرآن نے اس رواج کو منسوخ کیا۔

ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم

اور ہم نے والدین اور رشتہ داروں کے چھوڑے ہوئے سرمایہ کے حقدار مقرر کر دیئے ہیں۔ اور جن لوگوں سے تمہارے عہد و پیمان ہو چکے ہیں۔ ان کو ان کا حصہ دو بلاشبہ اللہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔

اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مواخات والوں کو زیرِ تشریح آیت کی بنا پر میراث دی جائے اور پھر اس آیت کے بعد میں آنے والی آیت اولوالارحام سے اور آیت احزاب سے منسوخ کیا جاوے۔
دوسرے یہ کہ مواخات والوں کو موالات کی بنا پر وراثت دی جائے اور آیت بالا کے ذریعے موالات کے عرب رواج کو منسوخ کہا جائے ہماری رائے میں دوسری رائے راجح ہے۔ قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا میلان اسی طرف ہے اور مولانا اشرف علی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی کو پسند کیا ہے۔
یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے اگر زیرِ تشریح آیت میں عقدِ موالات کی بنا پر مہاجرین و انصار میں رشتہ قائم رکھا ہے اور سورہ نساء کی آیت کے ذریعے عقدِ موالات کو ختم کر دیا ہے تو کیا موالات کی ساری انواع کو ختم کر دیا ہے۔ یا موالات کی کوئی قسم باقی ہے جسے اس آیت کا منطوق قرار دیا جا سکے اور آیت قرآنی نسخ سے محفوظ رہے
عرب کا دورِ جاہلیت ختم ہو جانے کے بعد زمانہ اسلام میں بھی عقدِ موالات کے ہی کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ دوسری صدی تک یہ اسلامی دستور باقی تھا۔ کہ جب کوئی نومسلم مشرف باسلام ہوتا تو وہ جس قبیلہ کے کسی شخص سے عقدِ موالات کرتا یعنی دوستی کا عہد و پیمان باندھتا اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہو جاتا اور اس کا حلیف اور مولیٰ کہلاتا۔ اسی نسبت سے امام ابن ماجہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو ربعی، امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کو جعفی، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو تیمی کہتے ہیں۔ یہ نسبت غلامی کی نہیں بلکہ دوستی کے عہد و پیمان کی نسبت ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں امام طحاوی رحمہ اللہ نے مشکل الآثار میں عقدِ موالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> عبد اللہ بن یزید رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس گیا انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو میں نے عرض کیا کہ ایسا شخص جس پر اللہ نے اسلام کے ذریعے احسان کیا یعنی نومسلم ہوں امام صاحب نے فرمایا یوں نہ کہو بلکہ ان قبائل میں سے کسی سے تعلق پیدا کرو پھر تمہاری نسبت بھی ان کی طرف ہو گی میں خود بھی ایسا ہی تھا۔

یہ عبد اللہ بن یزید امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد ہیں۔ چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ یہ ابو حنیفہ اور ابن عون کے شاگرد ہیں۔ فنِ حدیث میں ان کا شمار امام بخاری کے اساتذہ میں سے ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بتایہ رہا تھا کہ امام اعظم کو تیمی غلامی کی وجہ سے نہیں بلکہ عقدِ موالات کے دستور کی وجہ سے کہتے ہیں۔ بالتصریح تو معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ عقدِ موالات کس نے کیا تھا بہر حال عقد موالات کا یہ دستور زمانہ اسلام میں موجود رہا۔ یہاں تک تو سارے ائمہ فقاہت متفق ہیں کہ وارث ہوتے ہوئے مولائے عقد موالات کو کچھ میراث نہیں ملتی ہے خواہ وہ وارث ذوی الفروض نسبی ہوں یا عصبہ یا ذوی الارحام۔ لیکن جب کوئی نہ ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے جیسا کہ الجصاص

نے تفصیل لکھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر اقربا میں سے کوئی وارث نہ ہو تو امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد، اور امام زفر رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو شخص جس مسلمان کے ہاتھ پر مسلمان ہوا ہو اور اس نے اس مسلمان سے عقد موالات کر لیا ہو اور وہ جس سے عقدِ موالات ہے بغیر وارث کے مر گیا تو یہ نومسلم اس کا وارث ہو گا۔ امام مالک ابن شبرمہ امام ثوری، امام اوزاعی اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کا سارا مال مسلمانوں کا اشتراکی سرمایہ ہے اور اسے خزانہ سرکار میں داخل کیا جائے گا۔ الجصاص رقم طراز ہیں۔

سارے قرآن اور ساری سنت میں ایسی کوئی قانونی دفعہ نہیں جس سے ذوی الارحام اور ورثہ کی عدم موجودگی عقد موالات کرنے والوں کو میراث سے محروم کر سکے۔

بہرحال یہ آیتِ گرامی عقد موالات کے لیے اب بھی اپنے دامن میں عمل کا پہلو رکھتی ہے اس لیے اسے منسوخ کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ عقدِ ولایت اس کا مصداق ہے۔ الجصاص نے یہاں ایک بہت گہری اور تپے کی بات لکھی ہے کہ:

ولایت میراث کا ایسا ہی سبب ہے جیسے نسب میراث کا سبب ہے یہ دوسری بات ہے کہ اسباب کے اختلاف سے کچھ کو ملے اور کچھ کو نہ ملے۔ جیسے نسب میں کچھ رشتہ داروں کو میراث ملتی ہے اور کچھ کو نہیں ملتی ہے۔

وفائے عہد کا التزام

۹۱ اور وہ لوگ جو نعمت ایمان سے مالامال ہوئے مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی تو ان سے تمہاری رفاقت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آئیں۔ ہاں اگر دین کے بارے میں وہ تم سے مدد کے خواہاں ہوں تو بلاشبہ تم پر ان کی مددگاری لازم ہے۔ لیکن اگر وہ کسی ایسی قوم کے خلاف تم سے مدد کے خواہاں ہوں جن سے تمہارا عہد و پیمان ہو تو پھر تم ان کی مدد نہیں کر سکتے ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اور جو مسلمان اپنے ملک میں رہے جہاں نازوں کا زور تسلط ہو یعنی دارالحرب ہجرت نہ کی۔ ان کی صلح و جنگ میں دارالاسلام کے رہنے والے مسلمان مہاجرین انصار شریک نہیں۔ اگر دارالحرب کے مسلمانوں نے صلح و معاہدہ کسی جماعت کفار سے کر لیا ہے تو دارالاسلام کے آزاد مسلمان اس معاہدہ کے پابند نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ان سے حسبِ مصلحت جنگ کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دارالحرب کے مسلمان جس وقت دینی معاملہ میں آزاد مسلمانوں سے مدد طلب کریں تو ان کو اپنے مقدور کے موافق مدد کرنا چاہیے مگر جس جماعت سے ان آزاد مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہو اس کے مقابلہ میں تا بقائے عہد دارالحرب کے

مسلمانوں کی امداد نہیں کی جا سکتی۔ نیز توریث باہمی کا سلسلہ جو مہاجرین و انصار میں قائم کیا گیا تھا اس میں بھی دارالحرب کے مسلمان شامل نہیں تھے۔[1]

۱۔ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ جو لوگ ایمان لائے اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ آ گئے جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کیا خواہ کسی قبیلہ اور کسی حلقے کے ہوں عقد موالات کے ذریعے ایک ہی برادری کے فرد ہو گئے۔ ان کا ہر فرد اس عقد موالات کا رکن ہے۔ بعضھم اولیاء بعض

اب پیش نظر آیت میں اسی قانون کی دوسری دفعہ یہ بتائی جا رہی ہے

۲۔ جو ایمان تو لائے مگر ابھی تک انھوں نے ہجرت نہیں کی ان کا اس عقد موالات سے کوئی تعلق نہیں اور اس رشتہ کے حقوق میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہجرت کر کے مسلمانوں سے آ نہ ملیں۔

۳۔ اگر وہ دین کے معاملہ میں مدد چاہیں تو تمہارا فرض ہے کہ ان کی مدد کرو۔ محض اس وجہ سے کہ وہ ابھی تک ہجرت نہیں کر سکے ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہماری مددگاری کے دینی حق سے محروم ہو جائیں۔

۴۔ یہ بات ہرگز نہ بھولنی چاہیے کہ عہد و پیمان کی نگرانی مسلمانوں کا سب سے پہلا فرض ہے۔ لہذا اگر وہ کسی ایسے غیر مسلم گروہ کے خلاف مسلمان حکومت سے مدد چاہیں جس سے تم صلح کا عہد کر چکے ہو تو تمہارے لیے جائز نہ ہوگا کہ ان کی مدد کے لیے عہد شکنی کرو۔ نتیجہ خواہ کچھ ہو لیکن اپنے قول و قرار پر قائم رہنا چاہیے۔

ان میں سے ہر بات تفصیل و تشریح کی محتاج ہے۔

پہلی بات کہ جو لوگ مسلمان تو ہیں لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی ہے ان کا اس مواخات اور عقد موالات سے کوئی تعلق نہیں جو مدینہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مہاجرین کے درمیان قائم کیا تھا یعنی یہ حضرات اس کے رکن نہیں ہیں۔ ان کو اس مواخات کی وجہ سے کوئی وراثت میں حصہ نہ ملے گا۔ یہاں بھی ولایت کی نفی سے دراصل توارث کی نفی مقصود ہے۔ الجصاص لکھتے ہیں۔

ان میں توارث کی نفی ولایت نہ ہونے کی وجہ سے کی گئی ہے

یعنی عقد موالات میں شامل نہ ہونا اس کا باعث ہے۔ محققین نے یہی مطلب بتایا ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

میراث میں ان کا کوئی حصہ نہیں چاہیے عقد موالات کے ارکان سے ان کی کیسی ہی قرابت کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اس محرومی کا باعث فریضہ ہجرت کو چھوڑ دینا ہے یا اختلاف دارین ہے۔ قرآن نے لم یہاجروا کہہ کر پہلی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر حال ذوالحال کی قید ہوتا ہے تو یہ بات بالکل صاف ہے کہ

[1] افادات شیخ الاسلام

ترکِ ہجرت اس کی علت ہے۔ اور علت ختم ہونے سے معلول کا ختم ہوجانا ایک بدیہی بات ہے۔ بتانے والوں نے خوب کھول کر سمجھایا ہے۔

یہ صورتحال فتح مکہ تک قائم رہی اس کے بعد جب ہجرت کی فرضیت ختم ہوگئی تو وراثت کا مدار نسب اور قرابت ہوگیا۔

بہرحال یہاں بھی ولایت کے معنے وراثت کے ہیں جو قرابت کی وجہ سے ملتی ہے اس آیت کے ذریعے ان مسلمانوں کو جنھوں نے ہجرت نہیں کی اس عقد موالات سے خارج کیا ہے جو مہاجرین وانصار کے مابین ہوا تھا۔

صحیح بخاری میں امام بخاری نے لکل جعلنا موالی پر عبداللہ بن عباس کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

مہاجرین جب مدینہ میں آئے تو مہاجر کو انصاری کی میراث ملتی تھی بغیر کسی نسبی رشتہ کے۔ صرف اس مواخات کی وجہ سے جو رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین وانصار کے مابین کرائی تھی جب قرآن کی یہ آیت والذین عقدت ایمانکم نازل ہوئی تو یہ مواخات کی بنا پر توارث ختم ہوگیا۔

یہاں حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی یہ وضاحت بھی قابل مطالعہ ہے۔

ابتدائے اسلام میں جب تک کہ اکثر مسلمانوں کے رشتے دار مسلمان نہ ہوتے تھے اور اس وجہ سے رسول اللہ نے باہم انصار و مہاجرین میں مواخات جس کا اثر عقد موالات جیسا تھا منعقد فرمایا۔ اس وقت رسم قدیم کے موافق حکم رہا کہ انصار و مہاجرین کے درمیان میراث جاری رہی۔ پھر جب لوگ کثرت سے مسلمان ہوگئے تو اس میں اول وہ ترمیم ہوئی جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی چھٹا حصہ مولی الموالات کو اور باقی دوسرے ورثہ کو ملتا بعد چندے سورہ احزاب کی آیت واولوا الارحام سے بالکل ہی اس مولی الموالات کا حصہ منسوخ ہوگیا۔

دکر الجصاص نے احکام القرآن میں والذین عقدت ایمانکم پر نوٹ لکھا ہے۔

سنت میں حضور اقدس ﷺ کے ایسے ارشادات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عقدِ موالات کرنے والوں کے لیے وراثت ہے۔ ابوداؤد میں تمیم داری کے حوالہ سے ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا یارسول اللہ ﷺ اس شخص کے بارے میں طریق کار کیا ہے جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے۔ آپ نے فرمایا کہ جس کے ہاتھ پر کوئی نومسلم اسلام لاتا ہے وہ اس نومسلم کی زندگی اور موت میں اس کا سب سے زیادہ قریبی ہے۔ موت میں قریبی ہونے کا اس کے سوا

کیا مشا ہے کہ وہ اس کی میراث کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ یہی رائے ہے حضرت عمر حضرت عبداللہ ابن مسعود
حسن بصری، ابراہیم نخعی کی بلکہ امام زہری سے دریافت کیا گیا کہ نو مسلم اگر عقد ولابت کرے تو اس
کا کیا حکم ہے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں۔ سعید بن المسیب کا فتوی یہ ہے کہ اگر کوئی نو مسلم کسی قوم کے
ہاتھ پر مشرف باسلام ہو توان کے لیے اس کی میراث جائز ہے۔ ربیعہ ابن عبدالرحمٰن کا فیصلہ یہ ہے
کہ دارالحرب ہو یا دارالاسلام اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کے ہاتھ پر مسلمان ہو تو اس کی میراث اس
کو ملے گی جس کے ہاتھ پر مسلمان ہوا ہے [1]

حافظ عسقلانی نے تمیم داری کی حدیث پر لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ اور ان کے اصحاب کا یہی مذہب ہے مگر ان کی شرط یہ ہے کہ دونوں کے درمیان عقدِ موالات ہوا ہو۔ اور محدثین میں سے یہی مذہب مشہور محدث اسحاق بن راہویہ کا ہے بلکہ حافظ ابن القیم نے تہذیب السنن میں تصریح کی ہے کہ اسحاق کے ساتھ تمیم کی روایت پر عمل کرنے والوں میں امام احمد طاؤس ربیعہ اور لیث بن سعد بھی ہیں اور یہی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز کا فیصلہ ہے۔

بہر حال زیر نظر آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مسلمان تو ہیں لیکن انھوں نے وقت کے اہم فرض ہجرت کا تقاضا پورا نہیں کیا وہ مسلمان ہونے کے باوجود اس عقدِ موافات میں شامل نہیں ہیں۔

اس صاف اور بدیہی تشریح کے باوجود جو آپ پڑھ چکے ہیں خبر نہیں۔ مولانا مودودی نے اس آیت کی تشریح میں یہ بات کیسے لکھ دی ہے۔

> اسی عدم ولایت کے بنا پر دارالکفر اور دارالاسلام میں مسلمان باشندے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسرے کے قانونی ولی نہیں بن سکتے۔ اور باہم شادی بیاہ نہیں کر سکتے۔

مولانا کا یہ فتوی مذہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ اور جملہ مذاہب اربعہ کے خلاف ہے۔ اور والذین امنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیئی کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے اس میں ولایت کو اگر بمعنی وراثت لیا جائے تو یہ حکم اس وقت کا ہے جبکہ ابتدائے قدوم مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان موافات قائم کی تھی جس کی بنا پر مہاجرین انصار کے اور انصار مہاجرین کے وارث ہوتے تھے جس کی دلیل قرآن میں اس سے پہلی آیت بعضھم اولیاء بعض ہے پھر جب مہاجرین و انصار کا باہمی توارث سورہ نساء نازل ہونے کے بعد لکل جعلنا موالی مما ترك الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم

[1] احکام القرآن للجصاص

اور سورہ انفال کی آیت او لوالارحام بعضھم اولی ببعض سے اور سورہ احزاب کی آیت و او لوالارحام بعضھم اولی ببعض سے یہ حکم ختم ہوگیا کہ مسلم مہاجر مسلم غیر مہاجر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سورۃ نساء کی آیت الوارث کے مطابق ہوگا ـــــ مولانا کے خیال کے مطابق پاکستان کا مسلمان دنیا بھر میں کسی مسلمان باشندہ سے ازدواجی وراثتی اور معاملاتی تعلق پیدا نہیں کر سکتا ہے۔ ایک ہندوستانی مسلمان مرد سے ایک پاکستانی عورت کی شادی نہیں ہو سکتی ایک پاکستانی لڑکی کسی ہندوستانی مرد سے شادی کی مجاز نہیں۔ پاکستانی مسلمان بیٹے کا ہندوستانی مسلمان باپ کی جائداد میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں جو مولانا موصوف کی ذہنی اُپَج کے مطابق بالکل ناجائز و حرام ہیں حالانکہ نہ یہ قرآن کی ان آیات کا منطوق ہیں نہ مدلول ہیں اور نہ مفہوم اور وں کا پتہ نہیں مگر میں ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اس علمی زلہ کا بنیادی سبب ولایت کا وہ تصور ہے جو ان کا خود تراشیدہ ہے وہ فرماتے ہیں۔

ولایت سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے ہوتا ہے اور شہریوں کا اپنی ریاست سے ہوتا ہے۔

اس کا نتیجہ انھوں نے یہ نکالا ہے کہ:

یہ آیت دستوری و سیاسی ولایت کو ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے اور ان حدود کے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتہ سے خارج کر دیتی ہے۔

ولایت کا یہ بنیادی تصور ہی ان کی فکری جولانیوں کے لیے بس کی گانٹھ اور ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ولایت سے مراد ایک ریاست کا شہری ہے اور شہریوں کا ریاست سے رشتہ نہیں بلکہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے رشتہ ہے اس رشتہ کی اُس وقت کے حالات میں اصل بنیاد ہجرت ہے۔ ہجرت سیاسی زبان کی اصطلاح نہیں۔ بلکہ قرآنی اصطلاح ہے اور یہ اُس وقت کے حالات میں فرض ہے۔ قرآن نے اسی کو اساس بنا کر مواخات کا دائرہ قائم کیا ہے جیسا کہ بعضھم اولیاء بعض سے معلوم ہو رہا ہے۔

بہرحال مولانا مودودی کی تشریح نہ صرف یہ کہ عام شارحین قرآن کی تشریح کے خلاف ہے بلکہ مذاہب اربعہ سے بھی متصادم ہے۔

آیت کی تشریح پر دوبارہ نظر

ولایت کے دوسرے معنے بھی ہیں۔ امداد، اعانت، حمایت، نصرت، قاضی بیضاوی نے اس کو اس طرح سمجھایا ہے او بالنصرۃ والمظاھرۃ یعنی ولایت توارث کی ہوتی ہے یا نصرت اور مدد کی ہے اور علامہ آلوسی رقم طراز ہیں۔

الولایۃ بالنصرۃ۔ الجصاص نے لکھا ہے دوسرے معنے نصرت اور حمایت کے ہیں۔ اس صورت میں پہلی آیت کا
مطلب یہ ہوگا کہ اسلامی معاشرے میں خاندانی نسب کی عصبیت کو چھوڑ کر اعتبار صرف ایمان واسلام اور ہجرت اور
جہاد کا ہوگا یہ ایک دوسرے کے ولی یعنی حامی وناصر ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حمایت ونصرت اہل کفر کے مقابلہ میں ہے
یہ بات اگرچہ خبر کے انداز میں کہی گئی ہے لیکن اس میں انشائی معنی مقصود ہیں۔ یعنی حکم یہ ہے کہ اہل کفر کے مقابلے میں اہل
ایمان ایک دوسرے کے حامی ومددگار بن کر کھڑے ہوں اور جب ضرورت پیش آئے تو ایک دوسرے کی مدافعت
کریں ——— اور دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن مسلمانوں نے ہجرت نہیں کی ہے دارالاسلام والوں پر ان
کی حمایت نصرت اور حفاظت ومدافعت کی ذمہ داری نہیں ہے اس ذمہ داری کے نہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ عملاً ایسا
کرنا ممکن نہیں ہے اور اس سے بہت سی بین الملکتی الجھنیں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اور پھر اس وقت حکم یہی تھا کہ
تمام لوگ جو مسلمان ہو چکے ہیں دارالکفر کے علاقے سے نکل کر مدینہ میں مجتمع ہوں تاکہ اہل کفر سے نمٹنے اور بیت اللہ کی
آزادی کے لیے منظم جدوجہد عمل میں آسکے اس کے بعد بتایا ہے کہ اگرچہ دارالاسلام والوں پر ان مسلمانوں کی حمایت
ومدافعت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ جنھوں نے دارالکفر سے ہجرت نہیں کی ہے۔ تاہم اگر وہ دین کے معاملہ میں مدد کے
طالب ہوں تو ان کو ممکن مدد بہم پہنچائی جائے بشرطیکہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف نہ ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہو معاہدہ کا
احترام مقدم ہے اگر تم کسی سے صلح کا عہد وپیمان کر چکے ہو تو تمہارے لیے جائز نہیں کہ مسلمانوں کی مدد کے لیے عہد شکنی کرو۔
نتیجہ خواہ کچھ نکلے لیکن اپنے قول وقرار پر قائم رہنا چاہیے۔ یہ اشارہ اس طرف تھا کہ مدینہ آکر حضور اقدس
نے مدینہ اور اطراف مدینہ کی مختلف جماعتوں سے باہمی صلح وسازگاری کا معاہدہ کر لیا تھا جو معاہدہ صحیفہ کے نام سے
مشہور تھا صحیفہ کے اکثر فریق عہد شکنی کر چکے تھے۔ لیکن ابھی تک مسلمانوں کی طرف سے انفساخ کا اعلان نہیں ہوا تھا
اس سے اندازہ کرو کہ قرآن نے وفائے عہد کا اگرچہ مخالفوں کے ساتھ ہو اور اگرچہ اس کی وجہ سے اپنوں کی مدد نہ کی
جا سکے کس درجہ لحاظ رکھا ہے۔

شارحین قرآن نے ان آیات کی یہی تشریحات پیش فرمائی ہیں شارحین قرآن کی اکثریت پہلی تشریح پیش کرتی
ہے شارحین قرآن میں سے امام رازی کو دوسری تشریح پر بہت اصرار ہے۔ انھوں نے لفظ ولایت کی وراثت والی تشریح پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چنانچہ وہ فرماتے ہیں

لفظ ولایت میں وراثت کے معنی میں قطعی نہیں کیونکہ اس لفظ کے لغوی معنے صرف قریب ہونے کے
ہیں۔ السلطان ولی من لا ولی لہ قریب ہی کے معنے میں بولا جاتا ہے اور اس کا وراثت سے کوئی
تعلق نہیں ہے۔ قرآن میں الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم میں ولایت کے معنے وراثت نہیں
ہیں بلکہ قریب کے ہیں اس لیے آیت میں ولایت کے معنے نصرت اور معاونت کے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ

دشمن کے مقابلے میں ہم آہنگ رہو اور ہر ایک دوسرے سے ایسا لگاؤ رکھے جیسے اپنے سے رکھتا ہے
اور جب لفظ ولایت میں معاونت و نصرت کے معنے موجود ہیں تو وراثت کے معنے میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن امام رازی کے اس شبہ کا علامہ خفاجی نے عنایۃ القاضی میں۔ ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں اور متاخرین میں سے علامہ جمال الدین القاسمی نے محاسن التاویل میں مسکت جوابات دیئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ولایت کے اصل معنے قرب کے ہیں اور ولی اقرب ہی کو کہتے ہیں۔ اسی قرب کے معنے کی وجہ سے اس کے معنے نصرت اور وراثت کے ہیں۔ نصرت بھی قرب کی وجہ سے ہوتی ہے اور وراثت بھی قرب ہی کی وجہ سے ملتی ہے۔ اور جیسا کہ علامہ خفاجی نے لکھا ہے کہ اس سببیت کا علاقہ ہے یعنی قرابت سبب ہے وراثت کا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے قرابت ایمانی سبب ہے نصرت و معاونت کا۔ دونوں جگہ قرینے کی وجہ سے معنے مجازی ہیں۔ علامہ خفاجی نے امام رازی کے جواب میں یہ بات لکھی ہے۔

فالولایۃ علی ھذا الوراثۃ المسببۃ من القرابۃ

اور بالکل بجا لکھا ہے۔ اور اسی معنے کی رعایت سے السلطان ولی من لا ولی لہ میں بھی معنے وراثت کے ہیں اور مطلب یہی ہے کہ جس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کا ترکہ بیت المال میں داخل کیا جائے تو یہ وراثت ہی ہوئی اور نکاح میں جو ولی ہوتا ہے وہ بھی وہی ہوتا ہے جو حقدار وراثت ہوتا ہے حدیث لا نکاح الا بولی کا مطلب یہی ہے۔ کہ نکاح میں ولایت اسی کا حق ہے جو لڑکی سے قرابت کی بنا پر وراثت کا حقدار ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے۔

مثبت للولایۃ لجمیع من کان من اھل المیراث علی حسب القرب و تاکید السبب

اور قرآن میں من قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا۔ کے معنے بھی یہی ہیں یعنی جو شخص ظلم سے مارا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو قصاص کا حق دے دیا ہے۔ اور ما کانوا اولیاءہ ان اولیاءہ الا المتقون کے معنے یہی ہیں کہ مشرکین مکہ حرم کے متولی نہیں۔ اس کے متولی تو صرف متقی ہو سکتے ہیں یعنی وہ ارباب تقویٰ جن کو ابراہیم سے قرب ہو وہی اس کے وارث ہو سکتے ہیں۔ بہرحال علاقہ سببیت کی وجہ سے ولایت کے معنے وراثت کیے گئے ہیں۔

آیئے اب ان آیات کا ایک اجمالی نظر سے بھی مطالعہ کر لیجئے۔ یہ آیات بتا رہی ہیں کہ:

۱۔ ہر وہ مسلمان جو دار الکفر میں ہے اسے ہجرت کر کے مدینے آجانا چاہیے اور دار الکفر میں قیام پذیر نہ ہونا چاہیئے
۲۔ جو دار الکفر سے ہجرت کر کے مدینے نہ آئیں گے وہ رشتہ مواخات میں داخل نہ ہوں گے۔ اموال غنیمت اور فیئ

ہیں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس موضوع پر حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی فوجی دستہ یا کسی لشکر پر امیر بنا کر روانہ فرماتے تو امیر کو یہ وصیت فرماتے کہ اپنی ذاتی زندگی میں اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہنا۔ اور ساتھیوں کی خیر خواہی کو ملحوظ رکھنا۔ اللہ کا نام لے کر اللہ کے راہ میں جہاد کرنا۔ جب دشمن کا آمنا سامنا ہو تو اس کے سامنے تین باتیں پیش کرنا جس بات کو بھی وہ اپنا لیں اسے مان لینا اور ان سے جنگ نہ کرنا۔

پہلی بات یہ کہ ان کو اسلام کی دعوت دینا اگر وہ مان لیں تو قبول کر لینا۔

دوسری بات یہ کہ مسلمان ہونے کے بعد ان کو ہجرت کی ہدایت کرنا اور ان کو بتا دینا کہ اگر وہ ہجرت کریں گے تو ان کے سارے شہری حقوق مہاجرین جیسے ہوں گے۔ اگر وہ ہجرت نہ کریں تو ان پر واضح کر دینا کہ وہ مسلمان بادیہ نشین ہوں گے۔ قانون الٰہی ان پر مسلمانوں کی طرح نافذ ہوگا لیکن فیئ اور مال غنیمت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اِلّا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شرکت کریں۔

تیسری بات یہ کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو ان کو اسلامی حکومت کا شہری بن کر جزیہ کی ادائیگی کے ساتھ رہنے کی دعوت دینا۔

اگر ان سب باتوں کا وہ انکار کر دیں تو اللہ سے مدد مانگنا اور ان سے جہاد کرنا ——— یہ حدیث مسلم میں بھی ہے۔

۲۔ ایمان کے بعد ہجرت اور جہاد وہ دو عملی نشانیاں یا ایمان کی وہ کسوٹی ہیں جن کے ذریعے ایک مومن کے ایمان کا امتحان ہوتا ہے۔ اور یہی اس دور میں اسلامی قومیت کی اساس ہیں۔

اہلِ کفر باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں

۹۲　اور جنھوں نے راہ کفر اختیار کی وہ باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں اگر تم ایسا نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ اور ایک بہت بڑی شورش بپا ہو جائے گی۔ یعنی کافر و مومن میں نہ حقیقی رفاقت ہے نہ ایک دوسرے کا وارث ہو سکتا ہے۔ ہاں کافر کافر کا رفیق و وارث ہے۔ بلکہ سب کفار تم سے دشمنی کرنے کو آپس میں ایک ہیں جہاں پائیں گے ضعیف مسلمانوں کو ستائیں گے۔ اس کے بالمقابل اگر مسلمان ایک دوسرے کے رفیق و مددگار نہ ہوں گے۔ یا کمزور مسلمان اپنے کو آزاد مسلمانوں کی معیت و رفاقت میں لانے کی کوشش نہ کریں گے تو سخت خرابی اور فتنہ بپا ہو جائے گا یعنی کمزور مسلمان مامون نہ رہ سکیں گے۔ ان کا ایمان تک خطرہ میں ہوگا۔ افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں بھی شارحینِ قرآن نے ولایت کے دونوں معنے نصرت اور وراثت کو پیشِ نظر رکھ کر تشریح کی ہے۔ شیخ الاسلام نے دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ لیکن دوسرے شارحین نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق الگ الگ تشریح کی ہے۔ جو ولایت کے مجازی معنے نصرت کے لیتے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کا تعلق ہے اس کی عداوت میں سارے کفار باہم دست بازو بن گئے ہیں۔ جو اللہ کا بندہ اسلام قبول کر لیتا ہے اس کی تعذیب و ایذا رسانی سب کے نزدیک کارِ ثواب ہے۔ یہاں تک کہ ظالموں کے ظلم سے اس کو بچانے کے لیے اس کے اپنے بھائی بندوں کی محبت بھی مردہ ہو چکی ہے۔ اس کی جان اور اس کا مال سب مباح ہیں ایسی حالت میں اگر مسلمان بھی ان مظلوموں کی مدد نہ کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین سے پھیرنے کے لیے سارے ملک میں ظلم و فساد عام ہو جائے گا۔ گو تعبیر تو خبر کے انداز میں صرف بتا رہی ہے کہ کفر خواہ کسی لبادے میں ہو باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں مگر اس کے مدلول میں یہ انشائی معنے بھی ہیں کہ مسلمانوں کو ان سے موالات کرنے سے روکا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ چاہے تمہارے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں تمہیں ان سے موالات نہیں کرنی چاہیے تمہاری موالات صرف اہلِ ایمان سے ہونی چاہیے۔

امام رازی نے اس تشریح کی بنیاد پر فتنہ و فساد کی اس طرح وضاحت فرمائی ہے کہ۔

۱۔ مسلمانوں کی کمزوری کے وقت میں اگر مسلمان کافروں سے ملیں گے جبکہ مسلمانوں کی عددی طاقت کم ہے۔ اور کافروں کی عددی طاقت زیادہ ہے تو یہ ملاپ اختلاط اور موالات ذریعہ بن جائے گا مسلمان کے کافروں سے مل جانے کا۔

۲۔ اگر مسلمانوں میں یک جہتی اور اتحاد نہ ہوگا تو ان کی جماعتی زندگی کا مظاہرہ نہ ہو سکے گا اور یہ کافروں میں جرأت کا سبب بن جائے گی۔

۳۔ جب ہر روز مسلمانوں کی عددی اور مادی طاقت میں اضافہ ہوگا تو یہ کفر میں اسلام کی رغبت کا ذریعہ ہوگا۔

بہرحال یہ تشریح ان شارحینِ قرآن کی ترجمانی کر رہی ہے جو آیت میں ولایت کے مجازی معنے نصرت لیتے ہیں۔ لیکن جن شارحین قرآن نے ولایت کے معنے مجازی وراثت لیے ہیں وہ اس آیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

اس آیت میں وجہ بیان کی گئی ہے اس بات کی کہ مسلمان مسلمان کا وارث کیوں ہوتا ہے فرمایا کیوں کہ باہمی توارث سے سب ایک ہی جماعت سمجھی جائے گی اور ایک مستقل اور علیحدہ جماعت ہوئے بغیر اسلام کو قوت و شوکت حاصل نہ ہوگی۔ اگر تم نے اس حکم عدم توارث پر عمل نہیں کیا اور باوجود دینی مخالفت کے محض قرابت کی بنا

پر کافر و مومن میں علاقہ توارث قائم رکھا تو اسلامی شوکت ختم ہو جائے گی۔ اس تشریح کی وجہ سے علماء نے یہ بات سمجھی ہے کہ کافر کافر کا وارث ہوتا ہے اور مسلمان مسلمان کا وارث ہوتا ہے لیکن کافر مسلمان اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا ہے۔ اختلاف دین میراث سے محرومی کا سبب ہے۔ پھر جب کافر کی وراثت کافر کو ملتی ہے تو کافر کو اپنی اولاد کے سارے معاملات میں ولایت بھی حاصل ہے۔ وہ اپنے اموال میں تصرفات بھی کر سکتا ہے یعنی اس آیت کی رو سے غیر مسلم اگر اسلامی مملکت کا شہری ہو تو اسلام اس کے بنیادی حقوق اور اس کی آزادیاں برقرار رکھتا ہے۔ یہ بات غیر مسلموں کے لیے بعضھم اولیاء بعض سے اسی طرح معلوم ہو رہی ہے جیسے خود مسلمانوں کے لیے بعضھم اولیاء بعض سے معلوم ہو رہی ہے الجصاص رقمطراز ہیں۔

اس آیت میں اس بات کی صاف رہنمائی ہے کہ کافروں کو اپنی خورد سال اولاد پر نکاح مالی تصرفات کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اس کے لیے عدالت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔

یہ بات کہ کافر مسلمان کا یا مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا۔ صرف اس آیت کے اشارے ہی سے معلوم نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس سے خود جناب رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی بات سمجھی ہے اجمالی طور پر صحیحین میں اور تفصیلاً مستدرک حاکم میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے جناب رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد آیا ہے۔

دو ملت والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا۔
پھر آپ نے یہی آیت گرامی والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض تلاوت فرمائی۔

اور یہ بھی اسی آیت سے مدلولاً معلوم کہ اختلاف دینین کی طرح اختلاف دارین بھی میراث سے مانع ہے۔ صرف میراث ہی سے نہیں بلکہ نکاح اور دوسرے معاملات سے بھی مانع ہے۔ اختلاف دین تو یہی ہے کہ مسلمان مرد ہے اور عورت کافر ہے یا اس کا عکس تو اس صورت میں نکاح درست نہیں ہے کہ یہ اختلاف دین ہے۔ اختلاف دارین کی بنا پر ایسے دو کافر بلا شبہ میراث سے محروم ہوں گے کہ ایک اسلامی مملکت کا شہری ہو اور دوسرا غیر اسلامی مملکت کا حربی ہو ان دونوں میں نہ وراثت ہے اور نہ نکاح۔ لیکن اگر دونوں مسلمان ہوں ایک دار حرب میں مقیم ہو۔ بیوی دار اسلام کی شہری ہو تو ان کا حکم یہ نہیں ہے دونوں ایک دوسرے کے وارث بھی ہوں گے اور نکاح بھی ہو سکتا ہے۔
الجصاص رقم طراز ہیں:

اختلاف دارین کا مطلب یہ ہے کہ ایک دار الاسلام کا باشندہ ہو خواہ مسلمان ہو یا شہریت لے کر ہو اور دوسرا حربی کافر ہو دار الحرب کا باشندہ ہو۔ لیکن اگر دونوں مسلمان ہوں تو ان کا حکم ایک ہی مملکت کا ہوگا اگرچہ ان میں سے ایک دار الحرب میں مقیم ہو اور دوسرا دار الاسلام میں ہو۔ (احکام القرآن)

ہجرت صداقت کی کسوٹی ہے

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی۔ راہ خدا میں جہاد کا فرض ادا کیا۔ یہی پکے اور سچے مسلمان ہیں۔
۷۴ ان کے لیے عزت و آبرو والی روزی ہے یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں سردار کے ساتھ والے مسلمان اعلیٰ ہیں گھر بیٹھنے والوں سے۔ آخرت میں ان کے لیے بڑی بھاری بخشش ہے اور دنیا میں عزت کی روزی یعنی غنیمت اور دوسرے مالی حقوق ؎

اس آیت میں ہجرت کو مسلمانوں کے لیے صداقت کی کسوٹی قرار دیا ہے فرمایا کہ سچے اور پکے مسلمان وہی ہیں جنھوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اور جنھوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ مسلمان کے دعوئ اعمال کی صداقت کی سب سے بڑی پہچان ایمان اور جہاد ہیں۔ کیونکہ ہجرت نام ہے اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینے اور حصول مقصد میں جو چیز حائل ہو ان کو چھوڑ دینے کا۔ خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشات ہوں حتیٰ کہ قوم ہو ملک ہو وطن ہو، اہل و عیال ہوں سب کو چھوڑ دینا۔ آج بھی علم و عمل کا کوئی گوشہ نہیں جس میں کامیابی بغیر اس کے مل سکے۔ انسان کی مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز ایسی نہیں جو ہجرت کے بغیر حاصل ہو سکے۔ یہ دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں۔ حیرت انگیز انکشافات انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی۔ تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام۔ قسم قسم کے وسائل معیشت کا ظہور۔ ملکوں کا عروج۔ قوموں کی بالادستی تمدن کی وسعت صرف انسان کے عمل ہجرت کے نتائج و ثمرات ہیں۔

جہاد کے معنے یہ ہیں کہ مقصود تک پہنچنے والی رکاوٹوں کو راستہ سے ہٹانا مال لگا کر جان کھپا کر۔ دنیا میں کوئی قوم کوئی ملک کوئی جماعت کوئی قبیلہ کوئی خاندان کوئی گھر کوئی شخص بغیر جہاد زندگی کی بہار نہیں پا سکتا۔

ہدایت کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ثبوت دے اور راستہ سے ضلالت کو ہٹائے۔ یہی دونوں ایمان کی صداقت کی کسوٹی ہیں۔ اور صحابہ کی پوری جماعت میں یہ دونوں چیزیں ایمان کے بعد اسی طرح عام تھیں جس طرح ہم میں روٹی کپڑا مکان کے لیے یہ دونوں عام ہیں۔

۲۔ یہ بھی یہ آیت بتا رہی ہے کہ تاریخی سرمائے میں اسلام کا اصلی سرمایہ مہاجرین و انصار ہیں۔ یہ دونوں حضور اقدس ﷺ کے اعجاز عمل کا شاہکار ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے اپنی نبوت کی صداقت کے لیے دو معجزے بطور دلیل نبوت پیش کیے ہیں ایک علمی دوسرا عملی، علمی معجزہ قرآن کی صورت میں اور عملی معجزہ مہاجرین و انصار کی صورت

؎ افادات شیخ الاسلام

ہیں یہ قرآن نے دونوں کا چہرہ دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

السابقون الاولون من المہاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔

مہاجرین وانصار میں جو لوگ سبقت کرنے والے سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔

مہاجرین میں السابقون الاولون۔ انصار میں السابقون الاولون اور پھر وہ لوگ جو ان دونوں جماعتوں کے قدم بقدم چلے اور بعد میں آئے سورہ حشر میں بھی مہاجرین وانصار کا یہی چہرہ پیش فرما کر ان کے بعد آنے والوں کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

والذین یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا۔

اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب بخشش فرما ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کھوٹ نہ بنا۔

اس لحاظ سے یہ آیت سب سے بڑی شہادت اور سب سے بڑا سارٹیفکیٹ ہے مہاجرین وانصار کے ایمان، ان کی قربانیوں، ان کی جان سپاریوں اور اللہ کی راہ میں بے حد و بے حساب جان نوازیوں کا۔ اولئک ھم المومنون حقا میں اگر حصر ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ مسند اور مسند الیہ کے درمیان ضمیر فصل آرہی ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ ان مہاجرین وانصار میں صفت ایمان کے سوا کچھ نہیں نہ کفر ہے اور نہ نفاق۔ نہ دل کا کھوٹ ہے اور نہ عمل کی خرابی ہے۔

اسلامی بھائی چارے کی بنا پر میراث نہیں

اور وہ لوگ جو اس کے بعد نعمت ایمان سے مالا مال ہوئے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمہاری ہمرکابی میں جہاد کیا وہ بھی تم ہی میں سے ہیں۔ اور رشتہ دار اللہ کی کتاب میں باہم زیادہ حقدار ہیں بلاشبہ اللہ کو سب باتوں کا پورا پورا علم ہے۔ یعنی مہاجرین میں جتنے بعد میں شامل ہوتے جائیں وہ سب باعتبار احکام مہاجرین اولین کی برادری میں شامل ہیں۔ ہجرت کے تقدم و تاخر کی وجہ سے صلح و جنگ یا وراثت وغیرہ کے احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں اگر قدیم مہاجرین کا کوئی رشتہ دار پیچھے مسلمان ہوا یا بعد میں ہجرت کر کے آیا تو وہ قدیم مہاجر کی میراث کا زیادہ حقدار ہے اگرچہ رفاقت قدیم اوروں سے ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کس کا کس قدر حق ہونا چاہیے۔ لہٰذا اس کے احکام سراسر علم و حکمت پر مبنی ہیں[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں سب سے پہلے ان مسلمانوں کو جنھوں نے اب تک ہجرت نہیں کی ہجرت کی ترغیب دی ہے اور بتایا ہے کہ تمہارے لیے بھی اسلامی معاشرہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس کی طرف سبقت کرو اور اس میں اپنا مقام حاصل کرو۔ اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو تاکید کی ہے کہ بعد میں ایمان لانے والوں اور ہجرت کرنے والوں کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھلے رکھو کہ وہ بھی تمہارے ہی دینی بھائی ہیں اور تمہارے ہی وجودملی کے اجزا ہیں۔ نہ ان کے مقابل میں تمہارے اندر کوئی احساس برتری ہو۔ نہ دلوں میں کوئی تنگی۔

آخر میں فرمایا۔ واولوالارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ۔ مطلب یہ ہے کہ مواخات اور عقد موالات کی بنا پر میراث قائم نہ ہوگی اور نہ وہ حقوق جو نسب اور مصاہرت کی بنیاد پر ملتے ہیں۔ مواخات کی وجہ سے ملیں گے۔ ان امور میں موالات اور مواخات دینی کی جگہ رشتہ داری کا تعلق بھی قانونی حقوق کی بنیاد رہے گا۔ یہ بات اس لیے ارشاد ہوئی ہے کہ ہجرت کے بعد نبی کریم ﷺ نے مہاجرین وانصار کے درمیان جو مواخات قائم کی تھی اس کی وجہ سے اب تک میراث کی بنیاد بھی موالات تھی۔ اب وہ ختم کردی گئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ عہد اول کے مہاجرین وانصار میں اسلامی اخوت کا ایسا ولولہ پیدا ہو گیا کہ خون کے عزیزوں سے کہیں زیادہ رشتہ ایمان کے ان عزیزوں کو اپنا سمجھنے لگے تھے حتی کہ اگر ایک مرجاتا تو رشتہ مواخات کا بھائی اس کا وارث سمجھا جاتا۔ انھوں نے اسلام کے رشتہ کو اختیار کرکے سارے رشتے قرابت کے خاندان کے قوم کے وطن کے زبان کے اور پیشوں کے سارے رشتے بھلا دیئے تھے صرف ایک ہی رشتہ کی لگن باقی رہ گئی تھی، ایمان واسلام اس لئے بیان فرمایا ہے کہ اولوالارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ جو قرابت دار ہیں وہ اللہ سبحانہ کے ٹھہرائے ہوئے قرابت دار ہیں اور صلہ رحمی کا رشتہ کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے بس وراثت کے اصل حقدار وہی ہیں۔ اب میراث کی تقسیم قرابت کی بنیاد پر ہوگی۔ موالات کی بنیاد پر نہ ہوگی۔ مواخات کی بنا پر وراثت کا انتظام عارضی تھا۔ قانون وراثت نازل ہونے کے بعد یہ عارضی انتظام خود بخود ختم ہوگیا۔

اس پر تو اتفاق ہے کہ قانون وراثت نازل ہونے کے مواخات کی بنیاد پر تقسیم وراثت کا عارضی اور وقتی انتظام ختم ہوگیا ہے لیکن اس میں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں کہ اس عارضی انتظام کو کب ختم کیا گیا۔

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے امام بخاری نے یہ بات لکھی ہے کہ مواخات اور عقد موالات کی بنیاد پر وراثت کی تقسیم کو سورہ نساء کی آیت ولکل جعلنا موالی مما ترك الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم سے ختم کیا گیا ہے۔ اور طبرانی کی روایت میں عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جانب یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ ایک شخص دوسرے سے عقد موالات کرتا تھا اس کی موت پر اس کا وارث ہوتا تھا سورہ

احزاب کی اس آیت کے ذریعے واو لوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ من المومنین والمہاجرین الا ان تفعلوا الی اولیاءکم معروفا وراثت کی تقسیم کا یہ معاملہ ختم کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں میں جوہری فرق ہے ایک مواخات ہے جو حضور اقدس ﷺ نے مدینہ کی ابتدائی زندگی میں مہاجرین کی بیگانگت کو ختم کرنے کے لیے قائم کی تھی۔ دوسرا عرب میں رائج عقد موالات ہے جس کی حقیقت قتادہ نے بیان کی ہے کہ ایک شخص دوسرے سے زمانہ جاہلیت میں معاہدہ کرتا تھا میرا خون تیرا خون تو میرا وارث میں تیرا وارث ہوں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بخاری کی روایت میں یہ بتا رہے ہیں کہ مواخات کی بنیاد پر تقسیم وراثت کو سورہ نساء کی آیت نے ختم کیا ہے اور طبرانی کی روایت میں بتا رہے ہیں کہ عرب جاہلیت کے عقد موالات کی بنیاد پر تقسیم وراثت کے معاملہ کو سورہ احزاب کی آیت نے ختم کیا۔

اس سورت میں قرآن کی آیت ـــــ واو لوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ میں اولوا الارحام سے مراد اس کے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنے ہیں اور کتاب اللہ سے مراد نازل شدہ قرآن نہیں بلکہ لوح محفوظ والا قرآن ہے۔ کیوں کہ سورہ انفال سورہ نساء سے پہلے نازل ہوئی ہے اس جملے کے ذریعے مواخات کی بنیاد پر تقسیم میراث کو ختم نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے ذریعے اہل قرابت کی اہمیت بتا دی گئی ہے کہ کسی بھی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے یہ اشتراک کہیں ہم عمری کہیں ہم درسی کہیں ہمسائیگی کہیں ہم مذاقی کہیں ہم پیشگی کہیں ہم وطنی کہیں ہم زمانی کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے۔ لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن رحم مادر ہے یہ ہم رحمی اللہ سبحانہ کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دست قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے۔ اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسان پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔ یہاں اللہ سبحانہ نے زیر تشریح آیت میں اسی کی طرف اپنے مخاطبوں کو متوجہ کیا ہے کہ ولایت ایمان اور ہجرت اپنی جگہ بڑا ہی مقدس اور پاکیزہ رشتہ ہے اس رشتہ کی بنیاد پر جو تعاون اور امداد ہو وہ بھی اعلیٰ اور اشرف ہے۔ لیکن قرابت اور رحم کا رشتہ اصلی اور اللہ سبحانہ کا قائم کردہ ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ صلہ رحمی ہو۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک ہو، لہذا دو مومنوں میں قریب رشتہ دار مومن غیر رشتہ دار مومن سے تمہاری نیکیوں، تمہاری ہمدردیوں کا زیادہ حقدار ہے ولایت کی ساری قسموں میں رشتہ دار مومن کو غیر رشتہ دار مومن کے مقابلہ میں ترجیح ہونی چاہیے۔ وراثت ہو یا نکاح سب میں رشتہ داری کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے حضور اقدس ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجئے کہ مجھے جنت مل جائے فرمایا خدا کی بندگی کرو شرک کرو نماز ادا کرو زکوٰۃ دو اور قرابت کا حق ادا کرو۔[1] ارشاد ہے جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔[2]

بہرحال یہاں دونوں کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان میں جب دونوں ولائتیں آمنے سامنے ہو جائیں تو ترجیح قرابت ولایت کو ہوگی بشرطیکہ یہ تقابل اہل ایمان کے درمیان ہو یعنی دونوں مومن ہوں۔ اسی لیے مومن مہاجرین کا ذکر کرنے کے بعد بعضہم اولیاء بعض فرمایا ہے اور یہاں اولیاء نہیں بلکہ اہل قرابت کا عنوان قائم کر کے بعضہم اولی ببعض فرمایا۔ اولیاء ولی کی جمع ہے صفت کا صیغہ ہے جبکہ اولیٰ اسم تفضیل ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادتی چاہتا ہے۔ اس لیے ذوی الارحام اہل ایمان کی ولایت کا پہلو عام اہل ایمان کی ولایت پر مقدم ہوگا۔

آیت قرآنی میں اولوالارحام آیا ہے اولو ذو کی جمع ہے اور ارحام رحم کی جمع ہے مطلب ہے رحموں والے یعنی رشتہ دار، علم فرائض میں اولوالارحام یا ذوی الارحام اصطلاحی لفظ ہے وہ لوگ جن کو قرآن نے اصحاب الفروض میں شمار نہ کیا ہو اور نہ وہ عصبہ ہوں۔

ان کی وراثت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے یعنی اگر میت کا کوئی وارث نہ ہو تو کیا وراثت ذوی الارحام کو ملتی ہے۔ صحابہ میں حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہم تابعین میں سے مسروق، محمد بن الحنفیہ، ابراہیم نخعی اور ائمہ میں سے سفیان ثوری اور امام ابوحنیفہ، امام احمد ذوی الارحام کی توریث کے قائل ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ذوی الارحام میں دو چیزیں ہوتی ہیں اسلام اور قرابت، اس لیے اسے اس شخص کے مقابلہ میں وراثت ملنی چاہیے جس میں قرابت نہیں صرف اسلام ہے۔

الحمدللہ سورہ انفال کی تشریحات سے آج مورخہ ۲ ذی الحج ۱۴۰۵ھ بروز جمعرات مطابق ۲۹ راگست ۱۹۸۵ء بوقت ۸ بج کر ۴۵ منٹ صبح فراغت ہوئی۔

ربنا تقبل منی معالم القرآن انک انت السمیع العلیم و تب علی انک انت التواب الرحیم

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب

التوبہ

سُورت کا نام

اس سورت کے نام مفسرین قرآن نے ایک سے زیادہ بتائے ہیں۔ التوبہ یہ نام اس لیے ہے کہ اس سورت کے آخر میں تین اہل ایمان کی توبہ قبول ہونے کا ذکر ہے۔ براءۃ اس لیے کہ اس کے آغاز میں مشرکین سے بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے۔ البحوث اس لیے کہ اس میں منافقین کے اسرار کو خوب کریدا گیا ہے۔ الفاضحہ اس لیے کہ اس میں منافقین کی زندگی کو شاہراہ عام پر رکھ دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی اس سورۃ کے متعدد نام دئے ہیں۔ المنقرۃ المعیرۃ، المبعثرہ، المشیرہ، المدمدمۃ، المخزیہ، المنکلہ، المشردہ، المقشقشہ، مشہور نام صرف دو ہیں۔ التوبہ اور البراءۃ۔

سُورت کے آغاز میں تسمیہ

قرآن کے دستور میں سورت کے آغاز میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے تاکہ دونوں سورتوں میں باہم امتیاز ہو جائے لیکن اس دستور کے خلاف یہاں بسم اللہ نہیں لکھی گئی۔ کیوں؟

اس کی وجہ شارحین قرآن نے ایک سے زیادہ بتائی ہیں مگر ان تمام میں اصلی اور بنیادی وجہ وہی ہے جس کی نشاندہی خود عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک پوچھنے والے کے جواب میں فرمائی ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ سورہ توبہ کے آغاز میں بسم اللہ کیوں نہیں لکھی ہے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ یہ تھا کہ آپ پر جب کئی کئی آیتوں والی سورتیں نازل ہوتی تھیں تو آپ وحی لکھنے والوں کو بلا کر فرما دیتے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں لگا دو سورۃ انفال ان سورتوں میں سے ہے جو مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے اوائل میں سے ہے اور سورۂ برات ان

ان سورتوں میں سے ہے جو نزول کے اعتبار سے آخر میں ہے اور دونوں سورتوں میں ہم آہنگی ہے اس لیے میں نے دونوں کو ساتھ ساتھ کر دیا۔ حضور اقدس ﷺ دنیا سے رحلت فرمائے دار البقا ہو گئے لیکن آپ نے کھول کر یہ بات ارشاد نہیں فرمائی کہ یہ سورت انفال سے متعلق ہے اس وجہ سے میں نے دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی ہے۔

مطلب یہی ہے کہ اس سورت میں بسم اللہ موجود نہ تھی جو کاتبین وحی نے لکھا اور جس کو ابوبکر کے زمانہ میں نقل کیا گیا۔ اصل اور بنیادی وجہ یہی ہے باقی باتیں سب مختلف لوگوں کی فکری جولانیاں ہیں۔ اس سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قرآن کی حفاظت میں احساسات کس قدر لطیف تھے کہ انھوں نے اپنی رائے سے اس سورت پر بسم اللہ لکھنا بھی گوارا نہیں کیا بلکہ قرآن کو حضور اقدس ﷺ سے لینے اور جیسا دیا گیا تھا ویسا ہی اس کو محفوظ رکھنے میں کس درجہ اہتمام تھا۔ اس لیے اصل اور بنیادی وجہ یہی ہے کہ چونکہ حضورؐ نے خود بسم اللہ نہیں لکھوائی اس لیے صحابہ نے بھی نہیں لکھی۔

علماء نے اس کی اور وجوہ بھی بتائی ہیں۔ ان کی حیثیت علت کی نہیں بلکہ حکمت کی ہے۔ مثلاً علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں المبرد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عرب میں یہ دستور تھا جب قوموں میں باہم معاہدہ ہوتا۔ ایک فریق معاہدے کو ختم کرنا چاہتا۔ اور عہد توڑنے کی اطلاع دوسرے فریق کو دیتا تو اس دستاویز کو بسم اللہ سے مزین نہ کرتا۔ چونکہ اس سورت میں اس عہد کے ختم ہونے کا اعلان ہو رہا ہے جو حضور اقدس ﷺ اور مشرکین مکہ کے درمیان تھا۔ اس لیے اس کی پیشانی پر بسملہ نہیں لکھی گئی یہی پس منظر ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کا جب ان سے دریافت کیا گیا کہ سورہ براءت کے آغاز میں بسم اللہ کیوں نہیں؟ فرمایا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم امن کا پروانہ ہے جب کہ سورہ براءت کے ذریعے اعلانِ جنگ ہے۔

سورہ برات روایت و تاریخ کی آغوش میں

اس سورت کا واقعات کی روشنی میں مطالعہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ صلح حدیبیہ ۶ھ سے لے کر ۹ھ کے اوائل تک کے حالات پیش نظر ہوں۔

اس عرصہ میں پورے عرب کی تبلیغ کا مسئلہ۔ اور پھر عرب سے باہر دنیا کی تبلیغ کا مسئلہ نبوت کے پیش نظر تھا۔ چوں کہ آپؐ کی رسالت عالمی اور آفاقی تھی اس لیے انتظامات تبلیغ بھی اہتمام کے متقاضی تھے مگر قریش کے جوش عداوت و فساد نے آغاز ہی میں ایسے خوفناک حالات پیدا کر دیئے کہ پہلے مسلمانوں کی ایک خاص بڑی جماعت کو وطن چھوڑ کر

حبش میں پناہ لینی پڑی، تاکہ وہ ظلم و ستم کی اس آگ سے محفوظ رہیں جو قریش نے مکہ اور آس پاس کے علاقوں میں بھڑکا رکھی تھی اور اطمینان سے خدائے واحد کی عبادت کر سکیں ——— پھر اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کو قبول کرنے کیلیے اہل یثرب کے دل کھول دیئے اور مسلمانوں کے لیے ایک نیا مامن میسر آ گیا۔ قریش نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور رزم و پیکار کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ قریش کی عداوت دیکھ کر بعض دوسرے قبیلے بھی مسلمانوں کے نئے مرکز یعنی مدینہ منورہ پر یورشوں کے منصوبے تیار کرنے لگے تاکہ مال بھی ملے اور قریش مکہ کی نظروں میں اعتبار بھی بڑھے۔ حضور اقدس ﷺ نے مشکلات کے ان ہجوم میں بھی تبلیغ اور تعلیم و تزکیہ کا سلسلہ مقدسہ جاری رکھا۔ مگر جو دلجمعی اور یکسوئی لازم تھی۔ اس کا انتظام معاہدہ حدیبیہ کے بعد ہی ہوا۔ جس کے مطابق قریش دس سال کے لیے جنگ سے دست بردار ہو چکے تھے۔ حدیبیہ کے بعد دعوت و تبلیغ اور اسلامی نظام کی قوت کی جو تدبیریں اختیار کی گئیں۔ ان کی بدولت دو سال کے اندر ہی اسلام اس قدر پھیل گیا کہ دنیائے کفر و شرک اس کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئی۔

دراصل قریش ایک ایسے چکر میں پڑ گئے تھے۔ جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ان کو نظر نہ آتا تھا۔ ان میں لڑنے کی تاب نہیں تھی۔ ان کی معاشی زندگی کا دار و مدار تجارت پر تھا۔ لڑائیوں سے تجارت بے حد متاثر ہوئی۔ اسلام کا حلقہ قریش کی سختیوں کے باوجود وسیع ہوتا جا رہا تھا صلح حدیبیہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ قبائل عرب فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں شریک جنگ ہو جائیں۔ چنانچہ اسی وقت بنو خزاعہ نے جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔ ان دونوں قبیلوں کے درمیان مدت سے رقابت چلی آ رہی تھی۔ صلح حدیبیہ ان دونوں پر بھی حاوی تھی۔ صلح پر اٹھارہ یا انیس مہینے گذر چکے تھے کہ رجب یا شعبان ۸ھ میں بنو بکر میں سے نوفل بن ورقاء نے اپنے قبیلے کے بہت سے افراد ساتھ لے کر بنو خزاعہ پر اچانک شبخون مارا بنو خزاعہ نے حد حرم میں پناہ لی۔ جہاں کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا حملہ آور رک گئے مگر نوفل نے کہا کہ تم لوگوں کو حد حرم میں چوریاں کرتے ہوئے باک نہیں۔ پھر اپنا خون بہا لینے میں کیوں رکتے ہو۔ یہ موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ چنانچہ حملہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ بنو خزاعہ نے مکہ مکرمہ پہنچ کر بدیل بن ورقاء اور اس کے مولیٰ رافع کے مکانوں میں پناہ لی۔ بنو خزاعہ میں سے ۲۵ ناقہ سواروں کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ کر بارگاہ رسالت میں فریاد کی پھر بدیل بن ورقاء نے حاضر ہو کر حالات عرض کیے حضور اقدس ﷺ کو سن کر سخت رنج ہوا۔ یہ صریح بد عہدی تھی۔ جس کے ذمہ دار قریش تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے ایک قاصد قریش کے پاس روانہ کیا اور تین صورتیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی ایک منظور کر لو۔

۱۔ مقتولوں کا خون بہا دلایا جائے۔

۲۔ قریش بنو بکر کی حمایت سے دست کشی کا اعلان کریں۔

صاف صاف کہہ دیں کہ معاہدہ حدیبیہ ٹوٹ گیا۔

۲- وہ اس معاہدہ کو توڑ کر اسلام سے آخری اور فیصلہ کن مقابلہ کرنا چاہتے تھے لیکن حضور اقدس ﷺ نے ان کی عہد شکنی کے بعد ان کو پنپنے کا موقعہ نہ دیا اور مکہ پر حملہ کر کے رمضان ۸ھ میں اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد اسلام فتح مکہ کے بعد سیاسی طور پر تومند ہو چکا تھا اور عرب کی قسمت کا قطعی فیصلہ ہو چکا تھا کہ اب اسے دار الاسلام بن کر رہنا ہے۔ اس واقعہ پر ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ عرب کا بیشتر حصہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا تھا اور نظام کفر کے چند پراگندہ عناصر مختلف گوشوں میں باقی رہ گئے تھے اس نتیجہ کے حد کمال تک پہنچنے میں ان حالات نے بھی کام کیا جو شمال میں رومی حکومت کی سرحد پر رونما ہو رہے تھے۔ حضور اقدس ﷺ تیس ہزار کی ہمرکابی میں رومی سرحد پر گئے لیکن رومیوں نے آپ کے مقابلے پر آنے سے پہلوتہی کی۔ اس کے نتیجہ میں تمام عرب پر آپ کی اور آپ کے دین کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور اس کا ثمرہ دنیا نے دیکھا کہ عرب کے گوشے گوشے سے وفد پر وفد آنے شروع ہوئے۔ اور اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گئے۔

داخلی اور خارجی خطرے

اگرچہ اسلام تومند ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے سامنے دو خطرے تھے ایک داخلی یعنی منافقین کا دوسرا خارجی یعنی کافروں کا۔ یہ دونوں خطرے سامنے تھے۔ اس سورت میں ان دونوں خطروں کا پورا پورا چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

منافقین کا خطرہ

مشہور ہے کہ عدو واحد داخل الباب انکی من سبعین عدوا خارج الباب دروازہ کے اندر ایک دشمن باہر کے ستر دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ ایک عام غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ دانستہ یا نادانستہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ منافقوں کا گروہ کوئی خاص سازشی گروہ تھا۔ جو جاسوسوں کی طرح بھیس بدل کر مسلمانوں میں رہنے لگا تھا باہر نکلتا تو مسلمان بن جاتا۔ ایسا نہیں بلکہ ان لوگوں نے اسلام کو بطور دین و اعتقاد کے اسی طرح اختیار کیا تھا جس طرح دوسرے مسلمانوں نے اختیار کیا اسی سورت میں کفروا بعد اسلامھم ہے یعنی اسلام کو اپنا کر پھر کفر کی باتیں کیں۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے وہ نماز پڑھتے تھے روزے رکھتے تھے۔ اسلام کے طریقے پر اولاد کی پرورش کرتے تھے۔ جہاں تک ایک دین کو بطور دین اختیار کر لینے کا تعلق ہے کوئی بات ایسی نہ تھی جو بظاہر ان کے مسلمان ہونے کے خلاف ہو۔ تاہم قرآن نے فیصلہ کیا کہ یہ مردم شماری کے مسلمان ہیں۔ کیونکہ اسلام کا گھونٹ تو انھوں نے پی لیا لیکن حلق کے نیچے نہیں اترا۔ کسی تعلیم کے اختیار کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو روح پیدا ہونی چاہیے اس سے بالکل محروم تھے۔ اخلاص و صداقت کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جگہ نہ تھی وہ اللہ

کا کلام سنتے مگر اس لیے نہیں کہ عمل کریں بلکہ اس لیے کہ صرف سنتے رہیں۔ وہ نماز پڑھتے مگر بے دلی کے ساتھ۔ خیرات کرتے مگر مجبور ہو کر ان کے دلوں میں دین سے زیادہ دنیا کا عشق تھا۔ اسلام کے جو احکام ان کی شخصی اغراض کے خلاف نہ ہوتے ان پر خوشی خوشی عمل کرتے جو خلاف ہوتے ان سے گریز کر جاتے۔ جب کبھی خوش حالیوں کا موقعہ ہوتا تو وہ سب کے سب مومن تھے۔ جب کبھی قربانیوں کا موقعہ آجاتا تو آخری صفوں میں بھی نظر نہ آتے۔ جہاد کے تصور سے ان کی روحیں لرز جاتیں۔ انفاق کا حکم ان کے لیے موت کا پیغام ہوتا۔ اسلام کے دشمنوں سے سازگاریاں رکھنے میں انہیں کوئی تامل نہ ہوتا وہ سمجھتے تھے کہ دونوں طرف ملے رہنے میں مصلحت ہے۔

ایمان و کفر کی طرح نفاق کی تمام حالتیں یکساں نہیں۔ چونکہ اصل کے اعتبار سے یہ حالت بھی انکار ہی کی ایک اقراری صورت ہے اس لیے جب بڑھتی ہے تو انکار قطعی ہی کی طرف جاتی ہے اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں۔ اسی سورت میں ہے و ممن حولکم من الاعراب منافقون کسی کا نفاق زیادہ تر یہ تھا کہ ہجرت سے جی چراتے تھے۔ کسی پر انفاق مال شاق تھا۔ کوئی جہاد سے بچنا چاہتا تھا کسی پر نماز کا قیام سخت گذرتا تھا کچھ ایسے تھے کہ احکام الٰہی اور آیاتِ قرآنی کی ہنسی اڑاتے تھے اور اس تاک میں رہتے کہ مسلمانوں پر کوئی آفت آپڑے تو کھلم کھلا دشمنوں کے کیمپ میں کھڑے نظر آئیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان سب نے اسلام بطور دین کے قبول کیا تھا اور مسلمانوں ہی میں ان کا شمار ہوتا تھا وہ خود بھی اپنے کو مسلمان سمجھتے تھے اور مسلمان بھی ان کو مسلمان سمجھتے تھے۔

اس سورت میں قرآن نے ان منافقین کا ایسا بھرپور چہرہ پیش کیا ہے کہ ان کے اعمال و خصائص کے اس میں مذکور ہونے کی رعایت سے اس کے نام رکھے گئے۔ الفاضحہ کیوں کہ اس میں منافقین کی پردہ دری کر کے رسوائی کی گئی ہے۔ المقشقشہ کیونکہ یہ سورت نفاق سے برائت کا سامان مہیا کرتی ہے۔ ایسے اور بہت سے نام جن کا ذکر پہلے سن چکے ہو۔

بیرونی خطرہ

جب اسلام کی دعوت زیادہ پھیل گئی اور پورے عرب کی تسخیر عمل میں آگئی تو وہ عیسائی ریاستیں جو عرب اور شام کے سرحدی علاقہ میں قائم ہو گئیں تھیں اور رومی حکومت کے ماتحت تھیں اس تحریک کی ترقی گوارا نہ کر سکیں اور رومی شہنشاہی کی پشت پناہی کی وجہ سے مغرور ہو کر آمادہ پیکار ہو گئیں سب سے پہلا معاملہ حارث بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا پیش آیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعوت اسلام کا خط دے کر موتہ روانہ کیا۔ جہاں کا رئیس شرجیل بن عمرو غسانی تھا اس نے انہیں بغیر کسی جرم کے قتل کرا دیا۔ اس صریح ظلم و غدر نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ پر

مور کر دیا اور ایک فوج سنہ ۸ ہجری میں روانہ کی۔ اُس وقت شہنشاہ قسطنطنیہ بھی شام میں مقیم تھا اس سے رئیس موتہ نے مدد مانگی اور شاہی فوج بھی میدان میں آگئی لیکن اس کے باوجود مسلمان فوج ۳ ہزار فوجیوں پر مشتمل اس شاہی فوج کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئی جس کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ اس دلیری کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمان فوجی بالکل پس جاتے لیکن سارا عرب یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کی نسبت کے اس مقابلہ میں کفار مسلمانوں پر غالب نہ آسکے اور مسلمان کامیاب رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام اور اس سے متصل رہنے والے نیم آزاد قبائل، عراق کے قریب بسنے والے نجدی قبائل اسلام کی طرف متوجہ ہو گئے اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد شام کے تمام عرب قبائل نے تہیہ کر لیا کہ پوری قوت سے مسلمانوں پر حملہ کریں۔ شہنشاہ قسطنطنیہ نے بھی ان کی اعانت کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ابھی ایک سال نہیں گذرا تھا کہ شاہی فوجیں شام میں جمع ہونے لگیں اور حضور اقدس ﷺ کو اس دفاعی مہم میں خود نکلنا پڑا۔ یہی دفاعی اقدام ہے جو غزوہ تبوک کے نام سے مشہور ہوا لیکن جب حضور اقدس ﷺ تبوک پہنچے تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اس بیباکانہ اقدام نے دشمنوں کے حوصلے پست کر دیئے اور اب حملہ کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

یہ ہے سورہ برأت کا وہ پس منظر جسے نگاہ میں رکھنے کے بعد آپ آسانی سے ان مسائل کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں جن سے سورۃ توبہ میں بحث کی گئی ہے۔

تاریخِ نزول سُورۃ توبہ

امام بخاری نے براء بن عازب سے روایت کی ہے کہ آخری سورت جو نازل ہوئی برأت ہے اخر سورۃ نزلت تامۃ اور حاکم وغیرہ نے ابی بن کعب اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ سب سے آخری آیتیں جو نازل ہوئیں الم البقرہ کی دو آیتیں ہیں۔ لیکن تمام روایتوں کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ برأت سب سے آخری نہیں ہو سکتی۔ کم از کم واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ اور سورہ نصر اس کے بعد نازل ہوئی ہے۔ لیکن ان میں کوئی تضاد نہیں۔ آیتوں میں باعتبار نزول آخری واتقوا یوما ترجعون ہے اور سورتوں میں باعتبار نزول آخری سورت برأت ہے۔ براء نے سورت کی بات بتائی ہے جب کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیت کی بات ارشاد فرمائی ہے۔ باقی سورہ اذا جاء نصر اللہ کے نزول میں آخری ہونے کی بات تو علامہ زمخشری کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ

اگر یہ سورت نزول میں آخری ہے تو اس کے شروع میں اذا کیوں لایا گیا ہے جو استقبال کے معنے کی

طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

اگرچہ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں اور علامہ طیبی نے کشف میں اس کے جوابات دیئے مگر تشفی بخش نہیں ہیں۔

بہر حال سورہ برارت آخر میں ہو یا نہ ہو لیکن باعتبار نزول کے یہ آخری کلام ضرور ہے۔ اور اسی لیے بہ حیثیت مجموعی اس سورت میں اور آخری دو آیتوں میں خصوصیت کے ساتھ اسی طرح کا طرز خطاب پایا جاتا ہے جیسے امت کو آخری احکام دیئے جا رہے ہیں یا آخری موعظت کا پیام ہو۔

چنانچہ آخری دو آیتوں میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت مخاطب تھی۔ فرمایا کہ اللہ کا رسول تم میں آ گیا اور اس نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے تم میں نہیں آیا۔ سنت الٰہی کے مطابق تم ہی میں پیدا ہوا۔ اور چونکہ وہ تم ہی میں سے ہے اس لیے اول سے آخر تک اس کی ساری باتیں تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اس کا لڑکپن بھی تم میں گذرا۔ اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے۔ پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا تو اس کی زندگی کا کوئی گوشہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا۔ اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ پھر جو کچھ گذرنا تھا گذرا اور تم نے مظلومی و بیکسی کے اعلان بھی سنے۔ فتح و کامرانی میں اس کی تصدیق بھی کر لی۔ تم میں کوئی نہیں جو اس کی بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک ایک بات کی سچائی آزما نہ لی ہو۔

یہ بات یہاں کیوں کہی گئی۔ صرف اس لیے کہ یہ سورت اس وقت نازل ہوئی۔ جب تمام عرب میں کلمۂ حق کا بول بالا ہو چکا تھا۔ اور یہ آخری پیغام تھا۔ بہر حال سورہ برارت ایک وداعی پیغام ہے اس کا ابتدائی حصہ آیات ۱ تا چالیس تک فتح مکہ کے بعد ۹ھ ہجری میں نازل ہوا سورت کا بقیہ حصہ بھی ۹ھ ہجری میں غزوہ تبوک میں اور اس کے بعد نازل ہوا۔

سورہ انفال ——— سورہ برارت

یہ دو سورتیں ہیں۔ ان دونوں میں باہم اس درجہ ربط، آمیزش اور ملاپ ہے کہ دونوں کے درمیان جدائی کی عام نشانی بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی نہیں لکھی گئی۔ اس موضوع پر شارحین قرآن نے بہت کم لکھا ہے لیکن مولانا عثمانی رحمہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ بار بار کیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:

سورہ انفال اوائل ہجرت میں اور یہ سورۂ برارت اواخر ہجرت میں نازل ہوئی۔ آنحضرت ﷺ کی عادت تھی کہ جو آیات قرآنی نازل ہوتیں۔ فرما دیتے کہ ان کو فلاں سورت میں فلاں موقعہ پر رکھو۔ ان آیات کے متعلق جنہیں سورہ توبہ یا برارت کہا جاتا ہے آپ نے کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ کسی سورت میں درج کی جائیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

مستقل سورت ہے کسی دوسری سورت کا جز نہیں لیکن عام قاعدہ یہ تھا کہ جب نئی سورت نازل ہوتی تو پہلی سورت سے جدا کرنے کے لیے بسم اللہ آتی تھی۔ سورہ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ آئی جو مشعر ہے کہ یہ جداگانہ سورت نہیں۔ ان وجوہ پر نظر کر کے مصاحف عثمانیہ میں اس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی۔ لیکن کتابت میں اس کے اور انفال کے درمیان فصل کر دیا گیا کہ نہ پوری طرح اس کا استقلال ظاہر ہو اور نہ دوسری سورت کا جز ہو۔ باقی انفال کے بعد متصل رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ انفال نزول میں مقدم ہے بلا خاص وجہ کے موخر کیوں کی جائے۔ اور دونوں کے مضامین باہم اس قدر مربوط و متسق واقع ہوئے ہیں کہ گویا برأت کو انفال کا تتمہ اور تکملہ کہا جا سکتا ہے۔ سورۃ انفال تمام تر غزوہ بدر اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔ یوم بدر کو قرآن نے یوم الفرقان کہا کیونکہ اس نے حق و باطل اسلام و کفر اور مومنین و مشرکین کی پوزیشن کو بالکل جدا کر کے دکھلا دیا۔ بدر کا معرکہ فی الحقیقت خالص اسلام کی عالمگیر اور طاقتور برادری کی تعمیر کا سنگِ بنیاد اور حکومتِ الٰہی کی تاسیس کا دیباچہ تھا والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض کے مقابلے میں جس خالص اسلامی برادری کی طرف انفال کے خاتمہ پر الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض و فساد کبیر کہہ کر توجہ دلائی ہے۔ اس کا صریح اقتضا ہے کہ اس عالمگیر برادری کا کوئی طاقتور اور زبردست مرکز حسی طور پر بھی دنیا میں قائم ہو۔ جو ظاہر ہے کہ جزیرۃ العرب کے سوا نہیں ہو سکتا جس کا صدر مقام مکہ معظمہ ہے۔ انفال کے آخر میں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ جو مسلمان مکہ وغیرہ سے ہجرت کر کے نہیں آئے اور کافروں کے زیرِ سایہ زندگی بسر کر رہے ہیں دارالاسلام کے آزاد مسلمانوں پر ان کی ولایت و رفاقت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے ما لکم من ولایتھم من شیء حتی یھاجروا۔ ہاں حسبِ استطاعت ان کے لیے دینی مدد بہم پہنچائی جانی چاہیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرکز اسلام میں موالات اور اخوتِ اسلامی کی کڑیوں کو پوری مضبوطی کے ساتھ جوڑنے کے لیے دو باتوں میں سے ایک بات ہونی چاہیے یا تمام عرب کے مسلمان ترکِ وطن کر کے مدینہ آ جائیں اور اسلامی برادری میں بے روک ٹوک شامل ہوں۔ اور یا آزاد مسلمان مجاہدانہ قربانیوں سے کفر کی قوت توڑ کر جزیرۃ العرب کی سطح ایسی ہموار کر دیں کہ کسی مسلمان کو ہجرت کی ضرورت باقی نہ رہے یعنی سارا جزیرۃ العرب تقریباً خالص اسلامی برادری کا ایسا ٹھوس مرکز اور غیر مخلوط مستقر بن جائے جس کے دامن سے عالمگیر اسلامی برادری کا نہایت محکم و شاندار مستقبل وابستہ ہو سکے۔ یہ دوسری صورت بھی ایسی تھی جس سے روز روز کے فتنہ و فساد کی بیخ کنی ہو سکتی تھی اور مرکز اسلام کفار کے اندرونی فتنوں سے بالکل پاک صاف اور آئے دن کی بدعہدیوں اور ستم رانیوں سے پورا مامون و مطمئن ہو کر تمام دنیا کو اپنی عالمگیر برادری میں داخل ہونے کی دعوت دے سکتا تھا۔ اسی اعلیٰ اور پاک مقصد کے لیے مسلمانوں نے ۲ھ ہجری میں پہلا قدم میدانِ بدر کی طرف اٹھایا تھا جو آخر کار ۸ھ میں مکہ معظمہ کی فتح عظیم پر منتج ہوا۔ جو فتنے اشاعت یا حفاظتِ اسلام کی راہ میں آڑے تھے فتح مکہ نے

ان کی جڑوں پر تیشہ لگایا۔ لیکن ضرورت تھی کہ وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ کے امتثال میں اسلامی برادری کے مرکز اور حکومت الٰہیہ کے مستقر کو فتنہ کے جراثیم سے بالکل صاف کر دیا جائے تاکہ وہاں سے تمام دنیا کو اسلامی دیانت اور حقیقی تہذیب کی دعوت دیتے وقت تقریباً سارا جزیرۃ العرب یک جان و یک زبان ہو اور کوئی اندرونی کمزوری یا خلفشار بیرونی مزاحمتوں کے ساتھ مل کر اس مقدس مشن کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ بس جزیرۃ العرب کو ہر قسم کی کمزوریوں اور فتنوں سے پاک کرنے اور عالمگیر دعوت اسلامی کے بلند ترین مقام پر کھڑا کرنے کے لیے لازم ہوا کہ دعوت اسلام کا مرکز خالص اسلامیت کے رنگ میں رنگین ہو۔ اس کے قلب و جگر سے صدائے حق کے سوا کوئی دوسری آواز نکل کر دنیا کے کانوں میں نہ پہنچے۔ پورا جزیرہ سارے جہان کا معلم اور ہادی بنے اور ایمان و کفر کی کشمکش کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔ سورہ براءت کے مضامین کا یہی حاصل ہے۔ چنانچہ چند روز میں خدا کی رحمت اور سچائی کی طاقت سے مرکز اسلام ہر طرح کے وساوس کفر و شرک سے پاک ہو گیا اور سارا عرب متحد ہو کر شخص واحد کی طرح تمام عالم میں نور ہدایت اور عالمگیر اخوت اسلامی پھیلانے کا کفیل و ضامن بنا فللہ الحمد۔ الغرض سورہ انفال میں جس چیز کی ابتدا تھی سورہ توبہ میں اس کی انتہاء ہے۔ اسی لیے سے اول باآخر نسبتے دارد کے موافق براءت کو انفال کے ساتھ بطور تکملہ ملحق کر دیا گیا۔ اور یہی مناسبات ہیں جن کو علماء نے لکھا ہے۔

آیاتہا ۱۲۹ (۹) سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ (۱۱۳) رکوعاتہا ۱۶

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ
اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝٢
وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ
اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى
اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٣ اِلَّا الَّذِيْنَ
عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ
يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝٤

اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ان مشرکین کی جانب جن سے اے مسلمانوں تم نے عہد وپیمان کیا تھا بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے لہٰذا اے مشرکو! تم ملک میں چار مہینے تک چل پھر سکتے ہو اور یاد رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کرو گے۔ اور سمجھ لو کہ اللہ کفر کو رسوا کر کے چھوڑے گا۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے یہ اعلان عام ہے حج کے بڑے دن کہ اللہ و رسول مشرکین کے معاہدوں سے بری الذمہ ہیں۔ لہٰذا اگر ظلم و

سرکشی سے توبہ کرو تو یہ تمہارے لیے مفید ہے اور اگر نہ مانو گے تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور جو لوگ کفر و شرک کو اپنائے ہوئے ہیں ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔[۲] ہاں مشرکین میں سے وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر انھوں نے اپنے عہد کے نباہنے میں بالکل کوتاہی اور کمی نہیں کی۔ اور نہ انھوں نے تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ لہٰذا چاہیے کہ ان سے جس قدر مدت کے لیے عہد ہوا ہے اس مدت کو پورا کرو اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔[۳]

مفردات کے معانی

براءۃ یہ برئی یبرأ کا مصدر ہے بری من الدین اس وقت بولا جاتا ہے جب قرض سے سبکدوش ہو جائے یہاں معنے معاہدہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے ہیں اور اس کی حیثیت وہی ہے جو عربی میں ھذا الکتاب من فلان الی فلان کی ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں برأ براء تبرأ۔ تبری کے معنے ان چیزوں سے چھٹکارا پانے اور دور رہنے کے ہیں جن کا قرب ناگوار ہو۔

اذان یہ تاذین سے اسم ہے۔ ایسی پکار جو کافروں میں ہنگامہ کر دے اسی سے نماز کے لیے اذان ہے اذن بہ کے معنے اعلان کرنے کے ہیں یہی معنی آذن کے ہیں۔ اذِن جب باب سمع سے ہو، تو اس کے معنے کان لگانا متوجہ ہونا ہیں۔ یہاں معنے اعلان عام اور اطلاع عام کے ہیں۔

معاہدین کا عہد ختم

حضور اقدس ﷺ اسلام کی دعوت لے کر دنیا میں تشریف لائے۔ آپ نے اپنی دعوت کو دلائل اور حقائق کے لباس میں پیش کیا۔ یہ اعلان کیا کہ اسلام کو کسی کے حلقوم میں جبراً نہ ڈالا جائے گا یہ سب کچھ خوشی اور رضا کا معاملہ ہے۔ دلیل کی پنی تلی ترازو میں رکھ کر اسلام کو برضا و رغبت قبول کرو۔ اس کے باوجود مشرکین نے اسے بزور شمشیر دبانا چاہا۔ اہل ایمان کو قسم قسم کی تکلیفیں دیں۔ پورے ماحول میں کوئی قتل اور تعذیب سے بغیر کسی حلیف کی مدد کے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی بڑی تعداد کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ جس کا جہاں سر سمایا وہاں روانہ ہو گیا حضور اقدس ﷺ کی

ذاتِ گرامی ان کی ایذاؤں اور سختیوں کا نشانہ بنی، انھوں نے علانیہ آپ کے قتل، آپ کے شہر بدر کرنے اور آپ کو گرفتار کرنے کا دارالندوہ میں مشورہ کیا۔ آخر میں قتل کی پوری اسکیم کو اپنا کر رہے۔ اللہ سبحانہ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا۔ آپ اور آپ کے ساتھی مدینہ روانہ ہو گئے۔ مدینہ میں ایسے افراد آپ کو دستیاب ہو گئے جنھوں نے آپ کی دعوت کو اپنانے اور اس کی مدد کا فیصلہ کر لیا۔ آپ کے مدینہ پہنچنے پر آپ کے اور مشرکین مکہ کے درمیان آج کی زبان میں جنگی حالات تھے۔ مدینہ میں آپ نے یہود و نصاریٰ سے صلح و امن کا معاہدہ کیا۔ لیکن انھوں نے عہد شکنی کی اور مشرکین مکہ کی مدد کی۔ حدیبیہ میں آپ نے مشرکین سے دس سال کے لیے امن و امان کا عہد کیا۔ آپ نے یہ معاہدہ کمزوری کی بنا پر نہیں طاقتور ہو کر کیا۔ مقصد یہ تھا کہ امن و امان ہو اور پر امن ماحول میں دلائل و حقائق کی روشنی میں لوگوں کو اسلام کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملے۔ اس معاہدہ میں بنو خزاعہ حضور اقدس کے حلیف اور بنو بکر قریش مکہ کے حلیف کی حیثیت سے معاہدے کے ارکان تھے۔ بنو بکر نے خزاعہ کے خلاف جارحانہ اقدام کیا اور قریش نے بنو بکر کی اسلحہ سے امداد کی۔ اس کے نتیجہ میں امن کا ماحول بدامنی میں صلح جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ یہ صورتِ حال فتح مکہ تک رہی اور فتح مکہ کا باعث بنی۔ اسی کے نتیجے میں شرک کی حکومت ختم ہو گئی۔ احوال و ظروف اور واقعات نے بتا دیا کہ مشرکین کے یہاں عہد و پیماں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ نبوت کی تاریخ کا جو بھی مطالعہ کرے گا وہ یہ ضرور محسوس کرے گا کہ جو جماعتیں حضور اقدس ﷺ کی مخالف تھیں ان کے تمام کام اول تا آخر تک ظلم و تشدد دغا و فریب وحشت و خونخواری پر مبنی رہے اور حضور اقدس ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا ان کا ایک ایک فعل صبر و تحمل درستی و دیانت اور عفو و بخشش کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ تھا مظلومی میں صبر، مقابلہ میں عزم، معاملہ میں راست بازی، طاقت و اختیار میں درگذر تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں جو کسی ایک زندگی میں اس طرح یکجا نہیں ہو سکتے۔

معاہدات کی منسوخی کا اعلان

(۱) اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ان مشرکین کی جانب جن سے اے مسلمانو تم نے عہد کیا ہے بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے۔ لہٰذا اے مشرکو تم ملک میں چار ماہ تک چل پھر سکتے ہو اور یاد رکھو کہ اللہ کو تم عاجز نہ کر سکو گے اور سمجھ لو کہ اللہ سبحانہ کفر کو رسوا کر کے چھوڑے گا ۶ھ ہجری بمقام حدیبیہ جب نبی کریم ﷺ اور قریش کے درمیان معاہدہ صلح ہو چکا تو بنی خزاعہ جو مسلمانوں کے اور بنو بکر جو قریش کے حلیف تھے بنی بکر نے معاہدہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے اسلحہ وغیرہ سے ظالم حملہ آوروں کی مدد کی۔ اس طرح قریش اور ان کے حلیف دونوں معاہدہ حدیبیہ پر قائم نہ رہے۔ جس کے جواب میں ۸ھ ہجری میں نبی کریم ﷺ نے اچانک حملہ کر کے مکہ معظمہ بڑی

آسانی سے فتح کر لیا ان قبائل کے سوا دوسرے قبائل عرب سے مسلمانوں کا میعادی یا غیر میعادی معاہدہ تھا جن میں سے کچھ اپنے معاہدے پر قائم رہے اور بہت سے قبائل وہ تھے جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہوا تھا اس سورت کی مختلف آیات مختلف قبائل کے متعلق نازل ہوئی ہیں شروع کی آیات میں غالباً ان مشرکین مکہ کا ذکر ہے جن سے معاہدہ تھا اگر میعادی تھا ان کو اطلاع کر دی گئی کہ ہم معاہدہ نہیں رکھنا چاہتے چار ماہ کی مہلت تم کو دی جاتی ہے کہ اس مدت کے اندر اسلامی برادری میں شامل ہو جاؤ یا وطن چھوڑ کر مرکز ایمان و توحید کو اپنے وجود سے خالی کر دو اور یا جنگی مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ لیکن یہ خوب سمجھ لینا کہ تم خدا کی مشیت کو روک نہیں سکتے۔ اگر اسلام نہ لائے تو وہ تم کو دنیا و آخرت میں رسوا کرنے والا ہے تم اپنی تدبیروں اور حیلہ بازیوں سے اسے عاجز نہ کر سکو گے۔ باقی جن قبائل سے کوئی معاہدہ ہی نہیں تھا ان کو بھی چار ماہ کی مہلت دی گئی ہو۔ یہ اور اس کے بعد کی آیتوں کا اعلان عام ۹ھ ہجری میں حج کے موقع پر تمام قبائل عرب کے سامنے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا [1]

اس آیت میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

۱۔ یہ معاہدہ کن لوگوں سے ہوا۔

۲۔ کس معاہدے کے فسخ کا یہاں اعلان ہوا ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں شارحین قرآن متفق ہیں کہ حضور اقدس نے متعدد قبائل سے معاہدے کیے تھے کچھ قبائل سے معاہدہ مقررہ مدت کے لیے تھا اور کچھ سے بغیر میعاد کے تھا۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس آیت میں غیر میعادی معاہدہ کا ذکر ہے۔ جس معاہدہ کا اس آیت میں ذکر ہے وہ حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔ علامہ بغوی معالم التنزیل میں لکھتے ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تبوک تشریف لے گئے تو منافقین نے طرح طرح کی افواہیں اڑانی شروع کر دیں اور مشرکین نے عہد شکنی کا آغاز کر دیا۔ آپ نے سورہ انفال کی آیت و اما تخافن من قوم پر عمل کرتے ہوئے نقض عہد کا اعلان کیا۔

حافظ ابن کثیر رقم طراز ہیں،

شارحین قرآن کا یہاں اختلاف ہے کچھ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ یہ آیت ان عہدوں کے بارے میں ہے جو میعادی نہ تھے یا جن سے چار مہینے سے کم مدت کے لیے عہد تھا جن کا عہد موقت اور میعادی تھا اس کا ذکر قرآن میں آگے آ رہا ہے یہ بہترین رائے ہے یہی ابن جریر کا مختار ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

دونوں باتیں درست ہیں لیکن ان معاہدین میں کچھ ایسے بھی تھے جن کا معاہدہ موقت اور میعادی تھا مگر انہوں نے معاہدہ توڑ دیا تھا۔ اسی کی طرف امام بغوی نے یہ کہہ کر اشارا فرمایا ؛ اور مشرکین نے عہد شکنی کا آغاز کر دیا یہ عہد شکنی کرنے والے وہ معاہدین تھے جنھوں نے حدیبیہ میں دس سال تک امن وامان سے رہنے کا عہد کیا تھا۔ اس پر تفصیل تبصرہ تو معالم القرآن کی جلد ۲۶ میں آئے گا۔ یہ معاہدہ کیا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کی تفصیلات محفوظ ہیں۔ ہم ناظرین معالم القرآن کی دلچسپی کے لیے اس معاہدہ کا متن پیش کرتے ہیں۔

۱۔ تیرے نام سے اے اللہ۔

۲۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو میں طے ہوا۔

۳۔ ان دونوں نے اس بات پر صلح کر لی ہے کہ دس سال تک جنگ روک دی جائے۔ جس کے دوران لوگ امن سے رہیں اور ایک دوسرے سے رُکے رہیں۔

۴۔ یہ کہ محمد کے ساتھیوں میں سے جو حج یا عمرے کے لیے مکہ آئے تو اس کی جان و مال کو امان ہوگا۔ اور قریش کا جو شخص تجارت کے لیے مصر یا شام جائے۔ بروایت ابی عبید عراق یا شام جاتے ہوئے مدینے سے گذرے تو اسے جان و مال کا امان ہوگا۔

۵۔ یہ کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد کے پاس آئے گا تو آپ اسے ان کے سپرد کر دیں گے اور محمد کے ساتھیوں میں جو شخص قریش کے پاس آجائے گا وہ اسے آپ کے سپرد نہیں کریں گے۔

۶۔ یہ کہ باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے جن میں باہر سے کوئی غداری داخل نہیں ہو سکے گی ؟ اور نہ خفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خود خلاف عہد وفا کریں گے۔

۷۔ یہ کہ جو محمد کے عہد اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کر سکے گا۔ اور جو قریش کے عہد اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ وہ بھی ایسا کر سکے گا۔ اس پر قبائل خزاعہ نے اٹھ کر کہا کہ ہم محمد کے معاہدے اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں اور بنی بکر نے کہا کہ ہم قریش کے معاہدے اور ذمہ داری میں داخل ہوتے ہیں

۸۔ یہ کہ تو اس سال ہمارے پاس سے واپس چلا جائے گا اور ہمارے ہاں مکہ نہیں آئے گا۔ البتہ سال آئندہ ہم باہر چلے جائیں گے اور تو اور تیرے ساتھی وہاں مکہ میں داخل ہو کر تین راتیں ٹھہر سکیں گے۔ تیرے ساتھ سوار کا ہتھیار ہوگا یعنی تلوار میان میں پڑی ہوگی۔ اس کے سوا اور کوئی ہتھیار لے کر تو وہاں نہ آسکے گا۔

۹۔ یہ کہ یہ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے جہاں ہم نے ان کو پایا یعنی حدیبیہ میں اور ان کو ذبح کر دیا جائے گا اور ان کو ہمارے پاس مکہ میں نہیں لایا جائے گا۔ اور یہ صراحت کہ ہمارے اور تمہارے حقوق برابر ہوں گے۔

یہ تھا وہ معاہدہ جو حدیبیہ میں جناب رسول اللہ اور مشرکین مکہ کے درمیان ہوا تھا۔ یہ موقت اور میعادی معاہدہ تھا لیکن مشرکین نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کر کے عہد شکنی کی۔

حدیبیہ کے معاہدہ کی خلاف ورزی

مشرکین نے حدیبیہ کے اس معاہدے کو توڑ دیا۔ حدیبیہ کے معاہدے میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ قبائل عرب میں سے فریقین میں سے جس کے ساتھ شریک ہونا چاہیں گے شریک ہو جائیں۔ چنانچہ اسی وقت بنو خزاعہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور بنو بکر قریش کے حلیف ہو گئے۔ ان دونوں قبیلوں کے درمیان عداوت سے رقابت چلی آ رہی تھی۔ معاہدہ حدیبیہ میں یہ دونوں ہی شریک تھے جس طرح قریش مکہ اور مسلمان۔ صلح پر اٹھارہ ماہ یا انیس گذرے تھے کہ رجب یا شعبان ۸ھ میں بنو بکر میں سے نوفل بن معاویہ نے اپنے قبیلے کے بہت سے افراد کو ساتھ لے کر بنو خزاعہ پر اچانک شبخون مارا۔ بنو خزاعہ نے حد حرم میں پناہ لی جہاں کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ حملہ آور رک گئے۔ مگر نوفل نے کہا کہ تم لوگوں کو حد حرم میں چوریاں کرتے ہوئے باک نہیں پھر اپنا خون بہا لینے میں کیوں رکتے ہو۔ یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا چنانچہ حملہ جاری رہا۔ یہاں تک بنو خزاعہ نے مکہ مکرمہ پہنچ کر بدیل بن ورقاء اور اس کے مولیٰ رافع کے گھر میں پناہ لی۔ یہ حملہ قریش کی سازباز کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ طبری کا بیان ہے کہ قریش میں سے عکرمہ ابن ابوجہل صفوان بن امیہ نے بھیس بدل کر بنو بکر کا ساتھ دیا۔

بنو خزاعہ میں سے عمرو بن سالم نے ۴۰ ناقہ سوار سواروں کے ساتھ مدینہ میں آ کر بارگاہ رسالت میں یہ منظوم فریاد کی۔

لاھم انی ناشد محمدًا حلف ابینا و ابیہ الاتلدا

اے اللہ میں محمد کو یاد دلاتا ہوں وہ موروثی حلف جو ہمارے باپ اور اس کے باپ میں ہوا تھا

ان قریشا اخلفوك الموعدا و نقضوا میثاقك المو کدا

کہ قریش نے تیرے سے وعدہ خلافی کی؛ اور تیرے پختہ عہد کو توڑ دیا۔

ھم بیتونا بالوتیر ھجدًا فقتلونا رکعًا و سجدا

انھوں نے ہم کو وتیر کے چشمے کے پاس سوتے ہوئے آ دبوچا۔ انھوں نے ہمیں نماز میں قتل کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ ابن القیم نے تصریح کی ہے کہ خزاعہ قبیلہ مر الظہران میں رہتا تھا۔ یہ مقام جدہ کے قریب آج بھی مشہور ہے پھر بدیل بن ورقاء نے آ کر حالات بتائے۔ حضور اقدس ﷺ

کو سخت رنج ہوا۔ یہ صریح عہد شکنی تھی جس کے ذمہ دار قریش تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے ایک قاصد قریش کے پاس روانہ کیا اور تین صورتیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی ایک منظور کر لی جائے۔

۱- مقتولوں کا خون بہا دلایا جائے۔

۲- قریش بنو بکر کی حمایت سے دست کشی کریں۔

۳- صاف کہہ دیں کہ معاہدہ حدیبیہ ٹوٹ گیا۔

قرطبہ ابن عمرو نے قریش کی طرف سے کہا کہ صرف تیسری صورت منظور ہے۔ یعنی یہ کہ معاہدہ حدیبیہ ٹوٹ گیا حضور اقدس ﷺ نے مکہ کی تیاری شروع کر دی۔ اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں غرض رمضان ۸ھ کو کوکبہ نبوی نہایت عظمت و شان سے مدینہ سے روانہ ہوا۔ دس ہزار آراستہ فوج رکاب میں تھی۔ قبائل عرب راستہ میں آکر ملتے جاتے تھے۔ بالآخر آپ مکہ میں فاتحانہ داخل ہو گئے۔ فتح کے بعد آپ مدینہ واپس ہوئے اور مکہ میں حضرت عتاب بن اسید کو امیر مقرر کیا۔

۸ھ میں مکہ فتح ہوا لیکن چونکہ ابھی تک ملک میں اچھی طرح امن قائم نہیں ہوا تھا۔ ۸ھ میں مسلمانوں نے حج حضرت عتاب بن اسید کی امارت میں کیا۔ اگرچہ حج کے ارکان مشرکین کے اہتمام میں انجام پائے۔

صدیقِ اکبر کا حج

اب ۹ھ ہے۔ غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد حضور اقدس ﷺ نے ذیقعدہ ۹ھ میں تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ سے حج کے لیے روانہ فرمایا۔ ان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قافلہ کے امیر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقیب تھے۔ اور حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت جابر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ معلم تھے۔ اور قربانی کے لیے حضور اقدس کی جانب سے بیس اونٹ ساتھ تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مناسکِ حج کی لوگوں کو تعلیم دی۔ یوم النحر میں خطبہ دیا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور سورہ براءت کی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ اور اعلان کر دیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔ کوئی برہنہ حج نہ کرے گا اور وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے تھے ان کے نقض عہد کی وجہ سے آج سے چار ماہ کے بعد ٹوٹ جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اعلان کی اس زور سے منادی کی کہ گلا بیٹھ گیا۔ یہ تاریخِ اسلام میں دوسرا حج ہے۔ اس حج میں مشرکین بھی شریک تھے۔ مگر مسلمانوں نے حج اپنے طریق پر کیا اور مشرکین نے اپنے طریق پر۔ الغرض حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حج کرایا خطبہ پڑھا مناسکِ حج کی تعلیم دی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یوم النحر میں جمرہ کے قریب کھڑے ہو کر اعلان کیا جیسا کہ ان کو رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا

اور جس کے ساتھ عہد تھا اس کا عہد واپس کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ اے لوگو کوئی کافر جنت میں نہ جائے گا اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے گا اور نہ کوئی ننگا بیت اللہ کا طواف کرے اور جس کا عہد رسول اللہ کے ساتھ کسی مدت کے لیے ہے وہ باقی رہے گا۔ حافظ ابن القیم لکھتے ہیں کہ حمیدی نے روایت کیا ہے کہ زید بن نفیع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا کہ آپ کو حج میں کس کام کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ فرمایا کہ چار احکام لے کر گیا۔

۱۔ یہ کہ جنت میں مومن کے سوا کوئی داخل نہ ہوگا۔

۲۔ کوئی ننگا بیت اللہ کا طواف نہ کرے گا۔

۳۔ مسلمان اور کافر اس سال کے بعد کعبہ میں جمع نہ ہوں۔

۴۔ رسول اللہ کے ساتھ جس کا معاہدہ کسی معین مدت کے لیے ہے وہ معاہدہ اس مدت تک قائم رہے گا اور جس کا معاہدہ کسی مدت کے لیے نہیں اس کو چار ماہ کی مہلت ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ کرنے کے بعد سورہ براءت کا اعلان کرنے کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ کیا اس سے کچھ کو وسوسہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روانگی حضرت ابوبکرؓ کی معزولی ہے۔ یہ شبہ بے خبری اور بے علمی اور حالات سے ناواقفیت سے پیدا ہوا ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود فرمایا کہ میں مامور ہوں۔ امیر آپ ہیں۔ حافظ ابن القیم زاد المعاد میں لکھتے ہیں کہ ابن سعد کی تصریح کے مطابق صدیق اکبرؓ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا۔ کہ کیا حضورؐ نے آپ کو مناسکِ حج ادا کرنے کے لیے روانہ کیا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں۔ میں تو صرف سورہ براءت کا اعلان کروں گا۔ حج آپ کرائیں گے یہ اس بات کی شہادت ہے کہ امیر حج حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے لیکن سوال یہ ہے کہ جب امیر حج ابوبکرؓ تھے تو حضرت علیؓ کو کس مقصد کے لیے روانہ کیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سورہ براءت کے اعلان کے لیے بھیجا۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ ابوبکرؓ بحالت امارت یہ فرض انجام نہیں دے سکتے تھے بلکہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ معاہدین کے معاہدوں کے ختم ہونے کا براءة من الله و رسوله کا اعلان کرنے کے لیے گئے تھے اور چونکہ عرب میں دستور یہ تھا کہ معاہدے کو ختم کرنے کا اعلان صرف وہی کر سکتا ہے جس سے معاہدہ ہوا یا پھر اسی کے خاندان کا کوئی فرد ابوبکر سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبی تعلق نہ تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے چچیرے بھائی اور داماد تھے اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سورہ براءت دے کر یہ فرض سپرد کیا۔ دستور کے مطابق اگر

معاہدوں کے ختم ہونے کا حضور یا ان کا رشتہ دار اعلان نہ کرتے تو مشرکین عرب معاہدوں کو ختم نہ سمجھتے۔ شاہ عبد الحق نے مدارج النبوت میں اور امام بغوی نے معالم التنزیل میں اس طرف اشارا کیا ہے کہ حضور نے حضرت صدیق کو ہم آیتیں سورہ برارت کی دی تھیں کہ ان کا اعلان کریں۔ لیکن اس کے بعد حضور نے حضرت علی رضہ کو اپنے ناقہ العضبا پر روانہ کیا۔ اور واپسی کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے حضور سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ کیا میرے خلاف کوئی حکم نازل ہوا فرمایا نہیں لیکن مناسب یہی تھا کہ میرے اہل میں کوئی شخص معاہدے کے متعلق اعلان کرے۔

اس سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے کہ عرب دستور کی خاطر ایسا کیا گیا ہے۔

علمار نے اس کی ایک اور وجہ بھی بتائی ہے کہ سورۂ برارت میں اللہ سبحانہ کی جانب سے صدیق اکبر کی مدح وثنار کی گئی ہے۔ اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کا جناب الٰہی میں مقام بتانے کے لیے ضروری تھا کہ خاندان نبوت کا کوئی فرد یہ بتائے نہ کہ خود ابوبکر اپنے مناقب پیش کریں۔

بہرحال زیر تشریح آیت کا تعلق اس معاہدے سے ہے سورۃ برارت کی ان ابتدائی آیتوں میں اس کو ختم کیا گیا ہے اور اس روز اس کی مدت مقرر کر دی گئی یعنی چار مہینے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جن کا معاہدہ میعادی نہ تھا یا جو میعادی معاہدہ کی عہد شکنی کر چکے تھے ان سے معاہدہ ختم کرنے کا اعلان ہوا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ان معاہدین کو ہم ماہ کی مہلت دی گئی ہے۔ یہ اعلان۔ اذوالحجہ کو ہوا۔ اس وقت سے۔ اربیع الثانی پر یہ مدت ختم ہوگی۔ یہ مہلت ان کو اس لیے دی گئی ہے کہ اس زمانے میں اپنے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں، ان کو اپنا مقام متعین کرنے میں آسانی ہو۔ آیا وہ اسلامی نظام کو قبول کرنا چاہتے ہیں۔ یا ملک چھوڑنا چاہتے ہیں یا پھر جنگ کرنا چاہتے ہیں جو کچھ کریں خوب سوچ کر کریں۔ طبری نے بحوالہ سدی بتایا ہے کہ اس اعلان کے بعد عام طور پر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اس طرح یہ قرآنی حکم واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علی سواء پر نبوت نے عمل کرکے دکھا دیا جیسا کہ امام بغوی نے لکھا ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ جب تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو علی الاعلان اس کا معاہدہ اس کی طرف پھینک دو اور اسے خبردار کر دو کہ اب ہمارا تمہارا کوئی معاہدہ نہیں۔ اس اعلان کے بغیر کسی معاہد قوم کے خلاف جنگی کارروائی شروع کر دینا درست نہیں۔ اسی ضابطہ اخلاق کے مطابق معاہدات کی منسوخی کا یہ اعلان عام ان تمام قبائل کے خلاف کیا گیا جو عہد و پیمان کے باوجود ہمیشہ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ اور موقع پاتے ہی پاس عہد کو بالائے طاق رکھ کر دشمنی پر اتر آتے تھے۔ یہ کیفیت بنی کنانہ، بنی ضمرہ اور شائد ایک آدھ قبیلہ کے سوا باقی ان تمام قبائل کی تھی جو اس وقت تک شرک پر قائم تھے۔ یہ اعلان کس طرح پہنچایا گیا۔ اس کا اندازہ کرنا ہو تو محمد بن کعب کے یہ الفاظ پڑھیے۔ فقرأھا علیھم فی منازلھم ایک ایک گھر کے دروازے پر اس کی منادی کی گئی۔ بلکہ ابوہریرہ کہتے ہیں

کہ بیرا تو گلا بھی شور مچا کر بیٹھ گیا۔
اس اعلان برأت کے بعد پورے جزیرۃ العرب میں شرک اور مشرکین کا وجود غیر قانونی اور قابل دست اندازی پولیس ہو گیا ان کے لیے سارے ملک میں کوئی جائے پناہ نہ تھی بلکہ عرب کا بیشتر علاقہ اسلام کے زیر نگین آ چکا تھا۔ ان کو اب تک یہ آس نہیں تھی کہ کوئی بیرونی طاقت مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر اسلام کا شیرازہ بکھیر دے گی لیکن اللہ سبحانہ نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور معاہدہ کے ختم ہونے کا اعلان کر کے ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ چھوڑا کہ یا تو لڑنے پر تیار ہو جائیں۔ یا ملک سے اپنا بستر گول کریں —— اور یا پھر اسلام کے حلقہ میں آ جائیں۔
اوروں کا پتہ نہیں مگر میں ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ معاہدے کی نسبت آیت میں مسلمانوں کی طرف اور مشرکین کو بطور معاہد پیش فرما کر فسخ معاہدے کی نسبت اللہ و رسولہ کی طرف کی گئی ہے اس میں اشارا ہے کہ معاہدے کو ختم اللہ سبحانہ کے حکم کے مطابق کیا جا رہا ہے اور یہ اسلام کے ضابطہ اخلاق کی وسعت ہے کہ وہ جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ نہیں کرتا بلکہ اپنے مخاطبوں کو حالات پر غور کرنے کی مہلت دیتا ہے

حج کے موقعہ پر عام منادی

۲ اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے یہ اعلان عام ہے حج کے بڑے دن کہ اللہ و رسول مشرکین کے معاہدوں سے بری الذمہ ہیں۔ لہٰذا اگر ظلم و سرکشی سے توبہ کر لو تو یہ تمہارے لیے مفید ہے اور اگر نہ مانو گے تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور جو لوگ کفر و شرک کو اپنائے ہوئے ہیں ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیجئے۔ یہ اعلان غالباً ان قبائل کے حق میں تھا جنھوں نے میعادی معاہدہ کیا۔ پھر خود ہی عہد شکنی کی یعنی ایسے لوگوں سے اب کوئی معاہدہ باقی نہیں ہے۔ اگر یہ سب لوگ کفر و شرک سے توبہ کر لیں تو ان کی دنیا و آخرت دونوں سنور جائیں گی۔ نہیں تو خدا کا جو کچھ ارادہ ہے تطہیر جزیرۃ العرب کا وہ پورا ہو کر رہے گا۔ کوئی طاقت اور تدبیر اسے مغلوب نہیں کر سکتی۔ اور کافروں کو کفر و بدعہدی کی سزا مل کر رہے گی ان قبائل کی عہد شکنی اگرچہ فتح مکہ سے پہلے ہو چکی تھی بلکہ اسی کے جواب میں مکہ فتح کیا گیا۔ تاہم ۹ھ ہجری میں حج کے موقعہ پر اس کا بھی اعلان عام کرایا گیا تاکہ واضح ہو جائے کہ اس قسم کے جتنے لوگ ہیں ان سے کسی قسم کا معاہدہ اب باقی نہیں رہا۔[۱]

یوم حج اکبر کیا ہے

حج کے بڑے دن یوم الحج الاکبر سے کیا مراد ہے۔ شارحین قرآن اس موضوع پر کسی ایک مرکزی خیال پر متفق نہیں ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ عرفات میں وقوف کا دن یوم الحج الاکبر ہے۔ یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے

[۱] افادات شیخ الاسلام

ہے اس رائے کو حضرت عمر بن الخطاب، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے۔ عطاء ابن ابی رباح، طاؤس، مجاہد اور سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ یہی امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ کی رائے ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یوم الحج الاکبر سے مراد یوم النحر یعنی عید قربان کا دن ہے۔ حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن ابی اوفی، المغیرۃ ابن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ انہی کے ہمنوا ہیں۔ شارحین قرآن میں محمد بن جریر طبری اسی خیال کے علمبردار ہیں۔ ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجۃ الوداع میں یوم نحر میں وقوف کیا تو دریافت فرمایا یہ کونسا دن ہے؟ لوگوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ یوم النحر ہے آپ نے فرمایا کہ یہی یوم الحج الاکبر ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ مجھے یوم النحر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے اعلانِ عام کے لیے منیٰ میں روانہ کیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے گا اور کوئی عریاں بیت اللہ کا طواف نہ کرے گا اور یوم الحج الاکبر یوم النحر ہے۔ اسے حج اکبر، اصغر کے مقابلہ میں کہا گیا ہے۔ ابن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یوم النحر ہی یوم الحج الاکبر ہے۔ اس میں قربانی کی جاتی ہے۔ اس میں حجامت ہوتی ہے احرام والے احرام کھول کر حلال ہوتے ہیں۔ سفیان ثوری اور ابن جریج رضی اللہ تعالیٰ کا خیال ہے کہ منیٰ کے سارے دن یوم الحج الاکبر ہیں گویا یوم زمانے اور وقت کے معنے میں ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ حج اکبر وہ ہے جس میں وقوف عرفات ہو اور عمرہ حج اصغر ہے یہ اور اس قسم کے خیالات ہیں جو عام تفسیر کی کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دراصل اس سے کوئی مخصوص قسم کا حج مراد نہیں ہے اکبر کا لفظ صرف حج اصغر یا عمرہ سے تقابل و اِشار کے لیے ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ یہی حج اکبر ہے عمرہ کے مقابلہ میں کہ وہ حج اصغر ہوتا ہے۔ ابن عربی نے قاضی اسماعیل مالکی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

سارے خیالات کی چھان بین سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ حج اکبر حج ہی ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی یہی کہتے ہیں۔ باقی اس آیت میں یوم الحج الاکبر تو اس سے مراد ۹ھ ہجری کا وہ حج ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کی امارت میں ہوا کیونکہ یہ پہلا موقعہ ہے جب مسلمانوں کو باقاعدہ حج کی سعادت حاصل ہوئی اس سے پہلے مسلمانوں کو جو مواقع ملے ان میں وہ صرف عمرہ کر سکتے تھے۔ عمرہ کو حج اصغر کہتے ہیں۔ اس نسبت سے پورے حج کے لیے حج اکبر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اذان من اللہ و رسولہ بھی اسی معاہدہ کے بارے میں ہے جس کے متعلق آغاز سورت میں براءۃ من اللہ و رسولہ کہہ کر اطلاع دی تھی یہ اسی کے متعلق اعلانِ عام ہے۔ اذان کے معنے اعلانِ عام کے ہیں اس میں حکم ہوا ہے کہ حج کے دن یہ منادی کرا دی جائے کہ اللہ و رسول کا اس قسم کے معاہدوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب جو توبہ کر کے

اسلام قبول کرے اس کے لیے خیر کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور جو روگردانی کریں گے وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکیں گے۔ حج کے موقعہ پر اعلان عام کرنے کا حکم اس لیے ہوا ہے کہ عرب میں حج ہی کا اجتماع ایک ایسا اجتماع ہوتا تھا جس میں ملک کے کونے کونے سے لوگ جمع ہوتے تھے جس کے سبب ہر وہ بات جو وہاں پھیل جائے پورے ملک میں پھیل جاتی۔ خاص طور پر ۹ھ کے حج تک چونکہ صورت یہ تھی کہ مشرکین بھی حج کو جاتے تھے اس لیے وہاں کا اعلان سب تک پہنچ جاتا تھا خواہ مسلمان ہوں یا کافر۔ اسی لیے الی الناس کی تعبیر آئی ہے۔

مذکورہ اعلان سے مستثنیٰ

۴ ہاں مشرکین میں سے وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا۔ پھر انھوں نے اپنے عہد کے نباہنے میں بالکل کوتاہی اور کمی نہیں کی اور نہ انھوں نے تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ لہٰذا چاہیے کہ ان سے جس قدر مدت کے لیے عہد ہوا ہے اس مدت کو پورا کرو اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔ یہ استثنار ان قبائل کے لیے ہے جن کا معاہدہ میعادی تھا مگر وہ اس پر برابر قائم رہے۔ کچھ کوتاہی ایفائے عہد میں نہیں کی نہ بذاتِ خود کوئی کارروائی خلافِ عہد کی اور نہ دوسرے بدعہدوں کو مدد پہنچائی مثلاً بنی ضمرہ، بنی مدلج ان کے متعلق اعلان کر دیا گیا کہ میعاد معاہدہ منقضی ہونے تک مسلمان بھی برابر معاہدہ کا احترام کریں گے۔ میعاد ختم ہونے کے بعد کوئی جدید معاہدہ نہیں اس وقت ان کے لیے بھی وہی راستہ ہے جو اوروں کے لیے تھا۔[1]

علامہ قرطبی فرماتے ہیں اس آیت الا الذین عاھدتم من المشرکین میں لفظ الا استثنار کے لیے ہے اور استثنا میں دو احتمال ہیں۔ استثنا متصل ہو یا منقطع ہو۔ متصل ہونے کی صورت میں معنے یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ کی جانب سے اعلان برارت ہے مشرکین کے لیے سوائے ان لوگوں کے جن سے میعادی معاہدہ ہو۔ اور منقطع ہونے کی صورت میں معنے یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ ان سے برارت کا اعلان کرتا ہے لیکن ان لوگوں سے نہیں جن سے تم نے میعادی معاہدہ کیا ہے ان کی میعاد معاہدہ پوری کرنی چاہیے۔

یہاں شارحین قرآن نے اس سوال کو بھی خاصی اہمیت دی ہے کہ استثنار کی صورت میں مستثنیٰ منہ کون ہے۔ علامہ زمخشری کی رائے میں مستثنیٰ منہ محذوف ہے اور یہ فسیحوا فی الارض میں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آیت کا روئے سخن اہل ایمان کی طرف ہے ان سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ و رسول ان معاہدین سے بری الذمہ ہے جن سے اے مسلمانو! تم نے عہد و پیمان کیا ہے۔ لہٰذا تم ان سے کہہ دو کہ چار مہینے گھومو پھرو لیکن یہ بات ان سے نہ کہنا جن سے تم نے عہد کیا ہے اور انھوں نے تا حال ایفائے عہد

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

بی کوئی کوتاہی نہیں کی ہے ان کے معاہدہ کی مدت پوری کرنا تمہارا فرض ہے ان کے ساتھ عہد شکنی کرنے والوں کا معاملہ نہ کرو۔
حافظ ابن کثیر نے بھی تعبیر کے تھوڑے سے تغیر سے یہ بات فرمائی۔ ان کے ارشاد کا خلاصہ جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ

یہ ہے:
یہ چار ماہ کی مدت کی تعیین سے استثنا ہے جن کا عہد میعادی نہیں تو ان کے لیے مدت چار ماہ ہے ان کو آزادانہ ملک میں گھومنے اور پھرنے کا قانونی حق ہے مگر جن کا عہد میعادی ہے ان کے لیے مدت وہی ہے جو معاہدہ میں لکھی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ انھوں نے عہد شکنی نہ کی ہو اور اہلِ ایمان کے مدمقابل کسی گروہ کی مدد نہ کی ہو۔

یہ بات بھی یہاں توجہ کے لائق ہے کہ یہ کون لوگ ہیں جن سے مسلمانوں نے میعادی معاہدہ کیا تھا اور انھوں نے نہ عہد شکنی کی اور نہ ہی مسلمانوں کے خلاف کبھی کسی مدمقابل کو امداد بہم پہنچائی۔

علامہ بغوی نے معالم التنزیل میں انکشاف فرمایا ہے کہ یہ مستثنیٰ قبائل بنو ضمرہ۔ اور بنو کنانہ ہیں۔ سدی کی رائے میں یہ بنو ضمرہ بنو مدلج ہیں۔ امام مجاہد اس کا مصداق خزاعہ اور مدلج کو بتاتے ہیں محمد بن عباد نے بنو خزیمہ کا نام لیا ہے اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حدیبیہ میں قریش کو بتاتے ہیں۔ بہرحال یہ امر تو یقینی ہے کہ اس وقت ایسے ضرور موجود تھے اس کی تعیین پر قرآن کی تشریح موقوف نہیں قرآن ہمیشہ کے لیے ضابطہ اخلاق پیش کر رہا ہے۔

قبائل سے معاہدے

تاریخ کے مطالعے سے امام بغوی کی تائید ہوتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبیلہ سے نہیں متعدد قبائل سے مدینہ پہنچنے کے بعد سیاسی معاہدے کیے تھے۔

اس کا پتہ تو نہیں چلتا لیکن امکان ہے کہ مدینے کے انصار نے آس پاس کے کچھ قبائل دوستی اور حلیفی زمانہ جاہلیت میں بھی کر رکھی ہو اگر ایسا رہا ہے تو یقیناً وہ معاہدے اسلامی مملکت کو وراثت میں ملے ہوں گے۔ رمضان ۱ھ میں ہجرت کے چھ ماہ بعد ہی جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے متعلق اپنی سیاست یہ مقرر فرمائی کہ ان پر معاشی دباؤ ڈالا جائے اور اس سلسلے میں ایک فوجی دستہ قبائل جہینہ کے علاقہ میں روانہ کیا تو وہاں کا سردار مسلمانوں کا حلیف تھا۔ اس فوجی دستہ میں کوئی انصاری نہ تھا سب مہاجرین ہی تھے اس لیے مجدی بن عمرو الجہنی سے یا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد خود کوئی معاہدہ کیا تھا یا کم از کم انصار کی پرانی حلیفی کی تجدید کر کے اسے مدینے کے مسلمانوں کے لیے عام کر دیا تھا۔ ابن سعد اور ابن ہشام اس حلیفی کا تو ذکر کرتے ہیں مگر نہ تو معاہدہ حلیفی درج کرتے ہیں اور نہ کوئی مزید تفصیل کہ وہ کب

اور کہاں ملے ہوا تھا بجز اس ایک اہم اطلاع کے کہ مجدی ابن عمرو مسلمانوں اور قریشیوں دونوں کا حلیف تھا۔

سنہ ۲ھ کے آغاز میں صفر کے مہینے میں رسول اللہ ﷺ خود ایک جمعیت کے ہمراہ مدینے کے جنوب مغرب میں کاروانی اسٹیشن ابوا تشریف لے گئے۔ قریشی کاروانی اس دفعہ بھی مسلمانوں کے بعد از وقت آنے کے باعث جا چکے تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے خالی ہاتھ واپسی کی مگر آس پاس کے لوگوں سے تعلقات پیدا کیے اور بنی ضمرہ کے ایک سردار مخشی بن عمرو سے دائمی حلیفی کا ایک معاہدہ کیا۔

یہ اہم معاہدہ جو غالباً اولین بھی ہے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ مہربان رحم کرنے والے خدا کے نام سے۔

۲۔ یہ ایک تحریر ہے محمد رسول اللہ کی طرف سے بنی ضمرہ کے لیے۔

۳۔ اس بات پر کہ ان کی جانوں اور مالوں کو تحفظ ہوگا۔

۴۔ اور یہ کہ انہیں ہر ایسے دشمن کے خلاف مدد دی جائے گی جو ظلم سے ان پر اچانک آپڑے۔

۵۔ ان کے ذمہ ہے کہ نبی کی مدد اس وقت تک کرتے رہیں۔ جب تک سمندر سیپ کو گیلا کرتا رہے۔ الا یہ کہ اللہ کے دین کے بارے میں وہ جنگ کریں یا ان سے جنگ کی جائے۔

۶۔ ان پر اس بارے میں اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے

۷۔ اور ان کو مدد اس شرط پر دی جائے گی کہ وعدہ وفا کریں اور عہد شکنی سے بچیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ان ہی کے ہمسایوں بنی مدلج سے جو معاہدہ ہوا اس کے متعلق ابو عبید نے کتاب الاموال میں تصریح کی ہے کہ وہ سنہ ۹ھ تک مسلمان نہیں ہوئے اور سنہ ۹ھ میں سورہ برا‌ءت کے نزول پر ان کو بھی ایک نہایہ دیا گیا کہ ان کا معاہدہ دوستی چار ماہ بعد ختم سمجھا جائے الا یہ کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ یہ قبیلہ مدلج وہی ہے جس کے سردار سراقہ ابن مالک نے ہجرت کے موقعہ پر قریشی انعام کے لالچ میں اولاً حضور اقدس ﷺ کا تعاقب کیا اور اعجاز نبوت دیکھ کر معافی مانگی تھی۔ جب حضور اقدس ﷺ غزوۃ ذات العشیرہ میں سراقہ کے علاقہ میں آئے تو اس نے شرف حلیفی خوشی سے قبول کی بلکہ ساری مسلمان فوج کی بڑی شاندار دعوت کی۔ بلاذری نے انساب الاشراف میں لکھا ہے کہ مہمان نوازی کے دور تعلق سے قریشی کارواں جسے پکڑنے کے لیے وہاں آئے تھے ہاتھ سے نکل گیا۔

قبیلہ جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو کی مسلمانوں اور قریش دونوں کے ساتھ بہ یک وقت دوستی کا ذکر آیا۔ اس قبیلے کی دو شاخوں سے کیے ہوئے معاہدہ کا متن ابن سعد نے بتایا ہے۔ اس کے شرائط کم و بیش وہی ہیں جو بنو ضمرہ کے معاہدے کے ہیں۔ معاہدہ یہ ہے۔

۱۔ ان کو ان کی جان و مال پر امان ہے۔
۲۔ ان کو ہر ایسے کے خلاف مدد دی جائے گی جو ان پر ظلم کرے یا ان سے جنگ کرے بجز دین اور اہل و عیال کے۔
۳۔ اور ان کے خانہ بدوشوں کو بھی جو معاہدے کی تعمیل اور عہد شکنی سے اجتناب کریں وہی حقوق ہوں گے جو ان کی بستیوں میں رہنے والوں کے ہیں۔
۴۔ اور اللہ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے۔

بنو ضمرہ کا قبیلہ بہت بڑا تھا اس کی ایک شاخ بنی عبد بن عدی تو مکے کے حدود حرم میں جا بسی تھی۔ اسی کی ایک اور شاخ بنو غفار کہلاتی تھی۔ اس قبیلہ کا معاہدہ الفاظ اور شرائط مندرجہ کے باعث جنگ بدر کے قریب قریب زمانے کا معلوم ہوتا ہے۔

معاہدہ یہ ہے۔

۱۔ یہ معاہدہ بنو غفار کے لیے ہے۔
۲۔ یہ کہ وہ مسلمانوں میں سے سمجھے جائیں گے ان کے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے اور ان پر وہی واجبات ہیں جو مسلمانوں پر ہیں۔
۳۔ اور یہ کہ نبی نے ان کے مالوں اور ان کی جانوں کے متعلق اللہ اور اس کی ذمہ داری قبول کی ہے۔
۴۔ ان کو ایسے دشمن کے خلاف مدد دی جائے گی جو ان پر ظلم کے ساتھ پیش قدمی کرے۔
۵۔ اور یہ کہ نبی جب ان کو اپنی مدد کے لیے بلائیں تو یہ قبول کریں گے اور ان پر آپ کی مدد واجب ہوگی۔ بجز اس کے جو دین کے بارے میں جنگ ہو۔
۶۔ یہ تحریر کسی گناہ کے مواخذے میں آڑے نہ آئے گی۔

ان کے علاوہ اور بھی قبائل سے آپ نے معاہدے کیے۔ مثلاً مزینہ یہ لوگ مدینہ سے صرف بیس میل کے فاصلے پر رہتے تھے اشجع قبیلہ یہ قبیلہ غطفان کی ایک شاخ ہے۔ اسی قبیلہ کا سردار نعیم بن مسعود الاشجعی ہے۔ اس کے علاوہ خزاعہ سے آپ نے حلفی کا معاہدہ کیا تھا۔ بہرحال مختلف قبائل سے رسول اللہ ﷺ نے جو معاہدے کیے تھے۔ ان معاہدین میں سے جنہوں نے عہد شکنی نہیں کی اور جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف اہل کفر کی مدد نہیں کی اور ان کے معاہدے میعادی تھے وہ اس ارشاد گرامی کی رو سے مستثنیٰ ہیں اس سے یہ بات مکمل کر سامنے آگئی کہ مذکورہ بالا اعلان منافقین عہد ہی سے متعلق تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ معاہدے بھی صرف ان کی قرار دادہ مدت ہی تک باقی رکھنے کی اجازت ہوتی تھی مدت گذر جانے کے بعد یہ بھی کالعدم ہو گئے۔ آئندہ کے لیے کسی نئے معاہدے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ اس اعلان برات کے

بعد حضور اقدس ﷺ نے مشرکین کے کسی گروہ سے کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مشرکین سے جو معاہدے کیے گئے تھے وہ صرف دعوت و تبلیغ کی خاطر کیے گئے تھے۔ اب تبلیغ و دعوت اور اتمام حجت کا دور ختم ہو رہا تھا اس لیے اب ان کے کسی گروہ سے کسی معاہدے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایفائے عہد کا اسلام کے پیش کردہ ضابطہ میں کیا مقام ہے کہ ان مشرکوں کے ساتھ جن کا معاہدہ میعادی ہے اور جنھوں نے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا ایفائے عہد کو اللہ سبحانہ نے تقویٰ بتایا ہے اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی کہا ہے اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ انفرادی تقویٰ نہیں بلکہ اجتماعی اور سیاسی تقویٰ ہے۔ اسلام میں جس طرح ہر مسلمان سے انفرادی تقویٰ کا مطالبہ ہے اسی طرح مسلمانوں سے من حیث الجماعت اجتماعی اور سیاسی تقویٰ کا بھی مطالبہ ہے یعنی مسلمان دوسری قوموں سے جو معاملات اور معاہدات کریں ان میں راست باز صداقت شعار اور وفادار بن کر رہیں۔ کسی عہد اور قول و قرار کی کوئی ادنیٰ خلاف ورزی بھی نہ کریں۔ السرخسی نے شرح السیر الکبیر میں عہد کی وفاداری پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ بد عہدی اتنا بڑا سنگین جرم ہے کہ اس کی صورت بھی حرام ہے۔ السید رشید رضا نے اس موقعہ پر یہ بات بالکل برمحل فرمائی ہے کہ یہ آیت قرآنی بتا رہی ہے کہ

ا۔ عہد کو پورا کرنا اسلام کے ضابطہ اخلاق میں سب سے اہم فریضہ ہے۔

۲۔ عہد موقت اور میعادی کو وقت مقررہ سے پہلے ختم کرنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ وفاء عہد کی بنیادی شرط یہ ہے کہ معاہدہ کی بھرپور حفاظت کی جائے۔

۴۔ مخالف کی جانب سے وفاء عہد کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ہمارے مخالفین کی کسی نوع سے امداد نہ کرے

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ــــــ اس آیت پر لطیف فوائد علمی پیش فرماتے ہیں۔ آیئے ان سے بھی استفادہ فرمالیجئے۔

فتح مکہ کے وقت مشرکین کی قسمیں

فتح مکہ کے وقت مشرکین چار قسموں میں منقسم تھے۔

ایک قسم ان لوگوں کی تھی جن سے حدیبیہ میں معاہدہ ہوا تھا اور انھوں نے خود اس معاہدہ کی دھجیاں اڑادی تھیں۔

دوسرے وہ قبائل تھے جن سے میعادی معاہدہ آپ نے کیا تھا اور وہ اس معاہدے پر قائم تھے جیسے بنی کنانہ کے دو قبیلے بنی ضمرہ و بنی مدلج۔

تیسرے کچھ قبائل ایسے تھے جن سے معاہدہ صلح غیر میعادی تھا۔

چوتھے وہ لوگ تھے جن سے کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہ تھا۔

پہلی جماعت یعنی قریش مکہ جنھوں نے معاہدہ حدیبیہ کو توڑا تھا اور جن کی داستان آپ تفصیل سے سن چکے ہیں ان کے بارے میں قرآن کا فیصلہ آگے آیت فاذا انسلخ الاشھر الحرم میں آرہا ہے۔

دوسری جماعت جن سے معاہدہ میعادی تھا اور وہ اس پر قائم تھے ان کا حکم الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئاً و لم یظاھروا علیکم احدا فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم ان اللہ یحب المتقین میں بتایا گیا ہے کہ ان کی مدت معاہدہ پوری کی جائے۔ یہ حکم بنی ضمرہ اور بنو مدلج کا ہے۔

تیسری اور چوتھی جماعت یعنی جن سے معاہدہ غیر میعادی تھا یا جن سے معاہدہ نہ تھا ان کا حکم یہ ہے کہ ان کو چار ماہ کی مہلت دی گئی ہے اور معاہدہ والوں سے معاہدہ ختم کر دیا گیا۔ براءۃ من اللہ میں اسی کا ذکر ہے۔

معاہدہ ختم ہونے پر مہلت دینے کا اعلان

ان احکام کا نفاذ اور مہلت اس وقت سے شروع ہوگی جب ان احکام کا اعلان بھرپور طریقہ پر تمام عرب میں ہو جائے اس اعلانِ عام کے لیے یہ انتظام کیا گیا کہ ۹ھ میں ایامِ حج میں منیٰ و عرفات میں اس کا اعلان کیا جائے واذان من اللہ و رسولہ میں اسی کو صراحۃً بتایا گیا ہے۔ اسی حکم ربانی کی تعمیل کے لیے ۹ھ کے حج میں حضرت صدیق اکبر اور علی مرتضیٰ کو تین سو صحابہ کے ساتھ مکہ روانہ کیا اور اعلان کرایا۔

ابتدائی آیات میں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ کمزور قوموں کو بلا مہلت کسی جگہ سے نکل جانے کا حکم یا ان پر یکبارگی حملہ بزدلی اور غیر شریفانہ فعل ہے جب ایسا کرنا ہو تو پہلے اعلان عام کیا جائے اور ان کو اس کی مہلت دی جائے کہ اگر وہ ہمارے قانونی نظام کو پسند نہیں کرتے ہیں تو آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں یہ بات قرآن کی آیت فسیحوا فی الارض سے معلوم ہو رہی ہے۔

یہ بھی ان آیات ہی کی رہنمائی ہے کہ کسی قوم سے معاہدہ صلح کر لینے کے بعد اگر معاہدہ میعادی ہو اور آپ میعاد سے پہلے ختم کرنا چاہتے ہیں تو اگرچہ چند شرائط کے ساتھ اس کی اجازت ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ معاہدہ کی میعاد پوری کی جائے۔

یہ بات بھی ان آیات سے مترشح ہو رہی ہے کہ فریق مقابل کے ساتھ ہر معاملہ میں مسلمانوں کے دھیان میں یہ بات رہنی چاہیے کہ مسلمان کی دشمنی کسی کی ذات سے نہیں بلکہ کافرانہ افکار، اطوار اور اقدار سے ہے۔

آخر میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ عہد کا پورا کرنا صرف قومی اور سیاسی مصالح کے بنا پر نہ ہو بلکہ اس کی بنیاد سر تا سر تقویٰ پر ہو اور بس۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آیت کی واقعات کی روشنی میں تشریح آپ کے سامنے آچکی ہے اب صرف ایک شبہ یا وسوسہ کا ازالہ باقی ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

واقعہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس ۹ھ میں حج کا امیر بنا کر روانہ کیا اور بعد کو معاہدوں کی تنسیخ کے لیے سورۂ برارت کی ابتدائی آیات دے کر آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ کیا۔ لوگوں کو وسوسہ یہ ہوا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل ہیں اور اس لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی خلافت کے حقدار ہیں۔

اس کا جواب اگرچہ تفسیر کی عام کتابوں میں موجود ہے علامہ آلوسی نے روح المعانی میں، قرطبی نے الجامع میں اور السید رشید رضا نے المنار میں اس پر اجمالی اور تفصیلی بحث کی ہے۔ ان ہی بزرگوں کی پیروی میں یہاں معالم القرآن کے ناظرین کے منہ کا مزہ درست کرنے کے لیے کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

آفتابِ ہدایت میں مولانا کرم الدین نے اس شبہ کی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سورہ برارت کی تبلیغ کے لیے مکہ مکرمہ روانہ کیا تھا۔ بعد میں جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور پیغام دیا کہ اس کام کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ کرو۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جا کر فرض تبلیغ احکام سورہ برارت انجام دیا تو جب آپ ایک سورت کی تبلیغ کی قابلیت نہ رکھتے تھے تو وہ خلیفہ کس طرح ہو سکتے تھے جس کے ذمے تمام احکام شرعیہ کی تبلیغ کا کام ہوتا ہے۔

اور اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:

روایات اہل السنۃ اس بارے میں مختلف ہیں۔ اکثر روایات میں یوں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی سے امیر حج مقرر فرما کر روانہ فرمایا تھا۔ بعد ازاں سورۂ برارت کا نزول ہوا تو آپ نے اس کی تبلیغ کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ فرمایا۔ اس صورت میں معترض کا اعتراض سرے سے غلط ٹھہرتا ہے۔ کہ جس کام کے لیے ابوبکر مامور ہوئے یعنی مناسکِ حج کی تعلیم کے لیے وہ کام آخر تک انھوں نے ہی انجام دیا۔ اس میں اعتراض کی کونسی بات ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر حج بنا کر روانہ کیا گیا تو سورہ برارت کی تبلیغ کا کام بھی آپ کے سپرد کیا گیا۔ لیکن بعد کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سورۃ برارت کی تبلیغ کا کام سپرد کر کے حضرت ابوبکر کا ہاتھ بٹانے کے لیے روانہ کیا گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے ماتحت ہو کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ کام انجام دیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خصوصیت سے اس کام کے لیے روانہ کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ عرب میں دستور یہ تھا کہ جب کوئی

معاہدہ کرنا یا اس کو توڑنا ہوتا اور صلح یا جنگ کا معاملہ درپیش ہوتا وہ ایسے شخص کے ہاتھ سے انجام پذیر ہو سکتا تھا جو بادشاہ کی قوم میں سے اس کا فرزند یا داماد ہو۔ دوسرا کوئی شخص خواہ کتنی بڑی شخصیت رکھتا ہو اس کام کے لیے منتخب نہیں ہو سکتا ہے چونکہ سورہ برارت اس بات کا اعلان تھا کہ سابقہ معاہدات ختم ہو چکے ہیں اس لیے یہ فرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو انجام دینے کا حکم ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور داماد تھے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جگہ یہ اعلان کوئی اور کرتا تو مشرکین کو اس کے ماننے میں دستور کے مطابق تردد ہوتا اور وہ اعتراض کرتے کہ اگر ایسا اعلان مقصود تھا تو شاہی خاندان کے کسی خاص آدمی کے ذریعہ اس کا اعلان کیوں نہیں کیا گیا۔ مشرکین کے اسی عذر کو رفع کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس ڈیوٹی پر لگایا گیا۔ اس میں قابلیت وعدم قابلیت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قابلیت میں ذرا متردد ہوتے تو آپ ان کو آغاز میں اس کام کے لیے کیوں منتخب فرماتے۔ یہ تو صرف حج کی امارت ہے ابوبکر کا سرکار نبوت کی جانب سے اس سے بھی بڑے اور ذمہ داری کے کاموں کے لیے انتخاب ہوا ہے۔ یہاں بھی جو کام صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد ہوا ہے وہ بڑا اہم اور ذمہ داری کا کام تھا۔ سرکاری طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اتنے بڑے اجتماع میں انتظامی سربراہ اور قائد حج بنا کر روانہ کیا گیا ہے وہاں پیش پا افتادہ حالات میں مقدمات کا فیصلہ اور مسائل شرعیہ کی تعلیم وتبلیغ جیسے امور کے لیے ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو بیک وقت مجتہد، منتظم اور مدبر ہو۔ سورہ برارت کی آیات کی تلاوت کے لیے کوئی انتظامی، اجتہادی صلاحیت درکار نہ تھی۔ بتانا ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے اور نہ اس سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی برتری ثابت ہوتی ہے۔

تاریخ، سیرت اور حدیث کی کتابوں میں یہ بات پوری وضاحت سے بتا دی گئی ہے کہ اس موقعہ پر حضرت ابوبکر رضؓ کی حیثیت امیر کی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مامور کی تھی۔ نمازیں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتدا میں ہو رہی تھیں مناسک حج ان کی امامت میں ادا ہو رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ناقہ پر سوار ہو کر تشریف لائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا امیراً جئت ام ماموراً۔ امیر ہو کر آئے ہو یا مامور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب یہ تھا کہ جئت ماموراً۔ میں مامور کی حیثیت سے آیا ہوں۔

خلاصہ یہ کہ امارت حج کی ذمہ داری اتنی عظیم تھی کہ اس ذمہ داری کے ساتھ اصالتاً خود حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سورہ برارت کا پیغام جگہ جگہ اور ہر خیمہ میں جا کر پہنچانا بے حد مشکل تھا ذمہ داری کے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے سورہ برارت والے کام کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ فرمایا۔ اس طرح تقسیم کار ہو گئی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا کام اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا کام بوجہ احسن انجام دیا۔

یہ تھے مولانا کرم الدین آفتاب ہدایت ہیں۔

اتنی بات تو اتفاقی ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حج کی امارت حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا ہوئی تھی اور واقعات کی دنیا میں ابوبکر نے حج اپنی امارت میں کرایا۔ سوچنے کی بات ہے کہ مکہ پر بھرپور تسلط ہے۔ اور مکہ اسلامی حکومت کے زیرنگین ہے حضرت عتاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرکاری طور پر مکہ کے گورنر ہیں۔ اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد پہلے حج کا حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر بنایا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وفات سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری نماز کا امام حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بنایا ہے۔ ان دونوں ارکان اسلام میں ابوبکر کی امامت اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے لیے ابوبکر کی ذات گرامی جمیع صحابہ میں احق اور اہل ہے واقعات بتاتے ہیں کہ ابوبکر کی امارت ہی میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معاہدوں کی تنسیخ کا اعلان کیا ہے بلکہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے وقت بھی امیر ہونے کی حیثیت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے مقرر کیا اور بحیثیت امیر حکم دیا کہ یا علی قم فبلغ رسالۃ رسول اللہ۔ علی اٹھو اور حضور انور کا پیغام پہنچاؤ بلکہ کام کو انجام دینے کی خاطر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امداد کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کچھ دوسرے صحابہ کو بھی مقرر کیا جیسے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

یہ بات کہ اس خاص کام کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیوں مقرر کیا اس پر اجمالی گفتگو پہلے ہو چکی ہے لیکن اس موضوع پر علامہ آلوسی نے نکتہ آفرینی فرمائی ہے وہ بھی گوش گذار فرمالیجئے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر حج اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معاہدوں کے ختم ہونے کا اعلان اسلیئے سپرد کیا گیا کہ صدیق اکبر رض کی ذات گرامی اللہ کی صفت رحمت وجمال کی مظہر ہے۔ جیسے بدر کے قیدیوں کے ذکر میں آپ پڑھ چکے ہیں مثلک یا ابابکر مثل ابراھیم اور مثلک یا ابابکر مثل عیسیٰ اور ارشاد نبوت میں ہے ارحم امتی با متی ابو بکر اس لیے اہل ایمان کے معاملات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کے سپرد کیے۔ اور حضرت علی اسد اللہ الغالب ہونے کی وجہ سے جلال کے مظہر تھے اس لیے کافروں سے معاہدے توڑنے کا معاملہ ان کے سپرد کیا یہ اسلام کی دو آنکھیں تھیں ایک میں صفت جمالی تھی اور دوسری میں صفت جلالی۔ میدان عرفات کے اس اجتماع میں کافر و مومن دونوں تھے اس لیے جلال اور جمال دونوں کی ضرورت تھی۔

ایک صاحب نے امام محمد بن جریر طبری کی پیش کردہ سدی کے حوالہ سے ایک روایت سے بڑا ہی انوکھا اور عجیب استدلال کیا ہے۔ آیئے پہلے وہ روایت سن لیجیے۔

سدی کہتے ہیں۔ جب قرآن میں سورہ برءت کی چالیس آیتیں نازل ہوئیں۔ ابوبکر کو انہیں دے کر روانہ

فرمایا اور ان کو حج کی امارت بھی سپرد کی۔ جب وہ روانہ ہو گئے اور ذوالحلیفہ کے درخت تک پہنچے تو پیچھے سے حضور نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سورۃ برارت کی آیات لے لیں۔ ابوبکر حضور کے پاس واپس آئے۔ دریافت کیا کہ یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کیا میرے بارے کچھ آسمان سے نازل ہوا ہے فرمایا بالکل نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ سورۃ برارت کو میری جانب سے ایسے شخص کو نہ پہنچانا چاہیے جو میرا غیر ہو بلکہ ایسے کو پہنچانا چاہیے جو میرے سے ہو۔

اس سے ان صاحب نے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ روایت بتلا رہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں نسبت یگانگت کی ذاتی ہے ——— اور یہ بھی یہ روایت بتا رہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام صحابہ میں اللہ کے نزدیک بہترین اور بزرگترین ہیں کیونکہ جو شخص ذاتِ پیغمبر سے مماثلت رکھتا ہو وہ بمنزلہ ذات پیغمبر کے ہے اور آگے لکھا ہے ——— کہ حضرت علیؓ کے بارے میں یہ بات ثابت شدہ حقیقت ہے جو خود ابوبکر کو بھی تسلیم ہے۔ کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس مقام سے گرانے کے لیے یہ سازش کی ہے کہ منی سے قریب نسبی مراد ہے اور نسب کا سہارا لینے کے لیے یہ بات بنائی ہے کہ عرب کا دستور تھا کہ معاہدوں کو ختم کرنے کے لیے خود معاہد یا اس کا کوئی رشتہ دار اعلان کرے۔

وہ تھی بنیاد اور یہ ہے اس کھوکھلی بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت۔ آیئے ہم اس بنیاد کا علمی جائزہ لیں۔

بلاشبہ یہ روایت سدی کی زبانی حافظ محمد بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں پیش کی ہے۔ لیکن جائے حیرت ہے کہ ان صاحب نے اس موضوع پر آئی ہوئی تمام روایات کو چھوڑ کر اپنے دعوے کی دلیل کے لیے اسے منتخب کیا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دوسری روایات ان صاحب کے دعویٰ کے لیے مفید نہیں ہیں۔ لیکن سدی کی اس روایت میں ان کے خیالی پلاؤ کے لیے کچھ سالہ دستیاب ہو سکتا ہے چاہے اس روایت کا چہرہ بگاڑ کر ہی کیوں نہ ہو۔ مزہ یہ ہے کہ سدی یہ روایت کسی بھی سہارے کے ذریعے نہیں کہہ رہا ہے بلکہ وہ خود اپنی جانب سے کہہ رہا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کہانی اس کی اپنی ساختہ پرداختہ ہے۔ اگر وہ کسی صحابی کا نام لے کر پیش کرتا تو کم از کم یہ معلوم تو ہوتا کہ سہارا اور مرکز کیا ہے۔ وہ تمام صحیح روایات جو اس موضوع پر احادیث وسیر کی کتابوں میں مستند ذرائع سے آئی ہیں وہ سب سدی کے اس بیان کے خلاف ہیں۔ یہ ایک بے غبار حقیقت ہے۔ روایت کے میدان میں اس واقعہ کو ترجیح ہونی چاہیے جو مستند روایتوں سے آئی ہے اس کے مقابلہ میں جس کی حیثیت صرف ایک انفرادی رائے کی ہے۔ اس پر طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ صاحب ادعائے تحقیق کے باوجود سدی کی اس انفرادی رائے کو بھی پورا نقل نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کو بھی قطع وبرید کرکے دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ سدی کے اس بیان میں یہ بھی ہے۔

اے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کیا تجھے یہ بات پسند نہیں کہ تو میرا غار کا ساتھی ہے اور حوض کوثر پر روز قیامت میرے ساتھ ہے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے فوراً کہا کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ بس ابوبکر حج کے امیر اور علی اعلان برارت لے کر روانہ ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یوم نحر میں اعلان کیا۔

۱۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک مسجد حرام میں نہ آئے گا۔

۲۔ کوئی برہنہ بیت اللہ کا طواف نہ کرے گا۔

۳۔ جن کا حضور اقدس ﷺ سے عہد میعادی ہے ان کا عہد میعاد تک ہے۔

۴۔ یہ کھانے پینے کے دن ہیں۔

۵۔ جنت میں مسلمان کے سوا اللہ سبحانہ کسی کو داخل نہ کرے گا۔ یہ سن کر مجمع نے کہا ہم بھی تیرے اور تیرے چچا کے بیٹے کے عہد سے دست بردار ہوتے ہیں۔ اب نیزہ بازی اور تلوار زنی کے سوا کوئی راہ نہیں ہے مشرکین واپس ہوئے تو باہم ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے تم ایسی حالت میں کیا کرو گے جب کہ قریش حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں لہذا یہ لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔

سدی کا یہ پورا بیان تفسیر ابن جریر کی جلد عاشر میں ہے۔

آپ ہی انصاف کریں کہ اگر ان صاحب کے خیال میں اپنے اس مزعومہ دعویٰ کے لیے یہ روایت اور سدی کا یہ بیان دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ اور حضور ﷺ میں یگانگت ہے اور یگانگت بھی ایسی کہ نفسہ لفسہ حضرت علی رض کی ذات حضور ہی کی ذات ہے تو کیا سدی کا یہ بیان اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ابوبکر دنیا میں حضور کے جیسے غار کے ساتھی ہیں ایسے ہی آخرت میں حوض کوثر پر آپ کے ساتھی ہوں گے

۱۔ پھر سدی کا بیان ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کو سورہ برارت کی چالیس آیات دے کر روانہ کیا بتایئے کیا ان چالیس آیتوں میں اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ آیت نہیں ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ حضور اقدس نے حضرت علی کو اس لیے روانہ کیا کہ وہ لوگوں کے سامنے ابوبکر رض کے مناقب اور ان کا مقام اعلیٰ بیان کریں اور بتائیں کہ ابوبکر کیا ہیں اور ذات رسول سے ان کا کیا تعلق ہے اور حضور نے اس اجتماع عام میں حج کے قائم کرنے کے لیے اپنا نائب کیوں بنایا ہے اور پھر ابوبکر کی امارت میں برارت کی تبلیغ کا کیوں حکم دیا ہے۔ چنانچہ صحیح روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکر رض نے میدان عرفات میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کو حکم دیا کہ حضور کا پیغام لوگوں کو سناؤ۔

ان صاحب نے روایت کے اس حصے کو جان کر چھوڑ دیا ہے تاکہ مخاطبوں کے دماغ میں یہ بات نہ آجائے کہ تاریخ نبوت کے اہم حادثہ میں تنہا رفاقت کا فرض ابوبکر ادا کر رہے ہیں۔ زندگی کا یہی حادثہ یعنی ہجرت ظہور اسلام کا نقطہ آغاز اور دنیا میں

اسلام کی روشنی کا ذریعہ ہے۔ اگر ہجرت کے موقعہ پر ابوبکر کی رفاقت کوئی معمولی بات ہوتی تو قرآن اسے اس پُرشوکت انداز میں بیان نہ کرتا کہ ایک طرف سید البشر کا ان کو صاحب بتائے اور نبوت کی زبان سے ان کے لیے اللہ کی معیت کا اعلان کرائے۔

باقی رہاں صاحب کا سدی کی روایت میں آئے ہوئے جملہ رجل منی سے ناجائز استفادہ اور اس پر اپنی مزعومہ عمارت کی تعمیر تو یہ درست نہیں ہے کیونکہ صحیح روایات میں اس کی تفسیر یہ آچکی ہے او رجل من اهل بیتی جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ معاہدے کی تنسیخ کا اعلان عرب دستور کے مطابق مجھے یا میرے کسی [illegible]ت دار کو کرنا چاہیے۔

بہرحال اس قسم کے وساوس کا نام عقائد نہیں ہو سکتا۔ عقائد کی عمارت کتاب وسنت کے محکمات پر اٹھتی ہے خیالی باتوں، ذہنی وسوسوں اور وہمی خواطر کا نام عقائد نہیں ہوتا ہے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ
وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ
كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا
الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵ وَاِنْ
اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ
اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶ ع

لہٰذا جب حرمت والے مہینے گذر جائیں تو پھر ان مشرکین کو مارو جہاں بھی تمہیں دستیاب ہوں اور ان کو گرفتار کرو، ان کو گھیر لو اور ہر جگہ ان کے لیے گھات میں بیٹھ جاؤ۔ بعد ازیں اگر وہ توبہ کرلیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کرو۔ بلاشبہ اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے اور اے پیغمبر اگر ان مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے امان کا خواہاں ہو تو اسے امان دیدیجئے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کے جائے امن پر پہنچا دیجئے یہ بات اس لیے ہے کہ یہ لوگ اسلام کا علم نہیں رکھتے ہیں۔

مفردات کے معانی

انسلخ۔ ماضی کا واحد مذکر انسلاخ سے۔ گذر جانا اصل میں سلخ ہے جس کے معنے سانپ کے کینچلی اتارنے کے ہیں اسی معنی میں آیت لھم الیل نسلخ منہ النھار آیا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

اذا ما سلخت الشهر اهلكت مثله
كفى قاتلا سلخى الشهور واهلالى

(الحرم حرام کی جمع ہے جیسے سحاب کی جمع سحب آتی ہے وہ مہینے جن میں اللہ نے قتال حرام کیا ہے یہ ذوالقعدہ ذوالحجہ المحرم اور رجب ہیں۔ خذوا جمع مذکر حاضر امر کا اخذ سے تیدی کو اخیذ کہتے ہیں۔ اس کے معنے یہاں پکڑنے اور گرفتار کرنے کے ہیں۔

مرصد اسم ظرف ہے کسی جگہ بیٹھ کر دشمن کو تاڑ میں رکھنا۔ ستاروں کی رفتار معلوم کرنے کی جگہ کو رصدگاہ کہتے ہیں۔ استجار واحد مذکر ماضی استجارہ سے اس کے معنے جوار کی درخواست کرنا۔ پڑوسی کی حمایت اور اس کی جانب سے دفاع عرب کے اخلاق میں سے ہے حتی کہ مددگار کو جار کہتے ہیں جیسے کہنا ہو کہ میں تمہارا مددگار ہوں تو بولتے ہیں انی جار لکم یہاں معنے پناہ چاہنے کے ہیں۔

اسلامی زندگی کا پیمانہ

پیچھے یہ بات کھول کر بتادی گئی ہے کہ ان معاہدین کے سوا جن کے معاہدے میعادی ہیں۔ سب کے معاہدے ختم ہیں اب ان کے سامنے صرف دو راہیں ہیں وہ اسلام قبول کرلیں۔ یا پھر میدان جنگ میں آمنے سامنے ہوکر فیصلہ کریں۔ ظاہر ہے کہ جب آپ مخالف سے اسلام کو اپنانے کی پیش کش کر رہے ہیں تو آپکے ذمہ یہ بھی ہے کہ آپ ان کو اسلامی زندگی کا کوئی محسوس اور مرئی نمونہ بتائیں ان آیات میں اسلامی زندگی کا پیمانہ بتایا گیا ہے کہ اگر وہ کفر سے باز آجاتے ہیں اور اسلامی زندگی کا پیمانہ نماز، زکوٰۃ اور عملی زندگی اپناتے ہیں تو وہ اسلام کی اجتماعی زندگی کے مسلمان شہری ہیں۔ گویا جس بات کے بعد ایک جماعت مسلمانوں کی اجتماعی سوسائٹی میں مسلمان تسلیم کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ کفر سے توبہ کے بعد اسلامی نظام کی حقیقت کا اقرار کرے اور عمل میں دو باتیں ضرور آجائیں ایک نماز کی جماعت کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ اگر یہ دو عمل ایک جماعت میں مفقود ہیں تو اس کا شمار مسلمانوں میں نہ ہوگا۔ یہ غیر مسلم آبادی، غیر مسلم جماعت کے اسلام میں داخل ہونے کا قرآن نے پیمانہ بتایا ہے۔ اس سلسلے میں فرد اور جماعت کے فرق کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے۔ بلاشبہ ایک فرد اگر تارک صلاۃ ہے تو وہ گنہ گار اور اس کا تعلق مفتی کے فتوے سے ہے اور اگر ایک جماعت من حیث الجماعۃ ترک صلاۃ کرتی ہے تو وہ اسلامی زندگی کی محسوس و مرئی نشانی سے محروم ہے اور اس کا تعلق اسلامی حکومت سے ہے۔

(۴) لہذا جب حرمت والے مہینے گذر جائیں تو پھر ان مشرکین کو مارو جہاں بھی تمہیں دستیاب ہوں۔ اور ان کو گرفتار کرو۔ ان کو گھیرلو۔ اور ان کے لیے گھات میں بیٹھ جاؤ۔ بعد ازیں اگر وہ توبہ کرلیں نماز قائم کریں زکوٰۃ دیں تو ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کرو۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔ استثناء سے فارغ ہوکر پھر مستثنیٰ منہ کا حکم بیان کرتے ہیں یعنی ان

عہد شکنی کرنے والوں سے اگرچہ اب کوئی معاہدہ نہیں رہا اور اس لیے علی الفور جنگ کی جا سکتی ہے۔ تاہم اشہر حرم کی حرمت کی رعایت مانع ہے کہ فوراً ان پر حملہ کیا جائے نیز اس لیے کہ اس وقت تک اشہر حرم میں ابتداءِ قتال کرنا ممنوع ہوگا۔ یا مصلحتاً تھوڑی سی بات کے لیے لوگوں میں تشویش پیدا کی جائے کیونکہ ان مہینوں میں قتال کی حرمت ان کے یہاں معروف و مسلم چلی آرہی تھی بہر حال ماہ محرم کے ختم تک ان کو مہلت دی گئی تاکہ جو چاہیں اپنا بندوبست کریں اس کے بعد تطہیر جزیرۃ العرب کی خاطر جنگ کے چارہ نہیں۔ جو کچھ برتاؤ جنگ میں ہوتا ہے۔ مارنا، پکڑنا، گھیراؤ ڈالنا۔ داؤ لگانا، گھات میں رہنا وہ سب ہوگا۔ البتہ اگر بظاہر کفر سے توبہ کرکے اسلامی برادری میں داخل ہو جائیں جس کی بڑی علامت نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا ہے تو پھر مسلمانوں کو ان سے تعرض کرنے اور ان کا راستہ روکنے کی اجازت نہیں ہے۔ رہا باطن کا معاملہ وہ خدا کے سپرد ہے مسلمانوں کا معاملہ ان کے ظاہر کو دیکھ کر ہوگا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اسلام کا کلمہ پڑھ کر نماز ادا نہ کرے یا زکوٰۃ نہ دے تو مسلمان اس کا راستہ روک سکتے ہیں۔ امام احمد۔ امام شافعی، امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ تارک صلوٰۃ اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ردۃً اور مالک و شافعی کے نزدیک حداً و تعزیراً۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسے خوب زدوکوب کیا جائے اور قید میں رکھا جائے حتی یموت او یتوب حتیٰ کہ مر جائے یا توبہ کرے۔ بہر حال تخلیہ سبیل کسی کے نزدیک نہیں رہے مانعین زکوٰۃ ان کے اموال میں حکومت جبراً زکوٰۃ وصول کرے اور اگر وہ لوگ مل کر حکومت سے برسرپیکار ہوں تو راہ راست پر لانے کے لیے جنگ کی جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے مانعین زکوٰۃ پر جو جہاد کیا اس کا واقعہ کتب حدیث و تاریخ میں مشہور ہے[1]

ان آیات میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ اس آیت میں الاشھر حرم سے کون سے مہینے مراد ہیں۔ شارحین قرآن کی اس موضوع پر دو رائیں ہیں۔

کچھ علماء کی رائے تو وہی ہے جسے شیخ الاسلام نے اپنایا ہے یہ کہ ان سے مراد وہی مہینے ہیں جو عرب میں حرمت والے تھے ذی قعدہ، ذی الحج، محرم اور رجب ان میں تین متصل ہیں اور ایک الگ ہے ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جن مشرکین سے عہد نہیں ہے یا جن سے عہد تھا اگر وہ عہد شکنی کر چکے ہیں ان سے اشہر حرم میں قتال نا جائز ہے لہٰذا جب یہ حرمت والے مہینے گذر جائیں تو تمہیں ان مشرکین کو قتل کرنے کا حکم ہے۔ گویا اس آیت میں ضمناً پہلے حرمت والے مہینوں میں قتال کی حرمت کا حکم بتایا اور پھر بتایا کہ جب یہ حرمت والے مہینے گذر جائیں تو پھر تمہیں قتال کا حکم ہے۔

لیکن اس پر قاضی بیضاوی اور علامہ آلوسی اور دوسرے شارحین قرآن نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس مطلب کی نظم قرآنی اور

[1] افادات شیخ الاسلام

سیاق قرآن اجازت نہیں دیتا۔ اور یہ بات بے بھی وزنی کیونکہ عرب والے جب پہلے ایک بات کے لیے تعبیر نکرہ کی اختیار کرتے ہیں پھر اسی کے لیے تعبیر معرفہ موصوفہ کی اختیار کریں تو اس صورت میں دوسرا عین اول ہوتا ہے اگر آپ کہیں گے کہ رایت تلمیذا و ضربت التلمیذ الشریف تو اس صورت میں تلمیذ شریر جس کی آپ نے پٹائی کی ہے وہی ہے جسے آپ نے دیکھا تھا آیت میں بھی یہی صورتحال ہے پہلے فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھرا کو نکرہ بناکر لایا گیا اور اب دوبارہ اسی کو معرفہ موصوف کے ساتھ لایا جارہا ہے فاذا انسلخ الاشھر الحرم معلوم ہوا کہ ان اشہر حرم سے وہی چار مہینے مراد ہیں جن میں ملک میں پہلے آزادانہ نقل وحرکت کی اجازت دی گئی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مطلب پر یہ شبہ پیش کیا ہے کہ اس مطلب کی صورت میں آیت میں اشہر حرم کا حکم بیان ہورہا ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ اشہر حرم کا حکم اسی سورت میں آگے آرہا ہے ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرا۔

کچھ علماء اور شارحین قرآن کی رائے یہ ہے کہ ان چار مہینوں سے عرب کے مشہور حرمت والے مہینے مراد نہیں بلکہ ان سے وہ چار ماہ مراد ہیں جن میں معاہدہ کو عہد ختم ہونے کے بعد غور وفکر کی مہلت اور آزادی سے ملک میں چلنے پھرنے کی رخصت دی گئی ہے۔ فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھر۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ دی ہوئی مہلت کے چار مہینے ختم ہوجائیں گے تو ان سے حالت جنگ قائم ہوجائے گا۔ اور ان مشرکین کی حیثیت حربیوں کی ہوگی۔ اور حربی کی حیثیت سے ان کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جائے جو حربیوں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے یعنی میدان جنگ کے تقاضوں کے تحت تم ان سے جو کچھ سلوک کر سکتے ہو کرو۔

فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم یہ مشرکین جہاں بھی تمہیں مل جائیں ان کو اس مدت کے گذر جانے کے بعد قتل کرو ان کے لیے دو ہی صورتیں ہیں اسلام اور جنگ مشرکین عرب کے ساتھ قرآن کا یہ خاص معاملہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں سے رسول بھیجا۔ ان کی زبان میں ان پر کتاب نازل کی۔ اسی ملت کی ان کو دعوت دی گئی جس کے وہ مدعی تھے۔ رسول اللہ نے مسلسل ۲۳ سال تک ان پر محنت کی تو اس ساری محنت کے بعد جو لوگ قبول حق پر آمادہ نہ ہوئے پھر بھی ان کو آزادی سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کے لیے چار ماہ کی مہلت دی گئی فرمایا کہ جب یہ چار ماہ گذر جائیں تو اب حالت جنگ ہے ان چار ماہ کو اشہر حرم کہا ہی اس لیے گیا ہے کہ ان میں ان کو مارنا قتل کرنا حرام کیا گیا ہے اس عرصہ میں مسلمانوں کے لیے ان پر حملہ کرنا ناجائز قرار دیا گیا ہے ان سے وہ اشہر حرم مراد نہیں جو حج اور عمرے کے لیے حرام قرار دیئے گئے

فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم یہ آیت اگرچہ عام ہے لیکن یہاں دو تخصیصیں ہیں ایک تخصیص کی نشاندہی خود قرآن نے کی ہے کہ حرم میں قتال حرام ہے قرآن میں ہے ولا تقاتلوھم عند المسجد الحرام حتی یقاتلوکم

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کو حرم میں قتال کی اس شرط پر اجازت دی ہے کہ تمہاری جنگ دفاعی ہو ہجومی نہ ہو۔ یہ شرط یہاں بھی محفوظ رہے گی۔ کیونکہ قرآن میں اگر ایک مقام پر حکم مقید ہو اور دوسرے میں مطلق۔ تو مطلق میں قید ملحوظ رہے گی۔

دوسری تخصیص قرآن سے نہیں سنت سے معلوم ہو رہی ہے یعنی ان مشرکین کو قتل کرو اور ان سے جنگ کرو لیکن تمہاری جنگ مادی اغراض کے لیے نہ ہو نہ ان لوگوں پر ہاتھ اٹھاؤ جو دین حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے اور نہ لڑائی میں جاہلیت کے طریقے استعمال کرو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور زخمیوں پہ دست درازی نہ کرنا۔ دشمنوں کے مقتولوں کا مثلہ کرنا۔ کھیتوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا۔ اور دوسرے تمام وحشیانہ افعال قرآن کی زبان میں اعتدا ہیں جس سے قرآن نے لاتعتدوا ان اللہ لایحب المعتدین کہہ کر مسلمانوں کو منع کیا ہے۔ اور احادیث میں ان سب کی ممانعت آئی ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ طاقت کا استعمال ان مشرکین کے لیے چار ماہ گذرنے پر کیا جائے جن سے کہ معاہدہ نہ تھا۔ یا جن سے معاہدہ تھا مگر ان کی جانب سے عہد شکنی ہو چکی ہے ان کو چار مہینے کی مدت میں اپنے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقع ہے کہ جزیرہ العرب میں رہنا ہے تو صرف قبولِ اسلام کے بعد رہنا ہے۔ اس کے علاوہ جزیرہ میں رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے ان چار ماہ میں وہ اگر کوئی متبادل انتظام رہائش کا کر سکتے ہیں تو ان کو اجازت ہے لیکن چار ماہ کی مدت گذرنے پر فیصلہ تلوار سے ہوگا۔

گویا چار ماہ کے بعد عرب میں مشرکین کا وجود عملاً خلافِ قانون ہو جائے گا۔ اور ان کے لیے پورے جزیرے میں کوئی پناہ گاہ نہ ہوگی اور اہلِ ایمان کو ان کو یہاں سے نکال دینے کا پورا پورا حق حاصل ہوگا اور نکالنے کے لیے اہل ایمان کو وہ تمام اطوار اپنانے کا حق ہوگا جو ایک دشمن کے لیے میدانِ جنگ میں اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ قرآن نے یہاں تین باتوں کی نشاندہی کی ہے

اوّل: خذوھم یعنی ان کو گرفتار کرلو۔ یہ وہی اخذ ہے جس کی پہلے اثخان فی الارض سے پہلے ممانعت کی تھی یہاں صاف اجازت دی جا رہی ہے۔ بلکہ حکم دیا جا رہا ہے۔ علامہ آلوسی نے تصریح کی ہے کہ ان مشرکین کی گرفتاری صرف استیلا کے لیے ہے کیونکہ ان قیدیوں کو غلام بنانا جائز نہیں۔ فان مشرکی العرب لایسترقون۔ بلکہ ان کو قید کرنے کے بعد مسلمان ہونے کی دعوت دی جائے گی نہیں مانیں گے تو قتل کیے جائیں گے۔

واحصروھم دشمن کسی محفوظ جگہ میں ہو جیسے قلعہ وغیرہ تو اس کا گھیراڈال لینا۔ ان کو نہ نکلنے دینا۔ ہر طرح سے اس ان کا ناطقہ بند کر دینا۔ اس میں ان کی خوراک بند کر دینا ... ان نہ پہنچے۔ مادی مدد ختم کرنا ہر قسم کی سپلائی پہ پابندی لگا دینا داخل ہے۔

واقعدوالھم کل مرصد۔ ان کی تاک ... ہر پہلو سے ان کی نگرانی ملک میں گھومنے اور شہروں میں ان کے آنے جانے کا خیال رکھو۔

عام شاہراہوں اور اہم مقامات پر ان کی تاڑ رکھو۔ اب ان کا چلنا پھرنا گھومنا سب خلاف قانون ہے۔

عفو و درگذر اور قتال کا تقابلی مطالعہ

یہ بات یہاں ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہاں اقتلوا المشرکین کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق صرف مشرک جماعتوں سے تھا جو عرب میں دعوت اسلامی کی پامالی کے لیے لڑ رہی تھیں یہ ساری دنیا کے تمام مشرکوں کے لیے حکم نہیں ہے چنانچہ اول سے کر آخر تک خطاب خاص جماعتوں سے ہے اور صاف لفظوں میں واضح کر دیا ہے کہ ان جماعتوں نے کس طرح عہد شکنی کی اور کس طرح خود ہی جنگ کا باعث ہوئے نیز ظلم و جنگ کی ابتداء کرنے والے بھی وہی ہیں۔ یہاں سے یہ بات خود بخود صاف ہو گئی ہے کہ اس آیت کے ذریعے کفار سے عفو و درگذر کی نصیحت کو جو منسوخ بتاتے ہیں۔ اور اس آیت کو آیت السیف کہتے ہیں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ حافظ السیوطی کہتے ہیں۔

> وہ احکام جو کسی وجہ سے ہوں۔ پھر وجہ تبادی ہو وہ حقیقت میں منسوخ نہیں بلکہ انساء کے قبیل سے ہیں جیسے ضعف ——— اور تعداد کی کمی کے وقت میں صبر و درگذر کا حکم، پھر قتال کے ذریعے اس کا نسخ اس کا تعلق احوال و ظروف کے اختلاف سے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر جو آیات عفو و صفح کو آیۃ السیف سے منسوخ بتاتے ہیں اس میں کوئی وزن نہیں بلکہ اس قسم کی آیات کا تعلق احوال و ظروف کے اختلاف سے ہے یعنی جو حکم کسی وجہ سے کسی وقت دیا گیا ہے اس کا امتثال اسی وقت تک ہے جب تک وجہ موجود ہے۔ وجہ کے انتقال سے حکم بھی منتقل ہو جائے گا۔ یہ نسخ نہیں ہے۔ نسخ تو نام ہے حکم کو ختم کر دینے کا ختم ہونے کے بعد اس کی پابجائی جائز نہیں ہے مکی کہتے ہیں کہ علماء کی ایک جماعت کہتی ہے ایسے تمام احکام جن میں توقیت اور غایت ہوتی ہے۔ محکم ہیں منسوخ نہیں ہیں۔ کیونکہ حکم مؤجل میں نسخ نہیں ہوتا ہے۔ [1]

اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار سے عفو و درگذر کی نصیحت ہے عام شارحین قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ وہ قرآن میں اس آیۃ السیف سے پہلے کی بات ہے۔ اس آیۃ السیف نے کفار کے حق میں عفو درگذر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ لیکن شارحین قرآن میں کچھ ایسے اہل علم بھی ہیں جو اس آیت السیف کے حکم اور عفو و درگذر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک کو دوسرے کو منسوخ نہیں کہتے ان کا کہنا ہے کہ عفو و درگذر کا تعلق زندگی کے عام معاملات سے ہے جبکہ جنگ کا تعلق خاص معاملات اور خاص لوگوں سے ہے۔ انسانی زندگی کے عام معاملات کو میدان جنگ کے خاص معاملات پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ اس آیت میں قرآن کے مخاطب وہ خاص لوگ ہیں جن کی اسلام دشمنی اور عہد شکنی منصۂ شہود پر آ گئی تھی۔ اس کے باوجود قرآن نے چار ماہ کی مدت

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن

دے کر یہاں بھی عفو سے کام لیا ہے۔

دوسری بات ان آیات میں سمجھنے کی یہ ہے کہ فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ فخلوا سبیلھم میں ان کے لئے ایک پیمانہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام مشرکین سے الگ ان کی یہ دار و گیر اس وقت تک بند کی جائے گی جب تک یہ اپنے کفر و شرک سے تائب ہو کر ایمان قبول نہ کریں اور نماز قائم نہ کریں اور زکوٰۃ نہ دیں۔ تابوا ایک جامع تعبیر ہے کفر و شرک سے بیزاری اور اسلام کے سارے فکری نظام کو اپنانے کی۔ اور نماز و زکوٰۃ تعبیر ہے اسلام کے نظام عبادت اور نظام اطاعت میں داخل ہونے کی جس سے یہ ہوئے کہ اسلام کے بغیر نہ ان کے لیے اسلامی مملکت کا شہری ہونے یا معاہد بن کر اسلامی نظام پر باقی رہنے کی کوئی گنجائش ہے نہ لونڈی غلام بن کر۔ ان کے لیے صرف دو راہیں ہیں یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار۔ منشا یہ ہے کہ اگر وہ شرک و کفر سے باز آجائیں اور اسلام قبول کر کے نماز اور زکوٰۃ کی پابندی اختیار کریں یا بالفاظ دیگر اسلامی نظام زندگی میں داخل ہو جائیں تو پھر ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اب یہ لوگ حربی نہیں بلکہ اسلامی مملکت کے مسلمان شہری ہیں۔

اِسلام سے وفاداری کا پیمانہ

اس آیت میں جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اقاموا - اقیموا - اٰتوا - اور ان جمع کے صیغوں میں ضمیروں کا مرجع مشرکین ہیں۔ یہ دونوں باتیں بتا رہی ہیں کہ کسی غیر مسلم جماعت کے اسلام سے وفاداری کا پیمانہ یہ اور صرف یہ ہے کہ ان کی زندگی میں یہ دو محسوس اور موٹی چیزیں نماز اور زکوٰۃ موجود ہوں۔ ایک نہیں بلکہ دونوں ہوں۔ اگر ان میں سے ایک بھی ان کی زندگی میں نہ ہو تو ان کی اسلام سے وفاداری کا اعتبار نہ ہوگا۔ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فتنہ ارتداد میں اسی آیت سے استدلال کیا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن لوگوں نے فتنہ برپا کیا تھا۔ ان میں سے ایک جماعت کہتی تھی کہ ہم اسلام کے منکر نہیں ہیں نماز بھی پڑھنے کے لیے تیار ہیں مگر زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ صحابہ کرام کو بالعموم یہ پریشانی لاحق تھی کہ آخر ایسے لوگوں کے خلاف تلوار کیسے اٹھائی جا سکتی ہے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کا حوالہ دے کر فرمایا کہ ہمیں تو ان لوگوں کے چھوڑ دینے کا حکم صرف اس صورت میں دیا گیا تھا جبکہ یہ شرک سے توبہ کریں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں مگر جب یہ تین شرطوں میں سے ایک شرط اڑا رہے ہیں تو پھر ہم انہیں کیسے چھوڑیں۔

احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ امام بخاری و مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کرتا رہوں تا آنکہ لوگ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں جب وہ یہ کریں تو ان کے مال، جان

محفوظ ہوں گے مگر یہ کہ اسلام کا حق بھی ان کی جان ومال کو جا ہے۔ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

امام بخاری نے الجامع الصحیح میں اور ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے سنن میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے یہ ارشاد پیش کیا ہے۔

مجھے حکم ہے لوگوں سے جنگ کرنے کا یہاں تک وہ کہہ لیں لا الہ الا اللہ جب وہ یہ کہہ لیں اور ہماری نماز جیسی نماز پڑھ لیں اور ہمارے قبلہ کا استقبال کریں اور ہمارے ذبیحہ کی طرح ذبح کریں تو قانونی حق کے سوا ان کے خون اور ان کے اموال ہمارے لیے حرام ہیں۔ ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

ان سب ارشادات نبوت کا روئے سخن غیر مسلموں کی طرف ہے یعنی بتانا یہ چاہتے ہیں کہ ایک غیر مسلم جماعت اسلامی ملک کے مسلمان شہری کب بنتے ہیں جو آیت قرآنی میں بات کہی گئی وہی بات ان احادیث میں بتائی گئی ہے۔ اور مقصد کفر سے ہٹ کر اسلام کو اپنانے کا عنوان بتانا ہے۔ یہ عنوان شہری زندگی کے لیے ہے لیکن عین میدان جنگ میں اسلام کو قبول کرنے کا عنوان صرف شہادتین کا اعلان ہے۔ احوال کے تغیر سے اسلام کی پذیرائی کا عنوان بدل جاتا ہے۔ جنگ کی حالت کے تقاضے امن کے تقاضوں سے مختلف ہوتے ہیں پہلی حالت اضطرار کی ہے جبکہ دوسری حالت اختیار کی ہے۔ اسلام میں اضطرار و اختیار دونوں حالتیں الگ الگ ہیں۔ بہرحال اصلاً تو یہ غیر مسلم جماعتوں کے لیے ہیں اسی سے یہ بھی استنباط کیا گیا ہے کہ مسلمان جماعت اگر ان دو باتوں میں سے کسی ایک سے یعنی نماز سے یا زکوٰۃ سے ہٹ جائے تو اس کا حکم بھی حربیوں کا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے گویا مسلمان جماعت کی جانب سے نماز یا زکوٰۃ کا انکار کرنا اسلام میں ایک بہت بڑا باغیانہ جرم قابل دست اندازی فوج ہے۔

بہرحال اس آیت میں ان تین کاموں توبہ، نماز اور زکوٰۃ کو عرب کے غیر مسلموں پر دعوت پہنچنے کے بعد اسلامی شہریت کی شرط قرار دیا ہے یعنی ان کاموں کے کرنے سے مشرکین عرب اسلامی مملکت کے مسلمان شہری ہوں گے۔ وہ پُرامن زندگی بسر کر سکیں گے۔ مسلمانوں کے ساتھ حج کرنے کی ان کو اجازت ہوگی۔ مسجد حرام میں ان کے داخلہ پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔

حدیث ابن عمر اور حدیث انس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اہل اسلام اور دوسروں کے درمیان جو اعمال مابہ الامتیاز اور حد فاصل تھے وہ یہی اعمال تھے کیونکہ تصدیق اگرچہ اصل ایمان ہے جسے قرآن نے توبہ کہا ہے لیکن وہ ایک قلبی صفت ہے اور اقرار اگرچہ زبان سے متعلق ہے مگر وہ بھی وقتی چیز ہے دو دنوں میں کھلا ہوا امتیاز ان کے علیحدہ علیحدہ شعائر کے ذریعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ اسلامی شعائر میں نماز سب سے زیادہ امتیاز کی حامل ہے قبلہ کا معاملہ یہود و نصاریٰ کے نزدیک حقانیت مذہب کا معیار تھا۔ معاشرتی لحاظ سے جس معاملہ میں وہ اہل ایمان سے کھلا ہوا احتراز کرتے تھے وہ ذبیحہ کا مسئلہ تھا۔ لہٰذا اگر عبادت میں وہ اہل ایمان جیسی نماز پڑھ لیتے ہیں اور قبلہ کا اتباع کر لیتے ہیں

اور معاشرتی لحاظ سے اہل ایمان سے اتنا ملنے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ ان کا ذبیحہ کھا لیتے ہیں تو یہ اس بات کی مکمل شہادت ہوگی
کہ وہ دل سے ایمان قبول کر چکے ہیں۔ اس لیے ان کے ساتھ خدا اور رسول کا عہد ہونا چاہیے اب ان کے ساتھ کوئی بھی جنگ
درحقیقت خدا اور رسول کے ساتھ بدمعاملگی کے مترادف ہوگی۔ پھر قرآن کی آیت اور ارشاد نبوت کی رہنمائی یہ ہے کہ اگر ان کی
عملی زندگی پہلی زندگی سے بالکل علیحدہ ہو چکی ہے اور وہ اسلامی شعائر کو قائم کرنے لگے ہیں تو ان کے اسلام میں اب شبہ
کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ قرآن کی آیت اور حدیث کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ جو مدعی اسلام صرف یہ تین افعال ادا
کرے وہ پکا مسلمان ہی رہے گا خواہ وہ ہزار قسم کے افعال کفر کرتا رہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ان تین کاموں کی تخصیص کی وجہ
یہ بتائی ہے۔

صرف ان تین افعال کے ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اہل کتاب توحید کے اقرار کے ساتھ نمازیں بھی پڑھتے
ہیں استقبال قبلہ بھی کرتے ہیں۔ جانور ذبح کر کے بھی کھاتے ہیں مگر نہ ہماری طرح نماز پڑھتے ہیں۔ نہ ہمارے
قبلہ کی طرف منہ کرتے ہیں اور نہ ہمارا ذبیحہ کھاتے ہیں۔ اور کوئی ان میں غیر اللہ کے نام پر بھی ذبح کرتا ہے۔
نماز اور زکوٰۃ ایسے افعال ہیں کہ ان کی اطلاع بسہولت ہو سکتی ہے۔ برخلاف دین کے اور افعال کے
نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ ظاہری حالات کے موافق کیا جاتا ہے۔ جو شخص جس دین کے
شعاروں کو علی الاعلان ادا کرے گا۔ اس کے ساتھ اسی دین والوں کا معاملہ کیا جائے گا جب تک اس سے
اس کے خلاف محسوس نہ ہو۔[1]

ایک شبہ اور اس کا جواب

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ یہ تو جبر و اکراہ ہے۔ نہیں یہ جبر و اکراہ نہیں۔ اگر جبر و اکراہ ہوتا تو قرآن ان کو چار ماہ
کی مہلت نہ دیتا بات یہ نہیں ہے کہ اگر نماز نہ پڑھو گے تو قتل کیے جاؤ گے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اگر اسلامی مملکت میں
مسلمان شہری بن کر رہنا چاہتے ہو تو مسلمان ہونے کی شرط یہ ہے۔ یہ اکراہ نہیں ہے بلکہ مسلمان ہونے کی راہنمائی ہے
اگر وہ مسلمان ہونا نہیں چاہتے ہیں تو وہ بخوشی یہاں سے جا سکتے ہیں لیکن جزیرۃ العرب میں رہنے کی شرط اسلام ہے۔
نبوت کی پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں محض اسلام پر مجبور کرنے کے لیے آپ نے کسی پر چڑھائی کی ہو
اگر اسلام جبر و اکراہ اور زبردستی کے ذریعے تبدیل عقیدہ کو جائز قرار دیتا تو اسلام میں داخل ہونے والوں سے اتنا اغماض
کیوں کرتا کہ امام یہ تحقیق بھی نہ کرے کہ ان کا ایمان نمائشی تو نہیں ہے بلکہ حکم یہ ہوتا کہ جب تک ان کے اسلام کی طرف سے

[1] فتح الباری ص۱۰۱

کمل اطمینان نہ ہو جائے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے۔ صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے یہ ارشاد فرما کر یہ آیت تلاوت فرمائی فذکر انما انت مذکر لست علیھم بمصیطر آپ ان کو سمجھاتے جائیے کیونکہ آپ کا کام سمجھانا ہے آپ ان پر ڈکٹیٹر نہیں ہیں۔ غور فرمائیے اگر حدیث کے پہلے حصہ میں کافروں کی بابت میں جبر و اکراہ کا کوئی شائبہ بھی ہوتا تو پھر اس کے ساتھ اس آیت کو تلاوت کرنے کا کیا موقعہ تھا۔ یہ تو کھلا ہوا اختلاف ہے۔ معلوم ہوا کہ اسلام کو دلوں میں ڈال دینا رسول کا کام ہی نہیں ہے۔ یہ کام تو اللہ کا ہے۔ رسول کا کام صرف وعظ و تبلیغ کے ذریعے اسلام کی خوبیاں بیان کرنا ہے تلوار کے ذریعے سے کسی چیز کی خوبی نہ تو دلوں میں اتاری جا سکتی ہے اور نہ اس کا منصب نبوت سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ جبر و اکراہ کے ساتھ حدیث کے اس ٹکڑے کا کوئی مفہوم نہیں ہو سکتا۔ جبر کے ہوتے ہوئے آپ مصیطر نہ ہو سکتے ہیں لیکن مذکر نہیں ہو سکتے اس لیے یہ بدیہی بات ہے کہ یہاں قبول اسلام پر مجبور کرنے کے لیے جنگ نہیں بلکہ مشرکین نے جو جنگ اسلام کے خلاف قائم رکھی تھی اسے ختم کرنے کی یہ ایک قطعی شکل بیان کی گئی ہے۔ فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ اور شکل بھی ایسی جو ان کی مرضی پر موقوف ہے۔ جنگ انھوں نے شروع کی ہے اس لیے ختم بھی ان کو کرنی چاہیے۔

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ مذہب میں زبردستی نہیں اس کا اعلان سب سے پہلے قرآن نے کیا لا اکراہ فی الدین اور ظاہر ہے کہ جو دین اپنی اشاعت کے لیے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتائے ہوں جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کا ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو۔ ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا ہے۔ قرآن نے نہ صرف یہ کہ دین کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بھی بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں ہے۔ قرآن دین کی ابتداء ایمان سے کرتا ہے۔ ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بزور پیدا نہیں کر سکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی طرح دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔ بے شک اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لیے جنگ ہے اور آنحضرت نے بھی یہ لڑائی لڑی ہے اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لڑائی اس لیے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے۔ حالانکہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو اور نہ آنحضرت کی سیرت میں کوئی ایسا واقعہ ہے جس میں کسی کافر کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو بلکہ اگر ہے تو یہ ہے۔

میدانِ جنگ میں تبلیغ

(۵) اور اے پیغمبر اگر ان مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے امن کا خواہاں ہو تو اسے امان دے دیجئے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کے جائے امن پر پہنچا دیجئے یہ بات اس لیے ہے کہ یہ لوگ اسلام کا علم نہیں رکھتے ہیں۔ پہلے فرمایا تھا

کہ اگر اپنی کفریات سے توبہ کر کے اسلام میں داخل ہو جائیں تو مامون ہیں ممکن ہے کہ کسی شخص کو اصول اسلام سے آگاہی نہ ہو اور تحقیق ورفع شکوک کی غرض سے مسلمانوں کے پاس آنا چاہے اس کی نسبت فرمایا کہ اپنی حفاظت اور پناہ میں لے کر خدا کا کلام اور اسلام کے حقائق و دلائل سناؤ۔ اگر قبول نہ کرے تو اسے قتل نہ کرو بلکہ اس کے مامن میں پہنچا دو۔ جہاں پہنچ کر وہ مطمئن ہو جائے اس کے بعد وہ سب کافروں کے برابر ہے۔ یہ امن دینے کا حکم اس لیے ہے کہ اسلامی اصول وحقائق سے ان لوگوں کو آگاہی نہیں ہے لہٰذا ان کے سامنے خوب حق واضح کر دینا چاہیے۔ اگر اس کے بعد بھی عناد برتتے تو قد تبین الرشد من الغی کے بعد دین میں کوئی اکراہ نہیں ہے[1]۔ یہ نہیں فرمایا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اس کو پناہ نہ دو بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے اور اس کو کلام الٰہی سنایا جائے تاکہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقعہ ملے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس طرح مسلمان ہو گا۔ اس کے تبدیلِ مذہب کا محرک تلوار نہ ہو گی بلکہ اس کا محرک صرف پیغامِ حق ہو گا۔ سوچنے کی بات ہے کہ جنگ کی سخت سے سخت حالت میں اصل مقصد یعنی ارشاد و موعظت کا دروازہ کس طرح کھلا رکھا ہے اور کس طرح دین و اعتقاد کے معاملہ کو جبر و اکراہ کے شبہ سے بھی بالاتر رکھا گیا اس آیت میں فرمایا کہ ان مشرکین میں سے کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے جس میں قرآن سننے اور حقیقت حال معلوم کرنے کی خلش پیدا ہو اگر کوئی ایسا آدمی آ جائے تو عین لڑائی کی حالت میں بھی اسے بخوشی پناہ دو جب تک رہنا چاہے رہے قرآن سنے اور جب جانا چاہے تو اسے اس کے ٹھکانے پر بحفاظت پہنچا دیا جائے تاکہ امن کی جگہ پہنچ کر آزادی و اختیار کے ساتھ غور و فکر کرے اور جو راہ چاہے اختیار کرے[2]۔

یہ بات کہیں لکھی ہوئی تو نہیں دیکھی لیکن میرا اپنا گمان یہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے بارے میں جو قانون بتایا ہے اسی آیت سے آپ کا استنباط ہے۔ یعنی یہ کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی کی نوبت آ جائے تو میدانِ جنگ میں پہنچ کر بھی دعوت و تبلیغ کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں اول یہ کہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاؤ اور لڑائی چھوڑ کر ہمارے بھائی ہو جاؤ۔ اگر ایسا کرو تو تم ہی اقتدار اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے اور اگر یہ منظور نہ ہو تو ہمارا سیاسی نظام قبول کر لو۔ اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہو گی۔ اگر وہ ان دو باتوں میں سے کوئی قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے کئی منظر ہیں کہ کسی دشمن قوم نے اسلام یا صرف اسلامی نظام کو قبول کر لیا ہے اور خون ریزی رک گئی ہے اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گیا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو روانہ کرتے تو فوجی قافلہ کو یہ ہدایت فرماتے:۔
جب تمہارا مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابلہ ہو تو اس کو تین باتوں میں سے ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت

[1] افادات شیخ الاسلام
[2] ترجمان القرآن

دو۔ وہ مان لے اس کو قبول کرلے اس پر حملہ کرنے سے رک جا۔ اس کو اسلام کی دعوت دے اگر وہ قبول کرے تو اس سے رک جا۔ اس کے بعد اس سے خواہش کر کر وہ مسلمانوں کے ملک میں آجائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے اور اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی ہوگی۔ قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا لیکن غنیمت اور فیئی میں اس کا حصہ نہ ہوگا جب تک وہ جہاد میں شرکت کرے اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو پھر تو اس کو اسلامی نظام قبول کرنے کی دعوت دے اگر وہ اس نظام میں رہ کر جزیہ دینا قبول کرے تو اس سے بھی رک جا اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے [1]

یہ وہ اصولِ جنگ ہے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی کو مجبور کر کے بزورِ شمشیر مسلمان بنا لینا۔ صحابہ کرام کے زمانے میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدانِ جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی بلکہ دعوت و تبلیغ کرتے رہے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں۔ اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں۔ اور اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو لیکن محکوم رہو گے [2]

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں کھلی ہیں اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ اگر میدانِ جنگ میں مشرکوں میں سے کوئی آپ سے پناہ مانگے تو آپ اس کو پناہ دیدیجئے یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے۔ پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دیجئے کیونکہ ان کو علم نہیں ہے یہ نہیں کہا گیا کہ اگر وہ پناہ ملے اور کلام الٰہی سننے کے بعد مسلمان نہ ہو تو اس کو اس کے مامن میں پہنچانے کی جگہ قتل کر دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو الٹ کر بیان کیا جاتا ہے۔

الغرض فاقتلوا المشرکین کے ذریعے جس دار و گیر کا سنگین حکم ہوا تھا اس میں بھی اتمامِ حجت کے لیے یہ رعایت دی گئی ہے۔ فرمایا کہ اس دار و گیر، پکڑ دھکڑ کے دوران اگر کوئی شخص امان چاہے تو اسے امان دے دو اور اس کو اسلام کی دعوت اور اس کا مقصد اچھی طرح سمجھا دو اور سمجھانے کے بعد اسے امن کی جگہ پہنچا دو تاکہ وہ ٹھنڈے دل سے اپنے معاملہ پر غور کر کے فیصلہ کر سکے کہ وہ اسلام قبول کرتا ہے یا تلوار یہ امان بخشی صرف اتمامِ حجت کے نقطۂ نظر سے ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے ذالک بانھم قوم لا یعلمون یہ اس رعایت کی وجہ بتائی ہے کہ چونکہ یہ لوگ اُمّی ہیں دین و شریعت سے بے خبر اور نبوت و رسالت سے ناآشنا۔ اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے بعد بھی کوئی کمی رہ گئی ہو اس لیے اگر کوئی شخص طالب ہدایت ہو تو اس کو رعایت دی جائے۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد
[2] جامع ترمذی

شارحین قرآن نے اس آیت قرآنی سے کچھ علمی مسائل بھی نکالے ہیں آیئے آپ بھی ان سے استفادہ کریں۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں۔

منشا یہ ہے کہ جو شخص دار حرب سے دار اسلام میں سفارت تجارت صلح کی نمائندگی یا جزیہ کی ادائیگی یا کسی اور وجہ سے آئے اور اسلامی حکومت سے امان کا طالب ہو تو اسے امان دینی چاہیے۔ جب تک وہ دارالاسلام میں رہے اور جب تک وہ واپس نہ جائے اس کی حفاظت کی ذمہ دار اسلامی حکومت ہے لیکن علماء کی رائے ہے کہ ایک سال سے زیادہ اسے قیام کی اجازت نہ دی جائے [1]

اور ابوبکر الجصاص اس آیت پر لکھتے ہیں۔

اس آیت قرآنی کا مسلمانوں سے یہ مطالبہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم حربی ہم سے توحید و رسالت کے بارے میں دلائل کے ذریعے اسلام آشنائی کا خواہاں ہو تو اس کے اس مطالبہ کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ اور اس درخواست کے بعد میدان جنگ میں حربی ہونے کے باوجود اس کا قتل کرنا جائز نہیں ہے ———— اور یہ بھی اسی آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ جو شخص بھی اسلام کے بارے میں کچھ معلومات کا خواہاں ہو تو یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کی تشنگی کے لیے علمی سیرابی کا سامان فراہم کریں۔ ابلغہ مامنہ کا اسلامی حکومت سے یہ مطالبہ ہے کہ ایسے پناہ گیر حربی کی حفاظت کرے اور لوگوں سے اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دے۔ اس آیت میں یہ بھی رہنمائی ہے کہ مسلمان حکومت اپنے غیر مسلم شہریوں کی جان و مال اور آبرو کی محافظ ہے اور یہ بھی یہ آیت بتا رہی ہے کہ دار الحرب کے باشندوں کو اسلامی حکومت دار الاسلام میں قیام کی بقدر ضرورت اجازت دے سکتی ہے [2]

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب یہاں بڑی مفید بات لکھ گئے۔

جو شخص اسلام کی تحقیق اور معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس آئے تو ہم پر واجب ہے کہ اس کو اجازت دیں اور اس کی حفاظت کریں اس کو کسی قسم کی تکلیف یا نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ اس وقت ہے جبکہ اس کے آنے کا مقصد اللہ کا کلام سننا اور اسلام کی تحقیق کرنا ہو اور اگر کوئی دوسری غرض تجارت وغیرہ ہو تو وہ مسلمان حکمران کے مصالح اور حکمران کے صوابدید پر موقوف ہے [3]

ابوبکر العربی نے احکام القرآن میں بھی علامہ قرطبی کی ہمنوائی کی ہے وہ فرماتے ہیں:

قرآن کی آیت صرف اس شخص کے متعلق ہے جو قرآن سننا اور اسلام آشنا ہونا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ

---

[1] ابن کثیر		[2] احکام القرآن		[3] معارف القرآن

کسی دوسرے مقصد کی خاطر حربی کو دارالاسلام میں قیام کی اجازت تو اس کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی مصالح اور منافع سے ہے۔

یہاں یہ سوال بھی کچھ شارحین اٹھا گئے کہ حربی کو قیام کی دارالاسلام میں اجازت صرف اسلامی سرکار ہی دینے کی مجاز ہے یا کسی درجہ میں مسلمان عوام کو بھی یہ حق حاصل ہے۔ اس کے چہرے سے بھی ابوبکر العربی نے نقاب اٹھائی ہے وہ احکام القرآن میں رقم طراز ہیں۔

سربراہ مملکت کی اجازت میں تو دو رائیں نہیں ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کی رائے عامہ کا تعلق ہے ان میں داخل سب ہیں آزاد، غلام، مرد، عورت، بچے۔ آزاد کے لیے اس حق کو امام مالک، امام شافعی امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے مانا ہے لیکن غلام کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا جواب ہاں میں ہے امام مالک اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ نے اس موضوع پر یہ ضابطہ بتایا ہے کہ جس کا مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں وہ کسی کو امان دینے کا مجاز نہیں ہے خواہ وہ غلام ہو یا عورت اور یا پھر بچہ[1]

آیت سے ایک انوکھا استدلال

حیرت ہے کہ امام رازی نے اس آیت سے ایمان مقلد کے معتبر نہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔ فرماتے ہیں،

یہ آیت بتلاتی ہے کہ دین میں تقلید کافی نہیں ہے بلکہ نظر و استدلال ضروری ہے۔ کیونکہ اگر تقلید کافی ہوتی تو اس کافر کو مہلت ملنے کا سوال نہ ہوتا بلکہ اس سے کہا جاتا کہ ایمان لاؤ یا پھر قتل ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جب یہ بات اس سے نہیں کہی گئی تو پتہ چل گیا کہ دین میں تقلید کافی نہیں ہے بلکہ دلیل و حجت کی نپی تلی ترازو ہونی چاہیے[2]

امام رازی کے منہ سے نکلی ہوئی اس بات کو پہلے السید رشید رضا نے بغیر کسی تنقید کے المنار میں نقل کیا۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی بات کو ان شاندار لفظوں میں پیش کیا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دین کے بارے میں تقلید کافی نہیں فہم و اذعان ضروری ہے ورنہ قرآن کا سنانا اور پھر غور و فکر کی مہلت دینا ضروری نہ ہوتا۔ یاد رہے کہ قرآن جس طرح اس معاملہ میں جبر کی پرچھائی دیکھنا نہیں چاہتا اسی طرح تقلیدی اعتقاد کا بھی روادار نہیں[3]

[1] احکام القرآن　[2] تفسیر کبیر　[3] ترجمان القرآن

علامہ مصطفیٰ المراغی نے بھی امام رازی ہی سے متاثر ہوکر یہ بات تفسیر مراغی میں لکھی ہے لیکن علامہ شوکانی اور مشہور عالم نواب صدیق حسن خاں نے اپنی تفسیر فتح القدیر اور فتح البیان میں عدم تقلید کے بہت بڑے زعیم ہونے کے باوجود اس آیت کی تشریح میں اس بات کا صراحۃ تو بڑی بات ہے اشارۃ بھی ذکر نہیں کیا۔ لیکن جن بزرگوں نے اس آیت سے یہ بات معلوم کی ہے ہم ان سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ تقلید سے آپ کی مراد کیا ہے۔ فروعات اور اعمال فرعیہ میں تقلید جیسا کہ مسلمانوں کی رائے عامہ ائمہ اجتہاد کی کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا آیت قرآنی میں اشارۃً بھی ذکر نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں اہل ایمان کے بارے میں نہیں بلکہ مشرکین کے بارے میں ہے وان احد من المشرکین۔ اگر یہ نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر کیا آپ لوگوں کے مجلہ دماغ میں یہ بات آگئی ہے کہ ایمان مقلد قرآن کے نزدیک معتبر نہیں بلکہ وہ ایمان معتبر ہے جو نظر و فکر، غور و تدبر اور اذعان و بصیرت کی قوت سے پیدا کیا جائے اگر یہی مراد ہے تو اس کو پوری امت میں سے معتزلہ اور متکلمین کے ایک فرقے کے سوا کسی کی حمایت حاصل نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ ایمان مقلد معتبر نہیں ہے اس پر دلائل کی روشنی میں ہی توحید و رسالت کو حاصل کرنا واجب ہے۔ ان کے خیال میں ایمان ایسی تصدیق کا نام ہے جو تشکیک مشکک سے بھی زائل نہ ہو سکے۔ یقیناً ایسی تصدیق دلائل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ علامہ تاج الدین السبکی نے تقلیدی ایمان کی چند صورتیں لکھی ہیں۔

۱۔ یہ کہ اسلام کی حقانیت ہی پر پورا یقین نہ ہو اور قلب میں شک و تردد ہو۔

۲۔ یہ کہ اسلام کی حقانیت کا اذعان اگرچہ حاصل ہو۔ مگر نجات ابدی کے لیے تمام ادیان یکساں نظر آئیں۔

۳۔ یہ کہ اسلام کی حقانیت پر کوئی شک و تردد باقی نہ ہو۔ نجات ابدی صرف دین اسلام میں منحصر سمجھے۔

پہلی دو صورتیں یقیناً معتبر نہیں اور تیسری سورت یقیناً معتبر ہے خواہ دماغ میں دلیل کا تصور بھی نہ ہو۔

اس حقیقت کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں کفار کے جو جم غفیر میدان جنگ میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے ان سب کا اسلام معتبر مانا گیا ہے اور کسی ایک واقعہ میں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان نو مسلموں کو اسلام کے فرائض و واجبات کی طرح نظر و استدلال سیکھنے کی بھی دعوت دی گئی ہو۔ ابتداء ہی جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام قبول کیا ان میں اسلام نظر و استدلال کے زور سے نہیں آیا بلکہ ان کے قلوب کی اثر پذیری کی وجہ سے آیا۔ چنانچہ ابتدائے بعثت میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ فکر و نظر اور استدلال سے مالا مال نہ تھے بلکہ وہ ہی تھے جو نیک طبع اور ایماندار راستی پسند اور حق جو تھے۔ اور جو نبوت کے اوصاف و خصائص سے واقف تھے۔ گذشتہ انسانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ واقف تھے۔

علامہ آلوسی اکابر محققین سے نقل کرتے ہیں کہ ایمان دراصل اس بدیہی تصدیق کا نام ہے جو اہل ایمان کے دلوں میں اس طرح سما جاتی ہے کہ اگر وہ خود بھی اسے نکالنے کی کوشش کریں تو نکال نہ سکیں۔ تاریخ میں ایسے لوگوں کی مثالیں کم نہیں جو دلائل پر غور و فکر کے بغیر اسلام لے آئے اس کے برعکس ایسی مثالیں بہت ہیں جن کے سامنے حقانیت اسلام کے دلائل روز روشن کی طرح

عیاں تھے مگر اس کے باوجود وہ اس سعادتِ عظمیٰ سے محروم رہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ ایمان و یقین کا حاصل ہونا صرف دلائل کی پرورش ہی پر موقوف نہیں بلکہ دلائل کی روشنی میں حاصل شدہ ایمان یکسر ناقابلِ وثوق اور اذعان سے تہی دامن ہوتا ہے اس میں یہ احتمال ہر وقت رہتا ہے کہ اگر دلائل دوسری جانب واضح ہو جائیں تو ایمان بھی رخصت ہو جاتا ہے۔ شیخ اکبر فتوحات مکیہ میں امام غزالی کی کتاب فیصل التفرقہ سے نقل کرتے ہیں کہ متکلمین کی اس جماعت کا غلو اور حق سے انحراف بھی کس درجہ تعجب خیز ہے کہ عوام کا ایمان صرف اس لیے معتبر نہیں کہ ان کو حقانیت اسلام کا یقین متکلمین کے اختراعی دلائل کی راہ سے حاصل نہیں ہوا یہ لوگ ان متواتر واقعات سے بھی باخبر نہیں ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کے عہد مسعود اور صحابہ کے مبارک دور میں بہت سے جاہل بت پرستوں کا ایمان معتبر مان لیا گیا تھا حالانکہ نہ خود ان کو دلائل کا پتہ تھا اور نہ کسی نے بعد میں انہیں دلائل کی تعلیم دی ہے۔

واقعہ یہ اور صرف یہ ہے کہ ایمان ایک نور ہے جو اللہ سبحانہ خاص اپنے فضل و رحمت سے بندہ کے دل میں ڈال دیتے ہیں اس کا ظاہری سبب کبھی تو کوئی باطنی تحریک ہوتی ہے اور کبھی کسی دیندار کی زیارت۔ روایات سے ثابت ہے کہ بعض منکرین آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے روئے انور پر نگاہ پڑتے ہی بے ساختہ بول اٹھے کہ یہ کاذب کا چہرہ نہیں ہے۔ اس قسم کے ایک واقعہ نہیں بے شمار واقعات ہیں۔ ان میں ایک شخص بھی بعد میں فکر و نظر اور استدلال کے ذریعے اذعان پیدا کرنے کی محنت میں مشغول نہیں ہوا بلکہ وہی نور ایمانی کا ایک ذرہ جو پہلی نظر میں حاصل ہوا تھا تلاوت قرآن کے ذریعے بڑھتا گیا اور پھیلتا گیا۔

تاریخ اور واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل بے غبار ہے کہ عین میدانِ جنگ میں یا بزم میں لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے تھے ان کو فرائض و واجبات کی ضرور تلقین ہوتی لیکن یہ کہیں بھی ذکر نہیں کہ ان کو توحید و رسالت کے دلائل کی تعلیم ہوتی۔ یہ تو درست ہے کہ کلامی دلائل بھی ایمان کا سبب ہو سکتے ہیں لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ ایمان صرف دلائل کے پستانوں پر ہی موقوف ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایمان جو دلائل کی طاقت سے وجود میں آتا ہے وہ ضعیف ترین ایمان ہوتا ہے۔ راسخ اور قوی ایمان وہ ہے جو اخبار متواترہ کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے یا ایسے قرائن سے میسر ہوتا ہے جن کو اگر زبان بیان کرنا چاہے تو ادا بھی نہ کر سکے۔ یہی وہ ایمان ہے جو شک و تردد سے بالا ہوتا ہے۔ کیونکہ شک و تردد کا مقام دلائل ہوتے ہیں جہاں دلائل نہیں وہاں شک و تردد بھی نہیں ہے۔

امام رازی علم کلام کے شہسوار ہیں ان کی خواہش ہے کہ دنیا بھی ان کی طرح کلامی اسلحہ خانہ کے ہتھیاروں کے ذریعے قرآن کا مطالعہ کرے۔

اس حد تک تو ہم بھی امام رازی کے ہمنوا ہیں کہ علم کلام کو ایمان کے لیے ایک دفاعی سرمایہ کی حیثیت میں اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ امام الحرمین ابو محمد جوینی نصیحۃ المسلمین میں یہ بات بڑی ہی پتے کی تحریر فرما گئے۔

قرآن کے دلائل غذا کے درجے میں ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کلامی موشگافیاں دوا کی حیثیت میں

ہیں کچھ کے لیے سود مند ہیں مگر بہتوں کو اس کے استعمال سے نقصان ہو رہا ہے۔ قرآنی تصریحات پانی کی طرح ہیں دودھ پیتا بچہ بھی پی سکتا ہے لیکن کلامی کچن کے روغنی کھانے صرف طاقتور ہی کھا سکتے ہیں اور وہ بھی زیادہ کھانے سے گاہ گاہ بیمار ہو جاتے ہیں۔

امام غزالی نے المنقذ من الضلال میں اقرار کیا ہے کہ،

علم کلام سے مقصود صرف ایمان کی حفاظت و نگرانی ہے۔

خیر ادریس پر تو حیرت نہیں لیکن تعجب ہے کہ مولانا آزاد نے اس آیت سے یہ بات کیسے سمجھ لی۔ یہ بات کہ ایمان تقلید معتبر نہیں ہو اہل حدیث اور محدثین کے یہاں معتبر نہیں۔ نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا
الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ
فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷ كَيْفَ وَاِنْ
يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ
بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان مشرکین کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو۔[۶] ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے پاس عہد و پیمان کیا تو جب تک وہ تمہارے عہد پر قائم رہیں تم بھی ان کے عہد پر قائم رہو۔ اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے ان کو جو متقی ہیں۔[۷] ان مشرکین کا عہد کیونکر عہد ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ آج پھر غلبہ پا جائیں تو نہ تو تمہارے لیے قرابت کا پاس کریں نہ کسی عہد و پیمان کا وہ اپنی باتوں سے تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے دلوں کا فیصلہ اس کے خلاف ہے اور ان کی اکثریت بدکرداروں پر مشتمل ہے۔[۸]

مَعانی مُفردات

فما استقاموا۔ ماضی کا جمع مذکر غائب ہے استقامت سے۔ استقامت کے معنے سیدھا رہنے یا سیدھا چلنے کے ہیں۔ اسی ے سیدھا کرنے کے معنے میں تقویم سے مادہ قوم ہے جس کے معنے کھڑے ہونے کے ہیں تقوم تقویم سے اور اقامہ اور استقامہ ات بنتے ہیں۔

ان یظہروا۔ یظہر سے مضارع معلوم کا جمع مذکر غائب ہے۔ جب اس کے ساتھ علی آئے تو اس کے معنے غلبہ اور برتری کے

آتے ہیں اسی سے اظہار ہے جس کے معنے برتر کرنے اور غالب کرنے کے ہیں۔ لایرقبوا جمع مذکر غائب مضارع مادہ رقب ہے۔ اس کے معنے نگرانی کرنا۔ انتظار کرنا اور اندیشہ کرنا ہیں۔ زمخشری نے اساس میں اس کے معنے چوکنا رہنے کے بتائے ہیں اِلًّا جاتا ہے لایراقب اللہ فی امورہ الّ ہمزہ کے زیر کے ساتھ قرابت کے معنے میں آتا ہے۔ حسان بن ثابت کا شعر ہے۔

کال السقب من وال النعام

لعمرك ان الك من قریش

پھر اس کے معنے حلف اور عہد کے بتائے ہیں۔ ان معنے کی رعایت سے یہ لفظ ال بمعنے جوار سے مشتق ہے اہل عرب جب باہم سازگاری کا معاہدہ کرتے تو ان کی آوازیں بلند ہو جاتی تھیں۔ پھر یہ لفظ بطور استعارہ قرابت کے لیے بولنے لگے اور رشتہ داروں کے درمیان قرابت کا معاملہ دو حلیفوں سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔

ذمہ۔ اور ذمام وہ عہد جس کی پاسداری نہ کرنا قابل مذمت ہو۔ یہ حق بھی ہوتا ہے۔ اور عہد بھی۔ اور فقہ کی زبان میں وہ حالت جس کی وجہ سے آدمی میں وجوب حق کی اہلیت ہو جائے۔ اہل عرب میں عہد شکنی کو عار سمجھتے تھے۔

پابندی عہد اور اسلام

سچ یہ ہے کہ اخلاقی احکام کا تعلق جہاں تک تعلیم محض سے ہے وہ کوئی ایسی متاع عزیز نہیں جس کے پیش کرنے پر اسلام فخر کرے۔ اخلاقی احکام ہمیں ہر جگہ مل سکتے ہیں اور قریباً ہر مذہب نے اپنا مقصد یہی بتلایا ہے کہ انسان کو اخلاق کا درس سنائے۔ اگر قرآن تعلیم دیتا ہے کہ عہد و مواثیق کی پابندی کرو تو قوانین موسوی اور ضابطہ ناصری بھی یہ نہیں کہتا کہ عہد باندھ کر توڑ ڈالو حتی کہ آریائی نسل کی وہ فلسفیانہ روحانیت بھی جس نے ہندوستان و ایران میں ظہور کیا۔ اپنی ہر ادنی سے ادنی شاخ کے اندر تعلیمات و احکام سے لبریز ہے۔

پس اصل چیز تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے نتائج اور اس کا عمل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن حکیم نے جو کچھ کیا اس نے عملی شکل میں کیسی صورت اختیار کی۔ انسان کی روح اس لیے بیمار نہیں کہ زبانوں نے تعلیم کم کر دی اور کاغذوں پر زیادہ نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا اصلی دکھ زندگی کی عملی مشکلات میں ہے اور صرف وہی تعلیم فتح مند ہو سکتی ہے جو ایک مستحکم عملی نمونہ اپنے ساتھ رکھتی ہو۔

عمل حقیقت کے لحاظ سے اولین نمونہ حضور اقدس ﷺ ہیں ان آیات میں اسی کی وضاحت کی گئی ہے کہ دشمنوں کی پے در پے عہد شکنیوں اور ظلم و عداوت کی انتہا نے کس طرح نبوت اور صحابہ کرام کو جنگ پر مجبور کیا۔

(۶) یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان مشرکین کا عہد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک عہد ہو۔ گذشتہ آیات میں جو برات کا اعلان کیا گیا تھا یہاں اس کی حکمت بیان کرتے ہیں یعنی ان مشرکین عرب سے کیا عہد قائم رہ سکتا ہے اور آئندہ کیا صلح ہو سکتی

لیے خطاب عام ہے اور کہا جا رہا ہے کہ بھلا ان مشرکین کے کسی عہد و پیمان کی کوئی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول پر کیسے ہو سکتی ہے جنھوں نے بار بار عہد کیئے اور بار بار خلاف ورزی کی اور پھر صلح حدیبیہ کا آخری عہد بھی اس ظالمانہ طریق پر پامال کیا اب ان کا عہد کیوں کر عہد سمجھا جا سکتا ہے علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ پوری بات اس طرح ہے کہ مشرکین کے لیے غدر و بد عہدی کو اندر چھپاتے ہوئے عہد کیسے ہو سکتا ہے اور کچھ کے خیال میں پوری بات اس طرح ہے۔ کہ مشرکین کا اللہ سے ایسا عہد کیسے ہو سکتا ہے کہ کل کو اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو جائیں اور اللہ کے رسول سے کب ایسا عہد ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا میں عذاب سے اطمینان کا سانس لے سکیں۔ اور حافظ ابن جریر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اے مسلمانو! مشرکین کے لیے ایسا عہد اور ایسی ذمہ داری اللہ اور اس کا رسول کب لے سکتا ہے جسے پورا کیا جائے اور اس کی وجہ سے ان مشرکین کو ملک میں گھومنے اور پھرنے کی آزادی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کا کوئی عہد نہیں ہے۔

معاھدوں کا احترام

(۷) ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے پاس عہد و پیمان کیا تھا۔ تو جب تک وہ تمہارے عہد پر قائم رہیں تم بھی ان کے عہد پر قائم رہو۔ اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے ان کو جو متقی ہیں۔ صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا۔ اس کے بعد اللہ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریق مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی۔ اس حالت میں اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جا سکتی تھی کہ اپنی قوت اور دشمنوں کی کمزوری کے باوجود وہ کہاں تک اپنے معاہدے پر قائم رہتے ہیں چنانچہ اللہ سبحانہ نے بار بار اس معاہدے کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی اور فرمایا تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو۔ جن مشرکوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا ان سے لڑنے کی اگرچہ اجازت دے دی گئی تھی اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا۔ پھر یہ حکم ہوا کہ ان کو چار مہینوں کی اور مہلت دو۔ آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہیں رہی۔ تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایفائے عہد کی تاکید کی گئی جنھوں نے حدیبیہ کے معاہدے کی حرمت کو قائم رکھا۔ اور ان مشرکوں کے ساتھ اس ایفائے عہد کو اللہ سبحانہ نے تقویٰ بتایا اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی فرمایا۔ اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ آگے بڑھ کر ان مشرکوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنھوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا۔ اللہ سبحانہ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کے ساتھ ان

لے افادات شیخ الاسلام

کو قائم رکھا ہے۔
مشرکوں کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنھوں نے اس معاہدے
آیت میں سیدھے رہنے کا مطلب ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو۔ اور ہر اگر
اپنے اس عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں ان کا شمار اہل تقویٰ میں ہوگا۔ یہ قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ
ہے۔ اور اہل تقویٰ اللہ کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفا اللہ سبحانہٗ کی خوشی
اور پیار کا موجب ہے اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔
عند المسجد الحرام لا کر صلح حدیبیہ کی طرف نہایت خوبصورت اشارا کیا ہے۔ حضور اقدس ﷺ
نے جتنے معاہدے کیے ہیں ان میں اگر کوئی معاہدہ مسجد حرام کی نسبت سے اپنے آپ کو متعارف کرا سکتا ہے تو وہ صرف حدیبیہ
کا معاہدہ ہے کیونکہ یہی معاہدہ مسجد حرام کے قرب جوار میں طے پایا تھا۔ مسجد حرام کا لفظ لا کر ایک طرف تو معاہدہ کا تعارف ہو
گیا دوسری طرف اس سے اس کی غیر معمولی حرمت بھی واضح ہوئی کہ یہ کوئی معمولی معاہدہ نہیں ہے بلکہ اسے تکمیل کا سہرا جوار
حرم میں حاصل ہوا ہے۔
آخر میں فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم کا بلیغ جملہ لا کر احوال و ظروف کے ناپیدا کنار سمندر کو کوزہ
میں بند کر دیا یعنی تیرتش جب تک اس معاہدے پر قائم رہیں تم بھی اس پر قائم رہو۔ اگر وہ اس کو توڑ دیں تو تم بھی اسے توڑ دو۔
کوئی معاہدہ یک طرفہ قائم نہیں رہتا ہے دونوں پارٹیاں مل کر اس کو قائم رکھتی ہیں۔ یہی تقاضائے عدل ہے اور اسلام اس
کا تمہیں حکم دیتا ہے۔ فقرہ کی بلاغت کا تقاضا ہے کہ اس کی جامعیت کو کھول کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا۔

دغابازوں اور بدعہدوں کا عہد

(۸) ان مشرکین کا عہد کیوں کر عہد ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ آج تم پر غلبہ پا جائیں تو نہ تو تمہارے لیے قرابت
کا پاس کریں اور نہ کسی عہد و پیمان کا۔ وہ اپنی باتوں سے تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے دلوں کا فیصلہ اس کے
خلاف ہے اور ان کی اکثریت بدکاروں پر مشتمل ہے۔ یعنی ان مشرکین عرب سے کیا عہد قائم رہ سکتا ہے اور آئندہ کیا صلح ہو سکتی
ہے جن کا حال تم مسلمانوں کے ساتھ یہ ہے کہ کسی وقت ذرا قابو تم پر حاصل کر لیں تو ستانے اور نقصان پہنچانے میں قرابت
کا مطلق لحاظ کریں اور نہ قول و قرار کا۔ چونکہ اتفاق سے تم پر غلبہ اور قابو حاصل نہیں ہے اس لیے محض زبانی عہد و پیمان کر
کے تم کو خوش رکھنا چاہتے ہیں ورنہ ان کے دل ایک منٹ کے لیے بھی اس عہد پر راضی نہیں۔ ہر وقت عہد شکنی کا موقع
تلاش کرتے رہتے ہیں چونکہ ان میں اکثریت غداروں کی ہے۔ اگر کوئی اکا دکا وفائے عہد کا خیال بھی کرتا ہے تو کثرت کے
مقابلہ میں اس کی کوئی پیش نہیں جاتی۔ بہرحال ایسی دغاباز بدعہد قوم سے خدا اور رسول کا کیا عہد ہو سکتا ہے۔ البتہ جن قبائل

تم بالخصوص مسجد حرام کے پاس معاہدہ کر چکے ہو سو تم ابتداء کر کے نہ توڑو جب تک وہ وفاداری کے سیدھے راستہ پر چلتے رہیں تم بھی ان سے سیدھے راہ رہو اور بڑی احتیاط رکھو کہ کوئی حقیر سے حقیر بات بھی ایسی ہونے پائے جس سے تم عہد شکنی کی گندگی سے داغدار ہو۔ خدا کو وہی لوگ محبوب ہیں جو پوری احتیاط کرتے ہیں چنانچہ بنو کنانہ وغیرہ نے مسلمانوں سے بدعہدی نہ کی تھی مسلمانوں نے نہایت دیانتداری اور احتیاط کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا اعلان براءۃ کے وقت ان کے معاہدہ کی میعاد منقضی ہونے میں نو ماہ باقی تھے۔ ان میں معاہدہ کی پوری پابندی کی گئی [1]

ان آیات میں یہ بات بہت زیادہ فکر و غور کی محتاج ہے کہ بات کا آغاز تو کیف یکون للمشرکین عھد عند اللہ وعند رسولہ سے کیا ہے لیکن ابھی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ جملہ معترضہ لا کر مسجد حرام کے جوار میں معاہدہ کرنے والوں کو ان سے مستثنیٰ کر دیا۔ جملہ معترضہ کے بعد پہلی بات کو از سر نو بیان کرنا شروع کیا اور ابتدائی تمہید سے شروع کر کے بات کو پورا کیا۔ فرمایا کیف وان یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم الا ولا ذمۃ۔ یہ بات علامہ آلوسی نے روح المعانی میں کھولی ہے کہ کیف کو مکرر لے کر آئے صرف یہ بتانے کے لیے کہ مشرکین کا عہد میں کردار کسی بھی رعایت کا مستحق نہیں۔ یا مقصد یہ ہے کہ ان سے وفائے عہد ان حالات میں ناممکن ہے۔ اور پھر کیف کے بعد یہاں فعل کا کوئی ذکر نہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر جملہ حالیہ وان یظھروا لے آئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں سے اللہ و رسول کا کوئی عہد کیوں کر ہو سکتا ہے جب کہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر ان کو کہیں تم پر دسترس یا غلبہ مل جائے تو ان کو تمہاری قرابت کی پروا نہ ہو گی۔ اور نہ کبھی تم سے کیے گئے عہد کی پاسداری کا لحاظ ہو گا۔

زندگی میں تعلقات کی بنیادیں دو ہی چیزیں فراہم کرتی ہیں معاشرتی تعلقات کی بنیاد رشتہ رحم و قرابت پر قائم ہوتی ہے جبکہ سیاسی روابط کی بنیاد باہمی معاہدات کی عائد کردہ ذمہ داریوں کے احترام پر ہوتی ہے۔ قرابت اور رشتہ داروں کے لیے قرآن میں ال آیا ہے۔ اس سے ان حقوق کی طرف اشارا ہے جو ایک اصل و نسل ایک جوہر و معدن سے ہونے یا قرابت اور جوار کی بنا پر ایک دوسرے پر آپ سے آپ قائم ہو جاتے ہیں۔

سیاسی تعلقات کو آیت میں ذمہ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ ذمہ داریاں جو کسی معاہدے میں شریک ہونے والی جماعتوں پر از روئے معاہدہ عائد ہوتی ہیں۔ فرمایا کہ اس اعلان براءت سے تم اس پریشانی میں نہ پڑ جانا کہ اب ان لوگوں سے تمام معاشرتی اور اجتماعی تعلقات ختم ہو رہے ہیں تعلقات کبھی یکطرفہ قائم نہیں رہتے۔ تم میں سے جو لوگ ان کے تعلقات کو عزیز رکھتے ہیں۔ انہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ وہ اگر تم پر کبھی قابو پا جائیں گے تو نہ تو قرابت کا خیال کریں گے اور نہ کسی اجتماعی معاہدے کی پاسداری کریں گے۔ ملاقاتوں میں جو یہ لوگ باتونی ہو کر باتیں بناتے ہیں۔ وہ محض زبانی ہمدردی کی نمائش اور

[1] افادات شیخ الاسلام

تمہیں بے وقوف بنانے کی ایک کوشش ہے ورنہ واقع میں ان کے دلوں میں اور ان کی زبانوں میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے آخر میں ارشاد ہوا ہے اکثرھم فاسقون یعنی جس طرح ان کی قرابت داری محض زبانی اور نمائشی ہے اسی طرح اپنے عہد و پیمان کے معاملہ میں یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ان کی اکثریت عہد شکن ہے فسق کا لفظ یہاں ان معنے میں نہیں جو محدثین اور فقہاء کی اصطلاح ہے بلکہ یہاں یہ لفظ غداری اور عہد شکنی کے معنے میں ہے اور قرآن میں اس لفظ کا استعمال ان معنے میں معروف ہے۔

دونوں آیتوں میں دو لفظ تقویٰ اور فسق مقابلہ پر آئے ہیں وفائے عہد کرنے والوں کے لیے تقویٰ مقام مدح میں آیا ہے اور عہد شکنی کرنے والوں کے لیے فسق مقام مذمت میں بولا گیا ہے یہاں دونوں کے تقابلی مطالعہ میں گہری حکمت ہے گویا یہاں تقویٰ وفائے عہد کا نام ہے تو فسق نقض عہد اور عہد شکنی کا نام ہے۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ
اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹﴾ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ
اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾ فَاِنْ
تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي
الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِنْ
نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ
فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾

انھوں نے اللہ کی آیات کو بہت ہی حقیر قیمت پر بیچ ڈالا ہے پھر لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنے لگے ان کے یہ کرتوت بہت ہی برے ہیں[9]۔ وہ کسی مردِ مومن کے لیے نہ تو قرابت کا پاس کرتے ہیں اور نہ کسی ذمّہ داری کا۔ لہٰذا یہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں[10]۔ پس اگر یہ لوگ توبہ کریں نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور اہلِ علم کے لیے ہم اپنے احکام کھول کر بیان کرتے ہیں[11]۔ اور اگر یہ لوگ عہد و پیمان کے باوجود عہد شکنی کریں اور تمہارے دین میں دست اندازی کریں تو تم ان کفر کے سرداروں سے جنگ کرو۔ ان کے معاہدے معاہدے نہیں ہیں۔ تاکہ یہ لوگ ظلم سے باز آجائیں[12]۔

مفردات کے معانی

معتدون یہ اعتداء سے ہے اس کا مادہ عدوان ہے اس کے لغوی معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں یا یوں کہہ دیجیے

کر حق سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ اعتدار کا لفظ زیادتی کے ہر پہلو کو جامع ہے یہاں عہد شکنی کے معنے میں ہے۔
اخوان یہ اخ کی جمع ہے۔ اخ کی جمع اخوۃ بھی ہے دونوں قرآن میں استعمال ہوئی ہیں۔ دونوں نسبی، دینی اور دوستی کے بھائی چارے پر بولی جاتی ہیں یہاں اخوان دینی اخوت کے لیے آیا ہے دوسرے مقام پر دوستی کے بھائی چارے کے لیے آیا ہے یہ یاد رہے کہ اخوان کا لفظ قرآن میں نسبی اخوت کے لیے کہیں نہیں آیا ہے۔
نکثوا ماضی کا جمع مذکر غائب ہے نکث سے۔ اصل میں رسی کو جوڑنے اور اس کو توڑنے کے لیے بولا جاتا ہے یہاں عہد توڑنے کے معنے میں ہے۔

معاہدہ ختم کرنے کی مزید وجوہ

ان آیات میں مشرکین سے معاہدہ ختم کرنے کی مزید وجوہ بتائی گئی ہیں کہ ان مشرکین کا معاملہ اللہ سبحانہ کے ساتھ اور اللہ کے بندوں کے ساتھ درست نہیں ہے اللہ کی جانب سے ان کے پاس اللہ کا رسول پیغام ہدایت اور زندگی گذارنے کا ضابطہ لے کر آیا لیکن اس کے مقابلہ میں دنیوی منفعتوں کو ترجیح دی۔ وقتی مفادات کے پیچھے پڑ گئے خود بھی اس ہدایت سے روگردانی کی اور دوسروں کو بھی روگردان کرنے میں نمایاں حصہ لیا یہ تو ان کا معاملہ اللہ سبحانہ سے ہے۔ اور اللہ کے بندوں سے ان کے معاملہ کی نوعیت یہ ہے کہ کسی مسلمان کے معاملہ میں ان کو نہ رحم و قرابت کا پاس ہے اور نہ عہد و پیمان کا کوئی لحاظ ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ معاہدوں کے معاملہ میں ان کی اخلاقی کمزوریاں کیا تھیں اور کن اخلاقی کمزوریوں کے تحت انھوں نے کیے ہوئے معاہدات کی پروا نہ کی بنیادی وجہ جو فی الواقع سب سے بڑی اخلاقی کمزوری تھی یہ تھی کہ ان میں مادہ پرستی اس قدر گھر کر گئی تھی کہ اس کے حصول کے لیے وہ ہر قسم کی دیانت پاکبازی اور ایمانداری عہد و پیمان کو داؤ پر لگا دیتے تھے اور اس میں اس قدر جھوٹے اور بے لگام ہو گئے کہ نہ صرف خود ایمان کے مقابلہ میں کفر کے رسیا تھے بلکہ چاہتے تھے کہ دوسرے بھی ایمان دوستی اور حق پرستی کی راہ پر نہ چلیں۔ یہی ان کی بدکرداری نہ تھی بلکہ وہ مادہ پرستی میں ایسے دیوانے ہو چکے تھے کہ اس کی راہ میں اگر رحم و قرابت حائل ہوتے یا عہد و پیمان راستہ میں رکاوٹ ہوتا تو وہ اس کی بھی کوئی پروا نہ کرتے۔ آیات کو بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باتیں دو ہیں۔
ایک یہ کہ مسلمانوں نے ان سے معاہدے کیوں ختم کیے۔
دوسرے یہ کہ مشرکین نے عہد شکنی کیوں کی۔
بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ یہاں قرآن پہلی بات کی وجوہ بیان کر رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں دوسری بات کی وجوہ بیان ہو رہی ہیں۔

(۹) انھوں نے اللہ کی آیات کو بہت ہی حقیر قیمت پر بیچ ڈالا ہے پھر لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے میں لگ گئے۔ ان کے

یہ کرتوت بہت ہی بُرے ہیں یعنی یہ مشرکین وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی ذرا سی طمع اور اپنی اغراض و اہواء کی خاطر خدا کے احکام و آیات کو رد کر دیا۔ اس طرح خود بھی خدا کے راستہ پر نہ چلے اور دوسروں کو بھی چلنے سے روکا جو ایسے بدترین اور نالائق کاموں میں پھنسے ہوں اور خدا سے نہ ڈریں۔ وہ عہد شکنی کے وبال سے کیا ڈریں گے اور اپنے قول و قرار پر کیا قائم رہیں گے لہ

اس ارشاد میں اصل دو باتیں آئی ہیں ایک یہ کہ انھوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت وصول کر لی۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک طرف اللہ کے قوانین ان کو بھلائی، درستی، اخلاق کی پاکیزگی اور قانونِ حق کی پابندی کی دعوت دے رہے ہیں۔ دوسری طرف دنیوی زندگی کے وہ چند مادی فوائد ہیں جو خواہش نفس کی بے لگام پیروی سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے دونوں چیزوں کا موازنہ کیا اور پھر اصل چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کو اپنے لیے اختیار کر لیا۔ علامہ طیبی نے اس فقرے کو استیناف بیانی قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک ذہن میں پہلی آیت سے اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے پہلے فرمایا تھا اکثرھم فاسقون ان مشرکین مکہ کی اکثریت عہد شکن ہے۔ معاً سوال ہوا کہ عہد شکنی کیوں کر رہے ہیں جواب میں ارشاد ہوا کیونکہ اشتروا بایات اللہ ثمنا قلیلا۔ وہ اللہ کی آیات کے بدلے حقیر قیمت قبول کر لیتے ہیں۔ یہ حقیر قیمت کیا تھی۔ دنیوی مفادات اور زندگی میں کام آنے والے منافع۔ بس یہی منفعت گیری اور مادہ پرستی ان کی عہد شکنیوں کا باعث تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنے لگے اس کا مطلب ہے کہ ان ظالموں نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ ہدایت کی جگہ ضلالت کو اپنے لیے پسند کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے کوشش یہ کی کہ دعوت حق کا کام کسی طرح چلنے نہ پائے۔ خیر و صلاح کی اس پکار کو کوئی نہ سنے بلکہ وہ منہ ہی بند کر دیئے جائیں جن سے یہ پکار اٹھتی ہے۔ جس صالح زندگی کو اللہ سبحانہ زمین پر قائم کرنا چاہتا تھا اس کے قیام کو روکنے میں انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور ان لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جو اس نظامِ حق کے متبع بنے جو محمد رسول اللہ ﷺ اللہ سبحانہ کی جانب سے لے کر آئے تھے۔ اصل ارشاد میں صدوا عن سبیلہ آیا ہے اس کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ صدود لازم ہے اور معنے یہ ہیں کہ وہ اللہ کے راستہ سے ہٹ گئے دوسرے یہ کہ صد متعدی ہے اور معنے یہ ہیں کہ انھوں نے رائے عامہ کو اسلام سے روکا۔ یہاں فقرے میں فا، کا استعمال بتا رہا ہے کہ ان کی نفع اندوزی لوگوں کو اللہ کے راستہ سے ہٹانے اور اسلام کی راہ میں روڑا بننے کا باعث تھی قاضی بیضاوی نے یہی بات سمجھی ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے انھم ساء ما کانوا یعملون۔ یعنی یہ لوگ اپنے اس کردار کے لحاظ سے بدترین ہیں کردار کی تفصیل شارحین قرآن نے شرک عہد شکنی اور لوگوں کو دینِ حق کی پیروی روکنا بتائی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان آیات میں ان کے

لہ افادات شیخ الاسلام۔

کردار کا پورا چہرہ جو پیش کیا ہے وہ بھی اس میں داخل ہے۔ یعنی بے ایمانی میں اتنا جھوٹ ہو جانا کہ قرابت اور رحم کی بھی پروا نہ کرنا۔ عہد و پیمان کی ذمہ داریوں کو محسوس نہ کرنا۔ معاملات میں ہم آہنگی نہ ہونا۔ عہد شکن ہونا۔ ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت کو پذیرائی دینا۔ لوگوں کو حق کی راہ چلنے سے روکنا۔ یہ سب بدترین اعمال ہیں۔ ان اعمال کی برائی اور شناعت اتنی واضح اور کھلی ہے کہ ان کا مرتکب معاشرہ کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ قرآن بتا رہا ہے کہ ان گندگیوں کے لبادے میں ملبوس حضرات سے اگر معاہدات کو ختم نہ کیا جائے تو اور کیا کیا جائے۔

اجتماعی ہی نہیں بلکہ انفرادی نقصان

(۱۰) وہ کسی مردِ مومن کے بیے نہ تو قرابت کا پاس کرتے ہیں اور نہ کسی ذمہ داری کا۔ لہٰذا یہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں۔ یعنی تمہارے ہی ساتھ نہیں بلکہ مسلمان نام سے ان کو بیر ہے۔ کوئی مسلمان ہو۔ موقع پانے پر اس کو نقصان پہنچانے کے لیے سب تعلقات قرابت اور قول و قرار اٹھا کر رکھ دیتے ہیں اس بارے میں ان کی ظلم و زیادتی حد سے بڑھی ہوئی ہے[1]

کچھ شارحین کی رائے میں یہ تکرار ہے۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ تکرار نہیں بلکہ پہلی آیت میں روئے سخن مشرکین کی طرف ہے جبکہ دوسری آیت میں یہودیوں کی طرف ہے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں بے قید مسلمانوں کے حقوق کی نگرانی کا ذکر ہے۔ جبکہ دوسری میں مسلمانوں کے خاص گروہ کے حقوق کی نگرانی کرنا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی آراء پیش کی گئی ہیں۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی زندگی دو حصوں پر منقسم تھی ایک اجتماعی اور دوسرے انفرادی۔ اجتماعی زندگی سے مسلمانوں کا نظم جماعت ہے جس کے تحت ان کی زندگیوں کے سارے گوشے ترتیب پا رہے تھے سب جمع ہو کر ایک ذاتِ گرامی یعنے حضور اقدس ؐ سے جڑے ہوئے تھے اور آپ کی ذات ملک کے نظم و سیاست۔ جماعت کی تنظیم میں مرکز تھی۔ تمام صحابہ اپنی زندگی کے تمام اطوار و اقدار میں آپ کے اشاروں کی منتظر۔ وقت کی سیاست۔ جنگ و امن کے سارے معاملات آپ ہی کے ارد گرد گھومتے تھے۔ یہ نظامِ حیات یا مسلمانوں کا اجتماعی نظام اس درجہ مضبوط۔ اس درجہ کامل اور اس قدر ہمہ گیر تھا کہ دنیا کو اس پر رشک آتا تھا۔ اس کے مقابلے میں ہر مسلمان کی انفرادی زندگی تھی۔ ان کا رہنا سہنا۔ ان کا کھانا پینا وغیرہ اس سے متعلق تھا۔ قرآن نے پہلی آیت میں بتایا کہ مشرکین کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی ان کا اقتدار اور ان کی سیاست اس قدر مبغوض ہے کہ اس کے خلاف اقدام میں نہ وہ کسی رشتہ داری کی پروا کرتے ہیں اور نہ کسی عہد و پیمان کی ذمہ داری کو نگاہ میں لاتے ہیں۔ اس آیت میں مسلمانوں کی انفرادی زندگی کے بارے میں بتا رہا ہے کہ مشرکین کو ان کی انفرادی زندگی بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے۔ وہ دشمنی میں اتنے از خود وارفتہ ہو گئے ہیں کہ نہ ان کو قرابت کا خیال

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے اور نہ کسی موالات کا۔

اور علامہ نسفی نے مدارک میں آیت میں خاص اور عام مسلمانوں کا فرق جو بتایا ہے وہ اجتماعی اور انفرادی سے الگ ہے۔

آخر میں جو فرمایا ہے واولئك هم المعتدون۔ یہی لوگ حد سے گذر جانے والے ہیں۔ اس جملہ میں قصر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعتدار مسلمانوں میں بالکل نہیں۔ اعتدار صرف مشرکین میں ہے یعنی مشرکین انتقام کے جوش میں بے تحاشا مسلمانوں کے نبرد آزما اور غیر نبرد آزما سب کو مارتے ہیں۔ مسلمانوں کے کھیتوں باغوں اور ان کی چراگاہوں کو آگ لگا دیتے ہیں۔ ان کے بے زبان جانوروں کو مار دیتے ہیں عہد اور عہد شکن قوموں کی دیکھا دیکھی معاہدوں کی پروا نہیں کرتے ان کی پے بہ پے عہد شکنیوں اور ظلم و عداوت کی انتہا نے مسلمانوں کے لیے اعلان جنگ ناگزیر کر دیا تھا۔ انھوں نے بار بار عہد کیے اور بار بار خلاف ورزی کی اور پھر صلح حدیبیہ کا آخری عہد بھی اس ظالمانہ طریق پر پامال کیا تو اب ان کے اعتدار میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اب تو یہ شر و تمرد میں آخری حدوں کو پھاند گئے ہیں

قرآن نے اعتدار کی بھرپور مذمت کی ہے اور مسلمانوں کو بھی اس سے روکا ہے لا تعتدوا ان الله لا یحب المعتدین۔ زیادتی نہ کرو اللہ سبحانہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ میدان جنگ میں بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو نہ مارا جائے۔ مشرکین عرب نے یہ تمام حدود پھاند ڈالی تھیں۔ مسلمان عورتیں مسلمان بوڑھے۔ مسلمان معذوران کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں۔ اس لیے قرآن نے اعتدار کی مہران پر لگا دی اور بتا دیا کہ حقوق تلف کرنے اور حدود توڑنے میں انھوں نے سبقت کی ہے تو ایسے بدعہدوں اور ایسے ظالموں کے ساتھ اللہ و رسول کا عہد کیسے رہ سکتا ہے۔

نماز و زکوۃ اخوتِ اسلامی کا پیمانہ

(۱۱) پس اگر یہ لوگ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور اہل علم کے لیے ہم احکام کھول کر بیان کرتے ہیں یعنی اب بھی اگر کفر سے توبہ کر کے احکام دینیہ نماز و زکوۃ وغیرہ پر عمل پیرا ہوں تو نہ صرف یہ کہ آیندہ کے لیے مامون و محفوظ ہو جائیں گے بلکہ اسلامی برادری میں شامل ہو کر ان حقوق کے مستحق ہوں گے جن کے دوسرے مسلمان مستحق ہیں جو کچھ بدعہدیاں اور شرارتیں پہلے ہو چکیں سب معاف کر دی جائیں گی۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ جو فرمایا بھائی ہیں حکم شریعت میں اس سے سمجھ لیں کہ جو شخص قرائن سے معلوم ہو کہ ظاہر میں مسلمان ہے اور دل سے یقین نہیں رکھتا اس کو حکم ظاہری میں مسلمان گنیں مگر معتمد اور دوست نہ جانیں ——

دینی بھائی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ شرطیں پوری کرنے کا نتیجہ صرف یہی نہ ہوگا کہ تمہارے لیے ان پر ہاتھ اٹھانا اور ان کے جان و مال سے تعرض کرنا حرام ہو جائے گا بلکہ مزید براں اس کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اسلامی سوسائٹی میں ان کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔ معاشرتی تمدنی اور قانونی حیثیت سے وہ تمام دوسرے مسلمانوں کی طرح ہوں گے کوئی فرق و امتیاز ان کی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوگا۔

یہی آیت اسی عنوان سے پہلے بھی آ چکی ہے اور دونوں جگہ مشرکین کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں بتایا کہ اگر مشرکین توبہ کریں نماز قائم کریں زکوٰۃ دیں تو مسلمانوں کے لیے روا نہیں ہے کہ ان سے جنگ کریں گویا محاربین میں جنگ کے خاتمے کے لیے یہ تین باتیں کافی ہیں اور اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اگر وہ یہ تین کام کریں تو مسلمان برادری کے رکن ہیں۔ ان کے وہی شہری اور بنیادی حقوق ہیں جو اسلامی مملکت میں مسلمانوں کے ہوتے ہیں دو صورتیں ہیں اور دونوں میں جوہری فرق ہے ایک یہ کہ عرب مشرکین سے جنگ کا خاتمہ کیسے ہو۔ کیا صلح کر کے جنگ کو ختم کیا جائے یا پہلے کی طرح کوئی جدید معاہدہ کر کے ان سے جنگ ختم کی جائے یا پھر ان کو اسلامی مملکت کا شہری بنا کر اور جزیہ لے کر جنگ ختم کی جائے فرمایا ان صورتوں میں سے کسی بھی صورت کو مشرکین عرب کے لیے نہ قبول کیا جائے ان سے جنگ ختم کرنے کی اور ان کو آزادانہ جزیرۃ العرب میں رہنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ اسلام کو قبول کریں اور اس کی قبولیت کے لیے وہ تین کام کریں توبہ، نماز اور زکوٰۃ ——

اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اسلامی اخوت کی پہلی ہی تین چیزیں بنیاد ہیں توبہ، نماز اور زکوٰۃ —— اگر یہ کام کرتے ہیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر اور سخت سے سخت دشمن ہو جس وقت وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائے اور اسلامی قانون قبول کرے وہ مسلمانوں کا دینی بھائی ہے۔ فاخوانکم فی الدین۔ غلام بھی اگر حلقہ بگوش اسلام ہو جائے تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے باپ کا نام و نسب بھی معلوم نہ ہو وہ دین کے رشتہ سے مسلمانوں کا بھائی ہے۔

فان لم تعلموا اباءھم فاخوانکم فی الدین و موالیکم ایسا کیوں ہے؟

اس لیے کہ حضور اقدس ﷺ تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے اور وہ دین کا رشتہ ہے جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا۔ دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ خاندانی اور قبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کر دی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دشمنوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا کہ وہ درحقیقت بھائی بھائی ہو گئے۔

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت کی تشریح جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے اس طرح فرمائی ہے کہ

ـــہ افادات شیخ الاسلام

مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب الادب و مسلم)

صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ

سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کی طرح ہیں کہ اگر اس کی ایک آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو سارا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔

یہاں شاہ عبدالقادر نے موضح القرآن میں اس آیت سے یہ نکتہ آفرینی خوب فرمائی ہے ——— یہ جو فرمایا کہ بھائی ہیں حکم شرع میں اس سے سمجھ لیں کہ جو شخص قرائن سے معلوم ہو کہ ظاہری مسلمان ہے دل سے یقین نہیں رکھتا اس کو حکم ظاہری میں مسلمان گنیں لیکن معتمد اور دوست نہ پکڑیں ——— شاہ صاحب بتانا یہ چاہتے ہیں کہ نماز اور زکوٰۃ مسلمان ہونے کی شرط نہیں بلکہ اخوت کی شرطیں ہیں۔ اخوت کے لیے ضروری ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا محسوس پیمانہ اپنے عمل میں رکھتے ہوں۔ قرآن نے موالات اور دوستی کی بھی نماز اور زکوٰۃ کو شرط بتایا ہے۔

انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ و یوتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔

تمہارے دوست تو اللہ اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے اور اللہ کے حضور جھکے رہتے ہیں۔

حکومت کے اسلامی ہونے کی بھی نماز اور زکوٰۃ شرط ہیں۔

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔

وہ کہ اگر ہم ان کو طاقت دیں ملک میں تو نماز قائم کریں زکوٰۃ دیں اور اچھے کام کا حکم کریں اور برے سے روکیں یعنی مسلمانوں کی حکومت، ان کی ولایت اور ان کی اخوت کے اسلامی ہونے کی نماز اور زکوٰۃ شرطیں ہیں۔

کچھ لوگوں نے اس آیت کے مفہوم سے استدلال کیا ہے کہ تارک نماز مسلمان نہیں یہ درست نہیں مسلمان ہونا اور بات ہے اور ان میں اخوت ہونا اور بات ہے۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں نماز اور زکوٰۃ نہ ہو تو وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی نہیں اور یہ بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک مسلمان نماز نہیں پڑھتا ہے تو اس کی زندگی اسلامی نہیں لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ مسلمان نہیں جن لوگوں کی نظر اس بنیادی نکتہ پر تھی انھوں نے تارک صلاۃ کو کافر نہیں بتایا لیکن ترک صلاۃ کو قابل

دست اندازی پولیس سنگین جرم قرار دیا۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام مالک کا یہی مسلک ہے۔ ائمہ میں صرف امام احمد ترکِ صلاۃ کو کفر بتاتے ہیں۔

علامہ السبکی نے طبقات الشافعیۃ الکبری میں امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا ایک مناظرہ بھی دلچسپ نقل کیا ہے۔

امام شافعی ——— کیا آپ تارکِ صلاۃ مسلمان کو کافر کہتے ہیں۔

امام احمد ——— جی ہاں

امام شافعی ——— جب وہ کافر ہے تو مسلمان کیسے ہو۔

امام احمد ——— لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

امام شافعی ——— یہ تو وہ پہلے ہی کہہ رہا ہے۔ اس کا تو اس نے انکار ہی نہیں کیا۔

امام احمد ——— نماز پڑھے گا تو مسلمان ہو جائے گا۔

امام شافعی ——— جب وہ کافر ہو چکا ہے تو کافر کی نماز ہو ہی نہیں سکتی۔

امام احمد ——— خاموش ہو گئے۔

یہاں دو مسئلے ہیں اور دونوں روح کے لحاظ سے بالکل الگ الگ ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی جماعت نماز چھوڑ دے یعنی اپنی اجتماعی زندگی ہی سے اسلام کا یہ لیبل ہٹا دے۔ اس آیت کی رو سے وہ جماعت کفر کی آغوش میں چلی جائے گی۔ حضرت ابوبکر　　　نے یہی بات مانعین زکوٰۃ کے بارے میں اس آیت سے سمجھی۔ دوسری بات کہ ایک فرد نماز چھوڑ دے۔ فرد ترکِ صلاۃ سے کافر نہ ہو گا لیکن اس کی زندگی اسلامی نہ رہے گی۔ پہلی آیت اور اس آیت دونوں کا رُخ مشرکین محاربین کی طرف ہے۔ دونوں جملہ شرطیہ ہیں لیکن مزہ یہ ہے کہ شرط دونوں جگہ ایک ہے فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ لیکن جوابِ شرط دونوں جگہ مختلف ہے پہلی آیت میں جوابِ شرط فخلوا سبیلھم ہے جب کہ دوسری آیت میں فاخوانکم فی الدین ہے۔ شرطوں کا یہ اتحاد اور جواب کا یہ تنوع سیاق کے تقاضے سے ہے پہلی آیت میں مشرکین کے بارے میں فاقتلوا المشرکین کے حکم کے بعد یہ آیت آئی ہے اس کے مطابق فخلوا سبیلھم جواب تھا کہ اب تمہیں ان کو کچھ کہنے کا حق نہیں۔ دوسری آیت مشرکین کا چہرہ پیش کرنے کے بعد کہ کفران میں رچ گیا ہے۔ ضلالت اور راہ خدا سے اعراض ان کی طبیعت بن گئی ہے ——— اس لیے یہاں جواب بھی برمحل اور برموقعہ ہے کہ فاخوانکم فی الدین۔ اس جواب میں اسلام کی طرف زیادہ کشش ہے۔

ایک ضروری اور اہم سوال

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ سوال ابھر آئے کہ ارشادِ نبوت میں اسلام کے تو پانچ ارکان بتائے گئے جب کہ آیت قرآنی صرف تین بتا رہی ہے۔ حدیث آپ نے بارہا سنی ہوگی۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اسلام کا قصر پانچ ستونوں پر قائم کیا گیا ہے۔ شہادتین، نماز، زکوٰۃ، روزہ، اور حج۔

یہ ارشادِ نبوت مسلم ترمذی اور نسائی میں بھی ان ہی الفاظ میں ہے۔ آیت قرآنی میں تین ارکان کا ذکر ہوا ہے شہادتین یعنی توبہ اور اقامتِ صلاۃ اور ایتاء زکوٰۃ۔ اور ارشادِ نبوت میں دو کا اضافہ اور روزہ اور حج۔ اور ان سب کی حیثیت اسلام کے مکان کی ستونوں کی ہے۔ عام شارحین قرآن نے تو اس شبہ کی اہمیت کو کچھ محسوس نہیں کیا مگر سوچنے کی بات ہے کہ جب اسلام تو ارکان پانچ ہیں اور ان پانچوں میں گہرا ارتباط ہے تو اس موقعہ پر صرف تین کو ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے ارکان کے باہمی ارتباط پر حافظ ابن رجب حنبلی نے بحث کی ہے فرماتے ہیں۔ ان میں باہم ایسا ربط ہے کہ اگر ان میں ایک بھی نہ ہو تو باقی بھی کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ارکان جیسے پورے اسلام کے قصر کو سنبھالے ہوئے ہیں ایسے ہی باہم ایک دوسرے کے لیے بھی سہارا بنے ہوئے ہیں۔ اگر سب موجود ہوں تو پورے قصر اسلام کا وزن باہم تقسیم کر لیتے ہیں اور اگر ان میں کوئی ایک نہیں ہوتا تو اسی کا وزن دوسرے ارکان پر پڑ جاتا ہے اور قصر کے لیے اور خود ستونوں کے لیے بھی یہ خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے یہ تو ظاہری ربط ہے اور معنوی ربط اس سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں معنوی ربط ایسا ہے کہ ایک دوسرے کے جز کی طرح ہے ایک کی ادائیگی ہے دوسرے کی توفیق ہوتی ہے اس لیے حدیث میں اسلام کی اس پر اسرار تشبیہ میں ارکانِ خمسہ کا باہمی رشتہ ہی سمجھنا چاہیے۔

ان ارکان کا باہمی ربط بھی یہی چاہتا ہے کہ قرآن میں ان پانچوں کا ذکر ہو۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن صرف تین پیش کرتا ہے توبہ اقامتِ صلاۃ اور ایتاء زکوٰۃ۔ اور وں کا پتہ نہیں مگر میں اس کی بنیادی وجہ جو سمجھا ہوں یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے بندوں سے تعلقات دو قسم کے ہیں ایک یہ کہ وہ حاکم ہیں ان کے احکام و قوانین کی طاعت کی جائے دوسرے یہ کہ اللہ سبحانہٗ محبوب ہیں ان سے محبت کی جائے۔ اس لحاظ سے اسلام میں عبادات بھی دو قسم کی ہیں کچھ عبادتیں وہ ہیں جن کے ذریعے اللہ کی حاکمیت کا سکہ دل پر قائم ہوتا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کے ذریعے جذبہ محبت میں انگیخت پیدا ہوتی ہے۔ حاکمیت سے متعلق عبادات کے لیے ہماری زبان میں بندگی کی تعبیر ہے جبکہ محبت سے تعلق رکھنے والی عبادات کو ہم پرستش کہتے ہیں نماز اور زکوٰۃ سے اللہ کی بندگی کا اظہار ہوتا ہے روزہ اور حج اللہ کی پرستش کی نمائندگی کرتی ہیں۔ سورہ براءت میں روئے سخن محاربین سے ہے

ان سے میدانِ جنگ میں بندگی ہی کا مطالبہ ہو سکتا ہے اس لیے یہاں صرف نماز اور زکوٰۃ کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔ اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے اہل ایمان کے لیے اسلام کا مکمل چہرہ پیش فرمایا ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ نفصل الایات ہم یہ احکام مبنی بر دلائل اہل علم کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ ان کو ایمان وکفر اور حق و باطل کے فاصلے معلوم ہو جائیں۔ یہاں اہل علم سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ سبحانہ کی نافرمانی کے انجام کو جانتے ہیں اور اس کا کچھ خوف اپنے اندر رکھتے ہیں اس فقرے میں ایک قسم کی تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس باب میں پوری وضاحت کر دی گئی ہے کوئی ابہام باقی نہیں ہے اب اگر مسلمانوں میں سے کسی نے ان مشرکین کے ساتھ اس سے الگ ہو کر معاملہ کرنا چاہا اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ علم یہاں کنایۃً تامل و تفکر کے معنے میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ احکام ان لوگوں کے لیے ہیں جو فکر و غور سے حقائق تک پہنچتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی آیت سے یہ بات سمجھی ہے کہ اس آیت نے تمام اہل قبلہ کے خون حرام کر دیے ہیں جب کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز و زکوٰۃ کی قرآن میں ہم آہنگی دیکھ کر یہ فتویٰ دیا کہ ——— تمہیں نماز و زکوٰۃ دونوں کا حکم دیا گیا ہے جس نے زکوٰۃ نہیں دی اس کی نماز نہیں ہے۔ حضرت ابن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فقاہت کو خوب سراہا ہے۔ رحم اللہ ابابکر ما کان افقہہ اللہ سبحانہ ابوبکر رضی پر اپنی رحمت کی موسلادھار بارش نازل کرے کیسی شاندار فقاہت کے مالک تھے ابن زید کا ارشاد حضرت ابوبکر کے اس فیصلہ کے بارے میں ہے جو انہوں نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں صحابہ کے سامنے پیش کیا تھا۔

واللہ لا افرق شیئین جمع اللہ بینہما۔

بخدا میں ان دو چیزوں کے درمیان جدائی نہ کروں گا جن کو اللہ نے جمع کیا ہے۔

عہد شکنی کرنے والوں سے جنگ

(۱۲) اگر یہ لوگ عہد و پیمان کے باوجود عہد شکنی کریں اور تمہارے دین میں دست اندازی کریں تو تم ان کفر کے سرداروں سے جنگ کرو ان کے معاہدے معاہدے نہیں ہیں تاکہ یہ لوگ ظلم سے باز آجائیں یعنی اگر عہد و پیمان توڑ ڈالا جیسے بنی بکر نے خلافِ عہد خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے حملہ آوروں کی مدد کی اور کفر سے باز نہ آئے بلکہ دینِ حق کے متعلق طعنہ زنی اور گستاخانہ عیب جوئی کرتے رہے تو سمجھو کہ اس طرح لوگ ائمۃ الکفر کفر کے سردار اور امام ہیں۔ کیونکہ ان کی حرکات دیکھ کر اور باتیں سن کر بہت سے کمزور اور بیوقوف پیچھے ہو لیتے ہیں۔ ایسے سرغنوں سے مقابلہ کرو کیونکہ ان کا کوئی قول و قسم اور عہد و پیمان باقی نہیں رہا ممکن ہے کہ تمہارے ہاتھوں سے سزا پاکر اپنی شرارت و سرکشی سے باز آجائیں۔ (افادات شیخ الاسلام)

اس آیت کی تشریح میں شارحینِ قرآن میں ہم آہنگی نہیں ہے۔

کچھ کی رائے یہ ہے کہ آیت کے پس منظر میں قریش ہیں مطلب ہے کہ جن لوگوں نے بار بار عہد کیے اور بار بار خلاف ورزی کی اور پھر صلح حدیبیہ کا آخری معاہدہ اس ظالمانہ انداز میں پامال کیا اب ان کا عہد کیوں کر عہد سمجھا جا سکتا ہے ہاں جو فریق اپنے عہد پر قائم رہے تو یقیناً ان کا عہد بھی قائم ہے۔ اسی طرح یہ آیت گویا قرآن کی آیت

کیف یکون للمشرکین عھد عند اللہ و عند رسولہ الا الذین عاھدتم عند المسجد الحرام فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم

کی وضاحت ہے وہاں فرمایا تھا کہ جن لوگوں نے تم سے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا جب تک یہ لوگ اس پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو اب بتایا جا رہا ہے کہ اگر یہ لوگ معاہدہ کو توڑ دیں تو تم ان کے ائمہ کفر سے جنگ کرو۔ ائمہ کفر سے قریش کے صنادید اور عمائد مراد ہیں کیونکہ دین کے معاملہ میں سارا عرب ان کے تابع تھا پیشوائی اور سرداری کا مقام ان کو حاصل تھا۔ اسلام کے خلاف طعن و طنز اور استخفاف و استہزا کے جتنے تیر و نشتر چلتے تھے سب کے موجد قریش ہی تھے۔ انھم لا ایمان لھم بھی ان ہی سے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ ان کے عہد و پیمان کا کوئی وزن نہیں ہے۔ یہ زیادہ دیر اس کو نباہ نہ سکیں گے آج نہیں تو کل یہ اُس کو پارہ پارہ کر دیں گے۔ جب بھی اسے توڑ دیں تم ان سے جنگ کرو تاکہ یہ اپنی شرارتوں سے باز آجائیں باز آجانے کے لیے قرآن کی تعبیر لعلھم ینتھون آئی ہے۔ اس فقرے کے ذریعے اس جنگ کے مقصد کو واضح کر دیا بتایا گیا تاکہ وہ ظلم و بدعہدی سے باز آجائیں۔ اسی طرح سورہ انفال میں لعلھم یذکرون آیا ہے یعنی یہ ہیں تاکہ عبرت پذیر ہوں یعنی یہ جنگ انتقامی جذبہ کے خیال یا دنیوی انتفاع و تغلب کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف اس لیے ہے کہ ارباب ظلم و تشدد اپنی بدکرداریوں سے باز آجائیں۔ آیت کی یہ تشریح اکثر شارحینِ قرآن نے اختیار کی ہے مگر اس تشریح پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ سورہ براءت کا زمانہ نزول غزوہ تبوک اور فتح مکہ کے بعد ہوا ہے اور یہ احکام سورہ براءت کی تبلیغ یوم نحر چار مہینے کے بعد ۹ھ میں پیش آرہے ہیں۔ اس اعتراض کی قوت کو قرطبی نے بھی محسوس کیا اور ان کے علاوہ دوسرے شارحین نے بھی۔ کچھ اس اعتراض کی قوت سے اتنے مرعوب ہو گئے کہ سورہ براءت کے زمانہ نزول ہی کا انکار کر بیٹھے۔ اور کچھ نے اسی اعتراض کی وجہ سے اس آیت کی تشریح میں دوسری راہ اختیار کر لی۔

ان کے خیال میں اس آیت کا تعلق قریش سے نہیں بلکہ ان زندیقوں سے ہے جن کا ظہور حضور اقدس ﷺ کے بعد زمانہ خلافت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں ہوا تھا۔ اس رائے کو علامہ زمخشری نے کشاف میں اختیار کیا ہے۔ اس صورت میں آیت کی تشریح اس طرح کی ہے۔

اس آیت کے الفاظ سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنا عہد توڑ دیں تو ان سے لڑو لیکن نظم کلام پر غور کرنے سے

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عہد سے مراد اسلام اور اطاعت امر کا عہد ہے۔ کیونکہ معاہدات کو تو پہلے ہی ساقط کیا جا چکا ہے اور اب آئندہ ان سے معاہدہ کرنا سرے سے پیش نظر نہ تھا لہٰذا یہاں خلاف ورزی معاہدہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، پھر آیت اوپر والی آیت کے متابعد آئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ توبہ کریں اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی قبول کر لیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اس کے بعد یہ کہنا کہ اگر وہ اپنی قسمیں توڑ دیں صاف طور پر یہ معنے رکھتا ہے کہ اس سے مراد ان کے اسلام قبول کرنے اور اسلامی نظام جماعت کی پابندی کا عہد کرنے کے بعد پھر اسے توڑ دینا ہے دراصل اس آیت میں فتنہ وارتداد کی طرف اشارہ ہے جو ڈیڑھ سال کے بعد خلافت صدیقی کی ابتدا میں بپا ہوا تھا۔ حضرت ابو بکر ؓ نے اس موقعہ پر جو طرز عمل اختیار کیا وہ ٹھیک اس ہدایت کے مطابق تھا جو اس آیت میں پہلے ہی دی جا چکی تھی [1]

علامہ نیساپوری، قاضی بیضاوی اور دوسرے شارحین قرآن کی اس تشریح کو زمخشری کی حمایت حاصل ہے۔

لیکن پہلی تشریح پر اگر تاریخی حیثیت سے اعتراض ہوا اور اس سے بچنے کے لیے ان بزرگوں نے تشریح کا یہ انداز اختیار کیا۔ تو اس تشریح پر بھی یہ اعتراض ہے کہ یہ تفسیر خود قرآن کے سیاق اور سباق کے خلاف ہے۔ کیونکہ:۔

اوّلاً اس آیت میں عہد توڑنے کا عہد کرنے کے بعد ذکر ہے اور یہ چاہتا ہے کہ نزول آیت سے پہلے معاہدہ ہو چکا ہو اور یہ معاہدہ حدیبیہ بھی ہو سکتا ہے جو ماضی میں ہو چکا ہے۔ صیغے بھی تعبیر میں ماضی کے استعمال ہوئے ہیں۔ حدیبیہ کے عہد میں صرف قریش مکہ ہی نہ تھے بلکہ مسلمانوں کے اور قریش کے حلفاء بھی اس میں شریک تھے جیسے بنو کنانہ اور بنو خزاعہ۔ تعبیر میں جمع کے صیغے اور جمع کی ضمیریں منہ بولی شہادتیں کہہ رہی ہیں کہ معاہد ایک قبیلہ نہیں بلکہ متعدد قبائل تھے۔ فتح مکہ کے بعد بھی کئی والے مکہ ہی میں موجود تھے اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں لگے ہوئے تھے۔

ثانیاً۔ اس آیت میں یہ فرمانے کے بعد کہ ان عہد شکنوں کے رہنماؤں سے تمہیں قتال کرنا چاہیے۔ فقاتلوا ائمۃ الکفر۔ مسلمانوں کو ان ہی سے قتال پر ابھارنے کے لیے قتال کی تین وجہیں پیش کی ہیں کہ۔

۱۔ انھوں نے اپنے عہدوں کو توڑ دیا ہے۔

۲۔ انھوں نے رسول خدا کو گھر سے نکالا ہے۔

۳۔ جنگ کا آغاز ان کی جانب سے ہوا ہے۔

یہ تینوں باتیں قریش کے سوا کہاں پائی جاتی ہیں۔ کیا یہ اوصاف مرتدین خلافت صدیقی پر چسپاں ہو سکتے ہیں

ثالثاً۔ اگر آیت میں خلافت صدیقی کے مرتدین مراد ہوں گے تو آیت قرآنی ضمیروں کے انتشار کا شکار ہو جائے گی اور ضمیروں کا ایسا انتشار فصاحت کے خلاف ہے آغاز میں کیف یکون للمشرکین عہد آیا ہے اس کے بعد

[1] تفہیم القرآن۔

آنے والے افعال اور ضمائر کا مرجع مشرکین ہیں۔ استقاموا۔ یظھروا، یرقبوا، یرضون، اشتروا، صدوا، یعملون، لایرقبون، تابوا اقاموا، اتوا، یعلمون، نکثوا، طعنوا، ینتھون، ان سب افعال کی ضمیروں کا مرجع مشرکین ہیں۔ اگر آیت میں مرتدین مراد ہوں گے۔ تو نکثوا اور طعنوا کی ضمیروں کا مرجع مشرکین نہ ہوں گے بلکہ ان کا مرجع مسلمان ہوں گے اور مسلمانوں سے وہ مسلمان مراد ہوں گے جنھوں نے اسلام کا حلقہ گردنوں میں ڈالا ہے نماز اور زکوٰۃ کو اسلامی زندگی کے لیے بطور عنوان اختیار کیا ہے۔ یہ فک ضمائر قرآن جیسی فصاحت کی علمبردار کتاب میں ممکن نہیں ہے

بہرحال آیت کی یہ تشریح پہلی تشریح سے زیادہ مخدوش اور غیر مربوط ہے پہلی اگر تاریخیت سے ہمنوا نہ ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔ تو یہ دوسری تشریح قرآن کے سیاق و سباق سے ہم نوا نہ ہونے

ہمیں اس آیت کی تشریح میں السید رشید رضا کی یہ بات پسند آئی ہے جو انھوں نے ساری قیل و قال کے بعد المنار میں پیش کی ہے فرماتے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ یہ آیت ان مشرک معاہدین کے بارے میں ہے جو معاہدین میں سے باقی رہ گئے تھے۔ اور اسی کے حکم میں وہ بھی داخل ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ ان مشرکین جیسا طرز عمل اختیار کریں گے۔

آیت قرآنی کو پڑھ کر آگے نہ بڑھ جایئے۔ ٹھہریئے اور ان اہل علم کے ذوق اجتہاد اور تحقیق علمی کی بھی داد دیجئے جنھوں نے اسلامی زندگی کے قانونی اور سیاسی مسائل اس سے معلوم کیے ہیں۔

اگر مملکت کا غیر مسلم شہری جسے ساری دستوری آزادیاں حاصل ہیں اور جس کے جان۔ مال اور آبرو کے تحفظ کی اسلامی مملکت نے ذمہ داری اٹھائی ہے وہ اگر اسلامی مملکت کا شہری ہو کر دین اسلام کے خلاف دل آزار اور توہین آمیز لب و لہجہ اختیار کرے تو اس آیت کی روشنی میں اس سے امن کا معاہدہ ختم ہو جائے گا اور اس کا یہ جرم اسلامی قانون میں قابل دست اندازی پولیس ہے اور اسلامی عدالت اسے قتل کی سزا دے سکتی ہے۔ کیونکہ معاہدہ سے نکل جانے کے بعد ذمی نہیں حربی کی حیثیت میں آگیا۔ علامہ نسفی مدارک میں رقمطراز ہیں۔

جب ذمی اسلام کے خلاف زبان درازی کرے تو اسے قتل کی سزا دی جا سکتی ہے کیونکہ اسلامی مملکت کا شہری ہونے کی حیثیت سے اس سے معاہدہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف زبان درازی نہ کرے۔ زبان درازی سے اس کا عہد ختم ہو گیا۔ اور اسلام کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔

ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں اس قانون کی عمومیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

معاہدین جب بھی معاہدہ کی خلاف ورزی کریں یا اسلام پر زبان طعن دراز کریں تو ان کا عہد ٹوٹ جائے گا۔

علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اسلام پر زبان درازی کرنے میں قرآن اور حضور اقدس ﷺ کی ذات گرامی کو نشانہ بنانے

والوں کے بارے میں لکھا ہے۔
حضور اقدس ﷺ کی شان میں گستاخی سے ذمی کے قتل کی سزا عدالت کا کام ہے یہ امام مالک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے اور احناف میں سے شیخ ابن الہمام بھی یہی کہتے ہیں۔
بات کھلی ہے کہ جیسے یہ جرم کسی مسلمان سے سرزد ہو تو اس کا عہد ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر یہی جرم کسی اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہری سے سرزد ہو جائے تو اس کا بھی عہد ذمہ ختم ہو جائے گا۔ دونوں کی سزا ایک ہے۔ یہ بات نہیں کہ مسلمان اگر یہ جرم کرے تو معاف ہے اور غیر مسلم یہ جرم کرے تو مستوجب عقوبت ہے۔ جرم دونوں کا ایک ہے سزا بھی دونوں کی ایک ہے۔ یہ اسلام کی قانونی مساوات ہے۔
اس آیت پر ذرا ایک نگاہ اور ڈال لیجئے آیت میں نکث آیا ہے یہ دراصل ما استقاموا کے مقابلے میں ہے یعنی وہ اپنے معاہدوں پر استقامت سے محروم ہو کر نقض عہد کر جائیں اور طعنوا فی دینکم یہاں تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ کے مقابل میں ہے بجائے اسلامی نظام کو قبول کرنے کے اسلام کے خلاف زبان درازیاں شروع کر دیں تو ایسے معاہدین سے تمہیں جنگ میں کوئی پس و پیش نہ کرنا چاہیے تمہیں ان سے قتال کرنا چاہیے کیونکہ فی الواقع یہی کفر کے امام اور لیڈر ہیں کافروں کی قیادت بھی کر رہے ہیں۔ کفر کا جھنڈا ان کے ہی ہاتھوں میں ہے۔ ان کا کوئی عہد ہرگز عہد نہیں ہے۔
بالکل آخر میں جہاد کی غایت و غرض بھی لعلھم ینتھون کہہ کر بتا دی کہ اسلام میں جہاد کی غرض و غایت وہ نہیں جو دوسرے نظاموں میں ہوتی ہے بلکہ اسلام میں جہاد کا اولین مقصد یہ ہے کہ شر و فساد کو ختم کیا جائے اور انسانی زندگی میں خیر و صلاح کو قائم کیا جائے۔ انتہاء کے معنے باز آنا ہیں اس کا مطلب ہے کہ مسلمان کی لڑائی اس وقت تک ہے کہ کفر کی طاقتیں شر و فساد سے باز آ جائیں۔ اگر وہ شر و فساد سے باز آ کر خیر و صلاح کو قبول کر لیں تو پھر کوئی جنگ نہیں۔ قرآن نے باز آنے والوں کو یہ خوشخبری دی ہے۔
قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف۔
آپ ان انکار کرنے والوں سے کہہ دیجئے کہ اگر باز آ جائیں تو ماضی کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔
یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آیت میں باز آنے کو جنگ ختم کرنے کی صورت بتایا گیا ہے لیکن اس کا مفہوم جبر و اکراہ نہیں۔ اسلام و کفر دونوں برابر کی طاقتیں ہیں جو دنیا میں ہمیشہ نبرد آزما رہی ہیں۔ ان کی باہمی جنگ کبھی جبر و اکراہ کی تعریف میں نہیں آ سکتی ہے۔ نیز یہ ہے کہ جب اسلام کا قبضہ اقتدار پر ہو جائے تو وہ بے بس لوگوں کی گردنوں پر تلوار رکھ کر اسلام لانے کے لیے مجبور کرے۔ ہمارے علم میں اسلام کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں کیا گیا بلکہ عین میدان جنگ میں دو صورتیں ایسی نکال دی گئیں کہ اگر کفار اسلام قبول کرنا نہ چاہیں تو مصالحت کر کے یا جزیہ دے کر اپنے دین پر قائم رہ سکتے ہیں۔

بکن مشرکین عرب کو یہ رعایت نہیں دی گئی ان کے سامنے صرف تین ہی صورتیں ہیں اسلام قبول کریں۔ میدان جنگ میں آجائیں یا چار ماہ کی مدت میں ترک وطن کر جائیں۔ یہاں انتہاء کے معنے کفر و شرک اور عہد شکنی سے باز آنے کے ہیں۔ دوسرے پارے میں مشرکین عرب کے بارے میں یہ قانونی دفعہ پڑھ چکے ہو۔

فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظالمین۔

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوٓا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣﴾ قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ﴿١٤﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٥﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِن دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾ ع ۱۰

کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے ہو جنھوں نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ ڈالا اور جنھوں نے اللہ کے رسول کو نکالنے کا منصوبہ بنایا اور انھوں نے ہی بار اوّل تم سے جنگ کا آغاز کیا۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ اگر تم ایمان والے ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ (۱۳) تم ان سے جنگ کرو اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دے گا اور ان کو ذلیل کرے گا اور تم کو ان پر غالب کرے گا اور اہلِ ایمان کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا اور ان کے دلوں کی جلن ختم کر دے گا اور جس پر چاہے گا اپنی رحمت سے رجوع کرے گا اور اللہ علم و دانائی والا ہے۔ (۱۵) کیا تم نے خیال کیا ہے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے گا حالانکہ ابھی تو

اللہ کو جاننا ہے تم میں سے ان کو جنھوں نے جہاد کیا ہے اور یہ کہ جنھوں نے اللہ اللہ کے رسول اور اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کسی کو اپنا پوشیدہ دوست نہیں بنایا ہے یاد رکھو۔ تمہارے اعمال جو کچھ بھی ہیں اللہ ان سے باخبر ہے ۱۶

معانی مفردات

بدأ وا کے ماضی کا جمع مذکر غائب بدأ سے بنا ہے مھموز اللام ہو تو معنے شروع کرنا متعدی باب فتح سے ہے اگر ناقص وادی ہو بدا یبدو تو باب نصر سے معنے ظاہر ہونا ہیں۔ مھموز سے باب افتعال ابتداء آتا ہے اور ناقص سے باب افعال ابداء آتا ہے دونوں متعدی آتے ہیں۔

یخزھم اخزاء سے مضارع مجزوم ہے جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے خزی کے معنے رسوا ہونا ای ے خزی رسوائی کے معنے میں ہے اس کا باب افعال اخزاء رسوا کرنا ہے۔

ولیجہ ولج یلج ولوج سے صفت کا صیغہ ہے راز دار کے معنے میں اصل معنے داخل ہونا ہے ہر چیز جس کو تم کسی چیز میں داخل کرو اور اس کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو ولیجہ ہے اس کی جمع ولائج ہے۔

ایمان کی سب سے بڑی آزمائش

ان آیات میں روئے سخن اہلِ ایمان کی طرف ہے اور ان کو جہاد کی ترغیب دی جارہی ہے۔ جہاد نام ہے شر و فساد کو مٹانے اور خیر و صلاح کو برپا کرنے کے لیے جان توڑ محنت کرنا اور اس کی خاطر اپنے کو تج کر دینا ہے قرآن و حدیث اس عمل کے عظمت کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنا محبوب اللہ کی بارگاہ میں یہ عمل ہے۔ نماز کے سوا کوئی عمل اتنا محبوب نہیں ہے۔ دشمنانِ حق کے مقابلے میں دعوتی اور فکری جہاد کرنے والوں کو جب قرآن نے کا مددگار انصار اللہ قرار دیتا ہے تو اندازہ لگائیے کہ وہ ان لوگوں کو کیا کچھ قرار نہ دے گا جو اس کے دین کی خاطر اپنی جان کا تحفہ پیش کرنے کے لیے ہی میدان میں اتر آئیں۔ چنانچہ وہ ایسے لوگوں کو اپنا مددگار ہی نہیں بلکہ اپنا محبوب بتاتا ہے ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا۔ اس محبوبیت کی تھوڑی سی جھلک حضور اقدس ﷺ کی زبان سے سنیئے۔

ایک شبانہ روز سرحد کی نگرانی ایک ماہ کے مسلسل روزوں اور نمازوں سے بھی افضل ہے (صحیح مسلم)

ایک اور ارشاد ہے۔

ہر مرنے والے کا عمل اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے لیکن اس شخص کا معاملہ اس سے مختلف ہے جو اللہ کی راہ میں جنگی پڑاؤ ڈالنے والا ہوتا ہے کیونکہ اس کا یہ عمل قیامت تک بڑھتا ہی رہے گا (ترمذی)

ایک اور ارشاد ہے۔

قسم ہے اس ذات کی جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے ایک صبح یا ایک شام کا سفر دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے اور راہ خدا میں دشمن کے بالمقابل آ کر ٹھہرا رہنا گھر میں ستر برس کی نمازوں سے بہتر ہے۔ ترمذی

صرف یہی نہیں کہ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے اور دنیا سے شر و فساد کو مٹانے کے لیے لڑنا اس کی محبت، مغفرت اور رحمت کا حقدار بنا دیتا ہے بلکہ اس کی نگاہ میں تو وہ لوگ بھی بڑا اونچا مقام پا لیتے ہیں جو لڑنے والوں کو صرف بالواسطہ مدد دیتے ہیں اور جہاد کی تیاریوں میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

(۱۳) کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے ہو جنھوں نے اپنے عہد و ایمان کو توڑ ڈالا اور جنھوں نے اللہ کے رسول کو نکالنے کا منصوبہ بنایا اور انھوں نے ہی بار اول تم سے جنگ کا آغاز کیا۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ اگر تم ایمان والے ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ قریش نے قسمیں اور معاہدے توڑ دیئے تھے کیونکہ خلاف عہد خزاعہ کے مقابلے میں بنو بکر کی مدد کی اور ہجرت سے پہلے پیغمبر علیہ السلام کو وطن مقدس مکہ مکرمہ سے نکالنے کی تجاویز سوچیں اور وہی نکلنے کا سبب بنے اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین (الآیہ) مکہ میں بے قصور مسلمانوں پر بیٹھے بٹھائے مظالم کی ابتداء کی۔ جب ابوسفیان کا تجارتی قافلہ بچ نکلا تو ازراہ نخوت و رعونت بدر کے میدان میں مسلمانوں سے چھیڑ کرنے کے لیے گئے۔ اور صلح حدیبیہ کے بعد بھی اپنی جانب سے عہد شکنی کی ابتدا کی کہ مسلمانوں کے حلیف خزاعہ کے مقابلے میں بنو بکر کی پیٹھ ٹھونکتے رہے۔ اور اسلحہ وغیرہ سے ان کی مدد کرتے رہے آخر کار مسلمان ان سے لڑے اور مکہ معظمہ کو مشرکین کے قبضہ سے پاک کیا۔ الا تقاتلون سے غرض ؂ معلوم ہوتی ہے کہ جو قوم اس طرح کے احوال رکھتی ہو اس سے جنگ کرنے میں مسلمانوں کو کسی وقت کچھ تامل نہ ہونا چاہیے۔ اگر ان کی طاقت اور ساز و سامان جمعیت کا خوف ہو تو مومنین کو سب سے بڑھ کر خدا کا خوف ہونا چاہیے خدا کا ڈر جب دل میں آ جائے پھر سب ڈر نکل جاتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ خدا کی نافرمانی سے ڈرے اور اس کے قہر و غضب سے لرزاں و ترساں ہے کیونکہ نفع و ضرر سب اس کے ہاتھ میں ہے کوئی مخلوق ادنیٰ سے ادنیٰ نفع و ضرر پہنچانے پر بدون اس کی مشیت کے قادر نہیں لے

لے افادات شیخ الاسلام

سارے شارحین قرآن کی رائے میں الا تقاتلون کی تعبیر مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد کی ترغیب ہی کے لیے نہیں بلکہ تحضیض اور انگیخت کے لیے آئی ہے۔ قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی، ابن الجوزی، ابن کثیر، ابن جریر، شوکانی، رازی اور قرطبی نے یہی بات لکھی ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو جنگ کے لیے ابھارا ہے۔ پہلی آیت میں وان نکثوا کی تعبیر آئی تھی جس سے معلوم ہوا تھا کہ معاہدہ ان کی جانب سے اسی طور پر باقی تھا لیکن یہاں نکثو کی تعبیر لاکر بتا دیا کہ انھوں نے معاہدہ توڑ دیا ہے اس طرح اس ارشاد میں جہاد کی ترغیب کے لیے ماضی کی ساری داستان مسلمانوں کے سامنے رکھ دی۔

پہلی یہ بات فرمائی نکثوا ایمانھم انھوں نے اپنے معاہدے توڑ دیئے۔ اس معاہدے سے کونسا معاہدہ مراد ہے۔ قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی اور ابن الجوزی کے خیال میں یہ وہ عہد شکنی ہے جس میں قریش مکہ نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی تھی۔

قریش کی عہد شکنی

معاہدہ حدیبیہ میں ایک دفعہ یہ تھی کہ قبائل عرب فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں شریک ہو جائیں۔ چنانچہ اسی وقت بنو خزاعہ نے رسول اقدس ﷺ کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور بنو بکر قریش کے حلیف ہو گئے۔ ان دونوں قبیلوں کے درمیان مدت سے رقابت اور چشمک تھی۔ معاہدہ حدیبیہ ان دونوں پر بھی حاوی تھا جیسے قریش مکہ اور مسلمانوں پر حاوی تھا۔ معاہدہ پر اٹھارہ یا انیس ماہ گذرے تھے کہ رجب یا شعبان ۸ھ یعنی اواخر اکتوبر تا اواخر دسمبر ۶۲۹ء میں بنو بکر میں سے نوفل بن معاویہ ــــــ نے اپنے قبیلہ کے بہت سے افراد لے کر بنو خزاعہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ بنو خزاعہ نے حدِ حرم میں پناہ لی۔ حملہ آور رک گئے مگر نوفل نے کہا تم لوگوں کو حدِ حرم میں چوریاں کرتے ہوئے کوئی باک نہیں ہے پھر اپنا بدلہ لینے میں کیوں رکتے ہو۔ حملہ جاری رہا یہاں تک کہ بنو خزاعہ نے مکہ پہنچ کر بدیل بن ورقاء کے مکان میں پناہ لی۔

اسی عہد شکنی کو یہاں نکثوا ایمانھم سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تو ہوئی قریش کے خلاف ان کے ماضی سے پہلی فردِ جرم۔

رسول کا اخراج

دوسرا جرم قریش کے ماضی سے قریش ہی کا جو بیان کیا گیا ہے وہ ہے وھموا باخراج الرسول یہ دارالندوہ کی اس سازش کی طرف اشارہ ہے جو قریش کے لیڈروں نے آپ کی دعوتِ حق کو یک قلم ختم کر دینے کے لیے کی تھی۔ اس کے لیے مختلف لیڈروں کی طرف سے مختلف تجویزیں پیش ہوئیں۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و بحث

کے بعد قتل کی تجویز پر اتفاق ہوگیا اور قتل کی یہ تدبیر سوچی گئی کہ قریش کے تمام بڑے خاندان اس میں شریک ہوں تاکہ خاندان بنو ہاشم کے لوگ قصاص کا مطالبہ نہ کرسکیں۔ ہجرت پر نویں جلد کا نوٹ ۳۶ سورہ انفال ضرور مطالعہ کر لیجئے۔ یہاں آیت میں لفظ ہم لاکر اشارہ کردیا کہ انھوں نے رسول کے شہر بدر کرنے کا منصوبہ بنایا تھا ورنہ رسول کا نکلنا حکم خداوندی کے تحت تھا۔ علامہ خفاجی فرماتے ہیں الواقع فیھا الھم بالاخراج لا الاخراج یعنی انھوں نے نکالنے کا منصوبہ بنایا تھا نکالا نہیں تھا نکالنے کے لیے منصوبہ بندی کی جسارت بھی بجائے خود قرآن کے نزدیک ایک جرم عظیم ہے سورہ انفال میں ان کے اسی منصوبہ کو قرآن نے مکر کہا ہے وہاں منصوبہ میں تین چیزیں بتائی ہیں قید کردینا، قتل کردینا اور نکال دینا۔ آیت قرآنی یہ ہے

واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک

اور یہاں صرف اخراج کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ ان کی مجلس مشاورت ہی ہر خروج وطن کا باعث تھی اس لئے یہاں صرف اخراج کا ذکر کیا ہے۔ سورہ ممتحنہ میں بھی اسی اخراج کا ذکر کیا ہے۔ یخرجون الرسول وایاکم ان تومنوا باللہ

قریش کی جانب سے جنگ کا آغاز

تیسری فرد جرم قرآن نے یہاں مخالفین پر یہ لگائی ہے کہ جنگ کا آغاز بھی انھوں نے کیا ہے اس کے لیے تعبیر یہ اختیار فرمائی ھم بداءوکم اول مرۃ یعنی نبوت سے جنگ کرنے میں پہل انھوں نے کی ہے۔ یہاں یہ اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے۔ مشرکین کا فوجی لشکر صرف اس لیے آیا تھا کہ قافلہ کو بچائے۔ دونوں موجود تھے۔ اذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصوی والرکب اسفل منکم۔ مشرکین کی فوج دور تھی۔ قافلہ مسلمانوں سے نچلے حصہ پر تھا۔ قافلہ نے خطرہ کا معمولی نشان دیکھ کر راستہ بدل لیا اور منظر عام سے غائب ہوگیا قریش کا جو فوجی لشکر صرف اس لیے آیا تھا کہ قافلہ کو بچائے وہ قافلہ کے سلامت نکل جانے کے باوجود ابوجہل کے اصرار پر واپس نہیں ہوا۔ بلکہ دندناتا ہوا بدر آیا تاکہ آس پاس کے قبائل پر اپنی قاہری و جباری کا رعب ڈالے۔ ان کا نعرہ تھا کہ ہم اب حضور انور اور ان کی دعوت کو ختم ہی کرکے جائیں گے اس لیے جنگ کی ابتدا بھی ان کی جانب سے ہوئی۔ یہ قریش کے جرائم کی فہرست بیان ہوئی ہے اس لیے اس آیت کا تعلق بلاریب قریش ہی سے ہے اور یہ سب حال کی نہیں ماضی کی داستان ہے۔ حال میں مسلمانوں کو اس لیے سنائی جارہی ہے کہ وہ مستقبل میں حالات کا ہر طرح سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوجائیں کیونکہ۔

اولاً تمام مشرک قبائل کو بیک وقت معاہدات کی منسوخی کا نوٹس دیا جاچکا ہے پھر مشرکین کے لیے حج کی بندش کعبہ کی تولیت میں تغیر اور رسوم جاہلیت کا کلی انسداد کا مطلب یہ تھا کہ ایک بار سارا ملک مسلمانوں کے خلاف کوہ آتش فشاں ہوجائے اور مشرکین اپنا خون اپنے مفادات کی خاطر بہادینے کے لیے تیار ہوجائیں اور سارے قبائل مسلمانوں کے خلاف

ایک سنگین محاذ بنالیں۔

ثانیاً۔ حج کو صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دینے اور مشرکین پر کعبہ کا راستہ بند کر دینے کے معنے یہ تھے کہ ملک کی آبادی کا بیشتر حصہ کعبہ کی طرف اس نقل و حرکت سے باز آجائے جو صرف مذہبی حیثیت سے نہیں بلکہ معاشی حیثیت سے عرب کے لیے ایک غیر معمولی حیثیت رکھتی تھی۔ اور جس پر اس زمانے میں عرب کی معاشی حیثیت کا بہت بڑا انحصار تھا۔

ثالثاً جو لوگ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے ان کے لیے یہ معاملہ بڑی آزمائش کا تھا۔ کیونکہ ان کے بہت سے رشتہ دار ابھی تک کافروں کی صف میں تھے۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے سارے مفادات مشرکین سے وابستہ تھے۔

ان حالات میں قرآن نے اہل ایمان کو ترغیب دی کہ الا تقاتلون کیا تم ان لوگوں سے جنگ کرو گے اور ان کو پورے عرب سے ختم کرنے کے لیے قدم نہیں اٹھاؤ گے۔ بالفاظ دیگر اس ترغیب اور تحضیض کے معنی یہ ہیں۔ کہ مسلمانوں کو خود اپنے ہاتھوں اپنے اقارب اپنے خاندان، اپنی قوم اپنے ہموطنوں کو تہس نہس کرنے کی تیاری کا حکم ہو رہا ہے بلکہ آج کی زبان میں اتحاد کے سارے رشتوں، زبان، ملک، قوم اور پیشہ سب پر اسلام کے مقابلے میں ضرب کاری لگانے کا حکم دیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اسلام کے نظام حیات میں زبان، نسل، قوم، وطن اور پیشہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے یہاں امت بنتی ہے ایمان کے نام پر اور قدر و قیمت ہے یہاں اعمال و اخلاق کی۔ اور بس۔

ایمان کے حوالہ سے تنبیہ

اس کے بعد اہل ایمان کو ایمان کے حوالہ سے ایمان کے تقاضے پورے کرنے پر تنبیہ کی جا رہی ہے۔ ایمان زبان کے صرف دعویٰ کا نام نہیں ہے۔

حسن بصری کا ارشاد ہے۔

ایمان صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ کا نام نہیں اور نہ آرزوں اور تمناؤں کا نام ہے بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں گھر کر جائے اور اعمال اس کی تصدیق کریں۔ (کتاب الایمان حافظ ابن تیمیہ)

این شربت عاشقی ست خسرو
بے خون جگر چشید نتوان

آیت میں ان کنتم مومنین یہ بتانے کے لیے نہیں لایا گیا کہ قرآن کے مخاطبوں میں کمزور ایمان والے بھی موجود ہیں بلکہ اس لیے لایا گیا ہے کہ ایمان کے ساتھ ایمان کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ ان کو پہچانا جائے اور پھر ان کو پورا کیا جائے،

ایمان باللہ کا تقاضا یہ ہے کہ جنگ کے معاملے میں مستقبل کو شکوک نگاہوں سے نہ دیکھو یہ نہ سوچو کہ خاندان کا کیا بنے گا تم کیا کھاؤ گے اہل وطن کو کیا منہ دکھائیں گے ان سب اندیشوں سے بالا ہو کر صرف اللہ سے ڈرو۔ اور یہ ہو کہ اگر ایمان کے تقاضے پورے نہ کیے تو خدا کو کیا جواب دیں گے فرمایا کہ ان لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو جو ڈرنے کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔

خشیت کے ساتھ محبت کی تعلیم

قرآن نے خوف و خشیت کے ساتھ خدا کی محبت اور پیار کی بھی تعلیم دی ہے۔ انسان میں سارے کاموں کا دو بنیادی چیزوں سے پیدا ہوتا ہے خوف اور شوق یا خشیت اور محبت۔ یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ اور آگے پیچھے بھی۔ ان دونوں کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ دعویٰ محبت کا نتیجہ ناز، کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان و محبوب غایت اعتماد کی وجہ سے نافرمانی بھی۔ ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم کا مداوا صرف خوف سے ہو سکتا ہے اس لیے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہو سکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے بلکہ ان دونوں کے اشتراک امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور یہی قرآن کی تعلیم ہے۔ اسی لحاظ سے قرآن نے بندوں کے اللہ سے تعلقات دو گونہ بتائے ہیں۔ حاکمیت اور محبوبیت۔ حاکمیت کا تقاضا اگر اطاعت ہے تو محبت کا تقاضا عبادت ہے۔ اسی طرح اللہ سبحانہ نے اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان و رحیم بھی۔ وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور رحیم بھی۔ وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے۔ خفا بھی ہوتا ہے اور نوازش بھی کرتا ہے اس سے ہی ہمیں ڈرنا چاہیے۔ اور اس سے ہمیں محبت کرنی چاہیے اس سے زیادہ اور مزے دار بات یہ ہے کہ قرآن اللہ سے ڈراتا ہے مگر جبار قہار کہہ کر نہیں بلکہ رحمان و رحیم کہہ کر۔ چنانچہ خدا کے نیک بندوں کی صفت ہے۔

وخشی الرحمان بالغیب۔ من خشی الرحمان بالغیب۔

اس جگہ اگر ایمان کا تقاضا خشیت کو قرار دیا ہے تو دوسرے رکوع میں ایمان کا تقاضا اللہ کی محبت کو بتاتا ہے نرا خوف ایمان نہیں اور نری محبت بھی ایمان نہیں۔ ایمان تو شوق اور خوف کے مجموعہ کا نام ہے

پھر اس آیت میں ایمان کے حوالہ سے مسلمانوں کو تنبیہہ کی ہے کہ تمہیں اللہ سے زیادہ ڈرنا چاہیے۔ احق کا استعمال بتا رہا ہے کہ خوف تو اوروں کا بھی ہوتا ہے اور یہ ایک طبعی چیز ہے لیکن عقلاً اللہ کا خوف مسلمانوں کو زیادہ ہونا چاہیے۔

جہاد کی غرض و غایت

(۱۴) تم ان سے جنگ کرو اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دے گا اور تم کو ان پر غالب کرے گا۔ اہل ایمان کے دلوں کو

ٹھنڈا کرے گا اور ان کے دلوں کی جلن ختم کر دے گا اور جس پر چاہے گا اپنی رحمت سے رجوع کرے گا اور اللہ علم و دانائی والا ہے۔ اس آیت میں شریعت جہاد کی اصل حکمت پر متنبہ فرمایا ہے۔ قرآن حکیم میں اقوام ماضیہ کے جو قصے بیان ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم کفر و شرارت اور انبیاء کی تکذیب و عداوت میں حد سے بڑھ جاتی ہے تو قدرت کی طرف سے کوئی تباہ کن آسمانی عذاب ان پر نازل ہوتا ہے جس سے ان کے سارے مظالم اور کفریات کا دفعۃً خاتمہ ہو جاتا ہے۔

فکلا اخذنا بذنبہ فمنھم من ارسلنا علیہ حاصبا و منھم من اخذتہ الصیحۃ

و منھم من خسفنا بہ الارض و منھم من اغرقنا ۔

لہٰذا سب ہی کی ہم نے گرفت کی ہے کچھ تو وہ ہیں جن پر ہم نے تیز و تند ہوا روانہ کی، کچھ کو چیخ نے آپکڑا کچھ کو ہم نے زمین دوز کر دیا اور کچھ کو ہم نے پانی میں غرق کر دیا۔

کوئی شبہ نہیں کہ عذاب کی یہ اقسام بہت سخت مہلک اور آئندہ نسلوں کے لیے عبرتناک تھیں لیکن ان صورتوں میں معذبین کو دنیا میں رہ کر اپنی ذلت و رسوائی کا نظارہ نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہ آئندہ کے لیے توبہ و رجوع کا کوئی امکان باقی رہتا تھا۔ شریعت جہاد کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ مکذبین اور متعنتین کو حق تعالیٰ بجائے بلاواسطہ عذاب دینے کے اپنے مخلص وفادار بندوں کے ہاتھ سے سزا دلوائے۔ سزا دہی کی اس صورت میں مجرمین کی رسوائی اور مخلصین کی قدر افزائی زیادہ ہے وفادار بندوں کا نصرت و غلبہ علانیہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے دل یہ دیکھ کر ٹھنڈے ہوتے ہیں کہ جو لوگ کل تک انہیں حقیر و ناتوان سمجھ کر ظلم و ستم اور استہزاء و تمسخر کا تختہ مشق بنائے ہوئے تھے آج خدا کی تائید و رحمت سے انہی کے رحم و کرم یا عدل و انصاف پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ کفر و باطل کی شوکت و نمائش کو دیکھ کر جو اہل ایمان گھٹتے رہتے تھے یا جو ضعیف و مظلوم مسلمان کفار کے مظالم کا انتقام نہ لے سکنے کی وجہ سے دل ہی دل میں غیظ کھا کر چپ ہو رہتے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے ان کے قلوب تسکین پاتے تھے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ خود مجرمین کے حق میں بھی سزا دہی کا یہ طریقہ نسبتہً زیادہ نافع ہے کیوں کہ سزا پانے کے بعد رجوع و توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حالات سے عبرت حاصل کر کے بہت سے مجرموں کو توبہ نصیب ہو جائے چنانچہ حضور پر نور ﷺ کے زمانہ میں ایسا ہی ہوا کہ تھوڑے دنوں میں سارا عرب صدق دل سے اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا آخر میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ علیم و حکیم ہے یعنی ہر ایک کی حالت کو دیکھ کر حکمت کا معاملہ کرتا ہے اور ہر زمانے میں اس کے مناسب احکام بھیجتا ہے [1]

ان آیات میں روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے اور ان میں مسلمانوں کو حکم ہوا ہے کہ جن کا چہرہ آیات بالا میں تمہارے سامنے پیش کیا گیا ہے تم ان سے جنگ کرو۔ اس جنگ کے اغراض و مقاصد کیا ہیں یہ تو آپ خود قرآن کی زبان سے سنیں گے

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جس سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دنیا کے ہر وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقاء کا آرزو مند ہے۔ اور اس میدان میں اسلام اور صرف اسلام کفر کی لڑائی بناتا صرف یہ چاہتا ہوں کہ اسلام کا اولین مقصد حیات یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جس سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دنیا کے ہر وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقاء کا آرزو مند ہے۔ اور اس میدان میں اسلام اور صرف اسلام کفر کی لڑائی حریف ہے۔ کیونکہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کفر کی ضد ہے اسلام اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن ہے اور ان کی لڑائی بلا فصل قائم ہے کفر کی طاقتیں اسلام کے سفر ارتقاء میں مزاحم ہوتی ہیں لیکن ان کی مزاحمت حق و صداقت کی سعی کمال کا سبب بن جاتی ہے۔ جس طرح انسان کو اپنے خارجی ماحول کی مخالف قوتوں سے کشمکش کرنا پڑتی ہے اور یہی کشمکش اس کی قوتوں کو صیقل کرتی ہے جس سے بالآخر وہ اپنے ماحول پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام بھی کفر سے جنگ آزما ہو کر اپنے قوی کو مضبوط اور اپنی داخلی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ کفر و اسلام کا یہ تصادم اور ان دونوں کی ازلی پیکار اسلام کی قوت حیات کی افزونی اور کفر کے ضعف او شکست پر منتہی ہوتی ہے اور اس پیکار کی وجہ سے اسلام اپنے اندرونی ارتقاء کے مراحل نسبتہ سہولت کے ساتھ طے کر سکتا ہے اس روشنی میں آپ اس آیت کا مطالعہ کریں تو آپ کو محسوس ہو گا قاتلوا کے ذریعے مسلمانوں کو قتال کا حکم دینے کے راز قتال کی جو اغراض و غایات بتائی ہیں اور اس کی جیتی جاگتی مثالیں دی ہیں قرآن نے اس آیت میں چھ باتیں فرمائی ہیں۔

۱۔ یعذبھم اللہ بایدیکم اللہ سبحانہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دے گا۔ اس میں اشارہ ہے اس سنت الٰہی کی طرف کہ جو قوم تکذیب پر اڑ جاتی ہے۔ رسول کی ہجرت کے بعد اس پر لازماً عذاب آتا ہے۔ اسی دستور کے مطابق عذاب کے نازل ہونے سے پہلے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔

۱۔ مومنین کی جماعت کے ساتھ حضور اقدس ﷺ کی مکہ سے ہجرت۔

۲۔ ہجرت سے پہلے ہدایت کی کسی آخری نشانی کا ظاہر ہوتا۔

چنانچہ ہجرت سے پہلے شق قمر کا معجزہ ظاہر ہوا اس کو دیکھ کر بھی جب قریش کے روسا ایمان نہ لائے تو حضور اقدس ﷺ کو مکہ سے ہجرت کا حکم ہوا اور ہلاکت کے عذاب نازل ہونے کا وقت قریب آ گیا۔ یہاں وھموا باخراج الرسول میں اسی طرف اشارہ ہے۔ صحابہ کرام میں جو اسرار نبوت کے محرم تھے وہ پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ یہ ہجرت قریش کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ مستدرک حاکم اور مسند امام احمد میں ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ مکہ سے نکلے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اِنّا لِلّٰہِ مکہ والوں نے اپنے پیغمبر کو نکال دیا اب ضرور ہلاک ہوں گے اسی عذاب ہلاکت کا آغاز یوم بدر سے ہوا ہے قرآن نے اسے البطشۃ الکبریٰ کہا ہے۔

عذاب دو طرح آتا ہے ایک میں اللہ سبحانہ کی شان قدرت کا اظہار ہوتا ہے دوسرے میں اللہ سبحانہ کی شان حکیمی کی نمائش ہوتی ہے اس آیت میں جس عذاب کی بات ہو رہی ہے اس کا تعلق اللہ سبحانہ کی شان حکیمی سے ہے اس لیے آیت کا انجام بجائے واللہ علی کل شیئ قدیر کے واللہ علیم حکیم ہوا۔ اگر زمینی، فضائی یا آسمانی عذاب ہوتا تو

اللہ کی قدرت ہوتی جیسا کہ دوسرے انبیاء کی امتوں میں ہوا ہے لیکن اب دورِ نبوت محمدیہ میں شانِ حکمت کا مظاہرہ ہوا اس طرح کے عذاب کا فائدہ، جیسا کہ شیخ الاسلام نے اشارا کیا ہے یہ ہے کہ معذبین کے لیے عذاب کا یہ انداز نسبتاً زیادہ نافع ہے کیونکہ سزا پانے کے بعد توبہ و انابت کا دروازہ کھلا رہتا ہے حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے دور میں عذاب کا اظہار قدرت تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی اے خدا زمین پر کوئی بسنے والا کافر نہ چھوڑ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی خداوندا ان کے دل سخت کر دے جب تک عذاب دیکھ لیں گے ایمان نہ لائیں۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو اس وقت دعا نکلی وہ یہ تھی خداوندا اپنا وعدہ پورا کر اگر یہ مٹھی بھر مسلمان تباہ ہو گئے تو تیرا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے اپنی اپنی قوم کی تباہی کی دعا مانگی جبکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اہلِ ایمان کی کامیابی اور فتح و نصرت کی دعا مانگی دشمنوں کی تباہی کی نہیں۔

آیت کا مطلب ہے کہ اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے کر شانِ حکمی کا اظہار فرمائے گا۔

۲۔ ویخزھم دوسری بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہ ان کو رسوا کرے گا یعنی ان کو تمہارے ہاتھوں قیدی بنا کر ذلیل و رسوا کرے گا اور جو قید نہیں ہوئے مقہور و مغلوب ہوں گے۔ یہ رسوائی بھی اسی عذاب کا ایک حصہ ہے کیونکہ تکذیبِ رسول کا باعث ان کی چودھراہٹ اور بڑائی تھی اور بڑائی کی سزا رسوائی ہے۔

۳۔ وینصرکم علیھم۔ اللہ تمہاری مدد کر کے تمہیں فتح مند کرے گا یعنی تمہیں کفر کے مقابلے میں غلبہ عطا فرمائے گا۔ تمام لڑائیوں میں اہلِ ایمان کی کامیابی کا راز اللہ کی مدد اور نصرت رہی ہے غزوہ بدر، غزوہ حنین میں اللہ کی نصرت چونکہ سامنے نظر آرہی تھی اس لیے قرآن نے دونوں جگہوں کی خاص طور پر نشاندہی کی ہے۔ لقد نصرکم اللہ ببدر اور لقد نصرکم اللہ فی مواطن کثیرۃ ویوم حنین۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی راہ میں محنت کرنے والوں کی اللہ سبحانہ مدد فرماتے ہیں قرآن نے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اللہ سے نصرت مانگیں اور فانصرنا علی القوم الکافرین۔ کہیں۔ دراصل نبوت جو مشن لے کر آتی ہے خواہ کس قدر مشکلات پیش آئیں۔ کتنی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفیں ہوں۔ بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ خود اس پر گواہ صادق ہے یہ نصرت نہ صرف اس دنیا میں بلکہ میدانِ حشر میں بھی ہوگی۔

انا لننصر رسلنا والذین امنوا فی الحیاۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد۔

اللہ سبحانہ کی اس تائید و نصرت پر یقین اس درجہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں برداشت کر لیتے ہیں۔ اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں مخالفوں کی فوج و لشکر تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود وہ اپنی دعوت اور اپنے مشن سے باز نہیں آتے ہیں اور کسی دام پر مخالفوں سے دعوت سے دست بردار ہو کر صلح نہیں کرتے ہیں۔ اہلِ کفر کو شروع شروع

میں اہلِ ایمان کی ظاہری بیچارگی اور تنہائی کو دیکھ کر ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے لیکن اللہ سبحانہ نے اس گمان بد کی تردید کر کے فرمایا ہے۔ فلا تحسبن اللہ مخلف وعدہ رسلہ۔ روز ازل سے ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ حق کی منادی کرنے والوں کی ہی فتح ہوگی۔

۴۔ ویشف صدور قوم مومنین۔ مومنوں کے دلوں میں اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کے جتنے دکھ ہیں وہ سب اچھے ہو جائیں گے اور ان کو اس بیماری سے شفا حاصل ہوگی۔ مسلمان بے بس اور بے کس ہونے کی وجہ سے قریش کے تیر زن اور سنگ دلوں کے ہاتھوں مکہ میں سنگ دلانہ مظالم کا نشانہ بنے ہوئے تھے فرمایا کہ اللہ سبحانہ اس طرح ان اہلِ ایمان کے کلیجے ٹھنڈے کرے گا جو اسلام لانے کے جرم میں ان ظالموں کے ہاتھوں ستائے گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعداء دین کی مغلوبیت پر خوش ہونا امر طبعی بلکہ محمود ہے۔ خاص کر ان لوگوں کے لیے جو ان پر حق کی حجت پوری کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔

۵۔ ویذھب غیظ قلوبھم۔ ان کے دلوں کی جلن دور ہو جائے گی مشرکین کی عہد شکنی اور ان کے مظالم سے جو اہلِ ایمان کے دلوں میں جلن اور گھٹن ہو رہی تھی وہ سب ختم ہو جائے گی۔

حیرت ہے کہ بعض شارحین قرآن کو شفاء صدور اور اذہاب غیظ قلوب میں تکرار محسوس ہوا۔ حالانکہ دونوں کا منشاء الگ الگ ہے شفاء ہوئی ہے اسلام کی برتری دیکھ کر اور گھٹن دور ہوئی ہے ان کی مقہوری اور مغلوبیت دیکھ کر۔

۶۔ ویتوب اللہ علیٰ من یشاء جنہیں توبہ ملنی ہے وہ تائب ہوں یعنی اللہ تعالیٰ ان کو حلقہ بگوش اسلام فرمائے گا۔ اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ کچھ لوگوں کو توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے گی۔ غالباً اس بات کو بالکل آخر میں اس لیے لایا گیا ہے کہ شروع میں لانے سے ایک طرف تو اہلِ ایمان کی تیاری جنگ ہلکی پڑ جاتی اور دوسری طرف مشرکین کے لیے دھمکی کا پہلو ہلکا پڑ جاتا۔ جس نے پوری سنجیدگی سے اپنی پوزیشن کی نزاکت پر غور کرنے اور بالآخر اسلام کے حلقہ بگوش ہونے پر آمادہ کیا۔

یہ ایک قسم کی خوشخبری ہے ان مسلمانوں کے لیے جو اپنے عزیزوں قریبوں کے ایمان کے آرزو مند تھے۔

قرآن نے اس آیت میں جن چھ باتوں کا ذکر کیا ہے حرف بحرف پوری ہوئیں۔ مشرکین عرب کی ہستی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ ان ہی مسلمانوں کے ہاتھوں جو ۱۳ برس تک ان کے مظالم سہتے رہے تھے ان کی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کی رسوائی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ تاریخ کے صفحات میں اس کو بقاء دوام مل گیا۔ اور پھر مسلمانوں کے دلوں کی مظلومیت و بیچارگی کے سارے دکھوں کو کیسی شفاء کامل مل کر پچیس برس کے اندر وہ کرہ زمین کی سب سے اشرف اور بہتر مخلوق ہو گئے آپ مانیں یا نہ مانیں یہ امر واقعہ ہے کہ ان مردان کار کی محنتوں جانبازیوں اور اس پر اللہ کی مدد سے جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے۔

۱۔ مدینہ منورہ کی شہری مملکت حضور اقدس ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں روزانہ دو سو چوہتر میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی رہی۔

دس سال بعد جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی تو دس لاکھ سے بھی زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیر اقتدار آچکا تھا۔

۲- پھر تقریباً برِاعظم ہندوستان و پاکستان کے برابر وسیع علاقہ بھی فتح کیا جس میں تقریباً ملیون کی آبادی تھی۔ دشمن کے بمشکل ۱۵۰ آدمی قتل ہوئے مسلمان فوج کا مشکل سے اس دس سال میں ماہانہ ایک سپاہی شہید ہوتا رہا۔

میں ان اعداد کا معاملہ تو سمجھ نہیں سکا۔ بعض اعداد معلوم نہیں۔ لیکن جو معلوم ہیں ان کو جمع کرلیا جائے تو یقیناً ۱۵۰ سے زائد ہوں گے اور یہ کہنا غالباً قرینِ صحت نہیں ہے کہ دس سال تک ہر مہینے میں مسلمانوں کا صرف ایک سپاہی شہید ہوتا رہا یعنی تمام جنگوں میں صرف ۱۲۰ مسلمان شہید ہوئے۔

اعداد سے اختلاف کے باوجود ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد کی تائید میں ایک لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں ہو سکتا ہے کہ دس سال کے عرصہ میں دس لاکھ مربع میل کا رقبہ نبوت کے زیرِ اقتدار آچکا تھا۔ لوگ معجزات کا انکار کرتے ہیں اس سے زیادہ پُرتاثیر اور یقینی طور پر ناقابلِ انکار معجزہ کونسا ہو سکتا ہے۔

یہ تو ہوئی يعذبهم الله بايديكم ويخزهم وينصركم عليهم کی زندہ و جاوید عملی تفسیر۔ باقی ويتوب الله على من يشاء۔ کو واقعہ کی صورت میں آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو اس کا سرسری اندازہ یوں کر سکتے ہیں۔ کہ بدر میں حضور اقدس ﷺ کے ساتھ مہاجرین و انصار میں جان نثاروں کی تعداد تین سو سے کسی قدر زیادہ تھی۔ احد میں یہ تعداد ۷۰۰ سو تھی۔ خندق میں تین ہزار حدیبیہ کے موقعہ پر صرف عمرہ ادا کرنا تھا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۱۴۰۰ تھی۔ عمرۃ القضاء کے وقت دو ہزار اور فتح مکہ کے موقعہ پر دس ہزار اور تبوک میں تیس ہزار تھی۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ عام عربوں کے لیے قبولِ اسلام میں سب سے بڑی رکاوٹ قریش مکہ کے شدید رویہ کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ صحیح بخاری میں ہے۔

> عرب اسلام لانے میں فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی قوم کو باہم فیصلہ کرلینے دو اگر حضور اقدس ﷺ قوم پر غالب آگئے، تو بلاشبہ واضح ہو جائے گا کہ وہ سچے نبی ہیں چنانچہ جب فتح مکہ کا واقعہ پیش آگیا تو عرب کی ہر قوم نے اسلام قبول کرلینے میں جلدی کی۔

عام عربوں میں قریش کو انتہائی رسوخ حاصل تھا۔ تولیتِ کعبہ نے ان میں خاص نوع کا تقدس پیدا کر دیا تھا۔ عرب پشتوں سے ان کی مذہبی قیادت کے معتقد چلے آرہے تھے اور عام معاملات میں بھی ان ہی کو منصبِ قیادت کا حامل سمجھتے تھے فتح مکہ نے یہ سب سے بڑی رکاوٹ درہم برہم کر ڈالی تھی اور جس سیاہ پردہ نے اسلام کی آسمانی روشنی کو عام نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا وہ تار تار ہو گیا۔ غرض فتح مکہ کے بعد عرب کی تمام چھوٹی قوتوں یا قبیلوں اور گروہوں پر آشکارا ہو چکا تھا کہ اب ان کا مستقبل اسلام سے وابستہ ہو چکا ہے لہٰذا ان سب کے لیے صرف دو راستے رہ گئے تھے۔

۱۔ قبولِ اسلام اور اس کے تمام اوامر و نواہی کی پابندی۔

۲- مرکزی اسلامی قوت سے مصالحت اور اس کی حفاظت پر انحصار۔

چنانچہ تمام گروہوں کے نمائندے یا تو اسلام قبول کر کے بارگاہِ رسالت میں آئے اور یا مدینہ پہنچ کر اسلام قبول کر لیا۔

یہ ہے یتوب اللہ علیٰ من یشاء۔

ایمان کی کسوٹی جہاد ہے

(۱۵) کیا تم نے خیال کر لیا ہے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ حالانکہ ابھی تو اللہ کو جاننا ہے تم میں سے ان کو جنھوں نے جہاد کیا ہے اور ان کو جنھوں نے اللہ کے رسول اور اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کسی کو اپنا راز دار نہیں بنایا ہے۔ یاد رکھو تمہارے اعمال جو کچھ بھی ہیں اللہ ان سے باخبر ہے۔ مشروعیت جہاد کی یہاں ایک اور حکمت بیان ہوئی یعنی ایمان اور بندگی کے زبانی دعوے کرنے والے تو بہت ہیں لیکن امتحان کی کسوٹی پر جب تک کسا نہ جائے کھرا اور کھوٹا ظاہر نہیں ہوتا۔ جہاد کے ذریعے سے اللہ سبحانہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کتنے مسلمان ہیں جو اس کی راہ میں جان اور مال نثار کرنے کو تیار ہیں۔ اور خدا اور رسول اور مسلمانوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار یا خصوصی دوست بنانا نہیں چاہتے۔ خواہ وہ ان کا کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ یہ معیار ہے جس پر مومنین کا ایمان پرکھا جاتا ہے۔ جب تک عملی جہاد نہ ہو صرف زبانی جمع خرچ سے کامیابی حاصل نہیں ہوتی ہے۔ پھر عمل بھی جو کچھ کیا جائے اس کی خبر خدا کو ہے کہ صدق و اخلاص سے کیا یا نمود و ریا سے جیسا عمل ہوگا ادھر سے اسی کے موافق پھل ملے گا[۱] یہ سارے مسلمانوں سے خطاب ہے کہ یہ اعلان ایک کسوٹی ہے جو تمہارے کھوٹے اور کھرے میں امتیاز کر دے گی کہ کون لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور ایسے بے لاگ ہیں کہ انہیں اللہ اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کسی کی دوستی اور قرابت کی کوئی پروا نہیں ہے اور کون لوگ دوسروں کی خاطر اللہ و رسول اور اہلِ ایمان کو نظر انداز کرنے والے ہیں۔

یہ امتحان اللہ کی حکومت کا ایک دستوری ضابطہ ہے جس سے ایمان کا دعوی کرنے والوں کو لازماً گذرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالی ہر ایک کے اعمال سے باخبر ہے لیکن اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ امتحان کی کسوٹی پر پرکھ کر کھرے اور کھوٹے کو نمایاں کرتا ہے۔ اور اہل ایمان کی تطہیر کرتا رہتا ہے۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ دعوی ایمان کر کے یوں ہی چھوڑ دیئے جاؤ گے تو یہ خیال صحیح نہیں ہے۔

اس آیت میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہو رہا ہے کہ اللہ، اللہ کے رسول اور صحابہ کرام سے وفاداری میں کوئی تقسیم نہیں ہے یہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری میں لازم و ملزوم ہیں جس طرح خدا کے رسول سے وفاداری نہ کرنے والا خدا کا وفادار نہیں ہو سکتا اسی طرح رسول کے صحابہ سے وفاداری نہ کرنے والا خدا اور اس کے رسول کا کبھی وفادار نہیں ہو سکتا اور یہ بھی اس پوری قوت کے ساتھ معلوم ہو رہا ہے کہ اگر کوئی شخص اہلِ ایمان کے مقابلے میں کسی اور کو اپنا دوست اور معتمد بناتا ہے تو وہ صرف مسلمانوں کا

[۱] افادات شیخ الاسلام

نہیں بلکہ خدا اور رسول کا بھی وفادار نہیں ہے اگرچہ دعوی میں کتنی ہی بلند آہنگی کا اظہار کرے۔

اس آیت میں دو باتوں کو بطور ایمان کی کسوٹی کے پیش کیا گیا ہے

ایک اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔

دوسرے مسلمانوں کو چھوڑ کر غیر مسلموں کو معتمد اور رازدار نہ بنانا۔

دونوں ہی باتیں اسلامی زندگی کی بنیادی باتیں ہیں۔ دونوں کا تعلق اسلامی زندگی سے اساسی ہے۔ اگر یہ ایک مومن کا مقصد حیات ہے اور ایمان کے نام پر امت اگر اس لیے وجود میں لائی گئی ہے کہ وہ دنیا کے سامنے حق کی شہادت پیش کرے تو اس عبادت سے بڑی عبادت اور اس شہادت سے اونچی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے جو اپنی جان دے کر انجام دی گئی ہو۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ کی یہ سب سے بڑی عبادت اور حق کی یہ سب سے اونچی شہادت ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسلمان کے وجود کا جو مقصد ہے جہاد اس مقصد کی انجام دہی کی سب سے معیاری کوشش ہے۔ اور جس وقت وہ اس جہاد میں اپنی جان کو بھی قربان کر دیتا ہے اس وقت اللہ کی بندگی اور حق کی شہادت کی آخری منزل اس کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے کیونکہ کسی مقصد یا فرض کی خاطر اپنی جان تک کو قربان کر دینا یقینی طور پر اس کا حق کو ادا کر دینا ہے اور فی الواقع ایسا ہی شخص اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اسے اس مقصد کا حقیقی علمبردار اور اس فرض کا سب سے سچا خادم کہا جائے اور یہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس راہ میں لگنے والے ان تمام کانٹوں سے دامان ایمان کو محفوظ نہ کرے جو کسی درجہ میں بھی رکاوٹ بن سکتے ہیں اسی لیے ان دو باتوں کو ایمان کی کسوٹی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

آنکس کو ترا بخواست جاں را چہ کند　　　فرزند و عیال و خاناں را چہ کند

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَن يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ
شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنفُسِهِم بِالْكُفْرِ ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ
وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ﴿١٧﴾ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ
آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ
وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ ۖ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَن يَكُونُوا مِنَ
الْمُهْتَدِينَ ﴿١٨﴾

اللہ کی مسجدوں کی آبادکاری ان مشرکوں کا کام نہیں ہے جو اپنے بارے میں کفر کا اعتراف کر رہے ہوں یہی لوگ ہیں جن کے اعمال حرف غلط ہو کر رہ گئے اور ان کو دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے۔ مساجد کے آبادکار تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت والے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہ ڈریں ان ہی سے ہدایت یافتہ ہونے کی امید ہے۔

معانی مفردات

ان یعمروا یہ مضارع منصوب کا جمع مذکر غائب ہے۔ عمارۃ کے معنے لغت میں مسجد میں عبادت کے لیے یا خدمت کے لیے قیام کرنے کے ہیں۔ گھر کے ساکن کو عامر کہتے ہیں جمع عمار آتی ہے۔ عمر الرجل اللہ بولا جاتا ہے آدمی نے اللہ کی عبادت کی۔ عمارہ بالکسر مکان کی آبادکاری کا ذریعہ۔ عمارۃ بالضم آبادکاری کی اجرت۔ اسی سے حج میں عمرہ ہے اللہ کی طاعت امام راغب فرماتے ہیں عمارت بربادی کی ضد ہے اور انما یعمر میں یہ لفظ عمارت کی نگرانی کے معنے میں ہے یا عمرہ بمعنے زیارت سے ہے یا بمعنے اقامت سے ہے۔ اسی سے اعتمار و تعمیر آتے ہیں۔

اور البقرہ میں پڑھ آئے ہو کہ حضرت ابراہیمؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کے موقعہ پر دو دعائیں کی تھیں۔ ایک دعا یہ تھی کہ اے اللہ ایسا پیغمبر روانہ فرما جو ان کے سامنے تیری آیات تلاوت کرے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرے۔ دوسری دعا یہ تھی کہ اے اللہ ہماری اولاد میں سے ایک امت مسلمہ پیدا فرما۔ یہ دونوں دعائیں کعبہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیم و اسماعیل نے اللہ کی بارگاہ عالی میں پیش کیں جو حال اور قال اجابت دعا کے لیے سازگار تھے۔ حال یہ تھا کہ دونوں اللہ کا گھر بنا رہے ہیں۔ محنت کر رہے ہیں تپتی دھوپ میں پسینہ سے شرابور ہیں اور زبان پر دونوں دعائیں اخلاص سے کہ خدا ہماری ذریت میں سے ایک امت مسلمہ پیدا فرما اور ان میں ایک عظیم المرتبت پیغمبر روانہ فرما جو ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ اللہ سبحانہ نے ان کی دعاؤں کو شرف قبول بخشا حضور اقدس ﷺ تشریف لائے اور امت مسلمہ وجود میں آئی۔ مشرکین مکہ نے نبوت سے مزاحمت کی اور آپ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ مسلمانوں کی زندگی اجیرن بنا دی۔ بالآخر ان کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے ہجرت عمل میں آئی۔ مکہ چھوڑ کر مدینہ آ گئے لیکن مخالفین نے یہاں بھی ایک آن چین نہ لینے دیا۔ خود بھی برسرپیکار رہے۔ دوسروں کو بھی سازشوں کے ذریعے ورغلاتے رہے۔ اہل ایمان نے جوابی کارروائی کی۔ اور بالآخر اللہ کی مدد سے وہ دن آ گیا کہ مکہ فتح ہو گیا توحید کا بول بالا ہوا شرک کا منہ کالا ہوا —— مکہ فتح ہونے کے بعد ضروری ہوا کہ بیت اللہ کی مشرکانہ عبادات سے تطہیر کی جائے۔ جس سال آپ نے مشرکین کے تمام عہدوں کے ختم ہونے کا اعلان کیا اسی سال یعنی ۹ھ میں یہ بھی اعلان کیا کہ آئندہ سال سے کوئی مشرک مشرکانہ عبادت مسجد حرام میں نہ کر سکے گا۔ حضرت علیؓ اور ان کے ساتھی یوم النحر میں جگہ جگہ خیمہ خیمہ اور گھر گھر منادی کر رہے تھے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے گا کوئی برہنہ طواف نہ کرے گا معاہدوں کے لیے چار ماہ کی مہلت اور مشرکین کو مسجد حرام میں عبادت سے روکنے کے لیے سال بھر کی مہلت دی گئی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

ایک یہ کہ معاہدین میں کچھ وہ بھی تھے جن کے معاہدے میں یہ دفعہ موجود تھی کہ فریقین میں سے کوئی دوسرے کو مسجد حرام سے نہیں روکے گا۔ عہد کی پاسداری کی اسلام میں بے حد اہمیت ہے اس لیے ضروری ہوا کہ اتنا وقت ان کو ملے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ غیر معاہدین کو مسجد حرام سے روکنا سنہ ۹ھ میں بغیر قتال کے ممکن نہ تھا کیونکہ لوگ لازماً پرانی ریت کی وجہ سے حج کو ضرور کرتے۔ قتال کی صورت میں دو قباحتیں ظاہر ہو جاتیں ایک یہ کہ معاہد اور غیر معاہد کی تمیز نہ ہوتی دوسری یہ کہ حرم میں قتال کرنا پڑتا۔ اس لیے پورے ایک سال کی مدت رکھی تاکہ سب کو یکساں طور پر علم ہو جائے۔ ان آیات میں اسی ممانعت کا تذکرہ ہو رہا ہے۔

(۱۶) اللہ کی مسجدوں کی آبادکاری ان مشرکوں کا کام نہیں ہے جو اپنے بارے میں کفر کا اعتراف کر رہے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال حرف غلط ہو کر رہ گئے۔ اور ان کو دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے۔ مشرکین مکہ بڑے فخر سے کہتے تھے کہ ہم مسجد حرام کے متولی اور

خادم ہیں۔ ہگران کی بڑی خدمت گذاری یہ تھی کہ پتھر کی سینکڑوں مورتیاں کعبہ میں رکھ چھوڑی تھیں ان ہی کی نذر و نیاز کرتے اور منتیں مانتے تھے بہت سے لوگ ننگے طواف کرتے تھے۔ ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں بجاتے تھے اور خدائے واحد کے سچے پرستاروں کو وہاں تک پہنچنے کی اجازت نہ دیتے تھے لے دے کر ان کی بڑی عبادت یہ تھی کہ حاجیوں کے لیے پانی کی سبیل لگا دی یا حرم شریف میں چراغ جلا دیا یا کعبہ پر غلاف چڑھا دیا اور کبھی ضرورت ہوئی تو شکست و ریخت کا انتظام کر دیا مگر یہ اعمال محض بے روح تھے کیونکہ مشرک کو جب خدا کی صحیح معرفت حاصل نہیں تو کسی عمل میں اس کا قبلہ توجہ اور مرکز اخلاص خدائے وحدہ لاشریک کی ذات منبع الکمالات نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے کافر کا کوئی عمل خدا کے نزدیک قابل قبول عمل نہیں اسی کو حبطت اعمالھم سے تعبیر فرمایا۔ الغرض کفار و مشرکین جو اپنے حال و قال سے اپنے کفر و شرک پر ہر وقت شہادت دیتے ہیں اس لائق نہیں کہ ان سے مساجد اور خصوصاً مسجد حرام کی حقیقی تعمیر و آبادی ہو سکے[1]

اس آیت میں معاہدین کے معاہدے ختم کرنے کے بعد قریش مکہ کی مسجد حرام سے تولیت کے ختم ہونے کا اعلان ہو رہا ہے فرمایا کہ اصلاً یہ پرستاران توحید کی عبادت گاہ تھی اور ان کے لیے ہی بنائی گئی تھی اب آئندہ بھی ان کے لیے مخصوص رہے گی۔ مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے مشرکانہ اعمال سے اور رسوم سے اسے ملوث کریں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ ۹ھ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جن امور کا اعلان عام کیا تھا ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ آئندہ سال سے کوئی مشرک خانہ کعبہ میں قدم نہ رکھ سکے گا۔ اسی حکم کی یہ تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن مساجد کی خدائے واحد کی عبادت کے لیے روز اول ہی سے تاسیس عمل میں آئی ہے اس کے متولی مجاور خادم اور آباد کار وہ لوگ ہرگز نہیں ہو سکتے جو خدا کے ساتھ خداوندی صفات حقوق اور اختیارات میں دوسروں کو شریک کرتے ہوں اور طرہ یہ کہ وہ اب بھی کفر ہی کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اور وہ علی رؤس الاشہاد اعلان کر چکے ہوں کہ ہم اپنی بندگی و پرستش کو ایک خدا کے لیے خاص کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر ان کا کیا حق ہے کہ کسی ایسی عبادت گاہ کے متولی بنے رہیں جو صرف اللہ سبحانہ کی عبادت کے لیے بنائی گئی ہے۔

اس سے پہلی آیات میں بھی ان کے جرائم کی فہرست پیش کر کے بتایا گیا تھا کہ یہ اس لائق ہیں کہ ان سے نہ صرف اعلان برأت کیا جائے بلکہ اعلان جنگ کیا جائے۔ اب تولیت بیت اللہ سے ان کے ہٹانے کا اعلان ہو رہا ہے۔ اور فرمایا جا رہا ہے۔ ما کان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللہ آیت میں مشرکین کا لفظ اگرچہ عام ہے مگر مقصود اس سے قریش ہیں۔ اگرچہ اس کے مدلول میں ہر وہ شخص جس میں شرک کا وصف پایا جاتا ہو داخل ہے اور اسی عموم کی خاطر اس وصف کے ذریعے مشرکین مکہ کا ذکر کیا ہے یعنی یہ صرف مشرکین مکہ ہی کا نہیں بلکہ کسی بھی مشرک کا حق نہیں ہے کہ ان یعمروا آباد کاری کریں عمارت کے لغت میں معنے آباد کاری کے ہیں لیکن آباد کاری ہو نہیں سکتی جب تک پہلے بناوٹ نہ ہو اس لیے عمارت کا منطوق اگر آباد کاری ہے تو اس کا

[1] افادات شیخ الاسلام

دول مساجد کا بنانا ہے۔ اس لیے مشرکین کو نہ مساجد کی آبادکاری کا حق ہے اور نہ مساجد بنانے کا۔ آبادکاری کا تو اس لیے کہ وہ مساجد کو اعمال شرکیہ اور رسوم کفریہ سے ملوث کریں گے اور بنانا اس لیے کہ مسجد بنانا ان کے یہاں قربات میں سے کوئی قربت نہیں اس لیے ان کی بنائی ہوئی مسجد، مسجد نہیں۔ ہاں بنانے کی ایک صورت ہے کہ وہ مسلمان کو ہبہ کر دیں پھر مسلمان اسے وقف کر دیں۔

مساجد کو جمع لایا گیا ہے۔ اصلاً مقصود تو مسجد حرام ہے مگر جمع لا کر اشارہ فرما دیا ہے کہ اعمال شرکیہ اور رسوم کی ادائیگی میں روئے زمین کی ساری مساجد کا حکم یہی ہے کہ نہ مشرکین ان میں اپنی رسوم اور عبادت مشرکانہ ادا کر سکتے ہیں اور نہ ان کو بنا سکتے ہیں۔

آیت کا مطلب ہے کہ مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مسجد حرام کے جو تمام مسجدوں کا مرکز اور قبلہ ہے، متولی بنے رہیں۔

شاھدین علی انفسھم بالکفر جبکہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں۔ کفر سے یہاں ان کی مشرکانہ زندگی ہے۔ یہاں شرک کو کفر سے تعبیر کر کے اشارہ کر دیا ہے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا نہ ماننے کے ہم معنے ہے۔ اللہ سبحانہ کو ماننا صرف وہ معتبر ہے جو توحید عبادت کے ساتھ ہو۔ اگر آپ شرک کرتے ہوئے آپ خدا کو مانتے ہیں تو قرآن کی نظر میں یہ ماننا نہیں ہے۔

مشرکین یہ دو متضاد چیزیں اپنے دامن میں جمع کیے ہوئے تھے ایک طرف مسجد حرام کی عمارت اور دوسری طرف شرک کی نجاست فرمایا ان دو باتوں کو جمع کرنا ان کو زیب نہیں دیتا۔ اور کچھ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ اس فقرے میں نفی کا مرجع متعید ہے اور مطلب ہے کہ ان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ شرک کی آلودگی رکھتے ہوئے بیت اللہ کی تولیت پر گھمنڈ اور فخر کریں ان کو نشہ تھا کہ ہم بیت اللہ کے مجاور ہیں چنانچہ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قید ہو کر آئے ان پر مسلمانوں نے شرک قطع رحمی کی پھبتی کسی بلکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ترش اور سخت لب و لہجہ میں یہ بات کہی۔ تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آگے سے جواباً کہا کہ ہماری خوبیوں پر پردہ ڈالتے ہو اور ہماری برائیوں کو اچھالتے ہو۔ ہم مسجد حرام کے آبادکار ہیں کعبہ کے نگران ہیں۔ حاجیوں کے مہمان نواز ہیں۔ قیدیوں کو رہا کراتے ہیں۔ شرک کے ساتھ ان کو ان نیکیوں پر فخر تھا۔ قرآن نے ان کے اسی سرمایہ افتخار پر یہاں ضرب لگائی ہے اولئك حبطت اعمالھم ان کے یہ اعمال شرک کی نجاست کی وجہ سے رائیگاں اور بیکار ہو گئے۔ شرک اتنا بڑا جرم ہے۔ کہ اس کے ساتھ کوئی نیکی نیکی نہیں ہے۔ نیکی کی قدر و قیمت تو صرف توحید سے پڑتی ہے خدا کے یہاں صرف وہ نیکی قبول ہوتی ہے جو توحید کی زمین پر ہو۔ جس طرح ایک عورت کا اپنے شوہر کے ساتھ سارا چاؤ پیار بیکار ہے جبکہ اس کا شوہر کے سوا کسی اور سے بھی تعلق ہو ٹھیک اسی طرح بندہ کی ساری نیکیاں بیکار ہیں جب وہ اپنے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرا رہا ہو۔

آخر میں فرمایا وفی النار ھم خالدون یعنی ان اعمال کے سبب ان کو دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ شرک کی وجہ سے نیکیاں بھی گناہ کی صورت اختیار کر لیں گی۔

آیت قرآن کا اصل مقصود مشرکین مکہ کی تولیت کا خاتمہ ہے یہ بات کہ مشرکین کا مسجد حرام میں داخلہ ہو سکتا ہے یا نہیں اس کا

ذکر آگے آرہا ہے یہاں تو تقابلی مطالعہ کے طور پر یہ بات پوری قوت سے واضح کی جارہی ہے کہ مسجد حرام کی تولیت کا حقدار کون ہے اور کون نہیں۔ پہلے منفی پہلو واضح کیا ہے کہ یہ منصب مشرکین کے لیے نہیں۔ پھر اس کی بنیادی وجہ بیان فرمائی ہے اور ساتھ ہی اس زمانے کی رواجی نیکیوں کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ان کی یہ خدمات بالکل بے حقیقت اور بے وزن ہیں۔ ان کی بنیاد ہرگز اس کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ ان کو تولیت دی جائے۔ کوئی نیکی اس وقت قابلِ اعتبار ہوتی ہے جب وہ اصل مقصود سے وفاداری کے ساتھ ہو۔ اگر اصل مقصد برباد ہو جائے تو کوئی جزوی نیکی اصل مقصد کی نیابت نہیں کر سکتی۔ ایک مسجد کا متولی اگر مسجد کو بت خانہ بنائے تو صرف اس بنا پر اس کو متولی نہیں بنایا جا سکتا کہ اس نے مسجد میں پانی اور لوٹوں کا انتظام کیا ہے۔ مسجد میں پانی اور لوٹوں کا انتظام بجائے خود نیکی ہے لیکن ایسی نیکی نہیں کہ اس کی خاطر کسی کے اس حق کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ مسجد کو بت خانہ بنائے رکھے اور اس کی زمامِ تولیت اس کے ہاتھ میں رہے۔

اس مقصد کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن کی یہ آیت آئی ہے اس کے سوا دوسری باتیں اس کا منطوق نہیں بلکہ مدلول ہیں منطوق کی حد تک بات قطعی ہے لیکن مدلول تو بہر حال ہماری سمجھ ہے۔ امام رازی نے تفسیر میں ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں آیت قرآنی کے مدلول سے متعدد مسائل نکالے ہیں اور لوگوں کے سامنے پیش کیے ہیں جن کا تعلق صرف مسجدِ حرام سے نہیں بلکہ عام مساجد سے ہے مثلاً کافر کا مسجد میں داخل ہونا کافر کا مسجد بنانا مسجد کے انتظامی معاملات میں کافر کا دراندازہونا یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

مسجدِ حرام کی تولیت کا اصلی حقدار

(۱۷) مساجد کے آباد کار تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ پر آخرت والے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہ ڈریں۔ ان ہی سے ہدایت یافتہ ہونے کی امید ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ مسلمان بدوں امتحان کے یوں ہی نہیں چھوڑے جا سکتے بلکہ بڑے بڑے عزائم اعمال مثلاً جہاد وغیرہ میں ان کی ثابت قدمی دیکھی جائے گی اور یہ کہ تمام دنیا کی مخلوقات پر کس طرح خدا و رسول کی جانب کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان آیات میں یہ بتلایا ہے کہ خدا کی مساجد حقیقتہً ایسے ہی اولوالعزم مسلمانوں کے دم سے آباد رہ سکتی ہیں مساجد کی حقیقی آبادی یہ ہے کہ ان میں خدائے واحد کی عبادت اس کی شان کے لائق ہو۔ ذکر اللہ کرنے والے کثرت سے موجود ہوں جو بے روک ٹوک خدا کو یاد کریں۔ لغویات و خرافات سے ان پاک مقامات کو محفوظ رکھا جائے یہ مقصد کفار و مشرکین سے کب حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ کام صرف ان لوگوں کا ہے جو دل سے خدائے واحد اور آخری دن پر ایمان لا چکے ہوں جوارح سے نماز کی اقامت میں مشغول رہتے ہیں۔ اموال میں سے باقاعدہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ سبحانہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ہیں۔ اسی لیے مساجد کی صیانت و تطہیر کی خاطر جہاد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ایسے مومنین جو دل و زبان ہاتھ پاؤں مال و دولت ہر چیز سے خدا کے

مبلغ فرمانبردار ہیں ان کا فرض منصبی ہے کہ مساجد کو آباد رکھیں اور تعمیر مساجد کے جھوٹے دعوے رکھنے والے مشرکین کو خواہ وہ اہل قرابت ہی کیوں نہ ہوں وہاں سے نکال باہر کریں کیونکہ ان کے وجود سے مساجد اللہ کی آبادی نہیں بربادی ہے لہ

اس آیت میں یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ یہ لوگ مسجد حرام کی تولیت کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں تو کون لوگ رکھتے ہیں ؟ اس اٹھے ہوئے سوال کا جواب بصورت انما لاکر دیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ صرف یہی اس کے اہل ہیں جن کا چہرہ آگے پیش ہو رہا ہے ان کے علاوہ اس کی کسی میں اہلیت نہیں ہے ۔ فرمایا صرف اور صرف وہ لوگ اس کے اہل ہیں جو من آمن باللہ والیوم الاخر جو اللہ اور آخرت والے دن پر ایمان رکھتے ہوں ۔

شارحین قرآن کو یہاں حیرت ہے کہ ایمان باللہ اور بالیوم الآخر کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ذکر کیوں نہیں کیا ۔ لوگوں نے مختلف باتیں کہی ہیں ۔

اصل بات یہ ہے کہ مدار نجات ایمان باللہ اور بالیوم آخر ہے ۔ بالیوم الآخر سے مراد قیامت جنت و دوزخ ہیں ۔ انبیاء ان ہی باتوں کی تعلیم و تشریح کے لیے تشریف لاتے ہیں ۔ عقول انسانی ان کے صحیح ادراک سے کوتاہ دامن ہے ۔ اس لیے اللہ سبحانہ نے اس کا بوجھ ہم پر نہیں ڈالا بلکہ نجات و فلاح کا راستہ تبلانے کی ذمہ داری خود لے لی ہے ۔ اس کے بعد ہمارا کام صرف اس بتائے ہوئے راستہ پر چلنا ہے چونکہ ایمان نبوت کے بغیر میسر آہی نہیں سکتا اس لیے ایمان باللہ کے مفہوم میں رسول پر ایمان لانا خود بخود داخل ہے ۔ اسی طرح قرآنی آیات میں کہیں کہیں صرف ایمان باللہ کا ذکر ہے اس سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ صرف ایمان باللہ و بالیوم الآخر سے نجات ہو سکتی ہے ۔ قرآن کا تصنیف کے بجائے خطابت کا انداز ہے اس لیے اس کا مطلب سمجھنے کے لیے ایک خطیب کے انداز بیان کا تصور رکھنا چاہیے ۔ وہ جب کسی ماحول میں گفتگو کرتا ہے تو بہت سے امور اس کے سامنے اور بہت سی باتیں متکلم و مخاطب کے دماغوں میں ہوتی ہیں ۔ اور بہت سی خطیب کے انداز تکلم سے سمجھی جاتی ہیں ۔ جب ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے تو کلام سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ۔ یہاں خود خدا کا رسول اللہ سبحانہ کا کلام پیش کرتا ہے جب وہ بولتا ہے تو اللہ کا ایک ترجمان بن کر بولتا ہے ۔ اس کی ہستی آنکھوں سے نظر آتی ہے اس لیے اسے اپنے بیان میں زور ان ہی باتوں پر دینا پڑتا ہے جو غائب اور غیر محسوس ہیں ۔ جب آمنوا باللہ کا حکم دیتا ہے تو یہ جانتا ہے کہ یہ حکم میری آواز پر جو مانے گا ۔ اس کو پہلے میرا ماننا لازم ہو گا ۔ مخاطبوں کو بھی جو کچھ پس و پیش ہوتا ہے تو زیادہ تر اسی شخصیت میں ہوتا ہے وہ بہت سی باتوں کا انکار کرتے ہیں تو اس وجہ سے کہ اس کے منہ سے نکل رہا ہے ۔ اسی لیے ایمان بالرسول جو فی الواقع ایمان باللہ کا ذریعہ تھا اب رکن رکین اور اصل الاصول بن جاتا ہے جس طرح ایمان میں اللہ و رسول کے درمیان تفریق کی گنجائش نہیں ہے ایک کا منکر دوسرے کا منکر سمجھا جاتا ہے ۔ اسی طرح رسولوں میں باہم یہی نسبت موجود ہے یعنی ایک کا منکر دوسرے کا منکر ہے ۔ یہاں ماضی حال اور مستقبل سب برابر ہیں ۔ اعمال و

لہ افادات شیخ الاسلام

اقوال کی صداقت ایمان کی صداقت پر موقوف ہے اور ایمان کی صداقت خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے سے مربوط ہے۔ اس لیے ایمان بالرسول اور رسول کے فرمانے پر دوسرے رسولوں پر ایمان لانا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے اب آیات ذیل کو پڑھیے۔

۱۔ انما المومنون الذین آمنوا باللہ ورسلہ۔

مومن دراصل وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔

۲۔ ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نومن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا اولئک ھم الکافرون حقا۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کریں۔ یہی لوگ اصل کافر ہیں۔

۳۔ من یکفر باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاخر

جو انکار کرے اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور رسولوں کا اور قیامت کا۔

ان تین آیتوں میں سے پہلی آیت میں اللہ اور رسول پر بلا تفریق ایمان لانے کا ذکر ہے۔ دوسری آیت میں ان کے درمیان ایمان میں فرق کرنے والوں کو کافر کہا ہے اور تیسری آیت میں فرشتوں اور یوم آخر کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اب صرف ایک آیت کو لے کر ایمان کی بحث کا فیصلہ کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ علامہ آلوسی کی یہ بات بالکل برمحل ہے۔

ایمان بالرسول ایمان باللہ میں داخل ہے کیونکہ ایمان کی حدود میں یہ دونوں ایک ہیں جب ایک کا ذکر ہوتا ہے۔ تو دوسرا خود بخود سمجھا جاتا ہے۔

آیت کی بلاغت یہ ہے کہ بجائے یہ کہنے کے کہ مسجد حرام کی تولیت کے حقدار مسلمان ہیں یہ کہا گیا ہے کہ حقدار وہ لوگ ہیں جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہوں نماز قائم کرتے ہوں زکوٰۃ دیتے ہوں۔ بتانا یہ ہے یہ وہ بنیادی صفات ہیں جو منصب تولیت کے لیے بنیادی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں تاکہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے کہ یہ منصب کسی گروہ یا خاندان کا اجارہ نہیں ہے بلکہ یہ تمامتر شرائط اور صفات سے مربوط ہے ایمان باللہ لاکر بتایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ سے اس کو سچی عقیدت ہو اور اپنے کو صحیح معنے میں احکام الٰہی کا متبع بنائے اور ایمان بالآخرۃ سے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اس کو اپنے سارے کاموں کے حساب و کتاب کی ذمہ داری کا پورا احساس بھی ہو اور پھر ان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب و عقاب کا یقین بھی ہو یہ دل اور نیت کی شرط ہے باقی ظاہری طور پر بھی وہ ایسا ہو کہ جس سے خدا پرستی نمایاں ہو بدنی لحاظ سے اور مالی لحاظ سے بھی جس کو اقامت صلاۃ اور ادائے زکوٰۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کاموں میں شہرت و عزت اور ریا و سمعہ کا لبادہ آجاتا ہے اس لیے یہ بھی فرمادیا کہ یہ کام عزت و

شہرت اور نام ونمود کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی ناراضگی کے اندیشے سے ڈر کر کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت میں چاہے وہ ذہنی ہو یا خارجی اللہ سبحانہ کی ناراضگی کا اندیشہ غالب رہے جو شخص ان صفات سے موصوف ہوگا وہ اس لائق ہے کہ اسے تولیت کا منصب دیا جائے۔ اگر ایسے اشخاص کو یہ منصب ملے گا وہ کامیاب بامراد اور فائز المرام ہوں گے۔ فعسی اولئک ان یکونوا من المھتدین۔ یہاں عسی کے لفظ سے تعبیر کرنے میں اشارہ ہے کہ یہ راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے اس میں قدم قدم پر مشکلات ہیں۔ صرف وہی لوگ جادہ مستقیم پر استوار رہ سکتے ہیں جن کے پاس توفیق الٰہی کی زاد راہ ہو۔

اَجَعَلۡتُمۡ سِقَايَةَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَةَ الۡمَسۡجِدِ
الۡحَرَامِ كَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىۡ
سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ ؕ لَا يَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰهِ‌ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى
الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ‌ ۘ‏ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا
فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ ۙ اَعۡظَمُ دَرَجَةً عِنۡدَ
اللّٰهِ‌ ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ‏ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمۡ رَبُّهُمۡ بِرَحۡمَةٍ
مِّنۡهُ وَرِضۡوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمۡ فِيۡهَا نَعِيۡمٌ مُّقِيۡمٌ ۙ‏ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيۡنَ
فِيۡهَاۤ اَبَدًا‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ‏ ﴿۲۲﴾

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کے لیے سبیل لگانے اور مسجد حرام کی آبادکاری کو اس شخص کے کام کے ہم پلہ بنا دیا ہے۔ جو اللہ پر آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا ہے[۱۸] وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا تو یقیناً اللہ کے نزدیک ان کا بڑا درجہ ہے اور یہی بامراد اور کامیاب ہیں[۱۹]۔ ان کا رب ان کو اپنی رحمت اور کامل خوشنودی کی بشارت دیتا ہے اور ایسے باغات کی جہاں ان کے لیے ہمیشگی کی نعمت ہوگی اور وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ بلاشبہ اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے[۲۰]۔

معانی مفردات

سقایۃ الحاج۔ سقایہ پانی پلانا۔ پلانے کی جگہ، پینے کا برتن۔ سقایہ کے بارے میں اہل لغت اور مفسرین کے اقوال سخت پریشان ہیں کوئی اس کو ستی یستی کا مصدر بتاتا ہے اور کوئی استی کا اور کوئی مصدر کو بمعنے اسم فاعل کہتا ہے۔ اور کسی کے خیال میں اس جگہ کا نام ہے جہاں حاجیوں کو پینے کے لیے پانی دیا جاتا تھا۔ علامہ سید رشید رضا مصری نے المنار میں اس کی شاندار تحقیقی بحث لکھی ہے وہ ہدیہ ناظرین ہے —— سقایہ لغت میں اس برتن کو کہتے ہیں جس سے پانی وغیرہ پلایا جاتا ہے۔ اسی معنے میں ہے۔ جعل السقایۃ فی رحل اخیہ رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے اور اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں پانی پلایا جاتا ہے۔ یہ مونث بھی استعمال ہوتا ہے اور مذکر بھی لسان العرب میں ہے —— سقایہ وہ جگہ ہے جس میں حج کے موقعہ پر پینے کے لیے شربت وغیرہ تیار کیا جاتا ہے اس کے بعد لکھا ہے کہ حدیث میں آتا ہے ماثر الجاھلیۃ تحت قدمی الاسقایۃ الحاج وسدانۃ البیت! جاہلیت کے قابل ذکر کارناموں میں ہر کارنامہ میرے قدموں کے نیچے ہے سوائے حاجیوں کے پانی پلانے کے انتظام اور خانہ کعبہ کی خدمت گذاری کے) کہ قریش پانی میں کشمش ڈال کر حاجیوں کو پلاتے تھے۔ اور حضرت العباس بن عبد المطلب جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس کے متولی رہے ہیں۔ جس حدیث کی طرف صاحب لسان العرب نے اشارہ کیا ہے حضور اقدس ﷺ کے حجۃ الوداع کی بعض روایات میں آیا ہے۔ اور امام نووی الاسماء والصفات میں فرماتے ہیں۔ سقایۃ العباس مسجد حرام میں ایک مقام ہے جس میں لوگوں کے پینے کے لیے پانی لایا جاتا تھا۔ اس کے اور زمزم کے درمیان چالیس ہاتھ کا فاصلہ ہے۔ ازرقی نے اپنی کتاب تاریخ مکہ میں بتایا ہے کہ سقایہ چمڑے کے حوض تھے جو قصی بن کلاب کے زمانہ میں مسجد حرام کے صحن میں رکھے جاتے تھے اور ان میں اونٹوں کے ذریعے کنوؤں سے شیریں پانی لایا جاتا تھا۔ پھر قصی نے مرتے وقت سقایہ کا منصب اپنے بیٹے عبد مناف کے سپرد کیا وہ برابر عبد مناف کے پاس رہا یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

پرستش اور بندگی کے اعمال کا موازنہ

اللہ سبحانہ کے بندوں سے ایمان کی بنیاد پر دو قسم کے تعلقات ہیں پرستش کے اور بندگی کے۔ ان دونوں کی یک جائی کا نام اسلام ہے۔ انسان کی ہمیشہ سے کمزوری یہ رہی ہے کہ اس نے ان دونوں میں یکجائی نہیں رہنے دی۔ یہودیت اور نصرانیت قرآن میں اسی تفریق کی مثالیں ہیں۔

ان آیات میں قرآن اسی پر تنبیہہ کر رہا ہے کہ تم تاریخ کو نہ دہرانا کہ دونوں میں یک جائی نہ رہنے دو۔ یہاں پرستش کے چند اعمال نمونہ کے طور پر پیش کر کے فرمایا ہے کہ یہ اعمال بے شک نیکیاں ہیں اور ان کا تعلق پرستش سے ہے لیکن یہ ان نیکیوں کے

ہم پلہ، ہموزن نہیں جن کا تعلق بندگی سے ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ کچھ ان لوگوں کے ذہنوں میں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو گئے اسی قسم کے خیالات آنے لگے کہ حرم کعبہ کی پاسبانی۔ اس میں عبادت، حاجیوں کی خدمت سے اونچی کوئی نیکی نہیں۔ قرآن نے بتایا کہ ان کاموں کے نیکیاں ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن یہ نیکیاں اللہ کی راہ میں جان کھپانے اور جہاد کرنے کے قطعاً ہم وزن اور ہم پلہ نہیں ہیں اللہ ورسول پر ایمان لانے کے بعد سب سے بڑی نیکی اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔ ہر حال اور ہر زمانے میں ایک مومن کی زندگی کے لیے ایمان وصداقت کی بنیاد یہی چیز اور اسی کا سچا عشق وولولہ ہے۔ یہی سنام دین ہے۔ یہی عماد ملت ہے۔ یہی اساس شریعت ہے۔ یہی ملاک اسلام ہے یہی ایمان ونفاق کی اصل کسوٹی ہے۔ یہی مومن کو منافق سے الگ کر دینے کے لیے اصل پہچان ہے نماز اسی سے ہے۔ روزہ اسی سے ہے۔ حج اسی سے ہے زکوٰۃ اسی کی خاطر ہے۔ سب اس کے لیے ملتوی ہو سکتے ہیں لیکن یہ کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ نماز دین کا ستون ہے اور برائیوں سے بچنے کی ڈھال لیکن یہ دین کی بنیاد ہے اور برائیوں کو معدوم کرنے والی تلوار ہے۔ اس کی فضیلت کو نہ نماز پہنچ سکتی ہے نہ روزہ نہ اس سے بڑھ کر دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظروں میں محبوب ہو اور کرنے والے کو اس کی دائمی محبت سے سرفراز کرے

بہر حال قرآن نے اسی غلطی پر تنبیہ کیا ہے۔ خبر نہیں کچھ شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح میں صاحبزادگی، مجاوری سجادہ نشینی کی بُو کہاں سے سونگھ لی۔ آیت قرآنی کا رُخ رواجی نیکیوں کا حقیقی نیکیوں سے تقابل کی طرف نہیں ہے بلکہ قرآن کا رُخ سخن سرتاسر اہل ایمان کی طرف ہے اور حقیقی نیکیوں کا حقیقی نیکیوں سے تقابل مقصود ہے اس لیے اس بات میں یہاں کوئی وزن نہیں ہے کہ۔

"جو لوگ ان صفات سے خالی ہوں وہ محض اس لیے کہ صاحبزادے ہیں۔ سجادہ نشینی ان کے خاندان میں چلی آرہی ہے اور خاص خاص موقعوں پر کچھ مذہبی رسوم کی نمائش وہ بڑی شان سے کر دیتے ہیں نہ کسی مرتبے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور نہ یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایسے بے حقیقت موروثی حقوق کو تسلیم کر کے مقدس مقامات اور مذہبی اداروں کو ان کے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔

اور نہ اس بات کی یہاں کوئی قدر ہے کہ:

دراصل قریش مکہ کو خانہ کعبہ کی مجاوری اور حاجیوں کے کاروبار کے منصرم ہونے پر بڑا غرور تھا۔ اور جب ایک جماعت اعتقاد وعمل کی روح سے محروم ہو جاتی ہے تو اسی طرح کے رسوم و مظاہر کو ہر طرح کی بزرگی وسعادت کا ذریعہ سمجھنے لگتی ہے۔

یہ دونوں اس ذہن کی تخلیق ہیں کہ آیت قرآنی میں رواجی نیکیوں اور حقیقی نیکیوں میں تقابل ہو رہا ہے یہی اس آیت کی تشریح وتفسیر میں ٹیڑھی اینٹ ہے جس سے تشریح کی پوری عمارت کج ہو کر رہ گئی۔ عام شارحین قرآن کا اس آیت کی تشریح میں یہی

نقطۂ نظر ہے، لیکن آپ آیت کے تشریحی نوٹ میں پڑھیں گے کہ آیت کے مطالب کا رخ کدھر ہے۔

(۱۸) کیا تم لوگوں نے حاجیوں کی سبیل لگانے اور مسجد حرام کی آبادکاری کو اس شخص کے ہم پلہ بنا دیا ہے جو اللہ پر آخرت والے دن پر ایمان لایا۔ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ مشرکین مکہ کو اس پر بڑا فخر و ناز تھا کہ ہم حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کو پانی پلاتے ہیں کھانا کھلا دیتے اور مسجد حرام کی حرمت یا کسوت کعبہ یا تیل بتی وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں اگر مسلمان اپنے جہاد و ہجرت پر نازاں ہیں تو ہمارے پاس عبادات کا یہ ذخیرہ موجود ہے۔ ایک زمانہ میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں اسی طرح کی بحث کی تھی۔ بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ چند مسلمان آپس میں جھگڑ رہے تھے کوئی کہتا تھا کہ میرے نزدیک اسلام لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے کے کام سے زیادہ کوئی عبادت نہیں۔ دوسرے نے کہا کہ میرے خیال میں اسلام کے بعد بہترین عمل مسجد حرام کی خدمت ہے مثلاً جھاڑو دینا روشنی وغیرہ کرنا۔ تیسرا بولا کہ جہاد فی سبیل اللہ تمام اعمال و افعال سے افضل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو ڈانٹا کہ تم جمعہ کے وقت منبر رسول کے سامنے بیٹھ کر اس طرح کی بحث کر رہے ہو ذرا صبر کرو جب حضور اقدس جمعہ سے فارغ ہو جائیں گے آپ سے یہ چیز دریافت کر لی جائے گی۔ چنانچہ جمعہ کے بعد حضور سے سوال کیا تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ اجعلتم سقایۃ الحاج۔ یعنی حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کا ظاہری طور پر بسانا ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ میں سے کسی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ افضل ہونا تو کجا۔ جہاں جہاد کے ساتھ ایمان باللہ کا ذکر کیا تو اس لیے کیا کہ مشرکین کے فخر و غرور کا جواب ہو سکے کہ تمام عبادات کی روح ایمان باللہ ہے۔ اس روح کے بغیر پانی پلانا یا مسجد حرام کی خدمت کرنا محض مردہ عمل ہے۔ تو یہ بے جان اور مردہ عمل ایک زندہ جاوید عمل کی برابری کیسے کر سکتا ہے وما یستوی الاحیاء ولا الاموات۔ اگر صرف مومنین کے اعمال کا باہم موازنہ کرنا ہے تو ایمان باللہ کا ذکر جہاد فی سبیل اللہ کی تمہید کے طور پر ہوگا۔ اصل مقصود جہاد وغیرہ عزائم اعمال کی فضیلت کو بیان کرنا ہے۔ ایمان کے ذکر سے تنبیہ فرما دی کہ جہاد فی سبیل اللہ ہو یا کوئی عمل ایمان کے بغیر ہیچ اور لاشے ہے۔ ان عزائم اعمال جہاد ہجرت وغیرہ کا تقوم بھی ایمان باللہ ہی سے ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو فہم سلیم رکھتے ہوں۔ ظالمین اور بے موقع کام کرنے والوں کی ان حقائق تک رسائی نہیں ہوتی۔[1]

چونکہ اس آیت کے پس منظر میں شارحین قرآن مختلف ہیں اس لیے آیت کا موضوع مقرر کرنے میں شارحین قرآن کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

آیت کا موضوع کیا ہے۔ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کا اعمال میں تفاضل یا خود اہلِ ایمان کے درمیان اعمال میں باہمی تفاضل۔ شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں دونوں کے درمیان ہم آہنگی اور مفاہمت کی بہترین کوشش فرمائی ہے۔ فجزاہ اللہ عنا وعن المسلمین۔

[1] افادات شیخ الاسلام

جو شارحین قرآن آیت کا موضوع اہل ایمان اور اہل کفر میں اعمال کا تفاضل بتاتے ہیں۔ انہوں نے عنوان بھی ایسے ہی قائم کیے۔ مثلاً نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں خوطب بہ المشرکون۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں فالخطاب للمشرکین۔ ان بزرگوں کی رائے میں قرآنی آیت کا روئے سخن مسلمانوں کی طرف نہیں بلکہ مشرکین کی طرف ہے، یعنی قرآن غیر مسلموں اور مسلمانوں کا مقابلہ کرکے بتا رہا ہے کہ مسلمان ایمان اور جہاد کی وجہ سے ان غیر مسلموں سے افضل ہیں جو سقایۃ الحاج اور عمارت بیت اللہ جیسی نیکیاں کرتے ہیں۔ اس کو امام رازی نے تفسیر میں ترجیح دی ہے۔ اور صرف امام رازی نہیں بلکہ آلوسی، ابن جریر، شوکانی، ابن الجوزی اور دوسرے مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے اس کے لیے جن روایات کا سہارا لیا ہے۔ وہ بھی گوش گذار فرمائیے۔

عوفی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ مشرکین کہتے تھے کہ ہم بیت اللہ کی خدمت کرنے والے حاجیوں کے لیے پانی کا انتظام کرنے والے ہیں اس لیے ہم ان لوگوں سے اچھے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اور جہاد کرتے ہیں۔

ابن ابی طلحہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے اس آیت کی تفسیر میں بتایا ہے کہ یہ آیت عباس بن عبدالمطلب کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب وہ بدر میں قید ہو کر آئے تو انہوں نے کہا مسلمانو تم نے اگر ہجرت، جہاد اور اسلام میں ہم سے سبقت کر لی ہے تو کیا بات ہے ہم بھی بیت اللہ کی خدمت کرتے ہیں حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور قیدیوں کو چھڑاتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اجعلتم سقایۃ۔

حضرت ضحاک بن مزاحم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے حضرت العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بدر والے روز قید ہونے کے بعد شرک کا آوازہ کسا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہم بھی الخ۔

امام شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عباس کے ایک مکالمہ پر نازل ہوئی۔

ابن جریر نے ابو صخرہ کے حوالہ سے محمد بن کعب القرظی کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کا ارشاد ہے کہ طلحہ بن شیبہ اور عباس بن عبدالمطلب اور علی ابن ابی طالب ایک بار باہم فخریہ انداز میں گفتگو اپنے کارناموں پر کر رہے تھے۔ طلحہ نے کہا کہ میں بیت اللہ کا چابی بردار ہوں۔ عباس بولے میں پانی پلانے کا منتظم ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بولے مجھے پتہ نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں نے لوگوں سے چھ ماہ پہلے قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے۔ میں مجاہد فی سبیل اللہ ہوں۔

سدی مفسر سے بھی ایسی ہی روایت ہے۔

عبدالرزاق نے حسن بصری کے حوالہ سے اسی قسم کا مباحثہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عباس اور طلحہ کے مابین پیش کیا ہے۔

ان روایات میں کسی ایک روایت کی حیثیت بھی چشم دید گواہ کی نہیں ہے ان سب کی حیثیت رائے کی ہے۔ ان کی تاریخی حیثیت خود اتنی مضبوط نہیں جس کے سہارے اتنے بڑے واقعہ کا فیصلہ کر دیا جائے۔

سوچنے کی بات ہے کہ مقابلہ کن سے کیا جا رہا ہے جنھوں نے اسلام کو قبول نہیں کیا۔ ایک غیر مسلم کے نزدیک ایمان اور جہاد نیکی نہیں ایمان کی حیثیت اس کے خیال میں ترحم کی اور جہاد کی سراسر فساد کی ہے۔ ایسی حالت میں اہل ایمان کی نیکیوں کا بلحاظ نیکیوں سے تقابل بے معنی ہے۔ مسلمان کے نظریہ کے مطابق کافر کی نیکی نیکی نہیں اور غیر مسلم کے خیال میں مسلمان کی نیکی نیکی نہیں۔ پھر باہم تقابل کیا۔

یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ جب قرآن ابھی ایک آیت پہلے مشرکین کے ان اعمال یعنی عمارت، سقایت اور حجابت، بیت اللہ کو کالعدم رائیگاں اور بیکار کہہ چکا ہے تو پھر ان کے اعمال کا اہلِ ایمان کے اعمال سے کیسے تقابلی مطالعہ پیش کر سکتا ہے آپ ابھی تو سن آئے ہیں حبطت اعمالھم۔ اس تقابل سے یہ بات خود بخود معلوم ہو رہی ہے کہ قرآن ان نیکیوں کو حالتِ کفر میں نیکیاں نہیں مانتا۔ پہلے کفر کی بنیاد پر نیکیوں کی نفی اور پھر کفر ہی کی موجودگی میں ان کی ان نیکیوں کا اہلِ ایمان کی نیکیوں سے مقابلہ قابلِ فہم نہیں ہے۔

اس لیے کچھ شارحین قرآن نے اس آیت کا موضوع اہلِ ایمان کے درمیان اعمال میں تفاضل قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کے سیاق اور سباق کا یہی تقاضا ہے سیاق میں قرآن کے مخاطبات اہلِ ایمان سے ہیں۔ قاتلوا ائمۃ الکفر، الاتقاتلون۔ قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم — ام حسبتم ان تترکوا ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا۔ یہاں تک روئے سخن اہلِ ایمان کی طرف ہے۔ اس آیت میں بلاقرینہ یکبارگی روئے سخن مشرکین کی طرف ہو جانا۔ بلاغت قرآنی کے خلاف ہے جبکہ سباق میں بھی اسی مسئلے کو مبرہن کرنے کے لیے اہلِ ایمان مخاطب ہیں۔ علامہ ابوالسعود کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے لایساعدہ النظم التنزیلی۔ قرآن کا نظم اس کی ہمنوائی نہیں کرتا۔

اور جن شارحین نے آیت کا یہ موضوع قرار دیا ہے ان کے خیال میں آیت قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی بندگی اللہ کی پرستش والے اعمال میں مسلمانو! کیا تم موازنہ کر کے پرستش والے اعمال حاجیوں کو پانی پلانا مسجد حرام کی آبادکاری بندگی والے اعمال جہاد فی سبیل اللہ کے ہم پلہ کر رہے ہو ایسا ہرگز نہیں ہے لایستوون عند اللہ یہ دونوں اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں ایک شخص حاجیوں کو پانی پلا رہا ہے۔ بیت اللہ میں یاد الٰہی میں مشغول۔ طواف کر رہا ہے۔ اس کا وہ مقام اللہ کے نزدیک نہیں جو جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے خون کے قطروں سے میدانِ جنگ میں حق کی شہادت دے رہا ہے۔ شاید عبد اللہ بن مبارک نے اسی بات کو سمجھانے کے لیے یہ فرمایا تھا۔

یاعابد الحرمین لو ابصرتنا

لعلمت انک بالعبادۃ تلعب

اس مطلب کی تائید صحیح مسلم کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت نعمان بن بشیر کے حوالہ سے آتی ہے۔ نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ:

میں حضور اقدس ﷺ کے ممبر کے پائیں میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص بولا مجھے مسلمان ہونے کے بعد کوئی پروا نہیں اگر میں حاجیوں کو پانی پلانے کے سوا کوئی کام نہ کروں۔ دوسرا بولا مجھے پروا نہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد مسجد حرام میں بیٹھ کر عبادت کے سوا اگر کوئی کام نہ کروں۔ تیسرا بولا اللہ کی راہ میں جان کھپانا اور جہاد کرنا سب سے اونچا کام ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کو ڈانٹ دیا اور فرمایا حضور ﷺ کے ممبر کے پاس کیوں شور کر رہے ہو۔ یہ جمعہ کا دن تھا جب نماز ہو چکی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے ان کے اختلاف کے بارے میں دریافت کیا۔ قرآن کی یہ آیت اجعلتم سقایۃ الحاج نازل ہوئی۔

یہ صحیح حدیث علی رؤس الاشہاد بتا رہی ہے کہ یہ مسلمانوں کے درمیان نیکیوں کے مفاضلہ کی بات تھی نہ کہ کافروں اور مسلمانوں کے درمیان۔ اس صحیح حدیث کی موجودگی میں آیت کا مطلب مقرر کرنے کے لیے بے سند روایتوں کا سہارا لینا درست نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر نے دوسری کہانیاں درج کرنے کے بعد لکھا ہے۔

اس آیت کی تفسیر سے متعلق ایک حدیث مرفوع بھی آئی ہے۔ اس کو پیش کر دینا ہی یہاں ضروری ہے[1]

حافظ ابن جریر نے بھی اپنی تفسیر میں اسی کو مقدم رکھا ہے۔ دوسرے شارحین قرآن میں کچھ نے اس حدیث سے چشم پوشی کر لی ہے حد یہ ہے کہ نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فتح البیان میں اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اس تشریح پر کچھ شبہات

پہلا شبہ یہ ہے کہ اس حدیث میں ہے کہ اس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس شبہ کا جواب علامہ قرطبی نے یہ دیا ہے کہ ایسے مواقع پر راویوں سے تسامح ہو جاتا ہے حضور اقدس ﷺ آیت قرآنی بطور استشہاد پیش کرتے ہیں راوی خیال کر لیتا ہے کہ اسی موقعہ پر نزول آیت ہوا ہے۔ ایسا بہت سے مواقع پر ہوتا ہے جیسا کہ آپ حافظ سیوطی کے الاتقان کے حوالہ سے پہلے بھی یہ بات سن چکے ہیں۔

لیجئے علامہ قرطبی کی پوری بات سن لیجئے۔

راویوں سے اس انداز بیان میں کہ یہ آیت نازل ہوئی کچھ تسامح ہوا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت عمر کے سوال کے جواب میں حضور اقدس ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ہے۔ راوی نے یہ خیال کر لیا ہے

[1] ابن کثیر

کہ اسی موقعہ پر نازل ہوئی ورنہ دراصل یہ تلاوت حضور اقدس ﷺ کی جانب سے اس بات پر کہ جہاد افضل ہے استدلال کی صورت میں تھی۔ یہ مطلب نہیں کہ خاص اس واقعہ میں اس آیت کا نزول ہوا ہے۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ اہل ایمان کے اعمال میں تفاضل بتانا ہوتا تو تشبیہ میں آمن باللہ والیوم الاخر ذکر نہ ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مقصود یہ ہے کہ یہ اعمال اگر ایمان کی زمین پر ہوں تب دوسرے اعمال سے افضل ہیں۔ ایمان تو قرآن میں شرط اول کے درجہ میں ہے۔ یہ کوئی سامان آرائش نہیں بلکہ یہ حقیقی واقعی اور بنیادی چیز ہے۔ اور اس شرط کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ غالباً یہ باتیں کرنے والے وہ مسلمان ہوں گے جو فتح مکہ کے موقعہ پر مسلمان ہوئے۔ ان کو جتانا ہے کہ جب مقصود کا شعور نہ ہو تو سب بیکار ہے۔ کیونکہ مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب وہ اصل قوت ہے جو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد مقصد کا شعور اس کی جدوجہد کا اصل محرک ہے۔ مقصد ہی حیات ہے۔ بے مقصدی موت ہے اسلام کا پورا نظام ایمان کی بنیادوں پر استوار ہے روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ جہاد فرائض عبادات اور اوامر و نواہی سب کے سب بالآخر اس غایت اصلی ایمان کے تابع ہیں کہ خدا کی زمین پر اس کی پرستش اور بندگی کی جائے۔

تیسرا شبہ یہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں میں باہم تفاضل اعمال کی نشاندہی کرتی تو آیت کے انجام پر واللہ لایھدی القوم الظالمین نہ ہوتا یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے ظلم کے معنے اتنے سنگین نہیں ہیں جتنے سمجھ لیے گئے۔ اس کے معنے بے موقع بے محل اور بے جا کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ اتنی تو در کنار نبیوں کے بارے میں بھی بولا گیا ہے! حضرت آدم کے بارے میں ہے ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین۔ حضور اقدس ﷺ کے بارے میں ہے۔ لئن اتبعت اھواءھم من بعد ما جاءک من العلم انک اذاً لمن الظالمین۔ اللہ کے قانون میں رو رعایت کی گنجائش کسی کے لیے نہیں ہے۔ طبیعت کے تقاضے سب میں ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ توفیق الٰہی ان کا تعلق ہر وقت اور ہر آن اپنے سے قائم رکھتی ہے۔ آیت کے معنے یہ ہیں کہ اللہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

بہرحال آیت قرآنی کا موضوع اہل ایمان کے اعمال میں تفاضل سے ہے اہل کفر اور اہل ایمان کے اعمال میں تفاضل سے نہیں ہے۔ اگر اس آیت میں کفر و ایمان کی عملی کشمکش کا ذکر ہوتا تو آئندہ آیت میں تغایر کو بتانے کے لیے حرف عطف ضروری لایا جاتا مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ بغیر عطف کے آیت آ رہی ہے۔

مقام مجاہدین کی برتری

(19) وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا یقیناً اللہ کے نزدیک ان کا بڑا درجہ ہے اور یہی بامراد اور کامیاب ہیں۔ یعنی ایمان ہجرت اور جہاد والوں کا مرتبہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا ہے اور یہی لوگ بامراد ہیں۔

آیت میں ایمان کے ساتھ دو عمل بتائے ہیں ایک ہجرت اور دوسرے جہاد ایمان تو اصل مقصد کی نشاندہی کر رہا ہے کیونکہ اس پر تو ساری زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ تو ساری اسلامی زندگی کے سارے اعمال سے یہاں ہجرت اور جہاد کا مقابلہ کیا ہے نیکیاں تو سب اپنی جگہ نیکیاں ہیں لیکن ان ساری نیکیوں میں اللہ کے یہاں ان اہل ایمان کا درجہ سب سے بڑا ہے جو ہجرت اور جہاد کا عمل کرتے ہیں پہلی آیت میں بتایا تھا کہ عام نیکیاں کرنے والے مجاہدین فی سبیل اللہ کے برابر نہیں اس آیت میں بتایا ہے کہ ان کا درجہ سب سے بڑا ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ ایمان کی حقیقی کسوٹی ہجرت اور جہاد ہیں۔ ہجرت ہجر سے جس کے معنے چھوڑ دینے کے ہیں اسلام کی اصطلاحی زبان میں ایمان کی خاطر اپنی دینوی مرغوبات و محبوبات کو چھوڑ دینے کا نام ہجر ہے مثلاً دولت کو آرام و راحت کو، عزیز و اقربا کو، وطن و مکان کو۔ چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل و عیال، مال و متاع دوست و احباب ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے اور اس کی محبت و الفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بھاری ہے اس لیے ترکِ وطن اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہے۔ اور ہجرت کا بول زیادہ تر اسی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

جہاد جہد سے بنا ہے جس کے معنی دشمن اور دشمن کی ساری قوتوں کو دور کرنے اور اپنے کو قائم و باقی رکھنے میں انتہا درجہ کی کوشش جہاد ہے۔ چونکہ اسلام کے قیام کی اصل بنیاد جہاد ہے اس لیے ہر حیثیت سے اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا اور سارے عملوں اور نیکیوں میں جو ایک مسلمان دنیا میں کر سکتا ہے اس عمل کا رتبہ و اجر افضل و اعلیٰ ٹھہرایا جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہوگی اتنا ہی زیادہ اس کا اجر و ثواب بھی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھ کر اور کس عمل میں مال و جان کا ایثار ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ یہی عمل ایمان کی اصل کسوٹی بن گیا جس مومن کا دل اس کے ولولہ و طلب سے خالی ہو وہ ایمان کی روشنی سے محروم اور نفاق کی ظلمت کا شکار ہے۔ صحیح مسلم میں ہے۔

جو مسلمان اس حالت میں دنیا سے گیا کہ نہ تو کبھی اللہ کی راہ میں جنگ کی اور اس کی طلب کا کبھی اس کے دل میں ولولہ ہوا تو اس کی موت ایسی حالت میں ہوئی جو نفاق کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ ای العمل افضل کونسا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے فرمایا ایمان باللہ و رسولہ پھر پوچھا اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ الجھاد فی سبیل اللہ۔ اللہ کی راہ میں جہاد۔

بخاری میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا لوگوں میں سب سے اونچا کون ہے فرمایا مومن یجاھد فی سبیل اللہ بنفسہ و مالہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرے۔

بعض احادیث میں اس عمل جہاد کا دوسرے اعمال عبادت سے موازنہ کیا ہے۔ ترمذی میں ارشادِ نبوت ہے۔

تم میں سے ایک کا راہ خدا میں کھڑا ہونا گھر میں بیٹھ کر ساٹھ سالہ عبادت سے افضل ہے۔

اور ترمذی ہی میں ہے۔

جس مسلمان نے ایک رات بھی جہاد کرتے ہوئے دشمن کے انتظار میں کاٹی اس کے لیے ایسا اجر ہے گویا ہزار راتیں قیام کیا اور دن کو روزہ رکھا

بخاری و مسلم میں ہے۔

تین بار آپ سے پوچھا گیا کہ جہاد کے برابر کونسا عمل ہے تین مرتبہ فرمایا تمہارے بس کی بات نہیں یعنی کوئی عمل ایسا نہیں جو جہاد کے برابر ہو اور تم کرسکو پھر فرمایا مجاہد کی مثال نہ دن میں روزہ رکھنے والے اور رات میں قیام کرنے والے قرآن تلاوت کرنے والے اس شخص پر جو نماز اور روزہ کرتا ہی رہے۔

اس آیت میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اہل ایمان کے اسی مقام بلند کی اعظم درجۃ عند اللہ واولئک ھم الفائزون کہہ کر خبر دی گئی ہے۔

اللہ کی راہ میں قربانیوں پر بشارت

(۲۰) ان کا رب ان کو اپنی رحمت اور کامل خوشنودی کی بشارت دیتا ہے اور ایسے باغات کی جہاں ان کے لیے ہمیشگی کی نعمت ہوگی اور وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ بلا شبہ اللہ کے پاس بہت اجر ہے یعنی اس کے یہاں ثواب و درجات کی کیا کمی ہے جس کو جتنا چاہے مرحمت فرمائے پہلی آیت میں تین چیزوں کا ذکر تھا۔ ایمان جہاد اور ہجرت ان تین پر بشارت بھی تین چیزوں کی دی رحمت، رضوان، خلود فی الجنۃ، ابوحیان نے لکھا ہے کہ رحمت ایمان پر مرتب ہے۔ ایمان نہ ہو تو آخرت میں خدا کی رحمت و مہربانی سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا اور رضوان جو بہت اعلیٰ مقام ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا صلہ ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ تمام نفسانی حظوظ و تعلقات ترک کر کے خدا کے راستہ میں جان و مال نثار کرتا اور رضا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انتہائی قربانی پیش کرتا ہے لہٰذا اس کا صلہ بھی انتہائی ہونا چاہیے اور وہ حق تعالیٰ شانہ کی رضا کا مقام ہے باقی ہجرت وہ خدا کے لیے وطن مالوف اور گھر بار چھوڑنے کا نام ہے اس لیے مہاجر کو خوشخبری دی گئی کہ تیرے وطن سے بہتر وطن اور تیرے گھر سے بہتر گھر تجھے ملے گا جس میں ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی آسائش و راحت سے رہنا ہوگا جس سے ہجرت کرنے کی کبھی نوبت نہ آئے گی[1]

اس آیت میں واقعی تین چیزوں کا ذکر ہے۔ اور پہلی آیت میں بھی تین اعمال ایمان، ہجرت اور جہاد کا ذکر ہے۔ ابوحیان کی نکتہ آفرینی کے مطابق ایمان کے مقابلے میں رحمت اور جہاد کے مقابلے میں رضوان اور ہجرت کے مقابلے میں جنات ہیں لیکن اس میں ترتیب درست نہیں رہی ہے کیونکہ قرآن میں پہلے ایمان پھر ہجرت اور اس کے بعد جہاد کا ذکر ہے اگر ترتیب بھی قائم رکھی

[1] افادات شیخ الاسلام

جائے تو ایمان کے مقابلے میں رحمت، ہجرت کے مقابلے میں رضوان جہاد کے مقابلے میں جنات آتا ہے مگر یہاں ذہن میں خلش ہوتی ہے لف ونشر مرتب ہوتا ہے یا غیر مرتب۔ اگر مرتب ہو تو ایمان کے مقابلے میں رحمت، ہجرت کے مقابلے میں رضوان اور جہاد کے مقابلے میں جنات آتا ہے۔ اور اگر غیر مرتب ہو تو ایمان کے مقابلے میں جنات، ہجرت کے مقابلے میں رضوان اور جہاد کے مقابلے میں رحمت آتا ہے۔ اس لیے اس نکتہ میں نہ لطافت ہے نہ بلاغت ہے۔"

اصل یہ ہے کہ آیت ایک عمل پر جزا نہیں بلکہ مجموعہ اعمال پر مجموعی جزا ہے یعنی جو شخص ایمان و ہجرت اور جہاد کی سرمایہ لے کر آئے گا اللہ کے یہاں اس کی جزا رحمت، رضوان اور جنت میں دائمی مقام ملے گی۔

جنت کو آخر میں لائے ہیں۔ پہلے رحمت اور رضوان کا ذکر کر دیا تاکہ جنت کی طلب میں شوق زیادہ ہو۔

خدا کی رحمت کب نہیں اور کہاں نہیں مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آتے ہیں جن کو رحمت کے بجائے قہر الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر یہ واقعہ بھی ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی وجہ سے اللہ سبحانہ کے قہر میں مبتلا ہونا پڑتا ہے لیکن جنت وہ مقام ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا۔ وہاں ہر طرف اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا۔ وہاں ہر طرف اور ہر آن اس کے فضل و رحمت کی بارش ہوگی۔ اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا۔ اہل جنت جن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے۔ رحمت ان کو اپنے گھیرے میں لے لے گی۔

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز رضوان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے سے راضی ہونا کہ اس کے بعد نہ کبھی اپنے بندہ پر عتاب فرمائے گا اور نہ اس سے ناراض ہوگا بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا۔ متقیوں کے لیے اللہ نے جو نعمتیں رکھی ہیں وہ ان گنت نعمتیں ہیں لیکن سب سے آخر میں جو نعمت رکھی ہے وہ نعمت رضوان ہے۔ اس پر تفصیلی بحث اسی جلد کے آخر میں آرہی ہے۔

آیئے ذرا اس پر بھی غور فرمایئے کہ جن اعمال پر ان انعامات کی یہ بارش ہو رہی ہے یعنی ایمان، ہجرت اور جہاد۔ ایمان تو اپنی جگہ ہے اس کے بغیر تو کوئی عمل قابل پذیرائی نہیں یہ تو اللہ و رسول سے عہد وفاداری کا نام ہے۔ اسی عہد وفاداری کو نبھاتے ہوئے دین کے سارے کاموں میں سے یہاں جو ہجرت اور جہاد کا ذکر کیا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ جن کا ذکر کیا جا رہا ہے ان کے پیش نظر یہ اور صرف یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی زمین پر بس اسی کی بندگی اور صرف اسی کی پرستش کی جائے اور معبودان باطل کو ہر جگہ سے نکال پھینکا جائے خواہ یہ معبود ہوائے نفس کی صورت میں ہوں یا دیوتاؤں اور بتوں کی۔ طبقاتی اور قومی مفاد کی صورت میں ظاہر ہوں، آمروں، لیڈروں اور بادشاہوں کا بھیس بدل کر آئیں۔ اس مقصد کی خاطر اگر ترک وطن کرنا پڑے تو خندہ پیشانی سے کرے وطن، قوم زبان رنگ و نسل کی کوئی وفاداری اللہ و رسول کے عہد وفاداری میں حائل

اگر اس مقصد کی خاطر اپنی جان مال مکان دوکان کارخانہ، منصب و اقتدار کو داؤ پر لگانا پڑے تو اس میں کوئی پس و پیش
ہو اور اگر اس
کرے۔ ان اہلِ ایمان کے یہ اوصاف اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ان میں اعلائے کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دے
کر اللہ کا قرب حاصل کرنے کی آرزو تھی۔ یہ چاہتے تھے کہ اسلام کے اخلاقی اقدار اور قرآن کے معیار خیر و شر کو سارے عالم پر حکمران
تاکہ اپنے اللہ کو راضی کریں۔ اس کام کو کرتے وقت ان کی نمازوں میں روح تھی۔ عبادات میں جان تھی اور اسلام کے سارے
اجزا اس غایت آخری سے اپنی زندگی اور پرورش کا سامان حاصل کر رہے تھے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ
اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ
فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَ
اَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ
اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ
اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ
فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾ ع ۸

اے اہل ایمان اگر تمہارے باپ دادے اور تمہارے بھائی بند ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کریں تو ان کو اپنا رفیق نہ بناؤ اور یاد رکھو جو بھی تم میں ان کو اپنا رفیق بنائے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا [۲۳] اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے تمہارے بھائی۔ تمہاری بیویاں، تمہاری برادری، تمہارا وہ مال جو تم نے کمایا ہے۔ تمہاری وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے۔ تمہارے وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسقوں کی رہنمائی نہیں کرتا ہے [۲۴]

مفردات کے معانی

استحبوا۔ ماضی کا جمع مذکر غائب ہے استحباب مصدر ہے۔ حب مادہ ہے استحباب کے معنے پسند کرنا ہیں اور حب کے لغوی معنے کسی ایسی چیز کا ارادہ کرنے یا اسے چاہنے کے ہیں جس کے کسی خیر کا ملنا یقینی یا متوقع ہو۔[1] اسی طرح لسان العرب میں اس لفظ کے معنے وداد یعنی پسند کرنا یا چاہنا بتائے ہیں اور بغض کو اس کی نقیض قرار دیا ہے۔ ابن القیم نے محبت کے لغوی معنے بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مادہ پانچ چیزیں بتاتا ہے۔

۱۔ صفائی اور سپیدی اسی سے دانتوں کی سپیدی کو حب الاسنان کہتے ہیں۔

۲۔ بلندی اور غلبہ اسی سے پانی کے بلبلوں کو حب الماء اور حباب کہتے ہیں۔

۳۔ چمٹنا اور جمنا اسی سے اونٹ کو اگر بیٹھ کر نہ اٹھے حب البعیر کہتے ہیں۔

۴۔ مغز اسی سے دانہ کو حب اور دل کے لیے حبۃ القلب بولتے ہیں۔

۵۔ روکنا اور حفاظت اسی سے اس برتن کو جس میں پانی محفوظ رکھا جائے حب الماء کہتے ہیں۔[2]

جہاد اللہ و رسول کی محبت کا تقاضا ہے

یہ آیت جہاد فی سبیل اللہ کو اللہ کی محبت کا لازمی ثمرہ بتا رہی ہے جیسے قرآن کی یہ آیت ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی حضور اقدس ﷺ کی اتباع کو محبت الٰہی کی نشانی بتا رہی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اس میں جہاد کا لفظ اللہ و رسول کا بیان واقع ہوا ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ جہاد کی محبت اور اللہ و رسول کی محبت دونوں انتہائی حد تک لازم و ملزوم ہیں یعنی قرآن کے نزدیک وہ ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔ اس طرح یہ ارشاد خداوندی بتا رہا ہے کہ دین کی نصرت اور اقامت کے لیے اپنی طاقتیں نچوڑ دینا محبت الٰہی کا ایسا ناگزیر تقاضا ہے جس کے بغیر اس کے وجود کا کوئی اعتبار ہی نہیں۔ ممکن نہیں کہ اللہ سبحانہ کی محبت اندر موجود ہو مگر وہ جہاد فی سبیل اللہ کے قالب میں ڈھل ڈھل کر باہر نہ آتی ہو۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے محبت الٰہی کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے صاف بتایا ہے۔

> اتباع شریعت اور جہاد فی سبیل اللہ ہی وہ سب سے بڑا فرق و امتیاز ہے جو اللہ کی سچی محبت کرنے والوں اور جھوٹے مدعیوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اور جس کے ذریعے ان اولیاء اللہ کے جو اللہ کے واقعی محب اور محبوب ہیں۔ اور ایسے مدعیان محبت کے درمیان تمیز کی جا سکتی ہے جو دعوے محبت کے ساتھ مخالف شرع

---

[1] مفردات القرآن

[2] مدارج السالکین

باتوں اور اپنے جی کی گھڑی ہوئی بدعتوں کا اتباع کرتے رہتے ہیں یا جو محبت کا یہ خودساختہ مفہوم لیتے ہیں کہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے محبت کی جائے حتیٰ کہ کفر وفسق جیسی چیزوں سے [1]

(۲۱) اے اہلِ ایمان اگر تمہارے باپ اور تمہارے بھائی بند ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کریں تو تم ان کو اپنا رفیق نہ بناؤ اور یاد رکھو جو بھی تم میں سے ان کو اپنا رفیق بنائے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ پہلی آیات میں بتایا تھا کہ جہاد و ہجرت اعظم اور افضل ترین اعمال ہیں۔ بسا اوقات ان دونوں اعمال میں خویش واقارب کنبہ برادری کے تعلقات خلل انداز ہو جاتے ہیں اس لیے فرمایا کہ جن لوگوں کو ایمان سے کفر عزیز ہے ایک مومن انہیں کیسے عزیز رکھ سکتا ہے۔ مسلمان کی شان نہیں کہ ان سے رفاقت اور دوستی کا دم بھرے حتیٰ کہ یہ تعلقات اس کو جہاد و ہجرت سے روک ہو جائیں ایسا کرنے والے گنہ گار ہیں کہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں [2]۔ شیخ الاسلام نے تفسیر میں بہت ہی اختصار سے کام لیا ہے بات ذرا تشریح طلب ہے۔

اصل یہ ہے کہ مکہ کا طلقاء کا ایک بڑا گروہ نیا نیا مسلمانوں میں داخل ہوا تھا یعنی ان باشندگانِ مکہ کا جنھیں حضور اقدس ﷺ نے عفو و بخشش کی ایک بے نظیر مثال قائم کرتے ہوئے فتح مکہ کے دن آزاد کر دیا تھا اور فرمایا تھا انتم الطلقاء آج تم سے کوئی باز پرس نہیں۔ یہ ابھی اسلامی زندگی کی پختگی کے محتاج تھے۔ اور ان میں سے بہتوں کے عزیز واقربا دشمنوں سے ملے ہوئے تھے۔ جب اعلانِ جنگ ہوا تو انہیں اپنے قرابت داروں کی فکر ہوئی۔ کچھ نے جاہلیت کے نسبی اور خاندانی عصبیت کی صدا ابھی بلند کی جو ابھی پوری طرح ان کے دلوں سے ختم نہیں ہوئی تھی ــــــ کچھ منافق اور کچے دل کے آدمی بھی تھے وہ کہنے لگے اب جنگ کے اعلان کی کیا ضرورت ہے جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ــــــ عام مسلمانوں میں بھی فتح و عروج کی وجہ سے کچھ نہ کچھ بے پروائی سی پیدا ہو گئی تھی لوگ خیال کرتے ہوں گے اب تو تمام عرب کلمہ حق کے آگے جھک رہا ہے اور دشمنوں میں دم خم باقی نہیں رہا۔ حالانکہ مشیتِ الٰہی نے عروجِ اسلام کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ کچھ اور ہی تھا اور اس موقعہ کی طبیعتوں کی بے پروائی نہ صرف مستقبل کے لیے بلکہ موجودہ حالت کے لیے بھی خطرہ سے خالی نہ تھی اس لیے ضروری ہوا کہ اہل ایمان کو ایمان و عمل کے عزائم کی از سرِ نو تلقین کی جائے اور یاد دلایا جائے کہ آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ شروع ہوئی ہے ازاں جملہ اس اعلانِ جنگ کی آزمائش ہے جسے دشمنوں کے غدر و فریب نے ضروری کر دیا ہے اور ملک کے امن و امان کا استحکام اس کے بغیر ممکن نہیں ہے چنانچہ پہلے فرمایا ام حسبتم ان تترکوا کہ تمہیں اسی طرح چھوڑ دیا جائے گا بلکہ ایمان و عمل کی اور بھی آزمائشیں باقی ہیں جن سے تمہیں دوچار ہونا ہے۔ اب یہاں سچے مومنوں کی فضیلت بیان فرمانے کے بعد اس آیت میں توجہ دلائی ہے کہ ایمان کا دعویٰ اور اہلِ ایمان کے دشمنوں کے ساتھ موالات و رفاقت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے

[1] العبودیۃ

[2] افادات شیخ الاسلام

اگر باپ اور بھائی بھی دشمن کی صف میں ہوں تو تمہیں ان سے کوئی علاقہ نہیں رکھنا چاہیے۔[1]

اس آیت نے یہ بات کھول کر سمجھا دی ہے کہ اہل ایمان کے تعلق دوستی اور اعتماد کی بنیاد وطن، قوم، نسب اور خاندان پر نہیں بلکہ ایمان پر ہے اگر مسلمانوں میں سے کسی کا باپ بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کا دلدادہ ہے تو ان کو اپنا معتمد اور دوست نہ بنانا چاہیے جو ایسا کرے گا وہ اپنے پر خود ہی ظلم کرے گا۔ قرطبی نے یہاں یہ بات برموقعہ لکھی ہے کہ اس آیت کے مخاطب پورے عالم کے مسلمان ہیں اور یہ حکم حالات کی تخلیق اور فرضی نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہے اور سب کے لیے ہے کہ ایمان و کفر میں کوئی رابطہ نہیں ہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس طرح کے تمام احکام کا تعلق جنگ سے ہے نہ کہ انسانی زندگی کے عام حالات سے۔ جہاں تک ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلق کا مسئلہ ہے اس موضوع پر اصل محبت و شفقت ہمدردی و سلوک اور تعاون و سازگاری ہے اس کے سوا کوئی بات نہیں۔ قرطبی نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ سلوک، تعاون کے معاملات یہاں بھی مستثنیٰ ہیں الاحسان والھبۃ مستثناۃ من الولایۃ۔ دلیل میں صحیح بخاری کے حوالے سے حضرت اسماء کا یہ عمل پیش کیا ہے کہ یارسول اللہ ﷺ میری والدہ آئی ہیں۔ وہ مشرکہ ہیں۔ کیا میں ان سے حسن سلوک اور رواداری کر سکتی ہوں فرمایا صلی امک تو اپنی ماں سے حسن سلوک کر۔ جب حالت جنگ میں بھی اس کا استثناء ہے تو جنگ نہ ہونے کی صورت میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسانی برادری کے علائق کا قرآن انکار نہیں کرتا۔ انسان ہونے کی حیثیت میں ہر انسان کا انسان سے تعلق ہے وہ تمام باتیں جو انسانی علاقوں کو منقطع کرتی ہیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں۔ یہاں الجصاص نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ یہ جنگ کے احکام ہیں کہ والدین سے اور بھائیوں سے رفاقت و ولایت کے تعلقات راہ ایمان میں رکاوٹ نہ ہونے چاہئیں۔ ورنہ قرآن نے عام حالات میں کافر باپ کے ساتھ نیکی کرنے اور اس کے ساتھ حسن سلوک اور تعاون کرنے کا حکم دیا ہے یہاں مسلمانوں کو زمانہ جنگ میں علائق منقطع کرنے کا حکم صرف اس لیے دیا ہے کہ کچھ منافق قسم کے لوگ کافروں سے رفاقت و سازگاری کے تعلقات رکھے ہوئے تھے۔ لکھا ہے یہ ایک کسوٹی بنا دی گئی مومن و منافق میں امتیاز کے لیے۔ جو مومن ہیں وہ دشمنوں کے کیمپ سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔ اور جو منافق ہیں وہ کافروں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ ان کا اکرام و تعظیم کرتے ہیں۔ ان سے بھائی چارہ اور تعلقات رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر پوری تفصیل بحث قرآن کے ۲۸ پارے سورہ ممتحنہ میں آرہی ہے۔

حبِّ ایمانی اور غیر ایمانی میں موازنہ

اے پیغمبران سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری، تمہارا وہ مال جو تم نے کمایا ہے تمہاری وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے، تمہارے وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں یہ ساری

[1] ترجمان القرآن۔

کرتے ہیں۔ ان کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو طیبات سے محروم کر لیتے ہیں والدین کا جذبہ محبت اولاد سے ان کی پرورش ان کی محبت ان کی تعلیم و تربیت کا سبب ہوتا ہے۔ اولاد مستقبل میں ان کی امیدوں کا سہارا ہوتی ہے قرآن نے اولاد کو دنیوی زندگی کی شان و شوکت بتایا ہے۔

المال والبنون زينة الحياة الدنيا۔

۳۔ بھائیوں سے محبت۔ بھائی چھوٹا ہے تو اولاد میں چھوٹے بچے کی جگہ ہے بڑا ہے تو باپ کی جگہ ہے۔ ایک طرف شفقت ہوتی ہے اور دوسری طرف احترام ہوتا ہے۔ اور دونوں میں نفسیاتی کشش ہے۔

۴۔ بیوی سے محبت بقائے نسل اور اولاد کی خواہش دونوں کو یکجائی کا موقعہ دیتے ہیں۔ اور دونوں کی یکجائی انسانی نسل میں اضافہ کا سبب ہوتی ہے انسان کی چاہتوں اور محبتوں میں میاں بیوی کی محبت ایک طاقتور رشتہ ہے بلکہ قرآن نے تو بتایا ہے کہ یہ رشتہ بنایا ہی اللہ نے مودت و رحمت کے لیے ہے۔

وجعل بينكم مودة و رحمة۔

۵۔ خاندان کی محبت وقار و عزت، تعاون اور عصبیت کی خاطر انسان اپنے خاندان سے محبت کرتا ہے۔ عرب میں خاندانی عصبیت حد سے زیادہ تھی۔ اسی کے بل بوتے پر ساری جنگوں کی کامیابی کا انحصار تھا۔ اور اسی کے ارد گرد ان کی داخلی و خارجی سیاست چکر لگاتی تھی۔

۶۔ اموال کی محبت، چونکہ مال کے پیچھے آدمی کی محنت ہوتی ہے اور آدمی جس چیز پر جان کھپاتا ہے اس سے طبیعت کو لگاؤ ہو جاتا ہے۔ لگاؤ ہونے کے بعد طبیعت اور عقل دونوں میں اس کی قدر و قیمت ہو جاتی ہے۔

۷۔ تجارت سے محبت۔ اس سے مراد کاروبار بھی ہو سکتا ہے اور دکان کا سامان بھی ہو سکتا ہے۔ زمانہ جنگ میں اچھے اچھے کاروبار رہ جاتے ہیں۔ مکہ کے کچھ مسلمان تاجر تھے۔ ان کی دوکانوں میں سامان تجارت تھا خریداروں کی اکثریت مشرکین کی تھی دکانیں حج کے موسم میں لگتی تھیں اور مشرکین کی حج میں شرکت پر اسلامی حکومت سرکاری طور پر قدغن قائم کر چکی تھی۔

۸۔ پسندیدہ مکانوں کی محبت، کرایہ کے مکان سے کون محبت نہیں کرتا ہے مکہ میں کچھ مسلمانوں کے مکان ہوں گے جن میں زندگی کی ساری آسائشیں موجود ہوں گی۔ اور مکہ میں کچھ مکان بصورت جائداد ہوں گے جن کو ایام حج میں کرایہ پر چڑھاتے ہوں گے۔ حالت جنگ میں دونوں مفادات خطرہ کا شکار ہو جاتے ہیں بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ حالت جنگ ہے اور مشرکین کی شرکت قانوناً ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ بہر حال یہ آٹھ قسمیں ہیں قرابت زوجیت منافع اور رہائشی مکانات یہ سب ہی اس کی متقاضی تھیں جنگ نہ ہو کیوں کہ جنگ کی حالت میں ان محبوبات کو چھوڑنا پڑے گا۔

قرآن نے اس آیت میں اہم اور بنیادی بات یہ بتائی ہے جیسا کہ امام رازیؒ نے سمجھا ہے کہ اگر ان محبوبات میں اور محبت ایمانی میں مقابلہ ہو جائے تو مومن وہ ہے جس پر ان تمام الفتوں میں سے کسی الفت کا جادو نہ چل سکے اور کوئی علاقہ بھی اسے اتباع حق سے نہ روک سکے۔

اس آیت قرآنی میں تفصیل کے ساتھ ان سارے عواقب کی طرف اشارا کر دیا ہے جو اسلامی زندگی اختیار کر لینے کے بعد غیر متوقع نہیں ہوتے ہیں یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ باپ بیٹے اور بیٹا باپ سے بھائی اپنے بھائی سے شوہر اپنی بیوی سے علیحدہ ہو جائے کنبہ برادری روٹھ جائے اپنا جمع کیا ہوا مال ہاتھوں سے نکل جائے چلتی ہوئی تجارت میں روڑا اٹک جائے اپنے رہائشی مکان ترک کرنے پڑ جائیں مگر بتلاؤ ایسے وقت میں تم کس کا ساتھ دو گے اگر کہیں عزیزوں کا ساتھ دیا تو یہ اس کا ثبوت ہو گا۔ کہ جو ایثار و قربانی کا عہد تم نے اپنے خدا سے باندھا تھا وہ غلط تھا پھر جو اس عہد شکنی کی پاداش ہو اس کا انتظار کرنا چاہیے۔

اسلام بتلاتا ہے کہ عزیزوں کے بڑے حقوق ہیں اور سب حقوق کی رعایت کرنا انسان کا فرض ہے مگر اللہ اور حضور اقدس ﷺ کا حق سب سے مقدم ہے اور اسی لیے جب کسی حق کی ادائیگی میں ان کا حق رہ جانے کا اندیشہ ہو تو ان کا حق مقدم کرنا ہو گا۔ والدین اپنی جگہ بہت زیادہ حقدار ہیں مگر اللہ سبحانہ اور ذات نبوت کا حق ان سے بہت زیادہ ہے اسی لیے آغاز آیت میں انداز بیان ہے کہ اگر تمہارے والدین ایمان پر کفر کو ترجیح دین اور اللہ سبحانہ کے حق کو فراموش کرنے لگیں تو پھر تمہارا یہ فرض ہے کہ تم ان کے حق کو نظر انداز کر دو۔

قرآن کی آیت دراصل ہمارے سامنے ایک تاریخی حقیقت پیش کر رہی ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے ابتدائی دور میں خدا اور رسول پر ایمان لانا اور والد اور اولاد کے درمیان سب سے بڑے افتراق کا سبب تھا۔ بہت ممکن تھا کہ ان رشتوں کی محبت اسلامی سعادت حاصل ہونے میں رکاوٹ ہوتی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع پر یہ محبتیں وقت کے تقاضوں میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئیں۔
یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر باپ کے لیے کبھی ایسا موقع آ جائے کہ اسلام کی وجہ سے اولاد چھوڑنی پڑے یا اولاد کے لیے ایسا حادثہ پیش آ جائے کہ اسلام کی خاطر اپنے والدین کو خیرباد کہنا پڑے تو ایمان یہ ہے کہ یہ قربانیاں کر گذرے۔

حُبِّ ایمانی کیا ہے

محبت ایک باطنی کیفیت ہے جو آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتی اور نہ کسی اور طرح محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس کا تو صرف قالب ہی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور جب واقعہ یہ ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ قالب بھی دراصل اس کے اَن دیکھے وجود کا واحد ثبوت ہے اس لیے محبت الٰہی کے معنی و مقصود کو سمجھ لینا اس پر موقوف ہے کہ قرآن سے اس کے عملی مظاہر معلوم ہوں۔ قرآن حکیم یہ

نے اللہ سبحانہ کی محبت کے عملی مفہوم کی کئی جگہ وضاحت کی ہے سب سے اصولی اور جامع وضاحت سورہ آل عمران کی اس آیت میں ہے۔
قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

یہ آیت محبت الٰہی کے موضوع پر جہاں دوسرے اہم اور بنیادی مسائل سے بحث کرتی ہے وہی اس کی اصل روح اور حقیقت کی بھی نشاندہی کرتی ہے کیونکہ جب وہ کہتی ہے کہ اللہ کی محبت کا واحد راستہ اللہ کے رسول محمد رسول اللہ کی پیروی ہے تو اس سے صرف حضور اقدس ﷺ کی اتباع کی فرضیت ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی مطلوبہ محبت اپنے ٹھیک اور معیاری مفہوم میں ٹھیک وہی محبت ہے جو اس کے رسول میں موجود تھی۔ حضور اقدس کے سینے میں اپنے اللہ سے جو محبت تھی وہ کیسی اور کس نوعیت کی تھی۔ اس سوال کا جواب ظاہر ہے کہ صرف آپ کی عملی زندگی ہی دے سکتی ہے۔ اس مبارک اور نمونہ کی زندگی کا جس کا ایک ایک خط وخال قرآن حدیث اور سیرت کی کتابوں میں ابھرے نقوش کی طرح بالکل نمایاں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ محبتِ الٰہی کا فطری تقاضا ضروری مظہر اور واحد لازمی ثبوت حضور اقدس ﷺ کا اتباع ہے جو شخص اس اتباع میں جتنا زیادہ بڑھا ہوگا اتنا ہی زیادہ اللہ سے محبت کرنے والا ہوگا اور جو اتباع سے جتنا زیادہ ناقص ہوگا اتنا ہی زیادہ محبت سے محروم ہوگا اتباعِ رسول اتنا معروف لفظ ہے جس کے لیے کسی شرح کی ضرورت نہیں ہے اس کا مدعا مسلم طور پر یہ ہے کہ آپ کے جمیع احکام میں اطاعت کی جائے۔ ایمان وعمل اخلاق وآداب اور زندگی کے طور طریقوں میں آپ ہی کے نقوشِ قدم کو دلیل راہ بنایا جائے۔ آپ کی زندگی کیا اور کیسی تھی دو لفظوں میں اس کا جواب دیا جا سکتا ہے کہ آپ کی زندگی مجسم قرآن تھی۔ قرآن اگر پرستش وبندگی کا مکمل ہدایت نامہ تھا تو آپ اس ہدایت نامہ کی مکمل تصویر تھے۔ اس ہدایت کی تعمیل میں اگر قائم باالعمل مجاہد تھے خشیت وانابت کے پیکر تھے۔ صبر وشکر کے مجسمے تھے اور آخرت کے طالب اور رضائے مولیٰ کے آرزومند تھے تو دوسری طرف گھر کے اندرونی گوشوں سے کر تمدن وسیاست کے آخری کناروں تک کوئی میدان کار ایسا نہیں جس میں آپ معروف نہ ہوں۔ یہی زندگی ہے جو قرآنی فیصلے کے تحت محبتِ الٰہی کا واحد عملی مفہوم اور اس کی حقیقت کا واحد لازمی مظہر ہے اس لیے جس کی محبت الٰہی عمل کے اس قالب میں ظاہر نہ ہوتی ہو وہ قرآن کی مطلوبہ محبت ایمانی نہیں ہو سکتی محبت کے نام پر اور کوئی چیز ہو گی۔

محبت ایمانی کا یہ مفہوم اتنا واضح ثابت اور بدیہی ہے کہ قرآن پر ایمان رکھتے ہوئے اس سے کسی طرح اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس میدان میں جس نے دادِ تحقیق دی ہے تو یہی بات بتائی ہے کہ اللہ سبحانہ اور اس کے رسول کی طاعت کے بغیر محبت ایمانی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم متکلمین کی ترجمانی کر رہے ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ کی محبت کا اصل اور بنیادی مفہوم اس کی ذات کی محبت نہیں بلکہ اس کی اطاعت وغلامی کی محبت یا اس کے اجر واحسان کی

بت ہے لے یا اللہ کی اطاعت پر جماؤ ہی اس کی محبت ہے ٹے

یہ حقیقت کی ہماری رائے میں صحیح تعبیر نہیں ہے۔ بات صحیح وہی ہے جو جمہور علمائے اہل السنۃ نے بیان کی ہے کہ بت الٰہی سے مراد اللہ سبحانہ کی ذات کی محبت ہے ٹے

یکن اس کے باوجود اس موضوع پر بھی دو رائیں نہیں ہیں کہ طاعت لوازم محبت سے ہے۔ یعنی جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ سورج تو چمک رہا ہو مگر روشنی اور گرمی نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ دل میں اللہ کی محبت تو موجود ہو مگر زندگی میں اس کے احکام کی پیروی نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آگ ہو اور تپش نہ ہو۔ جب دل میں محبت کی انگیٹھی دہک رہی ہے لازماً اس میں گرمی کی لپٹیں بھی ہوں گی امام غزالی فرماتے ہیں۔ نعم هذا الحب يستلزم الطاعة ٹے

محبّت عقلی یا محبّت طبعی

محبت ایمانی کا یہ عملی مفہوم اس حقیقت پر سے پردہ اٹھانے کے لیے قطعاً کافی ہے کہ محبت ایمانی قطعی طور پر عقلی نوعیت کی ہے۔ کیونکہ یہ اعمال و اوصاف جو قرآن نے محبت ایمانی کے ضروری مظاہر کی حیثیت سے بیان کیے ہیں طبعی محبت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ یہ بداہتہً عقلی محبت اور ایمانی عقیدت ہی کے مظاہر ہو سکتے ہیں۔

غور فرمایئے کہ جب محبت الٰہی کے لیے اتباع نبوت کو شرط قرار دیا ہے تو اس کی تہ میں کونسی محبت کارفرما ہو سکتی ہے عقلی اور اعتقادی قسم کی یا طبعی اور جذباتی قسم کی کوئی شک نہیں کہ یہ محبت اپنی اصل نوعیت میں عقلی و اعتقادی ہی محبت تھی۔ طبعی اور جذباتی ہرگز نہیں تھی۔ کیونکہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ دل کے اندر جو کچھ ہوتا ہے اعمال میں وہی ڈھل کر سامنے آتا ہے دوسرے لفظوں میں حرکات و اعمال انسان کی اندرونی کیفیت کے سچے ترجمان ہوتے ہیں اس لیے اگر دل میں اللہ سبحانہٗ کی طبعی محبت ہوتی ہے تو خارج میں اس کا ظہور انہی شکلوں میں ہوتا ہے جو اس محبت کا فطری تقاضا ہیں ایسی صورتوں میں ہرگز نہ ہوتا جو عقلی محبت کا تقاضا ہیں۔ اسی طرح اگر دل اللہ سبحانہ کی عقلی محبت سے سرشار ہو تو انسان سے وہی اعمال صادر ہوں گے جن کا اس محبت کا مزاج مطالبہ کرتا ہے نہ کہ وہ اعمال جن کا طبعی محبت مطالبہ کرتی ہے۔ حضور اقدس

ٹے تفسیر کبیر میں ہے انا قلنا نحب الله فمعناه نحب طاعة الله وخدمته او نحب ثوابه واحسانه۔ جلد دوم

ٹے شرح مسلم للنووی میں ہے۔ محبتهم استقامتهم على الطاعة

ٹے علامہ آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں۔ المحبة تتعلق حقيقته بذات الله تعالى وينبغي للكامل ان يحب الله لذاته

ٹے اس موضوع پر سیر حاصل بحث حافظ ابن تیمیہ کی النبوات، حافظ ابن القیم کی کتاب روضۃ المحبین، امام غزالی کی احیاء العلوم اور اس کی شرح اتحاف السادۃ المتقین میں

ٹے روح المعانی جلد سوم

کے اعمال حیات صاف پکارتے ہیں کہ وہ جس تخم محبت کے برگ وبار ہیں وہ اصلاً اللہ سبحانہ کی عقلی محبت ہے نہ کہ طبعی۔ کیونکہ طبعی محبت کے اعمال و مظاہر بالکل دوسرے ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ہوتے جو حیات مبارکہ میں پائے جاتے ہیں۔

محبت الٰہی کی یہ نوعیت جو قرآنی ارشادات سے واضح ہو رہی ہے اور جو عقل کا بہترین تقاضا بھی ہے۔ اہل نظر سے کبھی پوشیدہ نہیں رہی ہے چنانچہ حضرت ابن عطار رحمۃ اللہ علیہ سے جب محبت الٰہی کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا:

محبت ایسی ڈالیوں کا نام ہے جو دل کی زمین میں نصب کی جاتی ہیں اور بقدر عقل پھل دیتی ہیں۔

بقدر عقل علی قدر العقول کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ کہنے والے کے نزدیک محبت کا سرچشمہ انسان کی عقل ہے نہ کہ اس کی طبیعت اور طبعی جذبات۔

اسی طرح مولانا اسماعیل الشہید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اس جگہ ایک بڑا ہی باریک نکتہ قابل توجہ ہے جس سے آج کل اکثر لوگ غافل ہیں اور اسے فراموش کر بیٹھے ہیں کہ وہ حبِ نفسانی جسے عشق کہتے ہیں اور حبِ ایمانی عقلی کہتے ہیں ان دونوں میں فرق ہے۔

مولانا موصوف کے اس بیان سے صرف یہی معلوم نہیں ہوتا کہ محبت الٰہی کی دو الگ الگ قسمیں ہیں۔ ایک حب نفسانی جسے عشق کہتے ہیں دوسری حب ایمانی جس کا مشہور نام حب عقلی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام و قرآن کو مطلوب دوسری ہی محبت ہے۔ نہ کہ پہلی۔

ایک اور ارشاد سنیئے جو اس موضوع پر صراحت کی آخری حد کو پہنچا ہوا ہے حکیم الامت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے جس محبت کا حکم ہے وہ حب عقلی ہے نہ کہ طبعی اسی لیے نصوص میں حب طبعی عشق کا عنوان کہیں مذکور نہیں بلکہ جا بجا حب کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوا کہ حب طبعی مراد نہیں بلکہ حب عقلی مطلوب ہے [1]

دونوں میں بنیادی اور جوہری فرق ہے حب عقلی محب اور چاہنے والے میں کامل فرزانگی چاہتی ہے جب کہ حب عشقی دیوانگی چاہتی ہے قرآن نے صحابہ کا جو چہرہ پیش کیا ہے یہ ہے۔

اذا ذکروا بایات ربھم لم یخروا علیھا صما و عمیانا

جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات پیش کی جاتی ہیں وہ بہرے اور اندھے ہو کر ان پر نہیں پڑتے ہیں۔ بلکہ کانوں سے سن کر آنکھوں سے دیکھ کر پورے شعور بالغ کے ساتھ اللہ کے احکام کی بجا آوری کرتے ہیں۔

حب طبعی میں عبادت کا مقصود صرف محبوب کی رضا ہوتا ہے جبکہ حب عقلی میں عبادت کا مقصود وصال خدا ہوتا ہے

[1] صراط مستقیم
[2] شریعت اور طریقت

دونوں میں فرق ہے یہ اور اس قسم کی بہت سی باتوں میں دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں۔ بہرحال قرآن و سنت کی دعوت عشق الٰہی حب طبعی کی نہیں بلکہ ایمانی محبت اور حب عقلی کی ہے۔ یہ اہل ایمان میں حب عقلی ہی ہے کہ اس کے مقابلے میں کسی اور کی محبت کو وہ ذرہ برابر اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ والذین امنوا اشد حُبًّا لِلّٰهِ ۔ یہ وہ محبت ہے جس سے دل کا خالی ہونا دین سے پھر جانے کے مترادف ہے۔ من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ اسی طرح اس نے ان لوگوں کے دعویٰ ایمان کو تسلیم کرنے سے پوری شدت کے ساتھ انکار کر دیا اور انہیں اس آیت میں عذاب کی کھلی دھمکی دی جو دوسری محبتوں کو اللہ کی محبت پر غالب کریں۔ غرض قرآن حکیم نے اللہ سبحانہ کی غایت تعظیم اور انتہائی محبت کو اہل ایمان کا خاصہ اور ایمان کی شرط لازم قرار دیا ہے اور اس حقیقت پر کوئی پردہ نہیں رہنے دیا ہے کہ محبت الٰہی کے بغیر اطاعت و عبادت کا وجود ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کسی سوکھی ڈالی سے پتوں اور پھولوں کا نکلنا ناممکن ہے۔

مُحبّت ایمانی میں صحابہؓ کا مقام

محبت ایمانی کی اس آزمائش میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جس طرح پورے اترے اس کی شہادت تاریخ نے محفوظ کر لی ہے۔ بلاشائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ نے اپنے سارے دل اور ساری عقل کے ساتھ ایسی محبت نہ کی ہوگی جیسی صحابہ نے اللہ سبحانہ سے کی۔ انھوں نے اس محبت کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا جو انسان کر سکتا ہے اور پھر اسی کی راہ سے سب کچھ پایا جو انسانوں کی کوئی جماعت پا سکتی ہے۔

انسان جب کسی مقصد کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے تو دو طرح کی حالتیں پیش آتی ہیں۔ کچھ جوانمرد اور باہمت ہوتے ہیں وہ بلا تامل مصیبتیں جھیل لیتے ہیں لیکن ان کو جھیلنا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں ہوتی کہ مصیبتیں ان کے لیے مصیبتیں نہ رہی ہوں عیش و راحت ہو گئی ہوں۔ کیونکہ پھر مصیبت مصیبت ہے باہمت کڑوا گھونٹ بغیر کسی جھجک کے پی لے گا لیکن اس کی کڑواہٹ کی یہ بدمزگی ضرور محسوس کرے گا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو صرف باہمت ہی نہ کہنا چاہیے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ سمجھنا چاہیے۔ ان میں صرف ہمت اور جوانمردی ہی نہیں ہوتی بلکہ محبت و شیفتگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے وہ مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح جھیلتے ہی نہیں بلکہ عیش و راحت کی طرح ان سے لذت و سرور حاصل کرتے ہیں۔ راہ محبت کی مصیبت ان کے لیے عیش و راحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے۔ اگر اس راہ میں ان کو کانٹوں پر لیٹنا پڑے تو کانٹوں کی چبھن میں ان کو ایسی راحت ملے جو کسی کو پھولوں کی سیج پر لوٹ کر نہیں مل سکتی۔ حتیٰ کہ اس راہ کی مصیبتیں جس قدر بڑھتی جاتی ہیں اتنی ہی زیادہ ان کے دلوں کی کلیاں کھلتی جاتی ہیں ان کے لیے صرف اس بات کا تصور کہ یہ سب کچھ کسی کی راہ میں پیش آ رہا ہے اور اس کی نگاہیں ہمارے حال سے بے خبر نہیں ہیں عیش و سرور کا ایک ایسا بے پایاں جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی سرشاری میں جسم کی کوئی کلفت اور

ذہن کی کوئی اذیت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ یہاں لوگوں کی بات ہو رہی ہے جو خدا کی محبت کیا خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا ہے لیکن حضور اقدس ﷺ کی تعلیم نے ان کو کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا اور ان کو ذات الٰہی کے ساتھ وابستگی محبت اور رشتہ کا کے لطف سے کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا واقعات تاریخ کی آغوش میں ان گنت ہیں۔ انشاء اللہ کسی دوسرے موقعہ پر ان سے روشناس کیا جائے گا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت

اس آیت میں دو محبتوں کا ذکر ہے اللہ کی محبت اور اللہ کے رسول کی محبت۔ اللہ کی محبت بالذات ہے اور حضور کی محبت اللہ کے رسول ہونے کی وجہ سے ہے ایسے ہی درجہ بدرجہ سب کی محبت ہے صحابہ کی محبت۔ انصار کی محبت عرب کی محبت اولیاء اللہ کی محبت، خانہ کعبہ کی محبت، محبوب بالذات تو صرف اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے باقی جس سے بھی محبت ہے وہ اللہ کی وجہ سے ہے۔ چونکہ قرآن نے اللہ کی محبت کی نشانی حضور اقدس ﷺ کی اتباع کو قرار دیا ہے اس لیے حضور کی محبت بھی ایمانی محبت کا حصہ ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ:

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے تم میں سے کوئی مومن ہو نہیں سکتا جب تک میں اسے اپنے بیٹے باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں۔

شیخ بدرالدین عینی لکھتے ہیں کہ محبت کے تین اسباب ہیں۔ کمال، جمال، احسان اور یہ تینوں اوصاف حضور اقدس سے زیادہ کسی میں موجود نہیں۔ آپ کا کمال تو اسلامی قانون و شریعت سے ظاہر ہے۔ آپ کا جمال احادیث شمائل میں موجود ہے آپ کی روحانی و جسمانی حسن کاریوں کا اندازہ ہی کون کر سکتا ہے۔ پھر آپ کی محبت تمام مخلوقات سے زیادہ کیوں نہ ہو، باپ بیٹے کی محبت طبعی ہے اور حضور اقدس ﷺ کی محبت عقلی ہے۔ حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ کمال یہ ہے کہ تقاضائے عقل تقاضائے طبیعت پر غالب آجائے۔ ایمان صرف عقائد و اعمال ہی کا نام نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جن سے شدہ شدہ مومن کا قلب مزین و رنگین ہو جاتا ہے۔ شفا میں سیرت محمد بن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ جنگ احد میں ایک انصاری عورت کا باپ بھائی شوہر تینوں شہید ہو گئے۔ جب اسے خبر ملی تو اس نے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ تو بخیریت ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں بخیر ہیں۔ اس نے کہا چلو مجھے دکھلا دو تاکہ میں خود آپ کے روئے مبارک کو دیکھ لوں جب اس نے آپ کو دیکھ لیا تو بولی کل مصیبۃ بعدك جلل۔ جب آپ زندہ ہیں سلامت ہیں تو آپ کے بعد ہر مصیبت آسان ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ذات انور ہمیں اپنے مال اولاد اور والدین اور پیاس میں سرد پانی سے زیادہ عزیز تھی۔ اہل مکہ جب زید بن دثنہ کو قتل کے لیے حرم سے باہر لے چلے تو ابو سفیان بولا زید قسم کھا کر کہو

کیا اس وقت تمہیں یہ پسند ہے کہ محمد ﷺ تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر ہوتے۔ زید نے قسم کھا کر کہا مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں کہ میں گھر میں ہوں اور یہاں آپ کے جسم میں ایک کانٹا بھی چبھے۔ ابو سفیان کہنے لگا میں نے کسی کو اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنا کہ محمد ﷺ کے ساتھی آپ سے محبت کرتے ہیں۔

قاضی عیاض نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا آپ مجھے اپنے اہل اور مال سے زیادہ محبوب ہیں مجھے یاد آتی ہے تو صبر نہیں آتا جب تک یہاں آ کر آپ کو دیکھ نہیں لیتا اب غم یہ ہے کہ وصال مبارک کے بعد آپ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوں گے وہاں میں آپ کو کیسے دیکھا کروں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اولئک الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا۔ جو لوگ اللہ و رسول کا کہا مانتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین۔ اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی اچھی ہے —— آپ نے اس کو بلا کر یہ آیت سنادی لکھا ہے کہ عبد اللہ بن زید بن عبد اللہ اپنے باغ میں کام کر رہے تھے۔ دفعتاً ان کے فرزند پہنچے اور حضور اقدس ﷺ کے وصال کی خبر دی اسی وقت دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور کہا کہ اے اللہ مجھے نابینا کر دے کہ ان آنکھوں سے اب کسی کو نہ دیکھ سکوں۔ یہ اور اس قسم کے بیشمار واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے صحابہ کو آپ سے ایسی ہی محبت تھی جیسا کہ حدیث انس میں موجود ہے بدقسمتی سے اگر کسی کو یہ مقام حاصل نہیں تو وہ ان کی محبت میں تاویل نہ کرے جن کو یہ مقام حاصل تھا۔

اس آیت میں احب الیکم من اللہ و رسولہ یعنی اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ محبوب ہوں۔ دونوں کی محبت کی یکجائی بتا رہی ہے کہ دونوں کی محبت مطلوب ہے۔ اگر حق تعالیٰ شانہ کی محبت خالق مالک رازق معبود ہونے کی وجہ سے تو آپ کی محبت اللہ کا رسول ہونے ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کی محبت کی وجہ سے ہے یعنی اللہ کی محبت آپ کی محبت کے بغیر بے معنے ہے، ترمذی کی ایک حدیث میں اس بات کو ذرا کھول کر سمجھایا گیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے اللہ سے محبت رکھو۔ کیونکہ وہ تم کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے، اور مجھ سے محبت رکھو اللہ کی محبت کی وجہ سے اور میرے اہل بیت سے محبت رکھو میری محبت کی وجہ سے۔

اس حدیث میں اللہ سبحانہ کی محبت کا سب سے آسان طریقہ یہ بتلایا گیا ہے کہ تم ان نعمتوں کو دیکھو جو شب و روز —— بلا محنت و جہد اور بلا کسی استحقاق کے تم کو میسر ہیں اللہ سبحانہ کی محبت پیدا ہو جائے گی۔ جب اللہ سبحانہ کی محبت تمہارے دل میں ہو جائے گی تو لازمی طور پر رسول کی محبت بھی دل میں گھر کر جائے گی کیونکہ رسول کا رشتہ اللہ سے ہی ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے تمہاری ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اور واسطہ ہدایت ہونے کی وجہ سے اس کی ذات پوری کائنات میں قیمتی ہے اس لیے رسول کی

محبت پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو بارگاہ محبت کا وسیلہ سمجھو۔ اسلام میں محبت کا اصل محور و مرکز اللہ کی ذات ہے اور یہی اس کی توحید کا امتیازی مقام ہے کہ انسان کے قلبی علائق کے گوشے صرف ایک ذاتِ اقدس کے لیے وقف رہیں جس سے بھی محبت کی جائے اس کی وجہ سے کی جائے اسی لیے اذان واقامت میں اعلان توحید کے ہمرکاب اعلان رسالت رکھا گیا ہے تاکہ اللہ کی محبت کے بعد رسول اللہ کی محبت وعظمت قلب میں خود بخود جاگزیں ہو جائے اور اسی لیے قرآن حکیم میں اللہ نے اپنی محبت کو حضور انور کی اتباع پر موقوف کیا ہے ابو سلیمان الدارانی فرماتے ہیں کہ جب لوگوں نے خدا کی محبت کے دعوے اور نعرے لگانے شروع کیے تو اللہ سبحانہ نے یہ آیت محنت نازل فرمادی۔ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی۔ یعنی علامت ودلیل محبت الٰہی صرف اتباع رسول ہے گویا اصل محور ومرکز اللہ سبحانہ کی محبت ہے اور اس کا صحیح معیار اللہ کے رسول کی اتباع ہے اب ہر شخص اپنے متعلق ولی ہونے یعنی خدا کی محبت کا مدعی بنے مگر رسول کی عظمت ومحبت سے وہ تہی دامن ہے۔ یا رسول کی محبت کا دم بھرتا ہے مگر اللہ سبحانہ کی عظمت ومحبت سے خالی ہے۔ وہ سراسر دھوکہ میں ہے۔ رسول کی عظمت ومحبت اس کا احترام اور اولین فریضہ ہے اور یہ اس لیے ہے کہ وہ اس باعظمت ذاتِ کبریا کا رسول ہے جس کی تمام کائنات مخلوق ہے رسول کی صحیح محبت یہ ہے۔ اپنے خود تراشیدہ خیالات پر رسول کی محبت کرنا صحیح محبت نہیں۔ اس علاقہ کو ذرا وسعت دو تو رسول کے اہلبیت سامنے آتے ہیں ان سے محبت اس لیے ضروری ہے کہ رسول کی محبت ضروری ہے۔ اب اگر کوئی شخص رسول کی محبت کا مدعی ہے مگر اہل بیت کی محبت نہیں رکھتا یا اہل بیت کی محبت کا نعرہ لگاتا ہے مگر اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے آثار اس میں نہیں پائے جاتے کیا ہم اسے صحیح محبت والا کہہ سکتے ہیں۔ رسول کا رشتہ جس طرح اہل بیت کے ساتھ ہے اسی طرح اس جماعت کے ساتھ ہے جن میں اس نے شب و روز گذارے، جنھوں نے اس کے لیے جانیں قربان کردیں۔ اور اس کی رفاقت میں تمام علاقے ختم کردے۔ اگر کوئی شخص　اس کی جماعت سے بغض رکھے تو کیا تم اسے رسول سے محبت کرنے والا کہو گے۔ ارشادِ نبوت ہے۔

> میرے صحابہ کے بارے میں خوفِ خدا رکھنے اور میرے بعد ان کو ہدفِ ملامت نہ بنانا یاد رکھو جو ان سے محبت رکھے گا وہ میری وجہ سے محبت رکھے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ میری وجہ سے بغض رکھے گا اور جو ان کو تکلیف دے گا اس نے بلاشبہ مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ کو تکلیف دی۔ بس قریب ہے وہ اس کی گرفت کرے[1]

بخاری ومسلم میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ:

> حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے انصار سے صرف مومن محبت رکھے گا اور ان سے صرف منافق بغض رکھے گا۔ جو ان سے محبت کرے گا۔ اللہ ان سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا اللہ ان سے بغض رکھے گا۔

[1] ترمذی عن عبد اللہ بن مغفل۔

یہ پہلے تبلایا جاچکا ہے کہ اسلام میں محبت کا مرکز صرف اللہ کی ذات ہے پھر جہاں تک بھی اس کی شعاعیں پھیلتی جاتی ہیں۔ سب کا منشا وہی ذاتِ گرامی ہے رسول سے محبت اللہ کی وجہ سے صحابہ سے محبت رسول کی محبت کی وجہ سے انصار کی محبت بھی رسول کی محبت کی وجہ سے اور پھر عرب سے محبت رسول کا وطن ہونے کی وجہ سے۔ اس لیے محبت میں اصل مرکز اللہ کی ذات ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جس طرح رسول کی طاعت اللہ کی طاعت ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ اسی طرح ٹھیک رسول کی محبت اللہ کی محبت ہے نہ طاعت میں اللہ ورسول کے درمیان تفریق ہے اور نہ محبت میں ان کے درمیان تقسیم ہو سکتی ہے ایک کا محب دوسرے کا محب ہے اور ایک کا محبوب دوسرے کا محبوب بن کر رہتا ہے۔

بہرحال قرآن کی اس آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ زندگی کے فوائد اور مرافق سے اللہ ورسول کا مقابلہ ہو جائے تو ایمان یہ ہے کہ اللہ ورسول کو مقدم رکھے۔

اپنے ایمان کا احتساب کیجئے

آیئے اس آیت کی روشنی میں ہم اپنے ایمان کا احتساب کریں۔ صحابہ کرام کے ایمان اور ہمارے ایمان میں بنیادی فرق ہے۔ ہمارا ایمان وہ ایمان نہیں جسے عہد رسالت کے مسلمانوں نے قبول کیا تھا اور جس پر انھوں نے اپنی زندگی کی بنیادیں استوار کی تھیں۔ وہ ایک جاندار انقلاب انگیز اور متحرک نظامِ فکر وعمل تھا جس کا خمیر محبت کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہوا تھا جس میں ایثار وقربانی اور سرفروشیوں کی ایک دنیا آباد تھی اور جس میں محض افراد کی شخصی نجات کا نہیں بلکہ پورے عالمِ انسانیت کی نجات کا تصور اور جذبہ کارفرما تھا۔ صحابہ کرام ایک نظامِ تمدن اور طرزِ زندگی کے داعی تھے ایک عالمگیر نصب العین کے نمائندے تھے اور ایک جہانی اور عالمگیر مقصد کے علمبردار تھے چنانچہ ان کے اعمال وعبادات کی قدر وقیمت اسی نسبت سے متعین کی جاتی تھی جس نسبت سے وہ اس نصب العین اور غایت اولیٰ کی تقویت کا باعث ہوتے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ ان کے اخلاص واتقاء کا پیمانہ تھا اور خدا کے ہاں ان کا اجر بھی اسی پیمانہ سے تقسیم ہوتا تھا۔ اسلامی نصب العین کی ترقی اور اسلامی نظام تمدن اور طرز تفکر کی دعوت ان کی زندگی کا اتنا بڑا سرمایہ تھا کہ اگر کبھی ان سے اس کام میں کوتاہی ہو جاتی تو ساری عبادتیں اور ریاضتیں ان کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتیں۔

قرآن کی زیر تشریح آیت کو کررسہ کرر پڑھیئے اور غور کیجیے کہ یہ مخاطبت کن لوگوں سے ہے۔ ان سے جن کی نمازیں یکسر خلوص وخشیت سے معمور تھیں۔ جن کے اعمال صالحہ اور فضائل اخلاق دنیا کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے جن کے درجات اور علو مرتبت پر خود قرآن گواہی دے رہا ہے اس کے باوجود انہیں چیلنج دیا جا رہا ہے کہ اگر زندگی کی محبتوں اور الفتوں نے دین حق کی اقامت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی راہ میں ادنیٰ سی رکاوٹ بھی پیدا کی تو پھر خدا کے حکم کے منتظر رہو۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ
اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ
عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ
اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ
جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ
نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ
وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ
اِنْ شَاۗءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾

مسلمانو! اللہ سبحانہ نے تمہاری بہت سے مواقع پر مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب تم اپنی افرادی طاقت پر نازاں تھے اور وہ افرادی طاقت تمہارے کچھ کام نہ آئی۔ زمین ساری پہنائیوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی تھی پھر تم نے میدان جنگ میں پیٹھ دکھادی تھی۔ پھر اللہ نے اپنے رسول اور اہل ایمان پر سکینت نازل فرمائی اور ایسی فوجیں اتاریں جو تمہیں نظر نہیں آرہی تھیں اور کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کو سزا دی۔ یہی بدلہ ہے حق کا انکار کرنے والوں کا۔ ۲۶ پھر اس کے بعد اللہ اپنی رحمت کا معاملہ فرمائے گا جس سے

چاہے گا اور اللہ بڑا ہی مغفرت والا اور مہربان ہے[۲۷]۔ مسلمانو! مشرکین نجس ہیں لہٰذا وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے نزدیک نہ آئیں[۲۸]۔ اور اگر تمہیں اس وجہ سے معاشی بدحالی کا اندیشہ ہو تو گھبراؤ نہیں اللہ سبحانہ تمہیں اپنے فضل سے عنقریب غنی بنا دے گا۔ اللہ دانائی اور علم والا ہے[۲۶]۔

معانی مفردات

حنین جگہ کا نام ہے۔ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں اسے ذی المجاز کے پہلو میں طائف کے قریب ایک وادی بتایا ہے اور لکھا ہے کہ مکہ اور حنین کا فاصلہ عرفات کی جانب سے دس میل ہے۔ کچھ کی رائے میں چھ میل ہے اور واقدی کی رائے میں تین میل ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی طائف سے تین میل بتایا ہے۔ اکثر شارحین قرآن اور سیرت نگاروں کے خیالات اسی کے لگ بھگ ہیں۔ سب یہی کہتے ہیں کہ طائف اور مکہ کے درمیان جگہ کا نام ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حجاز کے ان دو شہروں کے درمیان جس قدر راستے ہیں ان میں کسی پر حنین نامی کوئی جگہ نہیں ہے۔ میری معلومات کے مطابق ڈاکٹر حمید اللہ پہلے محقق ہیں جنھوں نے حنین کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ حنین کے تعین کا ایک بدیہی طریقہ یہ ہے کہ معلوم کیا جائے کہ حضور اقدس ﷺ جنگ حنین کے بعد کس راستہ سے طائف گئے اس قرینے سے کام لے کر ڈاکٹر حمید اللہ نے وہ مقام متعین کر لیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ کے بعد حنین سے نخلۃ الیمانیہ گئے۔ پھر قرن اور ملیح ہوتے ہوئے وادی لیہ کے مقام بحرہ الرغاء پہنچے جہاں ایک روز قیام فرمایا۔ لیہ میں مالک بن عوف النصری کا قلعہ تھا وہاں سے ہوتے ہوئے آپ نخب پہنچے جسے الیقفرہ بھی کہتے ہیں۔ پھر طائف کے قریب نزول فرمایا۔ اسی قرینے کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے مکہ مکرمہ سے قرن تک سفر کا نقشہ یوں بتایا کہ پہلے جعرانہ پھر نخلۃ الیمانیہ۔ پھر قرن۔ جنگ حنین جعرانہ اور نخلۃ الیمانیہ کے درمیان ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے حنین کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس[۳۰] چالیس میل بتایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حنین کو مکہ یا طائف کے راستوں پر نہیں بلکہ اسے مکہ سے شمال مشرق اور طائف سے شمال مغرب میں تلاش کرنا چاہیے۔

عیلۃ۔ فقر تنگدستی۔ معاشی بدحالی۔ اسی سے عائل ہے تنگدست کے معنے میں۔

غزوۃ حنین

اسلام کی کامیابی جہاں قریش مکہ کی پشتینی اقتدار کے لیے نیز تولیت کعبہ کے سلسلے میں خودغرضی کی بنا پر تراشے ہوئے

اوضاع واطوار کے لیے پیام مرگ تھی اس وجہ سے جوش غضب نے انہیں پاگل کردیا تھا وہاں بعض دوسرے قبائل کے نزدیک کا ایال ناقابل برداشت تھی جو کثرت تعداد مہارت فنون جنگ اور قوت وطاقت کی بنا پر ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ انہیں بھی خیال ہو گیا تھا کہ نو مولود قوت مرکز عرب یعنی مکہ مکرمہ پر قابض ہو جائے گی تو ان قبائل کی خود رائی ضغطے میں پڑ جائے گی۔ ان میں سے ہوازن ثقیف بطور خاص قابل ذکر ہیں جو طائف اور اس کے اطراف میں مقیم تھے چنانچہ جب اسلامی قوت کے تدریجی ارتقاء سے قریش پر ایک گونہ بیچارگی کی حالت طاری ہوگئی تو ہوازن وثقیف کے رؤساء نے عرب کا دورہ کر کے مختلف قبیلوں کو مسلمانوں کی مخالفت پر ابھارا اس اثناء میں یکایک مکہ مکرمہ پر اسلام کا قبضہ ہو گیا۔ تو ہوازن وثقیف معاً جنگ کے لیے تیار ہو گئے ان کو یہ خیال بھی ہوگا کہ مسلمانوں کو شکست دیے کر وہ اپنی آزادی ہی کے لیے ایک زبردست خطرہ کا انسداد نہ کریں گے بلکہ قریش کی پوری میراث پر بھی قابض ہو جائیں گے۔ اس طرح ان کا اقتدار بڑھ جائے گا۔

جنگ کی تیاری

ہوازن کے رئیس اعظم مالک بن عوف نے جو تیس سال کا پُرجوش جوان تھا۔ سب سے پہلے جنگ کا فیصلہ کر کے تمام قبائلی گروہوں اور شاخوں کو شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ بنو نصر اور بنو جشم سب کے سب شریک ہو گئے۔ بنو سعد بن بکر اور بنو ہلال میں سے کچھ لوگ آئے۔ البتہ بنو کعب اور بنو کلاب میں سے کوئی قابل ذکر شخص شامل نہ ہوا ثقیف کے رئیسوں میں سے قارب بن الاسود نیز ذوالخمار سبیع بن الحارث اور اس کا بھائی احمر بن الحارث ساتھ تھے اور تمام معاملات میں ان سے مشورے لیے جاتے تھے۔ ریاست عامہ کا منصب مالک بن عوف ہی کو حاصل تھا۔

بنو جشم کے معروف رئیس اور عرب کے مشہور شہسوار درید بن الصمہ کو بھی ساتھ لے لیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ کیونکہ عمر سو سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اور اس کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔ تاہم اس کی دانائی، صواب اندیشی اور تجربہ کاری سب کے نزدیک مسلم تھی۔ مالک بن عوف نے حکم دے دیا تھا کہ تمام لوگ پورا مال واسباب اور بال بچے ساتھ لائیں تاکہ ان کی وجہ سے جنگ میں لوگوں کی پامردی کو تقویت پہنچے۔ لیکن اس تدبیر کا نتیجہ الٹا نکلا جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ یہ لوگ وادی اوطاس میں پہنچ گئے۔

دُرید بن صمّہ

دُرید نے آتے ہی پوچھا کہ ہم کون سے مقام پر ہیں جواب ملا کہ اوطاس میں۔ اس نے کہا کہ یہ مقام جنگ کے لیے موزوں ہے۔ زمین نہ تو اتنی نرم ہے کہ اس میں لڑنے والوں کے پاؤں دھنس جائیں اور نہ اتنی سخت ہے کہ گھوڑوں کو کاٹے پھر اس نے پوچھا یہ کیا ہے کہ اونٹ بلبلاتے ہیں گدھے شور کر رہے ہیں بچے رو رہے ہیں اور بکریاں ممیا رہی ہیں۔ جواب ملا کہ مالک کے حکم سے مال واسباب

بال بچے ساتھ لے آئے ہیں پوچھا کیوں؟ کہا گیا کہ ان کی محبت لوگوں کو زیادہ جم کر لڑنے پر آمادہ کرے گی۔

درید بولا جس کے پاؤں اکھڑ جائیں بھلا وہ یہ سب کچھ کب دیکھتا ہے جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے شکست ہوئی تو مال وعیال مصیبت کا باعث بن جائیں گے۔

پھر درید نے بنو کعب بنو کلاب کے بارے میں پوچھا بتایا گیا کہ ان میں سے کوئی نہیں آیا۔ درید نے کہا کہ اگر آج عزت و شرف کا دن ہوتا تو کعب و کلاب ضرور آتے میرے خیال میں تمہیں بھی وہی کرنا چاہیے جو کعب و کلاب نے کیا۔

درید نے مالک سے کہا کہ ہوازن کو تہلکے میں نہ ڈالو۔ اہل وعیال کو کسی محفوظ مقام پر ٹھہراؤ۔ فارغ ہو کر لڑو۔ فتح ہوئی تو سب تم سے آملیں گے شکست ہوئی تو یہ بچے رہیں گے۔ لیکن مالک نے یہ کہہ کر درید کی رائے ٹھکرا دی کہ تو پیر فرتوت ہے اور تیری عقل سٹھیا گئی ہے۔

حالات کی تحقیق

حضور اقدس ﷺ کو ہوازن و ثقیف کے عزائم اور جنگی تیاریوں کی خبر ملی تو عبداللہ بن حدرد اسلمی کو مقرر کیا کہ ان قبیلوں کے اندر چلے جائیں۔ ہر معاملے کے متعلق صحیح اور قطعی معلومات حاصل کریں۔ جب تک ایک ایک بات واضح نہ ہو جائے۔ ان کا ساتھ نہ چھوڑیں چنانچہ ابن ابی حدرد اپنا فرض احسن طریقے پر پورا کر کے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور پوری کیفیت عرض کر دی۔

یہ معلومات اس وجہ سے بھی ضروری تھیں کہ اگر جدال و قتال روکنے اور مناسب طریق پر صلح و مصالحت کرنے کی کوئی صورت ہو تو اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور اس وجہ سے بھی ضروری تھیں کہ اگر جنگ ناگزیر ہو تو موقع و محل کی مناسبت سے اس کے لیے انتظامات کیے جائیں۔

تیاری اور روانگی

یہ بہر حال حضور اقدس ﷺ حرم پاک میں بیٹھ کر جنگ جوؤں کے حملہ کا انتظار نہیں فرما سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں حدود حرم کے اندر خونریزی ہوتی جو اس مقام کی عزت و حرمت کے منافی تھی ویسے بھی حضور اقدس ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ حتی الامکان اچانک جنگ کرنے والوں کے سر پر پہنچ جاتے اور ان کی جمعیت درہم برہم کر ڈالتے۔

آپ نے ابوجہل کے سوتیلے بھائی عبداللہ بن ربیعہ سے تیس ہزار درہم مصارف کے سلسلے میں قرض لیے۔ صفوان ابن امیہ سے جس نے قبول اسلام کے لیے مہلت لے رکھی تھی۔ ایک سو زرہیں مستعار لیں۔ عتاب ابن اسید کو مکہ مکرمہ پر حاکم مقرر کیا اور ۶ شوال المکرم ۸ھ

کو اس سمت روانہ ہو گئے۔ جہاں ہوازن وثقیف جمع ہو رہے تھے۔ دس شوال کو منزلِ مقصود پر پہنچے۔
جنگ کے متعلق تمام روایات سامنے رکھ کر صحیح کیفیت کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلامی فوج کس راستے سے آرہی ہے چنانچہ اس نے راستہ کے ایک نشیب میں ادھر ادھر محفوظ مقامات پر کمین گاہ بنا کر تیر انداز بٹھائے تھے۔ صبح کی تاریکی زائل نہیں ہوئی تھی۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ مسلمانوں کے مقدمۃ الجیش میں بنو سلیم اور طلقائے کہ تھے جو اس وقت تک اسلام بھی نہیں لائے تھے وہ کمین گاہوں کی زد میں پہنچے تو ایک دم ہر سمت سے تیروں کی بارش ہو گئی۔

ابن ہشام میں ہے۔

جب وادی حنین سامنے آئی تو ہم نے تہامہ کی طرف جانے والی وادیوں میں سے ایک نشیبی ڈھلائی اور وسیع وادی میں اترنا شروع کر دیا ہم اترے جا رہے تھے۔ صبح کی تاریکی ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ دشمن ہم سے پہلے وادی میں آگئے تھے۔ انھوں نے ہر تنگ گھاٹی میں ہر گوشے ہر خفیہ راستے سے ہم پر حملہ کر دیا۔ یہ ان کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور اس کے لیے پوری تیاری کر رکھی تھی۔[1]

پہلے بنو سلیم پلٹے۔ پھر اہل مکہ نے راہ فرار اختیار کی۔ بعد ازاں عام ابتری پھیل گئی نہ کوئی صورت حال کا اندازہ کرنے کی حیثیت میں رہا اور نہ کوئی پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کا قرآن میں بڑے پر شوکت انداز میں بیان ہے۔

(۲۴) مسلمانو! اللہ سبحانہ نے تمہاری بہت سے مواقع پہ مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب تم اپنی افرادی قوت پر نازاں تھے اور وہ افرادی طاقت تمہارے کچھ کام نہ آئی۔ زمین ساری پہنائیوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی تھی پھر تم نے میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھادی تھی۔ پھر اللہ نے اپنے رسول پر سکینت نازل فرمائی اور اہلِ ایمان پر اور ایسی فوجیں اتاریں جو تمہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ اور کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کو سزا دی۔ یہی بدلہ ہے حق کا انکار کرنے والوں کا۔ پچھلی آیت میں تنبیہہ کی گئی تھی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے وقت مومنین کی کنبہ برادری، اموال و املاک وغیرہ کسی چیز پر نظر نہ ہونی چاہیے۔ یہاں آگاہ فرمایا ہے کہ مجاہدین کو خود اپنی فوجی جمعیت و کثرت پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیے۔ نصرت و کامیابی اکیلے خدا کی مدد سے ہے جس کا تجربہ پیشتر بھی بہت سے میدانوں میں تم کر چکے ہو بدر، قریظہ، نضیر اور حدیبیہ وغیرہ میں جو کچھ نتائج رونما ہوئے وہ صرف امدادِ الٰہی نصرتِ غیبی کا کرشمہ تھا اور اخیر میں غزوہ حنین کا واقعہ تو الیسا صریح اور عجیب و غریب نشان آسمانی نصرت و امداد کا ہے جس کا اقرار سخت معاند دشمنوں کو بھی کرنا پڑا۔

حنین میں جنگ

فتح مکہ کے بعد فوراً آپ کو اطلاع ملی کہ ہوازن، ثقیف وغیرہ بہت سے قبائل عرب نے ایک لشکر جرار تیار کر کے بڑے سازو

[1] سیرت ابن ہشام

سامان سے مسلمانوں پر حملہ کا ارادہ کیا ہے۔ یہ خبر پاتے ہی آپ نے دس ہزار مہاجرین وانصار کی فوج گراں کو جو مکہ فتح کرنے کے لیے مدینے سے ہمراہ آئی تھی۔ طائف کی طرف کوچ کر دیا دو ہزار طلقا بھی جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے آپ کے ہمراہ تھے یہ پہلا موقعہ تھا کہ بارہ ہزار کی عظیم الشان فوج کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدانِ جہاد میں نکلی۔ یہ منظر دیکھ کر بعض صحابہ سے رہا نہ گیا اور بے ساختہ بول اٹھے کہ جب ہم تھوڑے تھے اس وقت ہم غالب ہے تو آج ہماری اتنی بڑی تعداد کسی سے مغلوب ہونے والی نہیں۔ یہ جملہ مردانِ توحید کی زبان سے نکلنا بارگاہ احدیت میں ناپسند ہوا۔ ابھی مکہ سے تھوڑی دور نکلے تھے کہ دونوں لشکر مقابل ہو گئے۔ فریق مخالف کی جمعیت چار ہزار تھی جو سر پر کفن باندھ کر اور سب عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے پوری تیاری سے نکلے تھے۔ اونٹ گھوڑے مویشی اور گھروں کا کل اندوختہ کوڑی کوڑی کر کے ہمراہ لائے تھے۔ ہوازن کا قبیلہ تیر اندازی کے فن میں سارے عرب میں شہرت رکھتا تھا۔ اس کے بڑے بڑے ماہر تیر اندازوں کا دستہ وادی حنین کی پہاڑیوں میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ صحیحین میں براء بن عازب کی روایت ہے کہ پہلے معرکہ میں کفار کو ہزیمت ہوئی وہ بہت سامال چھوڑ کر پسپا ہو گئے یہ دیکھ کر مسلمان سپاہی غنیمت کی طرف جھک پڑے۔ اس وقت ہوازن کے تیر اندازوں نے گھات سے نکل کر ایک دم ہاوا بول دیا۔ آنِ واحد میں چاروں طرف سے اتنے تیر برسائے کہ مسلمانوں کو قدم جمانا مشکل ہو گیا۔ اول طلقا میں بھاگڑ پڑی۔ آخر سب کے پاؤں اکھڑ گئے زمین ساری فراخی کے باوجود تنگ ہو گئی کہ کہیں پناہ کی جگہ نہ ملتی تھی۔ حضور اقدس ﷺ مع چند رفقا کے دشمنوں کے نرغے میں تھے ابوبکر، عمر، عباس، علی، عبداللہ بن مسعود وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تقریباً اسی صحابہ بلکہ اہلِ سیر کی تصریح کے مطابق صرف دس نفوس قدسیہ عشرہ کاملہ میدانِ جنگ میں باقی رہ گئے جو پہاڑ سے زیادہ مضبوط نظر آ رہے تھے۔ یہ خاص موقعہ تھا جبکہ دنیا نے پیغمبرانہ توکل وصداقت اور معجزانہ شجاعت کا ایک محیر العقول نظارہ ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا۔ آپ سفید خچر پر سوار ہیں۔ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک رکاب اور ابوسفیان بن الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسری رکاب تھامے ہوئے ہیں۔ چار ہزار کا لشکر پورے جوشِ انتقام میں ٹوٹے پڑتا ہے۔ ہر چہار طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی ہے ساتھی منتشر ہو چکے ہیں مگر رفیقِ اعلیٰ آپکے ساتھ ہے ربانی تائید اور آسمانی سکینہ کی غیر مرئی بارش آپ پر اور آپ کے چنے ہوئے رفیقوں پر ہو رہی ہے جس کا اثر آخر کار بھاگنے والوں تک پہنچتا ہے جدھر سے ہوازن وثقیف کا سیلاب بڑھ رہا تھا آپ کی سواری کا منہ اس وقت بھی اسی طرف ہے اور ادھر ہی آگے بڑھنے کے لیے خچر کو مہمیز کر رہے ہیں۔ دل سے خدا کی طرف لو لگی ہے اور زبان پر نہایت استغنا و اطمینان کے ساتھ انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب جاری ہے یعنی بے شک میں پیغمبر ہوں سچا اور عبد المطلب کی اولاد ہوں۔ اسی حالت میں آپ نے صحابہ کو آواز دی۔ الی عباد اللہ انی رسول اللہ خدا کے بندو ادھر آؤ یہاں آؤ کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ پھر آپ کی ہدایت کے مطابق حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو نہایت جہیر الصوت تھے۔ اصحاب سمرہ کو پکارا جنھوں نے درخت کے نیچے حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی۔ آواز کا کانوں میں پہنچنا تھا کہ بھاگنے والوں نے سواریوں کا رخ میدان

جنگ کی طرف پھیر دیا۔ جس اونٹنی نے رخ بدلنے میں دیر کی وہ گلے میں زرہ ڈال کر اونٹ سے کود پڑا اور سواری چھوڑ کر حضور کی طرف لوٹا۔ اسی اثنا میں حضور ﷺ نے تھوڑی سی مٹی اور کنکریاں اٹھا کر لشکر کفار پر پھینکیں جو خدا کی قدرت سے ہر کافر کے چہرے اور آنکھوں پر پڑی ادھر حق تعالیٰ نے آسمان سے فوجیں روانہ کر دیں جن کا نزول غیر مرئی طور پر مسلمانوں کی تقویت و ہمت افزائی اور کفار کی ہزیمت کا سبب ہوا۔ پھر کیا تھا کفار کنکریوں کے اثر سے آنکھیں ملتے رہے جو مسلمان قریب تھے انھوں نے پلٹ کر حملہ کر دیا آناً فاناً میں مطلع صاف ہو گیا۔ بہت سے بھاگے ہوئے مسلمان لوٹ کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا لڑائی ختم ہو چکی ہے ہزاروں قیدی آپ کے سامنے بندھے کھڑے ہیں اور مال غنیمت کے ڈھیر لگے ہیں۔ فسبحان من بیدہ ملکوت کل شئی۔ اس طرح کافروں کو دنیا میں سزا ملی لے

یہاں ایک ضروری بات تشنۂ تحقیق ہے وہ یہ کہ اس ابتدائی شکست کا سبب کیا تھا مورخین کہتے ہیں اور اسی کو عام شارحین قرآن نے اختیار کیا ہے کہ شکست کا بنیادی سبب یہ تھا کہ قبیلہ ہوازن نے میدان جنگ میں پہلے پہنچ کر تمام مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا اور تیراندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں میں چھپا دیئے۔ مسلمانوں کی فوج رات کے آخری حصہ میں وادی حنین میں پہنچی تو دشمن نے یکبارگی تیروں کی بارش شروع کر دی۔ آگے بنو سلیم اور اہل مکہ تھے وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور اس کے نتیجے میں سارا فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور سب میں ابتری پیدا ہو گئی۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں یہی سبب لکھا ہے لیکن مورخین کی بتائی ہوئی یہ داستان ان احادیث کے خلاف ہے جو اس موضوع پر صحیحین میں آئی ہیں۔ صحیحین کی احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو حنین کی جنگ میں پہلے کامیابی ہوئی ہے لوگ کامیابی کو دیکھ کر مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے دشمن کے تیراندازوں نے موقع پاکر تیراندازی شروع کر دی جس سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی انتشار اور پراگندگی پیدا ہوئی۔ بخاری میں حضرت براء ابن عازب کا بیان ہے۔

ایک شخص قیسی نے حضرت براء سے دریافت کیا کہ کیا آپ لوگ حنین والے دن حضور اقدس کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے بولے کہ حضور اقدس ﷺ نہیں بھاگے تھے۔ دراصل ہوازن کے لوگ بڑے ماہر تیرانداز تھے۔ ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے تو ہم لوگ مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے تو انھوں نے ہمیں تیروں پر دھر لیا میں نے حضور اقدس ﷺ کو سفید خچر پر سوار دیکھا اور ابوسفیان ابن الحارث اس کی باگ تھامے ہوئے تھے اور حضور فرما رہے تھے انا النبی لا کذب۔ انا ابن عبد المطلب۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میرا خیال یہی ہے کہ ان لوٹ مار کرنے والوں میں مکہ کے ان طلقاء کا ہاتھ تھا جو دو ہزار کی تعداد میں مسلمانوں کی فوج بن کر آئے تھے دراصل ان میں کچھ لوگ آئے بھی اس لیے تھے کہ مسلمانوں کو عین جنگ میں دھوکا دیں۔ چنانچہ صحیح مسلم

لے افادات شیخ الاسلام

ہیں ہے کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جو اس جنگ میں شریک تھیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ان طلقاء کو قتل کر دیجئے ان کی وجہ سے شکست ہوئی ہے۔

ہمارے سوا ان طلقاء کو قتل کر دیجئے انہی نے شکست دلائی ہے۔

امام نووی نے صحیح مسلم کی شرح میں اس فقرے پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ:

سب لوگ نہیں بھاگے تھے بلکہ مؤلفۃ القلوب میں جو منافقین تھے اور مکہ کے مشرکین جو اس جنگ میں شریک ہو گئے تھے اور جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے بھاگنا شروع کیا اور یہ ناگہانی ہزیمت اس وجہ سے ہوئی کہ دشمنوں نے ایک ساتھ تیروں کی بارش شروع کر دی تھی اور فوج میں ایسے اہل مکہ بھی تھے جن کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں پر مصائب کے منتظر رہے ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے جو صرف غنیمت کے لیے آئے تھے۔

ابوحیان اندلسی البحر المحیط میں لکھا ہے۔

ان طلقاء کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو شکست سے دوچار کیا جائے

علامہ آلوسی نے بھی یہی انکشاف کیا ہے۔

سب سے پہلے طلقا مکہ فریب سے شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے اس لیے مسلمان فوجوں میں بے ترتیبی اور پسپائی رونما ہوئی۔

لہٰذا مؤرخین کا یہ کہنا کہ ہوازن والوں نے صحابہ کے حنین میں پہنچتے ہی بے خبری کی حالت میں مسلمانوں پر حملہ کر دیا تھا درست نہیں ہے جبکہ صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے ہے جیسا کہ فتح الباری میں حافظ صاحب نے بتایا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں ہم نے مکہ فتح کیا پھر حنین میں جہاد کیا۔ مشرکین نے میدانِ جنگ میں شاندار طریقے پر صف بندی کی تھی۔ پہلے گھوڑے سواروں کی صف پیادہ فوجوں کی صف پھر عورتوں کی پھر جانوروں کی صفیں تھیں۔ ہماری تعداد زیادہ تھی۔ میمنہ پر حضرت خالد تھے۔ ہمارے گھوڑے سوار پیچھے کو ہٹ رہے تھے۔ ہماری دیکھتی آنکھوں ہمارے سواروں کا دستہ ہٹ گیا اور دیہاتی سب بھاگ گئے۔ اور وہ لوگ جن کا پتہ ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ لڑائی باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ہوئی تھی کسی قسم کی ہنگامی حالت نہ تھی۔ ابتداء میں فتح ہوئی لیکن جیسا کہ براء کی روایت میں ہے کہ اس فتح کے نظارے میں لوگ غنیمت سمیٹنے میں لگے۔ غنیمت سمیٹنے والوں پر تیروں کی بارش ہوئی۔ لوگ آگے سے بھاگے۔ آگے بھی طلقاء مکہ تھے۔ ان کے پیچھے گھوڑے سوار تھے۔ ان گھوڑے سواروں کے جلو میں کوکبہ نبوت

تھا بھاگنے والے بھی طلقاء تھے۔ امام بخاری نے صحیح میں ہشام بن زید کے حوالہ سے بتایا ہے کہ بھاگنے والے بھی طلقاء تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں۔

آپ کے ساتھ دس ہزار آدمی تھے اور آپ کے ساتھ طلقاء بھی طلقاء بھاگنے والے۔

گو کہ بہت گھوڑے سواروں میں تھا اور گھوڑے سوار طلقاء کی بھگدڑ کے نتیجے میں تتر بتر ہو گئے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھوڑے پر جمے اور ڈٹے رہے بلکہ آگے بڑھتے رہے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت تو یہی کہتی ہے کہ آپ اول میں اکیلے رہ گئے اس لیے یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ باقی اونٹ سوار اور پیدل فوج برابر آپ کے ساتھ رہی۔ ابتری صرف تیر اندازی اور طلقاء کی بھگدڑ کی وجہ سے صرف گھوڑے سواروں میں ہوئی اور فتح آتی آتی شکست میں بدل گئی۔ امام بخاری کی روایت میں جو آیا ہے کہ آپ اکیلے رہ گئے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ بالکل اکیلے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ جس جگہ رسول تھے وہاں کوئی نہ تھا۔ کیونکہ اسی روایت میں ہے کہ حضرت انس فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو آواز دی تو انصار نے یہ الفاظ کہے لبیك یا رسول الله ابشر نحن معك ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ خوش ہوں ہم آپ کے ساتھ ہیں اسی باب میں حضرت انس کی روایت اس سے پہلے ہے جس میں انصار کے یہ الفاظ ہیں لبیك یا رسول الله وسعديك يارسول الله نحن بين يديك جی ہاں اے اللہ کے رسول ہم آپ کے ساتھ ہیں یہ روایات بتاری ہیں کہ انصار یہیں موجود تھے اور ان میں سے کوئی نہیں بھاگا تھا اور بخاری میں حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے۔ کہ ابوسفیان بن الحارث اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے۔ مسلم میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں کہ میں نے اور ابوسفیان بن الحارث نے حضور سے علیحدگی اختیار نہیں کی تھی۔ ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ اس دن حضور کے ہمراہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے فتح الباری میں حاکم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اس روز حضور کے ساتھ ۸۰ آدمی باقی رہ گئے تھے اور حافظ عسقلانی نے بھی یہی بیہقی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حارثہ ابن النعمان کہتے ہیں کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے۔ [1]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاگنے والے سب طلقاء تھے ورنہ مہاجرین و انصار سب موجود تھے، چونکہ سب حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس تھے۔ تھوڑی تھوڑی تعداد میں ہنگامی انتشار کے بعد جمع ہو رہے تھے اس لیے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد بتائی ہے۔

یہ صرف محمد ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت مہاجرین و انصار میں سے حسب ذیل

[1] نواب صدیق حسن خاں نے سیرۃ شامیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین میں جمنے والے.. ۱ تھے ۳۲ مہاجرین میں سے تھے اور ۶۸ انصار تھے۔ یہ گویا ..۱ کی تفصیل ہوئی۔

اصحاب موجود تھے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عباس، حضرت ابوسفیان بن الحارث، حضرت جعفر بن ابی سفیان، حضرت فضل بن عباس، حضرت ربیعہ بن الحارث، حضرت اسامہ حضرت ایمن بن ام ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہم

اگر ہم اس روایت کو صحیح مان لیں اور کسی سند کا مطالبہ نہ کریں تو اس کا مطلب ہے کہ گھوڑے سواروں میں جب بھگدڑ مچی یعنی تیروں کی تاب نہ لا کر جب گھوڑے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس وقت گھوڑے سواروں میں یہ حضرات حضور کے ساتھ رہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی گھوڑے سوار تھے ان میں حضرت عباس اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہما پیادہ تھے حضور کی رکاب تھامے ہوئے۔ اور دوسرے خچر کا لگام پکڑے ہوئے تھے۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت انس کی بخاری کی روایت میں جو یہ جملہ آیا ہے بقی وحدہ حضور اکیلے رہ گئے تھے وہ ظاہری معنے میں نہیں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ حضور اقدس آگے اور بقیہ لوگ پیچھے تھے لیکن اس کا صاف مطلب ہے کہ یہ بیانہ ثابت قدم رہنے والوں کی قلت بتانے کے لیے ہے اور وہ بھی گھوڑے سواروں میں ورنہ حقیقت یہ تھی یہ بات کہ ابتری صرف گھوڑے سواروں میں آئی اور وہ بھی طلقاء مکہ کے مال سمیٹنے کی وجہ سے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب جنگ ختم ہوگئی ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ایک مسلمان عورت نے اپنے تاثرات کو اس طرح ظاہر کیا۔

غلبت خیل اللہ خیل اللات وخیلہ احق بالثبات

بات ادھوری رہ جائے اگر ہم ان طلقاء کے بارے میں کچھ ضروری باتیں نہ بتائیں۔ یہ تو آپ امام نووی کی زبان سے سن آئے ہیں کہ ان میں ابھی کچھ مسلمان بھی نہ ہوئے تھے اور جو ہوئے تھے وہ بھی ہواؤں کا رخ دیکھ کر ہوئے تھے۔ بخاری کی روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ بھاگنے والے بھی یہی تھے۔

ابن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ خود شیبہ بن عثمان نے بتایا ہے کہ میں نے ارادہ کیا کہ قریش کے ساتھ میں بھی حنین جاؤں اور موقع ملے تو قریش کے خون کے بدلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کروں اس کے بعد میں جب اکیلے ساتھ روانہ ہوا تو میں اپنے خیال میں مگن تھا اور میرا ارادہ اور مضبوط ہو گیا حتی کہ جس وقت لوگ رل مل گئے تو میں اپنے مقصد کے پیش نظر تلوار لے کر حضور کی طرف بڑھا اور تلوار کو بلند بھی کر لیا تھا کہ یکایک آگ کی ایک لہر بجلی کی طرح میرے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ظاہر ہوئی خوف سے میری حالت بری ہو گئی۔ اسی حال میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی میں نزدیک گیا فرمایا کہ اور نزدیک آؤ میں نزدیک ہوا آپ نے اپنا ہاتھ میرے سینہ پر رکھ دیا اسی وقت میرے سینہ میں ایک عظیم تغیر پیدا ہوا اور مجھ کو محسوس ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میرے دل میں اپنی جان سے زیادہ ہے حضور نے فرمایا کہ اور نزدیک آؤ اور دشمنوں سے مقابلہ کرو میں بڑھا اور تلوار چلانے لگا۔ محبت کا یہ عالم تھا کہ اگر میرا باپ بھی زندہ ہوتا اور اس وقت سامنے آتا تو میں تلوار سے اس کا بھی مقابلہ کرتا۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ طلقاء جو آگے لگے ہوئے تھے ان میں غیر مسلم بھی تھے ناپختہ مسلمان بھی تھے منافق بھی اور نئی بھی تھے یہی منصوبے کے تحت بھاگے تھے۔ براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی پہلے سن آئے ہو کہ آگے جو لوگ تھے وہ ناتجربہ کار تھے اور غیر مسلح تھے ان پر جو تیروں کی بارش ہوئی بھاگ کھڑے ہوئے۔

بہرحال ابن اسحاق کی روایت کی بنیاد پر یہ کہنا کہ اچانک حملہ ہوا اس سے بھگدڑ پڑ گئی اور سب بھاگ گئے صحیح نہیں۔ اچانک کچھ نہیں ہوا۔ جو کچھ ہوا خاص منصوبہ بندی کے تحت ہوا۔ فوجیں آمنے سامنے ہوئیں ابتداء میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ اسی کامیابی کو دیکھ کر آگے لگنے والے مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے دشمن کی جانب سے تیروں کی بارش ہوئی تو بھاگ اٹھے ان کے پیچھے گھوڑے سوار تھے۔ گھوڑے کچھ تیروں کی بارش سے اور کچھ بھگدڑ سے بدکے اور بھاگے۔ گھوڑے سواروں میں ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری تھی۔ ان سواروں میں ایک پیکر مقدس اپنی جگہ جما ہوا تھا۔ آپ کی سواری کی لگام حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور رکاب سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں جانب مڑ کر دیکھا اور کہا یا معشر الانصار جواب دیا ہم حاضر ہیں پھر آپ نے بائیں مڑ کر فرمایا اب بھی جواب آیا ہم حاضر ہیں۔ جلال نبوت میں فرمایا انا النبی لا کذب، انا ابن عبد المطلب۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہایت بلند آواز تھے۔ آپ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین و انصار کو بلاؤ۔ انھوں نے زور سے نعرہ مارا۔ یا معشر الانصار۔ یا اصحاب الشجرہ۔ اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج یک جا ہو گئی۔ جن لوگوں کے گھوڑے نہ آ سکے انھوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے۔ انصار میں خزرج والے بڑے جنگ جو تھے۔ جب انھوں نے ہاتھ دکھائے حضور دیکھ کر خوش ہوئے اور فرمایا الان حمی الوطیس اب تنور تپا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضور بغلہ سے اترے زمین سے ایک مٹھی مٹی لی کفار کی طرف متوجہ ہوئے اور شاھت الوجوہ کہہ کر جب وہ مٹی کفار کی طرف پھینکی تو دشمن کا کوئی شخص نہ بچا جس کی آنکھ میں خاک پڑی ہو۔ کفار میں بھگدڑ مچ گئی اور مسلمانوں کو اللہ نے فتح دی۔ دشمن سراسیمہ ہو کر بھاگ پڑا میدان خالی ہو گیا۔ صرف مال اسباب اور اہل و عیال رہ گئے۔ فراریوں میں سے کچھ گروہ اوطاس کی طرف چلے گئے اور کچھ نے طائف کا رخ کیا۔ بنو غیرہ نخلہ کی طرف گئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مفرورین کے تعاقب کا انتظام فرمایا۔

ابو عامر اشعری اوطاس کی جانب مامور ہوئے۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کو مارا لیکن سلمہ ابن درید کے تیر سے ان کو مہلک زخم لگا اور شہادت پائی ابو عامر نے وفات سے پیشتر ابو موسیٰ اشعری کو اپنی جگہ مقرر کیا ساتھ ہی کہا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کرنا۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے درخواست کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عامر رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کی۔

درید بن الصمہ مارا گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نخلہ الیمانیہ، قرن، ملیح، بحرۃ الرغا سے ہوتے ہوئے طائف پہنچ گئے۔

اور مال غنیمت حنین سے جعرانہ روانہ کر دیا گیا۔

شہدائے حنین

جنگ حنین میں یہ اصحاب شہید ہوئے۔

۱۔ ایمن بن عبید

۲۔ یزید بن زمعہ

۳۔ سراقہ ابن حارث

۴۔ ابو عامر اشعری

مال غنیمت اور قیدی

جنگ حنین کے قیدیوں اور مال غنیمت کی مجموعی کیفیت درج ذیل ہے۔

عورتیں اور بچے	۶ ہزار
اونٹ	۲۴ ہزار
بھیڑ بکریاں	۴۰ ہزار
چاندی	۴ ہزار اوقیہ

مال غنیمت کی تقسیم

مال غنیمت کی تقسیم میں رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے جدید الاسلام لوگوں کے ساتھ تالیف قلب کی خاطر زیادہ رعایت فرمائی، چنانچہ ابو سفیان اور اس کی اولاد کو تین سو اونٹ حکیم بن حزام کو دو سو اونٹ کے علاوہ آٹھ آدمیوں کو سو سو بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ دیئے فوج میں سے ہر شخص کو کوئی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں ملیں سواروں کا حصہ زیادہ تھا۔

اہل مکہ پر خاص کرم نوازی بعض نوجوان انصار کے لیے موجب اعتراض بن گیا اور کچھ کی شکایتیں حضور اقدس ﷺ کو پہنچیں تو آپ نے انصار کو ایک خیمے میں جمع کیا اور فرمایا:

اے انصار کیا یہ سچ نہیں کہ تم گمراہ تھے اور خدا نے میرے ذریعے سے تمہیں ہدایت دی تم منتشر و پراگندہ تھے خدا نے میرے ذریعے سے تم میں اتفاق پیدا کیا تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے سے تمہیں مالدار بنایا۔

انصار حضور اقدس ﷺ کی تقریر میں ہر بات پر کہتے تھے بے شک اللہ و رسول نے ہم پر احسان کیا حضور اقدس ﷺ نے تقریر میں فرمایا۔

تم اس کے جواب میں یہ کیوں نہیں کہتے ہو کہ اے محمد جب سب لوگوں نے تمہیں جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ جب تجھے گھر اور وطن سے نکال دیا تو ہم نے تجھے پناہ دی۔ جب تم محتاج تھے تو ہم نے تیری مدد کی میں کہتا جاؤں گا تم سچ کہتے ہو۔ اے انصار تم ہمارے شعار ہو اور دوسرے لوگ دثار ہیں۔ اے اللہ انصار پر رحم کر۔ انصار کی اولاد پر رحم کر ان کی اولاد کی اولاد پر رحم کر۔

آخر میں فرمایا۔

اے انصار کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ دوسرے لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمد مصطفےٰ کو لے کر اپنے گھر جاؤ۔

انصار چیخ اُٹھے کہ ہمیں صرف محمد ﷺ درکار ہیں۔

دراصل انصار میں کچھ کو خیال ہو گیا تھا کہ اب رسول اللہ ﷺ شائد مدینہ منورہ نہ جائیں۔ اور مکہ مکرمہ میں قیام فرمائیں اسی تاثر نے ان میں شاید پریشانی اور دل شکستگی پیدا کی اور ان کی زبان پر ایک ایسی بات آئی جس کی ان کی فطری روح اتنا سے کوئی مناسبت نہ تھی وہ تو اپنے پاس سے سب کچھ دے کر خوش ہوتے تھے۔ پھر باہر کا مال دوسروں کو زیادہ ملنے پر کیوں کر رنجیدہ یا شاکی ہو سکتے تھے۔ جب عشق و محبت میں ناکامی کی بلائے مہیب گھٹا کی طرح ماحول پر چھاتی نظر آتی ہے تو دل و دماغ کی طبعی کارفرمائی میں بھی خلل آجاتا ہے۔ اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں ہے یہ معاملہ تو اس وجود مقدس سے عشق کا تھا حضور اقدس نے اپنی تقریر میں انصار کے ساتھ جانے کا خاص طور پر ذکر کیا اس سے وہ خوشی سے بلیوں اچھل گئے اور ان کے قلب سے تمام پریشانیوں بے چینیوں کو دھو ڈالا۔

وفد ہوازن کی آمد

رسول اللہ ﷺ طائف سے لوٹے تو عمرہ ادا کیا۔ پھر جعرانہ تشریف لائے۔ اسیران جنگ کی رہائی کے لیے جس وفد ہوازن کا انتظار تھا۔ اس کی ایک شاخ سے حضور اقدس ﷺ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ تھیں۔ رئیس وفد نے رضاعت ہی کے رشتہ سے بات کی اور کہا کہ اسیر عورتوں میں آپ کی پھوپھیاں اور خالائیں بھی ہیں۔ اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے کسی خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو اس سے بھی بہت امیدیں ہوتیں۔ آپ سے بہت امیدیں ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ خاندان عبدالمطلب کا حصہ تو میں چھوڑ سکتا ہوں لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے موقع پر سب لوگ جمع ہوں تو یہ درخواست

پیش کریں۔ بخاری میں یہ بھی ہے کہ یہ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو کر آئے تھے جاءہ وفد ھوازن مسلمین حافظ عسقلانی نے موسیٰ ابن عقبہ کے مغازی کے حوالہ سے یہ بھی بتایا ہے کہ میں اس موضوع پر مسلمانوں سے گفتگو کروں گا تم بھی بات کرنا اور اپنا مسلمان ہونا بتانا اور یہ بھی بخاری ہی میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ نماز ظہر کے بعد درخواست پیش ہوئی تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا مجھے تو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے لیکن میں عام مسلمانوں سے تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔ بخاری میں ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔ اما بعد فان اخوانکم قد جاء نا تائبین۔ یہ تمہارے بھائی توبہ کرکے آئے ہیں جس کا جی چاہے اپنا حصہ چھوڑ دے۔ یہ سنتے ہی مہاجرین وانصار نے اپنے حصے چھوڑ دیئے۔ یوں تمام عورتیں اور بچے واپس ہو گئے۔

آیئے اب ذرا آیات قرآنی کے آغاز پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال لیجئے۔ فرمایا لقد نصرکم اللہ فی مواطن کثیرۃ اللہ نے تمہاری بہت سے مواقع پر مدد کی۔ یہ تاریخ کے حوالہ سے مسلمانوں کے حوصلے بلند کیے جا رہے ہیں۔ جنگ کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کرو کیونکہ جس خدا نے پہلے مدد فرمائی ہے اس کی مدد اب بھی تمہارے شامل حال رہے گی۔ امام بخاری نے صحیح میں زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ کل غزوہ انیس ۱۹ تھے۔ حافظ عسقلانی انیس پر نوٹ لکھا ہے کہ راوی کا مطلب ہے کہ وہ جنگیں جن میں حضور اقدس ﷺ بنفس نفیس تشریف لے گئے انیس ہیں کچھ علماء نے مغازی اور سرایا کی تعداد اسی بتائی ہے۔ ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم۔ حنین میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی اتنی بڑی کبھی کسی جنگ میں نہ تھی۔ افرادی طاقت کی بہتات پر ناز ایک طبعی چیز ہے ایک کا نہیں سب کا بھی یہ احساس ہوگا کہ آج تعداد کی کمی شکست کا باعث نہ ہوگی ہوا بھی ایسا ہی پہلے پہلے کامیابی مسلمانوں کو ہوئی لیکن اس خود بینی اور کثرت تعداد پر ناز نے ہی فتح کو شکست میں بدل دیا۔ وہ جن پر ناز کیا تھا انھوں نے ہی مال غنیمت سمیٹنا شروع کیا اور وہی تیروں کی بارش میں بھاگنے والے تھے۔ اسی کثرت نے سب میں ابتری ڈال دی۔ یہاں صاف بتا دیا کہ شکست کا اصل راز بھی خود بینی اور افرادی طاقت کی بہتات پر ناز تھا۔ شارحین قرآن نے نام بھی بتائے ہیں کہ کہنے والوں نے کہا تھا کہ لن نغلب الیوم من قلۃ۔ آج ہم تعداد کی وجہ سے مغلوب نہ ہوں گے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ صرف اتنی بات نہ تو توکل کے منافی ہے اور نہ اسباب پر اعتماد کی نشان دہی کرتی ہے۔ قرآن کی تنبیہہ تو اجتماعی احساس پر ہے کہ کامیابی کا مدار نہ افرادی قوت کی بہتات پر ہے اور نہ حالات کی سازگاری پر ہے اور نہ سامان جنگ پر ہے۔ کامیابی کا اصل مدار معنوی قوت۔ یعنی اللہ سے تعلق ہے اگر معنوی قوت موجود ہو تو مادی قوت کی کمی پوری ہو سکتی ہے لیکن معنوی قوت نہ ہو تو مادی قوت کی بڑی سے بڑی بہتات بھی اس کی تلافی نہیں کرتی حنین کی جنگ میں اگلی صفوں میں یعنی طلقاء میں معنوی قوت ناپید تھی۔ اس لیے مادی قوت نے کام نہیں دیا۔ فلم تغن عنکم شیئا وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین نہیں کام آئی

افرادی طاقت کی بہتات زمین ساری وسعتوں کے باوجود تنگ ہو گئی اور تم نے جنگ سے منہ موڑ لیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ جس عددی طاقت پر تم نے ناز کیا تھا وہ معنوی طاقت سے دامن گیر نہ تھی۔ ان کے دلوں کا اللہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اخلاص و ایثار کا نام و نشان نہ تھا یہ صرف گنتی ہی گنتی تھی۔ جنگ سر گن کر نہیں۔ سر کٹا کر جیتی جا سکتی ہے اور سر کی بازی لگانے کی بنیادی شرط ہے کہ نصب العین کا شعور ہو ثم انزل الله سكينته على رسوله وعلى المومنين۔ یہ اہل ایمان کو بشارت ہے۔ اس جگہ ثم کا استعمال بتا رہا ہے کہ اہل ایمان کو جو حادثہ پیش آیا تھا وہ کافی دیر تک رہا اور سکینۃ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اس پیش پا افتادہ حالات سے اہل ایمان کو بے حد پریشانی ہوئی۔ کیونکہ یہ سب کچھ بغیر ارادے کے ہنگامی طور پر رونما ہوا۔ اللہ سبحانہ نے اس پریشانی کا اپنے رسول اور اہل ایمان پر سکینت نازل فرما کر علاج کیا اور ساری فوج کے اکھڑے ہوئے پاؤں جما دیئے۔ ان جما دینے کا ذریعہ ساری فوج کے لیے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور کچھ اہل ایمان کی استقامت تھی۔ منتشر شیرازہ جمع ہوا اور شکست کے بعد فتح رونما ہوئی۔ قاضی ثناء اللہ نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ رسول کا ذکر آیت میں یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ آپ کی برکت سے اہل ایمان پر سکینت نازل ہوئی۔ شاید علیٰ کا تکرار یہی بتانے کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب آگے والوں نے بھاگنا شروع کر دیا اور انہیں بھاگتا دیکھ کر لشکر میں ابتری پیدا ہوئی قریب تھا کہ شکست ہو جائے اللہ سبحانہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو سکون و اطمینان کی نعمت عطا فرمائی اور آپ کے صدقے سب اہل ایمان کو یہ نعمت ملی۔ اس لیے سب میں ہمت و شجاعت کی نئی لہر دوڑ گئی۔ اور پھر اس بے جگری سے لڑے کہ دشمنوں کے قدم اکھاڑ دیئے۔ یہ حادثہ فی الحقیقت اللہ سبحانہ کی طرف سے مسلمانوں کی تادیب کے لیے تھا تاکہ محض کثرت تعداد ہی کو کامیابی کی بنیاد نہ سمجھ لیں۔ اصل چیز معنوی قوت ہے یعنی مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب و آرزو۔ اگر یہ موجود ہو تو مٹھی بھر انسان سینکڑوں انسانوں پر غالب آ سکتے ہیں۔ كم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله والله مع الصابرين

وانزل جنودا لم تروها۔ ایسی فوجیں لایا جو تمہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اس موضوع پر شارحین قرآن کا اتفاق ہے کہ حنین میں نزول ملائکہ ہوا اور اس پر اکثریت ہے کہ ملائکہ نے جنگ میں حصہ نہیں لیا لیکن اس میں اختلاف ہے کہ ان کی تعداد کتنی تھی علامہ آلوسی نے متعدد خیالات لکھے ہیں۔

وعذب الذين كفروا۔ اور اللہ نے کافروں کو سزا دی کہ قتل ہوئے اور قیدی بنائے گئے اور دنیا میں یہی کفر کی سزا ہے۔ جب تک وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کرتے رہیں۔ اہل ایمان سے دشمنی رکھیں اور ان سے لڑیں۔ کفر و ایمان دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہ ایمان کی وسعت صدر ہے کہ وہ کفر کو کچھ نہیں کہتا جب تک ایمان کے راستے میں رکاوٹ نہ پیدا کرے جن لوگوں کا یہاں ذکر ہے انھوں نے ایمان کو جینے کا حق دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور کفر ایمان کے مقابلے میں جب بھی اس انداز سے آئے کفر کی سزا یہی ہے جو ہوازن والوں کو ملی ہے۔

ہوازن کا قبولِ اسلام

پھر اس کے بعد اللہ رحمت کا معاملہ فرمائے گا جس کے ساتھ چاہے گا اور اللہ بڑا ہی مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے

(۲۷) اس میں اس بات کی طرف اشارا ہے کہ ان سب واقعات کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو توبہ کی توفیق دے گا۔ اور یہ مسلمان ہوں گے یہ گویا مسلمانوں کو ایک قسم کی بشارت ہے۔ فتح حاصل کرنے کے بعد اور اس سے بڑی بشارت کیا ہو سکتی ہے کہ حق کے راستہ سے نہ صرف یہ کہ رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی بلکہ رکاوٹ ڈالنے والے بھی حق کے علمبردار ہو جائیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ دنیا خیر و شر دونوں کا مسکن ہے۔ یہاں بھلائی کی بھی طاقتیں ہیں اور برائی کی بھی۔ اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری پوری آزادی ملی ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں باہم ٹکراتی رہتی ہیں۔ اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جائے اور نہ صرف یہ کہ اس کی دعوت قبول نہ کی جائے بلکہ سرے سے اس دعوت کو برداشت ہی نہ کیا جائے۔ اس لیے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے بارے میں امت اسلامیہ کا کیا رویہ ہونا چاہیے۔ قرآن اس سوال کے جواب میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے حق کے راستہ سے ہٹانے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ مسلسل کرنی چاہیے اور آخری حد تک کرنی چاہیے اسی کوشش کو قرآن کی زبان میں جہاد فی سبیل اللہ کا نام دیا گیا ہے۔ جہاد کے لفظی معنی بھی حصول مقصد کی خاطر ساری طاقت نچوڑ دینے کے ہیں یہاں بتایا جا رہا ہے کہ تمہاری محنت کا نتیجہ سامنے آگیا۔ اب یہ لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے۔ اب ان کو نظامِ کفر کے فروغ و بقاء کی کوئی امید ان لوگوں میں نہ رہے گی اور وہ سہارے ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے وہ اب تک کفر سے چمٹے رہے ہیں۔ اب خود بخود یہ لوگ اسلام کے دامن رحمت میں پناہ لینے کے لیے آجائیں گے۔ چنانچہ تاریخ نے یہ بات محفوظ رکھی ہے۔

فتح مکہ اور فتح حنین میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ فتح مکہ کے لیے اسلامی فوجوں کا مکہ میں داخلہ ۲۰ رمضان ۸ھ میں ہوا اور ۶ شوال ۸ھ میں اسلامی فوجیں حنین کی طرف روانہ ہو گئیں۔ دونوں کے درمیان صرف ۱۶ روز کا فاصلہ ہے۔ اس لحاظ سے حنین بھی فتح مکہ کا تتمہ ہے۔ اہل مکہ نے مقابلہ نہیں کیا اور ہوازن و ثقیف مقابلہ پر آئے۔ عام عربوں میں اسلام کے لیے رکاوٹ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے قریش مکہ کی رکاوٹ تھی۔ فتح مکہ اور فتح حنین نے یہ سب سے بڑی رکاوٹ درہم برہم کر ڈالی اور جس سیاہ پردے نے اسلام کی آسمانی روشنی کو عام نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا وہ تار تار ہو گیا ہوازن کے بارے میں پڑھ چکے ہو کہ حضور اقدس ﷺ ابھی جعرانہ ہی میں تھے کہ ایک وفد قبولِ اسلام کر کے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ اسی قبیلہ کی ایک شاخ بنو سعد بن بکر تھے انہوں نے اپنی طرف سے ہشام بن ضمام کو نمائندہ بنا کر روانہ کیا۔ محمد بن اسحاق اور ابو عبید نے بتایا ہے کہ ۹ھ میں آئے واقدی کی رائے ہے کہ ۵ھ میں آئے۔ مگر محققین نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ صحیح بخاری میں ضمام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں دعوت

کے لیے داعی پہنچا تھا۔ اس کے بعد ہی ساری عوامی زندگی اسلام کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اور یدخلون فی دین اللہ افواجا کی تفسیر ہوگئی۔

شاید آپ سوچیں کہ ایسا خود بخود ہوگیا ——— نہیں بلکہ اسلام کی دعوت کے لیے حضور اقدس ﷺ نے داعی مقرر فرمائے اور مختلف اطراف میں روانہ فرمائے۔

مسجد حرام میں مشرکین کا داخلہ بند

(۲۵) مسلمانو! مشرکین نجس ہیں لہٰذا وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے نزدیک نہ آئیں جب حق تعالیٰ نے شرک کی قوت کو توڑ کر جزیرۃ العرب کا صدر مقام مکہ معظمہ فتح کرا دیا اور قبائل عرب جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تب ۹ھ میں اعلان کرا دیا گیا کہ آئندہ کوئی مشرک کافر مسجد حرام میں داخل نہ ہو بلکہ اس کے نزدیک یعنی حدود حرم میں بھی نہ آنے پائے کیونکہ ان کے قلوب کفر و شرک سے اس قدر پلید اور گندے ہیں کہ اس سب سے بڑے مقدس مقام اور مرکز توحید و ایمان میں داخل ہونے کے لائق نہیں اس کے بعد صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضور نے جزیرۃ العرب سے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو نکال دینے کا حکم دیا چنانچہ حضور کی آخری وصیت کے موافق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں یہ حکم عملاً نافذ ہوا اب بطور استیلا یا توطن کفار کے وہاں رہنے پر مسلمانوں کو رضامند ہونا جائز نہیں ہے بلکہ تطہیر جزیرۃ العرب بقدر استطاعت ان کا فریضہ ہے۔ ہاں احناف کے نزدیک کوئی کافر عارضی طور پر امام کی اجازت سے وہاں جا سکتا ہے بشرطیکہ امام اتنی اجازت دینا خلاف مصلحت نہ سمجھے باقی حج و عمرہ کی غرض سے داخل ہونے کی کسی کافر کو اجازت نہیں کما ورد فی الحدیث الا لا یحجن بعد العام مشرک ۱؎

اس آیت میں دو یا تین باتیں تشریح طلب ہیں۔

ایک تو منطوق قرآن ہے یعنی مسجد حرام میں کافر و مشرک کا داخل نہ ہونا۔ دوسرا مدلول قرآن یعنی جزیرۃ العرب میں غیر مسلم کا داخل نہ ہونا۔ شیخ الاسلام نے اپنے اشارات میں دونوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہم پہلے منطوق قرآنی کو بیان کرتے ہیں

یہ آیت بھی اعلان براءت کی اہم دفعہ ہے کہ مشرکین اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ پھٹکنے پائیں۔ یعنی آئندہ کے لیے ان کا حج اور ان کی زیارت ہی بند نہیں بلکہ مسجد حرام کی حدود میں ان کا داخلہ بھی بند ہے تاکہ شرک و جاہلیت کے اعادہ کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔

قابل غور یہ بات ہے کہ یہ حکم مسجد حرام کے بارے میں خاص ہے یا تمام مساجد کے لیے! امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ حج اور عمرہ اور مراسم جاہلیت ادا کرنے کے لیے حدود حرم میں داخل نہ ہوں۔ امام

۱؎ افادات شیخ الاسلام

شافعی کے نزدیک اس حکم کا منشا یہ ہے کہ وہ مسجد حرام میں جا ہی نہیں سکتے امام مالک یہ رائے رکھتے ہیں کہ صرف مسجد حرام ہی میں نہیں جا سکتے بلکہ کسی مسجد میں بھی ان کا داخل ہونا جائز نہیں ہے۔

دوسری بات سوچنے کی یہ ہے کہ آیت میں نجاست سے مراد ظاہری ہے یا معنوی۔ تقریباً سارے اہل السنتہ کے مدارس کا اس پر اتفاق ہے کہ نجاست سے مراد نجاست معنوی ہے یعنی اعتقادی شرک کی نجاست قلبی ہے نہ کہ نجاست جسمی۔

تیسری بات اس میں سمجھنے کی یہ ہے کہ فلا یقربوا المسجد الحرام سے مقصود کیا ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ نہی تکوینی ہے تکلیفی نہیں۔ وہ اس کو محمول کرتے ہیں کفار کے ایسے قرب پر جو غلبہ واستیلاء کے ساتھ ہو یعنی آیندہ کفار کو مسجد حرام میں پاؤں جمانے کا موقع نہ دیا جائے۔ "قرب" کا لفظ منع واستیلاء وتمکین کے لیے کمال مبالغہ ہے۔

علامہ ابو السعود رقم طراز ہیں۔

مشرکین کو مسجد حرام کے قریب ہونے کی ممانعت کے بارے میں روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے کہ مشرکین کو اس پر اقتدار وغلبہ کا موقعہ نہ دو۔

اسی قسم کی تصریحات احناف شارحین قرآن اور فقہائے احناف نے فقہ کی کتابوں میں پیش کی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ احناف کے خیال میں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ غیر مسلموں کو مسجد حرام میں غلبہ وتمکین کے ساتھ داخل ہونے دیں لیکن اگر کسی عارضی ضرورت سے کسی غیر مسلم کو آنے دیا جائے مثلاً تعمیر یا تجارت یا غیر مسلم حکومتوں کے غیر مسلم سفراء تو یہ جائز ہے مگر ائمہ ثلاثہ اور جمہور سلف اس کے خلاف ہیں ان کا کہنا ہے کسی حال میں بھی غیر مسلم مسجد حرام کے حدود میں داخل نہیں ہو سکتا اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ غیر مسلم کے قرب مکانی کو اگرچہ وہ عارضی اور بلا تمکین واستیلاء ہو روکیں اور اس مقام اور اس مقام کے اطراف واکناف کو جہاں کا داخلہ حرم میں داخلہ کا ذریعہ ہے ہمیشہ صرف اہل اسلام کے لیے مخصوص کر دیں۔

امام نووی رقم طراز ہیں:

کسی حال میں جائز نہیں ہے کہ غیر مسلم کو حدود حرم میں داخل ہونے دیا جائے اور اگر کوئی غیر مسلم پوشیدہ طور پر چلا جائے تو اس کا اخراج واجب ہے اگر وہ مکہ میں مر جائے اور دفن بھی ہو جائے تو چاہیے کہ قبر کھودی جائے اور لاش نکال دی جائے۔ اگر متغیر نہیں ہوئی ہے۔

بہرحال اس موضوع پر احناف دلیل کے میدان میں تہی دامن ہیں جمہور کا مذہب دلائل کی قوت رکھتا ہے۔ احناف کا یہ کہنا کہ آیت میں نہی تکوینی ہے بالکل بے وزن ہے۔ کیونکہ یہاں نہی اقتراب میں کمال در مبالغہ ہے اور یہ مبالغہ منع دخول میں ہے اور جب منع دخول ہے تو ظاہر ہے کہ قرب کی ہر صورت وحالت اس ممانعت میں داخل ہوگی اور جب قرآن بھی اس معاملہ میں مبالغہ کر رہا ہے تو معلوم ہوا کہ قرب میں مبالغہ ہی مقصود ہے عربی میں لا ادینک ھاھنا کا مطلب یہ ہی ہوگا کہ کسی

حال میں بھی میں تمہیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتا ہوں۔ اُردو میں جب ہم کہیں گے کہ تم اس جگہ کے پاس بھی نہ پھٹکنا تو اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ کسی حال میں بھی تمہارا یہاں آنا ہمیں پسند نہیں نہ حاکم بن کر اور نہ محکوم ہو کر۔

اصل یہ ہے کہ دین حق کے قیام اور امت مسلمہ کی بقاء کے لیے ضروری تھا کہ جس طرح تعلیم و احکام کو ہمیشہ کے لیے کتاب و سنت میں محفوظ کر دیا گیا اسی طرح باعتبار مکان بھی ایک مرکزی مقام ہمیشہ کے لیے ایسا مقرر کر دیا جاتا جو صرف پرستارانِ حق کے لیے مخصوص ہوتا اور وہاں کی فضا شرک و فساد کی ناپاکی سے کبھی مکدر و ملوث نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے سرزمین حرم کو اس کے لیے منتخب فرمایا۔ اور یہی ناف زمین دنیا کی آخری و باقی ہدایت و سعادت کے لیے ایک مرکزی سرچشمہ و درسگاہ کی حیثیت سے قائم کی گئی۔ ذالك تقدير العزيز العليم۔

اور چونکہ یہ مقصد کمال مبالغہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے ضروری ہوا کہ نہ صرف غیر مسلموں کے قبضہ و تمکین کو بلکہ سرے سے ان کے قرب ہی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ اگر آمد و رفت کا دروازہ کھلا رہے گا تو مسلمانوں کی حمیت کی اہمیت باقی نہ رہے گی۔ طبعیتیں غیر مسلموں کے حرم میں داخلہ کو برداشت کر لیں گی۔ اس صورت میں استیلا ممکن ہو جائے گا۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ شریعت کے مقاصد میں ایک اہم مقصد صرف مفاسد کو روکنا نہیں بلکہ ان ذرائع پر بھی قدغن قائم کرنا ہے جو مفاسد کا دروازہ کھولتے ہیں۔ یعنی قرآن صرف برائیوں کو نہیں روکتا بلکہ ان راہوں پر بھی پہرہ بٹھاتا ہے جو برائیوں کی طرف جانے والی ہوں۔

بہر حال میرے خیال میں اس موضوع پر ائمہ ثلاثہ اور جمہور کا مذہب قوی ہے کہ مسجد حرام میں غیر مسلم کو داخل ہونے دینا کسی حال اور کسی شکل میں جائز نہیں۔ اور اسی پر مسلمانوں کا تیرہ سو سال سے عمل ہے۔

مساجد میں غیر مسلموں کا داخلہ

اس پر امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ متفق ہیں کہ یہ آیت مسجد حرام کے لیے خاص ہے۔ دوسری مساجد کا یہ حکم نہیں ہے ان میں غیر مسلم داخل ہو سکتا ہے لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ بلا قید جواز کے قائل ہیں جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اس میں مسلمانوں کی اجازت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ صرف امام مالک ناجائز بتاتے ہیں۔

احناف کا مذہب فقہ کی کتابوں میں بالکل واضح اور صاف ہے کہ مساجد میں غیر مسلموں کا داخلہ جائز ہے صاحب ہدایہ نے روایتی طور پر وفد ثقیف کی آمد پر ان کے مسجد نبوی میں قیام سے استدلال کیا ہے۔ فتح مکہ اور حنین کی کامیاب جنگ کے بعد جب قبیلہ ثقیف کا وفد آیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ان کو مسجد میں آنے دیا بلکہ بحیثیت مہمان کے ان کو مسجد میں ٹھہرایا آپ کو یاد ہو گا کہ حنین میں جنگ ہوازن و ثقیف ہی سے ہوئی تھی کچھ نے یہ شبہ بھی پیش کیا تھا۔ فتولهم في المسجد

وهم مشركون ۔ آپ ان کو مسجد میں ٹھہراتے ہیں وہ تو مشرک ہیں فرمایا ان الارض لا تنجس زمین ناپاک نہیں ہوتی ہے یعنی ان میں نجاست جسمانی نہیں اعتقادی ہے۔ ابوداؤد اور امام احمد نے عثمان ابن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو خود وفد میں شریک تھے روایت کیا ہے۔

وفد ثقیف جب حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آیا تو آپ نے ان کا قیام مسجد میں تجویز فرمایا تاکہ ان کے دل کچھ نرم ہوں۔

حافظ زیلعی نے نصب الرایہ میں اس کے تمام طرق پر مبسوط بحث کی ہے یہ وفد رمضان ۹ھ میں آیا اور یہ وہ وقت ہے کہ اسلام کا اقتدار پر بھرپور قبضہ ہو چکا ہے۔ حنین میں مغلوب ہونے کے بعد وفد عاجزانہ اور مغلوبانہ آرہا تھا۔ اور اس وفد کے سارے ارکان مشرک تھے اور مشرک بھی کیسے۔ اس وفد کا سردار ابن عبد یا لیل تھا اور اس کا حال یہ ہے کہ ابوطالب کے انتقال کے بعد جب قریش مکہ کا ظلم اس حد تک پہنچ گیا کہ حضور اقدس ﷺ کے لیے مکہ میں رہنا بھی دشوار ہو گیا تو آپ نے طائف کا سفر کیا کہ شائد باہر کے قبائل حق کا ساتھ دیں۔ لیکن آپ جب قبیلہ ثقیف کی بستی میں پہنچے تو اسی عبد یا لیل اور اس کے دونوں بھائیوں نے آپ کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ طائف میں دم لینے کی مہلت نہ دی۔ دعوت حق کا جواب تھا کیا خدا کو کوئی آدمی نہ ملا جسے پیغمبر بناتا جب آپ واپس ہوئے تو بستی کے لڑکوں اور غلاموں کو آپ کے پیچھے لگا دیا کہ تضحیک اور تحقیر کریں۔ انھوں نے آپ کی شان میں گستاخیاں کیں۔ اللہ اکبر اس جسم مقدس کو جس کے بقاء پر تمام روئے زمین کی ہدایت و سعادت موقوف تھی پتھروں کی بوچھاڑ سے زخمی کر دیا۔ پیشانی مبارک کا خون بہہ کر پائے مبارک کو رنگین کر رہا تھا اور یہ دعا ورد زبان تھی۔

اللھم انی اشکوا الیک ضعف قوتی و قلۃ حیلتی وھوانی علی الناس یارب المستضعفین۔

اس کے بعد جنگ ہوازن و ثقیف کے جو واقعات پیش آئے وہ آپ آیت بالا کی تشریح میں پڑھ چکے ہیں۔ جنگ ہوازن کے بعد عروۃ ابن سعود ثقفی مدینہ آیا اور مشرف باسلام ہوا۔ مسلمان ہونے کے بعد تبلیغ حق کے عشق نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ حضور اقدس ﷺ روکتے رہے اور وہ قوم کی محبت کے اعتماد پر طائف واپس گئے اور اسلام کی دعوت کا کام شروع کر دیا لیکن ثقیف نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ایک روز عین نماز کی حالت میں شہید کر دیا۔ یہ تو اس وفد کی اسلامی عداوت کی تصویر ہے خود کفر سے ان کو کس قدر محبت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب فتح مکہ کے بعد یہ وفد آیا اور مسجد کے قیام میں کلام اللہ کی تلاوت باجماعت نماز کا نظارہ اور حضور اقدس ﷺ کی محبت دیکھ کر اسلام لانے کے لیے تیار ہوئے تو اگرچہ اسلام کی صداقت مان چکے تھے لیکن پھر بھی بت پرستی اور کفر کا کانٹا دل سے نہیں نکلتا تھا چاہتے تھے کہ اپنی شرطیں منوا کر مسلمان ہوں۔

پہلے مطالبہ کیا کہ نماز کی پابندی سے ہمیں مستثنیٰ کر دیجئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا لا خیر فی دین لیس فیہ

رکوع۔ وہ دین ہی کیا جس میں اللہ کے سامنے جھکنے والی پیشانی نہ ہو۔

پھر بولے اچھا زنا کے بغیر تو چارہ نہیں۔ ہماری قوم کے لوگ اکثر سفر میں رہتے ہیں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا۔ پھر بولے کہ سود چھوڑنا تو مشکل ہے۔ شراب تو ہماری غذا ہے۔ دونوں باتوں کے جواب میں ارشاد فرمایا۔ اتقوا اللہ و ذروا مابقی من الربا اور رجس من عمل الشیطان۔ جب ان ساری شرطوں اور مطالبوں کو بابِ نبوت نے رد کر دیا۔ تو آخر میں بولے کہ اچھا ساری باتیں منظور لیکن رب۔ دیبی کو ہم نہیں ڈھا سکتے۔ اس کو حضور اقدس نے منظور فرمایا اور خالد بن الولید کو چند صحابہ کے ساتھ اس مہم پر روانہ کیا کہ طائف کی دیبی کو گرائیں حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مندر کی زمین تک کھود ڈالی مگر یہ لوگ یہی کہتے رہے کہ بے حرمتی کا وبال آئے گا۔ ان حقائق سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ سخت قسم کے مشرک اور اسلام کی عداوت میں کس درجہ سنگدل تھے اس کے باوجود حضور اقدس نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جس قلعہ طائف کو مسلمانوں کی منجنیق چالیس دن تک سنگ باری کر کے فتح نہ کر سکی۔ اس کے بسنے والوں کے دلوں کو حضور اقدس کے خلق اعظم، اسلام کی سماحت، مسجد کے قیام اور اسلامی عبادت کے نظام نے چند گھنٹوں میں فتح کر لیا۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہے کہ خود عائشہ نے ایک روز حضور سے دریافت کیا کہ اُحد والے دن سے بھی زیادہ سخت دن کوئی آپ پر آیا ہے فرمایا۔ ہاں وہ دن جب میں طائف گیا اور اعانت و قبول حق کی امید سے اپنی دعوت ابن عبد یالیل کے سامنے پیش کی اور اس نے میری کوئی پروانہ کی وہ دن اُحد سے بھی زیادہ سخت تھا۔ اسی روایت میں ہے کہ اس کے باوجود آپ نے فرمایا تھا کہ:

اس پر بھی مجھے اُمید ہے کہ ان کی نسل سے وہ لوگ پیدا ہوں گے جو اللہ کی عبادت کریں گے۔

غزوہ طائف میں جب قلعہ مسخر نہ ہوا اور وقتی مصالح کے تحت حصار اٹھا لیا گیا لوگوں نے کہا ثقیف کے لیے بددعا کیجئے۔ فرمایا۔ اللھم اھد ثقیفا وأت بھم

اے اللہ ثقیف کے دلوں کو قبول حق کے لیے کھول دے۔

چنانچہ یہی ہوا جن لوگوں نے پتھر مارے تھے وہ دوڑے دوڑے آئے کہ حق قبول کریں۔ یہی ہے ثم یتوب اللہ من بعد ذالک علیٰ من یشاء کی واقعاتی تعبیر۔ مسجد میں ان کے لیے خیمہ لگایا گیا اور حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میزبانی کے فرائض انجام دیئے اور مسجد میں ٹھہرانے کی علت یہ بتائی گئی حیث یسمعون القران۔ جہاں وہ قرآن سن سکیں۔

بہر حال یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ کافر و مشرک کے مسجد میں داخلہ پر اسلام میں کوئی قدغن نہیں ہے۔ اس موضوع پر امام مالک کی رائے دلائل سے تہی دامن ہے جبکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا دامن دلائل کے موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی تائید میں صرف ایک واقعہ نہیں ہے اور بھی واقعات ہیں۔ وفد نجران کا واقعہ بھی ان واقعات

میں سے ایک ہے جو صحاح اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے اور جس کی نسبت سورہ آل عمران کی آیات مباہلہ بالاتفاق نازل ہوئیں۔ نجران یمن میں عیسائی آباد تھے حافظ ابن القیم نے اپنی عادت کے مطابق اس واقعہ کی فقہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اس میں اہل کتاب کو مسلمانوں کی مساجد میں داخل ہونے کا پروانہ ہے۔ (زاد المعاد)

صحیحین میں ثمامہ ابن اثال کا واقعہ موجود ہے۔ ثمامہ نجد کا رئیس تھا ہجرت کے پانچویں سال حضور اقدس ﷺ نے چند سوار نجد کی طرف روانہ کیے وہ ثمامہ کو گرفتار کر لائے اور مسجد نبوی کے ستون سے باندھ دیا۔ تمام روایات کے جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تین دن تک وہ مسجد میں رہا۔ تیسرے روز حضور اقدس ﷺ نے بلا کسی شرط کے رہا کر دیا۔ امام بخاری نے جواز دخول مشرک بر مسجد میں اسی واقعہ سے استدلال کیا ہے کتاب الصلاۃ میں ایک خاص باب اس عنوان سے قائم کیا ہے کہ دخول المشرک فی المسجد اور اس میں اسی واقعہ سے استدلال کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اس بارے میں حق اور قوی ہے اور امت کا عمل بھی تیرہ صدیوں سے اسی پر ہے

یہود و نصاریٰ کا جزیرہ عرب سے اخراج

آیئے دوسرے مسئلہ پر بھی ذرا توجہ فرمائیے۔ یہاں تک تو قرآن کا منطوق ہے اور حکم خاص اس مرکز کے متعلق تھا جسے مسجد حرام کہتے ہیں کہ کوئی غیر مسلم نہ صرف یہ کہ وہاں نہ رہے بلکہ کسی حال میں اس کے قریب بھی نہ آئے۔ جمہور اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ مسجد حرام سے مراد صرف خانہ کعبہ کا احاطہ نہیں بلکہ تمام سرزمین حرم ہے یہ حکم تو خاص اس مرکز کے متعلق تھا۔ قرآن کی آیت کے مدلول سے حضور اقدس ﷺ نے اس مرکز کے ارد گرد کا حکم بھی بتا دیا کہ اسلامی مرکز کا گرد و پیش اور اس کا مولد و منشا ہمیشہ غیروں کے اثر سے محفوظ ہو جائے۔ اسلام کو اپنے ظہور کے وقت مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے سابقہ پڑا۔ مشرکین عرب کے بعد یہود و نصاریٰ کی بھی ایک بڑی جماعت جزیرۃ العرب میں آباد تھی۔ مدینہ میں یہودیوں کے متعدد قبیلے تھے خیبر میں ان کی ریاست تھی۔ یمن میں نجران عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا۔

چنانچہ مدینہ کی سرزمین کو آپ نے اپنی زندگی ہی میں یہودیوں سے خالی کرا لیا آخری جماعت جو مدینہ سے نکالی گئی وہ بنو قینقاع اور بنو حارثہ تھے۔ امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے۔

بنو نضیر نے حضور سے جنگ کی حضور نے بنو نضیر کو جلا وطن کیا قریظہ کا قیام رہا۔ جب انہوں نے بھی جنگ کی۔ تو وہ مفتوح و مغلوب ہو کے مرد قتل ہوئے عورتیں اور بچے قید ہوئے۔ کچھ بچے مسلمان ہو گئے مدینہ کے سارے یہود کو حضور نے مدینہ سے نکال دیا۔ (صحیح مسلم)

بخاری و مسلم میں اس اخراج کا واقعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیان کے مطابق اس طرح ہے کہ حضور اقدس صحابہ کو ساتھ لے کر یہودیوں کی تعلیم گاہ میں گئے اور فرمایا:

اے یہودیو! اسلام کو قبول کرلو نجات پاؤ گے پھر فرمایا یہ سرزمین سرکاری ہے اس پر اللہ و رسول کا قبضہ ہے میں تمہیں یہاں سے جلاوطن کرنا چاہتا ہوں جس کسی پاس کسی قسم کا اثاثہ ہو وہ فروخت کرلو۔ ورنہ جان لو اس ملک کی حکومت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہے جو غیر مسلم اس ملک میں باقی رہ گئے خارج کر دیئے جائیں گے۔

امام بخاری نے باب باندھا ہے۔ اخراج الیھود من جزیرۃ العرب اس میں پہلی روایت یہود مدینہ کے اخراج کی لائے ہیں۔ دوسری روایت حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی۔ ایک تھی اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ:

امام بخاری نے عنوان میں صرف یہود کا ذکر کیا ہے امام بخاری بتانا چاہتے ہیں کہ تمام غیر مسلم اقوام میں یہودی سب سے زیادہ توحید کے قائل ہیں ان کو خارج کیا گیا ہے تو دوسروں کے اخراج کا واجب ہونا بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا۔ لہٰذا تصریح کی ضرورت نہیں [1]

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں یہود و نصاریٰ کی تصریح ہے۔

میں ضرور جزیرہ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکالوں گا تا آنکہ جزیرہ میں صرف مسلمان رہ جائیں۔

امام احمد نے ابوعبیدہ ابن الجراح کے حوالہ سے بتایا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال سے پہلے آخری بول یہ تھا کہ حجاز کے یہودیوں کو اور نجران والوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس کی علت بھی بتا دی ہے۔

سب سے آخری وصیت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تھی کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہ ہوں۔

اسی وصیت اور حکم کی تعمیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر اور یمن کے یہود و نصاریٰ کو عرب سے نکالا۔ حافظ عسقلانی فتح الباری میں رقم طراز ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جن یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکالا تھا ان کی تعداد چالیس ہزار تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا تمام صحابہ کے مشورے اور اتفاق سے کیا اور حضور اقدس کی وصیت کی پوری تحقیق کے بعد کیا۔ امام مالک نے زہری کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

---

[1] فتح الباری

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی میں رہے تاآنکہ حض ر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بات ورپر ثابت ہو گئی کہ
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جزیر ں دو دین اکٹھے نہیں ر ۔ حضرت عمر رض نے
یہ ثابت ہو جانے کے بعد اعلان کیا جس کے پا قدس صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہوا سے وہ پیش
کرنا چاہیے تاکہ اس کو نافذ کیا جا سکے ورنہ میں تم بدر کروں گا چنانچہ آپ نے لک بدر کر دیا۔

ایک وسوسہ اور اس کا ازالہ

شائد آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ اگر علت یہی عر دو دین جمع نہیں ۔ تو اس کام کی حضور اقدس
صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تکمیل کیوں نہیں کی؟

جواب یہ ہے کہ احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں ایک قسم احک ہے جن کا تعلق ا ا ح و تزکیہ سے ہوتا ہے جیسے
تمام اوامر و نواہی اور فرائض و واجبات دوسرے دو میں تعلق سے نہیں بلکہ ام ، اور اجتماعی فرائض اور ملکی سیاسیات
سے ہوتا ہے جیسے قوانین سیاسیہ اور فتح ممالک۔

سنت الٰہی یوں ہے کہ پہلی قسم کے احکام خود شارع زندگی یں تکمیل ہیں اور وہ ان کی تکمیل کا اعلان
کر کے دنیا سے جاتے ہیں لیکن دوسری قسم کے لیے ایسا ہونا ضر نہیں ن کے نفا ے لیے ایک خاص وقت مطلوب
ہوتا ہے اور وہ شارع کے بعد بتدریج تکمیل و تنفیذ پاتے ہیں سر بت یا تو بطو ن بتایا جاتا ہے یا اپنے جانشینوں
کو وصیت کر دی جاتی ہے۔

یہ جلا وطنی کا مسئلہ اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے اس یے ض ا کہ اس کا پ د خود حضور کی حیات مقدسہ میں
ہو جاتا۔ آپ نے یہود کے اخراج سے عملاً نفاذ شروع کر دیا تھا خیبر ہی میں معا جب ضرورت ہو گی یہاں سے
جلا وطن کر دیئے جاؤ گے۔ پھر اسی منصوبہ کی تکمیل کی اپنے جانشین کرا ی۔ چنانچہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس
کی تکمیل کا وقت آ گیا۔ اور یہود خیبر نے اپنی شرارتوں سے خود سر انجام کر دیا۔

ایک اور شبہ کا ازالہ

شاید آپ یہ بھی محسوس کریں کہ حضرت ابو بکر تعالیٰ نے زمانہ خلافت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
نے اہل خیبر کی شرارتوں اور واقعہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ل نہیں کیا۔
بات ٹھیک ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تنفیذ و صیت پر تکمیل کا ضروری ہے۔ حالات

کا دہارا کچھ ایسا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اہل ردت کے قتال وغیرہ مہمات نے مہلت نہ دی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ہوتے ہی ایران عراق اور شام کی مہمات عسکریہ میں مشغول ہو گئے جب خیبر کی شرارتوں نے خود موقع فراہم کر دیا تو آپ نے یہ کام بھی انجام دے دیا۔ اور جس طرح مہمات شرائع خود حضور اقدس کے زمانے میں بتدریج تکمیل کو پہنچے ٹھیک اسی طرح مہمات سیاسیہ بھی خلافت راشدہ میں بتدریج تکمیل کو پہنچے۔

اب کسی کو اس کا حق نہیں ہے کہ محض رائے، مصلحت کے سہارے قرآن کے مدلول نبوت کے منطوق اور خلافت راشدہ کے اسوس عمل کا مقابلہ کرے۔

افسوس ہے کہ مولانا شبلی نے الفاروق میں یہود و نصاریٰ کے جزیرۃ العرب سے اخراج کی یہ توجیہ کی ہے کہ ــــ یہود خیبر اور نصاریٰ یمن بغاوت کی تیاریاں کر رہے تھے اس لیے مجبور ہو کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو نکال دیا۔ مولانا کو اس توجیہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو یورپ کے ادعائی مذاق کے مطابق دکھلانا چاہتے تھے اور چونکہ لا یترك فی جزیرۃ العرب دینان کا معاملہ ان کے خیال میں آج کل کی تہذیب اور روشن خیالی کے خلاف تھا اور اس کی کوئی سائنٹفک توجیہ ان کو معلوم نہ تھی اس لیے بحالت مجبوری اور ناچار یہود خیبر کی شرارت کا سہارا لیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو قرآن کے مدلول سے سمجھا ہوا شرعی ضابطہ سے ہٹا کر محض دفع بغاوت کا ایک سیاسی واقعہ بتا دیا فانا للہ والی اللہ المشتکیٰ ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مولانا نے اسی ذہنی مرعوبیت کے پیش نظر تجارتی قافلے پر حملہ کا غزوہ بدر میں انکار کر دیا اور معذرت آمیز انداز اختیار کیا۔ حالانکہ کسی معاملے کے متعلق معذرت آمیز لب و لہجہ استعمال کرنا ضعف موقف کی علامت ہے۔ جب موقف ضعیف ہو تو اسے دلائل کے زوردار الفاظ کی فراوانی سے مستحکم نہیں بنایا جا سکتا۔

بہرحال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باتفاق جمیع صحابہ جو کچھ کیا وہ دراصل اسی وصیت نبوی اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب کی تعمیل تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور کے ارشاد و عمل ان کے آخری لمحات کی وصیت حضرت عمرؓ کے اور تمام صحابہ کے اجماع و اتفاق سے یہ بات روز روشن کی طرح علی رؤس الاشہاد ہو گئی۔ کہ اسلام نے ہمیشہ کے لیے جزیرۃ العرب کو صرف اسلامی آبادی ہی کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔

جزیرہ عرب کی تحدید

یہاں تک پہنچنے کے بعد معالم کے قاری کے ذہن میں یہ سوال ضرور چٹکیاں لے گا کہ جزیرہ سے مقصود کیا ہے تمام مورخین اور قدیم جغرافیہ نگار اس پر متفق ہیں کہ عرب کو جزیرہ اس لیے کہا گیا کہ تین طرف سمندر اور ایک طرف دریائے پانی سے محصور ہے یعنی تین طرف بحر ہند، خلیج فارس، بحر احمر و قلزم واقع ہیں ایک جانب دریائے دجلہ۔ صورت اس کی یہ ہے کہ دریائے

فرات بلادِ روم سے شروع ہوا اور قنسرین کے نواح میں عرب کی سرحد پر ظاہر ہوا پھر عراق میں ہوتا ہوا بصرہ کے پاس سمندر میں جاگرا وہاں سے پھر عرب کو سمندر نے گھیرا اور قطیف و بحرین میں ہوتا ہوا عمان سے گذر گیا۔ پھر حضر موت اور عدن ہوتا ہوا یمن کی جانب یمن کے ساحلوں سے جا ٹکرایا۔ حتیٰ کہ جدہ میں نمودار ہو گیا جو مکہ اور حجاز کا ساحل ہے پھر ساحل طور اور خلیج ایلہ پر جا کر سمندر کی شاخ ختم ہو گئی پھر سرزمین مصر شروع ہوتی ہے اور قلزم نمودار ہوتا ہے اور اس کا سلسلہ بلادِ فلسطین سے سواحل عسقلان ہوتا ہوا سرزمین شام و ساحل اردن تک بیروت پر پہنچ جاتا ہے اور آخر میں قنسرین تک منتہی ہو کر وہ جگہ آتی ہے جہاں سے فرات نے عرب کا احاطہ شروع کیا تھا۔ یہی جزیرہ ہے جس سے عرب کی سرزمین مراد ہے اور یہی عرب اقوام کا مولد و منشاء ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عرب طول میں عدن سے لے کر عراق کی ترائی تک اور عرض میں ساحل بحر احمر سے خلیج عربی تک پھیلا ہوا ہے اس کی حد شمال میں دائیں جانب دجلہ ہے اور اگر عرض کا خط کھینچیں تو بائیں جانب شام آج کل جغرافیوں میں عرب کے یہی حدود بتائے جاتے ہیں۔

اس ساری تفصیل کے بعد آئیے اب صاحب معالم التنزیل امام بغوی کی زبانی اس تفصیل کا خلاصہ بھی سن لیجئے قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری اور خازن نے اپنی تفسیر میں اسی کو نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ

تمام اسلامی علاقے غیر مسلموں کے اعتبار سے تین قسم کے ہیں۔

۱۔ حرم کا علاقہ اس میں غیر مسلم کا داخل ہونا جائز نہیں ہے خواہ وہ غیر مسلم اسلامی مملکت کا شہری ہو یا امن کی راہداری رکھتا ہو یہی امام شافعی امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کا مسلک ہے۔ اگر دارِ کفر سے کوئی غیر مسلم ایلچی بن کر آئے اور مسلمان سربراہ مملکت حرم میں ہو تو اسے حرم میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے بلکہ خود حرم سے باہر آکر اس سے ملے۔ لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک معاہد غیر مسلم کو مسلمان سربراہ کی اجازت سے داخل ہونا جائز ہے۔

۲۔ جزیرۃ العرب اس میں غیر مسلموں کو تین دن سے زیادہ قیام کی اجازت نہیں لیکن مسلمان سربراہ مملکت سے راہداری لے کر داخل ہو سکتے ہیں۔

۳۔ ان دو کے علاوہ سارے اسلامی ممالک ان میں غیر مسلم داخل بھی ہو سکتے ہیں اور رہ بھی سکتے ہیں نہ ان کے داخلہ پر کوئی پابندی اور نہ ان کی رہائش پر۔ لیکن صرف مساجد میں داخلہ کے لیے اجازت شرط ہے۔

بالکل آخر میں حضرت مولانا آزاد کی زبانی بھی آیت کی تشریح سن لیجئے افسوس کہ مولانا کی تفسیر البیان شائع نہ ہو سکی۔ تشنہ کام لوگوں کے لیے بہت بڑی علمی سیرابی کا سامان ہو جاتا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اسی حکم کا ذکر ہے جو اوپر گذر چکا ہے یعنی آیندہ سے کوئی مشرک اس عبادت گاہ میں جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے

خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنائی تھی داخل نہ ہو سکے گا۔ اور یہ مقام امت مسلمہ کے لیے مرکز ہدایت بن کر رہے گا جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔

اس آیت میں مشرکوں کے نجس ہونے سے مقصود ان کی قلبی نجاست ہے نہ کہ جسمانی کیونکہ اسلام کسی انسانی جسم کو ناپاک نہیں قرار دیتا۔ اور ہر انسان کو انسان ہونے کے لحاظ سے ایک درجہ پر رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے چھوت چھات کی ہر قسم کے عمل کو ناجائز قرار دیا ہے۔ خود پیغمبر اسلام کا یہودیوں اور مشرکوں سے ہر طرح کی معاشرت رکھنا۔ ایک ساتھ کھانا پینا ان کی دعوتوں میں جانا اور انہیں دعوتوں میں بلانا حتی کہ انہیں مسجد میں ٹھہرانا ثابت ہے۔ لا یقربوا المسجد الحرام کا حکم بالاتفاق مسجد حرام سے تعلق رکھتا ہے۔ عام مساجد میں غیر مسلموں کے لیے کوئی شرعی روک نہیں ہے چنانچہ پیغمبر اسلام نے یمن کے عیسائیوں اور طائف کے مشرکوں کو اپنی مسجد میں ٹھہرایا تھا[1]

معاشی بدحالی کا اندیشہ

(۲۶) اور اگر تمہیں اس وجہ سے معاشی بدحالی کا اندیشہ ہو تو گھبراؤ نہیں اللہ سبحانہ تمہیں اپنے فضل سے غنی بنا دے گا اللہ دانائی اور علم والا ہے۔ حرم میں مشرکین کی آمد و رفت بند کرنے سے مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ تجارت کو بڑا نقصان پہنچے گا۔ اور جو سامان تجارت یہ لوگ لاتے تھے وہ نہیں آئے گا اس لیے تسلی کر دی کہ اس سے نہ گھبراؤ تم کو غنا عطاء فرمانا محض اس کی مشیت پر موقوف ہے وہ چاہے گا تو کچھ دیر نہ لگے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خدا نے سارا ملک مسلمان کر دیا مختلف بلاد و امصار سے تجارتی سامان آنے لگا بارشیں خوب ہوئیں جس سے پیداوار بڑھ گئی۔ فتوحات و غنائم کے دروازے کھول دیئے۔ اہل کتاب وغیرہ سے جزیہ کی رقمیں وصول ہونے لگیں۔ غرض مختلف طریقے سے حق تعالیٰ نے غنا کے اسباب جمع کر دیئے۔ بے شک خدا کا حکم حکمت سے خالی نہیں[2]

مطلب یہ ہے کہ مشرکین پر حرم میں داخل ہونے کی پابندی معاشی، تجارتی اور کاروباری حالات کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ یہ اندیشہ والی بات اس لیے فرمائی ہے کہ حج کے زمانے میں باہر کا مال مکہ آتا اور مکہ کی چیزیں باہر کے تاجر خریدتے تھے اس زمانے میں کاروباری پہلو کو اس قدر اہمیت ہو گئی کہ حج کا زمانہ اسی کاروباری پہلو سے متعین ہوتا قریش نے نسی کا قاعدہ ایجاد کر کے حج کا ایک خاص موسم متعین کر دیا تھا تاکہ موسمی تغیرات تجارتی کاروباری گرما گرمی میں رکاوٹ نہ بنیں۔ اب ۹ھ میں اسلام کی جانب سے جب اعلان ہوا کہ آئندہ مشرکین حج نہیں کر سکتے تو ان کو تشویش لاحق ہوئی جو کاروباری زندگی سے تعلق رکھتے تھے ان کو خیال آیا کہ مشرکین کو روک دینے سے کاروبار اور تجارت پر بڑا اثر پڑے گا جس سے مسلمانوں کی معاشی حالت بد سے بدتر ہو جائے گی۔ ظاہر ہے یہ سوچ ان کی ہی ہوئی ہوگی جن کی معیشت کا دار و مدار حج پر تھا اور یہ مکہ کے ان نو مسلموں کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا ہوگا۔ پھر ہم کہاں

[1] ترجمان قرآن

[2] افادات شیخ الاسلام

گے کہاں سے، کھانے کا انتظام کیا ہوگا؟ ورنہ مہاجرین وانصار تو یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ ان کی معیشت کا کوئی تعلق حج سے نہ تھا۔ اللہ سبحانہ نے ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے فرمایا کہ معاشی بدحالی کا غم نہ کرو اللہ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے تمہیں غنی بنا دے گا چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اللہ سبحانہ کا یہ وعدہ پورا ہوا اور اس طرح پورا ہوا کہ ایک دن کے لیے بھی تجارت اس قانون سے متاثر نہ ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تو یہ حال ہوا کہ مصر و شام اور روم و ایران کے خزانے بھی اونٹوں پر لد لد کر اسلامی حکومت کے سرکاری خزانے میں پہنچنے لگے اور اللہ نے اپنے فضل سے اس طرح غنی کر دیا کہ لوگ اپنی زکوٰۃ کا مال مدینہ کی گلیوں میں لیے پھرتے تھے لیکن اس کا لینے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔

ان شاء اگر چاہے گا سے اس حقیقت پر متوجہ کرنا مقصود ہے کہ اس وعدہ کو پورا کرنے کے لیے کسی لمبے چوڑے سامان کی ضرورت نہیں ہے محض اس کی مشیت کافی ہے۔ چنانچہ جب اس کی مشیت ہوئی سارا ملک اسلام کے زیر نگین آگیا۔ سامان تجارت دور دور سے آنے لگا بارشیں اچھی ہوئیں۔ پیداوار خوب ہونے لگی۔ فتوحات اور غنیمتوں کے دروازے کھل گئے غرض مشیت کی ایک حرکت نے اسباب غنا جمع کر دیئے۔ فقہائے مفسرین نے آیت سے یہ بھی استنباط کیا ہے کہ رزق کے باب میں تعلق خاطر اسباب ظاہری سے رکھنا جائز ہے اور توکل کے منافی نہیں۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔

اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ دل کا تعلق اسباب سے توکل کے منافی نہیں ہے۔

اور یہ بھی علماء نے اس آیت سے بات سمجھی ہے کہ روزی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ عطیہ خداوندی ہے جیسا کہ علامہ قرطبی نے تفسیر میں لکھا ہے۔

اور یہ بھی اس کے ساتھ اس انشاء اللہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ رزق کے لیے اللہ سبحانہ کی سنت یہ ہے کہ وہ وسائل اور ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ وسائل کے بغیر رزق کا حصول اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔ اسی لیے ان شاء کہہ کر آتے ہیں جس کا حاصل یہی ہے کہ ثمر کا ہونا یقینی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اسباب کی بجا آوری تم نے کی تو غنا حاصل ہونے کے لیے فضل خداوندی ہوگا چونکہ اللہ کی مشیت کا ظہور اللہ کے علم و حکمت کے تحت ہوتا ہے اس لیے فرمایا ان اللہ علیم حکیم۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا
يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ
مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ
وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿٢٩﴾ ع ۵

جنگ کرو ان اہل کتاب سے جو نہ تو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت پر اور نہ حرام کرتے ہیں ان چیزوں کو جن کو اللہ و رسول نے حرام کیا اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں یہاں تک وہ جزیہ دیں اپنی کشائش سے چھوٹے اور محکوم بن کر ۲۷ ع

مفردات کے معانی

الجزیۃ عربی میں جزیہ خراج کے معنی میں بولا گیا ہے جو اراضی سے وصول کیا جاتا ہے اور ٹیکس کے لیے بھی جو اشخاص پر عائد ہوتا ہے۔ ایران و روم میں اس طرح کے ٹیکس لیے جاتے تھے۔ خود جزیہ کا لفظ بھی ایران کی پیداوار ہے یعنی فارسی لفظ گزیت کا معرب ہے۔ اس بارے میں مولانا شبلی مرحوم نے جو کچھ لکھا ہے وہ زمانہ حال کی نہایت قیمتی تحقیق ہے۔ اس کے اصلی معنے جنگی ٹیکس کے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں دو ہی احتمال ہیں ایک یہ کہ لفظ جزیہ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں ایک ہی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ اصل لفظ فارسی ہے اور فارسی سے عربی میں آیا ہے جیسے اور بہت سے فارسی الفاظ اہل عرب نے لے لیے ہیں عن ید اصل معنے تو ہاتھ کے ہیں لیکن یہاں وسعت اور کشائش سے کنایہ ہے یعنی ان سے لیا جائے جن کے ہاتھ میں ہو اور ہاتھ سے دیں اور جن کے پاس کچھ نہ ہو اور دینے میں ان کے ارادے کو دخل نہ ہو ان سے نہ لیا جائے جیسے بچے عورتیں صاغرون صغر سے ہے کبر کی ضد اس کے معنے چھوٹا ہونا یعنی محکوم اور اسلامی حکومت کے شہری بن کے رہنے کے ہیں۔

اہلِ کتاب سے قتال کا حکم

پہلی آیات میں ان مشرکین سے معاہدے ختم کرنے کا ذکر ہے جنھوں نے عہد کی خلاف ورزیاں کی تھیں یا جن کے معاہدے میعادی تھے اس آیت میں ان یہودیوں اور عیسائیوں سے تمام معاہدات فسخ کرنے کا حکم دیا ہے جنھوں نے یکے بعد دیگرے معاہدوں کی خلاف ورزیاں کی تھیں اور مسلمانوں کے امن و عافیت کے خلاف ایک بڑا خطرہ بن گئے تھے اور حکم دیا ہے کہ مشرکین عرب کی طرح ان سے بھی اعلانِ جنگ کرو۔

حضور اقدس ﷺ مدینہ تشریف لائے تو حجاز میں یہود کی متعدد جماعتیں آباد تھیں لیکن عیسائیوں کی کوئی قریب آبادی نہ تھی وہ یا تو یمن میں تھے یا عرب شام کے سرحدی علاقے میں۔ یہودیوں کا جو طرزِ عمل رہا اس کا حال آپ پہلے سن چکے ہیں۔ عیسائیوں کی حالت یہودیوں سے مختلف تھی۔ یمن کے عیسائیوں نے ابتدا ہی سے موافقانہ روش اختیار کی تھی اور خود اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کر لیا تھا۔ پھر اسلام نے خود بخود اپنی راہ نکال لی لیکن آگے چل کر جب دعوتِ اسلام نمادار ہوئی تو وہ عیسائی ریاستیں جو عرب اور شام کے سرحدی علاقہ میں تھیں اور رومی حکومت کے ماتحت تھیں اسلام کی دعوت کی وسعتوں کو دیکھ نہ سکیں اور رومی حکومت کی اعانت پر مغرور ہو کر مسلمانوں سے جنگ کے لیے تیار ہو گئیں۔ سب سے پہلا معاملہ حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا پیش آیا۔ حضور اقدس ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت کا خط دے کر موتہ بھیجا تھا۔ موتہ کا رئیس شرجیل بن عمرو غسانی تھا۔ اس نے حضرت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دیا۔ حضور اقدس ﷺ اس کھلے ظلم کے خلاف جنگ پر مجبور ہو گئے۔ اور ۸ھ میں ایک فوج روانہ کی گئی۔ اس وقت شہنشاہ قسطنطنیہ بھی شام میں مقیم تھا اس سے رئیس موتہ نے مدد مانگی۔ اور شاہی فوج بھی میدان میں آ گئی۔ لیکن فتح مسلمانوں کی ہوئی۔

اس واقعہ کے بعد شام کے تمام عرب قبائل نے سنگھٹن قائم کر کے مسلمانوں پر حملہ کا ارادہ کر لیا اور قسطنطنیہ کے بادشاہ نے ان کو مدد دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی ایک سال نہ گذرا تھا کہ شاہی فوجیں شام میں جمع ہونے لگیں اور حضور اقدس ﷺ کو خود دفاع کے لیے جانا پڑا۔ اسی کا نام تبوک کا غزوہ ہے۔

اس سورت کی یہ آیات اس واقعہ کے بعد نازل ہوئیں۔ چونکہ اب مسلمانوں پر ان کی جانب سے سخت حملہ ہونے والا تھا۔ اور دوسری طرف عرب کے یہودی سازشوں میں لگے ہوئے تھے اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ مشرکین کی طرح ان یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کیا جائے۔

جیسے مشرکین سے ساری دنیا کے مشرکین مراد نہیں ایسی ہی عیسائی اور یہود سے سارے جہان کے عیسائی اور یہود مراد نہیں بلکہ وہی مراد ہیں جنھوں نے اسلام کی راہ روکی یا جو قیامت تک روکتے رہیں گے۔

(۲۷) جنگ کرو ان اہلِ کتاب سے جو نہ تو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت پر اور نہ حرام کرتے ہیں ان چیزوں کو جن کو اللہ اور رسول نے حرام کیا اور نہ دینِ حق کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں کشائش سے عاجز اور محکوم بن کر۔ جب مشرکین کا قصہ پاک ہو گیا اور ملکی سطح ذرا ہموار ہوئی تو حکم ہوا کہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کی قوت توڑ دو۔ مشرکین کے وجود سے تو بالکل عرب کو پاک کر دینا مقصود تھا لیکن یہود و نصاریٰ کے متعلق اس وقت صرف اسی قدر مطمح نظر تھا کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں زور نہ پکڑیں اور اس کی اشاعت و ترقی میں حائل نہ ہوں۔ اس لیے اجازت دی گئی کہ اگر یہ لوگ ماتحت رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کر لیں تو کچھ مضائقہ نہیں قبول کر لو پھر حکومتِ اسلامیہ ان کے جان و مال کی محافظ ہوگی ورنہ ان کا علاج بھی وہی ہے جو مشرکین کا تھا یعنی مجاہدانہ قتال کیونکہ یہ بھی اللہ اور یومِ آخرت پر جیسا چاہیئے ایمان نہیں رکھتے نہ خدا اور رسول کے احکام کی کچھ پروا کرتے ہیں رسول کریم ﷺ تو کجا اپنے تسلیم کردہ نبی حضرت مسیح علیہ السلام کی بھی پیروی نہیں کرتے ہیں محض اہواء و آراء کا اتباع کرتے ہیں جو سچا دین پہلے آیا یعنی حضرت مسیح وغیرہ کے زمانہ میں اور جو نبی آخر الزماں لے کر آئے کسی کے قائل نہیں بلکہ جیسا کہ عنقریب آتا ہے اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ خدا کا روشن کیا ہوا چراغ اپنی پھونکوں سے گل کر دیں۔ ایسے بدباطن نالائقوں کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو ملک میں فتنہ و فساد اور کفر و تمرد کے شعلے بھڑکتے رہیں گے [1]

آیئے شیخ الاسلام نے جو کچھ اختصار سے فرمایا ہے اس کی تفصیل گوش گذار فرما لیجئے۔

یہاں کچھ اہم باتیں سمجھنے کی ہیں۔

اقوامِ دنیا کی قانونی تقسیم

اوّل یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا۔ اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق فرمائے جن پر اسلام کی تیرہ صدیوں سے برابر عمل ہو رہا ہے۔

۱۔ مسلمان جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو مانتے ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور برائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا کھا سکتے ہیں۔ ان سے جنگ حرام ہے اگر ان میں کوئی طبقہ اسلامی حکومت کا باغی ہو جائے تو ان کے اموال غنیمت نہیں اسلامی حکومت میں ان کے حقوق برابر ہیں۔

۲۔ مشرکین عرب یعنی وہ لوگ کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ ان ہی کی زبان میں ان پر کتاب نازل ہوئی اسی ملت کی ان کو دعوت دی گئی جس کے وہ مدعی تھے۔ رسول اللہ نے مسلسل ۲۳ سال تک ان پر محنت کی ان کو جگایا۔ ان کی

[1] افادات شیخ الاسلام

ہر مجلس اور بزم میں ان کے ایک ایک دروازے پر آپ نے دستک دی۔ ان کے ایک ایک شبہ اور اعتراض کا جواب دیا۔ ان کی تمام الزام تراشیوں تہمتوں اور عداوتوں کا مقابلہ کیا۔ ان کے مطالبہ پر معجزے بھی دکھائے اور ان کی امتحانی کسوٹیوں پر بھی اپنے کو کھرا اور سچا ثابت کر دکھایا ان کا حکم یہ ہے کہ ان سے اسلام اور صرف اسلام قبول کیا جائے نہ ان کو اسلامی مملکت کا شہری بنایا جائے اور نہ ان کو غلام بنایا جائے ان کے لیے صرف دو ہی راستے ہیں لا یقبل من مشرکی العرب الا الاسلام او السیف یعنی اسلام یا تلوار تیسرا راستہ ان کے لیے کوئی نہیں ہے۔

۲۔ اہل کتاب یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن حکیم میں آئے ہیں یا یوں کہو کہ جو لوگ اگرچہ قرآن کو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس جزیہ ادا کر کے اسلامی حکومتوں میں رہ سکتے ہیں ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہتی ہیں۔ انکو مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں انکی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور مسلمان کھا سکتے ہیں ان کا جائز کھانا کھا سکتے ہیں اور ہم اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

۴۔ شبہ اہل کتاب یعنی وہ لوگ جو قرآن اور تورات و انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب کے دعوے کے باوجود ستاروں کو پوجتے ہیں اور مجوس جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں۔ ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے ان ہی پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بدھوں وغیرہ کو بھی اسی صنف میں داخل کیا۔ مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ تمام حقوق حضور اقدس ﷺ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں۔ ان کی جان و مال آبرو اور ان کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

جزیہ کی قانونی تقسیم اور اس کا حکم

دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ آیت میں جو حکم بیان ہوا ہے وہ ان اہل کتاب کا ہے جنھوں نے مسلمانوں سے جنگ کی ہو اور شکست کھا کر اس کی طاعت پر مجبور ہوئے ہوں وہ اہل ذمہ اس سے بالکل الگ ہیں جن کو فقہائے نے معاہد یا اہل صلح سے تعبیر کیا ہے۔ معاہد اہل ذمہ سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے بغیر جنگ و قتال کے بطور خود اپنی مرضی سے اسلامی حکومت کا شہری بن کر رہنا پسند کیا ہو۔ ان لوگوں کے ساتھ حکومت اسلامی اس عہد نامے کے مطابق معاملہ کرے گی جو ان کے اور حکومت کے درمیان طے ہوا ہے۔ ان لوگوں سے جو بھی معاہدہ طے پا جائے بلا کسی معقول وجہ کے اس کو توڑنے کی اسلام میں سخت ممانعت

آئی ہے۔ اسی طرح جزیہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ جزیہ صلحی۔ جزیہ قہری، جو جزیہ بطور صلح مقرر ہوا ہو وہ جزیہ صلحی ہے اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے باہمی رضامندی سے جو بھی طے ہو جائے وہی لیا جاتا ہے۔ اس میں کمی بیشی اور تبدیلی روا نہیں ہے کیونکہ اس کو بدل ڈالنا عہد شکنی ہے اور اسلام میں عہد شکنی کی کسی حال میں اجازت نہیں ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ اگر اسلامی حکومت نے کسی آبادی سے کچھ بدل صلح لے کر مصالحت کی ہو مثلاً تین سال کے لیے معاہدہ ہوا ہے اور بدل صلح ان سے تین لاکھ روپیہ طے ہوا، اگر اسلامی حکومت عہد ختم کرنا چاہتی ہے اور مدت سے پہلے ختم کرنا چاہتی ہے مثلاً دو سال میں تو حکومت اسلامی عہد ختم کرنے کی دو شرطوں کے ساتھ مجاز ہے۔

اول یہ کہ عہد شکنی کی ان کو اطلاع کرے۔

دوسرے یہ اگر ایک سال میں معاہدہ ختم کیا ہے تو دو لاکھ روپیہ واپس کرنا ہوگا۔ قہری جزیہ وہ ہے جو کافروں کے میدان جنگ میں مغلوب ہو جانے کے بعد ان کو املاک پر قابض رکھنے کے بعد لیا جائے۔

غیر مسلموں سے جزیہ کیوں لیا جاتا ہے

تیسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ قرآن نے غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم کیوں دیا اس لیے کہ حق و انصاف کا تقاضا یہی تھا اور اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی مملکت میں غیر مسلموں پر اس قدر بوجھ نہ ڈالا جائے جتنا بوجھ مسلمانوں پر ڈالا جائے گا۔

اسلام نے مسلمانوں پر جنگی خدمت فرض کی تھی یعنی آج کل کی اصطلاح میں فوجی بھرتی جبری تھی اور اس لیے ضروری تھا کہ جو غیر مسلم اسلامی حکومت میں شہری زندگی بسر کریں وہ بھی ملک کی حفاظت کے لیے جنگ میں شریک ہوں لیکن اسلام نے اسے خلاف انصاف سمجھا کہ اس معاملے میں غیر مسلموں پر جبر کیا جائے۔ اس نے یہ بات ان کی مرضی پر چھوڑ دی کہ اور کہا کہ اگر خود اپنی خوشی سے چاہو تو جنگی خدمات میں مسلمانوں کی طرح شریک ہو۔ نہ شریک ہونا چاہو تو اس کے بدلے اپنی حفاظت کے لیے سالانہ رقم ادا کرو۔ اسی حفاظتی رقم کا نام جزیہ ہے۔

فی الواقع انسان کے عقائد و جذبات کی آزادی کا یہ ایسا اعتراف تھا جس کا اس زمانے میں کوئی دوسری قوم تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جنگ کے لیے نکلنا اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ لینا ہے اسلام مسلمانوں کو اس کے لیے مجبور کر سکتا ہے لیکن اسے کیا حق ہے کہ غیر مسلموں کو اس کے لیے مجبور کرے۔

صحابہ کرام کے زمانے میں غیر مسلموں کو سرکاری فرامین دیئے گئے ان میں صاف صاف اس کی تصریح ہے کہ جو فوج میں شریک ہوگا اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا جو نہ ہوگا اس سے جزیہ لیا جائے گا۔ الجصاص نے اس موقعہ پر یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔

قرآنی آیت کا مضمون کہہ رہا ہے کہ جزیہ صرف ان سے لیا جائے گا جن میں میدانِ جنگ میں جا کر جنگ کی صلاحیت ہے۔ کیونکہ جن میں مقاتلہ کی صلاحیت نہیں ہے وہ آیت قرآنی کے مخاطب نہیں مقاتلہ تو صرف جانبین میں ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے جزیہ صرف ان لوگوں سے لیا جائے گا جن میں لڑنے کی صلاحیت ہے۔

قرآن کے اسی اشارے سے سمجھ کر صحابہ نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

ہمارے ذمہ اس شرط پر تمہاری حفاظت ہے کہ تم کو بقدرِ استطاعت جزیہ دینا ہوگا اور اگر ہم تم سے مدد لیں گے تو اس کے بدلہ میں جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔[1]

آذربائیجان کی فتح میں یہ معاہدہ لکھا گیا۔

جو لوگ کسی سال فوج میں کام کریں گے تو اس سال کا جزیہ ان سے نہ لیا جائے گا۔[2]

یہ غیر مسلموں سے جزیہ لینے کی پہلی علت ہے۔

دوسری علت جزیہ لینے کی یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں پر کئی طرح کے ٹیکسوں کا بوجھ ڈالا ہے۔ زکوٰۃ ان کو ادا کرنی پڑتی ہے عام صدقات وخیرات میں ان کو حصہ لینا پڑتا ہے۔ جنگ آجائے تو اس کا بوجھ بھی ان کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ غیر مسلم شہریوں پر ایسا ہی بوجھ ڈالا جاتا۔ کیونکہ آزادی حقوق کے معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان تمام ٹیکسوں سے مستثنیٰ کر کے جو مسلمانوں پر عائد کیے تھے صرف جزیہ کی صورت میں ٹیکس ان پر رکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں پر بوجھ بھی نہ ہوا اور حقوق سب کے سب برابر رہے یعنی اگر ایک غیر مسلم فوجی خدمت سے انکار نہ کرے تو وہ اسلامی حکومت میں آزادی اور حقوق کی ویسی ہی زندگی بسر کرے گا جیسی ایک مسلمان بسر کر سکتا ہے لیکن مسلمان کی طرح اس پر سرکاری واجبات بالکل نہ ہونگے کیا اس کی کوئی مثال پوری دنیا کی تاریخ پیش کی جا سکتی ہے۔ کسی قوم کے حقوق صرف چار چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں جان مال آبرو مذہب۔ ان کے سوا جتنے حقوق ہیں وہ سب انہی کے تحت آتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام مفتوحہ قوموں کے ان تینوں بنیادی حقوق کو محفوظ قرار دیا بیت المقدس کے عیسائیوں کو از روئے معاہدہ جو حقوق دیئے وہ یہ تھے

یہ وہ امان ہے جو خدا کے بندے امیر المومنین عمرؓ نے اہل ایلیاء کو دی۔ یہ امان جان مال، گرجا صلیب تندرست بیمار اور ان کے تمام اہل مذاہب کے لیے ہے نہ ان کے گرجا میں سکونت اختیار کی جائے گی۔ نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ ان کے احاطہ کو نقصان پہنچایا جائے گا نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔[3]

یہ صرف ایلیا ہی تک محدود نہیں۔ جرجان، آذربائیجان اور موغان کے معاہدوں میں اسی قسم کی تصریحات پائی جاتی ہیں

[1] طبری تاریخ　[2] تاریخ طبری　[3] طبری حالات بیت المقدس

سب کا نقل کرنا یہاں دشوار ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ جزیہ بدل ہے غیر مسلموں کی جانوں، مالوں، آبرو اور ان کے مذہب کے امان اور تحفظ کا۔ ان کی طرف اب شہری زندگی میں کسی کو میلی نگاہ سے دیکھنے کی بھی اجازت نہ ہو گی نہ خود مسلمان ان کی جان مال آبرو اور دین سے تعرض کریں گے اور نہ کسی کو تعرض کرنے دیں گے۔ تاریخ کی گواہی ہے کہ یرموک کے معرکہ کے سلسلے میں مسلمان جب غیر مسلم شہریوں کی حفاظت سے معذور ہو گئے تو جزیہ کی کل وصول شدہ رقم واپس کر دی۔ حضرت ابو عبیدہ ؓ سپہ سالار افواج شام نے اور تمام اضلاع کے حکام کو لکھ کر بھیجا کہ جتنا جزیہ وصول ہو چکا ہے سب واپس کر دیا جائے [1]

جزیہ کن سے وصول کیا جائے

یہ تو آپ الجصاص کے حوالہ سے پڑھ چکے ہیں کہ جزیہ صرف مقاتلین سے وصول کیا جاتا ہے یعنی جن میں میدان جنگ میں جانے کی صلاحیت ہو ان کا تعلق خواہ کسی طبقے سے ہو اس کا مطلب ہے کہ اندھے سے کوڑھی سے مفلوج سے بوڑھے گرجوں میں رہنے والے پادریوں، سیاحت کرنے والوں سے عورتوں سے بچوں سے جزیہ نہ لیا جائے۔ الجصاص نے اس کی وجہ یہی بتائی ہے لیسوا من اھل القتال۔ علامہ موصلی نے لکھا ہے کہ:

بچوں پر عورتوں پر پاگلوں پر غلاموں پر بدل کتابت والوں پر اپاہجوں پر اندھوں پر، گنٹھیا کے بیماروں پر بڈھوں پر گوشہ نشین راہبوں پر نکمے فقیر پر کوئی جزیہ نہیں [2]

ان کی وجہ یہی بتائی ہے کہ یہ لوگ میدان جنگ کے ہیرو نہیں ہیں۔ اس لیے ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔

بلکہ ان معذورین کی خود اسلامی حکومت کفالت کرتی تھی۔ قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں حیرہ کے فتح کے معاہدہ میں رقم طراز ہیں:

اگر اسلامی مملکت کا کوئی بوڑھا شہری کام کرنے سے رہ جائے یا کوئی آفت آ جائے یا دولت مندی کے بعد غریب ہو جائے اور اس کے اہل مذہب اس کو خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ ختم کر دیا جائے گا اور اس کی اولاد کو سرکاری خزانہ سے خرچ دیا جائے گا۔

یہ معاہدہ حضرت ابوبکر ؓ کے زمانے میں ہوا تھا حضرت عمر ؓ کے زمانے میں بھی اسی پر عمل ہوتا رہا بلکہ آپ نے اس کو قرآنی استدلال سے اور زیادہ مؤکد بنا دیا۔ ایک بار ایک بوڑھے غیر مسلم شہری کو بھیک مانگتے دیکھا پوچھا بھیک کیوں مانگتے ہو اس نے کہا کہ مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے اور مجھ میں ادا کرنے کی قدرت نہیں ہے یہ سن کر آپ اسے اپنے

[1] کتاب الخراج

[2] الاختیار لتعلیل المختار

گھرے گئے اور کچھ نقد روپے دے کر داروغے سے کہلا بھیجا کہ اس قسم کے معذوروں کا سرکاری خزانہ سے وظیفہ مقرر کریں۔ قرآنی آیت انما الصدقات للفقراء کے فقراء میں اہل کتاب بھی داخل ہیں واللہ یہ انصاف نہیں کہ ان لوگوں کی جوانی کی توانائی سے ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں نکال دیں [1]

جزیہ کی تاریخ اور تقدیر

یہ سورۂ برات کی آیت ہے اور یہ سورت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ فتح مکہ کے بعد عرب جوق در جوق اور فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اور تقریباً عرب کے تمام قبائل میں اسلام کی نشر و اشاعت ہو گئی اب عربوں سے جنگ کی ضرورت باقی نہ رہی اسکے بعد پہلا حملہ تبوک پر ہوا اور وہیں اکیدر صاحب دومۃ الجندل نے جزیہ قبول کر لیا پھر اس کے بعد نجران کے عیسائیوں نے جزیہ دینا قبول کیا جزیہ کے بدلے ان سے عہد کیا گیا کہ ان کا کوئی گرجا گرایا نہ جائے گا اور ان کا کوئی پادری نکالا نہ جائے گا۔ اور نہ ان کو اپنا دین چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا تاوقتیکہ کوئی نئی بات نہ کریں اور سودی کاروبار نہ کریں۔

حضور اقدس ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جزیہ وصول کرنے کے لیے یمن روانہ کیا اور حکم دیا کہ ہر بالغ مرد سے ایک دینار نقد یا اس کی قیمت کا معافری کپڑا وصول کریں یہ یہودی تھے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ ہجر کے مجوسیوں سے حضور اقدس ﷺ نے جزیہ لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجوسیوں کے بارے میں متردد تھے مگر اس شہادت کے بعد انھوں نے مجوسیوں سے جزیہ قبول کیا۔

الغرض جزیہ کی ابتدا تبوک کے بعد ہوئی اور تین قوموں سے جزیہ خود حضور ﷺ نے قبول کیا۔

۱۔ نجران اور ایلہ کے لوگوں سے جو نصرانی تھے۔

۲۔ دومۃ الجندل سے جس میں اکثر یہودی تھے۔

۳۔ ہجر کے مجوس سے۔

اگرچہ کسی بت پرست سے حضور اقدس ﷺ کا جزیہ قبول کرنا ثابت نہیں ہے لیکن بت پرستی اور آتش پرستی میں کوئی فرق نہیں ہے صحیح یہ ہے کہ مجوس نہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں نہ کسی نبی کے پیرو ہیں۔ بعض روایات میں جو آیا ہے کہ ان کی آسمانی کتاب تھی وہ اٹھالی گئی اول یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ دوئم اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو یہ ان کے زیادہ مغضوب من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ بعض وجوہ سے مجوسیوں کی حالت زیادہ خراب ہے کیونکہ مجوسی ایک خالق کے بھی قائل نہیں وہ خالق خیر اور خالق شر علیحدہ علیحدہ مانتے ہیں بت پرست ایک خالق کے قائل ہیں۔ مجوسی محرمات ابدیہ یعنی اپنی بیٹی اور بہن سے نکاح درست کہتے

[1] کتاب الخراج

ہیں۔ بُت پرست ان لغویات کے قائل نہیں ہیں۔ جب ان خرابیوں کے باوجود مجوس سے جزیہ لے کر ان کو اپنے دین پر رہنے کی اجازت دی گئی ہے تو بُت پرستوں کو یہ اجازت کیوں حاصل نہ ہوگی بلکہ اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین سے بدرجہ اولیٰ جزیہ لیا جائے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ من الذین اوتوا الکتاب میں من بیانیہ ہے لہذا سارے اہل کتاب بیان کردہ صفات سے موصوف ہوں گے۔ اس سے مراد وضع جزیہ بھی ہوا اور معلوم ہے کہ یہ صفات مشرکین میں بدرجہ اولیٰ پائی جاتی ہیں یعنی اللہ پر ایمان نہ رکھنا۔ آخرت کو نہ ماننا۔ خدا اور رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہ کرنا۔ دین حق کی پیروی نہ کرنا۔ کیونکہ اہل کتاب توحید و معاد کا عقیدہ رکھتے ہیں گو اس میں غلطیاں کرتے ہیں اور مشرکین تو خود ان عقائد کے اصل ہی میں مخالف ہیں۔ جب مدار حکم مشرکین میں زیادہ طاقت ور ہے تو اصل حکم بھی ان کے لیے بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

باقی رہی یہ بات کہ حضور اقدس ﷺ نے بُت پرستوں سے جزیہ کیوں نہیں لیا اس کی وجہ شادی سے پہلے بتائی جا چکی ہے اور ویسے ہی ظاہر ہے کہ جزیہ کا جب حکم نازل ہوا اس سے پہلے تمام بت پرست قبائل میں اسلام پھیل چکا تھا اور اس کے بعد حضورؐ کو بُت پرست قبائل سے جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

آیت جزیہ سے قبل جن قبائل سے جنگ ہوئی ان پر نہ جزیہ لگایا گیا اور نہ لگایا جا سکتا تھا بت پرست ہوں یا اہل کتاب بنی قینقاع، بنی نضیر، بنی قریظہ، اہل خیبر سب اہل کتاب تھے مگر ان میں سے کسی سے حضورؐ نے جزیہ نہیں لیا۔ کیونکہ جس وقت ان سے مقابلہ تھا اس وقت جزیہ کا حکم بھی نہ تھا۔ قرآن کی یہ آیت نازل ہی نہ ہوئی تھی۔

حضور اقدس ﷺ نے اہل ہجر کو اور منذر بن ساوی کو اور دوسرے سربراہان مملکت کو خطوط روانہ کیے۔ ان میں بلاتفریق سب کو اسلام اور جزیہ کی دعوت دی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جب دشمن سے لڑو تو تین باتوں کی دعوت دو۔

۱۔ وہ اسلام قبول کریں۔

۲۔ جزیہ دینا منظور کریں۔

۳۔ میدان میں آکر مقابلہ کریں۔

اس میں کوئی تفریق بت پرست اور اہل کتاب کی نہیں ہے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کسریٰ کے عامل سے ملے تو فرمایا کہ ہمیں حکم ہے کہ ہم اس وقت تک تم سے جنگ کریں یا تو اسلام قبول کر لو۔ یا جزیہ دو۔

اسی لیے امام مالک، امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب اور بت پرست سب سے جزیہ قبول کرنا جائز ہے۔ لیکن صرف عرب کے بت پرستوں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

اولاً اس لیے کہ وہاں حضورؐ کی نبوت ظاہر ہوئی اس لیے وہاں بُت پرستی ہرگز نہ رہنی چاہیے۔

ثانیاً اس لیے کہ وہ تمام قبائل مسلمان ہو گئے تھے پھر بت پرستی اگر وجود پذیر ہو سکتی تھی تو صرف ارتداد سے اور مرتد کے لیے بالاتفاق جزیہ نہیں ہے۔

ثالثاً اس لیے کہ حضورؐ کی وصیت ہے کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔

حضور اقدس ﷺ نے نجران کے نصاریٰ سے جزیہ میں دو ہزار حلے لیے یمن کے یہود کے متعلق حضرت معاذ کو حکم دیا کہ ہر بالغ مرد سے ایک دینار لو اس سے معلوم ہوا کہ جزیہ کی کوئی خاص مقدار مقرر نہیں۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جزیہ کے تین درجے مقرر کیے۔

غریبوں سے	بارہ درم سالانہ
متوسط لوگوں سے	چوبیس درم سالانہ
سرمایہ داروں سے	اڑتالیس ۴۸ درم سالانہ

ایک درم صرف ساڑھے تین ماشہ کا ہوتا ہے۔ اگر چاندی کی قیمت پچاس روپے تولہ ہو تو ایک درم چار روپے ایک پیسہ کا تقریباً ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ بارہ درم سالانہ تقریباً ۵۰ روپے ہوئے اس لحاظ سے گویا

غریبوں سے	پچاس روپے سالانہ
متوسط سے	سو روپے سالانہ
سرمایہ داروں سے	دو سو روپیہ سالانہ

بنتے ہیں۔ اس کا مقابلہ ان ٹیکسوں سے کیجئے جو غیر اسلامی حکومتیں لیتی ہیں اوروں کا پتہ نہیں مگر مشہور عیسائی مورخ جرجی زیدان نے تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے جو بات لکھی ہے وہ سنانا چاہتا ہوں۔

مسلمانوں کو جزیہ کے نام سے جو رقم رومیوں اور ایرانیوں کو ادا کرنی پڑتی تھی ان ٹیکسوں کی مجموعی مقدار سے وہ بہت کم تھی جو یہی لوگ روم اور ایران کی حکومتوں کو دیتے تھے [۱]

شائد آپ پوچھیں کہ یہ جزیہ اسلامی حکومت غیر مسلموں سے وصول کرتی تھی اس کا مصرف کیا تھا؟۔ الماوردی نے اس کا جواب الاحکام السلطانیہ میں دیا ہے وہ سن لیجئے۔

ضروری تھا کہ جزیہ کی رقم ذمیوں کی فلاح و بہبود، تعلیم و ترقی اور ان کی دوسری ضروریات پر صرف کی جائے۔

حافظ ابن الہمام نے فتح القدیر میں اس کے اور مصارف بھی لکھے ہیں۔ آیئے اب آیت قرآنی کے اجزاء پر بھی غور فرمالیجئے اس آیت میں مسلمانوں کو اہل کتاب سے قتال کرنے کا حکم دیا ہے اور اہل کتاب کے ذکر سے ان کا چار سلبی اوصاف کے ذریعے

[۱] تاریخ التمدن الاسلامی

پھر وپیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ جن کا حال یہ ہے ان سے راستی صداقت اور پاس عہد کی کوئی اُمید نہیں ہو سکتی ہے ان سے جنگ کے سوا چارہ کار کوئی نہیں ہے۔

ان اہل کتاب کی سب سے پہلی صفت یہ بتائی ہے لا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر یعنی ان کا اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں ہے۔ زبان سے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ پر اور آخرت پر ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ وہ ایمان نہیں رکھتے ہیں شارحین قرآن یہاں ورطہ حیرت میں ہیں کہ دعوے کے باوجود ان سے ایمان کی کیوں نفی کی گئی۔ اگر یوں کہا جاتا کہ وہ اللہ کے رسول پر ایمان نہیں رکھتے تو بات کا ایک وزن ہوتا اور واقعہ کی تصویر ہوتی لیکن یہاں رسول کا کوئی ذکر نہیں ہے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان کا ذکر ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ یہودی ہو یا عیسائی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تعلق کی وجہ سے خدا کو بھی مانتے ہیں اور آخرت کو۔

اس کشمکش سے نکلنے کے لیے شارحین قرآن نے جو راہیں تلاش کی ہیں وہ گوش گذار فرمائیے۔ صحابہ اور تابعین سے اس بارے کوئی مثبت چیز منقول نہیں ہے چنانچہ حافظ ابن جریر نے اس جملہ کی تفسیر کے بارے میں متقدمین شارحین سے کوئی بات نقل نہیں کی ہے۔ اس کی تشریح میں جو کچھ کہا ہے متاخرین کا سرمایہ ہے۔

حافظ ابن کثیر رح فرماتے ہیں۔

> چونکہ واقع میں یہود و نصاریٰ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے اس لیے کسی نبی پر بھی ان کا ایمان صحیح نہیں ہے۔ وہ صرف ایسے خیالات و آراء کے پیروکار ہیں۔

امام رازی فرماتے ہیں لا یومنون اس لیے فرمایا کہ:

> یہ لوگ دعوےٰ کرتے تھے ایمان باللہ کا مگر واقعہ یہ ہے کہ اکثر یہود مشبہ تھے اور آخرت کے بارے میں یہود و نصاریٰ دونوں بعث جسمانی کے منکر تھے۔

علامہ ابوالسعود نے یہ بتایا ہے۔

> یہودی مشبہ اور عیسائی مثلثہ ہیں اللہ پر ان کا ایمان نہیں ہے آخرت کے موضوع پر ان کا علم نہ ہونے کے برابر ہے ایسے علم پر مبنی ایمان ایمان نہیں ہے۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں۔

> ان کے ادعائی ایمان کو ایمان نہ ہونے کے برابر کر دیا ہے۔

علامہ زمخشری رقمطراز ہیں۔

> ان سے ایمان کی نفی اس لیے کی ہے کہ یہودی مشبہ اور عیسائی مثلثہ ہیں۔ اور ایمان آخرت پر وہ نہیں جو ضروری ہے۔

یہ اور اسی طرح کے خیالات اکثر شارحین قرآن نے پیش کیے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس آیت میں مطلق ایمان کی نفی نہیں ایمان کے تو مدعی تھے مگر ایمان کے ساتھ ایمان کے لوازم سے ان کی زندگیاں۔ ان کے اعمال۔ ان کے اخلاق یکسر خالی تھے اس لیے یہاں اس ایمان کی نفی کی گئی ہے جو زندگی میں تقاضوں سے لوازم اور ثمرات سے بالکل بیگانہ تھا۔ یہاں ایمان کی نفی ایسی ہی کی گئی ہے جس طرح ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھم بمومنین میں نفی کی گئی ہے ایمان ملزوم اور اعمال صالحہ اس کے لوازم ہیں ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم وملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے۔ جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا اسی طرح عمل کے بغیر ایمان بے برگ و بار درخت ہے جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم ووجود برابر ہے اس بنا پر جہاں ایمان ہے اس کے عملی نتائج وآثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخل ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے اب اگر ایسا شخص تم کو نظر آتا ہے جو زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس کے مطابق کوئی تبدیلی نہ ہو تو یہ نفاق عملی کے سوا کچھ ہو ایمان کا جھوٹا مدعی ہے قرآن کا اس پر ماھم بمومنین کا فتویٰ ہے۔ یہی بات قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں کہی ہے اور آگے دعوے ایمان کے کھوکھلا ہونے کی ان کی عملی زندگی میں نشاندہی کی ہے۔ ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ یعنی اللہ اور اس کے رسول نے جن چیزوں کو ان پر حرام کیا تھا وہ اب ان کے لیے حرام نہیں ہیں۔ اول تو ہوائے نفس سے قسم قسم کے حیلے نکال کر حرام چیزوں کو حلال بنانے میں لگ گئے۔ نتیجہ یہ کہ جس دین کا حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام نے تعلیم دی تھی ان کی زندگی اس سے یکسر خالی ہو گئی۔ اگر رسول سے حضرت موسیٰ اور عیسیٰ مراد ہوں تو ضمناً یہ بھی اشارا کر دیا ہے کہ ان یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی تحریفات کے ذریعہ اپنے رسولوں کے دین کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے

ولا یدینون دین الحق وہ دین حق کے پیروکار نہیں ہیں۔ یا تو مطلب ہے کہ وہ اسلام کو نہیں اپناتے ہیں اور یا یہ مطلب ہے کہ وہ دین حق سے روگرداں ہیں یعنی جن انبیاء کے ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں جو دین حق وہ لے کر آئے اس کی پیروی نہیں کرتے ہیں۔ دین سے یدینون آیا ہے اس کے معنے اطاعت کے ہیں۔ حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔ یہاں تک کہ دیں جزیہ ہاتھ سے محکومانہ حیثیت سے۔ ید کے معنی ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

ایک معنے تابعداری کے ہیں عربی میں بولتے ہیں ھذہ یدی لک۔ میں آپ کا تابعدار ہوں۔ مطلب ہے کہ جزیہ کی ادائیگی تابعدار ہو کر کریں۔ دوسرے معنے نقد کے ہیں ید ابید۔ اسی معنے میں آتا ہے مطلب ہے کہ جزیہ نقد ادا کریں عن ید کے معنے ابو عبید نے اعجاز القرآن میں خوشی کے بھی لکھے ہیں طیبۃ نفس یعنی جزیہ بخوشی ادا کریں۔

صاغرون میں صغار کے معنے ذلت کے ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں میں نے متعدد اہل علم سے سنا ہے کہ ھم صاغرون کا مطلب ہے کہ ان پر اسلامی حکومت کے قوانین جاری ہو جائیں یعنی وہ اسلامی مملکت کے شہری ہوں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے

کہاکہ اس سے لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ جزیہ ذلت اور بے عزتی کے ساتھ لینا چاہیے۔ جزیہ لینے والا بیٹھا رہے دینے والا سرجھکا کر کھڑا ہو۔ کمر بھی اکڑی نہ ہو۔ لینے والا اس کی داڑھی پکڑے۔

لیکن امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی پرزور تردید کی ہے اور اس پر سیئۃ قبیحۃ بدترین برائی کا تمغہ لگایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اسلام کی سماحت اور اس کی جانی بوجھی نرمی کے خلاف ہے۔ اگر مجھے تردید کرنی نہ ہوتی تو میں اس کے ذکر سے بھی اپنے قلم اور کتاب کو آلودہ نہ کرتا۔

حافظ ابن القیم نے بھی اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے۔

اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ آیت قرآنی کا یہ مدعا ہے نہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے ایسا منقول ہے۔ آیت کا واضح مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جزیہ ان کو دے کر محض اسلامی قوانین کا محکوم ہو کر رہے جو اسلامی قوانین کے تحت شہری زندگی گذارنے کا نام ہے اور یہی صغار ہے۔

اصل بات تو صرف اس قدر ہے کہ اسلامی حکومت میں ہر مسلمان مرد پر فوجی خدمت لازم ہے۔ بوقت ضرورت سارے مسلمان شہری فوج بن سکتے ہیں غیر مسلم شہریوں کے لیے یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ فوجی خدمت سے ایک قلیل رقم کے بدلے میں مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جزیہ کفر یا کسی اعتقادی گمراہی کا معاوضہ نہیں بلکہ فوجی خدمات کا معاوضہ ہے۔ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے وجب نصرۃ للمقاتلۃ۔ دفاع میں امداد کے لیے جزیہ واجب ہوا ہے۔ شیخ ابن الہمام لکھتے ہیں اور پوری صراحت سے لکھتے ہیں کہ حکومت میں جو گروہ دفاع کی خدمت انجام دے رہا ہے اس کی امداد کے لیے جزیہ ہے کیونکہ مملکت کے ہر شہری پر مملکت کے دفاع میں مدد کرنا ضروری ہے اور غیر مسلم شہری چونکہ یہ خدمت انجام نہیں دیتے ہیں اس لیے اس کے قائمقام جزیہ ہے ـــــ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جو غیر مسلم شہری جنگ میں حصہ لیتے ہیں ان پر کوئی جزیہ نہیں ہے۔ اور جزیہ دینے کے بعد ان کی حیثیت بالکل مسلمان شہریوں کی ہوتی ہے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے لھم ما للمسلمین وعلیھم ما علی المسلمین۔ ان کے شہری زندگی میں وہ سارے حقوق ہوں گے جو اسلامی مملکت کے مسلمان شہریوں کے ہوں گے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ
ابْنُ اللّٰهِ ۖ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ
الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ ﴿۳۰﴾
اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ
وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلٰهًا
وَاحِدًا ۖ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۳۱﴾
يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا
أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُونَ ﴿۳۲﴾ هُوَ الَّذِي
أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى
الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿۳۳﴾

اور یہودیوں نے کہا کہ عُزیر اللہ کا بیٹا ہے[۲۸]۔ اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ ہے ان کا کہنا اپنے منہ سے۔ یہ لوگ اپنی بات میں پہلے کافروں کی بات کی مشابہت رکھتے ہیں[۲۹]۔ اللہ ان کو ہلاک کرے کدھر پلٹے جارہے ہیں[۳۰]۔ انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کو چھوڑ کر رب بنالیا اور مسیح ابن مریم کو حالانکہ ان کو صرف ایک معبود کی بندگی کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے اس کی ذات ان کی شرک سازیوں سے پاک ہے[۳۱]۔ یہ لوگ

چاہتے ہیں کہ اپنے پھونکوں سے اللہ کی روشنی کو بجھا دیں حالانکہ اللہ نہ رہے گا بغیر اپنی روشنی کو پورا کیے بغیر چاہے کافروں کو برا نہیں ۳۲۔ اسی نے تو اپنے رسول کو الہدی اور دین الحق دے کر روانہ کیا ہے تاکہ اس کا بول بالا ہو ہر دین پر اگرچہ مشرکوں کو ناگوار ہو ۳۳

معانی مفردات

یوفکون افك سے مضارع مجہول ہے پھیر دینا۔ قاموس میں ہے کہ افک ضرب اور سمع دونوں سے آتا ہے۔ اور مصدر افک الف کے کسرہ کے ساتھ اور فتحہ کے ساتھ جھوٹ بولنے کے معنے میں آتا ہے اور افک عنہ کے معنے پھیرنے بدلنے رائے بدلنے اور مراد سے محروم کرنے کے ہوتے ہیں۔ امام راغب کہتے ہیں افك کا استعمال ہر اس چیز کے لیے ہوتا ہے جو اپنے اصل رخ سے پھیر دی گئی ہو۔ اسی بنا پر ان ہواؤں کو جو اپنے چلنے کا اصلی رخ چھوڑ دیں۔ مُؤتَفِكَات کہا جاتا ہے اور اعتقاد سے باطل کی طرف اور سچائی سے جھوٹ کی طرف اور اچھے سے برے اعمال کی طرف پلٹنے کے لیے انی یوفکون بولا گیا ہے۔

الٰہ بروزن فعال ہے بمعنے اسم مفعول مالوہ جس کی عبادت کی جائے ہر قوم کے نزدیک جس کی بندگی یا پرستش کی جائے وہ الٰہ ہے چاہے معبود برحق ہو یا معبود باطل۔ اس کی جمع آلہتہ آتی ہے جیسے امام کی جمع ائمہ آتی ہے۔

سبحانہ۔ علامہ سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں کہ سبحان مصدر ہے پاکی بیان کرنا۔ اس کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں منصوب ہونا اور مفرد کی طرف مضاف ہونا مضاف الیہ چاہے اسم ظاہر ہو یا اسم ضمیر۔ جیسے سبحان اللہ اور سبحانہ علامہ مجد الدین فیروزآبادی نے سبحان کو معرفہ لکھا ہے۔ یعنی تسبیح کا علم جنس ہے۔ یہی مختار جمہور ہے قاضی بیضاوی۔ علامہ زمخشری اور بہت سے علماء یہی کہتے ہیں۔ اس کے معنے ہیں اللہ کی ذات ہر برائی سے پاک ہے۔ شاہ ولی اللہ معرفت کا ایمان کی حد تک ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ کی معرفت ایمان میں صرف تسبیح اور تحمید کی حد تک مطلوب ہے۔ تسبیح یہ کہ اللہ کی ذات تمام عیبوں تمام کوتاہیوں سب برائیوں سے پاک ہے۔ تحمید یہ کہ اللہ کی ذات میں ساری بزرگیاں اور سارے کمالات ہیں۔

یہودیوں کے ایمان کا کھوکھلا پن

ان آیات میں یہودیوں اور عیسائیوں کے دعوٰی ایمان کے کھوکھلا پن کو واضح کیا جا رہا ہے۔ پہلے بتایا تھا کہ وہ ایمان کے

مدعی ہونے کے باوجود ایماندار نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کی عملی اور فکری زندگی میں ایمان کے لوازم اور تقاضوں کے خلاف شہادتیں موجود ہیں۔

پہلی شہادت۔ لا یحرمون ما حرم اللہ و رسولہ

دوسری شہادت۔ ولا یدینون دین الحق

تیسری شہادت۔ وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصاریٰ الخ

چوتھی شہادت۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم

پانچویں شہادت۔ یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم

ان پانچوں شہادتوں کے بعد آخری اور فیصلہ کن بات ارشاد ہوئی ھو الذی یہ پانچوں شہادتیں اس بات کے ثبوت کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ یہ لوگ ایمان باللہ کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ خدا کی ہستی کو چاہے یہ مانتے ہوں لیکن ان کے خدا کو ماننے کے ساتھ ناخدا شناسی بلکہ خدا کی کھلم کھلا بغاوت تبا رہی ہے کہ ان کا خدا کو ماننا نہ ماننے کے برابر ہو گیا ہے۔ ایمان کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ کی شرائط کے تحت ہو لیکن ان کا ایمان اپنی خواہشوں اور بدعات کے تحت تھا۔ اللہ ورسول کی حرام کردہ چیزوں کو جائز بنا کر شریعت وقانون کو کالعدم کر دیا اور زندگی میں نظامِ حق سے بیزاری کا مظاہرہ کیا۔ مشرکانہ عقائد ایجاد کر کے انھوں نے خدا کی توحید کی نفی کر دی۔ زندگی میں تحلیل وتحریم کا حق اپنے عالموں اور مشائخ کو دے کر ان کو رب بنا لیا۔ اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اللہ سبحانہ نے ان کو ان گمراہیوں سے نکالنے کے لیے دینِ حق کی روشنی روانہ کی ہے لیکن یہ اس کی پیروی تو درکنار اس روشنی کو ہر وقت بجھانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں کیا ایسے لوگ ایمان رکھتے ہیں۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

حضرت عزیر کی ابنیت کا دعویٰ

(۲۸) اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کچھ یہود کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں لیکن یہ عقیدہ عام یہود کا نہ تھا اور زمانہ مابعد میں تو بعض علماء نے لکھا ہے کہ اب کوئی یہودی اس عقیدے کا باقی نہیں رہا۔ اگر عہد نبوی میں یہود کا کوئی فرقہ اس کا قائل نہ ہوتا تو ضرور تھا کہ اس وقت یہود قرآن کے بیان کی تغلیط کرتے جیسا کہ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا کی آیت سن کر عدی بن حاتم نے اعتراض کیا تھا۔ کہ احبار ورہبان کو رب تو کوئی نہیں مانتا۔ اس کا جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا جو آگے آرہا ہے لہٰذا ابنیت عزیر کے عقیدے کی ان کی طرف نسبت کرنا اور ان کی جانب سے اعتراض وانکار منقول نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ ضرور اس وقت اس خیال کے لوگ موجود تھے ان جیسے وقت گزر جانے سے بہت سے مذاہب اور فرقے مٹ گئے وہ بھی نابود ہو گیا ہو تو کوئی مستبعد نہیں

ہے باقی ہم سے ایک ثقہ بزرگ امیر شاہ خان صاحب مرحوم نے بیان کیا کہ سیاحت فلسطین کے دوران مجھے بعض یہودی ایسے خیال کے ملے جن کو اسی عقیدے کی نسبت سے عزیری کہا جاتا۔ واللہ اعلم۔[1]

آئیے پہلے اسی موضوع پر دوسرے شارحین قرآن کے تبصرے بھی پڑھ لیجیے۔

عزیر کا نام تورات میں عزرا ہے۔ ان کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ ہے۔ بخت نصر کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر جو تباہی آئی۔ اس میں تورات کے صحیفے بھی بالکل ناپید ہو گئے۔ کہا جاتا ہے یہی عزرا ہیں جنھوں نے اپنی یادداشت سے از سر نو تورات کو مرتب کیا۔ عجب نہیں کہ ان کے اسی کارنامے کی بنا پر یہود نے ان کو ابن اللہ بنا دیا ہو تاکہ اس دعوٰی سے ان کی مرتب کی ہوئی تورات کو درجہ استناد حاصل ہو سکے۔[2]

عزیر سے مراد عزرا ہیں جن کو یہودی اپنے دین کا مجدد مانتے ہیں ان کا زمانہ ۴۵۰ قبل مسیح ہے۔ اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جو دور ابتلا بنی اسرائیل پر آیا۔ اس میں نہ صرف یہ کہ تورات دنیا سے گم ہو گئی تھی بلکہ بابل کی اسیری نے اسرائیلی نسلوں کو اپنی شریعت اپنی روایات اور اپنی قومی زبان عبرانی تک سے نا آشنا کر دیا تھا آخر کار عزیر یا عزرا نے بائبل کے پرانے عہدنامے کو مرتب کیا اور شریعت کی تجدید کی۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل ان کی بہت تعظیم کرتے ہیں اور یہ تعظیم اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ بعض یہودی گروہوں نے ان کو ابن اللہ تک بنا دیا۔[3]

یہاں یہودیوں کا یہ قول جو نقل کیا ہے کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں تو اس سے مقصود یہودیوں کا عام اعتقاد نہیں ہے بلکہ صرف ان یہودیوں کا اعتقاد ہے جو یثرب میں آباد تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سلام بن شکم، نعمان ابن ابی اوفی، ابوانس، شاش بن قیس اور مالک بن صیف کہ رؤسا یہود میں سے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کی کس طرح پیروی کر سکتے ہیں جب کہ آپ نے ہمارا قبلہ ترک کر دیا اور عزیر کو ابن اللہ نہیں مانتے۔ ابن جریر

عزیر سے عزرا مراد ہیں بخت نصر کے حملہ بیت المقدس میں تورات کے تمام نسخے جل گئے تھے اس لیے جب یہودی قید بابل سے چھوٹ کر آئے تو ان کے پاس تورات کا کوئی نسخہ نہ تھا اور ان کی نئی نسل عبرانی سے نا آشنا ہو گئی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت عزرا نے کلدانی حروف میں اور ایسی عبرانی میں جو کلدانی زبان میں مخلوط تھی از سر نو تورات کے صحائف لکھے اور یہی نسخہ اصلی نسخہ کا بدل سمجھا گیا۔ چونکہ حضرت عزرا نے از سر نو شریعت مرتب کی۔ اور قید بابل کے بعد نئے دور کے بانی ہوئے اس لیے یہودیوں میں ان کی شخصیت بہت ہی مقدس مانی گئی ہے حتی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم مرتبہ اور شریعت کا دوسرا بانی کہا گیا۔ چنانچہ آج تک یہودیوں کا عام اعتقاد یہ ہے کہ اگر اس عہد میں لوگوں سے قصور نہ ہوا ہوتا تو عزرا بھی وہ سارے معجزے دکھا دیتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دکھائے تھے۔[4]

---

[1] افادات شیخ الاسلام
[2] تدبر قرآن
[3] تفہیم
[4] ترجمان القرآن

عزیر یہود کے مذہبی نوشتوں میں کاتب کی حیثیت سے مشہور ہیں تورات کی گمشدگی کے بعد انہی عزیر نے توریت از سر نو اپنی یادداشت سے لکھ دیا۔ اور اس لیے یہود ان کو مثیل الٰہی سمجھتے ہیں بلکہ بعض نے غلو کر کے اس مرتبے سے بھی بڑھا دیا۔ ابن اللہ۔ عربی میں ابن اور ولد دو الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ ابن اللہ سے مراد صلبی یا حقیقی فرزند نہیں بلکہ خدا کا لاڈلا یا چہیتا فرزند معنوی مجازی ہے۔ یہود اسی معنے میں حضرت عزیر علیہ السلام کو اپنا مطاع کل اور بارگاہ حق میں محبوب مطلق مانتے تھے[1]

مولانا سید سلیمان ندوی ارض القرآن میں لکھتے ہیں۔

عزیر سے مراد عزرا کاہن ہیں۔ جنھوں نے تورات کو اپنے اعجاز سے دوبارہ زندہ کیا۔ معترضین اسلام کا بیان ہے کہ یہودیوں میں عزیر کی ابنیت کا کوئی عقیدہ نہیں ہے اس لیے قرآن کا یہ دعویٰ سراسر خلاف واقع ہے اس اعتراض کا سرسری جواب تو جیسا قاضی بیضاوی نے لکھا ہے یہ ہے کہ قرآن نے اپنی آواز مدینہ میں یہودیوں کے مجمع کے اندر بلند کی اور کہیں سے اس کی تکذیب اور خلاف واقعیت کی آواز نہ اٹھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہودیوں میں یہ اعتقاد موجود تھا۔ ابن جریر طبری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ سے روایت کی ہے کہ مدینہ میں اس اعتقاد کے لوگ موجود تھے ابن حزم نے ملل میں لکھا ہے کہ یہودیوں کا صدوقی فرقہ جو یمن میں تھا اس کا یہی عقیدہ تھا ——

میرے نزدیک اصل یہ ہے کہ یہودیوں میں ابنیت کا تخیل نہایت قدیم ہے۔ تکوین کے چھٹے باب میں ہے۔

خدا کے بیٹوں نے دیکھا کہ انسان کی بیٹیاں خوبصورت ہیں۔

ابن اللہ کے معنے عبرانیوں کے محاورے میں خدا کے محبوب اور پیارے کے تھے اسی لیے مسلمانوں کے مقابلے میں عرب کے عیسائیوں اور یہودیوں کا دعویٰ تھا نحن ابناء اللہ واحباءہ۔ ایسی حالت میں یہود عرب اگر عیسائیوں کے مقابلے میں ان کا غرور توڑنے کے لیے حضرت عزیر کو حضرت عیسٰی کا مماثل اور ہمسر قرار دیتے ہوں تو کیا عجب ہے قرآن نے بھی اسی موقعہ پر یہودیوں کے اس قول کو نقل کیا ہے[2]

یہ متاخرین شارحین قرآن کی پیش کردہ تشریحات ہیں۔ لیکن یہ سوال ابھی تشنہ جواب ہے کہ عزیر کون ہیں۔ ان کا تورات سے کیا تعلق ہے اگر تورات موجودہ ان کی ساختہ و پرداختہ ہے تو اس کی روایتی اور تاریخی حیثیت کیا ہے۔ شارحین قرآن میں سے صرف علامہ رشید رضا نے اس پر کچھ اچھی باتیں پیش کی ہیں۔ ہم یہاں ناظرین معالم کی ضیافت طبع کے لیے اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

عزیر کی شخصیت

یہ تو آپ سن چکے ہیں کہ تورات میں جو عزرا ہے اسی کو عرب یہودیوں نے پیار و محبت کی خاطر تصغیر کر کے عزیر بولا ہے

---

[1] دریابادی

[2] ارض القرآن

اسماء میں اس قسم کی تبدیلی صرف عربی میں نہیں سب زبانوں میں ہوتی ہیں۔ اہل عرب نے یسوع کو عیسیٰ بنایا ہے۔ عزرا عبرانی ہو یا عزیر ہوں عربی کے یہ ان کا نام ہے تورات میں جو صحیفہ عزرا کے نام سے ہے اس میں ان کا نسب نامہ یہ دیا ہے۔

عزرا ابن سرایا ابن عزریا ابن ملقیا اور اس کو حضرت ہارون علیہ السلام کے صاحبزادے عاذر تک بتایا ہے[1]

یہودی دائرۃ المعارف میں ہے کہ:

عزرا کا زمانہ یہودی تاریخ کا موسم بہار ہے۔ یہی شریعت موسیٰ کے ناشر ہیں۔ تورات طاق نسیان ہو چکی تھی لیکن عزرا نے اس کو دوبارہ زندگی کا لبادہ پہنایا ہے اگر ان کا زمانہ بنی اسرائیل کے گناہوں کا نہ ہوتا تو یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح کے معجزات دکھاتے۔

اور اسی میں یہ بھی ہے کہ:

انھوں نے شریعت کو آسوری حروف میں قلم بند کیا مشکوک مقامات پر نشان لگا دیئے۔ تاریخ یہود کا آغاز ان کے زمانہ سے ہے۔

ڈاکٹر جارج پوسٹ قاموس کتاب مقدس میں لکھتے ہیں کہ:

عزرا ایک یہودی کاہن اور مشہور کاتب ہے۔ بابل میں ان کی رہائش ارتخشتا بادشاہ میں رہی ہے اسی بادشاہ کے ساتویں سال میں عزرا یہودیوں کی ایک وافر تعداد لے کر مسجد اقصیٰ گئے یہ ۴۵۷ء قبل مسیح ہے سفر کی مدت چار ماہ ہے۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ:

یہودیوں کے یہاں ان کی شخصیت بڑی عظیم ہے کہ ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم پلہ بتایا جاتا ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ انھوں نے کتاب مقدس کے صحیفوں کو جمع کیا ہے اور عبرانی قدیم حروف کی جگہ کلدانی حروف استعمال کیے ہیں۔

تورات کی تاریخی و روایتی حیثیت

باقی رہا یہ سوال کہ جس تورات کو حضرت عزیر دوبارہ منصۂ شہود پر لائے اس کی روائتی اور تاریخی حیثیت کیا ہے اس کا جواب حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی مشہور کتاب اظہار الحق میں دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

[1] حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں جو نسب نامہ دیا ہے وہ یہ ہے عزیر ابن جردہ بن عدیا ابن ارب ابن وروزنا ابن عدی ابن تقی ابن السبوع بن فنحاص ابن العاذر ابن ہارون ابن عمران۔

تمام اہلِ کتاب کا دعویٰ ہے کہ کتاب تاریخ اوّل و ثانی کو عزرا پیغمبر نے بھی اور زکریا پیغمبروں کی اعانت سے تصنیف کیا ہے تو گویا ان دونوں کتابوں پر تینوں پیغمبر متفق ہیں —— دوسری جانب تاریخی کتب اس کی شہادت دے رہی ہیں کہ عہدِ عتیق کی کتابوں کا حال بخت نصر کے حادثہ سے پہلے ہی بدتر تھا۔ اور اس حادثہ کے بعد توان کا نام ہی نام رہ گیا تھا۔ اور اگر عزرا دوبارہ ان کتابوں کو تدوین نہ کرتے تو ان کے زمانے میں یہ کتابیں موجود نہ ہوتیں اور دوسرے زمانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے —— اور یہ کتاب اہلِ کتاب کی اس کتاب میں تسلیم کی گئی ہے جو حضرت عزرا کی طرف منسوب ہے۔ اگرچہ فرقہ پروٹسٹنٹ اس کو آسمانی کتاب نہیں مانتا مگر اس اعتقاد کے باوجود اس کا رتبہ ان کے نزدیک مورخین کی کتابوں سے بہرحال کم نہیں اس کے الفاظ یہ ہیں۔

توریت جلادی گئی تھی اور کوئی شخص بھی اس کا علم نہیں رکھتا تھا اور کہا گیا ہے کہ عزرا نے روح القدس کی مدد سے اس کو دوبارہ جمع کیا۔

اور کلمنس اسکندر یانوس کہتا ہے کہ،

آسمانی کتابیں سب ضائع ہوگئیں تھیں۔ پھر عزرا کو الہام ہوا کہ ان کو دوبارہ لکھے۔

ٹرٹولیں کہتا ہے۔

مشہور یہی ہے کہ عزرا نے بابل والوں کی یروشلم پر غارت گری کے بعد تمام کتابیں لکھیں۔

تھیوفلکٹ کہتا ہے۔

کتب مقدسہ بالکل ناپید ہوچکی تھیں۔ عزرا نے الہام کے ذریعے ان کو دوبارہ جنم دیا۔

جان ملز کیتھولک اپنی کتاب مطبوعہ ڈربی ۱۸۴۳ء کے صفحہ ۱۵ میں لکھتا ہے۔

اہلِ علم اس پر متفق ہیں کہ اصل توریت کا نسخہ اور اسی طرح عہدِ عتیق کی کتابوں کے اصل نسخے بخت نصر کے فوجیوں کے ہاتھوں ضائع ہوگئے اور جب ان کی صحیح نقلیں عزرا پیغمبر کے ذریعے شائع ہوئیں وہ بھی تیوکس کے حادثے میں ضائع ہوگئیں۔

ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ دنیائے اہلِ کتاب اپنے مذہب کے استناد میں عزیر کی مقروض ہے۔ اور اس استناد کی تاریخی حیثیت جو کچھ اور جیسی کچھ ہے وہ سب کی جانی بوجھی ہے کہ عزرا کی کتابت کا افسانہ راویوں نے گھڑا ہوا ہے۔

بہرحال یہودی حضرت عزیر کی پاکی اور ان کی عظمت کے بے حد معتقد تھے تا آنکہ کچھ نے ان کو ابن اللہ بھی کہا ہے۔ لیکن یہ بات ابھی علمی طور پر ثابت نہیں ہے کہ یہودیوں نے یہ تعظیماً و احتراماً کہا تھا یا عیسائیوں کی اصطلاح میں کہا تھا لیکن

مفسرین قرآن اس پر متفق ہیں کہ یہ سب کی بات نہ تھی بلکہ کچھ کا خیال تھا۔ اور بات وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمائی ہے۔

سابقہ اہلِ کفر کی مشابہت

(۲۹) اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ہے ان کا کہنا اپنے منہ سے۔ یہ لوگ اپنی بات میں پہلے کافروں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں یعنی ابنیت اور الوہیت مسیح کا عقیدہ پرانے مشرکین کے عقیدے کے مشابہ ہے بلکہ ان کی ہی تقلید میں یہ اختیار کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ مائدہ کے فوائد میں ہم نقل کر چکے ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ اس مہمل عقیدے پر ان کے پاس نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی۔ یہ تو محض ان جاہل قوموں کی تقلید ہے جو حق سبحانہ کی تجسیم کو مانتی تھیں اور عقیدہ حلول یا اوتار کی قائل تھیں اشارہ مشرکین یونان کی جانب ہے کہ ان ہی کے فلاسفہ کے اقوال کی روشنی سے پہلی صدی عیسوی کے یہود و نصاریٰ دونوں ہی متاثر ہو گئے تھے اور ان کی مشرکانہ تعلیمات کو اپنے مذہب کا جز منانے لگے۔ مسیحیت پر یونانی اور رومی مذہبوں کی چھاپ کی دریافت انیسوی صدی کے محققین و فضلاء کا خاص کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ابنیت، حلول اور تثلیث کا عقیدہ مشرق و مغرب کے بت پرستوں میں موجود تھا خواہ یہ ہندوستان کے برہمہ یا بدھ ہوں یا چین و جاپان، ایران، مصر، یونان اور روم سے تعلق رکھتے ہوں۔

یہاں یہ بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے کہ پورے قرآن میں کہیں یہ بات نہیں بتائی ہے کہ یہود کہتے ہیں اتخذ اللہ ولداً۔ لیکن عیسائیوں کے ذکر میں یہ بات بار بار قرآن و سنت میں دہرائی گئی ہے۔ ابن اور ولد میں بھی فرق ہے ولد از صلبی اولاد ہی کو کہتے ہیں ابن کے اگرچہ حقیقی معنے بھی ہیں لیکن مجازاً محبوب کے معنے بھی دیتا ہے۔ جو تعظیماً مخلوق کو ابن کہتے ہیں وہ لازماً اللہ سبحانہ کو اب کہتے ہیں۔ مگر قرآن اللہ سبحانہ کے لیے اب کی جگہ رب کا لفظ لاتا ہے۔ اب اور رب ان دونوں کا معنوی تقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل قرآن کے سطح نظر سے کس درجہ پست ہے اب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص نقطہ میں قائم ہوتا ہے اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتی ہے اس طرح گویا باپ کو بیٹے کے وجود سے یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص محدود اور آنی ہوتا ہے۔ بیٹے کے وجود قیام بقاء ضروریات زندگی، سامان حیات، نشوونما اور ارتقاء کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اپنے باپ سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے مگر ذرا غور کرو کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو رابطہ و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک لمحہ کے لیے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے۔ کیا یہ تعلق باپ بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہوتا ہے۔ ربوبیت عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے وہ گہوارہ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا۔ قطرہ آب ہو یا قطرہ خون مضغہ گوشت ہو یا مشت استخوان۔ شکم مادر میں ہو یا اس سے باہر بچہ ہو، جوان ہو ادھیڑ ہو یا بوڑھا کوئی آن کوئی لمحہ رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے تعلق سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے لفظ رب یک قلم پاک ہے اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں ہے جن میں عیسائیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

یہ جو فرمایا ذالك قولهم بافواههم۔ یہ ان کی بات منہ کی ہے اس کے معنے بے سروپا بات کہنے کے ہیں۔ نظریہ ابنیت کی تردید میں اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ ایک ایسی پادر ہوا بات ہے جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے اور انسانیت کی ساری تاریخ میں جو کبھی سوچی نہیں گئی تھی۔ اسی کو مان کر الہیات کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا۔

حضرت مولانا مناظر حسن گیلانی نے اس موقعہ پر کیا اچھی بات فرمائی ہے۔

یقیناً حق تعالیٰ کے متعلق جتنی غلط سے غلط مہمل سے مہمل باتیں اب تک کہی گئی ہیں ان میں سب سے بری بات وہ ہے ان میں سب سے مہمل بات وہ ہے جو نظریہ ابنیت کے ماننے والوں کے منہ سے نکل رہی ہے جس کا حقیقت سے ذرہ برابر بھی لگاؤ نہیں ہے۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی قسم کی علمی تائید اسے حاصل نہیں ہے۔ علم و عقل کی تائید تو بڑی بات ہے واقعہ یہ ہے کہ جس انداز سے سوچا جائے بجز تردید کے عقل کی راہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔

جس بات کو یہاں قول بالا فواہ کہا ہے قرآن نے دوسرے موقعہ پر اسی کو لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ لقد جئتم شيئا ادا۔ یعنی تم بڑے اچنبے کی بات پیش کر رہے ہو یعنی ایسی عجیب و غریب بات جو کبھی دیکھی اور سنی نہیں گئی اور فطرت انسانی جسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ اسی لیے زبان نبوت نے اسے اللہ سبحانہ کی جناب میں گالی قرار دیا ہے ارشاد ہے یسبنی ابن آدم۔ حق سبحانہ فرماتے ہیں کہ انسان نے مجھے گالی دی ہے۔ گالی یہی ہے کہ فلاں اللہ کا بیٹا ہے۔

آخر میں فرمایا یضاھئون قول الذین کفروا من قبل یعنی یہود و نصاریٰ اپنی اس بات میں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور مسیح خدا کے بیٹے ہیں اپنے سے پہلے لوگوں کے مشابہ ہو رہے ہیں۔ مضاہاۃ کے معنے مشابہت کے آتے ہیں جس عورت کو ماہواری نہ آتی ہو اور اس طرح وہ مردوں سے مشابہ ہو جائے اسے ضہیاء کہتے ہیں۔ مطلب کہ یہ دونوں اس کہنے میں اپنے سے پہلے کافروں کی کاپی کر رہے ہیں۔ عبداللہ بن عباس، مجاہد اور قتادہ کہتے ہیں کہ یہاں مشرکین کے مشابہ ہیں جن کا خیال ہے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ لیکن مشرکین تو اب موجود ہیں اور قرآن کہہ رہا ہے کہ اپنے سے پہلے کافروں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ پہلے کافر کون ہیں۔ تاریخ ابنیت و حلول و تثلیث کا عقیدہ ہندوستان، چین، جاپان، ایران روم اور مصر کے بت پرستوں کا رہا ہے ان ہی کی یہ لوگ بھی نقل کر رہے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ مصر، یونان، روم و ایران اور دوسرے ممالک میں جو قومیں پہلے گمراہ ہو چکی تھیں ان کے ہی اپنے خیالات فاسدہ میں یہ بھی مشابہ ہیں۔

ابنیت کے نظریہ پر تعجب

(۳۰) اللہ ان کو ہلاک کرے کدھر بہکے جا رہے ہیں۔ یعنی خدا ان کو غارت کرے کہ توحید کی صاف اور واضح روشنی کے باوجود کدھر جا رہے ہیں۔ اصل تعبیر قاتلھم اللہ ہے۔ شارحین قرآن کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ جملہ دعا کے لیے ہے یا تعجب کے لیے۔ ابن عباس ﷜ نے اسے دعاء کہا ہے اور ابن جریج نے اسے تعجب قرار دیا ہے۔ یعنی اس نظریہ ابنیت کی شناعت اور برائی اس قدر واضح ہے کہ اس کے اپنانے والوں پر تعجب ہوتا ہے کہ ایسی بدیہی اور کھلی حقیقت کے باوجود یہ کدھر جا رہے ہیں۔ اس موقعہ پر مشہور لغوی اصمعی نے یہ شعر پیش کیا ہے۔

یا قاتل اللہ لیلیٰ کیف تعجبنی　　واخبر الناس انی لا ابالیھا

تعجب ہے کہ لیلیٰ مجھے کیسے پسند کرتی ہے　　حالانکہ لوگوں نے اسے بتا دیا کہ میں اس کی پروا نہیں کرتا

زمخشری نے اساس اللغۃ میں تعجب کے معنے میں یہ محاورہ بتایا ہے قاتلہ اللہ ما افصحہ۔ بہر حال دعا کی نسبت یہاں تعجب کے معنے زیادہ صاف ہیں۔

امام رازی نے بھی اسی کو اپنایا ہے فرماتے ہیں کہ
یہ لوگ اس لائق ہیں کہ ان کی اس بات پر تعجب کیا جائے۔
مطلب یہ ہے کہ نظریہ ابنیت کی اس گندگی کے باوجود اسے کیسے قبول کر رہے ہیں اور نظریہ توحید سے روگرداں ہو رہے ہیں۔

لہ افادات شیخ الاسلام

احبار و رہبان کی ربوبیت

(۳۱) انھوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کو چھوڑ کر رب بنالیا ہے۔ اور مسیح بن مریم علیہ السلام کو۔ حالانکہ ان کو صرف ایک معبود کی بندگی کا حکم دیا گیا تھا اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے۔ اللہ کی ذات ان کی شرک سازیوں سے پاک ہے ان کے علماء مشائخ جو کچھ اپنی طرف سے مسئلہ بتا دیتے خواہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال کہہ دیتے اسی کو سند سمجھتے کہ بس خدا کے یہاں ہم چھٹکارا پالیں گے۔ کتب سماویہ سے کوئی سروکار نہ رکھا تھا محض احبار و رہبان کے احکام پر چلتے تھے اور ان کا یہ حال تھا کہ تھوڑا سا مالی یا جاہی فائدہ دیکھا اور حکم شریعت کو بدل ڈالا جیسا کہ دو تین آیتوں کے بعد مذکور ہے۔ پس جو منصب خدا کا تھا یعنی حلال و حرام کی تشریع وہ علماء و مشائخ کو دے دیا تھا اس لحاظ سے فرمایا کہ انھوں نے عالموں اور درویشوں کو خدا ٹھہرایا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اسی طرح کی تشریح فرمائی ہے اور حضرت حذیفہؓ سے ایسا ہی منقول ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں عالم کا قول عوام کو سند ہے جب تک وہ شرع سے سمجھ کر کہے۔ جب معلوم ہو کہ خود اپنی طرف سے کہا یا طمع وغیرہ سے کہا پھر سند نہیں [1]

یہ آیت قرآنی مہمات معارف میں سے ہے۔ لیکن یہ بات خیال میں رکھیے کہ یہ دونوں الزام یعنی کسی کو خدا کا بیٹا بنانا اور کسی کو حلال و حرام کرنے کا حق دینا اس بات کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ یہودی اور عیسائی ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔

شارحین قرآن میں سے متاخرین نے اس آیت پر طویل مباحث سے پڑھنے والوں کی ضیافت طبع کا سامان کیا ہے قاضی بیضاوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

> اللہ کو چھوڑ کر رب بنانے کا مطلب ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے عالموں اور مشائخ کی ان باتوں میں طاعت کی جو انھوں نے خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حلال بنایا اور حلال چیزوں کو حرام بنا دیا یا ان کو سجدے کرتے تھے اور مسیح ابن مریم علیہ السلام کو رب اس طرح بنایا کہ ان کو خدا کا بیٹا کہتے تھے حالانکہ ان رب بنانے والوں کو صرف یگانہ معبود اللہ کی طاعت کا حکم دیا گیا تھا۔ باقی انبیاء اور ان تمام کی طاعت جن کی طاعت کا حکم خود اللہ نے دیا ہے وہ فی الواقع اللہ کی طاعت ہے۔ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں وہ لوگوں کی شرک سازیوں سے پاک ہے۔

علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں۔

[1] افادات شیخ الاسلام

یہودیوں نے اپنے علماء کو عیسائیوں نے اپنے مشائخ کو خدا کو چھوڑ کر رب بنالیا یعنی انھوں نے تحلیل وتحریم میں ان کی طاعت کی ہے یہی تفسیر جناب رسول اللہ نے حضرت عدی کے جواب میں ارشاد فرمائی اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بھی ایک سائل کے جواب میں یہی بات فرمائی آیت میں عبادت یعنی طاعت بطور استعارہ ہے یعنی اطاعت کو عبادت سے تشبیہ دی ہے یہ آیت ان گمراہ فرقوں کے خلاف ماتم کر رہی ہے جو اپنے علماء اور اپنے مشائخ کی بات کی وجہ سے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور مسیح بن مریم علیہ السلام کو عیسائیوں نے معبود بنالیا۔ یا ان کو خدا کا بیٹا بنالیا۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہود نے عزیر علیہ السلام کو معبود نہیں بنایا تھا۔ حالانکہ ان لوگوں کو یگانہ معبود کی اطاعت کا حکم ملا تھا۔ رسول کی طاعت اور ان لوگوں کی طاعت جن کی طاعت کا خود خدا نے حکم دیا ہے اس میں داخل نہیں۔ وہ اللہ ہی کی طاعت ہے۔

امام رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مفسرین کی اکثریت کہتی ہے کہ ارباب سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ دنیا کے معبود ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اوامر ونواہی میں ان کی اطاعت کرتے تھے جیساکہ عدی بن حاتم کے جواب میں حضور کا ارشاد بتا رہا ہے — کہتے ہیں میں نے ابو العالیہ سے دریافت کیا کہ احبار ورہبان کی ربوبیت کیسے تھی انھوں نے بتایا کہ احبار ورہبان کے اوامر ونواہی اللہ کی کتاب کے مخالف ہوتے تھے اور ان ہی کی اطاعت کرتے تھے کتاب اللہ کی پروانہ کرتے تھے۔

یہی تشریح علامہ ابو السعود نے تفسیر میں کی ہے۔ علامہ قرطبی حافظ ابن جریر نے اور حافظ ابن کثیر نے اس آیت کی یہی تشریح کی ہے۔ علامہ شوکانی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اس طرح پیش کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے اوامر اور نواہی میں ان کی اطاعت کی وہ گویا ایسے ہوگئے جیسے ان کو رب بنالیا۔

نواب صدیق حسن خان رح نے فتح البیان میں اس طرح تشریح کی ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی اپنے علماء اور مشائخ کے اوامر ونواہی کی اطاعت کی وجہ سے ایسے ہوگئے جیسے انھوں نے ان کو رب بنالیا ہے کیونکہ انھوں نے احبار ورہبان کی ایسی ہی طاعت کی جیسے ارباب کی کی جاتی ہے۔

اس کے بعد دونوں بزرگوں علامہ شوکانی اور نواب صاحب نے ائمہ اجتہاد کے مقلدین کے خلاف استغاثہ کیا ہے۔

جدید شارحین قرآن میں السید رشید رضا، علامہ جمال الدین القاسمی محمد الدین شنقیطی سب نے یہی تشریح کی ہے۔

اور شارحین قرآن میں مولانا اشرف علی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا غلام اللہ خان، مفتی محمد شفیع مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ، مولانا امین احسن اصلاحی، علامہ عبدالدائم پیر محمد کرم شاہ کی تفاسیر میرے پیش نظر ہیں۔ اس آیت کی تشریح میں ان بزرگوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے بھی استفادہ فرمایئے۔

حضرت مولانا اشرف علی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

یہود و نصاریٰ نے خدا کی توحید فی الطاعۃ چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو باعتبار طاعت کے رب بنا رکھا ہے کہ ان کی اطاعت تحلیل و تحریم میں مثل اطاعت خدا کرتے ہیں کہ نص پر ان کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور ایسی اطاعت بالکل عبادت ہے بس اس حساب سے وہ ان کی عبادت کرتے ہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں۔

معبود بنانے کا جو الزام ان پر عائد کیا گیا ہے اگرچہ وہ ان کو اپنا رب کہتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اطاعت مطلقہ جو خالص اللہ جل شانہ کا حق ہے۔ اس حق کو انکے حوالے کر دیا تھا کہ ہر حال میں ان کے کہنے کی پیروی کرتے تھے اگرچہ ان کا قول اللہ و رسول کے خلاف کبھی نہ ہو تو یہ ظاہر ہے کہ کسی کی ایسی طاعت کرنا کہ اللہ و رسول کے خلاف بھی کہے تو اس کی طاعت نہ چھوڑے یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو اپنا رب اور معبود بنا لے جو کھلا ہوا کفر ہے۔

مولانا محمد ادریس صاحب فرماتے ہیں۔

ان اہل کتاب نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنا لیا ہے کہ جو وہ فتویٰ دے دیں اس کو حکم خداوندی کی طرح واجب العمل سمجھتے ہیں اور ان کے قول کو اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ اگرچہ وہ توریت و انجیل کے نصوص کے خلاف ہی کیوں نہ ہو ایسی بے چون و چرا اطاعت عبادت کے حکم میں ہے جو شرک ہے۔

پیر کرم شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی حلال کی ہوئی چیز کو اگر کوئی حرام کر دے یا ان کی حرام کردہ چیز کو حلال کر دے تو اس نے گویا تشریع و قانون سازی جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جن لوگوں نے ان کی باتوں کو مان لیا گویا انھوں نے اس کی خدائی مان لی۔

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں۔

اب یہ اس کی دلیل بیان ہو رہی ہے کہ انھوں نے اپنے فقیہوں اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب مان

لیا ہے اس کے بعد عدی کی روایت کو تشریح میں پیش کیا ہے۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں؛

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی سند کے بغیر جو لوگ انسانی زندگی کے لیے جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرتے ہیں وہ دراصل خدائی کے مقام پر بزعم خود متمکن ہو جاتے ہیں اور جو ان کے حق شریعت سازی کو تسلیم کرتے ہیں وہ انہیں خدا بناتے ہیں۔

مولانا دریابادی فرماتے ہیں۔

یعنی انہیں ایسا مستقلا صاحب اختیار مان رکھا ہے گویا یہی معبود و رب ہیں جو چاہیں وہ جائز کر دیں جو چاہیں وہ حرام ٹھہرا دیں۔ سارے اختیارات شریعت و قانون سازی کے گویا ان ہی کو حاصل ہیں۔

یہ ہے ان تشریحات کا خلاصہ جو شارحین قرآن نے اس آیت کے مطالب بیان کرتے ہوئے لوگوں کو بتایا ہے۔ جس ارشاد نبوت پر ان مطالب کی بنیاد ہے اگرچہ اس کی روایتی حیثیت کچھ اتنی مضبوط نہیں ہے[1] لیکن چونکہ شارحین قرآن نے اسے شرف قبول دیا ہے اور امام ترمذی نے غرابت کے ساتھ اس کی تحسین کی ہے اس لیے ہم بھی اسے بسر و چشم قبول کرتے ہیں۔ آیئے پہلے حافظ ابن کثیر کی زبانی پوری حدیث گوش گذار فرمایئے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچی تو وہ شام کی طرف کوچ کر گئے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے۔ کسی جنگ میں ان کی بہن اور ان کی قوم کے کچھ افراد قیدی ہو گئے تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میری بہن کو رہا کر دیا وہ اپنے بھائی یعنی میرے پاس آ گئی اس نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کی ترغیب دی۔ عدی قبیلہ میں ریاست و زعامت کا مقام رکھتے تھے ان کے والد مشہور سخی حاتم طائی تھے۔ عدی مدینہ آئے ان کی آمد پر لوگوں میں ان کے آنے کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے گلے میں چاندی کی صلیب تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا میں نے عرض کیا کہ ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کی عبادت تو نہیں کی فرمایا ہاں کی ہے اس طرح کہ یہ لوگ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا کر پیش کرتے اور لوگ ان کی بات مانتے یہی ان کی عبادت ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی کو مخاطب کر کے

[1] رواہ الترمذی وقال حسن غریب لا نعرفہ الا من حدیث عبد السلام بن حرب و غطیف ابن اعین لیس بمعروف فی الحدیث و رواہ الطبرانی من طرق عن عدی بن حاتم۔ و خرجہ السیوطی فی الدر و زاد نسبتہ لابن سعد و عبد بن حمید و ابن المنذر و ابن ابی حاتم والطبرانی و ابی الشیخ و ابن مردویہ والبیہقی فی سننہ۔

فرمایا عدی تمہارا کیا خیال ہے کیا اللہ اکبر کا بول تمہیں نقصان دیتا ہے کیا تمہارے علم میں اللہ سے کوئی بڑا ہے کیا لا الہ الا اللہ تمہیں چبھتا ہے کیا اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق ہے۔ اس کے بعد آپ نے عدی کو اسلام کی دعوت دی۔ عدی مسلمان ہو گئے عدی کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ کا چہرہ خوشی سے چمک گیا ہے اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ یہود مغضوب علیہم اور نصاریٰ ضالین ہے۔

حافظ ابن جریر نے اس موقعہ پر اپنے مذاق کے موافق دوسرے صحابہ سے بھی اسی کی تائید میں آیت کی تشریح نقل کی ہے مثلاً حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا یہودی اور عیسائی اپنے احبار و رہبان کی عبادت کرتے تھے فرمایا بلکہ تحلیل و تحریم کا ان کو اختیار دے رکھا تھا۔

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رب بنانا یہ ہے کہ وہ طاعت کرتے تھے۔

یہ سب تشریحات بہ بانگ دہل اعلان کر رہی ہیں کہ رب بنانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہودی اور عیسائی اپنے علماء اور شائخ کی عبادت کرتے تھے بلکہ یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے علماء کو اور عیسائیوں نے اپنے مشائخ کو تشریع اور قانون سازی کا حق دے کر زندگی کی ساری شقوں میں اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا تھا۔ پہلے ان کی زندگی کے سارے فیصلے کتاب اللہ کی روشنی میں ہوتے تھے۔ اب ان کی زندگی کے سارے اطوار کتاب اللہ سے ہٹ کر احبار و رہبان کی خواہش اور رائے سے ہوتے تھے اور سب اسے بے چون و چرا مانتے۔ دراصل اس روایت میں یہودی اور عیسائی تاریخ کا ایک اہم پہلو پیش کیا جا رہا ہے۔ اور بتایا جا رہا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جو نظام حیات ملا تھا وہ خالصتاً الٰہی نظام تھا اور اس کی بنیاد تورات اور اسوہ انبیاء پر تھی۔ قرآن نے یہ بات کھول کر بتائی ہے۔

انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی و نور یحکم بھا النبیون الذین اسلموا للذین ھادوا والربانیون والاحبار بما استحفظوا من کتاب اللہ وکانوا علیہ شھداء فلا تخشوا الناس واخشون ولا تشتروا بایاتی ثمنا قلیلا ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی سارے نبی جو اللہ کے فرماں بردار تھے اسی کے مطابق یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح مشائخ اور علماء بھی اسی کے مطابق فیصلہ کرتے تھے کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے اے یہودیو تم لوگوں سے نہ ڈرو میرے سے ڈرو۔ میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر فروخت نہ کرو جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

اور ایسی ہی بات قرآن نے عیسائیوں کے بارے میں بتائی ہے۔

ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون

ہمارا حکم تھا کہ انجیل والے اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔

قرآن کی یہ آیات بتا رہی ہیں کہ صرف گرجا اور کلیسا کی حدود میں نہیں بلکہ زندگی کی ساری شاخوں میں ان کو حکم تھا کہ اخلاق، عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی دوائر میں اللہ کے قانون کی پیروی کریں ان کے علماء اور مشائخ نے اس جادہ مستقیم سے ہٹ کر عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی زندگی کو انسانی قوانین کے تابع کر دیا تھا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ احبار و رہبان کی حیثیت یہودیوں اور عیسائیوں میں ہرگز وہ نہ تھی جو آج مسلمانوں میں علماء اور مشائخ کی ہے بلکہ ان کی حیثیت عدالت کے ججوں اور حاکموں کی تھی۔ عدالت میں بیٹھ کر وہ فیصلے کرتے تھے۔

۱۔ یہ فیصلے کتاب اللہ کی روشنی میں نہ ہوتے تھے بلکہ خود ان کی ہوائے نفس کے تحت ہوتے تھے۔

۲۔ ان فیصلوں کے لیے وہ سودے کرتے تھے اور رشوت لیتے تھے۔

۳۔ بادشاہوں اور امراء کی خواہشوں کے مطابق اللہ کے قانون کو تبدیل کر دیتے۔

۴۔ حرام خوری ان کی طبیعت بن چکی تھی۔

۵۔ قرض اور سود کے معاملات میں وہ اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان تفریق کرتے۔

۶۔ اگر امی اور اسرائیلی کا مقدمہ ان کی عدالت میں آتا تو ہر حال میں اسرائیلی کو جتانے کی فکر ہوتی۔

۷۔ انسانی قدریں ناپید تھیں ان کا نظریہ تھا کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

۱۔ خدا کی کتاب جو اس غرض سے نازل کی گئی تھی کہ اس کے مطابق عدالت میں فیصلے ہوں یک قلم بے اثر اور بے کار ہو کر رہ گئی۔

۲۔ ہدایت کا مرکز عملاً خدا کا حکم نہ رہا بلکہ انسانوں کا حکم ہو گیا۔ زندگی میں اللہ کے قانون سے اسی بے رخی کو قرآن نے یہاں لا یدینون دین الحق سے اور سورہ مائدہ میں وما اولئک بالمومنین سے تعبیر کیا ہے اور اسی کو قرآن نے ان کو رب بنانا کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی اپنے علماء کی اور عیسائی اپنے مشائخ کی اطاعت کرتے تھے اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھے تھے۔

اس سورت میں جس موقعہ پر یہ بات کہی گئی ہے اگر وہ پیش نظر ہو تو بات بالکل بے غبار ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ قرآن

جس دینِ حق کا داعی بن کر آیا ہے اسے دنیا میں قائم کرنے کے لیے جیسے اس نے مشرکین کے بارے میں صاف صاف کہا ہے کہ:
فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم ایسے ہی اہلِ کتاب کے بارے میں بھی کہا ہے قاتلوا الذین لایومنون
باللہ ولا بالیوم الاخر۔

جن لوگوں نے بات کو طاعت سے ہٹا کر عبادت کی طرف پھیر دیا ان کو یہاں الجھنوں اور دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ دراس آیت میں بہت از کار باتیں کرنی پڑیں جن کا آیت کے منطوق مدلول اور مفہوم سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اور اس پریشانی میں مسلمانوں کے ائمہ مجتہدین کے خلاف دہائی دینی پڑی۔ شوکانی، نواب صدیق حسن خان ہوں یا سید رشید رضا اور جمال الدین سب نے آیت کا رُخ یکبارگی ائمہ اجتہاد کی طرف کر دیا۔ حالانکہ آیت کا رُخ تو یہ اور صرف یہ ہے کہ اللہ کے قانون کی موجودگی میں ہم انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر زندگی گذارنے کے مجاز و مختار ہیں یا نہیں۔ قانون کے اصل سرچشمے صرف دو ہیں قرآن و سنت۔ ان میں جس قدر قوانین واضح شکل میں موجود ہیں وہ قطعی اور اٹل ہیں اور ہمیشہ کے لیے واجب التسلیم اور واجب الاطاعت ہیں۔ ان میں کبھی کوئی معمولی ردوبدل بھی نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی سربراہ مملکت حکومت چلانے میں ان سے بال برابر انحراف کر سکتا ہے نہ کسی مسلمان حاکم کے لیے جائز ہے کہ معاملات کا فیصلہ ان سے ہٹ کر کرے ایسا کرنا اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے احبار و رہبان تو آیت میں یہود اور عیسائیوں کے اس دور کی تاریخی تمثیل ہے جب نظام زندگی ان کے ہاتھوں میں تھا۔ ان کی جگہ اگر پارلیمنٹ ہو، اسمبلی ہو کمیٹی ہو، انتظامیہ ہو عدلیہ ہو، فوجی نظام ہو اور یہی کردار پیش کرے کہ چور کو قطع ید کی سزا قرآن کے مطابق نہ دے بلکہ برطانیہ کے پارلیمانی نظام کے مطابق دے۔ زانی کو زنا کی سزا قاتل کو قتل کی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے مطابق نہ دے بلکہ پارلیمانی نظام کے مطابق دے تو یہ پارلیمنٹ کو اسمبلی کو، عدلیہ کے ججوں کو رب بنانا ہے۔ اسی لیے آیت میں عبادت کو طاعت کے معنے میں بتایا گیا ہے۔ علامہ آلوسی نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے۔

اللہ کی عبادت بھی اس وقت تک ہو نہیں سکتی جب تک طاعت میں تخصیص نہ ہو۔ اگر طاعت میں تخصیص نہیں تو عبادت میں بھی تخصیص نہیں ہے۔

شرک جیسے عبادت میں ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح طاعت میں بھی ہوتا ہے۔ خاص طاعت میں شرک کے بارے میں قرآن میں ہے۔

وان اطعتموھم انکم لمشرکون۔
اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو یہ مشرکانہ عمل ہوگا۔
ایک شرک تو یہ ہے کہ:

اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے مثلاً کسی کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے مختار جان کر لہ[1]

یہ اللہ سبحانہ کی پرستش میں شرک ہے۔

دوسرا شرک یہ ہے کہ حکم میں شریک کرے یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند کرے اور اس پر چلے بس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک کرتے ہوں۔

اور سورہ انعام میں فرماتے ہیں۔

شرک صرف یہی نہیں ہے کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے لہ[2]

یہ اللہ سبحانہ کی بندگی میں شرک ہے۔ شرک دونوں ہیں اور دونوں از روئے قرآن ممنوع ہیں۔ اسلامی قانون کے اصول کی ہر کتاب میں یہ بات لکھی ہوئی ہے۔ الحاکم لاخلاف فی انہ اللہ یا لاحکم الا من اللہ۔

افسوس کی بات ہے کہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے بزرگوں کی نگاہ اس پر تو لگی کہ مسلمان ائمہ مجتہدین کی اجتہادات میں تقلید کر رہے ہیں اور اس کے خلاف تو خوب واویلا کیا لیکن ان کی نگاہوں نے یہ نہ دیکھا کہ مسلمان جج عدالتوں میں مسلمان حکمران دفاتر میں مسلمان ممبران پارلیمنٹ میں۔ مسلمان وکلاء قانون میں، مسلمان عوام عائلی و معاشرتی نظام میں مسلمان مزدور معاشیات میں مسلمان حکمران، سیاست میں اللہ کی اطاعت چھوڑ کر ناخدا ناشناسی اور اللہ کی کھلم کھلا بغاوت کر رہے ہیں۔ اللہ اکبر رفع الیدین اور آمین میں ابو حنیفہ رح کی تقلید تو شرک ہو گئی اور زندگی کے ہر گوشہ میں خدا کو چھوڑ کر انسانوں کی نہیں بلکہ کافروں کی اطاعت ہو رہی ہے۔ یہ ہے علمی زندگی میں فکر کی پستی۔ ذرا اس حرارتِ ایمان کی داد دیجئے جو مسائل فرعیہ میں ائمہ کی تقلید پر تو شرک فی الطاعۃ کی پھبتی کسی جاتی ہے لیکن کافروں کی عدالت میں بیٹھ کر قرآن کے دیوانی فوجداری قوانین کو چھوڑ کر کافروں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ جو کرتا ہے اس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے انا اللہ فالی اللہ المشتکیٰ۔

آیت قرآنی تو یہ اور صرف بتا رہی ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر اپنی سیاسی اور قانونی زندگی میں احبار و رہبان کو حاکمانہ حیثیت میں قبول کر کے ان کی طاعت کا قلادہ اپنے گلوں میں ڈال لیا تھا۔ یہ احبار و رہبان عدالتوں میں بیٹھ کر اللہ کے قانون کے خلاف عوام کی امنگوں کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ یہ آیت فی الواقع امت اسلامیہ کے اس کردار کے خلاف ماتم کر رہی ہے جو اس نے اپنی سیاسی اور قانونی زندگی میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول

[1] موضح القرآن

[2] موضح القرآن

کی سنت چھوڑ کر طاغوت کی اطاعت کر رہی ہے۔

دیکھنا چاہیے کہ خود مسلمانوں کا کیا حال ہوا جو دنیا کے بتانے کو آئے تھے کہ ان الحکم الا للہ اور جنھوں نے غیروں کے سامنے اپنی زندگی کا یہ نصب العین بتایا تھا کہ بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کرنا ہمارا کام ہے۔ افسوس ہے کہ وہ خود ہی تیسری صدی سے اسی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے بھی قانون سازی کا حق کتاب و سنت کی جگہ بادشاہوں رئیسوں اور زعیموں کے حوالہ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام مفاسد ظہور میں آگئے جو انسان کی انسان پر حاکمیت کے لازمی نتائج ہیں۔ اور سیاسی و قانونی زندگی میں انسانوں کی حاکمیت سے سب سے بڑا فساد یہ پیدا ہوا کہ صدیوں سے مسلمانوں کی عقلی ترقی رک گئی۔ اور کتاب اللہ کی جگہ انسانی قوانین کی اطاعت نے علم و بصیرت کی راہوں سے انہیں دور کر دیا حتی کہ اب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول سے ہٹ کر مسلمان اپنی دینی سیاسی اور قانونی زندگی میں اشتراکیت جمہوریت کے دلدادہ ہو گئے ہیں اور پورے عالم کے مسلمانوں کا سیاسی معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں یہی قبلہ ہیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمان باہم دست بگریبان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے جا رہے ہیں اور پوری اسلامی زندگی قتل ہو رہی ہے پہلے برطانیہ کے پارلیمانی قوانین کی طاعت ہوتی تھی اب اس کی جگہ اشتراکی اور جمہوری قوانین کی بندگی ہو رہی ہے۔

قرآن کی یہ آیت نہ رسول کی طاعت سے روکتی ہے اور نہ مجتہدین کی طاعت سے۔ کچھ نے اس آیت کا سہارا لے کر رسول کی طاعت کا انکار کر دیا اور کچھ نے ائمہ اجتہاد کی تقلید کے خلاف اس کو دلیل بنا کر پیش کیا۔ یہ دونوں راہیں افراط و تفریط ہیں۔ ان کی اجازت تو خود قرآن نے دی ہے۔ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بات کھول کر سمجھا دی ہے۔

اور اس کا راز یہ ہے کہ تحلیل و تحریم اس تکوین اور آئین کا نام ہے جو عالم ملکوت میں نافذ ہے کہ فلاں چیز قابل گرفت ہے یا نہیں۔ یہی تکوین اور نفاذ امر اللہ کی صفات میں سے ہے باقی حضور اقدس ﷺ کی طرف تحلیل و تحریم کی نسبت تو اس معنے میں ہے کہ آپ کا ارشاد اس بات کی قطعی نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو حلال یا حرام کیا ہے۔ اور ائمہ مجتہدین کی طرف تحریم و تحلیل کی نسبت اس معنے میں ہے کہ وہ اس کو محض شارع سے روایت کرتے ہیں یا کلام شارع سے استنباط کرتے ہیں۔

قرآن عزیز نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی دونوں انداز میں بالکل واضح کر دیا ہے اس آیت کی اصلی ضرب تو ان لوگوں پہ ہے جو اللہ اور رسول کے قانون کی موجودگی میں انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق زندگی گذار رہے ہیں۔

حضرت عدی رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی یہی بتا رہی ہے کہ کسی چیز کو حلال و حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں نہ فرد کا

کا نہ جماعت کا بلکہ خدا کا ہے اور اسی کا نام قانون سازی ہے۔ اس تحلیل و تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکم خداوندی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان عرب یہود اور منافقین کو جو قانون الٰہی کی سختی سے بچنے کے لیے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالت میں لے جاتے تھے یا فیصلہ کے لیے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے زجر و توبیخ فرمائی اور ان کے اس عمل کو کھلا نفاق اور شرک قرار دیا چنانچہ ارشاد ہے۔

الم تر الی الذین یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیک و ما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ۔

کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا ایمان لا چکے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔
طاغوت کا مشترک مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس سے فیصلہ کرایا جائے وہ طاغوت ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ سات جگہ آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل یا معبود باطل مراد ہے۔

قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا کفر بھی ہے ظلم بھی ہے اور فسق بھی ہے اس کا صاف مطلب ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔

اولاً۔ اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنے ہے۔
ثانیاً۔ اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے کیونکہ ٹھیک عدل و انصاف کے مطابق جو حکم ہو سکتا ہے وہ خدا کا حکم ہے اس لیے خدا کے حکم سے ہٹ کر جب اس نے فیصلہ کیا یا لیا تو ظلم کیا۔
ثالثاً۔ یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر کسی اور قانون کو اپنا یا اور یا کسی دوسرے قانون کو نافذ کیا تو درحقیقت بندگی اور طاعت کے دائرے سے اس نے قدم باہر نکالا اور یہی فسق ہے۔
قانون و شرع کی حقیقت تحلیل و تحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرے اور بلا سند الٰہی کسی چیز کو حرام یا حلال ٹھہرائے تو اس کا نام افترا علی اللہ کذبا۔ خدا پر جھوٹ تہمت و کذب باندھنا ہے۔

بہر حال یہ ایک بے غبار بات ہے کہ قانون ساز صرف اللہ سبحانہ ہے اور ولا یحرمون ما حرم اللہ و رسولہ

میں تحریم کی نسبت جو حضور اقدس ﷺ کی طرف ہے وہ اس حیثیت سے ہے کہ آپ اللہ کے احکام کے مبلغ ہیں رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ جس طرح خدا کے احکام میں اولی الامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے۔

قرآن کی آیت کا منطوق تو یہی ہے ہاں اس کے مدلول میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اگر آپ کا مولوی، پیر، استاذ، امام ایک بات کہہ رہا ہے اور سراسر اپنی جانب سے کہہ رہا ہے اس کے لیے اس کے پاس قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں ہے اور آپ اسی کی بات کو پذیرائی دے رہے ہیں تو یقیناً آپ اس کو رب بنا رہے ہیں۔ یا جیسا کہ امام رازی فرماتے ہیں۔

ہمارے شیخ کہتے ہیں کہ میں نے کچھ مقلدین مولوی ایسے بھی دیکھے کہ ان کے سامنے قرآنی آیات پیش کی گئیں جو ان کے مذاہب کے خلاف تھیں تو انھوں نے ان کو شرف پذیرائی نہیں دیا۔

یہ تو امام رازی اپنے دور کی بات کہہ رہے ہیں ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ لوگوں کو دہرم سے زیادہ دھڑا اس قدر زیادہ محبوب ہے کہ ان کے سامنے شرک و بدعت کی تردید میں قرآن کی آیات پیش کیجئے تو وہ بڑی سادگی سے کہتے ہیں کہ یہ آیت تو یہودیوں کے بارے میں ہے یا یہ آیت عیسائیوں کے متعلق ہے یا اس میں مشرکین مکہ کا ذکر ہے۔ حد ہے آپ اگر کسی شافعی کے سامنے قرآن کی آیت امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت پر پیش کریں گے تو جبین بچین ہو جائے گا امام شافعیؒ کے قول کی تاویل نہ کرے گا۔ بلکہ قرآن کی آیت کی تاویل کرے گا کبھی کہے گا اس کا تعلق خطبہ سے ہے اور کبھی کہے گا کہ اس کا تعلق سورہ فاتحہ کے سوا باقی قرآن سے ہے۔ اگر کہو کہ عزیز سورۃ فاتحہ بھی تو قرآن ہے تو بڑی سادگی سے کہے گا کہ فاتحہ قرآن نہیں یہ تو ام القرآن ہے۔

علامہ آلوسی نے یہ بات بالکل بجا فرمائی ہے کہ:

یہ آیت ان گمراہ فرقوں کی اس روش پر ماتم کر رہی ہے جو علماء اور لیڈروں کی بات کی وجہ سے اللہ کی کتاب اور سنت رسول کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ حق اس لائق ہے کہ اسے شرف پذیرائی دی جائے خواہ وہ اس کے امام کے اجتہاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

مطالب کی حد تک آیت کی تشریح ختم ہو چکی ہے لیکن بعض مہمات کی تشریح باقی ہے۔ کچھ علماء نے اس آیت سے عدم تقلید پر استدلال کیا ہے آیئے ان کی کہانی بھی خود ان کی زبانی سن لیجئے۔

علامہ شوکانی فتح القدیر میں فرماتے ہیں،

اس آیت میں ہر صاحب دل کو تنبیہ ہے کہ تقلید نہ کرنی چاہیے اللہ کے دین میں۔

نواب صدیق حسن خان ﷫ نے فتح البیان میں علامہ شوکانی کی ہی عبارت بغیر علامہ شوکانی کا نام لیے نقل کر دی ہے اور اس طرح انھوں نے بھی گویا ہاں میں ہاں ملا دی۔

علامہ سید رشید رضا نے اس آیت پر تقلید کے خلاف بہت بڑا محاذ قائم کیا ہے اور اس انداز سے اس مسئلہ کو پیش کیا ہے گویا آیت قرآنی کا منطوق یہ ہی ہے۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن نے عبادت کا دائرہ جس قدر تنگ رکھا ہے اطاعت میں اس قدر تنگی نہیں رکھی۔ عبادت اس کی محبوبیت کا تقاضا ہے جبکہ طاعت اللہ سبحانہ کی حاکمیت کا تقاضا ہے۔ محبوبیت میں نیابت نہیں ہو سکتی لیکن حاکمیت میں نیابت ہو سکتی ہے۔ عبادت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی امر ان لا تعبدوا الا ایاہ فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہ کہیں نہیں فرمایا کہ امر ان لا یطیعوہ الا ایاہ اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو بلکہ اس کے برعکس اللہ سبحانہ نے اپنی طاعت کے ساتھ رسول کی طاعت کو شرط نجات قرار دیا ہے اور رسول کی طاعت کو اپنی طاعت بتایا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ اللہ کی عبادت کا سرچشمہ اللہ کی الوہیت ہے۔ الہ اللہ کے سوا کوئی نہیں اور طاعت کا منبع اللہ کی ربوبیت یعنی حاکمیت ہے حاکمیت میں خلافت ہو سکتی ہے یعنی رسول حاکمیت میں اللہ کی نیابت کرتا ہے۔ رسول ہونے کی وجہ سے اللہ کے رسول کی طاعت کی جاتی ہے اور رسول کی نیابت میں اولی الامر کی اطاعت کی جاتی ہے۔ گویا اصل طاعت اللہ کی ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کا رسول ہونے کی وجہ سے اور رسول کے بعد ہر شخص کی طاعت اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ مطیع رسول ہو چاہے وہ فرمانروا ہوں، اولیاء ہوں یا پھر علماء قاضی ثناء اللہ کا یہ ارشاد بالکل برموقع ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں دامان طاعتِ رسول نہ ہو اس کی طاعت پر یہ آیت ضرب کاری ہے خواہ وہ کوئی ہو۔

کیا ائمہ اجتہاد ارباب من دون اللہ ہیں

مسلمان جو ائمہ اجتہاد کی اعمال فرعیہ میں تقلید کر رہے ہیں امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کیا وہ اس آیت کی روشنی میں اتخاذ اربابا من دون اللہ کا مشرکانہ عمل کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے اس غلط فہمی کا شکار حافظ ابن حزم ظاہری ہوئے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان کو جواب دیا ہے کہ ایسا سمجھنا اس شخص کے بارے میں تو درست ہے جو کسی امام اجتہاد کی تقلید کرے اور اس کے بارے میں یہ عقیدت ہو کہ اس سے غلطی نہیں ہو سکتی اور اس کی بات حتمی درست ہے اور ذہن یہ ہو کہ اس کے خلاف اگر دلائل بھی ہوں پھر بھی اس کی ہی بات مانے گا۔ اگر ایسا ہے تو وہ بلاریب اس آیت کا مصداق ہے لیکن ایسا شخص ہرگز اس کا مصداق نہیں جو دین کی زندگی میں نبوت کی طاعت کرتا ہو اور حلال و حرام کے سارے اختیارات اللہ کے لیے مانتا ہو لیکن چونکہ اسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے ارشادات کا پورا علم نہیں ہے اور آپ کے مختلف ارشادات میں تطبیق سے واقف نہیں ہے اور نہیں جانتا کہ مسائل کو کیسے استنباط کیا جاتا

ہے اس لیے وہ کسی عالم راشد کی اس خیال سے پیروی کرتا ہے کہ اس کی بات درست ہے اگر اس کی بات اسے خلاف سنت معلوم ہو تو ذرا ہٹ جاتا ہے اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے یہ ایک غبار حقیقت ہے کہ ہم کسی مجتہد کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس پر فقہ کی وحی آتی ہے اور ہم پر اس کی طاعت فرض ہے اور وہ معصوم ہے۔ اس کے برعکس ہم اگر کسی کی تقلید کرتے ہیں تو صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ہمارے خیال میں وہ امام اجتہاد اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت سے واقف ہے اس کی بات پر ہم غور کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی بات کا ماخذ کتاب وسنت میں صراحۃً مذکور ہے یا اس کی بات کتاب و سنت سے مستنبط ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات نہ ہوتی تو کوئی مومن کسی بھی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔[1]

یہ ہیں حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے موضوع تقلید پر شہ پارے۔ شاید آپ کے ذہنوں میں خلش ہو کہ ان چار ہی کی تقلید کیوں کی جاتی ہے تو اس کا جواب ان کے پوتے حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشہور کتاب منصب امامت میں دیا ہے فرماتے ہیں:

> احکام شرعیہ کا علم دو طرح حاصل ہوتا ہے تقلید کی راہ سے یا تحقیق سے۔ انبیاء کے علوم تقلیدی نہیں تحقیقی ہوتے ہیں۔ تحقیق کے دو راستے ہیں ایک اجتہاد دوسرے الہام۔ انبیاء کے مشابہ علم احکام میں دو ہی ہو سکتے ہیں مجتہدین یا ملہمین۔ اور چونکہ کشف والہام کے ذریعے احکام کا علم صدر اول میں نہ تھا۔ اس لیے علم احکام میں انبیاء کے مشابہ صرف مجتہدین ہیں۔ ان کو ائمہ فن سمجھنا چاہیے یعنی وہ اس فن کے امام ہیں جیسے چاروں امام۔ ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ اگرچہ مجتہدین ان چار کے سوا اور بھی بہت ہیں لیکن امت میں مقبول اور مشہور یہی چند اشخاص ہیں اس لیے گویا ان ہی چار کو اس فن میں نبوت سے بھرپور مشابہت حاصل ہے اسی وجہ سے تمام مسلمانوں میں خاص ہوں یا عام ان کو امام کے لقب سے پکارا جاتا ہے اور قوت اجتہاد سے موصوف مانا جاتا ہے۔[2]

یہ کہنا کہ تقلید نے علم وبصیرت کی راہوں سے مسلمانوں کو بیگانہ کر دیا اور ان کی عقلی ترقی روک دی تاریخی حالات کا منصفانہ تجزیہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ مسائل فرعیہ میں ائمہ اجتہاد کی تقلید نہیں بلکہ پوری زندگی کے مسائل میں رؤسا، زعماء اور سلاطین کی تقلید ہے۔ ان کی تقلید نے مسلمانوں کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے بیگانہ بنایا ہے اور یا پھر ان علماء کی قیادت ہے جو اسلام کو دینداری نہیں بلکہ فن دینداری اور پیشہ دینداری بنائے ہوئے ہیں۔ ورنہ جہاں تک دین کی زندگی میں اسلام کی ترقی کے لیے جیسے اجتہاد کی ضرورت ہے تقلید کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ بقول مولانا شہید علم دو ہی راہوں سے آتا ہے محققین سے اور یا پھر تقلید سے اور ظاہر ہے کہ پوری امت کا ہر فرد

[1] حجۃ اللہ البالغہ

[2] منصب امامت

محقق نہیں ہو سکتا ہر کہ ومہ کا کام تحقیق نہیں ہے خود قرآن نے تحقیق کی ذمہ داری سب پر نہیں کچھ پر ڈالی ہے۔

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین۔

پس کیوں ایسا نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آتی کہ دین میں فہم و دانش پیدا کرے۔

آیت میں طائفہ کا لفظ بتا رہا ہے کہ دین میں تفقہ اور تحقیق کی ذمہ داری سب پر نہیں ہے۔ بلکہ کچھ پر ہے۔ جب کچھ پر ہے تو بات صاف ہے کہ باقی کا علم تقلیدی ہے۔ اور جب تقلیدی ہے تو یہ بات واضح ہے کہ تقلید بھی امت کی ضرورت ہے اسلام نہ تو تقلید بلا اجتہاد چاہتا ہے اور نہ اجتہاد بلا تقلید، اجتہاد بلا تقلید اگر افراط ہے تو تقلید بلا اجتہاد تفریط ہے عدل کا تقاضا ہے کہ دونوں ہوں اور اپنی اپنی حدود میں ہوں۔ اسلام اپنے سیاسی اور قانونی نظام میں جامعیت کے ساتھ اجتماعیت چاہتا ہے جیسے سیاسی نظام میں وہ نہ تشتت و پراگندگی کو پسند کرتا ہے اور نہ جمود و استبداد کو۔ وہ ایک طرف اگر امارت چاہتا ہے تاکہ امت میں فوضویت اور انارکی نہ راہ پائے تو دوسری طرف امارت کے لیے شوری کو ضروری قرار دیتا ہے تاکہ امت میں استبداد رونما نہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح اسلام قانونی نظام میں نص نہ ہونے کی صورت میں نہ تو عوامی فکر کو اس طرح آزادی عطا کرتا ہے کہ امت کا ہر فرد مجتہد ہو اور کتاب و سنت ہر کہ ومہ کی فکری آوارگی کی جولانگاہ بن جائے۔ کہیں یہ انکار حدیث کا لبادہ پہن لے اور کہیں یہ منصب نبوت پر جا کر براجمان ہو جائے۔ کہیں یہ اجتماعی عمل صحابہ کے خلاف چیلنج بن جائے اور کہیں قرآن کے محکمات پر ہاتھ صاف کر دے اور نہ امت کے لیے ایسی تقلید جامد کو جائز قرار دیتا ہے کہ اس کے لیے فکر و اجتہاد سرے سے معطل ہو جائیں اور عوامی زندگی کا نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے رابطہ ٹوٹ جائے اور اس طرح امت کی اجتماعی زندگی پوری کی پوری قرآن و سنت سے بیگانہ ہو جائے۔

اسلام نے ایک طرف تو جنس اجتہاد کو باقی رکھا جس کی انواع حسب اقتضائے زمانہ آتی اور ختم ہوتی رہیں گی اور دوسری طرف تقلید کو قائم رکھا تاکہ عام زندگی کا تعلق اسلاف سے نہ ٹوٹے اور ناواقف اپنی رائے کو دین کا لباس پہنا کر اسلام کو آراء و قیاسات کا مجموعہ نہ بنائے یعنی امت کے علمی تشتت کو تقلید سے اور تقلیدی جمود کو اجتہاد و تحقیق سے دور کر دیا۔

اگر آپ مانتے ہیں کہ اسلام معروف معنی میں مذہب نہیں بلکہ ایک دین ہے ایک نظام زندگی ہے جو انفرادی زندگی تک محدود نہیں ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی تقاضوں کی تشنگی کو دور کرتا ہے تو پھر عدم تقلید کی منادی کرنے کے اسکے سوا کوئی معنے نہیں کہ آپ قانون کے فن کو بتائے بغیر ہر کہ ومہ کو وکیل بیرسٹر اور بار ایٹ لا بننے کا پروانہ دے رہے ہیں۔ آپ سوچئے کہ آپ کدھر جا رہے ہیں اور دنیا کو کیا باور کرا رہے ہیں۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر یہ منطق میری سمجھ سے بالا ہے کہ ایک طرف آپ اسلام کے بارے میں یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ ایک نظام زندگی ہے اور مکمل نظام ہے جو اس سے ہٹ جائے گا اس کی زندگی مصائب کا گہوارہ بن جائے گی اور دوسری طرف

اسلام کے ماضی سے رشتہ توڑنے کی دنیا کو دعوت دیتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ امت کے ہر فرد کا علم اسلام کے بارے میں تحقیقی ہو کسی کا علم تقلیدی نہ ہو تو یہ وہ بات ہے جس کا مطالبہ خود قرآن نے بھی امت سے نہیں کیا۔ جیسا آپ سن چکے ہیں۔ بہرحال اس آیت کا منطوق مسائل فرعیہ میں ائمہ اجتہاد کی تقلید نہیں بلکہ عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی زندگی میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو چھوڑ کر رؤسا، زعما اور ارباب اقتدار کی تقلید ہے بتانا یہ چاہتا ہوں کہ آیت قرآنی نماز میں روزے میں اور حج کے اجتہادی مسائل میں امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد کی تقلید پر قدغن قائم نہیں کر رہی ہے۔ بلکہ معاملات سیاسی میں قومی مسائل میں اور اقدار زندگی میں اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ کر رؤسا اور سلاطین کی تقلید سے روک رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ ان کے کہنے میں آکر خدا اور رسول کی بغاوت نہ کرو۔ اس کا روئے سخن صرف عوام کی طرف نہیں خواص کی طرف بھی ہے وہ ججوں اور وکیلوں سے کہہ رہی ہے کہ اگر تم جانتے ہو کہ قرآن میں چور کی سزا قطع ید ہے تو تم اللہ کے اس فیصلہ کو چھوڑ کر اگر ارباب اقتدار کے قانون کے مطابق فیصلے کرتے ہو تو یہ تمہاری جانب سے ارباب اقتدار کو رب بنا لینا ہے اور عوام سے کہتی ہے اگر تم اپنے مقدمات ایسے حکمرانوں کی عدالت میں لے جاتے ہو تو تمہارا یہ عمل ان کو اربابًا من دون اللہ بنانے کے مترادف ہے اور بس۔

اسلام کا چراغ روشن رہے گا

(۳۲) یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنی پھونکوں سے اللہ کی روشنی کو بجھا دیں حالانکہ اللہ نہ رہے گا اپنی روشنی کو پورا کیے بغیر چاہے کافر برا مانیں یعنی توحید خالص اور اسلام کا آفتاب جب چمک اٹھا تو یہ دوغلی باتیں اور مشرکانہ دعاوی کہاں فروغ پا سکتے ہیں یہ کوشش کہ بے حقیقت اور بے مغز باتیں بنا کر اور فضول بحث و جدال کر کے نور حق کو مدھم کر دیں ایسی ہے کہ کوئی بیوقوف منہ سے پھونکیں مار کر چاند یا سورج کی روشنی کو بجھانا یا ماند کرنا چاہے یاد رکھو یہ لوگ خواہ کتنے ہی جلیں مگر خدا نور اسلام کو پوری طرح پھیلا کر رہے گا[1]

سورہ صف میں بھی یہی آیت گرامی ذرا سے فرق کے ساتھ آئی ہے۔ ارشاد ہے۔ یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواههم واللہ متم نورہ اس سورت میں واللہ متم نورہ اور یہاں ویابی اللہ الا ان یتم نورہ۔ یہ تفنن کیوں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ سورہ صف کا زمانہ نزول ۳ھ ہجری ہے یہ وہ وقت ہے جب مسلمانوں کو جنگ احد میں شکست ہوئی اور اسلام کا اقتدار سیاسی صرف مدینے کے چند محلوں تک محدود تھا۔ مسلمانوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی اور سارا

[1] افادات شیخ الاسلام

عرب اس دین کو مٹانے کی فکر میں تھا ایک طرف قبائل اور دوسری طرف یہودی۔

عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم تھا جو تمام قبیلہ پر حکمرانی کرتا تھا اور مال غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو مرباع کہتے تھے۔ اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا کوئی اور عمدہ چیز اس کو پسند آتی تھی اس کو چھانٹ لیتا تھا اس کا نام صفی تھا یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس ہوتا تھا قبیلہ کے تمام معاملات ذاتی نزاعین قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ سے ہوتے تھے۔ یہ رؤسا عام قوم سے بہت سے حقوق میں برتر ہوتے تھے۔

اس لیے عرب میں تمام روسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا ان کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا ہے

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بڑے مضبوط قلعے تھے فن جنگ سے واقف تھے سامان و اسلحہ بھی وافر رکھتے تھے۔ دولت کی بہتات تھی باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا۔ عرب کے تمام مادی ذرائع کے وہ تنہا اجارہ دار تھے۔ اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کے ایک ایک عیب کو طشت از بام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا۔

اس لیے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ بنیاد سے اکھاڑ دے گی۔

عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی حکومتوں کا قبضہ تھا۔ عراق۔ یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کی شمالی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا۔ عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے ان ہی دو میں کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا نعرہ لگاتے تھے۔

اسی لیے عرب میں اسلام کی قوت کا جب ان کو احساس ہوا تو انھوں نے اس کی دار و گیر کرنی چاہی۔ کسریٰ ایران نے یمن کے گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی نبوت کو پکڑ کر ہمارے دربار میں حاضر کرو اور قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری بھی کر دی تھی جس کی وجہ سے تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر حضور اقدس ﷺ کے بعد اسلام کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

اُحد کے معرکہ کے بعد جو زک مسلمانوں کو پہنچی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کی ہوا اکھڑ گئی تھی۔ اور گرد و پیش کے قبائل ان پر شیر ہو گئے تھے ان حالات میں فرمایا۔ واللہ متم نورہ اللہ کے اس نور کو کوئی بجھا نہ سکے گا پوری طرح روشن سورج کی طرح بالفعل روشن ہو کر رہے گا۔ یہ گویا پیشین گوئی تھی کہ عرب قبائل اور یہودی اقتدار ختم ہو کر رہے گا یہ ۳ھ ہجری کی بات ہے یہ ایک صریح پیشین گوئی ہے جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اللہ سبحانہ کے سوا اس وقت کون جان سکتا تھا۔ کہ احد میں شکست کے بعد اسلام کا مستقبل کیا ہو گا۔

یہ پیش نظر آیت سنہ میں نازل ہوئی اور یہ تمام تر امت کے نام دوامی پیام تھا اور احکام سے مقصود پیش آنے والے واقعات تھے اس میں فرمایا ویابی اللہ الا ان یتم نورہ اللہ یہ روشنی پوری کیے بغیر نہ رہے گا یہ قبائل اور یہودیوں کے علاوہ ایران وروم کی طرف اشارہ تھا کہ اسلام کا بول بالا ہو کر رہے گا اور یہ طاقتیں مٹ کر رہیں گی۔

آیئے اب اسی روشنی میں یہ ارشاد نبوت پڑھیے۔ یہ مسند امام احمد کی حدیث ہے اور حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں اسے جگہ دی ہے یہ اس کی صحت کی ضمانت ہے۔

حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اسلام قبول کرلے میں نے عرض کیا میں ایک دین سے تعلق رکھتا ہوں آپ نے فرمایا مجھے تیرے دین کا تیرے سے زیادہ پتہ ہے۔ میں نے کہا کہ کیا میرے دین کو آپ میرے سے زیادہ جانتے ہیں؟ فرمایا ہاں کیا تم فرقہ رکوسیہ سے تعلق نہیں رکھتے ہو۔ اور تم اپنی قوم سے چوتھ بھی لیتے ہو میں نے عرض کیا جی ہاں فرمایا یہ تو تمہارے دین میں تمہارے لیے حلال نہیں ہے۔ میں نے نیازمندانہ طرز عمل اختیار کرلیا آپ نے فرمایا مجھے پتہ ہے کہ تمہارے اور اسلام کے درمیان کیا رکاوٹ ہے یہی نا کہ تمہارا خیال یہ ہے کہ اسلام کو پذیرائی دینے والے وہ عرب اور کمزور لوگ ہیں جن کو عرب نے بھی پرے ہٹا دیا ہے کیا تمہیں حیرہ کا پتہ ہے میں نے عرض کیا کہ میں نے دیکھا نہیں ہے ہاں سنا ضرور ہے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اللہ اس معاملہ کو یعنی اسلام کے اقتدار کو پورا کرکے رہے گا تا آنکہ حیرہ سے ایک کجاوہ سوار عورت روانہ ہوگی۔ بیت اللہ کا بغیر کسی خوف کے طواف کرے گی اور بخدا تم کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے۔ میں نے کہا کہ کسریٰ ابن ہرمز فرمایا ہاں کسریٰ ابن ہرمز تم مال خرچ کرو گے اور لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ عدی کہتے ہیں دو باتیں پوری ہو چکی ہیں بخدا تیسری بھی پوری ہو کر رہے گی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی ہے

اللہ اکبر عرب قبائل، یہ پوری دنیا رومی اقتدار اور ایرانی حکومت سب کی کوشش ہے سب کی خواہش ہے کہ اللہ کی روشنی اسلام کے چراغ کو اپنی مادی طاقت کی پھونکوں سے بجھا دیا جائے۔ یریدون ان یطفئوا نور اللہ بافواھھم مگر اللہ نے فیصلہ فرمایا ہے کہ عرب کے صحرانشین کے ذریعے جن کی ساری زندگیاں اونٹ چراتے بسر ہوئیں تھیں اسلام کا بول بالا کرے اور ایرانیوں اور رومیوں جیسی متمدن قوموں کی قسمتوں کو ان کا مالک بنائے۔

ڈاکٹر فلپ ہٹی اپنی تاریخ عرب میں لکھتا ہے۔

اگر کوئی فرد ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں ایسی پیشین گوئی کی جسارت کرتا کہ دس سال کے اندر اندر عرب کی سراسر غیر متمدن اور غیر متعارف سرزمین سے ایک نادیدہ قوت کا ظہور ہونے والا ہے۔ جو وقت کی

دونوں عالمی طاقتوں سے ٹکرا جائے گی ایک یعنی ساسانیوں کی پوری میراث سنبھال لے گی اور دوسری یعنی بیزنطینوں کے بہترین صوبوں پر قبضہ جمالے گی تو لاریب اسے پاگل قرار دیا جاتا. لیکن یہی صورتحال پیش آئی. پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد عرب کی بنجر اور بے آب سرزمین جادو کی چھڑی سے ایسے سورماؤں کی پرورش گاہ بن گئی. جس کی مثال کیت وکیفیت دونوں کے اعتبار سے کسی دوسری جگہ ملنی دشوار ہے. عراق، ایران شام اور مصر میں خالد بن ولید اور عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مہمیں تاریخ رزم کی ان مہمات میں سے ہیں جنہیں نہایت درخشاں انداز میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا اور ان کا مقابلہ نپولین، ہنی بال یا سکندر کی مہموں سے کیا جائے تو ترجیح کی مستحق قرار پائیں گی [1]

اسلام قرآن اور حضور اقدس ﷺ کے مقابلے میں عرب قبائل اور یہودیوں، رومیوں اور ایرانیوں کی سازشوں کو قرآن نے پھونکیں مارنے سے تعبیر کیا ہے اور یہ بڑی ہی بلیغ تعبیر ہے اسلام اگر اللہ کا دین ہے اور یہی نور اللہ ہے تو اسے ختم کرنے کے لیے دنیا کی ساری مادی طاقتوں کی کوششوں کی حیثیت آفتاب کو پھونکیں مار کر بجھانے سے زیادہ کچھ نہیں ہے بتانا یہ ہے کہ ان کی کوششوں سے خواہ یہ کتنی زیادہ ہوں اسلام کا بال بیکا نہ ہوگا کیوں؟ اس لیے کہ ویابی اللہ الا ان یتم نورہ اس لیے کہ اللہ نے اسلام کا بول بالا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے قرآن نے یہ کہہ کر صحابہ کو دلیری دی تھی۔

حیرت ہے کہ تاریخ کی اس بدیہی اور بے غبار حقیقت کے باوجود شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح میں یہ تکلف کیوں فرمایا کہ:

اللہ کے دینِ حق کی اپنی منہ زبانی باتوں کی سند پر مخالفت کرنا ایسا ہی ہے کہ کوئی سورج کو مٹی کا دیا سمجھ کر اس کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہے۔

اسلام کا سب ادیان پر غلبہ

(۳۳) اسی نے تو اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین الحق دے کر روانہ کیا ہے تاکہ اس کا بول بالا ہو ہر دین پر اگرچہ مشرکوں کو ناگوار ہو. اسلام کا غلبہ باقی ادیان پر معقولیت اور حجت و دلیل کے اعتبار سے یہ تو ہر زمانے میں بحمد اللہ نمایاں طور پر رہا ہے. باقی حکومت و سلطنت کے اعتبار سے وہ اس وقت حاصل ہوا ہے اور ہوگا جبکہ مسلمان اصولِ اسلام کے پوری طرح پابند اور ایمان و تقویٰ کی راہوں میں مضبوط اور جہاد فی سبیل اللہ میں ثابت قدم تھے یا آئندہ ہوں گے اور دین حق کا ایسا غلبہ کہ باطل ادیان کو مغلوب کر کے بالکل صفحۂ ہستی سے محو کر دے، یہ نزول مسیح کے بعد قرب قیامت میں ہونے والا ہے [2]

---

[1] تاریخ عرب

[2] افادات شیخ الاسلام

یہ آیت گرامی مہمات معارف قرآنی میں ہے؟ اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ آیت قرآن میں ایک بار نہیں تین بار آتی ہے ایک بار سورہ صف میں اور دوسری بار سورہ فتح میں اور تیسری بار اس سورت میں یعنی پہلے ۳ھ میں غزوہ احد کے بعد اور ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد اور یہ آیت ۹ھ میں فتح مکہ کے بعد آئی۔ ۳ھ میں غزوہ احد میں شکست کے بعد بتایا کہ جو لوگ اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسروں کی بندگیاں ملاتے ہیں اور اللہ کے دین میں دوسرے دینوں کی آمیزش کرتے ہیں جو اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ پوری کی پوری زندگی اسلام کے تحت قائم ہو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کا رسول اس لیے نہیں آیا ہے کہ کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کر کے ان کے ساتھ مصالحت کرے بلکہ اس لیے روانہ کیا گیا ہے کہ اسلام کو نظام زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کر کے اسے سب پر غالب کرے، مشرکین مزاحمت میں جتنا زور لگا سکتے ہیں لگا لیں رسول کا مقصد پورا ہو کر رہے گا اس اعلان سے احد کے بعد ایک طرف اہل ایمان میں دلیری آئی اور دوسری طرف مشرکین بھی حیران رہ گئے۔

دوسری آیت ۶ھ میں حدیبیہ کی صلح کے بعد نازل ہوئی اس موقعہ پر یہ اعلان پھر دہرایا گیا۔ کیونکہ حدیبیہ میں جب معاہدہ صلح لکھا جانے لگا تھا اس وقت کفار مکہ نے حضور اقدس ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ رسول اللہ کا لفظ لکھنے پر اعتراض کیا تھا ان کے اصرار پر خود حضور ﷺ نے معاہدے کی تحریر سے یہ الفاظ مٹا دیئے تھے۔ اکثر مسلمان معاہدے کی شرطوں پر بہت پریشان تھے۔ اہل ایمان کی اسی پریشانی کو طمانیت و سکون میں تبدیل کرنے اور کفار کو دانت پیسنے کی خاطر یہ ارشاد ہوا کہ غم کی کوئی بات نہیں آپ جو ہدایت اور دین حق لے کر آئے ہیں بول بالا اسی کا ہونا ہے اور اس پر اللہ گواہ ہے۔ اب اس موقعہ پر فتح مکہ کے بعد دنیا کی سپر پاور یعنی رومی حکومت نے اسلام کو آنکھیں دکھانی شروع کیں تو قرآن نے اس اعلان کو یہاں پھر دوہرایا اور بتایا کہ جس دین حق اور ہدایت کو اللہ نے اپنے رسول کو دے کر روانہ کیا ہے وہ اس لیے نہیں آیا ہے کہ یہ کسی دوسرے نظام زندگی کا تابع اور مغلوب کر رہے بلکہ وہ پوری کائنات کے خالق و مالک کا دین حق ہے اور رسول اس کا نمائندہ ہے وہ اس دین حق کو غالب کرنے آیا ہے اگر کوئی دوسرا نظام زندگی دنیا میں ہے بھی تو وہ اس دین حق کے تحت صاغرون بن کر رہے گا یعنی اسلام کی بخشی ہوئی گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا ہوگا۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔

> حضور اقدس ﷺ خلافت عامہ لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔ اور آپ کے دین کا غلبہ تمام ادیان پر بغیر جہاد اور اس کے سامان کے ہو نہیں ہو سکتا جب مسلمان جہاد چھوڑ بیٹھیں گے اور گائے کی دم کے پیچھے پڑ جائیں گے مسلمانوں کو ذلت گھیرے گی اور دوسرے ادیان کا ان پر غلبہ ہو جائے گا۔

اب شاہ صاحب کی عبارت کو بتکرار پڑھیں اور غور کریں کہ کیا کہہ رہے ہیں اور اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں کیا اتارنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ اس آیت قرآنی کی روح ہے۔

یہ آیت ہمیں دنیا کے ادیان کے مقابلے میں اسلام کی حیثیت بتا رہی ہے کہ اسلام ساری دنیا کے لیے ہے. وہی حق اور شر دو نجات ہے. اس کے سوا جو کچھ ہے یا باطل ہے اور یا اللہ کے نزدیک غیر مقبول ہے. اس بات کا ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ اسلام کو ماننے والے اللہ کا دین لے کر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچیں اور اسلام کی راہ میں کسی کو مزاحم نہ ہونے دیں. جن لوگوں کے سینے نہ کھلیں. ان کو اسلام لانے کے لیے ہرگز مجبور نہ کریں. لیکن انہیں اس بات کی بھی اجازت نہ دیں کہ وہ دوسروں کے دلوں اور دماغوں پر پہرے دار بن کر بیٹھ جائیں. ظاہر بات ہے کہ اسلام کو ایسا ماحول اس وقت ہی دستیاب ہو سکتا ہے جب زندگی کا اجتماعی نظام باطل کے ہاتھوں سے چھین کر خود اس کے ہاتھوں میں آ جائے. کیونکہ انسانی معاشرے پر جو نظام مسلط ہوتا ہے وہ لوگوں کے ذہنوں کو بھی اپنے تسلط میں رکھتا ہے. کم از کم اسلام تو یہی کہتا ہے اور جو شخص بھی اسلام کی مذکورہ حیثیت کو سامنے رکھ کر غور کرے گا وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گا اب اگر کوئی دوسرا نظام سیاسی اسلام کے راستے میں رکاوٹ ہے تو اس کے معنے صاف یہ ہیں کہ اسلام کہیں بھی کسی غیر اسلامی نظام حیات کو نافذ رہنے کا حق دار تسلیم نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ اقتدار اس کے ہاتھ میں ہو. اور جہاں بھی اس کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے وہاں طاقت استعمال کی جائے چنانچہ قرآن جہاں ایک حد تک دفاعی جہاد کی تاکید پر تاکید کرتا رہا وہاں اس وداعی پیام یعنی سورہ برارت میں اُس نے آخری نشانہ یہ بتایا کہ:

یظھرہ علی الدین کلہ

ضمیر کا مرجع چاہے دین الحق کیونکہ ضمیر کا مرجع قریب ہو تو زیادہ اچھا ہے. اور اسی میں معنویت ہے کہ جس دین حق کو رسول لے کر آیا ہے اللہ اس کو سب ادیان پر غالب کرے گا. اور اگر ضمیر کا مرجع رسول کو قرار دیا جائے اور مطلب یہ بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو سارے دین سے باخبر کرے گا تو اس میں کوئی معنویت نہیں ہے کہ دین تو سارا ہی رسول لے کر آیا ہے اور وہ اس سے پہلے بھی باخبر ہے پورے ٢٢ سال کے بعد اس کہنے میں کوئی معنویت نہیں ہے. اگرچہ اس تشریح کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف کی گئی ہے لیکن محققین نے اسے قابلِ ذکر نہیں سمجھا ہے.

بہرحال آیت میں سارے دینوں پر اسلام کے غالب کرنے سے مراد صرف نظریاتی غلبہ نہیں بلکہ اس کے ساتھ سیاسی غلبہ بھی ہے. اسی وجہ سے اس کے بعد والی آیت میں یہ کہہ کر اسلام کو غالب کرنے کی تدبیر بتائی گئی ہے.

قاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ

اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قتال اور جہاد کو کبھی ختم نہ ہونے والی ضرورت اور ذمہ داری بتاتے ہوئے امت کو خبردار کیا ہے.

الجھاد ماض منذ بعثنی اللہ الی ان یقاتل آخر امتی الدجال لایبطلہ جور جائر ولا عدل عادل.

جہاد میرے وقت سے لے کر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک میری امت کا آخری فرد دجال سے نہ لڑے۔
یہ جہاد نہ تو کبھی کسی ظالم امیر کے ظلم کی وجہ سے ساقط ہو گا اور نہ کسی عادل امیر کے عدل کی وجہ سے۔
حضور اقدس ﷺ نے اپنے آخری دور میں اور خلفائے راشدین نے اپنے زمانوں میں عرب سے باہر کے حکمرانوں کو جو دعوت اسلام نے دی اور ان کے انکار پر جس طرح طاقت کے ذریعے انہیں اسلامی اقتدار کا تابع فرمان بنایا وہ اسی غرض کے تحت دفاعی نہیں بلکہ اقدامی جہاد تھا۔

اقدامی جہاد کی وضاحت

اقدامی جہاد کے بارے میں جس کا یہ آیت قرآنی مطالبہ کر رہی ہے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ:

اولاً۔ اس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے کیونکہ اسلام کا تعلق دل سے ہے اور دل جبر سے کبھی معتقد نہیں ہوتا قرآن میں یہ بات کھول کر اور واضح کی گئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ اس کے بندوں میں کوئی گمراہ نہ ہوتا تو وہ ان کو پیدا ہی مومن بنا کر کرتا یا پیدا کرنے کے بعد جبراً مومن بنا دیتا فلو شاء لھداکم اجمعین یا ولو یشاء اللہ لھدی الناس جمیعًا۔ لیکن چونکہ انسان جس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس کے پیش نظر یہ جبری اسلام کسی طرح صحیح نہ تھا اس لیے اس نے ایسا نہیں کیا چنانچہ اس کا صاف اعلان ہے لا اکراہ فی الدین ایسی حالت میں وہ اس بات کو کیسے صحیح قرار دے سکتا تھا کہ اگرچہ اسلام کے معاملے میں میں نے جبر نہیں کیا ہے تو مسلمانو تم جبر کرو۔ یہ اعلان تو صاف بتاتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے لیے جبر کسی حال میں نہ کیا جائے گا۔ نہ پیدائشی طور پر نہ خارجی اور سیاسی طور پر۔ اس معاملے میں ہر انسان کے لیے آزادی ہے۔ چاہے تو قبول کرے چاہے تو نہ کرے۔

ثانیاً یہ کہ کسی قوم کو آقا اور دوسری قوم کو اس کا غلام بنانے کی مہم نہیں ہے یعنی جس چیز کو استعماریت یا سامراج کہا جاتا ہے اس سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے اس کے برخلاف یہ کچھ ایسی بنیادی صداقتوں کی صرف سیاسی بالادستی تسلیم کرانے کی مہم ہے جن پر اس پوری کائنات کا نظام قائم ہے اور جن کے تسلیم کرنے پر انسان کی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح موقوف ہے۔ پھر جو لوگ دوسروں سے ان بنیادی صداقتوں کی صرف سیاسی بالادستی تسلیم کرانے اٹھے ہوئے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود ان کی کلی بالادستی مانے ہوئے ہیں۔ سوچیئے جو گروہ خود سب سے بڑے آقا سب سے مکمل غلام کی حیثیت رکھتا ہو وہ کسی دوسرے کو کیا اور کیسے اپنا غلام بنائے گا۔ اس کے علاوہ دوسروں سے ان بنیادی صداقتوں کی یہ جزوی بالادستی بھی وہ اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں بلکہ خود انہیں کے فائدے کے لیے تسلیم کراتے ہیں وہ ان سے کچھ لیتے نہیں بلکہ ان کو کچھ دینے کی ضرور کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں وہ انہیں اس حق کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں جس میں ان کی

دونوں جہانوں کی مسرتیں چھپی ہوئی ہیں۔ بلاشبہ ان کی حمیت کو یہ سیاسی محکومی ناگوار ہوگی لیکن یہ حمیت ایک غلط قسم کی حمیت ہوتی ہے اور خود ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہوتی ہے اس لیے ہرگز کسی توجہ کی مستحق نہیں ہے۔

شارحین قرآن نے بالعموم اس آیت میں سیاسی غلبہ نہیں بلکہ نظریاتی غلبہ مراد لیا ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ غلبہ دلیل اور حجت کا ہے بالحجۃ والبراھین شوکانی لکھتے ہیں کہ اسلام کا غلبہ دلائل، معجزات اور ان قوانین کے ذریعے ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے بنائے ہیں من البراھین والمعجزات والاحکام۔ امام رازی رقم طراز ہیں کہ کسی چیز کی دوسری پر برتری کبھی دلیل کے ذریعے ہوتی ہے۔ کبھی کثرت اور بہتات سے اور کبھی استیلا اور دبدبہ سے اور آگے فرماتے ہیں کہ اسلام کا نظریاتی غلبہ جانا پہچانا ہے۔ ظھور ھذا الدین بالحجۃ مقرر معلوم۔

حالات کی تبدیلی سے شرح و تفسیر میں تبدیلی رونما ہو جاتی ہے دراصل خود بدلتے نہیں ہیں۔ کوشش یہ کرتے ہیں کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اتار کر اپنی پستیوں سے ہمکنار کر لیں۔ مسلمانوں کی بدعملی سے سیاسی اقتدار چھن کر در غلامی آیا تو قرآن کی تفسیر پر اس کا اثر پڑا ہے۔ ورنہ آیت کی اصل تشریح وہ ہی ہے جو حافظ ابن کثیر، حافظ ابن جریر اور محققین نے اختیار کی ہے کہ دنیا کے تمام موجود نظاموں کے مقابلے میں اسلام کا بول بالا کرے گا اور یہ حقیقت بالکل بے غبار ہے جیسا کہ الجصاص نے لکھا ہے:

جو کچھ بتایا گیا تھا ویسا ہی کچھ ہوا حضور اقدس ﷺ کی امت کا مخالف اسلام قوموں کے مقابلے میں بول بالا ہوا۔ اس واقعہ میں حضور کی نبوت کی قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی کھلی شہادت ہے۔

یہ اشاعت و غلبہ اسلام کی ایک زبردست پیشین گوئی ہے اور وہ پوری ہوئی اسلام نے دنیا پر اس طرح کامیاب حکومت کی کہ اس کے سامنے تمام متمدن حکومتوں کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ اس سے بڑھ کر پیشین گوئی کی صداقت اور کیا ہو سکتی ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ
أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۗ
وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا
فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُحْمَىٰ
عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَ
ظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾

اے اہل ایمان بہت سے علماء اور مشائخ کھاتے ہیں لوگوں کے مال ناجائز طور پر اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں[۳۴]۔ اور جو سونے اور چاندی کو ذخیرہ بناتے ہیں اور راہ خدا میں اسے خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دیجئے[۳۵]۔ یہ عذاب اس روز ہوگا جس دن سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیوں پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا یہ ہے جو تم نے ذخیرہ کیا تھا اپنے لیے۔ اس ذخیرہ کا مزہ چکھو[۳۶]۔

مفردات کے معانی

الاحبار۔ یہ جمع حبر کی ہے قرطبی فرماتے ہیں کہ حبر وہ ہے کہ جس کی گفتگو میں حسن، نظم اور اتقان ہو۔ اسی سے پھولدار کپڑے کو محبر کہتے ہیں اسی سے تحبیر کے معنے سجانا خوبصورت بنانے کے ہیں۔ ابو موسیٰ اشعری خوش آواز تھے نماز میں تلاوت قرآن کر رہے تھے۔ حضور اقدس ﷺ سن رہے تھے۔ انھوں نے نماز سے فراغت حاصل کی تو حضور نے ان کو شاباش دی اور فرمایا کہ ابو موسیٰ اللہ نے تجھے تو مزامیر داؤد سے مزمار دیا ہے! ابو موسیٰ نے خوش ہو کر کہا اگر مجھے پتہ ہوتا کہ یارسول اللہ

آپ سن رہے ہیں تو بجبورت تجبیر اخوب بنا سنوار کر پڑھتا۔ احبار کے واحد میں اختلاف ہے کچھ حبر بکسر الحاء کہتے ہیں اور کچھ حبر بفتح الحاء بتاتے ہیں۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ مفسرین قرآن بفتح الحاء کہتے ہیں اور اہل لغت بکسر الحاء۔ ابن السکیت نے دونوں میں فرق بتایا ہے کہ حبر بالکسر روشنائی اور بالفتح عالم کو کہتے ہیں۔ آلوسی فرماتے ہیں کہ عالم کو کہتے ہیں چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

الرھبان۔ جمع راہب کی ہے راہب رہبتہ سے ہے جس کے معنے ڈر ہیں رھب یرھب کا مصدر ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ حمیری زبان میں رہب آستین کو کہتے ہیں۔ اصمعی کا بیان ہے کہ میں نے ایک اعرابی کو کہتے سنا اعطمانی رھبك جو تیری آستین میں ہے دے دے رھبان زاہدان اہل کتاب کو کہتے ہیں قرطبی کہتے ہیں راہب وہ ہے جس میں لوگوں سے ہٹ کر محض اللہ کے ڈر سے اخلاص نیت ہو۔ اس کے اوقات اس کے کام اور اس کا لگاؤ صرف اللہ سے ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہ رھبان عابد اصحاب صومعہ نشین ہیں اس کا واحد راہب ہے جیسے فارس اور فرسان راکب اور رکبان اور کبھی رہبان ہی واحد ہوتا ہے اس کی جمع رہابین آتی ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ رہبان واحد اور جمع دونوں آتے ہیں۔ جو اس کو واحد قرار دیتے ہیں وہ اس کی جمع رہابین بناتے ہیں اور رہبانیۃ زیادہ مناسب ہے اسی سے رہبانیت ہے فرط خوف سے عبادت کی بجا آوری میں غلو کرنے کا نام ہے افادالراغب علامہ زمخشری فرماتے ہیں۔ راہبوں کا فعل رہبانیت ہے پیاپے بغیر افطار روزے رکھنا، ٹاٹ پہننا، گوشت نہ کھانا وغیرہ ــــــ یکنزون جمع کرتے ہیں۔ رکھنا کرتے میں اسی سے اکتناز ہے عربی میں اس اونٹنی کو جس کا گوشت سمٹا ہوا ناقہ کناز اللحم کہتے ہیں۔ کنز کے لیے مدفون ہونا شرط نہیں ہے۔

ناجائز دولت اور اس کا ذخیرہ

پہلی آیات میں یہودیوں اور عیسائیوں کا ذکر تھا کہ وہ اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنائے ہوئے ہیں۔ یہاں اب احبار و رہبان کا بھرپور چہرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اور بتایا جا رہا ہے کہ جن کے پیچھے لگ کر عوامی زندگی خدا سے بیگانہ ہو چکی ہے خود ان کا کردار کیا ہے؟ عدالت کے سارے دیوانی و فوجداری مسائل کی ذمہ داری یہودیوں میں احبار اور عیسائیوں میں رہبان پر تھی۔ بلکہ دنیا میں بچاؤ اور آخرت کی ساری قانونی اتھارٹی وہی تھے۔ قانون سازی بھی ان کا کام تھا اور حکومت کی وساطت سے قانون کا نفاذ بھی وہی کرتے تھے۔ یعنی وہ صرف مسائل میں دینی رہنما نہ تھے بلکہ قانون سازی، دیوانی، فوجداری جرائم میں سزا دینا۔ اور دینی زندگی میں گناہ پر تعزیری کارروائی کرنا ان کا کام تھا۔ گویا عوام کی پوری زندگی ان کی گرفت میں تھی۔ چاہے روحانی ہو یا معاشی، سیاسی ہو یا اخلاقی، معاشرتی ہو یا قانونی، زندگی کے ہر گوشے پر ان کی حکمرانی تھی اس کے ساتھ

ان کا کام یہ تھا کہ اللہ کے دین کی ساری باتوں کو یک قلم دوکانداری اور پیشہ بنالیا تھا یعنی دیندار نہ تھے بلکہ دین کو بطور فن اپنائے ہوتے تھے اور پھر دین کو پیشہ بنائے ہوئے تھے اور ان کی پوری زندگی ہر معنے میں دکانداری کی زندگی ہوگئی تھی احبار و رہبان ہونے کے معنے بھی یہ ہو گئے تھے کہ اللہ و رسول کے نام سے پیشہ کی روٹی کھانے والے، علم دین کا پڑھنا پڑھانا دین کی تعلیم، مقدمات کے فیصلے معاشرتی زندگی کے تقاضے، دین کی دعوت ہدایت قرارت ذکر کوئی کام ایسا نہ تھا کہ بغیر اجرت کے کیا جاتا ہو۔ قانون کو توڑ مروڑ کر یا طرح طرح کے حیلے نکال کر ایسی صورتیں نکال لیتے جس سے ان کا الو سیدھا ہو جائے۔ قرآن نے یہاں چند جملوں میں نہیں بلکہ چند لفظوں میں ان کا ان کی پوری زندگی کا بھرپور چہرہ پیش کر دیا ہے اور یا ایہا الذین اٰمنوا سے آغاز کر کے اشارہ کر دیا کہ مسلمانو تم بھی اس آیئنے میں اپنا چہرہ دیکھتے رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی ان کے قدم بقدم چل پڑو۔

(۳۴) اے اہل ایمان بہت سے علماء اور مشائخ کھاتے ہیں لوگوں کے اموال ناجائز طور پر ۔ اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں یعنی روپیہ لے کر احکام شرعیہ اور اخبار الٰہیہ بدل ڈالتے ہیں ادھر عوام الناس نے انہیں جیسے پہلے گذر اخدائی کا مرتبہ دے رکھا ہے جو کچھ یہ علماء و مشائخ غلط سلط کہہ دیں وہ ہی ان کے نزدیک حجت ہے۔ اسی طرح یہ علماء و مشائخ نذرانے وصول کرتے رہتے ہیں اور اپنی سیادت و ریاست قائم رکھنے کے لیے عوام کو مکر و فریب کے جال میں پھنسا کر راہ حق سے روکتے رہتے ہیں کیونکہ عوام اگر ان کے جال سے نکل جائیں اور دین حق اختیار کر لیں تو ساری آمدنی بند ہو جائے یہ حال مسلمانوں کو سنایا تاکہ متنبہ ہو جائیں کہ امتوں کی تباہی اور خرابی کا بڑا سبب تین جماعتوں کا بے راہ ہونا اور اپنے فرائض کو چھوڑ دینا ہے علماء، مشائخ اور اغنیاء ان میں سے دو کا ذکر ہو چکا تیسری جماعت رؤساء کا ذکر آگے آتا ہے عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے۔

وھل افسد الدین الا الملوک واحبار سوء و رھبانھا[1]

یہ آیت اس اعتبار سے بجد اہمیت رکھتی ہے کہ اس کی پیشانی پر یا ایہا الذین اٰمنوا لگایا گیا ہے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا ایمان سے محروم ہو جانا اللہ کی کتاب اور اس کے رسول سے بیگانہ ہو جانا اور قانون الٰہی کو زندگی میں عملاً چھوڑ دینا دراصل ان کے علماء مشائخ کی گمراہیوں اور دنیا پرستیوں کا نتیجہ تھا۔

شاہ ولی اللہ محدث نے فوز الکبیر میں یہ بات بہت ہی وزنی لکھی ہے کہ:

اگر احبار یہود کی حالت دیکھنی چاہتے ہو تو آج کے علماء کو دیکھ لو اور اگر عیسائیوں کے مشائخ کا نقشہ بنانا چاہتے ہو تو آج کل کے مشائخ کے سامنے بیٹھ کر کھینچ لو۔

یہاں حضرت مولانا ابوالکلام کا تبصرہ اس آیت پر بہت شاندار ہے اس لیے ہم معالم القرآن پڑھنے والوں کی ضیافت طبع کے لیے مولانا کا تشریحی نوٹ کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی حلقوں اور اداروں کی تاریخ اب منضبط ہو چکی ہے اس پر نظر ڈالی جائے تو بے شمار باتیں سامنے آئیں گی لیکن خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

۱۔ بادشاہوں اور امیروں کی مطلب برآری کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتے تھے اور انعام و اکرام حاصل کرتے۔ حلال کو حرام یا حرام کو حلال بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ شریعت کے کسی حکم کا انکار کر دیتے بلکہ یہ ہے کہ اس کے حکموں کو توڑ مروڑ کر ایسی صورتیں نکال لیتے کہ امیروں کی ہوائے نفس پوری ہو جائے۔

۲۔ ناجائز کھانے کی ایسی صورتیں نکال لیتے کہ فلاں جماعت کافروں کی جماعت ہے ان کا مال دھوکے اور فریب سے بھی کھا لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ثواب ہے۔

۳۔ معاملات و مقدمات میں رشوت لے کر فیصلے کرتے۔

۴۔ راہبوں میں جو شخص زیادہ شہرت حاصل کر لیتا۔ لوگوں کی اس سے عقیدت وابستہ ہو جاتی۔ وہ ان سے طرح طرح کی نذریں وصول کرتا۔

۵۔ تمام مذہبی اعمال و رسوم کے لیے باقاعدہ قیمتیں مقرر تھیں اور اس غرض سے کہ آمدنی کے وسائل زیادہ بڑھیں۔ ہمیشہ نئی نئی رسمیں اور نئی نئی تدبیریں نکالتے رہتے نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی زندگی کے تمام اعمال خرید و فروخت کی چیز بن گئے۔

۶۔ کتاب اللہ کے علم و تعلم کو صرف اپنے ہی حلقہ کے لیے مخصوص کر لیا کہ یہ عوام کے سمجھنے کی چیز نہیں۔ صرف سن کر تبرکاً ثواب کما لینے کی چیز ہے۔

۷۔ عوام میں یہ اعتقاد پیدا کر دیا کہ نجات کا سر رشتہ ان ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

۸۔ جلب زر کا یہ طریقہ نکالا کہ مغفرت کے پروانے فروخت ہونے لگے۔

۹۔ طرح طرح کے تبرکات و آثار بنائے تھے لوگ ان کی زیارت کرنے اور مقررہ نذریں ادا کرتے۔

۱۰۔ مقابر اور مشاہد کی مجاوری بھی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ اس راہ سے وہ دنیا کی ایک دولت سمیٹتے تھے۔

۱۱۔ جو مر جائے اسے ثواب پہنچانے کے لیے مقررہ رقمیں وصول کرتے اور اس غرض کے لیے طرح طرح کی رسمیں رائج کر دی تھیں۔

دراصل اس آیت میں احبار و رہبان کے دو سنگین جرم بتائے ہیں ایک اکل اموال الناس بالباطل۔ دوسرا صد عن سبیل اللہ

آیت میں لام بتا رہا ہے کہ یہ حضور اقدس ﷺ کے زمانہ کے علماء اور رہبان کا کردار تھا کیونکہ مضارع پر لام ولفظ

ہو کر اسی طرح حال کے معنے دیتا ہے جیسے مضارع پر س یا سوف داخل ہو کر استقبال کے معنے دیتا ہے۔

قرآن نے اکل اموال بالباطل ان کا سب سے بڑا جرم نمایاں کیا ہے چونکہ یہ ان کا معاشی جرم ہے اس لیے قرآن یہ فردِ جرم ان پر لگا کر ایک اہم معاشی مسئلہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے یاکلون اموال الناس بالباطل لے رہے ہیں لوگوں کے مال باطل کی راہ سے۔ لینے کو کھانے سے تعبیر کرنا علامہ آلوسی کی رائے میں مجاز مرسل ہے دونوں میں تعلق یعنی کھانے اور لینے میں علت و معلول یا لازم و ملزوم کا ہے اور اگر اموال سے مراد ہی کھانے ہوں تو دوسری بات ہے بہر حال کچھ ہو باطل کی راہ سے کھانا یا لینا ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ دیئے بغیر لوگوں کا مال لیتے ہیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بدن کا ہر عضو اپنی جگہ جسمانی مشین کی خدمت انجام دے رہا ہے اور اگر ایسا نہ کرے تو اسی وقت اس عضو کو بدن سے جدا کر دیا جاتا ہے اسی طرح امت میں جماعتی جسم کا فرد حصہ بن کر جینے کا حق اسی وقت ہوتا ہے کہ جس طرح یہ دوسرے فرد سے فائدہ اٹھا رہا ہے اسی طرح بلا ریب اس کو اپنی صلاحیت کے مطابق دوسروں کو بھی نفع پہنچانا چاہیے خواہ صورت کوئی ہو۔ ظاہر ہے کہ معاشی نظام بھی لینا اور دینا ہے۔ مثلاً کاشت کار غلہ دیتا ہے پارچہ باف کپڑا بنتا ہے۔ ڈاکٹر علاج کرتا ہے۔ استاذ علم تقسیم کرتا ہے یہ سب کچھ دے کر لے رہے ہیں لیکن یہ احبار و رہبان غریب عوام کو لینے کے معاوضہ میں کیا دے رہے ہیں؟ مادی شکل میں نہ سہی کسی اور شکل میں ذہنی، عقلی، روحانی فوائد میں سے کسی فائدے کی شکل میں ان کو کیا دیتے ہیں۔ قرآن بتا رہا ہے کہ سب کا نہیں بلکہ اکثریت کا یہی حال ہے کہ کسی کو کچھ نہیں دیتے ہیں اکل اموال الناس بالباطل کی اس سے زیادہ بدترین شکل اور کیا ہو سکتی ہے۔ چور بھی کچھ دیئے بغیر لوگوں سے لیتا ہے۔ سود خوار بھی کچھ دیئے بغیر لیتا ہے لیکن احبار و رہبان کی چوری اور نفع اندوزی کو مجرم چور کی چوری سے کیا نسبت ہے؟

یہ تو احبار و رہبان کی اکثریت کے معاشی جرم کا ذکر ہے۔ اگلے فقرہ میں حصول معاش کے اس غلط ذریعہ کو اختیار کر لینے کی وجہ سے جن ایمانی شرارتوں کی یہ جولانگاہ بنے ہیں ان کا ویصدون عن سبیل اللہ میں ذکر ہے عرب عوام کو دین سے بے بہرہ رکھ کر یہ لوگ اللہ کی سیدھی راہ سے عوام کو روکتے اور بھٹکاتے ہیں۔ اور بھٹکانے کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اس کی تفصیل آپ مولانا آزاد کے تشریحی نوٹ میں پڑھ چکے ہیں۔

ایک خاص مسئلہ پر ضروری تنبیہہ

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ایک غلط فہمی کو دور کر لیجئے۔ یاکلون اموال الناس بالباطل کے معنے ہیں کہ احبار و رہبان کچھ دیئے بغیر لوگوں کا مال لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہی احبار و رہبان کچھ دے کر لوگوں سے مال لیں اور بجائے لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنے کے اللہ کا راستہ بتائیں تو قرآن کو ان کے اس عمل پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس لیے

جبار و رہبان کا جو طبقہ اہلِ ایمان کی جماعت کو بذریعہ تعلیم، تہذیب، تدریس، تالیف و تصنیف یا وعظ و تذکیر یا کسی اور ذریعہ سے واقعی نفع پہنچا رہا ہے اور اس میں اپنا قیمتی وقت خرچ کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں اگر ان کو عوام کی جانب سے کچھ امداد ملتی ہے تو بلا ریب یہ امداد اکل اموال الناس بالباطل میں داخل نہیں ہے۔ حضور اقدس ﷺ سے بھی بڑا نمونہ کوئی ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نبوت سے پہلے آنحضور ﷺ نے گلہ بانی بھی کی ہے اور تجارت بھی۔ لیکن سوال نبوت سے پہلے کا نہیں منصبِ نبوت پر سرفرازی کے بعد کا ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفوس کے کاموں کے علاوہ کبھی کسی معاشی مشغلہ میں مشغول ہوئے ہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دولت ان کی زندگی میں ختم ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ طائف کے رئیس نے حضور ﷺ کی غربت کو بھی انکار نبوت کی دلیل بنایا تھا۔ ہجرت کے بعد جب مدینہ تشریف لائے اور کچھ روز کے بعد وہ سب آ گئے جن کے اخراجات کا بار حضور ﷺ پر تھا۔ جن میں آپ کے مولیٰ زید اور آپ کی دائی کھلائی ام ایمن بھی تھیں تو جب تک اسلامی فتوحات کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ آخر خود حضور ﷺ اور آپ کے اہل و عیال کا گزر بسر کا ذریعہ کیا تھا۔ سیرت نگاروں نے اگرچہ اس کا ذکر نہیں کیا تو کیا بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت موجود نہیں ہے کہ:

کان الرجل یجعل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم النخلات حتی افتتح قریظۃ والنضیر

یعنی جب قریظہ اور بنی نضیر کی جائداد نہ ملی تھی تو دستور یہی تھا کہ حضور اقدس کے لیے کھجور کے کچھ درخت مخصوص کر دیتے تھے۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ ہجرت کے بعد چار پانچ سال تک حضور اقدس کے مرید یا تلامذہ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم خدمت کی اس سعادت سے سرفراز ہوتے رہے۔ مختلف روایات میں انصار کی خدمت کا تذکرہ حدیث کی کتابوں میں موجود ہے بلکہ صدقہ نہ لینا اور ہدیہ قبول کرنا کچھ صحابہ نے اسی کو نبی شناسی کا پیمانہ بنایا۔ سلمان فارسی کا حال پڑھیے۔ شہدائے احد میں مخیریق نامی صحابی جو یہودی سے مسلمان ہوئے تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ میں اور علامہ ابو القاسم السہیلی نے الروض الانف میں لکھا ہے کہ ان صحابی نے ایک باغ نہیں بلکہ سات باغ حضور اقدس ﷺ کو دیئے تھے کہ جو چاہیں کریں۔ ان باغوں کے نام یہ تھے برقہ[1]، دلال[2]، صائفہ[3]، حسنی[4]، الاعراف[5]، المثبت[6]، مشربہ[7] ام ایمن۔ مخیریق جب احد میں شہید ہو گئے تو حضور اقدس ﷺ نے ان باغوں کو وقف کر دیا تھا اور لکھا ہے کہ یہ اسلام میں سب سے پہلا وقف تھا۔ آخری باغ میں ایک بنگلہ تھا حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا یہاں رہتی تھیں۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ صدقات نہیں ہدیوں کی صورت میں جو عوام کی جانب سے ان بزرگوں کو کچھ فتوحات ملتی ہیں اگر وہ ان فتوحات کے لینے سے انکار نہیں کرتے ہیں جبکہ وہ قدر ضرورت سے زائد آمدنی کو اشاعت اسلام تاسیس مدارس میں اور نشر کتب

میں خرچ کر رہے ہوں تو ان کے سامنے نبوت کا یہی نمونہ ہے

اکتناز مال کی ممانعت

(۳۵) اور جو سونے اور چاندی کو ذخیرہ بناتے ہیں اور راہ خدا میں اسے خرچ نہیں کرتے ہیں ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے جو لوگ دولت اکٹھی کریں خواہ حلال طریقے سے ہو مگر خدا کے راستہ میں خرچ نہ کریں مثلاً زکوٰۃ نہ دیں اور حقوق واجب ادا نہ کریں ان کی یہ سزا ہے تو اسی سے ان احبار و رہبان کی سزا معلوم کر لو جو حق چھپا کر یا بدل کر روپیہ بٹورتے ہیں اور ریاست قائم رکھنے کی حرص میں عوام کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں بہر حال دولت وہ اچھی ہے جو آخرت میں وبال نہ بنے لہ

شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح تو کی ہے لیکن اس آیت کا پہلی آیت سے پیوند نہیں بتایا۔ اس کا تو سب اقرار کرتے ہیں کہ یہ الذین کی وجہ سے مستقل قسم ہے یہ الاحبار والرھبان کی صفت نہیں ہے چنانچہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

یہ تیسری قسم کا ذکر ہو رہا ہے لوگ علماء مشائخ اور سرمایہ داروں ہی کے دست نگر ہوتے ہیں علماء مشائخ اور دولت مند۔ ان میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو عام زندگی بگڑ جاتی ہے۔

مگر یہ سوال یہاں بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کا اس موقعہ پر ذکر جو دولت کا ذخیرہ کرتے رہتے ہیں اور اللہ کے بتائے ہوئے مصارف میں خرچ نہیں کرتے جہاں احبار و رہبان کی بات ہو رہی ہے کیوں ہے؟ کیا ان دونوں یعنی علماء مشائخ ــــ اور سرمایہ داروں میں کوئی مناسبت ہے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ احبار و رہبان کی زندگی بسر کرنے والوں کی اکثریت جس طرح خداداد توانائیوں کے سرمائے کو پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ سال تک یوں ہی ضائع کرتی رہتی ہے اور اپنی انفرادی قوتوں سے جماعت کی کوئی خدمت نہیں کرتی۔ اسی طرح دولت مند اپنی زائد از ضرورت آمدنی والے سرمایہ کو بجائے نفع پہنچانے کے کنز بنا بنا کر اس کے افادی پہلوؤں کو ضائع کرتے رہتے ہیں۔ دونوں طبقوں میں یہی اشتراکی مناسبت ہے کون کہہ سکتا ہے کہ آخرت والی زندگی میں جن سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں احبار و رہبان کا حصہ نہ ہوگا جب دونوں کے جرموں کی نوعیت میں ہم آہنگی ہے تو کیا سزا کی نوعیت میں تناسب نہ ہوگا۔ بلکہ جرم کی سنگینی میں احبار و رہبان سرمایہ داروں سے بھی آگے ہیں کیونکہ دولت مند اگر کسی کو اپنی مالی توانائی سے فائدہ نہیں پہنچاتے تو کچھ دیئے بغیر کسی کا مال بھی نہیں کھاتے لیکن احبار و رہبان کی اکثریت تو اکل اموال الناس بالباطل کے جرم میں بھی مبتلا ہے۔ اس لحاظ سے احبار و رہبان کے معاشی جرم بھی دولت مندوں کے جرم سے زیادہ سنگینی ہے۔

ایک تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ

یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ دولت مندوں کے ذکر میں ایک تاریخی حقیقت کی طرف اشارا ہو۔ زمانہ نزول قرآن کی تاریخ

پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ اور ہندوستان کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ ہے جس میں نام نہاد مذہبی پیشواؤں نے مختلف ترکیبوں سے عوامی زندگی کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے ایسے داؤ بنا رکھے تھے کہ ان کی گرفت سے وہ کسی طرح باہر نہیں ہو سکتے تھے یورپ یا تو جیسا کہ پڑھ چکے ہو کہ اعترافِ جرم کا ایسا ہتھکنڈہ مذہبی پیشہ وروں کو مل گیا تھا کہ جو شخص پادری کے سامنے اپنے گناہ کا اقرار کر لیتا اسے بخشش کا پروانہ مل جاتا۔

سربراہانِ مملکت ان ہی احبار و رہبان کے نیچے اس طرح دبے ہوئے تھے کہ گویا ان کے فرمان کی خلاف ورزی حکومت سے دست برداری کے مترادف تھی۔ خدا کی رحمت کا عام بیوپار احبار و رہبان کے پیدا کردہ نظام میں اس قدر عام تھا کہ آٹھ آنے دس آنے سیر خدا کی رحمت ان سے خریدی جا سکتی تھی۔

آسمان پر رحمت کا دروازہ صرف اس کے لیے کھولا جاتا جس کے لیے یہ احبار و رہبان زمین پر کھولتے تھے۔ یہ اور اس قسم کی سینکڑوں ترکیبیں تھیں جن کے ذریعے عوام کی کمائی پر احبار و رہبان اور ان کے ایجنٹوں کا پورا اقتدار قائم تھا ان مانے طور پر جس کسی سے جس قدر اور جس وقت چاہتے تھے عیسائی مذہب کے یہ احبار و رہبان وصول کر لیتے تھے۔

نتیجہ یہ تھا کہ گرجوں اور چرچوں کے خزانے شاہی خزانوں سے کہیں زیادہ وسیع ہو چکے تھے۔ معمولی معمولی گرجوں میں لاکھوں کی دولت بصورت کنز رہتی تھی۔ مشہور واقعہ ہے کہ ہرقل کو ایرانیوں کے مقابلے میں جب فوجی مصارف کی ضرورت پیش آئی اور شاہی خزانہ ان کی پابجائی میں ناکافی ثابت ہوا تو بادشاہ روم کو قرض کی صورت میں سب سے بڑی مالی امداد ان ہی احبار و رہبان سے ملی۔ بالکل یہی حال ہندوستان میں برہمنوں، سادھوؤں، یوگیوں اور جوگیوں کا تھا۔ محمود غزنوی کو سومنات میں جو غیر معمولی سرمایہ ملا تھا۔ وہ ہندو مذہب کے احبار و رہبان کی ذخیرہ کی ہوئی دولت تھی۔ اس زمانے میں بھی جب اشتراکیوں نے زار روس کی حکومت پر قبضہ کیا تو اشتراکیوں کو سرمایہ کی غیر معمولی مقدار روس کے گرجوں ہی سے ملی۔

بہرحال تاریخ کے ان واقعات کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد دونوں آیتوں کی باہمی مناسبت کا کچھ سراغ ضرور ملتا ہے

اِسلام کے مذہبی خُدّام کی خصُوصیّت

شاید قرآن کے اسی تہدیدی انداز کا اثر ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی خدمات انجام دینے والے طبقوں کا ایک بڑا گروہ باوجودیکہ وہ مسلمانوں کی دینی خدمت میں اپنا زیادہ وقت اخلاص اور دیانت و امانت سے صرف کرتا تھا اور اس کام کی وجہ سے جو امداد ان کو مسلمان عوام یا اسلامی حکومت کی جانب سے ملتی تھی یہ اکل بالباطل نہ تھا یعنی کچھ دیئے بغیر دوسروں کا مال لینا نہ تھا لیکن قرآن کی ان ہی دھمکیوں سے وہ اتنے مرعوب تھے کہ اس کا لینا بھی وہ پسند نہ کرتے تھے اور اپنی معاشی ضرورتوں کے لیے دوسرے کام کرتے تھے یہ جو آپ فقہائے احناف میں دباغ، خیاط، نداف، صداد، حلوائی، قدوری جیسے الفاظ

دیکھتے ہیں تو ان کا مطلب یہی تو ہے کہ یہ بزرگ دین کی خدمت کرتے ہوئے یہ کام کرتے تھے اور خدمت دین کی کوئی اُجرت نہ لیتے تھے آپ فقہائے احناف شوافع، حنابلہ اور موالک پر لکھی ہوئی طبقات پر کتابیں پڑھیں بلکہ محدثین کے اقوال پر لکھے ہوئے تذکرے پڑھیں ہر جگہ آپ کو پیشہ کی نسبت ملے گی۔

ان فقہاء کا یہ حسن کہ دین کی خدمت پر کوئی اجرت نہ لیتے تھے بلکہ زندگی چلانے اور گذارنے کے لیے کاروبار کرتے تھے اکبر کے زمانے میں عیب بن کر رہ گیا۔ اکبر کے دربار میں فقہاء پر جب تنقید ہوتی تو مشہور ابوالفضل وزیر ان فقہاء کے متعلق کہتا تھا کہ ہر جوتے گانٹھنے والے، مٹھائی بیچنے والے کا قول ہم پر حجت نہیں ہو سکتا۔ اشارہ اسلام کے ان فقہاء اور علماء کی طرف ہوتا تھا جو عوام اور حکومت سے کسی قسم کی معاشی امداد لینا پسند نہ کرتے تھے بلکہ مختلف دستکاریوں اور عام ذرائع معاش سے روزی حاصل کرتے تھے۔ ابوالفضل کی نگاہ میں ان کا یہی ہنر عیب ہو گیا۔

خیرات کا قانونی و اخلاقی ضابطہ

اس آیت کی تشریح تو آپ موقعہ محل کے اعتبار سے سن چکے ہیں لیکن آیئے شارحین قرآن نے اس آیت کی شرح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی گوش گذار فرما لیجئے۔

پہلی بات یہ ہے کہ آیت قرآنی کا روئے سخن کس کی طرف ہے۔ اس پر تین خیال ہیں کچھ کہتے ہیں کہ روئے سخن سب کی طرف ہے مسلمان، یہودی اور عیسائی یہ حضرت ابوذر غفاری کی رائے ہے۔

کچھ کہتے ہیں کہ روئے سخن صرف اہل کتاب کی طرف ہے یہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے ہے۔

کچھ بتاتے ہیں کہ صرف مسلمان مراد ہیں۔ یہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے ہے۔

پھر اس میں اختلاف ہے کہ کنز کا مصداق کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں وہ مال جس کی زکوٰۃ نہ دی جائے۔ اس صورت میں انفاق کے معنے زکوٰۃ ادا کرنے کے ہوں گے شارحین قرآن کی رائے عام یہی ہے۔

کچھ کا خیال ہے کہ چار ہزار سے زیادہ مال کنز ہوتا ہے یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے ہے اور کچھ کی رائے میں ضرورت سے زیادہ سب کچھ کنز ہے۔

ان دو باتوں میں اختلاف کی وجہ سے آیت کی تشریح میں صحابہ میں دو فریق پیدا ہو گئے تھے ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب کچھ خدا کے راستہ میں خرچ کر دینا چاہیے کل کے لیے کچھ نہ رکھنا چاہیے۔ ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت عذاب کا مستحق ہو گا۔

دوسرا کہتا تھا کہ اللہ سبحانہ نے ہماری دولت میں جو حق واجب کیا ہے یعنی زکوٰۃ اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع

کرنا عذاب کا سبب نہیں ہے لیکن اہل راز صحابہ اور علمائے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھول دی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورات میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالہ کی گئی ہیں جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے۔ یہ دونوں تعلیمیں اپنی اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ سے کم ہے۔ اسی طرح دوسری تعلیم جو نہایت بلند روحانی تخیل ہے مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے زیادہ ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے اور اسی لیے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیئے ایک قانونی اور دوسرا اخلاقی۔ نیز مال خیرات کی دو مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں تھی یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحب نصاب پر فرض ہے اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے۔ اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ صحابہ میں دونوں قسم کے لوگ تھے۔ جو کل کے لیے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے جیسے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں میں لا کر ڈال دیتے تھے جیسے حضرت ابوبکر اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک وقت لٹا دیتے تھے جیسے حضرت عبدالرحمان بن عوف اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعض انصار کرام۔

بہرحال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے۔ اور ہر ایک کے لیے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق کامیابی کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لیے عملاً ہر وقت امداد مل سکے اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبہ کمال کے لیے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت بھی پیش کر دی ہے۔ اور اس کی خوبیاں اور برائیاں بھی بیان کر دی ہیں تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شہپر دل سے اڑ کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے صحابہ کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف کا حل یہی ہے کہ صحابہ جو کچھ بتا رہے ہیں وہ قانونی بات ہے اور ابوذر جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ قانونی نہیں بلکہ اخلاقی بات ہے۔ حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں

حضرت ابوذر غفاری سے بہت سے آثار اس موضوع پر مروی ہیں کہ آپ گذارہ سے فالتو سرمایہ کو کنز کہتے تھے اور ایسا کرنے والے کی مذمت کرتے تھے اور قرآن میں اس آیت کا مصداق اس کو بتاتے لیکن صحابہ کی رائے عام

ابوذر کے اس موقف کی مخالف تھی۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مسلک پر امام بخاری کی اس حدیث سے واضح روشنی پڑتی ہے جو زید بن وہب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے آئی۔

زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میرا گذر ربذہ سے ہوا تو حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ یہاں کیسے فرمایا میں شام میں تھا میرے اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان اس آیت قرآنی والذین یکنزون میں اختلاف ہو گیا۔ معاویہ کہتے تھے کہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہے میرا موقف یہ تھا کہ اہل کتاب اور اہل ایمان دونوں کے بارے میں ہے۔ میرے اور ان کے درمیان یہ اختلاف تھا حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میری شکایت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ دی حضرت عثمان نے مجھے مدینہ آنے کو لکھا۔ میں مدینہ آگیا۔ لوگ مجھ پر اس طرح ٹوٹ پڑے گویا انھوں نے مجھے اس سے پہلے دیکھا ہی نہیں اس کا تذکرہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی مدینے سے قریب کہیں جانے کی ہے تو ٹھیک ہے بس اس وجہ سے میں نے یہاں ڈیرہ لگا لیا ہے اور اگر کوئی حبشی بھی امیر ہو تو سمع وطاعت میرا فرض ہے [1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی حضرت ابوذر غفاری نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے [2]۔ اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زائد ہو۔ خدا کی راہ میں دے دے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

زید بن وہب رضی اللہ عنہ نے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالفین نے یہ مشہور کر دیا کہ ابوذر کو انھوں نے شہر بدر کر دیا۔ ابوذر نے ان کو بتایا کہ اس مقام پر رہائش کا معاملہ ان کا اپنا اختیاری ہے سرکاری نہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وہاں آتے تھے۔

حافظ عسقلانی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ابن سعد کے طبقات میں ہے کہ:

کوفہ کے کچھ لوگوں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے کیا آپ ہمارے ساتھ عثمان کی مخالفت میں شریک ہوں گے ابوذر نے جواباً کہا کہ ہرگز نہیں۔ اگر مجھے عثمان مشرق سے مغرب تک بھی روانہ کریں میں پھر بھی ان کی بات سنوں گا اور طاعت کروں گا۔

اس واقعہ میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ علم ورائے کی آزادی اور علماء کا احترام اس دور کا نمایاں امتیاز تھا۔ حافظ عسقلانی نے اسی حدیث

---

[1] صحیح بخاری　　[2] مسند امام احمد

پر لکھا ہے کہ:

اس زمانہ میں سربراہانِ مملکت علماء کا کس قدر احترام کرتے تھے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود گرفت نہیں کی بلکہ مرکزی حکومت کو اطلاع دی۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ باوجودیکہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نظریہ سے اختلاف رکھتے تھے مگر ان پر کوئی سختی نہیں کی اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت اور سرکار کے خلاف شورش سے بچ کر رہنا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ مفسدہ کا اندیشہ ہو تو افضل کو مفضول کی طاعت کا حکم دیا جا سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ امر بالمعروف میں کسی کا لحاظ نہ ہونا چاہیے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں احنف بن قیس کا یہ بیان بھی آتا ہے کہ:

میں کچھ قریشیوں کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص آیا موٹے چھوٹے کپڑے پہنے ہوئے آکر کھڑا ہوا اسلام کیا پھر بولا کہ دولت کا ذخیرہ کرنے والوں کو صنف کی خوشخبری سنا دو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر یہ چھاتی کے پستان پر رکھا جائے گا۔ تا آنکہ بغل کے نیچے سے نکلے گا پھر بغل کے نیچے رکھا جائے گا اور پستان سے نکلے گا۔ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ یہ کہہ کر چل دیا میں پیچھے ہو لیا اور اس کے پاس بیٹھا۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ کون ہے میں نے عرض کیا کہ جو کچھ آپ نے فرمایا لوگوں نے پسند نہیں کیا بولے لوگوں کو عقل نہیں ہے مجھ سے تو میرے خلیل نے کہا تھا میں نے دریافت کیا کہ آپ کا خلیل کون ہے فرمایا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے مجھ سے فرمایا اے ابوذر کیا کوئی نظر آرہا ہے۔ ابوذر کہتے ہیں میں نے سورج کو دیکھا کہ کتنا دن باقی ہے میرا خیال تھا کہ غالباً حضور مجھے کسی کام کو روانہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا جی۔ فرمایا ابوذر میں اس بات کو پسند نہیں کرتا ہوں کہ احد پہاڑ کے برابر میرے پاس سونا ہو اور میں اس کو خرچ کروں۔ میں تو صرف تین دینار چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ابوذر نے کہا کہ یہ لوگ عقل سے بیگانے ہیں دنیا جمع کر رہے ہیں میں بخدا ان سے نہ دنیا مانگوں گا اور نہ ان سے دین کے بارے میں کچھ پوچھوں گا تا آنکہ میں اللہ سے مل جاؤں۔

یہ حدیث بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ ابوذر جو کچھ بتا رہے ہیں قانونی نہیں اخلاقی پیمانہ ہے۔ اور یہ ہر کہ و مہ کے لیے نہیں بلکہ اصحاب عزیمت اور خواص کے لیے ہے اگر یہ قانون کی بات ہو تو قرآن کے سارے مالیاتی نظام سے متصادم ہو جائے سوچئے اگر قانون یہی ہے کہ جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے ضرورت سے زائد روزانہ خرچ کر دے اور یہ سب کے لیے ہے تو پھر قرآن میں انفاق کے مطالبات کی بجا آوری کا عمل کیا ہے مطلب ہے کہ زکوٰۃ کب فرض ہوگی حج کب فرض ہوگا۔ قربانی کون کرے گا۔ بیوی کا مہر کیسے دے گا میراث کی تقسیم کہاں ہوگی۔ جب جمع کچھ نہ ہوگا تو ان قرآنی فرائض کی بجا آوری کا کوئی مکلف ہی نہ ہوگا۔ یہ ایسے ہی بات ہے جیسے شیخ شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں حضرت شبلی کے بارے میں

لکھی ہے۔

کسی نے حضرت شبلی سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے پر ہوتی ہے بولے فقہاء کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقراء کے مسلک پر کہا دونوں کے فرمایا فقہاء کے مذہب کے مطابق سال گذرنے پر دو سو درم میں سے پانچ درم اور فقراء کے مسلک پر فوراً پورے کے پورے دو سو درم اور اسی کی خوشی میں اپنی جان بھی پیش کرنی چاہیے پوچھنے والے نے کہا کہ ہم نے یہ مذہب ائمہ دین سے حاصل کیا شبلی نے کہا کہ ہم نے یہ مذہب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ سے حاصل کیا۔

بہرحال حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ کا موقف قانونی نہیں سراسر اخلاقی ہے۔

ابوذر رضؓ کے طرز عمل کا ایک اور محمل

ایک محمل تو یہی ہے کہ یہ معاملہ عزیمت سے تعلق رکھتا ہے اور اخلاقی بات ہے قانونی نہیں جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبیؐ میں بتایا ہے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ کے اس طرز عمل کا ایک اور محمل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بات ان عام مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں جو قدر ضرورت سے زائد سرمائے کو ذخیرہ بنا کر رکھ دیتے ہیں کہ اس مال کو ذخیرہ نہ بنائیں بلکہ کاروبار میں لگائیں تاکہ عام لوگوں کی معیشت میں برتری ہو۔ جہاں مال ذخیرہ بنا کر رکھ دیا جاتا ہے وہاں اقتصادی اور تمدنی زندگی روبہ زوال ہو جاتی ہے۔ آخر اسلام میں سونے چاندی کے برتنوں کے حرام ہونے کی بنیادی وجہ یہی تو ہے کہ ملک کی دولت کو بیکار کرنا ہے اور اقتصادی مسلک میں ایک پیسے تک کو بیکار رکھنا جرم ہے جس کے معنے یہی ہیں کہ سونے اور چاندی کو برتنوں کی صورت میں رکھنا معاشی نقطۂ نظر سے ملک اور قوم کا جرم ہے۔ دنیا کے معاشیوں کو شائد اس کا اب علم ہوا ہے مگر اسلام کی معاشیات کے سربراہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آج سے چودہ سو سال پہلے یہ اعلان فرمایا کہ سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پانی پیا کرو اور نہ ان کی پلیٹوں میں کھانا کھایا کرو[1]۔ اور صرف ممانعت ہی پر اکتفا نہیں فرمائی بلکہ ملک کے اس معاشی مجرم کے متعلق یہاں تک فرمایا۔

چاندی کے برتن میں جو کھاتا پیتا ہے جہنم کی آگ میں اس کے پیٹ میں وہ کھولے گا[2]

اس لیے بالاتفاق تمام فقہائے اسلام کا فیصلہ ہے کہ سونے چاندی کے برتن کا استعمال مرد اور عورت دونوں کے لیے حرام ہے اور جو حکم ظروف کا ہے وہی مردوں کے لیے زیورات کا بھی ہے بجز انگوٹھی کے کہ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے ہر قسم کے زیور سونے کے ہوں یا چاندی کے مردوں پر حرام ہیں۔ اور عورتوں کو زیورات کی اگرچہ اجازت ہے لیکن یہ اجازت

---

[1] صحاح ستہ　[2] صحیح بخاری

تمنائے نبوت کی عکاسی نہیں ہے۔ منشار نبوت یہی ہے کہ عورتیں بھی ملک کے اس سرمایہ کو یعنی سونے اور چاندی کو اپنے گلے کا ہار یا ہاتھوں کی بیڑیاں نہ بنائیں تو بہتر ہے۔

یالیت امتی لم تحل الذھب۔ کاش میری امت سونے کا زیور نہ پہنتی۔ (مسند احمد)

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ حضور اقدس ﷺ نے یہ برتنوں اور زیوروں والی بات اسی آیت سے استنباط فرما کر امت کو بتائی۔ پھر اگر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی یہی لوگوں سے کہتے ہوں کہ سونے اور چاندی کو بے مقصد روک لینے اور ذخیرہ کرنے سے مسلمانوں کی معاشی حالت رو بہ تنزل ہو جائے گی تو اس میں کیا استحالہ ہے۔

یہ بات تو سب کی جانی بوجھی ہے کہ ایک صحابی حضور اقدس ﷺ کے پاس آئے اور سونے کا ایک ڈلا یہ کہتے ہوئے خدمت اقدس میں پیش کیا کہ یہ میری طرف سے صدقہ ہے۔ حضور اقدس نے بے رخی اختیار فرمائی۔ اس نے پھر توجہ دلائی وہ بلا بار توجہ دلاتا تھا اور آپ بے رخی برتتے تھے۔ جب اس کا اصرار حد سے گذر گیا تب حضور اقدس ﷺ نے سونے کا یہ ڈلا ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد اس زور سے اس کی طرف پھینکا کہ بیان کرنے والا کہتا ہے کہ اگر اس کے لگ جاتا تو اسے تکلیف ہوتی یا زخمی کر دیتا۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم میں ایک شخص سارا مال اٹھا کر لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے۔ اس کے بعد خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جاتا ہے پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اس کے بعد آپ نے فرمایا خیر صدقۃ ما کان عن ظھر غنی۔ سب سے اچھا صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنا سارا مال صدقہ کر ڈالیں۔ بخاری کی اس حدیث کے اس فقرے خیر صدقۃ ما کان عن ظھر غنی کا مطلب علامہ خطابی نے معالم السنن میں یہ بتایا ہے۔

ایسی تونگری جس پر بھروسہ کر سکتا ہو اور جس کی پشت پناہی حاصل کر سکتا ہو اس وقت جب مصائب اور حوادث کا وہ شکار ہو۔

علامہ خطابی نے اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے اپنی تائید میں دوسری حدیث پیش کی ہے جس میں ہے خیر الصدقۃ ما ابقت غنی بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی کی تونگری کو باقی رکھے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ صدقہ یا انفاق کرتے ہوئے اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی حاصل کرنے یا مصارف پیش آنے میں مدد لے بہرحال حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیش نظر مسلمانوں کی معاشی حالت تھی اسی لیے وہ عوام کو سرمائے کو ذخیرہ کرنے سے روکتے تھے

ابوذر کے کردار کا ایک اور محمل

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس کردار کا کہ ضرورت سے زائد مال کو ذخیرہ کرنا اس آیت قرآنی کی رو سے حرام ہے

اور ایسا کرنے والا قرآن کی اس آیت میں بیان کردہ سنگین سزا کا سزاوار ہے شارحین قرآن نے ایک عمل یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ کا روئے سخن عوام کی طرف نہیں بلکہ مسلمان سربراہ مملکت کی طرف تھا۔ انھوں نے شام میں حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ کو دیکھا کہ اموال فیئے کو پیش پا افتادہ حالات کے لیے سرکاری خزانہ میں محفوظ کر رہے ہیں تو ان کو بتایا کہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں یہ مال مسلمانوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ اور تقسیم ہونے کی قانونی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں ملک کا دفاع مسلمانوں کے فرائض میں داخل تھا۔ اس کے لیے تنخواہ یاب فوج نہ تھی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ بلا خوف اعلاء حق میں بیباک تھے۔ ان کی زبان سے نکلی ہوئی بات میں عوامی مفاد تھا، بات منہ سے نکلتے ہی عوام میں پذیرائی ہو گئی اور نتیجہ یہ کہ ابوذر قیادت کر رہے تھے اور عوام کی بھیڑ ان کے ساتھ تھی۔ خفیہ اور علانیہ اس کے لیے جلسے اور اجتماعات بھی شروع ہو گئے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ نے بجائے اس کے خود روکتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ کو ساری روئداد لکھ دی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ نے ان کو مدینہ بلا لیا اور بس اگر یہ بات ہے تو اس کا تعلق دونوں کے اجتہاد سے ہے حضرت ابوذر کا اجتہاد یہ تھا کہ یہ مال شہریوں میں تقسیم ہونا چاہیے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ کا اجتہاد یہ تھا کہ لوگوں میں افراط زر ہے اس لیے اس مال کو امت کی مصالح کی خاطر سرکاری خزانہ میں جمع ہونا چاہیے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ کی بات وقتی اور جذباتی تھی جبکہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ کی رائے دور اندیشی پر مبنی تھی غلط نہ وہ تھے اور نہ یہ لیکن معاشرہ میں غلط کار لوگ ایسے وقت کی تلاش میں ہوتے ہیں کہ کسی نہ کسی بہانے شہری زندگی میں کچھ ہلچل ہو۔ اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ نے احتیاطی تدبیر اختیار فرمائی کہ بجائے اس کے کہ صوبائی سربراہ کی حیثیت سے خود کوئی قدم اٹھائیں مرکزی گورنمنٹ کو اطلاع دے دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ کے مزاج کی شدت سے واقف تھے خود اسے مدینہ بلا لیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کا فتح الباری میں میلان اسی طرف ہے۔ لکھتے ہیں۔

والصحیح ان انکار ابی ذر علی السلاطین الذین یاخذون المال لانفسھم و لا ینفقونہ فی وجھہ۔

مطلب یہی ہے کہ یہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ کا ایک مسئلہ میں امر بالمعروف تھا۔

حافظ ابن تیمیہ کا فیصلہ

یہ تو آپ سن آئے ہیں کہ ربذہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ کا قیام شہر بدری کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی رضامندی سے تھا مگر کچھ لوگوں نے یہاں بھی بات کا بتنگڑ بنا لیا۔ اور اس بات کو بھی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ کے مثالب میں شمار کر لیا حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں اس معاملہ کو موضوع بنا کر تشفی بخش جواب دیا فرماتے ہیں۔

عبداللہ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ کی والدہ نے یہ بات قسم کھا کر کہی کہ حضرت

ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ربذہ روانہ نہیں کیا تھا۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں معاذ اللہ ان یکون اخرجہ عثمان ۔ خدا کی پناہ اس سے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکالا ہو یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ حقیقت بالکل بے غبار ہے کہ حضرت ابوذر نیک زاہد تھے۔ ان کا مذہب یہ تھا کہ حاجت سے زیادہ سرمایہ کو خرچ کر دینا چاہیے اور اسے جمع کرنا وہ کنز ہے جس سے روز قیامت مالک کو داغا جائے گا۔ قرآن کی یہی آیت و الذین یکنزون تلاوت کرتے تھے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی سناتے کہ اے ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یہ پسند نہیں کرتا ہوں کہ احد کے برابر میرے پاس سونا ہو اور مجھ پر رات گذرے ایسے حال میں کہ میرے پاس اس میں سے ایک دینار ہو اور یہ ارشاد بھی سناتے کہ قیامت کے روز وہ لوگ اجر و ثواب میں تھوڑے ہوں گے جو دنیا میں بہت زیادہ مال والے ہوں گے جب عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا اور انھوں نے بے حساب مال چھوڑا تو ابوذر اس کو قابل مواخذہ کنز سمجھے۔ اس موضوع پر حضرت عثمان حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مناظرہ کر رہے تھے کہ حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لے آئے۔ کعب نے گفتگو سن کر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہمنوائی کی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جذبات سے بے قابو ہو کر حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مارا فضرب ابوذر گھونسہ یا تھپڑ رسید کیا ہوگا۔ یہی صورت حال شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پیش آئی۔ پوری امت کا موقف ابوذر کے خلاف ہے کہ کنز وہ ہے جس کی زکات نہ دی جائے۔ آخر اللہ سبحانہ نے قرآن میں تقسیم میراث کا طریقہ بتایا ہے اگر ایک شخص مال چھوڑ کر دنیا سے رخصت نہیں ہوتا ہے تو اس کی میراث کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا ہے بے شمار صحابہ کرام زمانہ نبوت میں سرمایہ دار تھے آپ نے ان پر کبھی گرفت نہیں فرمائی۔ خود انبیاء کی ایک جماعت سرمایہ دار تھی حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہی عن المنکر میں اتنے آگے چلے گئے تھے کہ مباحات بھی ان کی نگاہ نکیر سے نہ بچ سکے اسی کے نتیجہ میں وہ معاشرے سے الگ ہو کر عزلت نشین ہو گئے تھے سچے اور پکے مومن مگر ان میں جذباتی غلو بہت کی کمزوری تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ابوذر میں اس کی نشاندہی فرمائی تھی فرمایا تھا ——— ابوذر میرے خیال میں تم کمزور ہو میں تمہارے لیے وہ کچھ پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے کرتا ہوں۔ خبردار امیر نہ بننا اور مال یتامیٰ کی تولیت نہ اختیار کرنا۔ اور اس کے ساتھ حضور کا یہ بھی ارشاد ہے۔ طاقتور مومن کمزور مومن سے اچھا ہے۔ اس لیے اراکین مجلس شوریٰ بلا ریب حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ طاقتور اور برتر ہیں۔

یہ بات ہم نے حافظ ذہبی کی المنتقی سے نقل کی ہے۔ آیئے ربذہ کے قیام کے بارے میں مشہور مورخ ابن خلدون کی بات بھی سن لیجئے۔

ابوذر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مدینہ سے باہر جانے کی یہ کہہ کر اجازت مانگی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ جب عمارتیں سلع تک بن جائیں تو مدینہ چھوڑ دینا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔ آپ نے ربذہ میں رہائش اختیار کی وہاں مسجد بنالی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اونٹوں کا ایک گلہ اور دو غلام دیئے اور ساتھ ہی سرکار سے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ آپ مدینہ آتے رہتے تھے مدینہ اور ربذہ کے درمیان تین میل مسافت ہے یاقوت نے جغرافیہ میں بتایا ہے کہ ربذہ مدینہ کے راستہ میں بہترین پڑاؤ ہے۔

کنز کی آخرت میں شکلیں

(۳۶) یہ عذاب اس روز ہوگا جس دن سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر اس سے پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے جو تم نے ذخیرہ کیا تھا اپنے لیے۔ اس ذخیرہ کا مزہ چکھو۔ بخیل دولتمند سے جب خدا کے راستہ میں خرچ کرنے کو کہا جائے تو اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ زیادہ کہو تو اعراض کر کے ادھر سے پہلو بدل لیتا ہے اگر اس پر بھی جان نہ بچی تو پیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے اس لیے سونا چاندی تپا کر ان ہی تین موقعوں پیشانی، پہلو، پیٹھ پر داغ دیئے جائیں گے تاکہ اس کے جمع کرنے اور گاڑنے کا مزہ چکھ سے [1]

قتل عمد کے بعد شدید کسی عمل کے لیے قرآن نے اس قدر شاید وعید سنائی ہو جتنی کہ اس آیت میں ان لوگوں کو سنائی گئی ہے جو سرمایہ کا اکتناز کرتے ہیں۔ اسلام کے معاشی نظام میں اکتناز ناپسندیدہ یہ ہے کہ دولت کے بڑے بڑے خزانے افراد کے پاس ہوں۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق اگر ایک شخص مالی واجبات کے مطابق پورا کرتا رہے تو اکتناز وجود ہی میں نہیں آسکتا ہے اللہ کے حقوق، والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، زوجین کے حقوق، یتیموں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، حاجت مندوں کے حقوق، مزدوروں کے حقوق، بیماروں کے حقوق، نوکروں کے حقوق، مہمانوں کے حقوق، مسلمانوں کے حقوق، انسانی برادری کے حقوق، بالآخر جانوروں کے حقوق کی ذمہ داریاں جو ہر ایک مسلمان پر قرآن نے ڈال ہیں۔ اگر ان کی واقعی بجاآوری کی جائے تو اسلامی معاشرے میں اکتناز کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ دولت ہونا جسے غنا کہتے ہیں مذموم نہیں لیکن دولت کے ذریعے اہل حقوق کے حقوق ادا نہ کرنا اور اس پر سانپ بن کر بیٹھ جانا مذموم ہے اور یہاں اسی کی مذمت ہو رہی ہے۔ قرآن میں قارون کے حوالے سے جس سب سے بڑے بخیل کا ذکر ہے اس کی سب سے بڑی برائی یہی تو ہے کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے نہ دنیا کی پرواکرتا تھا اور نہ آخرت کی۔ لاتنس نصیبك من الدنیا واحسن کما احسن اللہ۔ جیسے اللہ نے تیرے سے نیکی کی ہے تجھے بھی مخلوق خدا سے ایسی ہی نیکی کرنی چاہیے لیکن معاشرے میں رہتے ہوئے معاشرے کی ساری ذمہ داریوں

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بے نیاز مستانہ نعرہ لگاتا تھا۔ انما اوتیتہ علی علم عندی۔

اسلام نے سرمایہ داروں پر ان حقوق کی باجائی کی ذمہ داریاں ڈالی ہیں ہر ملک پر آبادی کے ان طبقات کی جو سرمایہ کی فراوانی رکھتے ہیں یہ ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ ان سے لیا جائے اور ان میں تقسیم کیا جائے جو مجبوری کی زندگی گذار رہے ہیں صرف زکوٰۃ ہی نہیں بلکہ زکوٰۃ کے سوا بھی معاشرے کے مختلف طبقات کی امداد کی اسلام نے مختلف صورتیں پیدا کی ہیں۔ حدیث کتاب ل میں صاف بتایا گیا ہے کہ ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔ اور یہ جو فرمایا ہے۔ اذا ادیت الزکوٰۃ فقد قضیت ما علیک۔ تم نے جب زکوٰۃ ادا کر دی تو تم نے حق ادا کر دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کا سرکاری حق تم نے ادا کر دیا۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد اب حکومت کا کوئی قانونی مطالبہ نہیں ہے۔ باقی صدقات، خیرات اور دوسرے تمام حقوق کے مالیاتی واجبات یہ یقیناً افراد کی انفرادی ذمہ داری ہے۔ اب اگر ایک شخص دولت رکھتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر رہا ہے وہ یقیناً آخرت کی اس سزا کا مستوجب ہے۔ قرآن نے اس معاملہ کو قانونی اس درجہ میں رکھا ہے کہ ہر ایک سے ان سے عہدہ برا ہونے کا مطالبہ کیا ہے لیکن اس درجہ میں قانونی نہیں بنایا کہ چور اور قاتل کی طرح اسے سزا دی جائے اسی وجہ سے یہاں آخرت کی سزا کو سنگین بنا کر پیش کیا ہے۔ جن جرائم کی سزا قرآن میں دنیا میں تجویز کی گئی ہے وہاں آخرت میں سزا کے لیے کوئی سنگینی نہیں۔ مثلاً چوری، زنا، قتل، ڈاکہ وغیرہ۔ یہ بات کہ قرآن نے یہاں دنیا میں سزا کیوں تجویز نہیں کی۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآن پولیس کے ذریعے معاشرے کو ٹھیک بنانا نہیں چاہتا بلکہ ایمان و احتساب کی قوت سے نیک بنانا چاہتا ہے۔

آخرت میں اس کی جو سزا تجویز کی گئی ہے یعنی یہ کہ قیامت کے روز پیشانی کا داغ پہلو اور پیٹھ کا زخم یہ دولت بنے گی جو راہ خدا سے چرا کر جمع کی ہے۔ دولت فراہم کرنے کی سرگردانی میں بڑا دخل دو چیزوں کو ہوتا ہے ایک ہم چشموں میں اپنا سر اونچا رکھنے کی خواہش دوسری اپنی ذاتی آرام و راحت کی طلب فرمایا جو لوگ دنیا میں سربلندی اور فخر کی خاطر دولت جمع کریں گے ان کی دولت بروز قیامت ان کی پیشانی پر داغ لگائے گی۔ اسی طرح جو لوگ نرم ریشمی و مخملیں گدوں غالیچوں قالینوں اور صوفوں کے درپے ہو کر انفاق کی سعادت سے محروم رہیں گے ان کی یہ بچائی ہوئی دولت ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو زخمی کرے گی۔

دراصل بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال دولت مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سونے چاندی کی اینٹیں خود بخود روٹی کپڑا اور مکان کی چار دیواری نہیں بن سکتی ہیں اس لیے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ ان کو ضروری اور اعلیٰ مقاصد کے حصول میں خرچ کرنا ان کا صحیح مصرف ہے اور ان ہی اعلیٰ مقاصد کو قرآن نے فی سبیل اللہ کہا ہے جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا ہے وہ اپنے لیے درہم و دینار جمع نہیں کرتا وہ اپنے پہلو، پیٹھ اور

پیشانی کے داغ کا سامان کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جرم کی سنگینی کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ان کی جمع کردہ دولت ہی کو مختلف شکلوں میں ان کے لیے عذاب بنایا جائے صحیح بخاری، صحیح مسلم نیز صحاح ستہ کی صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ جنت و دوزخ میں جانے سے پہلے میدان حشر کے اس اجتماع عظیم میں اپنے سرمائے سے متعلقہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے گریز کرنے والے اپنے آپ کو پائیں گے کہ مالہ شجاع اقرع لہ زبیبتان یطوقہ یوم القیامۃ ویاخذ بلھزمتیہ ثم یقول انا مالك انا کنزك۔ ان کا مال ایک ایسے سانپ کی شکل میں ہوگا جس کا سر بالکل چکنا ہوگا اور جس کے چہرے پر دو سیاہ نشان ہوں گے وہ ان بخیلوں کی گردنوں سے لپٹ پڑے گا اور ان کے دونوں جبڑوں کو پکڑ کر کہے گا میں ہوں تیرا مال میں ہوں تیرا خزانہ ان ہی حدیثوں میں ہے کہ اونٹوں اور دوسرے مویشیوں کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے کو قیامت کے دن ان ہی جانوروں سے روندا جائے گا۔ یہ بھی ہے کہ سونے اور چاندی کی تختیاں آگ میں تپائی جائیں گی اور ان ہی لوگوں کے پہلو، پیشانیاں، پیٹھیں ان تپائی ہوئی تختیوں سے داغی جائیں گی یہ مدت ان لوگوں کو اتنی دراز محسوس ہوگی کہ موجودہ دنیا کے وقت کا جو پیمانہ ہے اس کے حساب سے حضور اقدس نے پچاس ہزار سال اس کی مدت بتائی ہے۔ اعاذنا اللہ والمسلمین منہ

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ
يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ
ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ ۚ وَقَاتِلُوا
الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ
اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝ إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ ۖ
يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ
عَامًا لِّيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ ۚ
ع ۵ ۸ ۱۱ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝

بلاشبہ اللہ کے نزدیک جس دن سے اللہ نے آسمان و زمین کی تخلیق فرمائی ہے۔ اللہ کی کتاب میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت کے ہیں۔ دین کی سیدھی اور پائدار راہ یہی ہے[37]۔ لہٰذا ان حرمت والے مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو[38]۔ اور سارے مشرکین سے بلا استثناء جنگ کرو جیسے وہ تم سب سے جنگ کرتے ہیں اللہ کی معیت ان کو حاصل ہوتی ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں[39]۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ نسی تو کفر میں بڑھوتری اور زیادتی ہے اس سے ان لوگوں کو جنہوں نے راہ کفر اختیار کی گمراہ کیا جاتا ہے ایک ماہ کو ایک سال حلت کا مہینہ اور اسی کو ایک سال حرمت کا مہینہ بنا دیتے ہیں تاکہ مطابقت پیدا

کریں ان مہینوں کی گنتی سے جن کو اللہ نے حرمت والا بنایا ہے۔ بس اس طرح وہ اللہ کے حرام کردہ مہینوں کو حلت والے مہینے بنالیں۔ ان کی نظر میں ان کے یہ بُرے اعمال خوشنما معلوم ہوتے ہیں اور اللہ کفر کی راہ پر چلنے والوں کو سعادت کی راہ نہیں دکھاتا ہے۔[۴۴]

مفردات کے معانی

الشھور۔ شہر کی جمع ہے مہینہ کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد قمری مہینے ہیں شمسی نہیں۔ قمری جس کا شمار چاند دیکھنے سے ہوتا ہے اور شمسی جس کا شمار آفتاب کے ایک برج سے دوسرے برج میں داخل ہونے سے ہوتا ہے۔ مہینہ کو شہر اس لیے کہا گیا کہ لوگوں میں اس کے آغاز و انجام کی شہرت ہوتی ہے۔ شرعی امور میں یعنی اعمال و عبادات میں قمری مہینہ معتبر ہے۔ کیونکہ انسان کے لیے مہینوں کا قدرتی حساب یہی ہے۔ چاند چھپتا ہے اور پھر نکلتا ہے۔ ہر شخص خواہ کسی متمدن شہر میں رہتا ہو خواہ صحرا میں معلوم کر سکتا ہے کہ کب مہینہ ختم ہوا اور کب شروع ہوا اس کے لیے نہ تو علم ہیئت کی حساب دانوں کی ضرورت ہے نہ تقویم کی جدولوں کی۔ علاوہ بریں موسموں اور طلوع و غروب کے وقتوں کی جو تبدیلیاں قدرتی طور پر ہوتی رہتی ہیں وہ سب اس حساب میں پیش آتی رہتی ہیں مثلاً رمضان اور حج کا مہینہ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ یہ مہینے محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذوالقعدہ، ذوالحجہ ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ سخاوی کے حوالہ سے ان مہینوں کی وجہ تسمیہ بتائی ہے۔

حُرُم۔ یہ حرام کی جمع ہے۔ یا تو یہ معنے ہیں وہ مہینے جو حرمت و احترام والے ہیں یا وہ مہینے ہیں جن میں جنگ و جدال حرام ہے۔

کافۃً۔ اس کے معنے سب کے ہیں۔ یہ قرآن میں چار جگہ آیا ہے اور ہر جگہ نکرہ آیا ہے۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس پر الف لام لگا کر الکافۃ بولنا جائز ہے یا نہیں کچھ کہتے ہیں کہ جائز ہے اور کچھ بتاتے ہیں کہ ناجائز ہے۔

مہینوں کا پیمانہ قمری ہے

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت پر ایک جامع تبصرہ کیا ہے پہلے اسے پڑھ لیجئے۔ فرماتے ہیں۔

میرے نزدیک اوپر سے سلسلہ مضمون کا یوں ہے کہ گذشتہ رکوع میں مشرکین کے بعد اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے جہاد کرنے کو حکم دیا۔ پھر اس رکوع کے شروع میں بتلایا کہ ان کے عقائد اور طور و طریق بھی مشرکین سے ملتے جلتے ہیں ان کا عزیر و مسیح کو خدا کا بیٹا کہنا ایسا ہی ہے جیسے مشرکین ملائکۃ اللہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے بلکہ نصاریٰ میں ابنیت مسیح کا عقیدہ مشرکین کی تقلید سے آیا ہے وہ دونوں کو خدائی کا درجہ دیتے ہیں۔ انھوں نے مسیح و روح القدس کو خدا ٹھہرالیا۔ باوجود دعویٰ کتاب کے احبار و رہبان کے احکام کو شریعت الٰہیہ کا بدل تجویز کرلیا یعنی احبار و رہبان رشوتیں لے کر اور حرام مال کھا کر جس چیز کو حرام یا حلال کر دیتے احکام سماوی کی حیثیت میں وہ قبول کر لیا جاتا۔ ان کا یہ طریقہ ٹھیک مشرکین کے طریقے سے مشابہ ہے۔ ان کے سرکردہ بھی جس چیز کو چاہتے حلال و حرام ٹھہرا کر خدا کی طرف نسبت کر دیتے تھے جس کا ذکر سورہ انعام میں مفصل گذر چکا ہے اور یہاں بھی اس کی ایک مثال بیان کی جارہی ہے۔ عرب میں قدیم سے معمول چلا آتا تھا کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے ”اشہر حرم“ خاص ادب و احترام کے مہینے ہیں ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب ان میں خونریزی اور جدال و قتال قطعاً بند کر دیا جاتا تھا۔ حج و عمرہ اور تجارتی کاروبار کے لیے امن و امان کے ساتھ آزادی سے سفر کرتے تھے۔ کوئی شخص ان ایام میں اپنے باپ کے قاتل سے بھی تعرض نہ کرتا تھا بلکہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اصل ملت ابراہیم میں یہ چار ماہ اشہر حرم قرار دیئے گئے تھے۔ اسلام سے ایک مدت پہلے جب عرب کی وحشت و جہالت حد سے گذر گئی اور باہمی جدال و قتال میں بعض قبائل کی درندگی اور انتقام کا جذبہ کسی آسمانی و زمینی قانون کا پابند نہیں رہا تو نسی کی رسم نکالی یعنی جب کسی زور آور قبیلہ کا ارادہ ماہ محرم میں ہی جنگ کرنے کا ہوا تو ایک سردار نے اعلان کر دیا کہ اس سال ہم نے محرم کو اشہر حرم سے نکال کر اس کی جگہ صفر کو حرام کر دیا۔ پھر اگلے سال کہہ دیا کہ اس سال حسب دستور قدیم محرم حرام اور صفر حلال رہے گا۔ اس طرح سال بھر میں چار مہینوں کی گنتی تو پوری کر لیتے لیکن ان کی تعیین میں اپنی پسند سے ردوبدل کر لیتے۔ حافظ ابن کثیر کی تحقیق کے مطابق نسی کی رسم صرف محرم و صفر میں ہوتی تھی اور اس کی وہی صورت تھی جو پہلے بیان ہوئی امام مغازی محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ رسم جاری کی قَلَمَّس کنانی تھا۔ پھر اس کی اولاد در اولاد یوں ہی چلا آیا آخر میں اسی کی نسل سے ابو ثمامہ جنادہ بن عوف کنانی کا معمول تھا کہ حج کے موقعہ پر اعلان کیا کرتا کہ امسال محرم اشہر حرم میں داخل رہے گا یا صفر۔ اسی طرح محرم و صفر میں سے ہر ماہ کبھی حلال اور کبھی حرام کیا جاتا تھا۔ اور عام طور پر لوگ اسی کو قبول کر لیتے تھے گویا عہد جاہلیۃ میں کافروں کے کفر کو بڑھانے والی ایک چیز یہ بھی تھی کہ خدا کے حلال یا حرام کیے ہوئے مہینہ کو بدل ڈالنے کا حق کنانہ کے ایک سردار کو سونپ دیا گیا تھا ٹھیک اسی طرح یہود و نصاریٰ کا حال تھا کہ انھوں نے تحلیل و تحریم کی باگ طامع اور غرض پرست احبار و رہبان کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ دونوں جماعتوں کی مشابہت ظاہر کرنے کے لیے ”نسی“ کی رسم کو یہاں ذکر کر دیا اور ان عدۃ الشھور اس کے رد کی تمہید ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

(۳۷) بلاشبہ اللہ کے نزدیک جس دن سے اللہ نے آسمان وزمین کی تخلیق فرمائی ہے اللہ کی کتاب میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔ ان میں چار مہینے حرمت والے ہیں۔ دین کی سیدھی اور پائدار راہ یہی ہے۔ یعنی آج سے نہیں جب سے آسمان وزمین پیدا کیے خدا کے نزدیک بہت سے احکام شرعیہ جاری کرنے کے لیے سال کے بارہ مہینے رکھے گئے ہیں۔ جن میں سے چار اشہر حرم ادب کے مہینے ہیں۔ جن میں گناہ اور ظلم سے بچنے کا اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے یہی سیدھا دین ابراہیم علیہ السلام کا ہے [1]

مطلب ہے کہ شریعت الٰہی اور اللہ کے قانون میں قابل اعتبار قمری سنہ کے بارہ مہینے ہیں نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم اور یہ آج کی بات نہیں روز آفرینش ہی سے اللہ کا یہ فیصلہ ہے فی کتاب اللہ کے ساتھ یوم خلق السموات کی تصریح سے مقصود تاکید میں زور پیدا کرنا ہے۔ یہ کل بارہ مہینے ہیں۔ محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاولی، جمادی الاخری، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذوالقعدہ، ذوالحجہ۔ ان میں چار حرمت والے مہینے ہیں محرم۔ رجب۔ ذوالقعدہ، ذوالحجہ۔

امام نووی فرماتے ہیں گنتی تو چار ہی سب کے نزدیک ہے اور اس پر اتفاق ہے لیکن اس بات میں کہ ان کی ترتیب کیا ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوجعفر النحاس نے اپنی کتاب صناعۃ الکاتب میں بتایا ہے کہ کوفیین ان مہینوں کی ترتیب یہ بتاتے ہیں محرم رجب ذوقعدہ اور ذوالحجہ۔ اس ترتیب میں چاروں مہینے ایک سال میں آتے ہیں اور اہل مدینہ یہ ترتیب بتاتے ہیں ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب۔ اہل مدینہ کی بتائی ہوئی ترتیب ارشاد نبوت سے ہم آہنگ ہے۔ الجصاص لکھتے ہیں۔

وھی التی بینھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم بانھا ذوالقعدہ وذوالحجۃ والمحرم ورجب۔

حافظ ابن کثیر نے اس ترتیب کی لطیف افادی حیثیت بتائی ہے فرماتے ہیں کہ:

حرمت والے مہینے چار ہیں تین لگاتار ہیں اور ایک الگ ہے۔ حج کے مہینے سے پہلے ایک مہینہ یعنی ذوالقعدہ ہے اس میں لڑائی وغیرہ بند رہتی تھی اور حج کی تیاری ہوتی تھی ذوالحجہ حج کا مہینہ ہے اس میں لوگ حج کرتے اور ادائے مناسک میں مشغول ہوتے تھے۔ اس کے بعد محرم کو حرمت والا مہینہ اس لیے بنایا تاکہ لوگ امن وامان سے اپنے گھروں میں جا سکیں۔ اور درمیان سال میں رجب کو حرمت والا ماہ اس لیے قرار دیا کہ لوگ بیت اللہ کی زیارت کر سکیں اور عمرہ کر سکیں اور عمرہ کی ادائیگی کے بعد واپس جا سکیں۔

ابوبکر الجصاص نے ان مہینوں کو حرم کہنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

دو وجہ سے ان کو حرم قرار دیا ہے ایک یہ کہ ان میں قتال حرام ہے اہل جاہلیت بھی ان میں قتال کی حرمت کا اعتقاد رکھتے تھے دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مہینوں میں گناہوں کی سزا میں دوسرے مہینوں کے مقابلے میں زیادہ سنگینی ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

جیسے ان مہینوں میں دوسرے مہینوں کے مقابلہ میں طاعت زیادہ قیمتی ہے۔ اللہ سبحانہ نے یہ اس لیے کیا ہے کہ اس ... میں برائی سے بچنے اور نیکی کی طرف بڑھنے میں بہت بڑی مصلحت ہے۔ جیسے جمعہ کے روز نماز جمعہ، رمضان کے مہینے میں روزے رکھے ہیں۔ تقدس تو زمانہ کے لحاظ سے ہے۔ مکان کے اعتبار سے جیسے بعض جگہوں میں برائیوں کے ارتکاب اور طاعات کی بجا آوری دونوں میں عظمت آجاتی ہے جیسے مسجد حرام اور مسجد نبوی اس لیے ان جگہوں اور ان مہینوں میں گناہوں سے بچ کر رہنا ذریعہ بن جائے گا باقی جگہوں اور باقی مہینوں میں گناہوں سے بچنے اور طاعات میں لگنے کا۔ اور اس طرح پوری زندگی نیکیوں کا گہوارہ اور برائیوں سے دور ہو جائے گی اس لیے وقتوں اور جگہوں کے تقدس کو نیکیوں کی طرف مائل کرنے اور برائیوں سے دور رکھنے میں عظیم ترین مصالح ہیں۔

علامہ جمال الدین قاسمی نے المہائمی سے یہ بات بہت اچھی نقل کی ہے کہ:

سال کو مین پر تقسیم کرکے ایک تہائی کو حرمت والا بنایا تاکہ تحریم کے مقابلہ میں تحلیل غالب رہے۔ تحلیل تقاضائے رحمت ہے۔ جبکہ تحریم تقاضائے عزت و جبروت ہے۔ اس تہائی میں بھی خوبی یہ رکھی ہے کہ سال کے آغاز و انجام کو حرام بنایا اور چونکہ صحیح وسط نہ آتا تھا اس لیے سال کے نصف آخر کے آغاز کا مہینہ اور سال کے انجام سے پہلے کا مہینہ لے لیا۔ تاکہ سال آغاز و انجام اور درمیان کے لحاظ سے تحریم کی آغوش میں رہے۔

آخر میں فرمایا ہے ذالک الدین القیم۔ یعنی یہ مہینوں کی تعداد اور مہینوں کی یہ تقسیم کہ بارہ میں سے آٹھ حلت کے اور چار حرمت کے مہینے ہیں یہی صحیح اور پائیدار قانون ہے۔ اور امام بغوی فرماتے ہیں کہ یہی ٹھیک حساب ہے اور عام شارحین قرآن نے بتایا ہے کہ یہی وہ پائیدار قانون ہے جس پر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام عمل پیرا تھے اہل عرب میں حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام ہی کی وراثت میں ان مہینوں کا اس قدر احترام تھا کہ اس زمانے باپ اور بھائی کا قاتل بھی مل جاتا تو اس کو بھی کچھ نہ کہتے۔

حرمت والے مہینوں کی حرمت کا تقاضا

(۳۸) لہٰذا ان حرمت والے مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔ اصل ارشاد میں ہے۔ فلا تظلموا فیھن انفسکم۔ ان کی بے حرمتی کرکے اور ان میں محرمات کا ارتکاب کرکے اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔ ضمیر کا مرجع الاشھر الحرم ہے جیسا کہ اکثر شارحین قرآن کی رائے ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ زمانہ جاہلیت میں حج کی دینی حیثیت تو برائے نام رہ گئی تھی۔ ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کرلی تھی جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا

تھا جو میلوں میں ہوتا ہے۔ شور وغل ہوتا تھا دنگا فساد ہوتا تھا۔ عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی غرض فسق و فجور کا بازار گرم ہوتا تھا۔ قرآن نے ان باتوں کو بند کر دیا۔ اور حج کو تقدس تورع نیکی اور ذکر الٰہی کا سراسر مرقع بنا دیا فرمایا کہ ان حرمت والے مہینوں کی حرمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں فسق و فجور میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور ایک مطلب یہ ہے کہ ان ایام میں جنگ و جدل اور بدامنی پھیلا کر ان مہینوں کی حرمت کو رائیگاں نہ کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ محترم وقت اور مقدس جگہ میں گناہ عقوبت کے لحاظ سے زیادہ سنگین ہوتا ہے اور طاعت میں اجر میں بھی زیادتی ہو جاتی ہے۔ صرف جگہ اور وقت ہی نہیں اگر مقدس شخص سے آپ کی نسبت ہے تو اس نسبت سے بھی گناہ اور طاعت کی جزا و سزا میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ قرطبی نے محترم اور معظم شخصیت کے لیے حضور اقدس کا نام لیا ہے اور قرآن کی یہ آیت تلاوت کی ہے یانساء النبی من یات منکن بفاحشۃ مبینۃ یضاعف لھا العذاب ضعفین۔ یعنی "اے نبی کی بیبیو جو بھی تم میں سے کسی بدکاری کا ارتکاب کرے گی اسے سزا ڈبل ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ضمیر کا مرجع الشھور بتایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ پورے سال میں اس جگہ کے تقدس کا لحاظ کرو اور خدا کی نافرمانی کر کے اپنی جانوں پر ظلم نہ ڈھاؤ۔

کیا اس آیت کی رو سے ان مہینوں میں قتال بھی حرام ہے۔ قرطبی نے عطاء ابن ابی رباح کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ قسم کھا کر کہتے تھے کہ لوگوں کے لیے حرم کے علاقے اور حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنا حرام ہے ہاں اگر کوئی حملہ کرے تو دفاع کر سکتے ہیں۔ لیکن علماء کی رائے عامہ نے اس رائے کو پذیرائی نہیں دی۔ اور اس کے لیے انھوں نے حضور اقدس کے طائف کے محاصرے اور ہوازن کی جنگ سے استدلال کیا ہے یہ جنگ ۸ھ میں شوال ذی قعدہ میں ہوئی ہے۔ اور کچھ نے دونوں میں اس طرح مفاہمت پیدا کی ہے کہ حرمت والے مہینوں میں جنگ کا آغاز تو درست نہیں لیکن اگر حلال مہینوں میں آغاز کر دیا اور زمانہ جنگ طویل ہو کر حرمت والے مہینوں میں داخل ہو گئی ہے تو جنگ کو جاری رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہوازن و ثقیف کی جنگ کی صورت حال یہی تھی۔ دفاع کی حد تک حرم اور اشہر حرم میں قتال کی اجازت سورۃ بقرہ میں آ چکی ہے۔ الشھر الحرام بالشھر الحرام والحرمات قصاص فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم۔ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کا بدلہ ہے۔ مہینوں کی حرمتیں ادلہ بدلہ اور برابر ہیں حرمت کا مہینہ یعنی ذی قعدہ جس میں عمرہ کی قضا کرنے جا رہے ہو بدلہ ہے اس حرمت والے مہینہ یعنی ذیقعدہ سال گذشتہ کا جس میں کفار مکہ نے عمرہ سے روک دیا تھا اور مکہ میں جانے نہ دیا تھا اب تم شوق سے ان سے بدلہ لو کیونکہ ادب و حرمت رکھنے میں تو برابری ہے یعنی اگر کوئی کافر ماہ حرام کی حرمت کرے اور تم سے نہ لڑے تو تم بھی ایسا ہی کرو مکہ والے جو سال گذشتہ میں تم پر ظلم کر چکے ہیں انھوں نے نہ ماہ حرام کی حرمت کا پاس کیا اور نہ حرم کا خیال کیا۔ اور نہ تمہارے احرام کا خیال کیا۔ اگر اس دفعہ بھی سب حرمتوں کو نظر انداز کر کے آمادہ پیکار ہوں تو تم بھی کسی حرمت کا خیال نہ کرو۔

جہاد اسلام کی اجتماعی زندگی کا تقاضا ہے

(۳۹) اور سارے مشرکین سے بلا استثناء جنگ کرو جیسے وہ تم سے جنگ کرتے ہیں اللہ کی معیت ان کو حاصل ہوتی ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس آیت سے نکلتا ہے کہ کافروں سے لڑنا ہمیشہ روا ہے چنانچہ غزوہ تبوک جس کا آگے ذکر آتا ہے ماہ رجب میں ہوا اور آپس میں ظلم کرنا ہمیشہ گناہ ہے ان مہینوں میں اکثر علماء کی رائے یہی ہے لیکن بہتر ہے کہ اگر کوئی کافر ان مہینوں کا ادب کرے تو ہم بھی اس سے لڑائی کی ابتداء نہ کریں لہ

شیخ الاسلام کا تشریحی نوٹ لا تظلموا فیھن انفسکم اور قاتلوا المشرکین سے متعلق ہے۔ حرمت والے مہینوں میں قتال کے بارے میں آپ علماء کے خیالات سن چکے ہیں۔ رائے عامہ یہی ہے کہ جائز ہے مگر واقعہ یہ ہے جب کہ قرآن بتا رہا ہے کہ منھا اربعۃ حرم۔ اس موقعہ پر ان کا یہ استدلال بڑا ہی عجیب ہے کہ تھا تو حرام مگر اس کی حرمت منسوخ ہوگئی۔ ناسخ کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی یہ آیت قاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم ناسخ ہے۔ ناسخ کیسے ہے اس طرح کہ اس میں یہ اضافہ کرو فیھن و فی غیرھن۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر یہ عبارت میرے جیسے کم فہم طالب علم کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک ہی آیت کے ایک حصہ میں حکم ہو رہا ہے اور اسی آیت کے دوسرے حصہ میں اسے اپنے اضافے سے منسوخ بتایا جا رہا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا بیان یہاں قابل غور ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ حرمت والے مہینوں میں قتال حرام ہے یا نہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ حرام تھا، پھر منسوخ ہوگیا اور قرآن کی اس آیت سے منسوخ ہوا۔ قاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم۔ اس آیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ حرمت والے اور غیر حرمت والے مہینوں میں قتال کرو۔ یہ قتادہ۔ عطاء الخراسانی، زہری اور سفیان ثوری کی رائے ہے یہ تو ان کا قرآن سے استدلال ہے۔ حدیث سے ان کا استدلال یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حنین میں اور ثقیف سے طائف میں جنگ کی تھی اور طائف کا محاصرہ شوال اور ذی قعدہ کے آغاز میں ہوا تھا۔ یہ ہے امام بغوی کا اس موضوع پر بیان۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ آیت قاتلوا المشرکین کافۃ میں ناسخ بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

اوّلاً: اس لیے کہ منسوخ ہونے والی آیت یعنی اربعۃ حرم ذالک الدین القیم اس کے ساتھ ہے اور نسخ کے لیے ضروری ہے کہ ناسخ و منسوخ میں کچھ وقت کا فاصلہ ہو۔

ثانیاً، فقاتلوا المشرکین میں زمانہ کے لحاظ سے عموم نہیں ہے کہ اس کو حرمتہ زمانہ کے لیے ناسخ

لہ افادات شیخ الاسلام

بنایا جا سکے۔

ثالثاً: تشریح میں مقدر عبارت بے محل ہے اور بے دلیل ہے۔

رابعاً: حضور ﷺ نے طائف کا شوال میں ضرور محاصرہ کیا۔ لیکن ذی قعدہ شروع ہوتے ہی آپ نے محاصرہ اٹھا لیا تھا۔

خامساً: اگر ذی قعدہ میں قتال کی حدیث ثابت بھی ہو جائے تو یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد سے اللہ کی کتاب منسوخ نہیں ہو سکتی۔

سادساً: یہ آیات قرآنی ۹ھ میں نازل ہو رہی ہے غزوہ طائف کے بعد۔ غزوہ طائف ۸ھ میں ہوا۔ ۸ھ کا حکم عمل نبوت ۹ھ کے حکم قرآن کے لیے کیسے ناسخ ہو سکتا ہے۔

سابعاً: حضور اقدس ﷺ نے وصال مبارک سے ۸۰ روز پہلے حجۃ الوداع میں ان مہینوں کی حرمت خطبہ میں بیان کی ہے۔ اس لیے صحیح بات ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ منسوخ نہیں ہے۔ عطاء ابن ابی رباح اسی لیے قسم کھا کر کہتے تھے کہ لوگوں کے لیے حرم میں اور حرمت والے مہینوں میں قتال جائز نہیں ہے ہاں صرف دفاعی صورت اس سے مستثنیٰ ہے اور یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔

اب آیئے پیش نظر آیت کی تشریح سن لیجئے۔ اس جگہ یہ بات عام ہے وقاتلوا المشرکین کافۃ لیکن البقرہ میں اس میں ایک قید ہے اور وہ یہ ہے کہ ولا تعتدوا ان اللہ لایحب المعتدین۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ حرم میں اپنی طرف سے لڑائی شروع نہ کرو۔ اور جو حکم حرم مکہ کا ہے وہی اشہر حرم کا ہے دونوں میں حالت دفاع مستثنیٰ ہے۔

قتال انفرادی نہیں اجتماعی ہے

قتال کے بارے میں قرآن کی جمع کے لفظوں میں تعبیرات بہت معنے خیز ہیں فقہاء نے ان ہی تعبیرات سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قتال کا فریضہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ ضروری ہے کہ نظام مملکت ہو۔ امام کی سربراہی ہو۔ فوج اور عسکریت کا وجود اور وجوب اسی آیت سے بطور عبارت النص کے معلوم ہو رہا ہے اور امام کی سربراہی کی بھی یہ آیت بطور اقتضاء النص کے نشاندہی کر رہی ہے۔ کیونکہ فوجی تنظیم اور اس کی اجتماعی ترتیب بغیر سرکار یعنی امام کے ممکن نہیں ہے۔

اسی سے قتال کی دو قسمیں معلوم ہو رہی ہیں۔ دفاعی اور اقدامی، دفاع کی صورت میں جہاد فرض عین ہوتا ہے جب کہ اقدام کی صورت میں جہاد فرض کفایہ ہوتا ہے۔ کفایہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں سے کچھ پر فرض

ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فرضیت سب پر ہے اور ادائے فرض کا مطالبہ سب سے ہے لیکن کچھ کے کرنے کے بعد ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اسی کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جماعتی فرائض اور شخصی فرائض۔ جماعتی فرائض یعنی فرض کفایہ سے وہ احکام مقصود ہیں جو بہ حیثیت جماعت امت پر فرض ہیں۔ فرض کفایہ میں شریعت کا خطاب اشخاص سے نہیں بلکہ جماعت سے ہے۔ دوسری قسم شخصی فرائض یعنی فرض عین کی ہے یعنی وہ فرائض جن کی فرضیت جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہوتا۔

شرعاً قتال کی اقدامی صورت فرض کفایہ ہے۔ ضروری نہیں کہ بیک وقت ہر مسلمان اس میں حصہ لے صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

جہاد فرض کفایہ ہے جب مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کے لیے کھڑی ہو گئی تو باقی مسلمانوں کے لیے واجب نہ رہا لیکن اگر کوئی گروہ بھی اس کے لیے نہ اٹھا تو پھر تمام مسلمان جہاد ترک کر دینے کی وجہ سے گنہ گار ہوں گے کیونکہ فرض پوری قوم پر ہوتا ہے۔

اسی طرح فقہ شافعی کی کتاب اقناع میں ہے۔

وہ فرض کفایہ ہے جب ایک گروہ اس کی بجا آوری کرے تو سب کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے۔

ابن ادریس اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

یہ صورت تو اس قتال کی ہے جس کی صورت اقدام کی ہے۔ دوسری قسم دفاع کی ہے یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں پر حملہ کر دے تو اس حملہ و تسلط کو ہر طرح کا مقابلہ کر کے روکنا مسلمانوں کا فرض ہے یہ دفاعی جہاد فرض کفایہ نہیں ہے بلکہ بالاتفاق نماز کی طرح ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔

اس آیت میں کافۃ آیا ہے قاتلوا المشرکین کافۃ۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ لفظ کافۃ یا تو فاعل کی ضمیر انتم سے حال ہے اور یا المشرکین قاتلوا کے مفعول سے حال ہے اگر فاعل کی ضمیر سے حال ہو گا تو معنے یہ ہوں گے تم سب مل کر مشرکوں سے جنگ کرو۔ اور اگر مفعول المشرکین سے حال ہو گا تو معنے یہ ہوں گے تم تمام مشرکوں سے بلا استثناء جنگ کرو۔ ہم نے ترجمہ میں دوسرے معنے کو اختیار کیا ہے۔ شیخ الہند نے بھی اپنے ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ اگر آیت کا روئے سخن اقدام ہے تو دوسرے معنے صحیح ہیں اور یہاں اقدام ہی معلوم ہوتا ہے آیت کا مقصد قتال کی ترغیب ہے۔ پہلے بتایا تھا کہ اللہ نے اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین حق دے کر روانہ کیا ہے تاکہ اسے سارے دینوں پر غالب کرے۔ سارے دینوں پر غالب کرنے سے مراد نظریاتی غلبہ بھی ہے اور سیاسی غلبہ بھی۔ اسی وجہ سے اس اعلان کے ساتھ یہ حکم دیا ہے۔ وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ۔ اور حضور اقدس ﷺ نے اس قتال اور

جہاد کو کبھی ختم نہ ہونے والی ضرورت اور ذمہ داری بتاتے ہوئے امت کو خبردار کیا ہے۔

جہاد میرے وقت سے لے کر اس وقت تک رہے گا جب تک کہ میری امت کا آخری فرد دجال سے لڑے

چونکہ اس جہاد کی نوعیت اقدامی جہاد کی ہے اس لیے فرمایا کہ بلا استثناء سارے مشرکین سے جنگ کرو۔

آخر میں فرمایا ہے کہ واعلموا ان اللہ مع المتقین اللہ کی معیت ان لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جن کے دامن پر برائیوں کے داغ نہ ہوں۔ قرآن نے یہ بات اپنے مخاطبوں کو بتکرار بتائی ہے کہ کامیابی اہل تقویٰ کے لیے ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہاں یہ بات بڑی ہی لطیف لکھی ہے۔

اس میں اللہ سے قرب کی بشارت ہے اور اللہ کی معیت اہل ایمان کے لیے بلا کیف ہے اور تقویٰ کو بنیاد بنا کر اللہ نے مدد کی ضمانت دی ہے۔

رسم نسی قطعاً کافرانہ رسم ہے

(۴۰) اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ نسی تو کفر میں سراسر زیادتی اور بڑھوتری ہے اس لیے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی گمراہ کہا جاتا ہے۔ ایک ماہ کو ایک سال حلت کا مہینہ اور اسی کو ایک سال حرمت کا مہینہ بنا دیتے ہیں تاکہ مطابقت پیدا کریں ان مہینوں کی گنتی سے جن کو اللہ نے حرمت والا بنایا ہے بس اس طرح وہ اللہ کے حرام کردہ مہینوں کو حلت والے مہینے بنالیں ان کو یہ برے اعمال خوشنما معلوم ہوتے ہیں اور اللہ کفر کی راہ پر چلنے والوں کو سعادت کی راہ نہیں دکھاتا ہے۔ یعنی برے کام کو اچھا سمجھ رہے ہیں جب سمجھ الٹ جائے تو بھلائی کا راستہ کہاں ملے۔ اس آیت میں جو رسم نسی کا ذکر فرمایا ہے اس کی تفصیل گزشتہ آیت کے فوائد میں زیر آیت ذلك الدين القيم گذر چکی ہے[1]

نسی کے موضوع پر بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے۔

۱۔ نسی کی لغوی حیثیت کیا ہے۔
۲۔ نسی کی اصطلاحی حیثیت کیا ہے۔
۳۔ نسی کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔
۴۔ مراد قرآن کیا ہے۔

نسی کے لغوی معنے

نسیء: جوہری صاحب صحاح کے خیال میں بر وزن فعیل ہے اور معنی میں مفعول کے ہے جیسے قتیل بمعنے مقتول آتا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

اور کچھ کی رائے ہے کہ انسار مزید سے نعیل کے وزن پر ہے جیسے انذر سے نذیر اکر سے نکیر زمخشری کا میلان اسی طرف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ نسأ ینساء کا مصدر ہے یہ مہموز اور ناقص دونوں طرح آتا ہے اس کے معنے دیر کرنے کے ہیں اسی سے چیز ل جائے اور قیمت ادھار ہو نسیئہ کہتے ہیں کیونکہ قیمت کی ادائیگی میں دیری ہوئی ہے۔ نسأت المراۃ عورت کے حاملہ ہونے پر بولتے ہیں کیونکہ ماہواری میں اس سے تاخیر ہو جاتی ہے۔ نسأتُ الناقۃ اس وقت بولتے ہیں جب اونٹنی کو تیز دوڑایا جائے اور تاخیر سے روکا جائے۔ منساۃ اس چھڑی کو کہتے ہیں جس کے ذریعے ہانکا جائے اور تاخیر سے روکا جائے۔

نسی کی تاریخی حیثیت

اس رسم کی ایجاد کا سہرا کس کے سر ہے۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس، قتادہ اور ضحاک کی رائے ہیں کنانہ کے تین لڑکے ہیں ابن عباس کی بحوالہ ضحاک ہی روایت ہے کہ اس کا موجد عمرو بن لحی بن قمعہ ہے امام زہری فرماتے ہیں کہ اس کی ایجاد کا سہرا بنی کنانہ کے قبیلے کے سر ہے۔ البلاذری کے انساب میں ہے کہ ابو ثمامہ القلمس ابن امیہ ابن عوف یہ کام کرتا تھا اور اس نے چالیس سال تک یہ کام کیا۔ امام مغازی محمد بن اسحاق کا بھی یہی میلان ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ جو یہ کام کرتا تھا قیادت اور زعامت بھی عرب کی اسی کے پاس ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک شاعر فخریہ کہتا ہے۔

ومنا ناسئ الشهر القلمس

یعنی قلمس مہینوں میں نسی کرنے والا ہم ہی میں سے ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے: ؎

السنا الناسئین علی معد شهور الحل نجعلها حراما

کیا ہم حلت کے مہینوں میں نسی کی رسم کے مطابق حرام کرنے والے نہیں ہیں

علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں بھی یہی بتایا ہے کہ قلمس نامی قبیلہ کنانہ سے تعلق رکھنے والا زمانہ جاہلیت میں جمرہ عقبہ کے پاس کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتا تھا۔

بہرحال اکثر اس پر متفق ہیں کہ یہ کارنامہ قلمس نامی شخص کا ہے اور اس رسم کا تاریخی نسب نامہ اس سے ملتا ہے۔ علامہ ابن الجوزی نے یہ انکشاف بھی کیا ہے۔

مشہور امام لغت فراء کہتے ہیں کہ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں جب منیٰ سے واپسی کا ارادہ کرتے تو بنی کنانہ میں ایک شخص کھڑا ہوتا جس کا نام نعیم بن ثعلبہ ہے اور پورے موسم حج کا وہی لیڈر ہوتا وہ کھڑے ہو کر

اعلان کرتا ہیں وہ ہوں جس میں کوئی عیب نہیں نکالا جا سکتا جسے جواب نہیں دیا جا سکتا اور جس کی فیصلہ کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ لوگ کہتے براہ نوازش مہینہ کو مؤخر کر دیجئے۔ مقصد یہ ہوتا کہ محرم کی حرمت کو مؤخر کر کے اسے صفر میں بنا دیجئے۔ وہ ایسا کر دیتا۔ وہ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ حرام مہینے لگاتار ہونے کی وجہ سے ان کی قزاقی اور لوٹ مار میں رکاوٹ ہوتی تھی۔ ان کی معاشی زندگی کی گاڑی لوٹ مار اور غارتگری ہی سے چلتی تھی۔

نسی کی اصطلاحی حیثیت

اس موضوع پر شارحین قرآن نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں پہلے وہ گوش گذار فرمایئے۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں بعض اقوام جو اپنے مہینوں کا حساب درست رکھنے کے لیے لوند کا ماہ ہر تیسرے سال بڑھاتی ہیں وہ نسی میں داخل نہیں اور بعض اکابر سلف سے جو نسی کے تحت یہ منقول ہے کہ عرب جاہلیت میں سال کے مہینوں کا عدد بدل ڈالتے تھے مثلاً بارہ کے چودہ مہینے بنا لیتے یا حساب میں ایسی گڑبڑ کی کہ جو ذوالقعدہ تھا وہ ذوالحجہ بن گیا حتی کہ ۹ھ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حج بھی ان کے حساب سے ذی قعدہ میں ہوا۔ اور حدیث ان الزمان قد استدار کھیئتہ کی تقریر اسی کو پیش نظر رکھ کر کی گئی۔ ان سب چیزوں پر حافظ ابن کثیر نے تعاقب کیا ہے لہ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی معارف القرآن میں مولانا دریا بادی اور حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ اسی خیال کے ہمنوا ہیں۔ حال کے شارحین میں ہمارے پیش نظر مولانا ابوالاعلیٰ اور مولانا امین احسن اصلاحی ہیں۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں:

عرب میں نسی دو طرح کی ہوتی تھی۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ جنگ و جدال و غارت گری اور خون کے انتقام لینے کی خاطر کسی حرام مہینے کو حلال قرار دیتے تھے اور اس کے بدلے میں کسی حلال مہینے کو حرام کر کے حرام مہینوں کی تعداد پوری کر دیتے تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لیے اس میں کبیسہ کا ایک مہینہ بڑھا دیتے تھے تاکہ حج ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا رہے۔ اور وہ ان زحمتوں سے بچ جائیں جو قمری حساب کے مطابق مختلف موسموں میں حج کی گردش کرتے رہنے سے پیش آتی ہیں۔ اس طرح ۳۳ سال تک حج اپنے اصل وقت کے خلاف دوسری تاریخوں میں ہوتا رہتا اور صرف چونتیسویں سال ایک مرتبہ اصل ذی الحجہ کی ۹، ۱۰ تاریخ کو ادا ہوتا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبے میں

فرمائی تھی کہ ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق السموات والارض یعنی اس سال کا وقت گردش کرتا ہوا ٹھیک اپنی اس تاریخ پر آگیا جو قدرتی حساب سے اس کی اصل تاریخ ہے لہ

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں:

نسی سے عرب جاہلیت کی اصطلاح میں وہ مہینہ مراد ہوتا ہے جس کو چند دن پیچھے ہٹا کر اس کے دنوں میں اضافہ کر دیتے تھے۔ شمسی سال قمری سال سے تقریباً گیارہ دن زیادہ ہوتا ہے۔ قمری سال کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اہل عرب یہ کرتے تھے کہ اس میں کمی کے بقدر اضافہ کر دیتے جس کی عملی شکل یہ تھی کہ ہر آٹھ سال میں تین ماہ بڑھائے جاتے گویا ہر دوسرے یا تیسرے سال کے خاتمہ پر ایک ماہ کبیسہ کا ہوتا اس طرح اپنے خیال کے مطابق انھوں نے قمری مہینوں بالخصوص اشہر حرم کا احترام بھی باقی رکھا اور اپنے تجارتی فوائد و مصالح کے نقطہ نظر سے اس کو شمسی بھی بنا لیا تھا لہ

شارحین قرآن نے نسی کی دونوں تشریحیں بتائی ہیں۔ ان سب کی تشریحات کو یہاں پیش کرنا بہت بڑی طوالت ہے اس موضوع پر مجھے مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تحقیق فکر انگیز معلوم ہوتی ہے اس لیے عالم القرآن پڑھنے والوں کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرتا ہوں۔

آیت میں نسی سے کیا مراد ہے؟ اسے خود قرآن نے بتلا دیا ہے اور صحابہ کرام نے مزید تشریح کر دی۔ لیکن بعد کو مفسروں کی کاوشوں نے خصوصاً علماء ہیئت کی دقیقہ سنجیوں نے اسے ایک پیچیدہ سوال بنا دیا غالباً ابو معشر فلکی پہلا شخص ہے جس کا خیال اس طرف گیا کہ یہ کبیسہ کا معاملہ تھا پھر ابوریحان بیرونی نے بھی اس کی پیروی کی۔ گذشتہ صدی کے بعض مستشرقین یورپ کو بھی اس مسئلہ پر خصوصیت سے توجہ ہوئی۔ کیونکہ انھوں نے خیال کیا اس سے عرب جاہلیت کی تقویمی معلومات پر روشنی پڑے گی چنانچہ پوکاک دی ساسی، گاسین دی پرسیول، اسپرنگر، ول ہواسن وغیرہم نے اس پر طول طویل بحثیں کی ہیں۔ اور زمانہ حال کا ایک اطالوی مستشرق پرنس کائتانی بھی اپنی زیر تصنیف تاریخ اسلام کی پہلی جلد میں اس پر بحث کر چکا ہے مستشرقین ہی کی صف میں محمود فلکی کو بھی شمار کرنا چاہیے جس نے کبیسہ کا نظریہ تسلیم کر کے یہ کوشش کی کہ اس عہد کے شمسی مہینوں کی تقویمی حالت منضبط کی جائے۔

لیکن حق یہ ہے کہ اس نظریہ کے لیے کوئی تاریخی بنیاد موجود نہیں ہے اور صاف بات وہی معلوم ہوتی ہے جس کی طرف خود قرآن نے اشارہ کیا ہے اور آثار صحابہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

عرب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ سے یہ بات چلی آتی تھی کہ سال کے چار مہینے امن کے مہینے ہیں۔ ان میں لڑائی نہ ہونی چاہیے رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ اسی لیے انہیں اشہر الحرم کہتے تھے یعنی حرمت کے مہینے۔

لہ تفہیم القرآن

نیز قمری مہینوں کے حساب سے کہ قدرتی حساب ہے حج کا مہینہ ہی متعین تھا اور وہ اسی نام سے پکارا جاتا تھا یعنی ذی الحجہ۔ اسی مہینے کی آٹھویں، نویں، دسویں حج کے اعمال و رسوم کے دن سمجھے جاتے تھے۔

ایک مدت تک بات اسی طرح قائم رہی لیکن پھر لوگوں پر اس کی پابندی شاق گذرنے لگی۔

اولاً اس لیے کہ قمری مہینوں کے حساب کی وجہ سے حج کا زمانہ ہمیشہ ایک ہی موسم میں نہیں آتا تھا، بدلتا رہتا اور اس کی وجہ سے قریش کے سفر تجارت میں خلل پڑتا۔

ثانیاً اس لیے کہ امن کے مہینوں کا معاملہ بھی ان کی جنگ جویانہ مقاصد کے خلاف واقع ہوتا تھا۔ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے کتنی ہی عداوت ہو اور انتقام کا کتنا ہی موزوں موقعہ سامنے دیکھے لیکن اس کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ ان مہینوں کی بے حرمتی کر کے اعلان جنگ کر دے چونکہ عرب جاہلیت کی طبیعتوں کے لیے نہ تو اپنی قیود تھیں نہ علمی حدود اس لیے مطلب برآری کا ایک ڈھنگ نکال لینے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ وہ ڈھنگ یہ تھا کہ امن کے مہینوں کا معاملہ ان کے قدرتی حساب پر موقوف نہیں رکھا بلکہ اس کے لیے ایک خود ساختہ اعلان ضروری ٹھہرایا جو حج کے موقعہ پر کیا جاتا تھا۔ اس اعلان کے ذریعے حسب ضرورت امن کے مہینے پیچھے ڈال دیتے یا حج کا مہینہ موخر کر دیتے مثلاً محرم امن کا مہینہ تھا اعلان کر دیا جاتا کہ اس سال محرم صفر میں ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ محرم کا حقیقی مہینہ حکماً معدوم ہو جاتا اور اس میں لڑائی شروع ہو جاتی۔ پھر یہ فرق دور تک پہنچ جاتا تو اسے لوٹانا شروع کر دیتے یہاں تک کہ اصل مہینوں کی ترتیب پھر قائم ہو جاتی۔

چونکہ یہ طریقہ سراسر جہل و فساد پر مبنی تھا اور اس کی وجہ سے نہ تو تقویم کا کوئی معیار باقی رہتا تھا نہ امن و جنگ کے ایام کا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس کا قطعاً انسداد کر دیا جائے اور حج کے لیے ایک معین اور قطعی زمانہ مقرر ہو جائے۔ اگر فی الحقیقت اس معاملہ کی بنیاد کسی حسابی قاعدہ پر ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآن اسے زیادۃ فی الکفر سے تعبیر کرتا۔*

بہرحال نسئی کے دو معنے ہیں ایک وہ ہیں جو خود قرآن نے بتائے ہیں کہ یحلونہ عاماً ویحرمونہ عاماً یعنی امن والے مہینے کو ایک سال حرمت والا مہینہ بنا دیتے اور ایک سال اسی کو حلت والا مہینہ کر دیتے، محرم کے ساتھ ان کا یہ معاملہ ہوتا۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ وہ اس میں کبیسہ کا عمل کرتے اور شمسی اور قمری مہینوں میں تطابق پیدا کر لیتے اور ہر آٹھ سالوں میں تین ماہ بڑھا دیتے گویا ہر دوسرے یا تیسرے سال کے خاتمہ پر ایک ماہ کبیسہ کا ہوتا۔

پہلی بات کا تعلق جہل و نادانی سے ہے دوسری بات سرتاسر علمی ہے قرآن یہاں ان کے علم و فکر کی بات نہیں کر رہا ہے بلکہ ان کی جہل و کوری کا ماتم ان لفظوں میں کر رہا ہے یحلونہ عاماً ویحرمونہ عاماً۔ صحابہ اور تابعین بھی اس سے یہی سمجھے ہیں۔ اس لیے آیت میں مراد پہلے ہی معنے میں کبیسہ والی بات کا آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے ڈاکٹر جواد علی کی کتاب المفصل فی تاریخ العرب بہترین ہے۔ موصوف نے اس پر ایک مبسوط مقالہ میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کا حاصل بھی یہی ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ یہ ایک دینی تشریع ہے کہ حرمت والے مہینے

* ترجمان القرآن

چار ہیں اس میں اتباع ہوا کی راہ سے تاویل کے ذریعے تبدیلی کر ڈالی۔ یعنی حرمت والے مہینوں کی تعداد تو باقی رکھی لیکن حرمت والے مہینوں کو بدلنا شروع کر دیا اسی کو قرآن نے کفر میں بڑھوتری سے تعبیر کیا ہے یعنی اصل کفر جو وہ مشرکانہ اعمال کے ذریعے کر رہے تھے اس میں یہ مزید اضافہ ہے۔ کیونکہ تحلیل و تحریم اللہ کا حق ہے۔ انہوں نے اس حق پر چھاپہ مارا ہے اور یہ لوگ اسی راہ سے ان سب کا فروں کو جوان کا کہا مانتے ہیں بے راہ اور گمراہ کر رہے ہیں، اور مگن ہیں کہ چونکہ ہم گنتی پوری کر رہے ہیں اس لیے ہم ملت ابراہیم کے پیرو ہیں۔

غرض دین ابراہیمی کا صرف اتنا احترام تھا کہ سال میں چار مہینوں کی گنتی پوری کر لیتے تھے۔ لیکن اللہ سبحانہ نے سال میں حرمت کے مہینوں کی جو ترتیب مقرر فرمائی تھی اس میں طرح طرح کی تاویلیں کر کے اپنی اغراض کے مطابق بنا لیتے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اس رد و بدل کی وجہ سے یہ امتیاز ہی ختم ہو گیا کہ ذی الحجہ کا مہینہ کون ہے اور محرم کونسا ہے۔ اس بنا پر یہ تہدید آئی ہے۔

حافظ ابن کثیر کی تحقیق

یہاں حافظ ابن کثیر نے اس آیت کی جو تشریح کی ہے وہ اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اللہ سبحانہ نے اس آیت میں مشرکین کی اس بات پر مذمت کی ہے کہ وہ اللہ کے قانون اور شریعت میں اپنی غلط آراء کے ذریعے تصرفات کرتے ہیں اور ناپاک خواہشوں کی وجہ سے اللہ کے احکام کو تبدیل کرتے ہیں۔ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال اور حلال کو حرام بناتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے کردار کی عکاسی ہے جن میں قومی حمیت، عصبیت اور شہامت اس قدر تھی کہ تین ماہ کے تسلسل کو وہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ان میں مہینوں کا قانون تحریم دشمنوں سے میدان جنگ میں مقابلہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ انہوں نے اسلام سے بہت پہلے محرم کی حرمت کو پامال کر کے اسے ماہ حلال بنا لیا اور صفر کا نام محرم رکھ لیا۔ اس طرح وہ حلال مہینہ کو حرام اور حرام کو حلال بناتے وہ صرف چار ماہ کی مدت پوری کرتے لیکن بے قیدی کے ساتھ محرم کی جگہ صفر کو حرام بنا لیتے جیسا کہ ان کے شاعر نے فخریہ کہا ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن کثیر نے امام مجاہد کا تشریحی نوٹ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ یہ تشریح بڑی ہی عجیب ہے۔ اس تشریح کی رو سے امام مجاہد کہتے ہیں کہ مشرکین ایک ماہ میں دو سال حج کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو ۹ھ میں حج کیا۔ وہ امام مجاہد کی رائے میں ذی قعدہ میں ہوا اور ۱۰ھ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حج کیا وہ ذی الحجہ میں ہوا ہے۔ حضور اقدس نے منیٰ میں جو تقریر فرمائی اور اس تقریر میں جو یہ بات ارشاد فرمائی۔ ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوات والارض۔ اس میں اسی طرف اشارا ہے۔

لیکن حافظ ابن کثیر کو امام مجاہد کی تشریح سے اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں؛

کہ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حج ذوالقعدہ میں ہوا جیسا کہ مجاہد کہہ رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حج ہی نہیں ہوا اور ایسے حج کو جو شرعاً ہوا ہی نہیں ہے قرآن الحج الاکبر کہہ رہا ہے۔

اگر ابوبکر کا حج قانون کے لحاظ سے بے وقت ہونے کی وجہ سے غلط ہوتا تو قرآن اسے الحج الاکبر نہ کہتا۔ اور پھر نسی کے عمل سے یہ کب لازم آتا ہے کہ دو سال تک وہ ایک ہی ماہ میں حج کرتے۔ نسی کا حاصل تو صرف یہ ہے کہ وہ ایک سال محرم الحرام کو حرام کی بجائے حلال بناتے تھے اور اس کی جگہ صفر کو حرام کہتے پھر مہینوں کی ترتیب وہی رہتی تھی۔ مہینوں کی گنتی بھی وہی رہی مہینوں کے نام بھی وہی رہتے۔ پھر دوسرے سال محرم کو ماہ حرام قرار دیتے اس کے بعد سارے مہینے اپنی جگہ رہتے تھے اس میں نہ کوئی رخنہ ہوتا اور نہ کوئی تبدیلی قرآن کی آیت یحلونہ عاما ویحرمونہ عاما کا یہی مطلب ہے۔ ان کے پیش نظر یہ بات ضرور رہی کہ حرمت والے مہینوں کا سال بھر میں شمارہ کم نہ ہونے پائے وہ صرف یہ کرتے تھے کہ کبھی تیسرے ماہ یعنی محرم کو پہلے لے آتے اور کبھی اسے صفر میں ڈال کر موخر کر دیتے۔ باقی رہا ارشاد نبوت ان الزمان قد استدار تو اس کی تشریح ہم پہلے بتا چکے ہیں اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مہینوں کی گنتی اور حرمت والے مہینوں کی تحریم کا معاملہ اللہ کی کتاب میں عدد اور ترتیب کے اعتبار سے پہلے ہو چکا ہے آج بھی وہی ہے ایسا نہیں جیسا کہ جاہل عرب اپنی جہالت کی وجہ سے بتائے ہوئے ہیں۔

جس ارشاد نبوت کا حافظ ابن کثیر نے حوالہ دیا ہے پوری بات بخاری ومسلم میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے اس طرح آئی ہے۔

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وقت گھوم پھر کر آ گیا ہے اپنی اسی حالت کے مطابق جیسے اللہ کی آسمان و زمین کی تخلیق کے دن تھی۔ سال بارہ مہینے کا ہے ان میں سے چار حرمت والے مہینے تین لگاتار ہیں ذوالقعدہ ذوالحجہ اور محرم مضر کا وہ رجب جو جمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے۔

اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ زمانہ کا دور اپنی اس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا۔ ذرا غور فرمائیے کہ یہ بات کہاں کہی جا رہی ہے اور کب کہی جا رہی ہے یہ بات حجۃ الوداع میں وفات سے تقریباً دو ماہ پہلے کہی جا رہی ہے۔ ۲۳ سال کی مدت میں ایک متحدہ امت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام ایک کامل قانون ایک مکمل شریعت ایک ابدی نظام حیات، خدا پرستی تدین تقویٰ، ایمانداری پارسائی، اور پاکبازی کا ایک مجسم دور یعنی ایک نئی زمین نیا آسمان پیدا ہو گیا۔ یہی حقیقت تھی جس کو علی طرح آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع میں ظاہر کیا گویا سارے عرب کے اسلام کے سائے میں آنے اور اسلام کا نظام حکومت سارے عرب میں چھا جانے پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آخری فرض اللہ سبحانہ کی شہنشاہی کا اعلان پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو آپ نے اس کا ان بلیغ الفاظ میں اعلان فرمایا۔ الیوم استدار الزمان کھیئتہ یوم خلق اللہ السموات والارض۔ زمانہ پھر کر اس مرکز پر آ گیا جس پر وہ اس دن تھا جس دن اللہ سبحانہ نے اسے پیدا فرمایا تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ
لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُمْ
بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٣٨﴾ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا
أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَ
اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ
اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي
الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنْزَلَ
اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ
الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ
حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾

اے اہل ایمان تمہیں کیا ہو گیا ہے جب تم سے راہِ خدا میں قدم اُٹھانے کو کہا جاتا ہے تو تم زمین میں ڈھے جاتے ہو کیا تم آخرت کے مقابلے میں دُنیا کی زندگی میں مگن ہو گئے ہو یاد رکھو آخرت کے مقابلے میں سامان دُنیا کی حیثیت بالکل تھوڑی ہے یعنی کچھ بھی نہیں ۳۸۔ اگر تم راہِ خدا میں قدم نہ اُٹھاؤ گے تو اللہ تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہارے بدلے میں اور لوگ لے آئے

گا اور تم اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑو گے اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہ کرو گے (تو کوئی پروا نہیں) اللہ نے تو اپنے رسول کی اس وقت بھی مدد کی ہے جب کافروں نے اس حال میں اس کو گھر سے بے گھر کیا کہ اللہ کا رسول دو میں سے دوسرا تھا۔ جبکہ وہ دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غمگین نہ ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پھر اللہ نے اپنا سکون و قرار اس پر نازل کیا اور اس کی امداد کے لیے ایسی فوجیں روانہ کیں جو تمہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اور بالآخر اللہ نے اہلِ کفر کی بات کو پست کر دیا۔ اور اللہ کی بات تو ہمیشہ اونچی ہوتی ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے[۴۱]۔

معانی مفردات

انفروا امر کا جمع مذکر حاضر ہے نفیر اور نفور کے معنے نکلنے۔ کوچ کرنے اور بھاگنے کے ہیں باب ضرب سے آتا ہے۔ اصل میں نفر کے معنے کسی چیز کے لیے بیتاب ہونے یا اس سے بیزار ہونے کے ہیں۔

اثاقلتم تم بوجھ سے جھکے تثاقل سے ہے۔ باب تفاعل اور تفعل کی بگڑی ہوئی صورت افاعل اور افعّل بھی آتی ہے اس کے معنے گراں بار اور بوجھل ہونے کے ہیں۔ اشیا کو کبھی تو بھاری اور بوجھل ہونے کی وجہ سے ثقیل کہا جاتا ہے اور کبھی جن اجسام کا رُخ اوپر کی طرف ہوتا ہے ان کو خفیف (ہلکا) کہتے ہیں جیسے دھواں اور جن کا رُخ نیچے کی طرف ہو ان کو ثقیل کہتے ہیں جیسے پانی اور پتھر۔ یہاں دوسرے معنے ہی کے اعتبار سے بوجھ سے جھکے جانے کے معنے مراد ہیں اسی کو شاہ عبدالقادر نے ڈھے جانا کہا ہے۔

الغار پہاڑ میں تھوڑے سے خلا کو کہتے ہیں۔ یہ جبلِ ثور میں غار کا ذکر ہے غار کی جمع غیران آتی ہے جیسے نار کی جمع نیران۔ پہاڑوں میں چھوٹا خلا غار کہلاتا ہے لیکن اگر بڑا ہو تو اسے کہف کہتے ہیں۔ کہف کی کبھی وسعت میلوں ہوتی ہے غار ہو یا کہف دونوں پہاڑی تہ خانے ہوتے ہیں غار چھوٹا ہوتا ہے اور کہف بڑا ہوتا ہے۔

ایمان باللہ کے لئے امتحانی کسوٹی جہاد ہے

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف جہاد میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے۔ یہاں اہل ایمان کو تنبیہ کیا جا رہا ہے کہ اپنی نیکیوں پر قانع ہو کر نہ بیٹھو کیونکہ ممکن ہے کہ یہ نیکیاں خالص اور بے آمیز نہ ہوں، بلکہ ان میں ذاتی یا قومی مفاد کی آمیزش ہو۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو دیکھو کہ اللہ سبحانہ کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی تم میں کتنی خواہش ہے کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا عثمانی نے یہاں ایک بہترا تشریحی نوٹ لکھا ہے پہلے اسے پڑھ لیجئے۔

یہاں سے غزوہ تبوک کے لیے اہل ایمان کو ابھارا گیا ہے۔ گذشتہ رکوع سے پہلے رکوع میں قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر۔ اہل کتاب کے مقابلے میں جہاد کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ درمیان میں جو ذیلی مضامین آئے۔ ان کا ربط موقع بموقعہ ظاہر ہوتا رہا ہے۔ گویا وہ سب رکوع حاضر کی تمہید تھی۔ اور رکوع حاضر غزوہ تبوک کی تمہید ہے۔ فتح مکہ و غزوہ حنین کے بعد ۹ھ ہجری میں تو نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ شام کا نصرانی بادشاہ ملک غسان قیصر روم کی مدد سے مدینہ پر چڑھائی کرنے والا ہے۔ حضور اقدس نے مناسب سمجھا کہ ہم خود حدود شام پر اقدام کر کے اس کا جواب دیں۔ اس کے لیے آپ نے عام طور پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ جہاد کے لیے تیار ہو جائیں۔ گرمی سخت تھی۔ قحط سالی کا زمانہ کھجور کی فصل پک رہی تھی۔ سایہ خوشگوار تھا۔ پھر اس قدر بعید مسافت طے کر کے جانا اور نہ صرف ملک غسان بلکہ قیصر روم کی باقاعدہ اور سر و سامان سے آراستہ افواج سے نبرد آزما ہونا کوئی کھیل تماشا نہ تھا۔ ایسی مہم میں مومنین مخلصین کے سوا کس کا حوصلہ تھا کہ جانبازانہ قدم اٹھا سکتا۔ چنانچہ منافقین جھوٹے حیلے بہانے تراش کر کھسکنے لگے۔ بعض مسلمان بھی ایسے سخت وقت میں اس طویل و صعب سفر سے کترا رہے تھے جن میں بہت سے تو آخر ساتھ ہو لیے اور گنے چنے آدمی رہ گئے جن کے کسل و تقاعد نے اس شرفِ عظیم کی شرکت سے ان کو محروم کر رکھا۔ حضور اقدس ﷺ تقریباً تیس ہزار مجاہدین کا لشکرِ جرار لے کر حدود شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور مقامِ تبوک میں ڈیرے ڈال دیئے اور قیصر روم کے نام نامہ مبارک لکھا جس میں اسلام کی دعوت دی گئی حضور کی صداقت اس کے دل میں گھر کر گئی مگر قوم نے موافقت نہ کی اس لیے قبولِ اسلام سے محروم رہا۔ شام والوں کو جب حضور کے ارادے کی خبر ہوئی۔ قیصر روم کو بتایا۔ اس نے مدد نہ کی۔ ان لوگوں نے اطاعت کی مگر اسلام قبول نہ کیا۔ تھوڑی مدت کے بعد حضور کا وصال ہوا اور فاروق اعظم کے عہدِ خلافت میں تمام ملکِ شام فتح ہوا جب حضور ﷺ تبوک سے غالب و منصور واپس تشریف لائے اور اللہ سبحانہ نے بڑی بڑی سلطنتوں پر اسلام کی دھاک بٹھا دی تو منافقین مدینہ بہت فضیحت ہوئے۔ نیز چند سچے مسلمان جو محض سستی اور کسل کی بنا پر

گئے بے حد نادم اور متحسر ہوئے۔ اس رکوع کے شروع سے بہت دور تک ان ہی واقعات کا ذکر ہے۔ مگر زیادہ منافقین کی حرکات بیان ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں مسلمانوں کو خطاب اور ان کے احوال سے تعرض کیا گیا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو بڑی شدت سے جہاد کی طرف ابھارا اور بتلایا ہے کہ تھوڑے سے عیش و آرام میں پھنس کر جہاد کو چھوڑنا گویا بلندی سے پستی کی طرف گر جانے کے مترادف ہے۔ مومن صادق کی نظر میں دنیا کے عیش و آرام کی آخرت کے مقابلے میں کوئی وقعت نہ ہونی چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ اگر خدا کے نزدیک دنیا کی وقعت پرپشہ کے برابر ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی کا نہ دیتا۔ اگرچہ شیخ الاسلام نے ان آیات کا ربط بیان کر دیا ہے لیکن یہاں سے چونکہ غزوہ تبوک کے ذکر کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس لیے کچھ غزوہ تبوک کے بارے میں قرآن کی آیات کی تشریحات کے لیے معلومات ضروری ہیں۔ تاکہ بات پوری بصیرت کے ساتھ علم میں آئے۔

غزوہ تبوک کی اہمیّت

غزوہ تبوک حضور اقدس ﷺ کا آخری غزوہ تھا۔ مختلف وجوہ سے اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔

اولاً۔ وقت کی دو بڑی شاہنشاہیاں تھیں یعنی رومی اور ایرانی۔ انہیں زمانہ رسالت میں وہ اہمیت حاصل تھی جو آج کل امریکہ اور روس کو حاصل ہے۔ ان میں سے ایک طاقت کے ساتھ براہ راست ٹکر کا یہ پہلا موقع ہے۔

ثانیاً: اس کے لیے تیس ہزار مجاہدین تیار ہوئے۔ ان کے ساتھ اونٹوں کے علاوہ حسب روایت طبقات ابن سعد دس ہزار گھوڑے تھے۔ سرزمین عرب میں اتنی بڑی تعداد اس سامان کے ساتھ پہلے کبھی فراہم نہیں ہوئی تھی۔

ثالثاً: تمام مجاہدین رضا کار تھے۔ ان میں سے تنخواہ دار ایک بھی نہ تھا۔ ضروری سامان اور زاد و توشہ کے علاوہ سواریاں بھی رضا کارانہ تھیں۔

رابعاً: ان رضا کاروں کے درجات عالیہ بھی پیش نظر رہنے چاہئیں اللہ تعالیٰ کے ان سعادت شعار بندوں نے جان و مال اور دنیا کی ہر چیز اللہ کی راہ میں بے دریغ قربان کرنے کی توفیق پائی۔

خامساً: منزل مقصود بہت دور تھی۔ راستہ سخت دشوار گذار اور موسم بے حد ناخوشگوار تھا۔ لیکن اہل حق کو رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنے میں ایک لمحہ کے لیے تامل نہ ہوا۔

سادساً: اسلامی نظام کے برکات و حسنات کا یہ کتنا ایمان افروز اور حیرت انگیز کرشمہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا پاک رسول ﷺ صرف آٹھ سال پیشتر بحالت بیچارگی مکہ مکرمہ سے نکل کر مدینہ منورہ پہنچے تھے۔ اس مختصر سی مدت میں غازیانہ

ملہ افادات شیخ الاسلام

صداقت کیش کی اتنی بڑی قوت پیدا ہو گئی جو سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے سرحد پر اس قیصر سے ٹکرانے کے لیے تیار تھی جو تھوڑا عرصہ پہلے ساسانی شاہنشاہی پر کاری ضرب لگا چکا تھا۔

کیا معنوی تربیت کے ذریعے مردم گری کے اس محیر العقول معجزے سے کسی کو بھی یارائے انکار ہو سکتا ہے یا اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

تبوک کا محلِ وقوع

تبوک حجاز کے منتہائے شمال میں اس شاہراہ پر واقع ہے جو شام کی طرف سے مدینہ منورہ یا مکہ مکرمہ آنے والے تجارتی قافلوں کا عام راستہ تھی اور ظہورِ اسلام کے بعد حج و زیارت کی غرض سے جو قافلے آتے جاتے رہے ان کا عام راستہ بھی یہی تھا موجودہ صدی کے اوائل میں سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے حجاز ریلوے تعمیر کرائی تھی تو اس کا اہم اسٹیشن تبوک تھا۔

مولانا آزاد مرحوم نے مدینہ منورہ سے تبوک کا فاصلہ ۶۱۰ کلو میٹر بتایا ہے۔ یہ فاصلہ سرسری حساب کے مطابق کم و بیش ۳۸۱ میل بنتا ہے سفرنامہ ارض القرآن میں مدینہ منورہ سے العلا تک فاصلہ ۵۰۰ میل اور العلا سے الحجر یا مدائن صالح کا فاصلہ تیس میل درج ہے۔ اگر ۵۲۰ میل کے اس فاصلے میں مدائن صالح سے تبوک کا فاصلہ بھی شامل کر لیا جائے تو پوری مسافت ۶۵۰ میل بنتی ہے۔

پرانے انداز بیان کے مطابق مدینہ منورہ اور تبوک کی درمیانی مسافت چودہ مرحلوں کی بتائی گئی ہے لیکن ۶۵۰ میل کے چودہ مرحلے فرض کرنا بہت مشکل ہے۔ ممکن ہے سفرنامہ ارض القرآن کا حساب صحیح نہ ہو یا ممکن ہے کہ کار کے میٹر کا حساب ملحوظ رکھا گیا ہو جسے خدا جانے کہاں کہاں چکر لگانا پڑا ہو۔ سب سے آخر میں ممکن ہے کہ کیلو میٹروں کو سہواً میل سمجھ لیا ہو۔

عزمِ تبوک کا سبب

عزم تبوک کا اصل سبب تھا کہ شمالی جانب سے مختلف خبریں آ رہی تھیں۔ قیصر روم حملہ کی تیاریاں خوب سرگرمی سے کر رہا ہے کیونکہ وہ جنگ موتہ کا بدلہ لینا چاہتا ہے جس میں صرف تین ہزار مجاہدین نے قیصر اور قبائلیوں کے کئی گنا زیادہ لشکر کو میدان سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت سے قیصر اور اس کے ماتحت سرحدی ریاستوں نے جن میں غسانی پیش پیش تھے عزم کر رکھا تھا کہ اسلامی قوت کو اوائل بلوغ ہی میں کچل ڈالیں مولانا شبلی فرماتے ہیں۔

شام کے بنطی سوداگر مدینہ میں روغن زیتون بیچنے آیا کرتے تھے انھوں نے خبر دی کہ رومیوں نے شام میں لشکر گراں جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہ تقسیم کر دی ہے اس فوج میں لخم و غسان کے تمام عرب شامل ہیں اور

مقدمۃ الجیش تک آگیا ہے۔ مواہب لدنیہ میں طبرانی سے روایت نقل کی ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا تھا کہ محمد ﷺ اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں اسی بنا پر ہرقل نے چالیس ہزار فوج روانہ کی۔

عیسائیوں کو اسلامی قوت اور اسلامی برکات کی صلاحیت توسیع و نفوذ کا بہتر اندازہ ہو گا کیونکہ وہ سرحد پر رہتے تھے۔ یہ نزدہ عربوں کے اسپال و عواطف سے پوری طرح آگاہ ہوں گے۔ اگر انہوں نے قیصر کو برانگیختہ کرنے کے لیے جھوٹی خبریں بھی بنالیں تو اس پر حیرت کیا ہے۔

کاشانۂ نبوت سے تیاری کا حکم

جب مختلف ذرائع سے قیصر کے عزم یورش کی تصدیق ہو گئی اور بظاہر شک و شبہ کا کوئی امکان باقی نہ رہا تو رسول اقدس ﷺ نے فیصلہ فرمالیا کہ جنگ ناگزیر ہے تو یہ حجاز کی شمالی سرحد پر ہونی چاہیے۔ اس میں کئی مصلحتیں تھیں۔

۱۔ ابتدائی مراحل ہی میں جنگ کو حملہ آور کے گھر میں پہنچایا جا سکتا ہے اور اپنے ملک کو تختہ مشق بننے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے دفاع کے لیے مستعدی کے ساتھ سرحد پر جانا بجائے خود دشمن کے جرات اقدام کو سرد کر سکتا تھا۔

۳۔ دشمن کسی ملک میں آتا ہے تو آبادی کے مختلف عناصر کو گوناں گوں ترغیبات سے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ حجاز کے شمالی حصوں کے قبائلی عناصر یا تو نئے نئے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے اور ابھی دین حق ان کے دلوں میں راسخ نہیں ہوا تھا یا وہ اسلام کی طرف مائل ہو رہے تھے لیکن دشمن کا اقدام ان مسلمانوں کو آزمائش میں ڈال سکتا تھا جنہیں اسلام قبول کیے زیادہ وقت نہیں گذرا تھا۔ اور ان کے لیے رکاوٹ کا باعث بن سکتا تھا۔

۴۔ دشمن کسی ملک میں آجاتا ہے تو آبادیوں کے امن و امان اور جان و مال کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور بہر حال بہت یا تھوڑے نقصان کا ضرور نشانہ بنتا ہے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے تبوک کے لیے تیاری کا حکم دے دیا اور تمام طبقوں خصوصاً اغنیاء کو فوج کے لیے سواریاں اور دوسرے مصارف کے انتظام کی طرف توجہ دلائی گئی۔

احوال و ظروف کی ناسازگاری

سوء اتفاق سے اس وقت گرد و پیش کے حالات خاصے ناخوشگوار تھے موسم شدید گرم تھا۔ سفر بہت طویل راستہ دشوار گذار تھا

خشک سالی کے باعث قحط کی سی حالت تھی۔ پھل پکنے والے تھے لیکن معاملہ اسلام کی حفاظت کا تھا جس پر تمام مسلمانوں کے ایمان جان و مال کی حفاظت کا انحصار تھا مختلف اصحاب نے انفاق میں بڑی فراخ حوصلگی سے حصہ لیا مثلاً۔

۱۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے پورا مال خدمتِ رسالت میں پیش کر دیا۔ یہاں تک کہ کُرتے کے بٹن بھی توڑ کر دے دیئے

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے پورے مال کے دو حصے کیے۔ ایک حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

۳۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ نے تین سو اونٹ ساز و سامان کے ساتھ حاضر کیے اور ایک ہزار دینار قاضی سلمان منصورپوری لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان نے نو سو اونٹ ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کیے۔ اور بعض جیش العسرہ کے لقب سے نوازے گئے۔

۴۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ نے چالیس ہزار درہم پیش کیے۔

۵۔ خواتین نے زیورات پیش کیے۔

۶۔ حضرت ابوعقیل انصاری رضی اللہ تعالیٰ نے رات بھر کنوئیں کا پانی نکال کر ایک کھیت سیراب کیا۔ اور مزدوری میں چار سیر کھجوریں ملیں اس میں سے دو سیر بارگاہ نبوت میں پیش کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ یہ کھجوریں پورے مال پر بکھیر دیں۔

غزوہ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے

جو لوگ غزوہ تبوک میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ گئے اور پیچھے رہ جانے کی وجہ سے مخلصین کہلائے ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ منافقین جو بے بنیاد عذر پیش کر کے گھروں میں بیٹھے رہے۔

۲۔ وہ مخلص اور جان نثار مساکین جن کے پاس نہ سواری کا انتظام تھا اور نہ وہ توشہ و زاد راہ کی استطاعت رکھتے تھے وہ اپنی بیچارگی پر بے اختیار روتے تھے اس لیے البکائین کہلائے۔

۳۔ بعض مخلصین سے بھی سہل انگاری ہوئی۔ سوچتے اور پروگرام بناتے وقت نکل گیا۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

آدمیوں کی کثرت، سواریوں کی قلت اور مزدوری ساز و سامان کی کمی کے باعث تبوک جانے والے لشکر کو جیش العسرہ کہا گیا ہے۔ چونکہ اس غزوہ کی وجہ سے منافقین کا پردہ بالکل تار تار ہو گیا تھا اور ان کی بہت رسوائی ہوئی تھی اس لیے اس غزوہ کا نام غزوہ فاضحہ بھی ہے اور اسی وجہ سے سورہ توبہ کا ایک نام سورہ فاضحہ بھی ہے۔

اخلاص کے ایمان افروز نمونے

سفر بہت طویل تھا راستہ میں کوئی پیچھے رہ جاتا اور حضور اقدس ﷺ یہ سنتے فرماتے کہ اسے چھوڑ دو۔ اگر اس میں کوئی بھلائی ہے تو وہ ضرور تم سے آملے گا۔ اور اگر اس کی حالت کچھ اور ہے تو سمجھ لو کہ خدا نے تمہیں بچا لیا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اونٹ راستہ میں سست ہو گیا اور وہ پیچھے رہ گئے اونٹ بیٹھ گیا اور وہ رک گئے اونٹ کی قوت رفتار سے مایوس ہو گئے۔ تو سامان خود اٹھا کر لشکر کے نقش ہائے قدم پر پیدل چلنے لگے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک منزل پر قیام فرما تھے تو کسی نے دیکھا کہ کوئی شخص پیدل آ رہا ہے حضور ﷺ سے عرض کیا گیا تو فرمایا ابوذر ہوں گے۔ چنانچہ وہی نکلے۔

حضرت ابوخیثمہ کا واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ رسول اللہ ﷺ روانہ ہو چکے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ میں تیزی اور گرمی تھی۔ حضرت ابوخیثمہ کی دونوں بیویوں نے پانی چھڑک چھڑک کر اپنے مکان ٹھنڈے کیے۔ کھانا تیار کر لیا۔ پینے کے لیے ٹھنڈا پانی لا رکھا۔ ابوخیثمہ آئے تو دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ بیویوں کے اہتمام پر نظر ڈالی۔ پھر بولے حضور اقدس ﷺ تیز دھوپ اور گرم ہوا میں ہوں اور ابوخیثمہ بیویوں کے پاس بیٹھ کر کھانا کھائے۔ یہ انصاف نہیں۔ خدا کی قسم میں کسی بھی مکان میں ہرگز داخل نہ ہوں گا۔ جب تک رسول اللہ ﷺ سے نہ مل جاؤں۔ چنانچہ سواری کے لیے اونٹ منگایا اور اسی وقت روانہ ہو گئے۔ حضور اقدس ﷺ تبوک پہنچ چکے تھے۔ کسی نے اطلاع دی دور کوئی آ رہا ہے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ابوخیثمہ ہوں گے پاس آئے تو ابوخیثمہ تھے۔ گویا پیچھے رہ جانے کے نتیجے میں تنہا سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے لشکر سے جا ملے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضور اقدس ﷺ نے مدینے سے روانگی کے وقت محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عامل مدینہ مقرر کیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اہل بیت کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا۔ حضور اقدس ﷺ جرف میں تھے اسی اثناء میں منافقین نے یہ بات بنائی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ اس لیے چھوڑ گئے کہ ان سے حضورؐ کو کچھ سرگرانی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بات سنی تو فوراً تبوک کے لیے روانہ ہو گئے اور جرف میں حضورؐ سے جا ملے۔ عرض کیا کہ آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں فرمایا کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمہیں میرے سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔

واقعہ یہی ہے کہ سفر طویل تھا اور انجام کا علم نہ تھا کہ کیا صورت پیش آئے گی اس لیے اہل بیت کے لیے کسی قریبی رشتہ دار

کو مقرر کرنا مدینہ میں مصلحت تھا چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

سفر میں دیارِ ثمود سے گذر

تبوک جاتے ہوئے راستہ میں صرف ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے الحجر (مدائن صالح) یعنی دیارِ ثمود پہنچتے ہی حکم دے دیا کہ یہاں کا نہ پانی پیا جائے نہ اس پانی سے وضو کیا جائے نہ اس سے آٹا گوندھا جائے۔ اگر کسی گوندھ لیا ہو تو وہ اونٹ کو کھلا دے صرف ایک کنواں مستثنیٰ رکھا گیا جو حضرت صالح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ کا تھا جس سے آپ کی اونٹنی پانی پیتی تھی اسی لیے اسے بیر ناقہ کہتے تھے۔ خود حضور اقدس ﷺ اس مقام سے گذرے تو چہرۂ اقدس پر پردہ ڈال لیا اور سواری کو تیز چلایا تاکہ جلدی گذر جائیں۔

حضور اقدس ﷺ کا طریقہ یہی تھا کہ جن مقامات میں مجرم قومیں غضب ایزدی کا نشانہ بن چکی تھیں وہاں سے جلد از جلد گذر جاتے عرفات کے راستہ میں وادی محسر آتی ہے یہاں اصحاب فیل پر عذاب آیا تھا۔ اس وادی سے عرفات آتے جاتے جلد گذر جانے کا دستور تھا۔

تبوک میں مقام

تبوک پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کم و بیش بیس روز تیام فرما رہے اس عرصہ میں نہ قیصر اور غسانیوں کی کسی فوج کا نہ ملانہ حملہ کی تیاری کے متعلق کچھ معلوم ہو سکا۔ ان حالات میں جنگ کا کونسا امکان تھا ممکن ہے کہ غلط افواہوں کا فتنہ سرحد کے نصرانی قبیلوں اور غسانیوں نے برپا کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جہاد کے لیے مسلمانوں کی بے مثال مستعدی دیکھ کر دشمنوں کا عزم یورش مضمحل ہو گیا ہو۔ موتہ کا تجربہ ان کے سامنے تھا جس میں تین ہزار نے کم از کم تنتیس گنا لشکر کو ہراساں کر دیا تھا۔ تبوک میں تو تیس ہزار جانباز آمادہ پیکار تھے اور ان کی قیادت خود حضور اقدس ﷺ بنفس نفیس فرما رہے تھے۔

اہل ایلہ کے لیے امان نامہ

ایلہ جسے آج ایلات کہتے ہیں اور وہاں اسرائیل نے بندرگاہ بنالی ہے۔ عقبہ کے پاس ہے۔ اس کا مسیحی حاکم یحنہ بن روبہ خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور جزیہ دینے کا اقرار کر کے اس نے امان نامہ حاصل کیا جس کا مضمون یہ ہے۔

یہ اللہ کی طرف سے اور محمد النبی کی طرف سے جو اللہ کے رسول ہیں یحنہ بن روبہ اور اہل ایلہ کے لیے امان نامہ ہے۔ سمندر میں ان کی کشتیوں اور جہازوں، نیز خشکی کے راستوں میں ان کے قافلوں اور مسافروں کے لیے اللہ اور اللہ کے

رسول کا ذمہ ہے اس ذمہ داری میں اہل شام اہل یمن یا سمندر میں کشتی بازی کرنے والے وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ان کے پاس رہتے ہیں اگر ان میں سے کوئی شخص معاہدے کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کا مال اس کی جان بچانے میں حائل نہ ہوگا وہ اس کے لیے حلال ہوگا جو اسے لے لے۔ یہ جائز نہ ہوگا کہ جو پانی ان کے ہاں جاتا ہے اسے بند کیا جائے یا خشکی یا تری میں جس راستے وہ جانا چاہیں انہیں روکا جائے [1]

اہل جربا اور اہل اذرح

جربا اور اذرح دونوں قریب قریب ہیں اور دونوں معان کے نزدیک ہیں ان دونوں جگہوں کے باشندے بھی تبوک کے زمانے میں امان نامے حاصل کرنے آئے۔ ان کے لیے شرطیں یہ تھیں۔

۱۔ ماہ رجب میں ایک سو دینار ادا کرتے رہیں۔

۲۔ اگر مسلمانوں سے کوئی شخص کسی جرم پر تعزیر کے اندیشہ سے ان کے ہاں پہنچ جائے تو مسلمانوں کے حوالے کردیں۔

دومۃ الجندل

یہ وادی سرحان کے جنوبی سرے پر واقع ہے آج کل اس کو جوف کہتے ہیں جو شمال نجد کا مشہور مقام ہے دومہ یا دوما دراصل حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے کا نام ہے اس کی اولاد جہاں آباد ہوئی وہ جگہ آغاز میں دومہ کہلائی۔ اس کا ذکر بائبل میں بھی مختلف جگہ آتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارض القرآن میں اس کی توضیح کی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن الولید کو چار سو بیس سواروں کے ساتھ دومۃ الجندل بھیجا جو کم و بیش پانچ مرحلوں پر تھا۔ مدینہ منورہ سے اس کی مسافت پندرہ رات بتائی گئی ہے۔ اکیدر بن الملک وہاں کا حاکم تھا جو بنی کندہ میں سے تھا وہ مذہبًا نصرانی تھا۔ بتلاتے ہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ دومۃ الجندل پہنچے تو چاندنی رات تھی اور اکیدر شکار کھیل رہا تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حملہ کردیا اکیدر قید ہوگیا اس کے بھائی نے جنگ کی اور مارا گیا۔ آخر اکیدر سے معاملہ طے کرلیا گیا۔ اس نے دو ہزار اونٹ آٹھ سو گھوڑے، چار سو زرہیں اور چار سو نیزے دینے منظور کیے۔ پھر حضرت خالد اکیدر اور اس کے بھائی کو ساتھ لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے۔ جزیہ ادا کرنے کی شرط پر نہ صرف اکیدر کو رہا کیا گیا بلکہ دومۃ الجندل کے علاوہ تیما کی حکومت بھی اسی کے سپرد کردی گئی۔ اسی طرح ایلہ کے علاوہ تبوک کا انتظام بھی یحنہ بن رؤبہ کے سپرد کردیا گیا۔ یاد رہے کہ تیما بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں تیما ان کے ہی نام سے آبادی کا نام ہے تیما تبوک سے ایک سو ستر میل جنوب میں واقع ہے

روانگی اور واپسی کی تاریخ

تمام روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ رجب ۹ھ میں تبوک گئے تھے تاریخ کسی نے نہیں لکھی ہے ان ہجرات کا بتایا گیا ہے۔ مدینہ منورہ رمضان ۹ھ مطابق دسمبر ۶۳۰ء واپس تشریف لائے۔ واپسی کی تاریخ بھی کہیں نظر سے نہیں گزری۔ ۲۰ روز یا ایک دو دن کم یا زیادہ آپ تبوک میں قیام پذیر رہے۔

جہاد کی ترغیب

(۴۱) اے ایمان والو تمہیں کیا ہو گیا جب تم سے راہ خدا میں قدم اٹھانے کو کہا جاتا ہے تو تم زمین میں ڈھے جاتے ہو کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی میں مگن ہو گئے ہو۔ یاد رکھو آخرت کے مقابلے میں سامان دنیا کی حیثیت بالکل تھوڑی ہے یعنی کچھ بھی نہیں ہے۔ آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جو اپنی تن آسانیوں اور مفاد پرستیوں کی وجہ سے جہاد کی حضور اقدس ﷺ کی جانب سے منادی ہونے کے باوجود اس سے جی چرا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہو اور ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرتے ہو۔ ایمان کے تقاضے پورا کرنے کا وقت آتا ہے تو تمہارا یہ حال ہو جاتا ہے کہ ایمان کے تقاضے کے بوجھ سے تمہاری گردن ٹوٹ گئی ہو اور تمہارے لیے اٹھنا دشوار ہو۔ آگے استفہامیہ فقرے ارضیتم بالحیاۃ الدنیا فرما کر ان کی اصل دکھتی رگ کی نشاندہی کر دی ہے۔ بیماری یہ ہے کہ تم لوگ آخرت اور اس کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی زندگی اور اس کی وقتی لذتوں پر قانع ہو گئے ہو تم سمجھتے ہو کہ یہی دنیا سب کچھ ہے اور تم اس نقد لذت کو کسی ادھار لذت کی خاطر چھوڑنا نہیں چاہتے ہو۔ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی کے مقابلہ میں کیا ہے۔ تم کیسی حقیر زندگی کے لیے کیسی لازوال پر شوکت اور شاندار زندگی کھو رہے ہو۔ دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی سے قطرہ اور سمندر کی یا ذرے اور آفتاب کی نسبت بھی زیادہ ہے فمامتاع الحیاۃ الدنیا فی الاخرۃ الا قلیل۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ عالم آخرت کی بے پایاں زندگی اور وہاں کے بے حد حساب ساز و سامان کو جب تم دیکھو گے تب تمہیں معلوم ہو گا کہ دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں لطف اندوزی کے جو بڑے بڑے امکانات تم کو حاصل تھے اور زیادہ سے زیادہ جو اسباب عیش تم کو میسر تھے وہ ان غیر محدود نعمتوں کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ دنیا کی ساری نعمتیں محدود اور معدود ہیں اور آخرت کی نعمتیں لامحدود اور لامعدود ہیں اور اس وقت تم کو اپنی ناعاقبت اندیشی و کم نگاہی پر افسوس ہو گا کہ تم نے کیوں ہمارے سمجھانے کے باوجود دنیا کے عارضی اور قلیل منافع کی خاطر اپنے آپ کو ان ابدی اور کثیر منافع سے محروم کر لیا۔ دوسرے یہ کہ متاع حیاۃ دنیا آخرت میں کام آنے والی چیز نہیں ہے یہاں تم خواہ کتنا ہی سر و سامان مہیا کر لو موت کی آخری ہچکی کے ساتھ ہر چیز

دست بردار ہونا پڑے گا اور سرحد موت کے دوسری طرف جو عالم ہے وہاں ان میں سے کوئی چیز تمہارے ساتھ نہ جائے گی وہاں اس کا کچھ حصہ تم پا سکتے ہو تو صرف وہی چیز جسے تم نے خدا کی رضا پر قربان کیا ہو اور جس کی محبت پر تم نے خدا اور اس کے دین کی محبت کو ترجیح دی ہو۔

قرآن میں نفاق کی رونمائی

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن منافقین کی طرف ہے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

یہ ان لوگوں پر عتاب کا آغاز ہے جو غزوہ تبوک میں حضور کے ساتھ نہیں گئے تھے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

اس موضوع پر کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیات ان لوگوں کے عتاب میں جو غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے نازل ہوئی ہیں۔

اگر ایسا ہے اور ایسا نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب بات متفق علیہ ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ دور نبوت میں منافقین کسی سازشی گروہ کا نام نہیں جو مسلمان نہ ہوں۔ بلکہ یہ سب مسلمان تھے اور جانے پہچانے مسلمان تھے پورے معاشرہ میں ان کے نامسلمان ہونے کا کسی کو کوئی شائبہ نہ تھا اور شائبہ کیسے ہو سکتا تھا جب کہ قرآن ان کو خود یاایھا الذین آمنوا کہہ کر مخاطب کر رہا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔

مستعد اور صالح انسان یہ ہر اچھی بات کو پہچان لیتے ہیں اور قبول کر لیتے ہیں اور پھر سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

مفسد قسم کے لوگ یہ ہر اچھی بات کا انکار کرتے ہیں کبھی سیدھی بات کو یہ قبول ہی نہیں کرتے۔ انکار ان کی طبیعت ہوتا ہے

درمیانے لوگ یہ ہر بات کو سن لینے اور مان لینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن ان میں فی الواقع تیاری نہیں ہوتی ہے۔ وہ قدم تو اٹھاتے ہیں مگر چلنا نہیں چاہتے۔ اور چلتے ہیں تو پہلے قدم میں لڑکھڑا جاتے ہیں نہ ان میں پہلے گروہ کی مستعدی ہوتی ہے اور نہ ان میں دوسرے گروہ کی بے باکی ہوتی ہے کہ صاف انکار کر دیں۔ اقرار کی حد تک وہ پہلے گروہ کے ساتھ ہوتا ہے لیکن جہاں تک اذعان وعمل کا تعلق ہے وہ دوسرے گروہ جیسا ہوتا ہے۔ مذبذبین بین ذالك لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء جزم ویقین اور عزم وعمل پہلے گروہ کا خاصہ ہے۔ انکار و جحود دوسرے کا اور شک و تذبذب اور بے عملی و تعطل تیسرے کا۔ بعینہٖ یہی حال ایمان وعمل کے دائرہ کا بھی ہے یہاں بھی طبیعت انسانی کی تینوں حالتیں ظہور میں آئی ہیں مستعد طبیعتیں قبول کر لیتی ہیں اور چل پڑتی ہیں یہ مومن ہیں مفسد انکار کرتے اور مخالفت پر کمر کس لیتے ہیں یہ کافر ہیں کچھ

لوگ قبول کر لیتے ہیں لیکن فی الحقیقت قبول کی روح ان کے اندر نہیں ہوتی یہ منافق ہیں۔ قرآن نے کفر کی طرح نفاق کے اعمال و خصائص بھی پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں، کیونکہ کفر کی طرح نفاق بھی محض زمانہ نزول قرآن کی پیداوار نہیں، ہمیشہ ظہور میں آنے والی گمراہی تھی اور انسانوں کی گمراہیاں کسی خاص زمانے جگہ اور قوم کی نہیں بلکہ نوع انسانی کی گمراہیاں ہوتی ہیں ایسے ہی قرآن کے مخاطبوں میں بھی یہ تین قسمیں تھیں فتح مکہ کے بعد اکثر لوگ مسلمان ہو گئے ان میں دو طرح کے مسلمان تھے۔ مخلصین بھی تھے اور وہ بھی تھے جنھوں نے اسلام کو بطور دین و اعتقاد اسی طرح اپنایا تھا جیسے دوسرے مسلمانوں نے وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے ان کے گھر کا ہر فرد یقین کرتا تھا کہ ہم مسلمان ہیں وہ نماز پڑھتے تھے روزہ رکھتے تھے اسلامی طور و طریقے پر اولاد کی پرورش کرتے تھے جہاں تک کسی دین کو اختیار کر لینے کا تعلق ہے کوئی بات ایسی نہ تھی جو بظاہر ان کے مسلمان ہونے کے خلاف ہو لیکن اسلام کا گھونٹ تو انھوں نے پی لیا تھا مگر حلق کے نیچے نہیں اترا تھا کسی تعلیم کو مان کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو روح پیدا ہونی چاہیے اس سے یک قلم محروم تھے وہ اللہ کا کلام سنتے مگر اس لیے نہیں کہ عمل کریں بلکہ اس لیے کہ صرف سنتے رہیں۔ اخلاص اور صداقت کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ نماز پڑھتے مگر بے دلی کے ساتھ خیرات کرتے مگر مجبور ہو کر ان کے دلوں میں دین سے زیادہ دنیا کا عشق تھا۔ اسلام کے جو احکام ان کے شخصی اغراض کے خلاف نہ ہوتے ان پر خوش خوش عمل کرتے۔ جو خلاف ہوتے ان سے نکل بھاگنا چاہتے۔ جب کبھی خوشحالیوں کا موقعہ ہوتا تو وہ سب سے پہلے مومن ہوتے۔ جب کبھی قربانیوں کا موقع آ جاتا تو سب سے آخری صفوں میں بھی دکھائی نہ دیتے۔ جہاد کے تصور سے ان کی روحیں لرز جاتیں انفاق کا حکم ان کے لیے پیام موت ہوتا۔ اسلام کے دشمنوں سے سازگاریاں رکھنے میں انہیں کچھ تامل نہ ہوتا۔ وہ سمجھتے کہ دونوں طرف ملتے رہنے میں ہی مصلحت ہے۔ اگر بازی الٹ پڑی اور دشمن فتح یاب ہو گئے تو ان کے پاس بھی اپنی جگہ بنی رہے گی یہ تھے منافقین جن کو قرآن　　یہاں یاایھا الذین آمنوا سے مخاطب کر رہا ہے۔ اس موضوع پر پوری تفصیل حدیث اور قرآن کی روشنی میں انشاء اللہ گیارہویں جلد میں آ رہی ہے وہاں انشاء اللہ پوری شرح و بسط سے بحث ہو گی۔

آیت قرآنی کا مطالبہ

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان آیات میں تاریخ کے خاص واقعہ کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں دین کی برتری کے لیے محنت کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ غزوۂ تبوک ہونا نہیں بلکہ ہو چکا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کی ان کمزوریوں کی نشاندہی کر کے جو غزوہ تبوک میں پیش آ چکی تھیں ان کا علاج بتایا جا رہا ہے۔ کیونکہ عرب میں اسلام کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد دوسرا اہم مرحلہ جو سامنے تھا وہ یہ تھا کہ عرب کے باہر دین حق کا بول بالا کیا جائے۔ اس معاملہ میں روم و ایران کی قوت سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اور نا گزیر تھا کہ عرب کے کام سے فارغ ہونے کے بعد ان سے تصادم ہو۔ حضور اقدس ﷺ ان کو دعوت اسلام کے خطوط روانہ کر چکے تھے اس لیے جن لوگوں نے تبوک کے موقعہ پر سستی و کمزوری دکھائی ان کو مخاطب کیا گیا اور

خطاب میں شدت عتاب ظاہر کی گئی آغاز ہی مالکم سے کیا ہے یہ کلمہ ملامت و توبیخ ہے یعنی تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ اور یہ فرمانے کے بعد اس بیماری کا ذکر کردیا جس کی وجہ سے حوصلے پست ہوجاتے ہیں۔ یعنی دنیا اور اس کی چیزوں کی محبت ارضیتم بالحیاۃ الدنیا من الاخرۃ کیا تمہیں آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی بھاگئی۔ یہ اصل بیماری ہے اور امت میں سارے فساد کی جڑ ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا قریب ہے کہ دنیا کی قومیں باہم ایک دوسرے کو تمہیں مٹانے کی دعوت دیں گی ایسے جیسے کھانے والے ایک دوسرے کو کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ ایک شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ کیا ہماری تعداد کم ہوجائے گی فرمایا نہیں بلکہ تمہاری کثرت ہوگی لیکن ایسے ہو گے جیسے سیلاب کا کوڑا کرکٹ اللہ سبحانہ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا دبدبہ ہٹادیں گے اور تمہارے دلوں میں ڈال دیں گے کسی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ وہن کیا ہوتا ہے فرمایا دنیا کی محبت اور موت کی ناگواری (ابوداؤد۔ بیہقی۔ مشکوۃ)

مرض کی نشاندہی کرنے کے بعد اس کا علاج بھی تجویز فرمادیا فما متاع الحیوۃ الدنیا فی الاخرۃ الا قلیل۔ دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑا ہے۔ دنیا میں ہر نعمت محدود اور معدود ہے اور آخرت میں ہر نعمت لامحدود اور لامعدود ہے۔ اس کا دھیان رکھو۔ اس کا یقین کرو اور اس کا مراقبہ کرو تو دنیا کی محبت کافور ہوجائے گی آخرت اور اس کی نعمتوں سے محبت ہوجائے گی۔ صحابہ کے زمانہ میں امت کے لیے اصل اور قوی ترین محرک اور داعیہ عمل یہی ہے۔ جیسا کہ قرآن عزیز کی بے شمار آیتوں سے ظاہر اور روشن ہے۔ احادیث میں اس کی بھرپور وضاحت ہے۔ حافظ ابن کثیر نے مسند امام احمد کے حوالے سے حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

دنیا کی ساری نعمتیں آخرت کے مقابلے میں ایسی ہیں جیسے سمندر کے پانی کے مقابلہ میں انگلی پر لگا ہوا پانی جو حیثیت سمندر کے پانی کے مقابلے میں انگلی پر لگے ہوئے پانی کی ہے وہی حیثیت آخرت کے مقابلے میں دنیا کی ہے

بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ روشن خیالی۔ تہذیب، تمدن کی ترقیوں نے مادیت کے اس دور میں اسی قوی ترین محرک اور موثر ترین داعیہ کو سب سے زیادہ کمزور کردیا ہے اب مسلمانوں کو آخرت سے اس قدر بیگانہ کردیا گیا کہ انکو روٹی کپڑے مکان کا لالچ دیا جاتا ہے۔ کہاں جنت اور اس کی نعمتوں کا لالچ اور کہاں روٹی کپڑے مکان کا لالچ این الثریا واین الثری فانا للہ والی اللہ المشتکیٰ۔ یاد رکھو یہ بیماری ہے اور اس بیماری کا علاج صرف اور صرف فکر آخرت ہے۔ صحابہ کی ساری کامیابیوں کا راز ذکر اللہ اور فکر آخرت میں چھپا ہوا ہے۔ جس قدر اللہ کا ذکر ہوگا اور فکر آخرت ہوگا۔ اسی قدر اہل ایمان کی کامیابی ہوگی۔ مسلمان کی زندگی ذکر اللہ سے خالی اور فکر آخرت سے بیگانہ نہیں ہوتی ہے۔

قوموں میں قانونِ استبدال

(۴۲) اگر تم راہِ خدا میں قدم نہ اٹھاؤ گے تو اللہ تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہارے بدلے میں اور لوگ لے آئے گا اور تم اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ یعنی اللہ سبحانہ کا کام تم پر موقوف نہیں ہے۔ تم اگر سستی کرو گے تو وہ اپنی قدرت کاملہ سے کسی دوسری قوم کو دینِ حق کی خدمت کے لیے کھڑا کر دے گا تم اس سعادت سے محروم رہو گے جو تمہارے ہی نقصان کا موجب ہے ؎

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمیکنی   منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت[1]

یہ بھی تنبیہ ہے کہ اگر تم خدا کی راہ میں جہاد کے لیے نہ اُٹھے تو خدا کے دردناک عذاب کی پکڑ میں آ جاؤ گے اور یہ خیال نہ کرو کہ تمہارے نہ اٹھنے سے اللہ سبحانہ کا کچھ بگڑ جائے گا۔ تمہارا جہاد کرنا خود تمہارے لیے موجب سعادت ہے ورنہ اللہ سبحانہ کا کوئی کام تم پر منحصر نہیں ہے وہ اپنے دین کی حمایت و نصرت کے لیے اوروں سے کام لے لے گا اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کا کام کچھ تم پر منحصر نہیں ہے کہ تم کرو گے تو ہو گا ورنہ نہ ہو گا۔ فی الواقع یہ تو اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے دین کی خدمت کے لیے تمہیں موقع دے دیا ہے اگر تم یہ کام نہ کرو گے تو اللہ سبحانہ تمہیں اس مقام سے ہٹا کر کسی دوسری قوم کو اس کی توفیق بخش دے گا۔

دراصل اس آیت میں قانونِ استبدال بتایا جا رہا ہے یعنی کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو کہ اگر تم نے ادائے فرض میں کوتاہی کی تو اللہ سبحانہ کا قانون یہ ہے کہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا۔

اللہ سبحانہ کی حکمت نے افراد کی طرح جماعتوں کی زندگی و بقا و قیام کے لیے بھی ایک خاص نظام مقرر کر دیا ہے اور اسی کے مطابق ایک جماعت کی جگہ دوسری جماعت۔ اور ایک قوم کی زندگی دوسری قوم کی زندگی سے ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ افراد کے نظامِ حیات کی طرح جماعتوں کا نظامِ حیات بھی جدوجہد سعی و طلب، فکر و عمل کی صلاحیت کا نظام ہے اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب و آرزو وہ اصلی قوت ہے جو اقوام و ملل کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد مقاصد کی کشش اس کی جدوجہد کا اصل محرک ہے مقصد اور نصب العین ہی سے زندگی میں ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے اور انسانی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہونے لگتی ہیں۔ یہی حال اسلام کے نظام کا ہے یہ پورا نظام لیظہرہ علی الدین کلہ اور دینِ حق کے قیام کی سعی و طلب پر استوار ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ خدا کی زمین پر بس اسی کی بندگی اور پرستش کی جائے۔ اگر خدا کے سوا کہیں کسی کی پرستش یا بندگی ہو رہی ہے تو قرآن کی زبان

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں یہ فتنہ ہے۔ یہ فتنہ دیوتاؤں، بتوں کی شکل میں ہو یا قومی مفاد کی صورت میں ہو یا آمروں لیڈروں اور بادشاہوں کا بھیس بدل کر آئے۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ اس نصب العین کی خدمت انجام دے کہ اللہ کا تقرب حاصل کرے۔ اسلام کی اخلاقی قدروں اور قرآن کے معیار خیر و شر کو سارے عالم پر حکمران بنا کر اللہ کو راضی کرے فرمایا اگر اس مقصد کو لے کر تم نہیں اٹھو گے تو اللہ سبحانہ تمہیں دردناک سزا دے گا یعنی تمہیں قحط سے ہلاک کر دے گا یا کسی دشمن کو تم پر مسلط کر کے سنگین سزا دے گا قاضی بیضاوی نے ایسا ہی لکھا ہے اور تمہیں ہٹا کر کوئی ایسی قوم لائے گا جو تمہاری مغائر ہو گی۔ یہ بھی وعید ہے بلکہ دھمکی میں تشدید ہے مطلب ہے کہ ایسے لوگ ہوں گے جنہیں نصب العین سے عشق ہو گا اور اسے حاصل کرنے کے لیے ان میں طلب اور سعی ہو گی۔ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ان میں طاعت کی سرشاریاں ہوں گی۔ اللہ نے اپنے رسول کی نصرت کا وعدہ کیا ہے اور یہ بھی اس کا فیصلہ ہے کہ اسلام اور دین حق کا بول بالا ہو کر رہے گا۔ اگر تمہارے ذریعے یہ کام نہ ہو گا تو اور ذریعے سے ہو گا۔ اللہ کے دین کی برتری میں تمہارا تساہل اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔ اللہ کو پوری پوری قدرت حاصل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمہیں اصلاح عالم کے لیے تیار کیا گیا ہے اور تمہیں بھی یہ کام کرنا ہے۔ تمہیں صرف اپنے کو دوزخ سے نہیں بچانا بلکہ پورے عالم کو جہنم سے بچانا ہے۔ اسی لیے تم کو امت وسط اور خیر امت بنایا ہے۔ اگر تم ہی دنیا کے مشاغل میں لگ کر اس کام کو نہیں کرو گے تو اللہ سبحانہ تمہیں بھی معزول کر دے گا جیسا کہ پہلے بنی اسرائیل کو معزول کر چکا ہے

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ اللہ کے علم میں ہے کہ شرط و جزا اس میں کوئی بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو گی اس لیے شارحین قرآن کا یہ کہنا کہ اہل فارس یا اہل یمن ان کی جگہ لیں گے بالکل بے محل اور بے جوڑ بات ہے یہ تو کام پر ابھارنے کے لیے صرف انداز تہدید ہے ورنہ حضور اقدس ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد ہی ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاح عالم کے لیے تیار کرنا تھا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بات پوری وضاحت سے سمجھائی ہے۔

> وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف ہدایت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے۔ پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے ان کے ذریعے وہ پوری روئے زمین میں جہاد کرتا ہے اور ان کو وہ شہروں اور ملکوں میں پھیلا دیتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس [1]

اس جماعت کا یہ تربیتی کورس ہے۔ نادان اس قسم کی آیات سے شکوک و شبہات میں پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ضرور پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جو باتیں کہی جا رہی ہیں ان کا تربیت سے تعلق ہے۔

دین کی نصرت اور ہجرت

(۴۲) اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہ کرو گے تو کوئی پروا نہیں، اللہ نے تو اپنے رسول کی اس وقت بھی مدد کی ہے جب

[1] حجۃ اللہ البالغہ

کافروں نے اس کو اس حال میں گھر سے بے گھر کیا کہ اللہ کا رسول دو میں سے دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غمگین نہ ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے پھر اللہ نے اس پر اپنا سکون و قرار نازل کیا اور امداد کے لیے ایسی فوجیں روانہ کیں جو تمہیں نظر نہیں آرہی تھیں اور بالآخر اللہ نے اہلِ کفر کی بات کو پست کر دیا۔ اور اللہ کی بات تو ہمیشہ اونچی ہوتی ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ یعنی بالفرض اگر تم نبی کریم ﷺ کی مدد نہ کرو گے نہ سہی۔ ان کا منصور و کامیاب ہونا کچھ تم پر موقوف نہیں ایک وقت پہلے ایسا ہو چکا ہے جب ایک یارِ غار کے سوا کوئی آپ کے ساتھ نہ تھا۔ معدودے چند مسلمان مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آکر ہجرت کر گئے تھے آخر آپ کو بھی ہجرت کا حکم ہوا۔ مشرکین کا آخری مشورہ قرار پایا تھا کہ ہر قبیلہ کا ایک نوجوان منتخب ہو اور وہ سب مل کر بیک وقت آپ پر تلواروں کی ضرب لگائیں۔ تاکہ خون بہا دینا پڑے تو سب قبائل پر تقسیم ہو جائے اور بنی ہاشم کی یہ ہمت نہ ہو کہ خون کے انتقام میں سارے عرب سے لڑائی مول لیں جس شب میں اس ناپاک کارروائی کو عملی جامہ پہنانے کی تجویز تھی۔ حضور اقدس ﷺ نے اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لٹایا تاکہ لوگوں کی امانتیں احتیاط سے آپ کے بعد مالکوں کے حوالہ کر دیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تسلی فرمائی کہ تمہارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ پھر خود بنفس نفیس ظالموں کے ہجوم میں سے شاہت الوجوہ فرماتے ہوئے اور ان کی آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے صاف نکل آئے حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لیا اور مکہ سے چند میل ہٹ کر غارِ ثور میں قیام فرمایا یہ غار پہاڑ کی بلندی پر ایک بھاری مجوف چٹان ہے۔ جس میں داخل ہونے کا صرف ایک راستہ تھا۔ وہ بھی ایسا تنگ کہ انسان کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر اس میں گھس نہیں سکتا۔ صرف لیٹ کر داخل ہونا ممکن تھا۔ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اندر جا کر صاف کیا۔ سب سوراخ کپڑے سے بند کیے کہ کوئی کیڑا کانٹا گزند نہ پہنچا سکے۔ ایک سوراخ باقی تھا اس میں اپنا پاؤں اڑا دیا۔ سب انتظام کر کے حضورؐ سے اندر تشریف لانے کو کہا۔ آپ صدیق اکبرؓ کے زانو پر سر رکھ کر استراحت فرما رہے تھے کہ سانپ نے ابوبکرؓ کے پاؤں کو ڈس لیا مگر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پاؤں کو حرکت نہ دیتے تھے۔ مبادا حضور کی استراحت میں خلل پڑے جب آپؐ کی آنکھ کھلی اور قصہ معلوم ہوا تو آپ نے لعاب مبارک صدیق کے پاؤں کو لگا دیا جس سے فوراً شفا ہو گئی۔ ادھر کفار قائف کو ہمراہ لے کر جو نشانہائے قدم کی شناخت میں ماہر تھا حضور اقدس ﷺ کی تلاش میں نکلا اس نے غارِ ثور تک نشانِ قدم کی شناخت کی مگر خدا کی قدرت کہ غار کے دروازے پر مکڑے نے جالا تن لیا اور جنگلی کبوتر نے انڈے دے دیئے یہ دیکھ کر سب نے قائف کو جھٹلا دیا اور کہنے لگے یہ مکڑی کا جالا تو محمد رسول اللہ کی ولادت سے بھی پہلے کا ہے۔ اگر اندر کوئی داخل ہوتا تو یہ جالا اور انڈے کیسے سالم باقی رہتے۔ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کو اندر سے کفار کے پاؤں نظر پڑتے تھے انہیں فکر تھی کہ جان سے زیادہ محبوب جس کے لیے سب کچھ فدا کر چکے ہیں۔ دشمنوں کو نظر نہ پڑ جائیں۔ گھبرا کر کہنے لگے کہ یا رسول اللہ ان لوگوں نے اگر ذرا جھک کر اپنے قدموں کی طرف نظر کی تو ہم کو دیکھ پائیں گے حضورؐ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ تیرا

کیا خیال ہے ان دو کی نسبت جن کا تیسرا اللہ ہے یعنی جب اللہ ہمارے ساتھ ہے تو پھر کس کا ڈر ہے اس وقت حق تعالیٰ نے ایک خاص قسم کا سکون و اطمینان حضورؐ کے قلب مبارک پر اور آپ کی برکت سے ابوبکرؓ کے قلب مقدس پر نازل فرمایا اور فرشتوں کی فوج سے حفاظت و تائید کی یہ اسی تائید غیبی کا کرشمہ تھا کہ مکڑی کا جالا جسے اوھن البیوت بتلایا ہے بڑا مضبوط و مستحکم ذریعہ تحفظ بن گیا۔ اس طرح خدا نے کافروں کی بات نیچی اور ان کی تدابیر خاک میں ملا دیں۔ آپ تین روز غار میں قیام فرما کر بعافیت تمام مدینہ طیبہ پہنچ گئے بے شک انجام میں خدا ہی کا بول بالا ہوتا ہے وہ ہر چیز پر غالب ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے بعض نے وایدہ بجنود لم تروھا سے بدر و حنین میں نزول ملائکہ مراد لیا ہے مگر ظاہر سیاق وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے واللہ اعلم[1]

ہجرت پر ہم جلد نہم سورہ انفال کے نوٹ نمبر ۲۶، ۲۷، اور ۲۸ میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں ــــــ جب مکہ میں اعداء حق نے فیصلہ کر لیا کہ تمام قبائل کے سردار مل کر بیک وقت حملہ کر دیں تو آپ کو ہجرت کا حکم ہوا آپؐ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر ثور کے غار میں پوشیدہ ہو گئے جو مکہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے یہاں آپ نے تین راتیں بسر کیں اور پھر مدینہ روانہ ہو گئے۔ دشمن جو آپ کی تلاش میں تھے وہ غار ثور میں بھی پہنچے لیکن اللہ نے ایسا سامان کر دیا تھا کہ وہ ناکام واپس ہو گئے۔

ہجرت اور روحانی اصول و نوامیس

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس عالم مادی میں کچھ طبعی اور فطری قوانین مقرر فرما دیئے ہیں جن میں عموماً تخلف نہیں ہوتا۔ اسی طرح عالم روحانی میں بھی اس نے کچھ اصول و نوامیس بنا دیئے ہیں جن کے خلاف نہیں ہوا کرتا۔ منجملہ ان اصول و نوامیس کے ایک یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو ہر طرح قوم کو سمجھاتا ہے۔ تبلیغ کا ہر فرض اس کے سامنے ادا کرتا ہے پھر قوم معجزات طلب کرتی ہے بالآخر اس کے سامنے معجزات پیش کیے جاتے ہیں اور جب اس پر بھی وہ ایمان نہیں لاتی۔ تو پیغمبر کو ہجرت کا حکم کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس بدبخت قوم پر عذاب آتا ہے، چنانچہ انبیائے کرام کی سیرتیں اس اصول کی بہترین تشریح کرتی ہیں۔ آج اسی قاعدہ کی تعمیل کا حضور اقدس ﷺ کو حکم ہوتا ہے۔ آپؐ کو معراج کی سب سے بڑی نشانی عطا کی گئی مگر اس کو بھی وہ جھٹلاتے ہیں۔ معراج ہی میں ہجرت کی دعا بتائی جاتی ہے۔ قل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا۔

جب ہجرت کا حکم ہوتا ہے تو آپؐ ترک وطن کا ارادہ فرماتے ہیں صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم ٹھیک دوپہر کے وقت گھر میں تھے کہ کسی نے کہا کہ حضور اقدس ﷺ تشریف لائے ہیں آپؐ کا سر مبارک

[1] افادات شیخ الاسلام

ڈھکا ہوا تھا۔ عادت شریف کے مطابق وہ وقت ہمارے گھر آنے کا نہ تھا والد صاحب نے کہا میرے والدین آپ پر قربان ہوں ہو نہ ہو یہ تشریف آوری یوں ہی نہیں کوئی بات ضرور ہے۔ آپ اجازت لے کر اندر تشریف لائے اور فرمایا کہ جو کوئی پاس ہو اسے باہر کر دیں ابوبکر نے عرض کیا صرف آپ کے گھر والے ہیں فرمایا مجھے ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ رفاقت کا آرزومند ہوں فرمایا ہاں رفاقت ہو گی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں نے کسی کو خوشی میں روتے نہیں دیکھا تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ہاں نکلا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

روانگی کے لیے ضروری انتظامات

محافظ حقیقی اللہ سبحانہ نے جس نے ہر قدم پر دشمن کے منصوبے ناکام بنائے اور اپنے رسول پاک کو ہر خطرے سے محفوظ رکھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب سے حکم ہجرت ہو چکا تھا اسی وقت سے نکلنے کی ساری تدبیریں بھی سوچ لی گئی ہوں گی مثلاً

۱۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پہلے سے دو سانڈنیاں سفر کے لیے تیار کر لی تھیں۔

۲۔ مکہ مکرمہ سے جنوب کی جانب سفر اس لیے اختیار کیا کہ مدینہ شمال میں تھا۔

۳۔ غالباً غارِ ثور میں پناہ لینے کا فیصلہ بھی پہلے ہی کر لیا ہو گا۔ یہ فیصلہ چلتے چلتے راستہ میں نہیں ہوا۔

۴۔ حضرت ابوبکر نے اپنے بیٹے عبداللہ کو اس کام پر مامور کیا تھا کہ دن بھر قریش کی باتیں سن کر رات کے وقت غار میں آ کر بتائے۔

۵۔ اسی طرح حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی ڈیوٹی لگا دی کہ رات کی تاریکی میں کھانا لایا کریں۔

۶۔ عامر بن فہیرہ کو تاکید کر دی گئی تھی کہ دودھ والی بکریاں روک رکھیں اور رات کے وقت انہیں غار کے دہانے پر لے آیا کریں۔

۷۔ ایک شخص عبداللہ بن اریقط کو رہبری کے لیے مقرر کر لیا تھا۔

ان انتظامات کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاشانۂ مبارک سے اول شب ہی میں نکل آئے تھے جو لوگ محاصرہ کر کے بیٹھے ہوئے تھے ان کو خبر تک نہ ہوئی۔ آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر آئے۔ وہاں حضرت عائشہ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہما نے جلد جلد سفر کا سامان تیار کیا۔ کھانا تیار کر کے چمڑے کے تھیلے میں رکھا۔ جب تھیلے کا منہ باندھنے کے لیے کوئی چیز نہ ملی۔ تو حضرت اسماء نے اپنے کمر بند سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر منہ باندھ دیا اس وقت سے ذات النطاقین مشہور ہو گئیں۔

اس طرح حضور اقدس ﷺ ابوبکر کو ساتھ لے کر شہر سے جنوبی سمت چل پڑے۔

غارِ ثور

چھ میل کے فاصلے پر ثور نامی پہاڑ ہے جس کی اندر بلندی پر ایک بڑا غار ہے راستہ سخت سنگلاخ اور دشوار گذار ہے دہانہ بہت تنگ ہے اندر جانے کا راستہ مغربی جانب ہے جو صرف ۲ فٹ اور تین فٹ کا ہے اس میں سے آدمی لیٹ کر جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کو تکلیف سے بچانے کے لیے تھوڑی دور تک اپنے کندھوں پر بٹھا لیا۔ غارِ ثور میں حضور اقدس ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے تین راتیں گذاریں۔ ۲۷ صفر کو مکہ سے نکلے تھے جمعرات کا دن گذر چکا تھا اور جمعہ کی رات شروع ہو گئی تھی عیسوی تاریخ ۹ ستمبر ۶۲۲ء تھی۔ طبقات ابن سعد کے مطابق مکہ مکرمہ سے روانگی کی تاریخ یکم ربیع الاول ہے یعنی ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء۔ پہلے حساب کے مطابق حضور اقدس ﷺ تین روز غارِ ثور میں قیام فرما رہے اور یکم ربیع الاول کو یعنی ۱۲ ستمبر کو عزم فرمائے مدینہ طیبہ ہوئے۔ روانگی کا دن بالاتفاق دوشنبہ ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ کا حزن واضطراب

یہ تین راتیں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے کہ شمع نبوت کے پروانے تھے جس عالم میں بسر کی ہوں گی اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے عشق و محبت کا کچھ بھی ذائقہ چکھا ہو۔ اللہ کا رسول غار میں پوشیدہ تھا۔ دشمن سراغ میں تھے ہر لمحہ اندیشہ تھا کہ کہیں سراغ نہ پالیں اور ایک مرتبہ ان کی صدائیں بھی کانوں میں آنے لگیں تھیں۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ ان کے دل کے حزن و اضطراب کا کیا عالم ہوگا۔ بلاشبہ انہیں یقین تھا کہ اللہ اپنے رسول کا مددگار ہے لیکن عشق و محبت کا قدرتی تقاضا ہے کہ محبوب کو خطرے میں دیکھ کر اضطراب ہو اس سے وہ دل کو روک نہیں سکتے تھے۔ اگر روک سکتے تو محبت کی عدالت کا فیصلہ ان کے خلاف ہوتا۔ لیکن حضور اقدس ﷺ کے سکون قلب کا عالم دوسرا تھا۔ ان کا رفیق غار جب جوشِ محبت میں مضطرب ہوتا تو تسلی دیتے اور فرماتے لاتحزن غمگین نہ ہو ان اللہ معنا اللہ ہمارے ساتھ ہے خود حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے کہ جب دشمن غار کے قریب آئے تو میں نے مضطرب ہو کر کہا ان میں سے کسی نے پاؤں اونچا کیا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ابوبکر تم ان دو کے بارے میں کیا خیال کرتے ہو جن کے لیے تیسرا خود اللہ ہے فرمایا ہے فانزل اللہ سکینتہ علیہ۔ اللہ نے اپنی جانب سے سکون نازل فرمایا یعنی ابوبکر پر کیونکہ حضور اقدس ﷺ کا قلب تو پہلے ہی پر سکون و مطمئن تھا۔

اس آیت میں حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ کے ان فضائل و مناقب کا خزانہ ہے جن کے ذریعے آپ کی ذات گرامی

تمام صحابہ میں ممتاز ہے۔ مثلاً

نبوت کا حضرت ابوبکرؓ پر اعتماد

اوّلاً۔ ایسے ہولناک وقت میں حضور اقدس ﷺ کا اپنے مشن اور اپنی ذات کے بارے میں سب کو چھوڑ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اعتماد اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اخلاص و عقیدت میں آپ بے مثال تھے۔ اس کی تائید اس ارشاد نبوت سے بھی ہوتی ہے جسے ابن عساکر اور ابن عدی نے بحوالہ انس روایت کیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ایک بار مدنی زندگی میں حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ حسان! کیا تم نے کچھ اشعار ابوبکر پر کہے تھے۔ بولے جی ہاں۔ ارشاد ہوا سناؤ میں سنوں گا۔ حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دو شعر سنائے۔

وثانی اثنین فی الغار المنیف وقد ۔۔۔ طاف العدو به اذ صعد الجبلا
وکان حب رسول اللہ قد علموا ۔۔۔ من البریۃ لم یعدل به رجلا

حضور اقدس ﷺ خوب ہنسے اور فرمایا تم ٹھیک کہتے ہو وہ ایسے ہی ہیں جیسے تم نے کہا۔

عتاب سے حضرت ابوبکرؓ مستثنیٰ ہیں

ثانیاً۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت حسن بصری، سفیان بن عیینہ اور امام شعبی رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان آیات میں اللہ سبحانہ نے نبوت کی نصرت نہ کرنے پر سب پر عتاب فرمایا لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدح فرمائی ہے کہ انہوں نے نصرت فرمائی ہے یعنی سب میں مستثنیٰ شخصیت صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے جنھوں نے اس آڑے اور نازک وقت میں حضور اقدس ﷺ کی مدد کی اور اس سفر میں آپ کی رفاقت کی۔ اور یہ بات بالکل بے غبار ہے کہ اس سفر میں ابوبکرؓ کو رفاقت کے لیے حضور اقدس ﷺ نے اللہ سبحانہ کے حکم اور ایماء سے پسند فرمایا تو اس کا صاف مطلب ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے ابوبکر کو جمیع صحابہ پر فضیلت کی سند ہے۔

ابوبکرؓ ثانی اثنین ہیں

ثالثاً۔ اس آیت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ثانی اثنین دو میں دوسرا فرمایا ہے سارے اہل ایمان کو مخاطب کر کے یہ انداز اختیار کرنا ان دو کی فضیلت اور بزرگی کا اللہ سبحانہ کی جانب سے اعلان ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور اقدس کا ثانی فرمایا ہے گویا مرتبہ نبوت اور صدیقیت کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی نبوت کے بعد مرتبہ صدیقیت کا ہے حضور اقدس کے بعد درجہ

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ثانی وہی شخص ہو سکتا ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ہو۔ کمالات علمیہ اور عملیہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ثانی تھے۔ اللہ سبحانہ نے حضور اقدس کو مبعوث فرمایا تو دین کی دعوت میں حضرت ابوبکر حضورؐ کے ثانی تھے۔ ابوبکرؓ نے ایمان لانے کے بعد دعوت دین کا کام کیا اور دعوت کے نتیجے میں طلحہ، زبیر، عثمان بن عفان اور ایک جماعت نے اسلام قبول کیا۔ غزوات میں ابوبکر خادم نبوت کی حیثیت سے ساتھ رہتے تھے۔ آپ سے جدا نہ ہوتے تھے یعنی غزوات میں بھی حضورؐ کے ثانی ہوتے تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو امامت میں ابوبکرؓ ہی حضورؐ کے ثانی تھے وصال مبارک ہوا تو امامت کبریٰ میں بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ثانی تھے حضرت ابوبکر کی وفات ہوئی تو قبر میں بھی حضرت ابوبکر آپ کے ثانی تھے۔ غرض یہ کہ از اول تا آخر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ثانی ہیں۔ اور انشاء اللہ آخرت میں بھی ابوبکرؓ ثانی ہوں گے۔

حضرت ابوبکرؓ کی صحابیت کا اعلان

رابعاً۔ قرآن نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بصراحت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی کہا ہے اور یہ وہ شرف ہے کہ کسی کو حاصل نہیں ہے یعنی صحابہ تو سب ہیں لیکن جن کے نبوت کے صاحب ہونے کا قرآن نے اعلان کیا ہے وہ ابوبکرؓ کے سوا کوئی نہیں۔ اسی وجہ سے علماء نے یہاں سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ ابوبکرؓ کے صاحب پیغمبر ہونے کا منکر قرآن کے اس اعلان کا منکر ہے اور انکار قرآن کی سنگینی سب کو معلوم ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کو اللہ کی معیت ہے

خامساً۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا ان اللہ معنا اللہ ہمارے ساتھ ہے یہ نہیں فرمایا ان اللہ معی کہ اللہ میرے ساتھ ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آیت میں جس معیت کا اعلان حضورؐ نے اپنے لیے فرمایا ہے اسی معیت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی شریک کر لیا ہے اور پھر اللہ کی معیت کے اعلان سے یہ بات بھی حضورؐ نے سمجھا دی ہے کہ جن جن اوصاف پر اللہ کی معیت آتی ہے ابوبکر ان سب اوصاف سے موصوف ہیں مثلاً ابوبکر میں صفت صبر درجہ کمال میں پائی جاتی ہے قرآن میں ہے۔ ان اللہ مع الصابرین۔ ایمان کی صفت کے اس درجہ اعلیٰ سے متصف ہیں جس کو اللہ کی معیت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ان اللہ مع المومنین۔ تقویٰ۔ اس بزرگترین درجے کے ابوبکرؓ مالک ہیں جس پر اللہ کی معیت حاصل ہوتی ہے ان اللہ مع المتقین اور ابوبکرؓ کو درجہ احسان کا وہ کمال حاصل ہے جس پر روحانی کمالات کی انتہا ہے

ان اللہ مع المحسنین۔ گویا ایک ہی فقرے ان اللہ معنا کے ذریعے بارگاہ نبوت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کامل متقی صابر اور محسن ہونے کا سارٹیفکیٹ ملا ہے اور جس کے ایمان صبر تقویٰ اور احسان کی زبان نبوت گواہی دے۔ نہیں بلکہ جسے نبوت اپنے ساتھ ان اوصاف میں شریک کرے اس کے افضل، اعلیٰ اور اولیٰ ہونے پر کب شبہ ہو سکتا ہے۔ اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ اس آیت نے معیت کی نوعیت بھی مقرر کر دی اگر یوں فرماتے ان اللہ معی و معك اللہ میرے ساتھ اور تیرے ساتھ ہے تو سننے والا سمجھ لیتا کہ معیت تو ابوبکر رضہ کو حاصل ہے لیکن دونوں کی نوعیت الگ الگ ہے ایک ہی معنا ہمارے ساتھ کہہ کر فیصلہ کر دیا کہ اللہ کی معیت نوعیت کے اعتبار سے دونوں کی ایک ہے جو معیت حضور کو حاصل ہے وہی ابوبکر کو حاصل ہے اور جملہ اسمیہ لاکر یہ شبہ بھی دور کر دیا کہ یہ معیت توقتی ہے بلکہ بتا دیا کہ اللہ کی یہ نوعیت ابوبکر رضہ کے لیے دائمی ہے کیونکہ جملہ اسمیہ ثبوت اور دوام کو بتاتا ہے۔

غالباً حافظ ابن تیمیہ نے یہ بات لکھی ہے یہ یاد نہیں کہ کہاں لکھی ہے کہ اس موقعہ پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے ساتھ اللہ کی معیت میں شریک کر لیا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے اپنے صحابہ کرام کو لے کر نکلے ہیں اور سمندر کے کنارے پہنچے ہیں۔ پیچھے سے فرعون کی فوجوں نے تعاقب کیا ہے جب اصحاب موسیٰ نے فرعون کی فوجوں کو پیچھے اور پانی کی موجوں کو آگے دیکھا تو گھبرا کر بول پڑے قال اصحاب موسیٰ انا لمدرکون۔ اصحاب موسیٰ نے کہا کہ ہم تو پکڑے گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کلا ان معی ربی ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی ایک صحابی کو بھی رب کی معیت میں اپنے ساتھ داخل نہیں کیا حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت یوشع علیہ السلام بھی تھے۔ اس سے امت میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام کا پتہ لگتا ہے اس موضوع پر ایک وعظ میں حضرت مولانا اشرف علی نے انکشاف فرمایا اور بڑا لطیف انکشاف ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو معیت میں اس لیے شریک کیا کہ صدیق اکبر رضہ کو اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ پریشانی حضور اقدس کی تھی اور حضرت صدیق اکبر رضہ دولت توکل سے مالا مال تھے اور موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ کرام نہ تو صدیق اکبر رضہ جیسے متوکل تھے اور نہ ان کی طرح حضرت موسیٰ کے عاشق زار اور جان نثار تھے۔ ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا اور خطرہ بھی نہیں بلکہ یقین تھا جیسا کہ انا لمدرکون کا انداز بتا رہا ہے۔ اگر حضرت موسیٰ کے ساتھی صدیق اکبر رضہ کے ہم پلہ ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے کہ رب ہمارے ساتھ ہے۔ علامہ قسطلانی نے یہاں اور لطیفہ پیدا کر دیا کہ حضرت موسیٰ کو معیت ربانی حاصل ہے جب حضور اقدس کو معیت الٰہیہ حاصل ہے۔ اللہ اسم اعظم ہے جو تمام صفات کمال کا جامع ہے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

حضرت علیؓ نے ابوبکرؓ کے مناقب کا اعلان کیا

سادساً۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ۹ھ کے حج میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کو سورۂ برارت کے اعلان کے لیے روانہ کیا۔ اس آیت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کے فضائل اور مناقب تھے۔ اپنے مناقب اپنے فضائل اپنے منہ سے کسی کو گوارا نہیں ہوتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا کہ مجمع میں ابوبکر کے مناقب اور فضائل تم بیان کرو تاکہ سننے والوں کو تمہاری زبان سے ابوبکرؓ کے مقام کا اندازہ ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل سے اندازہ ہو گیا کہ نبوت کی بارگاہ میں صدیقِ اکبرؓ کا مقام کیا ہے۔

مرزا مظہر جانِ جاناں فرماتے ہیں کہ:

> حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کی فضیلت کے لیے یہ بات بس ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کے لیے وہ معیت بتائی ہے جو خود حضور کے لیے ہے۔

حضرت ابوبکرؓ پر اللہ کی سکینت

سابعاً اس آیت میں جس سکینت کا ذکر ہے وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر نازل ہوئی کیونکہ پریشانی حضرت ابوبکرؓ کو تھی ان کو ہی سکون کی ضرورت تھی ورنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تو اس قدر مطمئن تھے کہ خاص اس وقت محوِ استراحت تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فانزل اللہ سکینتہ علیہ کی ضمیر کا مرجع صاحب ہے مطلب یہ ہے کہ ازالۂ غم کے لیے حضورؐ کے اس ارشاد کے بعد اللہ سبحانہ نے ابوبکر پر سکینت نازل فرمادی۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں امام رازی نے مفاتیح الغیب میں یہی مطلب بتایا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سکینت سے اطمینان مراد ہے۔ اور اطمینان چاہیئے پریشان و غمگین کو۔ اب آپ یہ خود ہی فیصلہ کرلیں کہ غمگین کون تھا۔

حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں سکینت کے موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ منازل السائرین اسی کتاب کا متن ہے۔ مرنیا رہیں شیخ الاسلام ہروی کتاب کے مصنف ہیں وہ فرماتے ہیں کہ سکینت ایک خاص کیفیت اور حالت کا نام ہے جس میں تین چیزیں بیک وقت موجود ہوتی ہیں ایک نور دوسرے قوت تیسرے روح۔ نور سے قلب روشن ہوتا ہے ایمانی حقائق اس پر منکشف ہوتے ہیں۔ قوت سے قلب میں عزم و استقلال آتا ہے اور روح سے دل میں حیات اور زندگی پیدا ہوتی ہے۔

اس تشریح کی موجودگی میں آپ سوچیئے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ پر سکینت نازل ہونے کا مطلب کیا ہے یہی نا کہ آپ پر حقائق ایمانیہ منکشف تھے اطاعت و بندگی کے وقت آپ کو خاص نشاط حاصل تھا اور قلب کبھی غفلت سے دوچار

نہ ہوتا تھا۔

قرآن میں سکینت کا نزول اہلِ ایمان پر ہوتا ہے اور یہاں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سکینۃ کا نزول ہوا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ غارِ ثور میں تمام اہلِ ایمان کی نمائندگی فرما رہے ہیں۔ اسی کا نظارہ دنیا نے ۹ھ ہجری کی امارت میں دیکھا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کے سرمایہ سے سامانِ ہجرت

ثامناً حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی دولت کا بڑا حصہ ابتدائے دعوتِ حق ہی سے راہِ اسلام میں بے دریغ صرف کر چکے تھے۔ سفرِ ہجرت کے تمام اخراجات بھی صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے برداشت کیے۔ جو کچھ سرمایہ تھا سب ساتھ لے لیا اور اس کا اندازہ پانچ ہزار درہم بتایا جاتا ہے۔ ہجرت کے سارے انتظامات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دور اندیشی، معاملہ فہمی، راز داری اور جان نثاری کی ایسی شہادت پیش کر رہے ہیں جس سے روشن تر شہادت کوئی نہیں ہو سکتی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کسی گفتگو میں غصہ ہو گئے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معافی مانگی، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معافی نہ دی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ گرامی میں حاضر ہوئے اور صورتِ حال بیان کی حضورؐ نے سن کر فرمایا ابوبکرؓ تجھے خدا معاف کرے گا اور یہ بات تین بار فرمائی۔ حدیث کے راوی ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ندامت ہوئی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر آ کر دریافت کیا کہ ابوبکرؓ ہیں؟ جواب ملا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ گرامی میں حاضر ہوئے اور سلام کہا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ غصے سے بدلا ہوا تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ڈر گئے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور بولے بخدا یا رسول اللہ میں نے کوئی زیادتی نہیں کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> بلاشبہ اللہ نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر روانہ کیا ہے تم نے کہا کہ تو جھوٹا ہے ابوبکر نے کہا کہ سچا ہے ابوبکر نے اپنی جان و مال سے میری غم خواری کی کیا تم میرے صاحب کو چھوڑتے ہو دو بار یہی بات فرمائی اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسی نے کچھ نہیں فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ تمام لوگوں میں مجھ پر مال اور جان سے احسان صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے۔

صرف سفرِ ہجرت کے موقعہ پر سانڈنی کے بارے میں فرمایا کہ سانڈنی میں مفت نہیں قیمت سے لوں گا۔

ابوبکرؓ کی اوصاف میں نبوت کی عکاسی

تاسعاً حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کی صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی عکاس تھی جن اوصاف کی خدیجۃ الکبریٰ

نے حضور اقدس ﷺ میں نشاندہی کی تھی اور ان اوصاف کو دلیل بنا کر حضور اقدس ﷺ کو نبی برحق مان لیا تھا جب حضورؐ نے غار حرا سے واپسی پر ساری داستان حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتائی اور حضرت خدیجہ رض کے تاثرات اس پر معلوم کرنا چاہے تو خدیجۃ الکبریٰ نے کہا۔

کلا لا یخزیك اللہ ابداً	ہرگز نہیں، آپ کو آپ کا رب کبھی اندوہ گین نہ کرے گا۔
تصل الرحم	آپ تو اقربا نوازی کرتے ہیں۔
تحمل الکل۔	ہامال اور گرے پڑے افراد کو معاشرہ میں سہارا دیتے ہیں۔
تقری الضیف	آپ تو مہمان نوازی کرتے ہیں۔
تکسب المعدوم	مصیبت زدوں کے کام آتے ہیں۔
تعین علی نوائب الحق	اور حق کے نوائب پر مدد کرتے ہیں۔

یہ نبوت کا وہ چہرہ ہے جسے صداقت کے لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بطور استدلال پیش فرمایا ہے آیئے صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب مکہ میں مسلمانوں پر ابتلائی دور تھا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی زمانہ میں حبشہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کر کے رخت سفر باندھ لیا۔ روانہ ہو گئے اور مشہور مقام برک الغماد تک سفر کی منزل طے کر لی۔ راستہ میں قارہ قبیلہ کا سردار نامی ابن الدغنہ مل گیا۔ بولا!

ابن الدغنہ رضی اللہ عنہ ابوبکر کہاں جانے کا ارادہ ہے۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھے میری قوم نے نکال دیا ہے۔ میرا ارادہ ہے زمین میں سیاحت کروں اور اپنے رب کی عبادت کروں۔

ابن الدغنہ رضی اللہ عنہ ابوبکر تیرے جیسا شخص نہ نکلتا ہے نہ نکالا جاتا ہے تو تو اقربا پر شفقت کرتا ہے بیکسوں کی دستگیری کرتا ہے۔ مہمان نوازی کرتا ہے۔ مصیبت زدوں سے ہمدردی کرتا ہے۔

دونوں کا تقابل مطالعہ فرمایئے اور دیکھئے کہ ابوبکر کی ذات حضور اقدس کی اخلاقی قدروں کا کیسا شاندار اور خوبصورت عکس ہے۔ اقدار کی اسی عکاسی کی وجہ سے وحی الٰہی نے ابوبکر کو ثانی اثنین قرار دیا ہے اور اسی تطابق کی وجہ سے حضور اقدس نے غار میں فرمایا یا ابا بکر ماظنك باثنین اللہ ثالثھما اے ابوبکر ان دو کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے جن میں تیسرا اللہ ہے۔

قرآن میں حضرت ابوبکرؓ کی مدح

عاشراً۔ قرآن وہ کامل ترین کتاب ہے جو اللہ سبحانہ کی جانب سے محمد رسول اللہ ﷺ انسانی ہدایت کے لیے

ے کر تشریف لائے ہیں۔ اس کتاب کے خصائص میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت کے سامنے اپنانے کے لیے اعمال صالحہ اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ پیش کرتا ہے اور ان کے موصوفین کی مدح کرتا ہے ایسے ہی وہ بچنے کے لیے اعمال سیئہ اخلاق قبیحہ اور اوصاف مذمومہ کا ذکر کرتا ہے اور ان کے اپنانے والوں کی مذمت کرتا ہے۔ پورے قرآن کریم میں انبیاء کو چھوڑ کر وہ کبھی اس معاشرے کے افراد و اشخاص کا ذکر نہیں کرتا ہے جو حضور اقدس کا مخاطب ہے خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے بُروں میں جیسے صرف ابولہب کا شخصی ذکر کیا ہے کیونکہ وہ برائی میں ایک مثالی شخصیت ہے اسی طرح قرآن نے اشخاص میں سے جس کی مدح کی ہے وہ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اور مدح کا یہ عجیب و غریب انداز اختیار کیا ہے کہ وہ ثانی اثنین۔ دونوں غار میں ہیں۔ ابوبکر حضور اقدس کے صاحب ہیں۔ ابوبکر حضور اقدس کی وجہ سے غمگین و پریشان ہیں۔ حضور اقدس ان کو تسلی دے رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ ہم دونوں کو اللہ کی معیت حاصل ہے اور اللہ سبحانہ نے ابوبکر کے غم کو غلط کرنے کے لیے سکون کی نعمت سے مالامال فرمایا۔ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ۔

یہ بات حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ خصوصیت ہے جس میں آپ کا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے۔ بلاشبہ حضرت زید اور عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بھی قرآن نے ذکر کیا ہے لیکن ان کا تذکرہ مقام مدح میں نہیں ہے۔

ہجرت سے متعلق دو باتیں باقی ہیں۔

ایک یہ کہ ہجرت سے اسلامی تاریخ کا آغاز ہوا ہے۔

دوسرے یہ کہ ہجرت کا سفر غار ثور سے مدینہ تک کیسے ہوا۔

غارِ ثور سے مدینہ کی طرف

آیئے پہلے سفر ہجرت پورا کر لیجئے۔ تین راتیں غارِ ثور میں گذار کر حضور اقدس ﷺ مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہوئے وقت پر دو سانڈنیاں غار کے پاس پہنچ گئیں جن میں سے ایک کی قیمت رسول اللہ ﷺ نے ادا فرمادی تھی۔ شائد اسی سانڈنی کا نام "قصویٰ" ہے۔ کچھ روایات میں ہے کہ یہ سفر رات میں شروع ہوا۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ غالباً سویرے سویرے روانہ ہوئے ہوں گے تاکہ دن چڑھنے سے پہلے ہی مکہ مکرمہ کے آس پاس سے دور ہو جائیں۔ سواروں کی ترتیب یہ تھی کہ ایک سانڈنی پر حضور اقدس ﷺ اور حضرت ابوبکر سوار تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیچھے تھے اور دوسری سانڈنی پر عبداللہ بن اریقط اور عامر بن فہیرہ سوار تھے۔

غار ثور سے نکل کر وہ راستہ اختیار کیا گیا جس پر عام آمد و رفت نہ تھی۔ سہ شنبہ کے روز دوپہر ہو گئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک چٹان کے پاس سایہ دیکھا۔ زمین صاف کر کے اس جگہ چادر بچھائی تاکہ حضور اقدس ﷺ استراحت فرما سکیں ادھر

اُدھر دیکھا تو ایک چرواہا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ اور بکری کے تھن خوب صاف کر کے دودھ نکلوایا۔ برتن کا منہ ڈھانک دیا تاکہ دودھ گرد و غبار سے محفوظ رہے اس میں پانی ڈال کر خدمتِ اقدس میں پیش کیا آپ نوش فرما چکے تو روانہ ہو گئے۔

جب حضور اقدس ﷺ رابغ کے قلعہ اور ساحلِ بحر کے درمیانی راستہ سے گذر رہے تھے تب سراقہ بن جعشم نے آپ کا تعاقب کیا۔ عبدالرحمٰن بن مالک مدلجی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو سراقہ کا برادر زادہ ہے وہ بیان کرتا ہے کہ سراقہ خود سر پر لگائے نیزہ تانے بدن پر ہتھیار سجائے اپنی گھوڑی پر ہَوا سے باتیں کرتا جا رہا تھا کہ اس کی نظر حضور اقدس ﷺ پر پڑ گئی۔ اس نے سمجھا کہ وہ کامیاب ہو گیا۔ اتنے میں گھوڑی گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ سراقہ بھی نیچے گر گیا۔ اٹھا گھوڑی کو اٹھایا سوار ہوا پھر چلا۔ حضور اقدس ﷺ تلاوتِ قرآن فرما رہے تھے کہ حضور کو دشمن کے قریب تر ہونے کی اطلاع دی گئی فرمایا اے اللہ ہمیں اس کے شر سے بچا۔ ادہر یہ دعائی الفاظ زبان مبارک سے نکلے ادہر گھوڑی کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ گر پڑا اور سمجھ گیا کہ اللہ کی مخالفت پہ غالب آنا محال ہے۔ اس نے عاجزانہ انداز میں جان کی امان مانگی۔ امان دی گئی۔ سراقہ آگے بڑھا اور عرض کی کہ اب میں ہر ایک حملہ آور کو پیچھے ہی روکتا رہوں گا۔ پھر اس کی درخواست اور حضور اقدس کے ایماء پر عامر بن فہیرہ نے اسے امان نامہ لکھ دیا۔ الاستیعاب میں ہے کہ جب سراقہ واپس ہونے لگا تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا، سراقہ اس دن تیری کیا شان ہو گی جب تیرے ہاتھوں میں ایران کے بادشاہ کسریٰ کے کنگن پہنائے جائیں گے سراقہ نے پوچھا کسریٰ شاہ ایران کے کنگن؟ فرمایا۔ ہاں۔ سراقہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ فاروقِ اعظم کے زمانہ میں جب مدائن فتح ہوا اور ایران کا مالِ غنیمت مدینہ منورہ پہنچا تو اس میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سراقہ کو پہنائے۔

راستہ ہی میں حضور اقدس کے قافلہ ہجرت کا گذر خیمہ ام معبد پر ہوا یہ عورت قوم خزاعہ سے تھی۔ مسافروں کی خبر گیری اور ان کی تواضع کے لیے مشہور تھی سر راہ پانی پلایا کرتی تھی اور مسافر وہاں ٹھہر کر سستایا کرتے تھے۔

یہاں پہنچ کر بڑھیا سے دریافت کیا کہ اس کے پاس کھانے کی کوئی چیز ہے وہ بولی نہیں اگر ہوتی تو دریافت کرنے سے پہلے حاضر کر دیتی۔ حضور اقدس ؐ نے خیمہ کے گوشہ میں ایک بکری دیکھی۔ پوچھا کہ یہ بکری کیوں کھڑی ہے ام معبد نے کہا کمزور ہے ریوڑ کے ساتھ چل نہیں سکتی۔ حضور اقدس ؐ نے فرمایا کہ اجازت ہے کہ ہم اسے دوھ لیں ام معبد نے کہا کہ اگر آپ کو دودھ معلوم ہوتا ہے تو دودھ لیں۔ حضور اقدس ؐ نے بسم اللہ کہہ کر بکری کے تھنوں کو ہاتھ لگایا۔ برتن مانگا وہ ایسا بھر گیا کہ دودھ اُبل کر زمین پر بھی گر گیا۔ یہ دودھ حضور اقدس اور آپ کے ساتھیوں نے پیا۔ دوسری دفعہ بکری کو دوہا گیا۔ برتن بھر گیا۔ یہ بھی ہمراہیوں نے پیا۔ تیسری دفعہ پھر برتن بھر گیا اور وہ آپ نے ام معبد کے لیے چھوڑ دیا اور آگے روانہ ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد ام معبد کا شوہر آیا۔ خیمہ میں دودھ کا بھرا ہوا برتن دیکھ کر حیران ہو گیا اور بولا کہ یہ کہاں سے آیا ام معبد نے کہا کہ ایک بابرکت شخص آیا تھا اور یہ دودھ اس کے قدم کا نتیجہ ہے۔ وہ بولا یہ تو وہی صاحب قریش معلوم ہوتا ہے جس

کی مجھے تلاش ہے۔ اچھاتم ذرا چہرہ تو پیش کرو۔ ام معبد بولی۔

پاکیزہ اور کشادہ چہرہ، پسندیدہ خو۔ نہ توند نکلی ہوئی نہ چندیا کے بال گرے ہوئے۔ زیبا صاحب جمال، آنکھیں سیاہ و فراخ بال لمبے اور گھنے۔ آواز میں بھاری پن، بلند گردن، روشن مردمک، سرگین چشم، باریک و پیوستہ ابرو۔ سیاہ گھنگریالے بال، خاموش باوقار، گویا دلبستگی لیے ہوئے۔ دور سے دیکھنے میں زیبندہ و دلفریب قریب سے نہایت شیریں و کمال حسین شیریں کلام۔ واضح الفاظ۔ کلام الفاظ کی کمی و بیشی سے معرا تمام گفتگو پروئی ہوئی موتیوں کی لڑی۔ میانہ قد نہ کوتاہ نہ طویل، زیبندہ نہال کی تازہ شاخ۔ زیبندہ منظر، والا قدر، رفیق ایسے ہر وقت اس کے گرد و پیش رہتے ہیں۔ جب وہ کچھ کہتا ہے چپ چاپ سنتے ہیں۔ حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں۔ مخدوم مطاع نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو۔

یہ چہرہ سن کر ام معبد کا شوہر بولا کہ یہ ضرور صاحب قریش ہے میں اسے ضرور ملوں گا[1]

سید سلیمان ندوی کو اصرار ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

یہ روایت بغوی، ابن شاہین ابن سکن ابن مندہ، طبرانی بیہقی ابو نعیم حاکم میں ام معبد کے بھائی حبیش بن خالد کی زبانی مذکور ہے اور حاکم نے نہ صرف یہ کہ اسے صحیح کہا ہے بلکہ اور دیگر طریقوں سے بھی اسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر معلوم ہے کہ حاکم کے صحیح کہنے کی علماء کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے چنانچہ حافظ ذہبی نے اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے تصریح کی ہے کہ ان میں سے کوئی طریقہ سند صحیح کے شرائط کے مطابق نہیں[2]

افسوس ہے کہ مولانا موصوف کے اس بیان سے محدثین کے اصول کے مطابق ہمیں اتفاق نہیں ہے بڑے بڑے محدثین و مورخین نے اسے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں۔ ابن الاثیر نے نہایہ میں حافظ ابو القاسم السہیلی نے الروض الانف میں، شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں حافظ عسقلانی نے فتح الباری اور الاصابہ میں۔ حافظ ابن عبد البر نے الاستیعاب میں ابن سعد نے طبقات میں ہیثمی نے مجمع الزوائد میں، اور بتایا ہے کہ طبرانی نے اسے روایت کیا ہے اور اس کے رجال صحیح ہیں ہشام بن حزام اور ان کے والد دونوں ثقہ ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے محدثین میں امام حاکم نے نہ صرف یہ کہ اس کی تصحیح کی ہے بلکہ لکھا ہے کہ ام معبد کا واقعہ متواتر فی اخبار صحیحۃ۔ باقی رہا حافظ ذہبی کا امام حاکم کی روایات کے بارے میں تبصرہ کہ لیس من ھذہ الطرق علی شرط الصحیح تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مستدرک کی روایت معتبر نہیں بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ان طریقوں میں سے کوئی طریقہ اصطلاحی صحت کی شرطوں کے مطابق نہیں ہے۔ صحت

[1] زاد المعاد

[2] سیرۃ النبی ج ۳ ص۱۷۷

حدیث کی شرطوں پر اگر ایک حدیث بھرپور طریقہ پر پوری نہیں اترتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا درجہ حسن کا ہے جو صحیح سے کمتر ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ حدیث موضوع ہے۔ امام ذہبی حدیث کا علی شرط الصحیح انکار کر رہے وہ اس کے حسن، ضعیف ہونے کا انکار کر کے اس کے وجود کے منکر نہیں ہیں۔ معتبر نہ ہونے کا مطلب ہے کہ حدیث موضوع ہے۔ یہ بات امام ذہبی نے نہیں فرمائی ہے۔ امام ذہبی محدثین کی اصطلاحی زبان میں بات کر رہے ہیں۔

یہ سفر جاری رہا راستے میں حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوئی وہ شام سے تجارتی قافلہ کے ساتھ آ رہے تھے انھوں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کی خدمت میں سفید کپڑوں کا ایک جوڑا پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں بھی قافلے اور مال کو مکہ مکرمہ پہنچاتے ہی ہجرت کر کے آجاؤں گا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ بہت سے تجارتی سفر کر چکے تھے اس لیے تجارتی شاہراہوں کے اطراف کے بہت سے لوگ انہیں پہچانتے تھے۔ ان میں سے اتفاقیہ راستے میں کوئی مل جاتا اور پوچھتا کہ آپ کے آگے کون ہے تو حضرت ابوبکرؓ فرماتے رجل یھدینی السبیل (یہ راہ بتانے والا ہے) حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کے ذہن میں اس کا مفہوم یہ تھا کہ میرے آپ ہادی ہیں۔ آپ نے مجھے صراط مستقیم بتائی ہے جواب سننے والے سمجھتے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے رستہ بتانے والا ساتھ لیا ہے۔

بریدہ اور ۷۰ حضرات کا اسلام رضی اللہ تعالیٰ

اثنائے سفر میں بریدہ اسلمی ملا۔ یہ اپنی قوم کا سردار تھا۔ قریش نے گرفتاری پر ایک سو اونٹوں کا انعام مقرر کیا تھا۔ بریدہ اسی انعام کے لالچ سے حضور اقدس کی تلاش میں تھا۔ جب نبی کریم ﷺ کے سامنے ہوا اور حضور سے ہم کلام ہونے کا موقعہ ملا تو بریدہ ستر آدمیوں سمیت مسلمان ہو گیا اپنی پگڑی اتار کر نیزے پر باندھ لی۔ جس کا سفید پھریرا ہوا میں لہراتا اور بشارت سناتا تھا کہ امن کا بادشاہ، صلح کا حامی دنیا کو عدالت و انصاف سے بھرپور کرنے والا تشریف لا رہا ہے۔

قبا میں ورودِ مبارک

سفر ہجرت میں کل آٹھ دن لگے جن کے نزدیک مکہ سے روانگی یکم ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ ان کے حساب کے مطابق رسول اللہ ﷺ ۸ ربیع الاول کو قبا پہنچ گئے۔ جن مورخین نے روانگی کی تاریخ ۴ ربیع الاول بتائی ان کے حساب کے مطابق قبا میں ورود مبارک ۱۲ ربیع الاول کو ہوا۔

کیفیت ورود مبارک

تشریف آوری کی خبر پہلے پہنچ چکی تھی۔ تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ پیغمبر ﷺ آرہے ہیں لوگ ہر روز تڑکے سے نکل کر شہر کے باہر جمع ہو جاتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت سے واپس چلے جاتے۔ ایک روز انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ اے اہل عرب لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آگیا۔ تمام شہر نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھا انصار ہتھیاروں سے سج کر بے تابانہ گھروں سے نکل آئے یہ قبا ہے جو مدینہ میں انصار کی متعدد آبادیوں میں سے ایک آبادی یا بستی تھا۔ اس وقت تمام آبادیوں کے انصار موقع پر موجود نہ ہوں گے۔ کیونکہ اول بظاہر یقین نہ ہوگا کہ حضور اقدس ﷺ سب سے پہلے قبا میں پہنچیں گے دوم تمام آبادیوں سے زیادہ لوگ پہنچ ہی نہ سکتے تھے۔ کیونکہ ان میں سے کچھ زیادہ فاصلے پر تھیں۔ ممکن ہے کہ کچھ اصحاب روزانہ قبا آجاتے ہوں۔

مشیت کی اندازہ فرمائی

حضور اقدس ﷺ دوپہر کے بعد قبا پہنچے ہوں گے کیونکہ اس روز ۸ ربیع الاول کو معمول کے مطابق دوپہر تک انتظار کر کے لوگ واپس جا چکے تھے کوئی اسے بخت و اتفاق سمجھے یا اللہ سبحانہ کی مشیت کی اندازہ فرمائی کہ حضور اقدس ﷺ جس روز قبا پہنچے اس روز نبوت کا تیرہواں سال ختم ہو رہا تھا اور دوسرے روز نئے سال کا آغاز ہونے والا تھا گویا حضور اقدس ﷺ کا ایک دور اس روز پورا ہوا۔ دوسرا دور نئے سال کے پہلے دن سے شروع ہوا۔ نیز دو شنبہ کو حضور اقدس کی سیرۃ طیبہ میں جو خصوصیت حاصل ہے اسے بھی پیش نظر رکھیے۔ آپ دو شنبہ ہی کو اس دنیا میں جلوہ افروز ہوئے۔ دو شنبہ ہی کو منصب نبوت ملا۔ دو شنبہ ہی کو غار ثور سے نکلے۔ دو شنبہ ہی کو قبا پہنچے۔ اور دو شنبہ ہی کو رحلت فرمائے دار البقا ہوئے۔ قبا، اس میں مسجد کی تاسیس، جمعہ کا قیام، انشاء اللہ گیارہویں جلد میں آئے گا۔

سنہ ہجری کا ہجرت سے آغاز

تاریخ عالم کا یہ عظیم واقعہ جس کی یاد ہر سال کے انجام و آغاز میں پوشیدہ ہے ہجرت کا واقعہ ہے۔ کیونکہ پہلی محرم سے نیا اسلامی سال شروع ہوتا ہے اور اس کی بنیاد اسی واقعہ ہجرت پر ہے۔

یہ دنیا کی تمام قوموں کی یادگاروں کی طرح طاقت کی کامرانیوں کی یادگار نہیں بلکہ کمزوری کی فتمندیوں کی یادگار ہے۔ یہ

اسباب و وسائل کی فراوانیوں کی یادگار نہیں بے سرو سامانیوں میں کامیابیوں کی یادگار ہے۔ یہ طاقت اور حکومت کے جاہ وجلال کی یادگار نہیں بے کسی و بیچارگی میں ثبات واستقلال کی یادگار ہے یہ فتح مکہ کی یادگار نہیں جسے دس ہزار تلواروں کی چمک نے فتح کیا تھا۔ یہ فتح مدینہ کی یادگار ہے جسے تلواروں کی چمک نے نہیں بلکہ ایک نادار وغریب اور بے سروسامان انسان کی روح ہجرت نے فتح کیا تھا۔ تاریخ اسلام کی ساری آنے والی فتح مندیاں اسی ہجرت میں بیج کی طرح پوشیدہ ہیں۔ اسی لیے جب یہاں اہل ایمان کو تسخیر عرب کے بعد پوری دنیا کے لیے جہاد کی ترغیب دی گئی تو اس معنوی فتح مندی کی یاد لوگوں کو دلائی گئی۔ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار الخ۔

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں میں متعدد سنہ جاری تھے زیادہ مشہور یہودی، رومی اور ایرانی سنہ تھے۔ عرب جاہلیت کی اندرونی زندگی اس قدر متمدن نہ تھی کہ حساب وکتاب کی کسی وسیع پیمانے پر ضرورت ہوتی، اوقات و مواسم کی حفاظت اور یادداشت کے لیے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے اور اس سے وقت کا حساب لگاتے۔ سنین جاہلیت میں عام الفیل یعنی بادشاہ حبش کے حجاز پر حملہ کرنے کا سال عرصہ تک یہی واقعہ عرب کے حساب وکتاب میں بطور سنہ مستعمل رہا۔ ظہور اسلام کے بعد یہ اہمیت خود اسلام کے واقعات نے لی۔

صحابہ کرام کا قاعدہ تھا کہ عہد اسلام کے واقعات میں سے کوئی اہم واقعہ لے لیتے اور اسی کا پیمانہ بنا لیتے۔ ہجرت مدینہ کے بعد ہی سورہ حج کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں قتال کی اجازت تھی۔ اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر۔ کچھ عرصہ تک یہی واقعہ حسابی پیمانہ بنا رہا۔ اسے سنہ اذن قتال کہتے تھے۔ اسی طرح سورہ برات نازل ہوئی تو بول چال میں سنہ برارۃ کا بھی رواج رہا۔ زمانہ نبوت کا آخری واقعہ حجۃ الوداع تھا۔ روایات سے اسی طرح متعدد سنوں کا پتا چلتا ہے مثلاً سنۃ التمحیص۔ سنۃ التوفئہ، سنۃ الزلزال، سنۃ الاستیناس۔ علامہ بیرونی نے الآثار الباقیہ میں اس طرح کے دس سنین لکھے ہیں۔

احساس ضرورت اور مشورہ

اس بارے میں متعدد روائتیں ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور روایت میمون بن مہران کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک کاغذ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے پیش ہوا جس میں شعبان کا ماہ درج تھا حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ کہ شعبان سے کونسا شعبان مقصود ہے اس برس کا یا آئندہ برس کا پھر آپ نے سرآوردہ صحابہ کرام کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اب حکومت کے مالی وسائل بہت زیادہ ہو گئے ہیں اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں ختم نہیں ہو جاتا لہٰذا ضروری ہے کہ حساب وکتاب کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہو سکیں اس پر لوگوں نے کہا کہ ایرانیوں

سے مشورہ کرنا چاہیئے یہاں اس کے (انکے) طریقے کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہرمزان کو بلایا اس نے بتایا کہ ہمارے یہاں ایک حساب موجود ہے۔ جسے ماہ روز کہتے ہیں اسی ماہ روز کی معرب مورخہ ہے۔ پھر یہ سوال سامنے آیا کہ اسلامی تاریخ کا آغاز کہاں سے ہو۔ سب نے اتفاق کیا کہ ہجرت کے سال سے ہو۔

ابن حبان نے قرہ ابن خالد سے ایک دوسری روایت بھی درج کی ہے۔ اس میں ایک دوسرے واقعہ کا ذکر ہے خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس یمن سے ایک عامل آیا تھا۔ اس نے کہا کہ لکھنے پڑھنے میں آپ لوگ تاریخ نہیں لکھتے ہیں۔ اس طرح فلاں بات فلاں سنہ میں۔ سنہ کے فلاں ماہ میں ہوئی۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور لوگوں کو اس معاملے کا خیال ہوا۔ پہلے انھوں نے ارادہ کیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے سنہ کا حساب شروع کردیں۔ پھر خیال آیا کہ وفات سے شروع کریں۔ لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ ہجرت سے تقرر ہو۔

ان روایات کی مزید تشریح امام شعبی کے اُس بیان سے ہوتی ہے جو محب طبری نے الریاض النضرہ میں نقل کیا ہے کہ:

> ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا کہ آپ کی جانب سے ہمارے نام خطوط آتے ہیں مگر ان پر کوئی تاریخ نہیں ہوتی اور یہ وقت وہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکومت کے مختلف دفاتر قائم کردیئے تھے اور خراج کے اصول وقواعد طے پا گئے تھے اور اس سے محسوس ہو رہا تھا کہ ضبط اوقات کے لیے ایک تاریخی پیمانہ مقرر ہو پرانی تاریخیں موجود تھیں۔ لیکن وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کو اختیار کریں۔ ابوموسیٰ اشعری نے لکھا تو انہیں زیادہ توجہ ہوئی صحابہ کو جمع کرکے مشورہ کیا۔ مشورہ میں سب کی رائے یہی قرار پائی کہ ہجرت کا واقعہ بنیاد قرار دے کر سنہ ہجری اختیار کیا جائے۔

ابوہلال العسکری نے الاوائل میں اور مقریزی نے تاریخ میں حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ واقعہ ہجرت سے سنہ شروع کرنے کی رائے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دی تھی۔ وہ کہتے ہیں۔

> جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کس روز سے تاریخ کا حساب شروع کیا جائے تو حضرت علیؓ نے فرمایا اس دن سے جس دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی اور مدینہ آئے۔

مشہور مورخ یعقوبی نے بھی یہی لکھا ہے۔ ۱۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے کہ:

> اسی زمانے میں حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ ضبط تحریر کے لیے ایک تاریخ مقرر ہو۔ پہلے ان کو خیال آیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے شروع کریں۔ پھر خیال آیا کہ آپؐ کی وفات سے آغاز کیا جائے پھر رائے ہوئی کہ حضور کی بعثت سے ابتدا ہو لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رائے دی کہ ہجرت سے شروع کرنا چاہیے۔

۱ـ اس بارے میں دنیا کی قوموں کا طریقہ ان کے سامنے آیا اور خود انہیں بھی یہ بات صاف نظر آئی کہ حضور اقدس کی پیدائش یا بعثت کو

اپنی ملی تاریخ کی بنیاد ٹھہرائیں لیکن چونکہ یہ بات اس معیار نظر سے ہٹی ہوتی جو اس قسم معاملات میں اسلام نے قائم کیا تھا اس لیے نہایت واضح اور صاف ہونے پر بھی ان کی طبیعت کو مطمئن نہ کر سکی وہ ایسا محسوس کرنے لگے کہ کوئی دوسری بات ہونی چاہیے وہ دوسری بات کیا تھی؟ ہجرت کا واقعہ۔ جونہی یہ بات سامنے آئی سب کے دلوں نے قبول کرلی۔ تاریخ کا یہ مبدا دنیا کی تمام تاریخوں اور یادگاروں کے خلاف تھا۔ صرف خلاف ہی نہ تھا بلکہ صریح الٹا تھا۔ دنیا کی تمام قومیں فتح اقبال سے اپنی تاریخ شروع کرتی ہیں لیکن صحابہ نے بیچارگی سے اپنی تاریخ کا آغاز کیا۔ بلاشبہ ان کی یہ سمجھ دنیا کی قوموں کے مقابلے میں الٹی تھی لیکن اس سمجھ کے عین مطابق تھی جو اسلام کی تربیت میں ان میں پیدا کردی تھی۔ انھوں نے اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر قوموں کی تقلید سے نہیں بلکہ قرآن کی روح سے کرنا چاہی تھی ۔ قرآن نے واقعہ ہجرت کا ذکر یہاں اس طریقہ پر کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بے سروسامانی و غربت کے اس عمل ہی میں فتح و نصرت اور پورے عالم میں کامیابی کی سب سے بڑی معنویت پوشیدہ تھی ثانی اثنین اذ ھما فی الغار۔ یہ سورت یعنی سورۂ برارت اس وقت نازل ہوئی جب اسلام فاتح کی حیثیت حاصل کرچکا تھا۔ معلوم ہوا کہ ساری فتح مندیوں کے باوجود اس کی ضرورت تھی کہ واقعہ ہجرت کی یاد دلائی جائے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اس پر مبسوط مقالہ لکھا ہے۔ میں نے اسی کا خلاصہ معالم میں پیش کر دیا ہے۔

انْفِرُوا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ
وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ
تَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا
لَّاتَّبَعُوكَ وَلَٰكِن بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُونَ
بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ
ع ٦ ١٢ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٤٢﴾

مسلمانو! ساز و سامان سے ہلکے ہو یا بوجھل نکل کھڑے ہو اور راہ خدا میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔ اگر تمہیں اپنے نفع و نقصان کا علم ہے تو یہی تمہارے حق میں بہتر اور مفید ہے[41]۔ اے پیغمبر اگر قریب الحصول فائدہ اور متوسط درجہ کا سفر ہوتا تو یہ لوگ بلاشبہ تمہارے پیچھے پیچھے چلتے لیکن ان کو مسافت دور معلوم ہوتی ہے[42]۔ اور آپ کے روبرو ضرور خدا کی قسم کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم جا سکتے تو ضرور تمہارے ہمراہ جاتے۔ وہ قسمیں کھا کر اپنے کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں[42]۔

مفردات کے معانی

خفاف جمع خفیف کی ہلکا، سبک، خفت سے بنا ہے جس کے معنے ہلکا ہونے کے ہیں بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ خفیف ثقیل کے مقابلہ پر بولا جاتا ہے ان دونوں کا استعمال حسب ذیل معنی میں ہوتا ہے۔ ا۔ وزن کے اعتبار سے

ایک کو خفیف دوسرے کو ثقیل کہتے ہیں۔

۲۔ زمانہ کی مناسبت سے چنانچہ ایک مقررہ وقت میں ایک گھوڑا دوسرے گھوڑے سے زیادہ دوڑے تو کہتے ہیں۔ فرس خفیف، فرس ثقیل۔

۳۔ جو لوگوں کو بھلا لگے اس کو خفیف اور جو لوگوں کو بُرا لگے اس کو ثقیل (گراں) کہتے ہیں۔

۴۔ جو طیش میں آجائے اسے خفیف کہتے ہیں اور جس میں وقار ہو اسے ثقیل کہتے ہیں۔

۵۔ جن اجسام کا رُخ اوپر کی جانب ہو جیسے آگ خفیف اور جن کا رُخ نیچے کی جانب ہو جیسے پانی ثقیل کہلاتے ہیں

ثقالاً۔ ثقیل کی جمع ہے صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ آیت میں لغوی معنے نہیں۔ مرادی معنے مراد ہیں دونوں خفاف اور ثقال مرادی معنے میں ہیں کچھ کہتے ہیں کہ جوان اور بوڑھے مراد ہیں کچھ تونگر اور مفلس مراد لیتے ہیں، کچھ مسافر اور مقیم کہتے ہیں اور کچھ چست اور سست بتاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ سب ہی مراد ہیں۔ کیونکہ آیت کا مقصود جہاد فی سبیل اللہ میں نکلنے کی دعوت ہے کہ ہر حال میں اللہ کی راہ میں نکلنا چاہیے۔ خواہ دشواری اٹھانی پڑے یا آسانی ہو۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ یعنی درحالیکہ اسباب و حشم بسیار دارید یا بجز قدر ضروری بدست شما نباشد و باین توجیہ آیت محکم باشد غیر منسوخ۔

شقہ مسافت امام راغب نے شقہ کے معنے اس سمت کے لکھے ہیں جہاں پہنچنے تک مشقت لاحق ہو۔ ایسا راستہ جو بغیر محنت و مشقت کے طے نہ ہو۔

جہاد کے لیے نکل جانے کا حکم

دینی اور ملی ضرورتوں کے لحاظ سے جہاد ہمیشہ ایک ہی اہمیت نہیں رکھتا ہے بلکہ کبھی تو وہ محض ایک فضیلت اور عزیمت کا کام ہوتا ہے اور کبھی دین کا لازمی تقاضا اور ایمان کی ضروری علامت ہوتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس وقت دشمن کے مقابلے میں عام لام بندی کی ضرورت نہ ہو بلکہ کچھ لوگ بھی اس مہم کو سر کر لینے کے لیے کافی ہوں اس وقت یہ جنگی خدمت صرف ایک فضیلت کا کام ہوگی۔ اس خدمت کا انجام دینے والا اگرچہ بڑے اجر و ثواب کا حقدار ٹھہرے گا۔ اور اس پر وہ ساری نوازشیں ہوں گی جن کا قرآن و سنت میں ذکر ہے مگر جو اس خدمت میں شریک نہ ہوگا تو کچھ کے اس فریضہ کو ادا کر لینے سے اس پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ ایسے ہی مواقع کے لیے قرآن میں کہا گیا ہے کہ "اگرچہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ مغفرت کے مستحق دونوں ہیں لیکن گھر بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں لڑنے والوں کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔

وفضل الله المجاهدين باموالهم وانفسهم على القاعدين درجة وكلا وعد الله الحسنى

لیکن جس وقت صورتحال یہ نہ ہو بلکہ امیر المومنین نے ضرورت محسوس کر کے عام لام بندی کا اعلان کر دیا ہو اس وقت یہ جنگی خدمت صرف فضیلت کی چیز نہیں رہ جاتی بلکہ دین کا ضروری تقاضا اور ایمان کی کسوٹی بن جاتی ہے۔ دور نبوت میں جن لوگوں نے نبوت کی جانب سے اعلان عام کے باوجود نکلنے میں ڈھیل دکھائی ان کو بھی اس رکوع میں مالکم اذا قیل لکم انفروا سے مخاطب کیا گیا ہے۔ اور ان ہی لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ جب نکلنے کا حکم ہو چکا ہے بہر حال تم کو نکلنا چاہیے خواہ رغبت خواہ کراہت خواہ خوشحالی میں ہو خواہ تنگ دستی میں خواہ حالات موافق ہوں یا ناموافق۔

(۴۴) مسلمانو ساز و سامان سے ہلکے ہو یا بوجھل نکل کھڑے ہو اور راہ خدا میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کرو اگر تمہیں اپنے نفع اور نقصان کا علم ہے تو یہی تمہارے حق میں بہتر اور مفید ہے یعنی پیادہ اور سوار فقیر اور غنی، جوان اور بوڑھے، جس حالت میں ہوں نکل کھڑے ہوں۔ نفیر عام کے وقت کوئی عذر پیش نہ کریں[1]۔ خفافا اور ثقالا دو متقابل لفظ ہیں ان کی مختلف اور متعدد تفسیریں آتی ہیں مثلاً تنگدست اور خوشحال جوان تیز رو۔ پیر سست رفتار بیکار اور مشغول بے سر و سامان اور باسامان، خوشدلی سے بے دلی سے مقصود بہر حال عموم حکم ہے کہ جس حال میں بھی ہو جہاد کے لیے نکل پڑو۔ حافظ ابن جریر نے متعدد تفسیریں نقل کر کے قول فیصل یہ لکھا ہے کہ خفاف کے تحت وہ سب داخل ہیں جنہیں قوت خوشحالی صحت جوانی عزم بے شغلی غرض کسی بنا پر آسانیاں حاصل ہوں۔ اور ثقال کے تحت وہ سب آ جاتے ہیں جنہیں اس کے برعکس مذکورہ بالا اوصاف میں دشواریاں لاحق ہوں اور اسی کے قریب قریب حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں پر ہر حال میں نکلنا ضروری ہے جی چاہے یا نہ چاہے فراخی ہو یا تنگی۔ علامہ قرطبی نے خفاف اور ثقال پر دس اقوال لکھے ہیں۔ حق یہ ہے کہ استعداد اور عدم استعداد کی تمام حالتیں اس میں داخل ہیں نوجوان نکل چلنے میں ہلکا ہوتا ہے۔ زیادہ عمر کا آدمی بوجھل ہوتا ہے سرگرم آدمی فوراً اٹھ کھڑا ہوگا۔ کسل مند کے قدم بوجھل ہوں گے جس کے علائق زیادہ ہیں وہ اپنے کو اتنا ہلکا نہ پائے گا جتنا ایک مجرد آدمی یا کم علائق رکھنے والا۔ اسی طرح کوئی سر و سامان سفر سے ہلکا ہوگا کوئی اسلحہ جنگ سے اس طرح کی ساری صورتیں اس میں داخل ہیں۔ صحابہ کرام نے اس آیت سے یہی سمجھا ہے جب کبھی جنگ کا اعلان ہو جاتا تو کسی حال میں بھی وہ اپنے کو شرکت سے معاف نہیں رکھتے تھے الّا یہ کہ قطعاً عاجز و معذور ہوں۔

ابو راشد حرانی کہتے ہیں میں نے مقداد بن اسود کو حمص میں دیکھا جنگ کے لیے نکل رہے تھے میں نے کہا کہ خدا نے تمہیں معذور ٹھہرا دیا ہے یعنی بوڑھے ہو بولے انفروا خفافا و ثقالا کا کیا جواب ہے۔

حبان بن زید شرعبی سے مروی ہے کہ میں نے افسس جاتے ہوئے فوج میں ایک نہایت بوڑھے آدمی کو دیکھا جس کی بھویں آنکھوں پر آ گری تھیں میں نے حیرت سے کہا کہ کیا خدا نے معذروں کو معاف نہیں کر دیا ہے اس نے کہا کہ خدا نے تو ہمیں

[1] افادات شیخ الاسلام

ہر حال میں نکل کھڑے ہونے کا حکم دیا ہے خفافا وثقالا۔ ابوایوب انصاری سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔

یہ آیت اس موضوع پر قطعی ہے کہ جب جہاد کے لیے بلایا جائے اور نفیر عام ہو جائے تو سوائے ان معذروں کے جن کا ذکر پارہ کے آخر میں آرہا ہے کوئی مستثنیٰ نہیں اور ہر شخص پر واجب ہو جاتا ہے کہ جان و مال سے شریک جہاد ہو۔ اور اس بارے میں کوئی عذر مسموع نہیں ہے۔

دیکھے پڑھ آئے ہو کہ غزوہ تبوک کی مہم حضور اقدس ﷺ کی جانب سے ایک دفاعی مہم تھی۔ جب حضور اقدس کو مختلف ذرائع سے قیصر روم کے اقدام کی تصدیق ہو گئی تو حضور اقدس ﷺ نے دفاع کا اعلان فرمایا اور اس کے لیے آپ نے حجاز کی شمالی سرحد کو منتخب کیا۔ دفاع اسلام کے ان بنیادی حکموں میں سے ہے جس کو ایک مسلمان۔ مسلمان رہ کر کبھی ترک نہیں کر سکتا ہے اگر ایک مسلمان کے دل میں رائی برابر بھی ایمان کی محبت ہے تو اس کی طاقت سے باہر ہے کہ دفاع کی صدائے حق سُنے اور از سر تا پا کانپ اُٹھے۔

جہاد کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم قتال یعنی لڑائی ہے اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اقدامی اور دفاعی۔ اقدام کی بنیاد ہی دفاع پر ہے یعنی جب تک دنیا میں عالمگیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہو جائے ضروری ہے کہ حریف و مفسد قوتوں سے ہمیشہ مقابلہ کیا جائے اگر ایسا نہ کیا جائے تو دشمن اہل ایمان کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے اور اسلام کی اشاعت اور اس کے مشن کی تبلیغ میں ہمیشہ رکاوٹ بنیں گے۔

فرائض شرعیہ کی دو قسمیں

فقہاء کی اصطلاح میں فرائض شرعیہ کی دو قسمیں ہیں کفایہ اور عین یہ وہی اعمال انسانی کی تقسیم ہے جس کو جماعتی فرائض اور شخصی فرائض کے ناموں سے پکارا جاتا ہے فرض کفایہ سے مقصود وہ احکام ہیں جو بحیثیت جماعت و اجتماع مسلمانوں پر فرض ہیں نہ کہ بحیثیت فرد و انفراد یعنی ایسے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے عائد کر دیئے گئے ہیں کہ ان کا انتظام کر دیں بس انتظام ہونا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد بہ ذات خاص اس میں حصہ بھی لے۔ اگر ایک گروہ نے ایک وقت میں انجام دے دیا تو باقی مسلمانوں سے ساقط ہو گیا جیسے تجہیز و تکفین میت اور نماز جنازہ۔ فرائض کفایہ میں شریعت کے مخاطب اشخاص نہیں بلکہ جماعت ہے۔ ہر مسلمان پر جماعت کی ذمہ داری ہے کہ یہ کام کرے جب کام ہو جاتا ہے، تو باقی افراد پر اس کا وجوب رہے گا۔

دوسری قسم اعیان کی ہے یعنی وہ فرائض جن کی فرضیت جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہوتا ہے جیسے پانچ وقت نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

شرعاً قتال کی پہلی صورت یعنی اقدام و ہجوم فرض کفایہ ہے۔ ضروری نہیں کہ بیک وقت ہر مسلمان اس میں حصہ لے۔ ہر عہد

اور ہر ملک میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو یہ فرض انجام دیتی رہے اس پر تبصرہ انشاء اللہ پارہ ۱۱ میں زیر تشریح آیت وما کان المومنون لینفروا کافۃ میں آئے گا۔

دوسری قسم دفاع ہے یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں پر اور حکومتوں پر حملہ کا ارادہ کرے تو اس کو ہر طرح مقابلہ کر کے روکنا اور اسلامی ملکوں اور آبادیوں کو غیر مسلموں کے تسلط اور ہر طرح کے قبضہ و اثر سے محفوظ رکھنا۔ یہ فرض عین ہے نماز روزے کی طرح ہر مسلمان سے اس کی بجا آوری کا مطالبہ ہے۔ ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ جس طرح ایک گروہ کے نماز پڑھ لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ سے نماز ساقط نہیں ہوتی۔

ہدایہ میں ہے۔

الا ان یکون النفیر عامًا فحینئذ یصیر من الاعیان۔

لیکن جس وقت نفیر عام ہو جائے جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔

نفیر نفر سے ہے۔ نفر کے معنے تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے ہیں۔ ایسے بلاوے اور اجتماع پر جو لڑائی کے لیے ہو نفیر کا اطلاق ہوتا ہے۔ انفروا خفافًا و ثقالاً کا مطلب یہ ہی ہے کہ اگر دفاع کی ضرورت عام اجتماع و قیام کا وقت آ جائے تو جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ حافظ ابن الہمام نے فتح القدیر میں ہدایہ کی عبارت کی شرح اس طرح کی ہے۔

فرض کفایہ کی صورت اس وقت ہے کہ نفیر عام نہ ہو لیکن اگر مسلمانوں کے کسی شہر پر غیر مسلموں نے حملہ کر دیا تو اس وقت جنگ کرنا ہر مسلمان فرد پر فرض عین ہو جائے گا چاہے جنگ کے لیے دعوت دینے والا عادل ہو یا فاسق ہو۔

اور عنایہ میں ہے:

اگر نفیر عام کی صورت ہو تو پھر جہاد کرنا ان مسلمانوں پر فرض ہو جائے گا جو دشمن سے قریب ہوں اور اس پر قابو رکھتے ہوں۔

اور اقدامی جہاد میں جب کہ جہاد فرض کفایہ ہوتا ہے کچھ جماعتیں مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً عورتیں اور نوکر لیکن اگر دفاع کی صورت پیش آ جائے تو فرضیت ایسی ہمہ گیر ہوتی ہے کہ بچوں اور معذوروں کے سوا کوئی گروہ کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر نوکر بغیر آقا کی اجازت کے مشغول جہاد ہو جائے۔ آیت کا یہی تقاضا اور ایمان کی یہی پکار ہے۔

یہ سب فقہاء کی تصریح ہے۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے

وجوب النفیر یعنی جب حفظ ملت کی ضرورت پیش آ جائے تو قتال کے لیے سب کا اٹھ کھڑے ہونا واجب

ہے اور قرآن کی اسی آیت سے استدلال کیا ہے انفروا خفافا وثقالا۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ ابن عباس کی یہ روایت پیش کی ہے۔ لاھجرۃ بعد الفتح ولکن جھاد ونیۃ فاذا استنفرتم فانفروا فتح مکہ کے بعد قانونی ہجرت کوئی نہیں بس اب تو جہاد اور نیت جہاد ہے لہذا جب تمہیں اٹھ کر چلنے کو کہا جائے اٹھ کر چل دو۔ یعنی جب تمہیں دعوت دی جائے جہاد کرو ——— فتح الباری میں ہے۔

جب ضرورت پیش آئے مثلاً دشمن حملہ آور ہو جائے جسے امام متعین کر دے اس پر فرض ہے۔

موطا امام مالک میں ہے۔

جب دشمن ہمارے شہروں پر حملہ آور ہوں اور امام مسلمانوں کو دعوت جہاد دے تو نفیر عام کے وقت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔

یہاں اس شبہ کو بھی دور کر دیجئے کہ پہلی آیت میں ارشاد ہوا ہے اذا قیل لکم انفروا جب تم سے کہا جائے کہ نکلو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نکلنے کو کہا جائے تب نکلو۔ لیکن اس آیت انفروا خفافا وثقالا کا مطالبہ یہ ہے کہ بلانے والا بلائے یا نہ بلائے ہر حال میں جہاد کے لیے نکل جاؤ۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ نفیر عام سے مقصود کیا ہے؟ یہ مقصود ہے کہ دفاع کی ضرورت پیش آجائے اور ہر شخص کو اس کا علم ہو جائے یا یہ مقصود ہے کہ جب تک کوئی بلانے والا مسلمانوں کو نہ بلائے گا نفیر عام کی حاجت پیدا نہ ہوگی اس کا جواب شاہ ولی اللہ نے موطا کی شرح میں یہ دیا ہے۔

استنفار کے وقت جہاد مسلمانوں پر فرض عین ہو جاتا ہے استنفار کی حقیقت یہ ہے کہ کفار بلاد مسلمین کا ارادہ کریں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ چھڑ جائے بس یہی استنفار ہے۔

شاہ صاحب کے بیان سے ظاہر ہو گیا کہ نفیر کی صورت کیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص دعوت دے مقصود یہ ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے جو نفیر کی متقاضی ہو۔ ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں اس مسئلہ کو پوری قوت سے سمجھایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

یہ سب مسلمانوں کے اعتقاد میں جانی بوجھی بات ہے کہ جب ملک کی بارڈر پر دشمن کا خطرہ ہو اور بارڈر والوں میں تاب مقاومت نہ ہو تو پوری امت پر جہاد فرض ہے۔ اس موضوع پر دو رائیں نہیں ہیں۔ اختلاف تو صرف اس میں ہے کہ جب دشمن کے مقابلے میں بھرپور طاقت مسلمانوں کی موجود ہو اور دشمن کے غالب آنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو کیا مسلمانوں کے لیے جہاد نہ کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ، عطاء، عمرو بن دینار اور ابن شبرمہ کی رائے میں گنجائش ہے۔ مقداد بن الاسود، ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما صحابہ اور تابعین اور احناف یہ کہتے ہیں مسلمانوں پر جہاد فرض ہے تاآنکہ وہ اسلام قبول کر لیں یا جزیہ دیں۔

جہاد بالمال کا حکم

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس آیت میں اور دوسری آیات میں جانوں کے ساتھ ساتھ مالوں سے بھی جہاد کرنے کا حکم ہے قرآن میں مالی جہاد پر تنبیہہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیات ہیں بلکہ مشکل سے کہیں جہاد کا حکم ہوگا جہاں جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو اور قابل ذکر امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو مقدم کیا گیا ہے۔ میدان جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لیے ممکن نہیں ہے لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لیے آسان ہے۔ جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ہر وقت ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔ لیکن مالی جہاد کی ہر وقت ہر آن ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے اس لیے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے۔

نفاق اور اخلاص میں امتیاز

(۴۵) اے پیغمبر اگر قریب الحصول فائدہ اور متوسط درجہ کا سفر ہوتا تو یہ لوگ بلاشبہ تمہارے پیچھے پیچھے چلتے لیکن ان کو مسافت دور معلوم ہوتی ہے۔ یہ منافقین کو کہا کہ اگر سفر ہلکا ہوتا اور بے محنت مال غنیمت ہاتھ آنے کی توقع ہوتی تو جلدی سے ساتھ ہو لیتے لیکن ایسی کٹھن منزلوں کا طے کرنا ان سے کہاں ممکن ہے [1]

اس آیت قرآنی سے سلسلہ بیان ان منافقین کی طرف متوجہ ہوا ہے جن کے لیے غزوہ تبوک کا معاملہ ایک آخری اور فیصلہ کن آزمائش ثابت ہوا تھا۔ اس نے تظاہر اور نمائش کے سارے پردے چاک کر دیئے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اس سورت کو الفاضحہ کے نام سے بھی پکارتے تھے کیونکہ اس سورت نے منافقوں کے بھید کھول کر ان کی فضیحت کر دی تھی۔

غزوہ احد کے ذکر میں سورہ آل عمران میں پڑھ چکے ہو کہ ما کان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم علیہ حتی یمیز الخبیث من الطیب۔

ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ اہل ایمان کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس حالت میں تم ہو وہ ضرور پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کرے گا۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جنھوں نے اسلام کا گھونٹ پیا ہے لیکن ان کے حلق کے نیچے نہیں اترا ہے۔ کسی تعلیم کے اختیار کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو روح پیدا ہونی چاہیے اس سے یک قلم محروم ہیں۔ اخلاص و صداقت کے لیے ان میں کوئی جگہ نہیں ہے اسلام کے جو احکام ان کی شخصی اغراض کے موافق ہیں ان پر خوش خوش عمل کرتے

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں. جو ان کی اغراض کا ساتھ نہیں دیتے ان سے بھاگنا چاہتے ہیں. جب کبھی خوشحالیوں کا موقعہ ہوتا ہے تو وہ دعوی اسلام میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں لیکن قربانیوں کے موقعہ پر آخری صفوں میں ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ ہیں کہ ایمان قبول کرلینے کے بعد ان کی ایمانی ہمت کا حال یہ ہے کہ انہوں نے راہ حق میں مصیبتیں جھیلی ہی نہیں ہیں بلکہ دل کی پوری خوشنودی اور روح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں اس میں بسر کر ڈالیں۔

اب تک یہ دونوں ملے جلے تھے خام پختہ خبیث اور طیب مخلص اور منافق. کھرا اور کھوٹا اللہ نے اعلان فرمایا کہ اللہ کھرے کو کھوٹے سے منافق کو مخلص سے ممتاز کرکے آشکارا کردے گا. چنانچہ یکے بعد دیگرے ایسے مرحلے پیش آتے رہے ہیں جن میں نفاق کے چہروں کو بے نقاب ہونا پڑا. اس سلسلے کا آخری مرحلہ غزوہ تبوک ہے۔

سن چکے ہو کہ اس موقعہ پر نا موافق حالات سے عام مسلمانوں کی سرگرمیاں بھی ابتداء میں کچھ اور ہی رہی تھیں لیکن منافقوں کی حالت بالکل دوسری تھی. یہ حکم ان کے لیے پیام موت سے بھی زیادہ سخت ہوا لگے حیلے بہانے کرنے. ہر شخص ایک نیا بہانہ گھڑ کر لاتا اور کہتا کہ ویسے تو مجھے کوئی عذر نہیں مگر مشکل یہ ہے کہ فلاں کام ضروری آن پڑا ہے. فلاں بات ناقابل برداشت ہو رہی ہے فلاں الجھاؤ سلجھایا نہیں جاسکتا اب جیسا آپ کا حکم ہو. مقصود یہ تھا کہ جھوٹی سچی مجبوریاں سنائیں گے تو حضور اقدس کا اخلاق ایسا نہیں ہے کہ کسی کو مجبور کرکے لے جانا چاہیں۔ ان کی رافت و رحمت ہمیشہ رسی ڈھیلی چھوڑ دیتی ہے. چنانچہ ایسا ہی ہوا حضور اقدس ﷺ ان کے حیلے بہانے سنتے اور یہ دیکھ کر کہ بخوشی چلنے کے لیے تیار نہیں کہہ دیتے کہ اچھا تمہیں رخصت ہے

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں انہی واقعات کی طرف اشارا فرمایا ہے ارشاد ہے کہ اگر کوئی ایسی بات ہوتی کہ فوری فائدہ دکھائی دیتا اور سفر بھی دور کا نہ ہوتا تو ان کے نفاق کو چھپنے کی آڑ مل جاتی جیسے بار بار مل چکی ہے یہ فوراً تیرے پیچھے قدم اٹھا دیتے۔ ظاہری حکم کی تعمیل کرتے۔ دل میں دنیا کا لالچ اور مکر و عذر کی چالیں ہوتیں. چنانچہ احد میں ایسا ہی ہوا تھا مگر انہیں مشکل یہ آپڑی کہ معاملہ نکل آیا ہے عرب سے باہر دور دراز کا اور سفر کی مشقتیں بڑی سخت ہیں. نہ تو دنیا کے نفع قریب کی توقع نہ قریب مقام کی سہولت بے بس ہو گئے اور نمائش کے طور پر بھی ساتھ نہ جاسکے. اللہ کی طرف سے بھی فیصلہ کن آزمائش تھی جس نے چوراہے میں سارا بھانڈا پھوڑ دیا اور جب کبھی راہ حق میں آزمائش آجاتی ہے تو منافقوں کے چہرے اسی طرح بے نقاب ہوتے ہیں۔

یہ بہانہ ساز لوگ جھوٹے ہیں

(۴۲) اور مسلمانوں کے روبرو ضرور خدا کی قسم کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم جاسکتے تو ضرور تمہارے ہمراہ جاتے وہ قسمیں کھا کر اپنے کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں یا تو نکلنے سے پہلے قسمیں کھا کر طرح طرح کے حیلے حوالے کریں گے کہ اب ان کو مدینہ میں ٹھہرے رہنے کی اجازت دے دیں یا واپسی پر جھوٹی قسمیں کھا کر باتیں بنائیں گے تاکہ اپنے نفاق پر پردہ

ڈالیں۔ حالانکہ خدا سے ان کا جھوٹ اور نفاق پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ یہ نفاق و فریب دہی اور جھوٹی قسمیں کھانا انجام کار ان ہی کے حق میں وبالِ جان ہوگا۔[1]

پہلی آیت میں مخاطب حضور اقدس ﷺ تھے۔ اس آیت میں مخاطب مسلمان ہیں۔ اگر سورہ برات کا نزول تبوک کے بعد ہوا ہے تو بلاشبہ ان کی یہ بات واپسی پر ہے۔ ماضی کے صیغوں سے تعبیر کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ بات انھوں نے مسلمانوں سے بعد کو کہی ہے کہ اگر غزوہ تبوک میں جانے کی ہم میں طاقت ہوتی تو ہم تمہاری ہمرکابی میں ضرور تبوک جاتے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی ان کی ہلاکت کا سبب ہے۔ اسی لیے حضور اقدس ﷺ نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے فرمایا کہ منافق کی نشانیاں تین ہیں۔ جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے۔ اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔[2] لفظوں میں تو یہ تین باتیں ہیں۔ لیکن حقیقت میں ایک ہی شکل کی تین مختلف صورتیں ہیں۔ جھوٹ بولنا تو جھوٹ ہی ہے مگر وعدہ کر کے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معنیً اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔ جھوٹ اکیلی برائی نہیں بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں بیسیوں قسم کی برائیاں بھی لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں اسی لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ دوسری برائیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ افاك اثیم جھوٹ بولنے والا۔ گنہ گار ——— کاذب کفار جھوٹا احسان کا حق نہ ماننے والا مسرف کذاب بے باک جھوٹا۔

علامہ قرطبی نے آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ تبوک میں نہ جانے والے جب مسلمان تبوک کی مہم سے واپس آئے ان سے کہنے لگے کہ اگر ہمارے پاس سواری کا جانور اور سرمایہ ہوتا تو ہم بھی تمہارے ساتھ جاتے۔ حالانکہ یہ لوگ جھوٹ بول کر اپنے کو تباہ کر رہے ہیں خدا خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ اپنی حیلہ جوئیوں اور بہانہ سازیوں میں جھوٹے ہیں۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ یہ لوگ جہاد سے واپسی پر مسلمانوں کو قسمیں کھا کر بتا رہے ہیں کہ بخدا اگر ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم بھی ضرور جاتے۔ اللہ سبحانہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جھوٹ کی وجہ سے ہلاک ہو رہے ہیں یہ دلیل ہے اس بات کی کہ جھوٹی قسمیں ہلاکت لاتی ہیں یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں کہ استطاعت نہ تھی۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں مسلمانو! جب تبوک سے تم واپس ہو گے تو تمہارے سامنے یہ پیچھے رہنے والے قسمیں کھا کر کہیں گے کہ اگر ہمیں عذر نہ ہوتا تو ہم بھی تبوک میں جاتے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ: یہ لوگ تبوک سے واپسی کے وقت عذر کی باتیں بنائیں گے اور کہیں گے کہ بخدا اگر ہمارے کچھ بھی بس میں ہوتا تو ہم ضرور ساتھ جاتے وہ جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے کو تباہی کے گڑھے میں ڈال رہے ہیں۔

سب شارحینِ قرآن نے اسی کے قریب قریب اس آیت کی تشریح کی ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام [2] صحیح بخاری

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾
اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾
وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ
فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾
لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ
يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ
الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

اے اللہ کے رسول اللہ آپ کو معاف کرے آپ نے ان کو رخصت کیوں دے
دی ہے (آپ اس وقت تک ان کو رخصت نہ دیتے) جہاں تک سچے آپ کے سامنے
کھل کر آجاتے اور جھوٹوں کا آپ کو علم ہو جاتا۔ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے
ہیں وہ مالوں اور جانوں سے جہاد کی رخصت آپ سے نہیں مانگتے ہیں اللہ خوب جانتا

ہے کہ متقی کون ہیں۔ رخصت تو صرف وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور جن کے دلوں میں شک کے کانٹے ہیں۔ بس وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں [۴۵]۔ اور اگر ان کا نکلنے کا واقعی ارادہ ہوتا تو وہ اس کے لیے ساز و سامان ضرور تیار کر لیتے (واقعہ یہ ہے) کہ اللہ نے ان کا اٹھنا پسند نہیں کیا لہٰذا ان کو روک دیا اور ان سے کہہ دیا گیا دوسرے بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو [۴۶]۔ اگر وہ تم میں ہو کر نکلتے بھی تو خرابی کے سوا تم میں کوئی چیز زیادہ نہ کرتے — اور تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کے گھوڑے دوڑا دیتے اور تم میں ایسے حضرات بھی ہیں جو ان کی بات پر توجہ کرتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو [۴۷]۔ اے پیغمبر بلاشبہ یہ لوگ پہلے ہی فتنہ خیزی کی تگ و دو کر چکے ہیں اور حالات کو زیر و زبر کر چکے ہیں۔ تا آنکہ حق نمایاں ہو گیا اور ان کی ناگواریوں میں اللہ کا حکم غالب ہو گیا [۴۸]۔

معانی مفردات

عدۃ۔ ساز و سامان اسباب۔ علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں مال ہتھیار وغیرہ بہت سا ساز و سامان جو تیار کیا جائے فیومی نے لکھا ہے کہ اس کی جمع عُدَدٌ آتی ہے جیسے غرفۃ کی جمع غُرَفٌ ہے۔ تاج العروس میں ہے عدۃ بالضم جو کچھ بھی تم گردش ایام کے لیے تیار کر سکو مال ہو خواہ ہتھیار اھبۃ کا استعمال جس معنے میں ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی معنے میں عدۃ اور عتاد بھی آتے ہیں۔ بولا جاتا ہے اخذت للامر عدتہ وعتادہ۔ یعنی میں نے اپنے معاملہ کی تیاری کر لی یہ اخفش کا بیان ہے اور ابن دریہ کا خیال ہے۔ العدۃ من السلاح ما اعتدتہ یعنی ہتھیاروں میں عدہ اسے کہتے ہیں جسے تم نے تیار کیا ہو شبط باز رکھا۔ روک دیا۔ شبط سے ماضی ہے جس کے معنے روک دینے اور باز رکھنے کے ہیں مادہ ثبط ہے۔ اسی سے تثبط بھی آتا ہے۔

خبال تباہ کرنا۔ خرابی مچانا۔ فساد و تباہی خبل یخبل کا مصدر ہے وہ خرابی اور فساد کہ جس کے لاحق ہونے کی

جانداروں میں اضطراب اور بے چینی پیدا ہو جائے مثلاً جنون یا ایسا مرض جو عقل اور فکر پر اثر انداز ہو۔

نفاق کے ایک سے زیادہ رُوپ

ایمان و کفر کی طرح نفاق کی بھی سب حالتیں یکساں نہیں ہوتی ہیں اور نہیں تھیں چونکہ اصل کے اعتبار سے یہ حالت ہی انکار ہی کی ایک اقرار نما صورت ہے۔ اس لیے جب بڑھتی ہے تو انکار قطعی ہی کی طرف بڑھتی ہے اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ چنانچہ اس عہد کے منافقوں کی حالت یکساں نہ تھی۔ عبداللہ بن ابی کا نفاق ہر منافق کا نفاق نہ تھا۔ خود قرآن نے اسی سورت کی آیت وممن حولکم من الاعراب منافقون و من اهل المدينة مردوا على النفاق میں اسی کی طرف اشارا کیا ہے۔ کسی نفاق کا رُخ زیادہ تر اس طرف تھا کہ ہجرت سے جی چراتے تھے کسی پر انفاق مال شاق تھا۔ کوئی جہاد سے بچنا چاہتا تھا۔ کسی پر نماز کا قیام سخت گذرتا تھا کوئی ایسا بھی تھا کہ احکامِ الٰہی اور آیاتِ قرآنی کا مذاق اڑاتا تھا۔ اور اس تاک میں تھا کہ اگر مسلمانوں پر آفت آپڑے تو کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھ ہو جائیں تاہم یہ قطعی ہے کہ ان سب نے اسلام بطور اپنے دین کے قبول کر لیا تھا۔ اور مسلمانوں میں سمجھے جاتے تھے۔ ان آیات میں ان کے صدری مکنونات اور نفسی خصائص کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ اور ان کی علامات کو خوب کھول کر بیان کیا گیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ جہاد کے موقعہ پر بچ بچ کر تا تا امکان اس میں شریک ہوتا اگر شرکت کی نوبت آ ہی جائے تو اہلِ ایمان میں تفرقہ بازی اور فتنہ انگیزی کرنا بلاشبہ یہ اعمالِ نفاق کے ہیں اور ہم ان میں سے ایک ایک عمل کو عملِ نفاق کہہ سکتے ہیں اور یہی نفاق عمل ہے لیکن اس نفاق عمل کی وجہ سے ہم کسی کو منافقین کی صف میں کھڑا کر کے وہ سلوک کر سکتے ہیں یعنی کسی ان ظاہری اعمال کی بنیاد پر ہم کسی کو کافر گردان سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ آئندہ کسی پر یہ حکم نہ لگایا جائے گا نزولِ وحی کا زمانہ بالکل جدا تھا اس وقت وحی الٰہی جس کے متعلق نفاق کا حکم لگا دیتی تھی لگ سکتا تھا اب معاملہ صرف ظاہر پر ہے۔

(۴۷) اے اللہ کے رسول اللہ تجھے معاف کرے آپ نے ان کو رخصت کیوں دے دی ہے۔ آپ اس وقت تک ان کو رخصت نہ دیتے۔ یہاں تک کہ سچے آپ کے سامنے کھل کر آجاتے اور جھوٹوں کا آپ کو علم ہو جاتا۔ منافقین جھوٹے عذر کر کے جب مدینے میں ٹھہرے رہنے کی اجازت طلب کرتے تو آپ ان کے کبر و نفاق سے اغماض کر کے اور یہ سمجھ کر ان کے ساتھ چلنے میں فساد کے سوا کوئی بہتری نہیں اجازت دیتے تھے اس کو فرمایا اگر آپ اجازت نہ دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ اس وقت ظاہر ہو جاتا کہ انہوں نے اپنے نہ جانے کو کچھ آپ کی اجازت پر موقوف نہیں رکھا ہے۔ جانے کی توفیق تو انہیں کسی حال میں نہ ہوتی۔ البتہ آپ کے سامنے ان کا جھوٹ سچ کھل جاتا پس اجازت دینا کچھ گناہ نہ تھا۔ البتہ نہ دینا مصالح

حاضرہ کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہوتا۔ اس اعلیٰ واکمل صورت کے ترک کی وجہ سے خطاب کو عفا اللہ عنك سے شروع کرنا عفو کا لفظ ضروری نہیں کہ گناہ ہی کے مقابلہ میں ہو۔ بعض محققین نے عفا اللہ عنك اس جملہ کو صدر کلام میں تعظیم و دعا کے طور پر لیا ہے جیسا کہ عرب کے محاورات میں شائع تھا مگر سلف سے وہی منقول ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا اور لفظ لم اذنت لھم اس کی تائید کرتا ہے۔[1]

آغاز میں اس انداز تعبیر عفا اللہ عنك کے بارے میں شارحین قرآن نے بہت کچھ علمی انداز میں داد تحقیق دی ہے۔ زمخشری کو چھوڑ کر سب نے دلکش اور پُر محبت انداز میں تنبیہ بتایا ہے۔ الشوکانی لکھتے ہیں وفی ھذا عتاب لطیف من اللہ سبحانہ علامہ آلوسی لکھتے ہیں۔ ھذا عتاب لطیف من اللطیف الخبیر سبحانہ لحبیبہ حافظ ابن کثیر حافظ ابن جریر اور علامہ بغوی نے یہاں تشریح میں سفیان بن عیینہ کا یہ تشریحی نوٹ پیش کیا ہے انظروا الی ھذا اللطف بدأ بالعفو۔ الغرض عام شارحین قرآن کا تشریح میں میلان یہی ہے۔ صرف علامہ زمخشری اور ان کی پیروی میں قاضی بیضاوی یہ کہتے ہیں کہ عفا اللہ عنك کنایہ ہے گناہ سے اور مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر تو نے غلطی کی اور بہت برا کیا۔ اخطأت وبئسما فعلت۔ زمخشری کی اس تشریح پر سب نے افسوس کیا ہے اور آلوسی کو زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ قاضی بیضاوی نے زمخشری کی ہمنوائی کیوں کی ہے۔ زمخشری کی رائے میں معاذ اللہ یہ حضور اقدس کو گناہ پر توبیخ ہے۔ اس نے لکھا ہے کنایۃ عن الجنایۃ یعنی عفا اللہ عنك کی تعبیر حضور اقدس کا گناہ بتانے کے لیے ہے۔ گناہ نام ہے حکم کی نافرمانی کا۔ اجازت اور رخصت کے موضوع پر قرآن آپ کو پہلے مختار بنا چکا ہے اور کہہ دیا ہے کہ یہ آپ کے صوابدید اور اختیار تمیزی پر موقوف ہے سورہ نور میں اسی موضوع پر ارشاد ہے۔ فاذا استاذنوك لبعض شانہم فاذن لمن شئت منھم جب آپ سے رخصت اور اجازت چاہیں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت اور رخصت دے دیں۔ فرمایئے اس حکم کی موجودگی میں اگر رخصت مانگنے والوں کو آپ نے اجازت دے دی ہے تو اس میں گناہ کی کونسی بات ہے جو بات آپ کے اختیار تمیزی پر موقوف تھی اس کو گناہ بتانا خواہ مخواہ کی دھاندلی ہے۔ اور یہاں اجازت کا پس منظر یہی ہے جیسا کہ علامہ ابو السعود نے بتایا ہے کہ ان کے جانے میں نہ دین کی کوئی مصلحت تھی اور نہ مسلمانوں کا کوئی فائدہ تھا بلکہ جیسا کہ خود قرآن نے بتایا ہے کہ ان کے جانے میں فساد ہی فساد اور فتنہ ہی تھا۔ اور خود اللہ سبحانہ کو بھی ان کا جانا پسند نہیں ہے کرہ اللہ انبعاثھم۔ تو ایسی حالت میں اس تعبیر کو معصیت جنایت اور گناہ سے کنایہ قرار دینا کہاں کا انصاف ہے۔

محققین تو یہاں نہ تنبیہ مانتے ہیں اور نہ توبیخ بلکہ وہ تو اسے انداز تکریم قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ سفیان ابن عیینہ کی

[1] افادات شیخ الاسلام

زبانی سن آئے ہیں انظر والی ھذا اللطف بدا بالعفو اس لطیف انداز پر غور فرمائیے کہ آغاز ہی عفو سے کیا ہے تاکہ یہ ہے کہ یہ انداز تنبیہ اور توبیخ نہیں بلکہ اندازِ تکریم ہے۔ عربی محاورات میں یہ اندازِ بیان موجود ہے علی ابن جہم المتوکل کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

عفا اللہ عنك الاحرمة ——— نعوذ بعفوك ان ابُعد علامہ شہاب نے بتایا ہے کہ یہ پیمانہ وہاں بولا جاتا ہے جہاں گناہ نہ ہو جس کی تکریم مقصود ہو وہاں بولتے ہیں عفا اللہ عنك ما صنعت فی امری علامہ سجاوندی کہتے ہیں اس میں حضور اقدس ﷺ کی تعظیم کی تعلیم ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اس پیمانہ میں گناہ کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ قشیری کہتے ہیں جو اس کو گناہ کی معافی کا پیمانہ بتاتا ہے۔ وہ عربی زبان کی گہرائیوں سے ناآشنا ہے

بہرحال یہ دلکش اور محبت آمیز انداز یہاں صرف یہ بتانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ عفو و درگذر کی ایک حد ہونی چاہیئے۔ یہ لوگ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ یعنی چشم پوشی اور درگذر آپ کی کریم النفسی کا لازمی تقاضا ہے۔ حضور اقدس ﷺ جس طرح تمام اعلیٰ صفات کے مظہر تھے۔ اسی طرح آپ میں چشم پوشی بھی کمال درجہ موجود تھی۔ منافقین آپؐ کی اس کریم النفسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ جہاد سے فرار کے لیے وہ مختلف قسم جھوٹے اعذار تراشتے اور آپؐ کی جناب میں پیش کر کے جہاد سے رخصت چاہتے حضور ان کے ان بناوٹی اعذار سے واقف ہوتے ہوئے ان کو اپنی کریم النفسی کی بنا پر اجازت دے دیتے۔ حضور اقدس ﷺ کی اجازت سے چونکہ ان کو اپنے نفاق پر پردہ ڈالنے کا ایک موقع مل جاتا اس وجہ سے اللہ سبحانہ نے حضور اقدس ﷺ کو اس لطیف انداز میں آگاہ فرمایا کہ منافقین آپؐ کی کریم النفسی سے بہت غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں آپ اپنی کریم النفسی کی وجہ سے ان کو اجازت دے دیتے ہیں جس سے وہ دلیر ہو جاتے ہیں کہ ان کی مکاری کامیاب ہو گئی۔ حالانکہ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو ان کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ آپ کی اجازت کے بغیر جو گھر میں بیٹھے رہتے تو ہر شخص پہچان لیتا کہ یہ منافق ہیں۔ لیکن وہ آپؐ کی اجازت کو اپنے چہرے کی نقاب بنا لیتے ہیں۔

آیت قرآنی میں تعبیر کا یہ اختلاف قابلِ توجہ ہے کہ سچوں کے لیے صدقوا کی فعلی ترکیب اور جھوٹوں کے لیے کاذبین کی اسمی ترکیب لائے ہیں۔ علامہ ابوالسعود نے بتایا ہے کہ تعبیر کا یہ فرق یہ بتانے کے لیے ہے کہ سچ منافقین میں ایک وقتی حادثہ کے طور پر ہوتا ہے جب کہ جھوٹ ان کی ایک دائمی عادت ہے۔ اور پھر آیت میں سچ کے لیے تبین اور جھوٹ کے لیے علم کی تعبیر بھی بے حد لطیف ہے۔ خبر میں اصل صداقت ہے کذب کا درجہ احتمالی ہے۔ وہ خود بخود نمایاں ہوتا ہے۔ برخلاف کذب کے کہ وہ اپنے لیے ثبوت چاہتا ہے۔ کیونکہ نیکی اصل ہے اور برائی سرتاسر بناوٹ ہے۔

ایمان و اخلاص میں فرق

(۴۸) جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ مالوں اور جانوں سے جہاد کی رخصت آپ سے نہیں مانگتے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ متقی کون ہیں رخصت تو صرف وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور جن کے دلوں میں شک کے کانٹے ہیں وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں۔ یعنی جن کے دلوں میں ایمان و تقویٰ کا نور ہے ان کی یہ شان نہیں کہ جہاد سے الگ رہنے کی اس طرح بڑھ بڑھ کر اجازت مانگیں۔ ان کا حال تو وہ ہے جو اس پارہ کے آخر میں بیان ہوا ہے تولوا واعینھم تفیض من الدمع حزنا ان لا یجدوا ما ینفقون یعنی بے سروسامانی وغیرہ کے عذر سے اگر جہاد فی سبیل اللہ کے شرف سے محروم رہ جائیں تو اس فعل کے فوت ہو جانے سے ان کی آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں۔ بے حیا بن کر جہاد سے علیحدہ رہنے کی اجازت لینا انہی کا شیوہ ہے جن کو اللہ سبحانہ کے وعدوں پر یقین نہیں نہ آخرت کی زندگی کو سمجھتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کے غالب و منصور ہونے کی جو خبریں دی ہیں ان کے متعلق ہمیشہ شک و شبہ میں گرفتار رہتے ہیں [1]

ان آیات میں جس کردار کی تصویر پیش کی گئی ہے اس میں کفر و ایمان کا تقابل مطالعہ کے یا نفاق و ایمان کا۔ ایمان دو معنے میں آتا ہے ایک معنی کے اعتبار سے وہ کفر کا متقابل ہے اور ایک معنی کے اعتبار سے وہ نفاق کا تقابل ہے۔ ایمان جب نفاق کے متقابل ہو تو اخلاص کے معنے میں آتا ہے۔ یہاں اسی معنے میں ہے۔ قاضی بیضاوی نے تشریح میں اس فقرے کے ذریعے فان المخلص منھم یبادرون الیہ مخلصین جہاد کی طرف سبقت کرتے ہیں یہی بتایا ہے۔ یعنی جو اخلاص سے تہی دامن ہوں وہ جہاد سے جان چراتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اہل تقویٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ نیکی میں اجازتیں مانگیں جہاد بہت بڑی نیکی ہے اس کے لیے رخصت طلبی ایمان میں ناسور ہونے کی نشانی ہے۔ افضل وہی ہوتے ہیں جو اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لیے کام کرتے ہیں نہ کہ اپنی اغراض اور اپنے مفادات کے لیے۔ ان کا ہی کام عنداللہ مقبول ہوتا ہے۔ ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح ملتی ہے ان کو خدا کے یہاں محبوبیت ملتی ہے ان کو ہی اس دنیا میں ہر دلعزیزی ملتی ہے ان کے کاموں کو شہرت ملتی ہے۔ ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے وہ اُمتوں اور جماعتوں کے محسن ہوتے ہیں۔ لوگ ان کے کاموں سے نسلاً بعد نسل استفادہ کرتے ہیں۔ اور ان کے لیے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں۔

یہ بات اس باب میں فیصلہ کن ہے کہ کفر و اسلام کی کشمکش ایک کسوٹی ہے جو کھرے مومن اور کھوٹے مدعی ایمان کو

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے جو شخص اس کشمکش میں دل و جان سے اسلام کی حمایت کرے اور اپنی ساری طاقت اور سارے ذرائع اسلام کو سربلند کرنے کے لیے لگا دے اور کسی قربانی سے دریغ نہ کرے وہی سچا مومن ہے بخلاف اس کے کہ جو اس کشمکش میں اسلام کا ساتھ دینے سے جی چراتے اور کفر کی سربلندی کا خطرہ سامنے دیکھتے ہوئے بھی اسلام کی سربلندی کے لیے جان و مال کی بازی کھیلنے سے پہلو تہی کرے اس کی یہ روش خود اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ اس کے ایمان میں اخلاص نہیں ہے گویا یہ ایک پیمانہ ہے اخلاص و نفاق کے درمیان۔ جو لوگ اللہ اور آخرت پر سچا ایمان رکھتے ہیں وہ جہاد سے رخصت کی درخواستیں پیش نہیں کرتے ہیں رخصت کی درخواستیں لے کر وہی لوگ آتے ہیں جن کے ایمان میں اخلاص نہیں ہوتا بلکہ ان کے دلوں میں شک کا روگ ہوتا ہے۔ باقی رہے واقعی معذور تو ان کا عذر سامنے ہوتا ہے اور ہر شخص ان کو معذور گردانتا ہے جیسا کہ اسی پارے میں آگے معذورین کا ذکر آ رہا ہے اور یہاں قرآن نے بھی واللہ علیم بالمتقین سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

ارادہ ہو تو اللہ کی جانب سے توفیق ہوتی ہے

(۴۹) اور اگر نکلنے کا واقعی ارادہ ہوتا تو وہ اس کے لیے ساز و سامان ضرور تیار کر لیتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے ان کا اٹھنا پسند نہیں کیا لہٰذا ان کو روک دیا۔ ان سے کہہ دیا گیا کہ بیٹھ جاؤ بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ ان کا ارادہ بھی گھر سے نکلنے کا نہیں ورنہ اس کا کچھ تو سامان کرتے۔ حکم جہاد سنتے ہی جھوٹے عذر نہ لے دوڑتے واقعہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے ان کی شرکت کو پسند نہیں کیا۔ جاتے تو وہاں فتنے سر اٹھاتے نہ جانے کی صورت میں انہیں پتہ لگ جائے گا کہ مومنین کو خدا کے فضل سے ایک تنکے کے برابر ان کی پروا نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے صفوف مجاہدین میں شامل ہونے سے روک دیا اس طرح نکلنے کا وبال ان کے سر ہے گویا ان کو نکو بنا کر رکھ دیا گیا کہ جاؤ عورتوں بچوں اور اپاہج آدمیوں کے ساتھ گھر میں گھس کر بیٹھ رہو اور حضور اقدس ﷺ نے ان کے اعذار کاذبہ کے جواب میں جو گھر میں بیٹھ رہنے کی اجازت دی یہ بھی ایک طرح خدا ہی کا فرمانا ہے اس لیے تکوینا کی قید کی بھی ضرورت نہیں ہے [1]۔ یہ توفیق کے باب میں اللہ کے قانون کو بیان کیا جا رہا ہے نیکوں کا آہستہ آہستہ نیکیوں کو مزید راستہ دکھانے کا نام توفیق ہے توفیق کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش سے ہے یعنی انسان میں پہلے ارادہ ہو۔ طلب ہو۔ تو اللہ کی جانب سے توفیق آتی ہے۔ اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے۔ بچہ چلنا یا بولنا کیوں کر سیکھتا ہے وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کوشش کرتا ہے تو اس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا

[1] افادات شیخ الاسلام

سیکھتا ہے وہ پہلے بے زبان ہوتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے۔ تو والدین اس کو با معنی الفاظ تلقین کرتے ہیں۔ اور اس طرح والدین کی کوششیں مل کر بار آور ہوتی ہیں اسی طرح توفیق الٰہی اور ارادہ انسانی باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں یہاں قرآن بتا رہا ہے کہ اگر ان کے اندر جہاد کے لیے اٹھنے کا ارادہ ہوتا تو وہ کچھ نہ کچھ سامان ضرور کرتے چونکہ ان میں ارادہ نہ تھا اس لیے توفیق الٰہی کا ظہور نہ ہوا۔ یہی سنت الٰہی ہے کہ جو لوگ نیکی کمانے کے لیے خود اپنے ارادے کو حرکت میں نہ لائیں گے اللہ سبحانہ کی جانب سے ان کو توفیق بھی ارزانی نہ ہوگی۔ اسی کو قرآن نے کرہ اللہ انبعاثھم سے تعبیر کیا یعنی بادل ناخواستہ ان کا اٹھنا اللہ کو پسند نہ تھا۔ کیونکہ جب وہ شرکت جہاد کے جذبے اور نیت سے خالی تھے اور ان کے اندر دین کی سربلندی کے لیے جاں فشانی کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا تو وہ صرف مسلمانوں کی شرما شرمی سے بددلی کے ساتھ یا کسی شرارت کی نیت سے مستعدی کے ساتھ اٹھتے تو یہ چیز ہزار خرابیوں کا باعث ہوتی۔ اس طرح اس آیت میں ارادہ اور طلب کے لیے ایک پیمانہ بتا دیا ہے کہ ارادہ اور طلب وہ ہے جس کی پشت پر تیاری کی شہادت ہو اگر تیاری نہ ہو تو اس کا نام ارادہ نہیں ہے۔ جب ارادہ ہی نہیں تو یہ عذر بھی نہیں بلکہ اس کا نام بہانہ ہے ان لوگوں نے جہاد میں نہ جانے کے لیے بہانے بنائے تھے۔ عذر ہوتا تو ارادہ ہوتا۔ ارادہ ہوتا تو تیاری ہوتی۔ عذر اور بہانے میں فرق ہے اس کو مثال سے سمجھئے جو شخص نماز جمعہ کی تیاری کر چکا ہے اور جانے کا ارادہ کر رہا ہے کہ دفعتاً پیٹ میں درد ہو گیا۔ بخار چڑھ آیا جس کی وجہ سے نہ جا سکا۔ یہ عذر ہے اور اس کے برعکس اگر ایک شخص نے جمعہ کے لیے جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا اور اس کی کوئی تیاری ہی نہ کی پھر اتفاقاً کوئی عذر بھی سامنے آ گیا تو یہ شرعاً عذر نہیں بہانہ ہے۔ یہی حال سب اعمال کا ہے۔ لوگ کام نہ کرنے کے بہانوں کو عذر کہہ کر اپنے نفس کو ٹالنے کی فکر میں رہتے ہیں بتایا جا رہا ہے کہ کام کے لیے تیاری کرنے نہ کرنے ہی سے کسی عذر کے عذر ہونے اور بہانہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے نہ تیاری کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں نہیں گیا قرآن بتاتا ہے کہ تم نہیں گئے بلکہ اللہ نے جانے کی توفیق نہیں دی اسی کو تمثیلاً یوں تعبیر کیا ہے وقیل اقعدوا مع القاعدین یعنی اللہ نے ان کو توفیق نہیں دی ہے قاعدین سے مراد عورتیں بچے اور بیمار ہیں۔

چونکہ مقابلہ بیزنطانی شہنشاہی سے تھا جو مشرق میں روما الکبریٰ کی جانشین تھی اور ابھی حال میں ایران کو شکست دے چکی تھی اس لیے منافقوں کو یقین تھا کہ مسلمانوں کے خاتمے کے دن آ گئے عبداللہ بن ابی سلول نے جو منافقوں کا سرغنہ تھا لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ حضور اقدس ﷺ اس سفر سے واپس نہ آئیں گے اور اسی یقین کی وجہ سے وہ جنگ میں جانے کے لیے تیار نہ تھے۔

منافقین کی فتنہ انگیزیاں

(۵۰) اور اگر وہ تم میں ہو کر نکلتے بھی تو خرابی کے سوا تم میں کوئی چیز زیادہ نہ کرتے اور تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کے گھوڑے

دوڑا دیتے اور تم میں ایسے حضرات ہیں جو ان کی بات پر توجہ کرتے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے یعنی اگر تمہارے ساتھ نکلتے تو اپنے جبن و نامردی کی وجہ سے دوسروں کی ہمتیں بھی سست کر دیتے اور آپس میں لگا بجھا کر مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کی کوشش کرتے۔ اور جھوٹی افواہیں اڑا کر ان کو دشمنوں سے ہیبت زدہ کرنا چاہتے غرض ان کے وجود سے بھلائی میں تو کوئی اضافہ نہ ہوتا ہاں بُرائی بڑھ جاتی اور فتنہ انگیزی کا زور ہوتا۔ ان ہی وجوہ سے خدا نے ان کو جانے کی توفیق نہ دی اور اب بھی ان کے جاسوس یا بعض ایسے سادہ لوح افراد تم میں موجود ہیں جو ان کی بات سے تھوڑا بہت متاثر ہوتے ہیں (ابن کثیر) اگرچہ ویسا فتنہ و فساد برپا نہیں کر سکتے جو ان شریروں کے وجود سے ہو سکتا تھا بلکہ ایک حیثیت سے ایسے جواسیس کا ہمراہ جانا مفید ہے کہ وہ بچشم خود مسلمانوں کی اولوالعزمی دیکھ کر ان سے نقل کریں تو ان کے دلوں پر بھی مسلمانوں کی ہیبت قائم ہوگی [1] مطلب یہ ہے کہ پیچھے رہ جانے والے یہ سمجھ رہے ہیں کہ پیچھے رہ کر ہم بچ گئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا نہ نکلنا ہی مسلمانوں کے لیے بہتر ہوا کیونکہ اگر یہ نکلتے تو فتنہ انگیزیاں کرتے اور کچے دل کے آدمیوں کو بہکاتے رہتے اس سے پہلے ارشاد تھا کہ کرہ اللہ انبعاثھم اللہ کے حضور ان کا اٹھنا ناپسند ہوا یعنی اللہ کے علم میں تھا کہ یہ نہیں نکلیں گے اور اللہ نے تمہارے لیے اس میں بہتری رکھی ہے بتانا یہ ہے کہ اگر یہ لوگ جنگ کے لیے نہیں نکلے تو اللہ سبحانہ کی مصلحت یہی تھی۔ اگر مسلمانوں کی ہمرکابی میں یہ بھی چلے جاتے تو تمہارے لیے یہ مفید بننے کی جگہ الٹے بہت بڑی مصیبت کا سامان بن جاتے ان کی بھاگ دوڑ تمہارے درمیان کوئی نہ کوئی فتنہ بپا کرنے میں ہوتی وفیکم سماعون لھم اور تمہارے اندر بھی ان منافقوں کی باتیں سننے والے اور ماننے والے موجود ہیں۔ یہ اشارہ ان سادہ لوح مسلمانوں کی طرف ہے جو اگرچہ منافق نہیں لیکن اپنی شرافت کی وجہ سے بسا اوقات ان منافقین کے چکمے میں آجاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جماعتی زندگی کے لیے تذبذب اور کچے دل کے آدمیوں کی موجودگی ایک بڑا مہلکہ ہے۔ خصوصاً جب کہ ملت موت وحیات کی جدوجہد میں مشغول ہو یہی وجہ ہے کہ آزاد سے آزاد قومیں بھی مجبور ہوتی ہیں کہ جنگ کے وقت میں حکومت کو غیر معمولی اختیارات دیں۔ اور اگر شخصی آزادی کے قوانین بھی معطل کر دے تو معترض نہ ہوں کیونکہ اس وقت ایک منافق کی شرارت پوری قوم کو خطرہ میں ڈال سکتی ہے۔

ان آیات کا مطالبہ یہ ہے کہ حتی الامکان ایسے افراد کی موجودگی برداشت نہیں کرنی چاہیے کہ ان کی علیحدگی سے جو عارضی شور و شغب ہوگا وہ جماعتی مصالح کے لیے جو زیادہ مضر ہوگا۔ اگر درخت کی جڑ درست ہے تو جتنا چھانٹو گے اتنا ہی زیادہ پھیلتا جائے گا اور فاسد اعضاء کا علیحدہ کرنا مضر نہیں ہوتا۔ چھوڑ دینا جسم کے لیے مہلک ہوتا ہے۔

منافقین کا گندہ ماضی

اے پیغمبر بلاشبہ یہ لوگ پہلے ہی فتنہ خیزی کی تگ و دو کر چکے ہیں اور حالات کو زیر و زبر کر چکے ہیں تا آنکہ حق نمایاں

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوگیا اور ان کی ناگواریوں میں اللہ کا حکم غالب ہوگا۔ جس وقت حضور اقدس ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے یہود اور منافقین مدینہ آپ کے خلاف طرح طرح کی فتنہ انگیزیاں کرتے رہے۔ اور اسلام کی روزافزوں ترقیوں کا تختہ الٹنے کے لیے بہت کچھ الٹ پھیر کی مگر بدر میں جب کفر وشرک کے بڑے بڑے ستون گر گئے۔ اور حیرت انگیز طریقہ پر اسلام کا غلبہ ظاہر ہوا تو ابن ابی سلول اور اس کے ساتھیوں نے کہا ان ھذا امر قد توجہ کہ یہ چیز تو اب رُکنے والی معلوم نہیں ہوتی۔ چنانچہ بہت سے لوگ خوف کھا کر محض زبان سے کلمہ اسلام پڑھنے لگے مگر چونکہ دل ہی دل میں کفر چھپا ہوا تھا اس لیے جوں جوں اسلام اور مسلمانوں کی کامیابی اور غلبہ دیکھتے دل ہی دل میں جلتے اور غیظ کھاتے تھے۔ غرض ان کی فتنہ پردازی اور مکاری کوئی نئی چیز نہیں۔ شروع سے ان کا یہی وتیرہ رہا ہے۔ جنگ احد میں یہ لوگ اپنی جماعت کو راستہ سے لے کر لوٹ آئے تھے مگر آخر دیکھ لیا کہ حق کسی طرح غالب ہو کر رہتا ہے اور باطل کیسے ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے [1]

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین آپ کے اور آپ کے صحابہ کے خلاف اور آپ کے دین کی مخالفت میں بھرپور کردار ادا کر چکے ہیں اور ایک عرصہ تک اپنی ساری فکری قوتوں کو اس میں لگا چکے ہیں جب حضور اقدس قدم رنجہ فرمائے مدینہ ہوئے۔ پوری عرب کی سیاسی قوت نے آپ کے خلاف محاذ بنایا اور مدینہ کے یہود اور یہ منافقین بھی ان کے مخالفت میں ہمنوا تھے اللہ سبحانہ نے بدر میں حضور اقدس کی بے مثال مدد فرمائی اور اسلام کا بول بالا کیا تو یہی منافقین کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی کہہ رہا تھا کہ اسلام کی برتری حاصل ہوگئی۔ اس غلبہ اور برتری کو دیکھ کر یہ لوگ ظاہر میں حلقہ اسلام میں داخل ہوگئے پھر جوں جوں اسلام کو غلبہ ہوتا گیا ان کے گھروں میں صف ماتم بچھتی گئی یہی حتی جاء الحق وظھر امر اللہ وھم لہ کارھون میں بتایا جا رہا ہے۔

حافظ ابن جریر نے یہ مطلب بتایا ہے کہ اے اللہ کے پیغمبر یہ منافقین آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے لیے ہمیشہ فتنہ کا سامان بنے رہے ہیں۔ ماضی میں ان کی کوشش یہی رہی ہے کہ صحابہ کرام کو دین سے برگشتہ کریں اس کے لیے تدبیر یہ کی ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود آپ سے اس موقعہ پر علیحدگی اختیار کی جب اجتماعیت کی ضرورت تھی اور یہی عبداللہ ابن ابی اپنے ساتھیوں کو لے کر آپ سے الگ ہوگیا مقصد صرف یہ تھا کہ سارے صحابہ اس کی ہم نوائی کریں اور آپ تنہا رہ جائیں یہ پہلا فتنہ ہے جس کی طرف قرآن نے لقد ابتغوا الفتنۃ من قبل سے اشارہ کیا ہے۔ اور وقلبوا لک الامور کا مطلب ہے کہ آپ کے اور آپ کے دین کے بارے میں ان کی فکری جولانیاں یہی رہی ہیں کہ آپ کو اور آپ کے دین کو ختم کر دیا جائے۔ ان کی امنگوں، خواہشوں کے علی الرغم آپ کا اور آپ کے دین کا بول بالا ہوا ہے۔

یہ اس گروہ منافقین کے ماضی کی اس آیت میں تصویر پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ لوگ ماضی میں کیا کرتوت کرتے رہے ہیں۔ قرآن نے صرف اشارہ کیا ہے کیونکہ یہ کوئی راز نہ تھا بلکہ منظر عام پر ہونے کی وجہ سے سب مسلمان جانتے تھے۔

[1] از افادات شیخ الاسلام

ہی ہیں جنھوں نے جنگ احد کے موقعہ پر پہلے تو شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔ پھر جب ان کا مشورہ قبول نہیں ہوا تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر عین موقع پر الگ ہو گیا۔ پھر جنگ کے بعد اسی کے ہم خیالوں نے یہ پروپاگنڈہ کیا۔ کہ نعوذ باللہ حضور اقدس قوم کے خیر خواہ نہیں ہیں پھر یہی لوگ تھے جنھوں نے جنگ مریسیع کے موقعہ پر اپنی فتنہ انگیزی سے ایسی صورت پیدا کر دی کہ انصار و مہاجرین کے درمیان تلوار چلتے چلتے رہ گئی۔ اسی سلسلے میں ان کی ایک نہایت سنگین شرارت واقعہ افک کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جو بات کا بتنگڑ بنانے کی ایک نہایت ناپاک مثال ہے حنین کے موقع پر تقسیم غنیمت کے معاملے میں انھوں نے بدطینتی سے دلوں میں سخت کدورت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ غرض جو موقعہ بھی ہاتھ آیا اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈلوانے میں کوئی کمی نہیں کی لیکن اللہ سبحانہ نے ان کی مفسدانہ سرگرمیوں کے برعکس اسلام اور مسلمانوں کا بول بالا کیا۔

ابو بکر الجصاص کی رائے میں یہاں فتنہ سے مراد مسلمانوں میں باہم تفریق ڈالنا اور جماعتی نظم کو پامال کرنا ہے۔ فان الفتنة ههنا المحنة باختلاف الكلمة والفرقة۔ اگر حقیقت بین نگاہوں سے دیکھا جائے تو نفاق کی جڑ یہی ہے۔ قاضی بیضاوی نے بھی فتنہ کا مدعا یہی بتایا ہے تشتيت امرك وتفريق اصحابك اور دوسرے شارحین قرآن نے اسی کو شرف پذیرائی دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ تشتت وافتراق۔ انتشار و تفریق کا ہر عمل نفاق ہے۔ یہ زندگی نہیں موت ہے۔ یہ عزت نہیں ذلت ہے یہ ترقی نہیں تنزل ہے سعادت نہیں شقاوت ہے تقوی نہیں فجور ہے حسنہ نہیں سیئہ ہے۔ اعاذنا اللہ من النفاق۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي
الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾
اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ
مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا
وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ
هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ
هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ
نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ
اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو کہتے ہیں مجھے رخصت دے دیجئے اور فتنہ میں
مبتلا نہ کیجئے۔ یاد رکھو کہ یہ لوگ فتنہ میں جا گرے ہیں اور بلاشبہ دوزخ کفر کرنے والوں
کا گھیرا ڈالے ہوئے ہے۔۴۹ اگر آپؐ کو کوئی خوشحالی ملتی ہے تو ان کو بری لگتی ہے
اور اگر آپؐ پر کوئی افتاد آپڑتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ ہم نے اس افتاد سے پہلے ہی
اپنا بندوبست کر لیا تھا اور شاداں پشت پھیر کر چل دیتے ہیں۔۵۰ آپؐ فرما دیجئے
کہ ہم کسی افتاد کی لپیٹ میں کبھی نہیں آ سکتے۔ سوائے اس افتاد کے جو اللہ نے
ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا کارساز ہے اور اللہ ہی پر بس اہل ایمان کو

بھروسہ کرنا چاہیئے[۵۳] اے اللہ کے رسول ان سے کہہ دو کہ ہمارے بارے میں
تمہیں صرف دو خوبیوں میں سے ایک کا انتظار ہے۔ اور ہمیں تمہارے بارے
میں انتظار ہے کہ اللہ تم کو عذاب دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں سے دلواتا ہے لہذا
انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں[۵۴]

مفردات کے معانی

الحسنیین۔ حسنیٰ کا تثنیہ بروزن فعلیٰ اچھی اور عمدہ حسنہ اور حسنیٰ میں باریک سا فرق ہے کہ حسن اعیان اور ذوات کے لیے اور احداث و واقعات دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح حسنہ جب صفت بن کر آئے دونوں کے لیے مستعمل ہوتی ہے اور اسم ہو کر استعمال ہو تو صرف احداث و واقعات کے لیے بولی جاتی ہے اور حسنیٰ کا استعمال صرف احداث میں ہوتا ہے۔ اعیان میں نہیں ہوتا ہے۔

لا تفتنی تو مجھے فتنہ میں نہ ڈال۔ یفتن فتن فتونًا ضرب جس کے معنے فتنہ میں ڈالنے اور گمراہ کرنے کے آتے ہیں نہی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ن وقایہ متکلم۔

ایمان کی منزل اور ہے کفر کی منزل اور ہے

ان آیات میں تقویٰ کی مصنوعی اور بناوٹی نمائش کو جہاں نفاق کی نشانی بتایا ہے وہاں ایمان و کفر کی ذہنیت کے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ کفر جو کچھ کرتا ہے اپنے نفس کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کے نفس کی خوشی کچھ دنیوی مقاصد کے حصول پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ مقاصد اسے حاصل ہو جائیں تو وہ پھول جاتا ہے اور حاصل نہ ہوں تو اس پر مردنی چھا جاتی ہے۔ پھر اس کا سہارا تمام تر مادی اسباب پر ہوتا ہے وہ سازگار ہوں تو اس کا دل بڑھنے لگتا ہے اور ناسازگار ہوتے نظر آئیں تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ بخلاف اس کے ایمان جو کچھ کرتا ہے وہ اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کام میں اس کا بھروسہ اپنی قوت یا مادی اسباب پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی ذات پر ہوتا ہے راہِ حق میں کام کرتے ہوئے اس پر مصائب نازل ہوں یا کامرانیوں کی بارش ہو دونوں صورتوں میں وہ یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ اللہ کی مرضی ہے وہ پوری ہو رہی ہے۔ مصائب کا ہجوم اس کا دل نہیں توڑتے

اور کامیابیاں اس کو اتراہٹ میں مبتلا نہیں کرتی ہیں کیونکہ اول تو وہ دونوں کو اپنے حق میں خدا کی جانب سے سمجھتا ہے اور اسے ہر حال میں یہ فکر ہوتی ہے کہ خدا کی ڈالی ہوئی اس آزمائش سے بخیریت گذر جائے دوسرے اس کے پیشِ نظر دنیوی مقاصد نہیں ہوتے کہ ان کے لحاظ سے وہ اپنی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ کرے۔ اس کا مقصد وحید رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ اور اس مقصد سے اس کے قریب یا دور ہونے کا پیمانہ کسی دنیوی کامیابی کا حصول یا عدمِ حصول نہیں ہے بلکہ صرف یہ امر ہے کہ راہ خدا میں جان و مال کی بازی لگانے کا جو فرض اس پر عائد ہوتا تھا اسے اس نے کہاں تک انجام دیا۔ اگر یہ فرض اس نے ادا کر دیا ہو تو خواہ دنیا میں اس کی بازی بالکل ہی رہ گئی ہو لیکن اسے بھروسہ رہتا ہے کہ جس اللہ کے لیے اس نے مال کھپایا اور جان دی ہے وہ اس کے اجر کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ پھر دنیوی اسباب سے وہ آس ہی نہیں لگاتا ہے۔ تا کہ ان کی سازگاری اور ناسازگاری اس کو خوش یا رنجیدہ کردے۔ اس کا سارا اعتماد خدا پر ہوتا ہے جو عالمِ اسباب کا حاکم ہے اور اس کے اعتماد پر وہ ناسازگار حالات میں بھی اسی عزم و ہمت کے ساتھ کام کیے جاتا ہے جس کا اظہار اہلِ دنیا سے صرف سازگار حالات ہی میں ہوا کرتا ہے۔ بس اللہ فرماتا ہے کہ ان منافقین سے کہہ دو کہ ہمارا معاملہ تمہارے معاملہ سے بالکل مختلف ہے۔ تمہاری خوشی و رنج کے قوانین کچھ اور ہیں اور ہمارے کچھ اور، تم اطمینان اور بے اطمینانی کسی اور ماخذ سے لیتے ہو اور ہم کسی اور ماخذ سے۔

(۵۱) اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو کہتے ہیں۔ مجھے رخصت دے دیجئے اور فتنہ میں مبتلا نہ کیجئے۔ یاد رکھو کہ یہ لوگ فتنہ میں جا گرے ہیں اور بلاشبہ دوزخ کفر کرنے والوں کا گھیر ڈالے ہوئے ہے۔ ایک بڑے منافق جد بن قیس نے کہا کہ حضرت مجھے تو یہیں رہنے دیجئے روم کی عورتیں بہت حسین ہوتی ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر دل پر قابو نہ رکھ سکوں گا تو مجھے وہاں لے جا کر گمراہی میں نہ ڈالیے۔ فرمایا یہ کہہ کر اور اپنے جبن و کفر پر جھوٹی پرہیزگاری کا پردہ ڈال کر وہ گمراہی کے گڑھے میں گر چکا۔ اور آگے چل کر کفر و نفاق کی بدولت دوزخ میں گرنے والا ہے۔ بعض نے آیت کو عام منافقین کے حق میں رکھا ہے اور لا تفتنی کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہم کو ساتھ لے جا کر اموال وغیرہ کے نقصان میں مبتلا نہ کیجئے۔ اس کا جواب الا فی الفتنۃ سقطوا سے دیا ہے [1]

دراصل انسان میں جب سچائی باقی نہیں رہتی تو نیکی و پرہیزگاری ہی کے خیال کو نیکی اور پرہیزگاری کے خلاف استعمال کرنے لگتا ہے اور اس سے حیلے بہانے کا کام نکالتا ہے اور یہ نفاق کا سب سے پُر فریب حربہ ہے۔ بہت سے سادہ لوح دیندار اس کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔ اس آیت میں اسی بات کی طرف اشارا ہے کچھ لوگ کہتے ہیں اس سفر میں جانا فتنوں سے دوچار ہونا ہے لہذا اس میں ہمیں نہ ڈالیے مدینہ ہی میں رہنے دیجئے۔ فتنہ سے ان کی کیا مراد تھی قرآن نے بیان نہیں کیا اور اس لیے نہیں بتایا کہ صریحی قرائن اس کی وضاحت کر رہے ہیں یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

بلاشبہ وہ ہر قسم کے متوقع اور وہمی خطرات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیش کرتے ہوں گے اور اسے فتنہ سے تعبیر کرتے ہوں گے مثلاً اس موسم میں ہزاروں آدمیوں کے لے جانے کی کیا تک ہے اس قدر دور دراز کے سفر میں لے جانا جان بوجھ کر ان کو ہلاک کرنے والی بات ہے اور یہ نیکی کا کام نہیں ہے پھر جہاں جانا ہے وہ دوسروں کا ملک ہے نہ معلوم کن کن برائیوں میں پڑنا پڑے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ نے تبوک جانے کا ارادہ کیا تو منافقوں کے ایک سردار جد بن قیس نے کہا میں عورتوں کے معاملہ میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہیں بنو اصفر کی عورتیں دیکھ کر مفتون نہ ہو جاؤں۔ پس مجھے رہ جانے کی اجازت دیجئے اور اس فتنے میں نہ ڈالیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو باتیں کہی گئی ہوں گی وہ اسی قسم کی ہوں گی۔ یہ متقیانہ قسم کا بہانہ کہ وہ عورت کے معاملے میں بہت کمزور ہے اس وجہ سے اسے جنگ میں شرکت سے معذور رکھا جائے۔ اگرچہ یہ عذر پیش تو کسی نے ضرور کیا ہو گا لیکن یہ عذر کی ایک ایسی صورت ہے جس کو تقویٰ اور دینداری کا لباس پہنانے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے۔ قرآن نے اسی لیے اس کا خاص طور پر ذکر کیا ہے تاکہ مسلمانوں کو شیطان کے خاص حربہ سے آگاہ کر دیا جائے کہ کبھی کبھی وہ تقویٰ کے بھیس میں بھی حملہ آور ہوتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ عذر بھی اشخاص کے اعتبار سے نت نئے اور الگ ہوں گے۔ کوئی کہتا ہو گا کہ اہلیہ پورے دنوں سے ہے کوئی بتاتا ہو گا کہ دکان پر کوئی نہیں کوئی کہتا ہو گا کہ گھر میں بچے ہیں نگران کوئی نہیں کسی نے بہانہ کیا ہو گا کہ ملازمت کا مسئلہ ہے چھٹی نہیں۔ لیکن قرآن نے یہاں اس واقعہ کی طرف اشارا صرف اس لیے کیا ہے کہ یہ دین کے نام پر بے دینی ہے۔ خالص معصیت سے آپ بچ سکتے ہیں لیکن گناہ کو جب آپ نیکی کے لباس میں پیش کریں تو اس سے بچنا بے حد دشوار ہے۔ دین میں ساری بدعات کی اصل علت یہی ہے آپ جانتے ہیں کہ یتیم کا مال کھانا حرام ہے لیکن یتیم ہی کے مال پر جب ختم کا لیبل لگا دیا جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس میں معصیت کا تصور نہیں رہتا بلکہ اس خالص خدا کی نافرمانی اور معصیت پر مشتمل کھانے کو متبرک بنا لیا گیا ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اغاثۃ اللہفان میں اس کی کئی اور متعدد مثالیں دی ہیں یاد رکھیے کہ شیطان ہر باطل پر نیکی کا حربہ چڑھا دیتا ہے ساری بدعتوں پر جب حبِ رسول کا سب صحابہ اور تبرا پر حب اہلبیت کا ائمہ اجتہاد سے باغیانہ اور بے باکانہ تعلقات پر طاعت رسول کا ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر اسلامی جمہوریت کا لیبل لگا دیا جائے تو یہی تو معصیت پر تقویٰ کا لبادہ ہے۔ جرم کی سنگینی کے پیش نظر قرآن نے خاص طور پر اس واقعہ کی طرف اشارا کیا ہے۔ اللھم اعذنا من شرور انفسنا من سیئات اعمالنا۔

ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہے الا فی الفتنۃ سقطوا یعنی تبوک پہنچ کر فتنے میں مبتلا ہونا تو ایک خیالی بلا ہے لیکن واقعی فتنہ تو یہ ہے کہ اس مصنوعی پرہیزگاری کی آڑ میں جہاد کو چھوڑ کر بیٹھ گئے ہو۔ اس لیے کہ فرائض دینی سے فرار کے لیے اس قسم کے عذر تراشنا بجائے خود ایک ایسا فتنہ ہے جس کے بعد ان کی بربادی کے لیے کسی اور فتنہ کی ضرورت

نہیں آخر میں ارشاد ہوا ہے وان جھنم لمحیطۃ بالکافرین۔ ضمیر کی جگہ اسم کافرین لا کر بتا دیا کہ ان کی یہ سزا کفر کی وجہ سے ہے اور سزا کو یقینی اور واقعی ظاہر کرنے کے لیے اسم فاعل لائے ہیں۔ مطلب ہے کہ غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنا اور حضور اقدس ﷺ کی نافرمانی اتنا سنگین گناہ ہے کہ اس کی پاداش میں ایسے لوگوں کو جہنم کی لپیٹ میں آنا ہے یہ ٹھیک ایسا ہی ہے جیسے مال یتیم کھانے والے کے بارے میں ہے ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارا وسیصلون سعیرا۔ علامہ آلوسی نے اسے تمثیل قرار دیا ہے ان منافقین کی احاطہ اسباب کی حالت کو جہنم کے احاطہ سے تشبیہ دی ہے اور لفظ کفران کے عمل کو خالص کافرانہ عمل بنانے کے لیے لائے ہیں۔

اسلام پر افتاد سے نفاق کی شادمانی

(۵۲) اگر آپ کو خوشحالی ملتی ہے تو ان کو بری لگتی ہے۔ اور اگر آپ پر کوئی افتاد آ پڑتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ ہم نے اس افتاد کے لیے پہلے ہی اپنا بندوبست کر لیا تھا اور شاداں پشت پھیر کر چل دیتے ہیں۔ منافقین کی عادت تھی کہ جب مسلمانوں کو غلبہ اور کامیابی نصیب ہوتی تو جلتے اور کڑھتے اور اگر کبھی کوئی سختی کی بات پیش آ جاتی مثلاً کچھ مسلمان شہید یا مجروح ہو گئے تو فخریہ کہتے کہ ہم نے از راہ دور اندیشی پہلے ہی اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا ہم سمجھتے تھے کہ یہی حشر ہونے والا ہے۔ لہذا ان کے ساتھ گئے ہی نہیں غرض ڈینگیں مارتے ہوئے اور خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے اپنی مجلسوں سے گھروں کو واپس جاتے [1]

حافظ ابن جریر نے یہی مطلب بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ بتا رہے ہیں کہ اے اللہ کے رسول اگر آپ کو کوئی خوشی ہوتی ہے اور اللہ سبحانہ تبوک کی جنگ میں آپ کے لیے کسی شادمانی کا سامان فرماتا ہے تو ان منافقین کے یہاں صف ماتم بچھ جاتی ہے اور غم میں ڈوب جاتے ہیں اور اگر کوئی افتاد آتی ہے فوج میں کچھ پریشانی ہوتی ہے حالات میں ناخوشگواری ہوتی ہے تو یہ لوگ خوشیاں مناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس افتاد کے آنے سے پہلے ہی محمد مصطفیٰ سے جنگ میں پیچھے رہ کر اپنے بچاؤ کا سامان کر لیا تھا۔

قد اخذنا امرنا من قبل کا علامہ نیشاپوری نے یہ مطلب بتایا ہے ہم تو اپنے حسن تدبیر اور سیاسی بصیرت کی وجہ سے پہلے ہی حالات سے باخبر تھے ہمیں تو پہلے ہی سے نتائج کا علم تھا اس لیے ہم نے پہلے اپنا بچاؤ کر لیا تھا قرطبی فرماتے ہیں کہ ہم نے پہلے احتیاط سے کام لیا اور میدان جنگ کی طرف نہیں گئے اور علامہ آلوسی کہتے ہیں کہ موجب افتاد حالات کا پہلے ہی مداوا کر لیا تھا کہ جنگ میں شمولیت ہی اختیار نہیں کی۔

یہاں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ آل عمران میں حسنہ کے مقابلے میں سیئۃ لائے ہیں وان تصبکم سیئۃ یفرحوا بہا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور یہاں حسنہ کا مقابلہ سیئہ سے نہیں بلکہ مصیبۃ سے کیا ہے ان تصبك مصيبة، عناية القاضي وكفاية الراضي میں اس کا بڑا لطیف جواب دیا ہے کہ آلِ عمران میں خطاب امت سے ہے اور یہاں مخاطب حضور اقدس ﷺ ہیں آپ کے حق میں ہر افتاد قابل اجر وثواب ہے وہ آپ کے کسی عمل کا نتیجہ نہیں حالات کا تقاضا ہے برخلاف سیئہ کے کہ وہ اعمال کا نتیجہ ہے اور عتاب ہے

اس آیت میں دراصل اللہ سبحانہ نے ان کے اندرون کو بے نقاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ عذر اور بہانے تو محض نمائشی ہیں۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ ان کے دلوں میں تمہاری بدخواہی ہے جب تم کسی کامیابی سے ہمدوش ہوتے ہو تو ان کو رنج ہوتا ہے۔ اور تکلیف ہوتی ہے اور اگر تمہیں کسی مصیبت سے کبھی دوچار ہونا پڑ جائے تو ان کے گھروں میں گھی کے چراغ جل جاتے ہیں اور خوشی سے ان کے دل بلیوں اچھل جاتے اور کہتے کہ خوب ہوا ہم نے اپنا بچاؤ پہلے کر لیا تھا۔

حالات کا دارومدار اللہ کی طرف سے ہے

(۵۲) آپ فرما دیجئے کہ ہم کسی افتاد کی لپیٹ میں کبھی نہیں آسکتے سوائے اس افتاد کے کہ جو اللہ سبحانہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے اللہ ہی تو ہمارا کارساز ہے اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے یعنی سختی ونرمی جو جس وقت کے لیے مقدر ہے وہ تو ٹل نہیں سکتی۔ نہ دنیا میں اس سے چارہ ہے ہم چونکہ ظاہر و باطن میں اللہ سبحانہ کو اپنا حقیقی مولا اور پروردگار سمجھتے ہیں۔ لہذا ہماری گردنیں اس کے فیصلے کے سامنے پست ہیں۔ کوئی سختی اس کی فرمانبرداری سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اور اسی پر ہم کو بھروسہ ہے کہ وہ عارضی سختی کو روزِ قیامت بالیقین اور بسا اوقات دنیا میں ہی راحت اور خوشی سے تبدیل کر دے گا[۱]

حافظ ابن جریر نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ اے اللہ کے رسول آپ ان سے کہہ دیجئے جو غزوہ میں پیچھے گئے کہ ہمیں اللہ کے فیصلہ کے بغیر کوئی تکلیف نہیں آسکتی ہے۔ دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ ہی ہمارا مددگار ہے اور اہل ایمان ہ سو صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا ہے۔ اگر وہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں اور اس کے سوا کسی مدد کے متوقع نہ ہوں اور ان کے دلوں میں اس کے سوا کسی کا نہ ہو تو اللہ سبحانہ ان کو زندگی کے ہر گوشہ میں کافی ہوگا اور مخالفین کے مقابلے میں صرف ان کی مدد کرے گا۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں ہماری زندگیاں اللہ کی قدرت اور مشیت کے تابع ہیں اللہ ہی ہمارا آقا اور مالک ہے۔ اور ہمارا بس اسی پر بھروسہ ہے۔

اس آیت میں دو اہم مسئلے ہیں۔ ایک اس زندگی میں قضا وقدر کا دوسرا زندگی میں اللہ سبحانہ پر بھروسہ کرنے کا۔

[۱] افادات شیخ الاسلام

قضاو قدر کا مسئلہ

قضاء و قدر کے مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا ہے جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہوگا۔ وہ اتفاقی حادثہ نہیں اور نہ خود بخود ہے بلکہ اس کائنات کے خالق اللہ سبحانہٗ علم سابق اور فیصلہ ازل کے مطابق ہوا ہے ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کا نقشہ تیار کر لیتا ہے اور اسی مجوزہ نقشے کے مطابق معمار اور مزدور اس تعمیر کو مکمل کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس مہندس ازل خالق کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول و قواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں۔ موت و حیات۔ فقر و غنا۔ شکست و فتح۔ ترقی و تنزل۔ عروج و زوال۔ کامیابی ناکامی۔ آرام و تکلیف۔ ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق اس کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہ راست نتیجہ نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے اس لیے اس پر ہمارا فخر کرنا بے جا ہے اسی طرح ہم کو جو جنگ میں ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ سبحانہٗ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے ہیں اس لیے شکست پر ہمیں دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی جوش و خروش اور سرگرمی سے پھر از سر نو جدوجہد میں مصروف ہونا چاہیے۔ اس عقیدہ کا نتیجہ پستی سستی اور دون ہمتی نہیں بلکہ بلندی استقلال اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ چیز ہے جو حضور اقدس ﷺ اور صحابہ کرام کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے ان کو صاحب وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں کو کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں ہے کیونکہ لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا وعلی اللہ فلیتوکل المومنون۔ ہم پر کوئی آفت اس کے علاوہ آ ہی نہیں سکتی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔ خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں جن کے لیے موت مقرر ہے وہ میدان جنگ میں بھی مریں گے۔ اور استراحت کے بستر پر بھی۔ اور جن کی موت کا وقت مقرر نہیں آیا وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں میں بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے۔

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمانوں کی ناقابل ہزیمت جرات اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ قضاء و قدر کے ماننے سے انسان کا مجبور محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی قسمت پر صابر و شاکر رہ کر سست و غافل بن کر بیٹھا رہے۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی نہ ربانی کتابوں کی حاجت ہوتی نہ تبلیغ و دعوت کی تاکید ہوتی اور نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ لاکھوں پیغمبر آئے کتنی کتابیں نازل ہوئیں۔ کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر

پھیلائے گئے ہدایت وارشاد کی تاکید پر تاکید آئی۔ لوگوں کی دعوت واصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا گیا۔ کوشش و محنت، سعی و تلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی۔ محمد رسول اللہ کی جدوجہد سے معمور زندگی ہمارے لیے نمونہ بنائی گئی۔ خلفائے راشدین اور عام صحابہ کرام نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی تصدیق کی۔

بہرحال یہ آیت بتارہی ہے کہ تم بتادو کہ ہمیں وہ ہی کچھ پیش آنے والا ہے جو اللہ سبحانہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے وہ ہمارا والی ہے اور ہمیں اس پر پورا بھروسہ ہے۔

خود اعتمادی کی جگہ خدا اعتمادی کا نظریہ

دوسرا مسئلہ اس میں توکل کا ہے۔ توکل کے معنے بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں اللہ سبحانہ پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں یعنی کام میں اسباب کے درجے تک سر توڑ کوشش کرنا اور نتائج کے لیے محنت پر نہیں اللہ سبحانہ پر بھروسہ کرنا۔ اس میں عزم وارادہ اور تدبیر و کوشش سب داخل ہیں۔ توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ جب کوئی لڑائی پیش آئے تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ کرو۔ مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اسے انجام دینے کا پختہ عزم کرو اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب دلخواہ نتیجہ پیدا کرے گا۔ اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اسے اللہ سبحانہ کی مشیت اور حکمت سمجھو اور اس سے مایوس اور بودے نہ ہو۔ اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکل آئے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جدوجہد کا نتیجہ ہے بلکہ یہ سمجھو کہ اللہ کا تم پر فضل ہوا ہے اور اسی نے تمہیں کامیابی سے ہمدوش کیا ہے ارشاد ہے۔

شاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین۔

معاملہ میں ان سے مشورہ کرو پھر جب پختہ ارادہ ہوجائے اللہ پر بھروسہ کرو اللہ بھروسہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیت نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت واضح کردی ہے کہ توکل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نہیں بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم وارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر و نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اللہ سبحانہ مددگار ہے تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کرسکتا اور اگر وہ نہ چاہے تو کسی کی کوشش اور مدد کارآمد نہیں ہوسکتی اس لیے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ کام میں خدا پر بھروسہ کرے۔

آیت کا مطالبہ موقعہ و محل کے اعتبار سے یہ ہے کہ ہم مشکلات کے اور موانع کی کثرت اور پر زور مخالفوں کی تدبیروں سے نڈر ہوکر استحکام عزم و استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد کو حالات کے مطابق نتائج کا دل میں یقین رکھیں۔

آج کی اجتماعی اصطلاح میں اسے خود اعتمادی کہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ فوجیں وہی کامیاب ہوتی ہیں جن میں خود اعتمادی ہو

لیکن اس خود اعتمادی کے ڈانڈے غرور اور فریب نفس سے جا ملتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے خدا اعتمادی کا نظریہ پیش کیا ہے جو غرور اور فریب نفس کے خطرہ سے محفوظ ہے۔

مومن کا منتہائے نظر احدی الحسنیین ہے

(۵۴) اے اللہ کے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ ہمارے بارے میں تمہیں تو صرف دو خوبیوں میں سے ایک کا انتظار ہے اور ہمیں تمہارے بارے میں یہ انتظار ہے کہ اللہ تم کو خود عذاب دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں سے دلاتا ہے۔ لہٰذا انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ اس صورت میں تم ہماری نسبت دو بھلائیوں میں سے کسی ایک کی ضرور امید کر سکتے ہو اگر خدا کے راستہ میں ہم مارے گئے تو شہادت وجنت اور واپس آئے تو اجر وغنیمت ضرور مل کر رہے گی جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ مجاہد کے بارے میں ان چیزوں کا تکفل فرمایا ہے برخلاف اس کے کہ ہم تمہاری نسبت منتظر ہیں کہ دو برائیوں میں سے ایک برائی ضرور پہنچ کر رہے گی یا نفاق وشرارت کی بدولت بلاواسطہ خدا کی طرف سے کوئی عذاب تم پر مسلط ہو گا یا ہمارے ہاتھوں سے خدا تمہیں سخت سزا دلائے گا جو رسوا کر کے تمہارے نفاق کا پردہ چاک کر دے گی۔ بہر حال تم اور ہم دونوں کو ایک دوسرے کا انجام دیکھنے کے لیے منتظر رہنا چاہیے۔ آخر معلوم ہو جائے گا کہ دونوں میں انجام بین اور دور اندیش کون ہے [1]

اس آیت گرامی کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے لیے جس بات کے انتظار میں رہتے ہو وہ یہ ہے کہ ہم جنگ میں مارے جائیں اور شکست ہو لیکن ہمارے لیے تو یہ ہی احدی الحسنیین ہے یعنی دو خوبیوں میں سے ایک خوبی۔ اور یہی مقام ہے جسے قرآن ایمان والوں کی خصوصیت بتاتا ہے۔

دنیا میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت کسی مقصد کے لیے جدوجہد کرتی ہے تو اس کے سامنے امید بھی ہوتی ہے یاس بھی کامیابی بھی ہوتی ہے اور ناکامی بھی لیکن ایمان یہ ہے کہ جدوجہد جو کچھ اور جیسی کچھ بھی ہے امید وکامرانی ہی ہے۔ مایوسی اور ناکامی کی اس پر پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کے لیے کرتا ہے اور اس کے لیے یہی بات کامیابی نہیں ہوتی ہے کہ کسی خاص منزل تک پہنچ جائے بلکہ اس کی راہ میں چلتے رہنا اور جدوجہد میں لگے رہنا بجائے خود بڑی سے بڑی کامیابی ہے وہ جب اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس لیے نہیں کرتا کہ کسی خاص منزل تک ضروری پہنچ جائے بلکہ صرف اس لیے کہ کسی کی راہ میں چلتا رہے اور یہ جو کسی کی راہ میں چلتے رہنا ہے تو یہی اس کی منزلِ مقصود ہے۔

رہرواں را خستگی راہ نیست　!
عشق ہم راہ است ہم خود منزل است

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسرے اگر جدوجہد کرتے ہوئے مرجائیں تو یہ ان کی ناکامیابی ہے مومن اگر مر جائے تو یہ اس کی بڑی سے بڑی فتحمندی ہے۔ایسی فتح مندی جس سے بڑی فتح مندی کی وہ اپنی ذات کے لیے آرزو ہی نہیں کرسکتا۔

آنانکہ غم تو ہر گزیدہمہ　　در کوئے شہادت از مو دند ہمہ

در ہر کہ در کون فتح از عشق است　　با آنکہ سپاہ او شہید ند ہمہ

دوسرے اگر مخالفوں اور دشمنوں پر غالب آسکیں تو ان کی ہار ہوئی لیکن مومن وہ ہے جو ہار کے معنے ہی سے ناآشنا ہوتا ہے۔وہ اگر کسی میدان میں غالب آئے جب بھی جیت اسی کی ہے۔کیونکہ اس کی ہار جیت کا معیار میدان جنگ نہیں ہوتا خود اس کی طلب و سعی ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی طلب و سعی میں پورا نکلا تو اس نے میدان مار لیا۔ اگرچہ میدان جنگ میں اس کی لاش ہزاروں لاشوں کے نیچے دبی ہوئی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اس راہ میں وہ کبھی مر نہیں سکتا۔اس کی موت بھی اس کی زندگی ہوتی ہے۔ ولکن لاتشعرون۔

یہ جو قرآن نے جا بجا زور دیا ہے کہ مومن کا مقصد سعی صرف اللہ اور اس کی سچائی ہے۔اور مومن کی جہد کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے تو اس میں یہی حقیقت پوشیدہ ہے یعنی وہ ساری منزلوں سے جو دنیا میں پیش آسکتی ہیں بلند کردیا گیا۔اب یہاں کی کوئی منزل اس کی منزل مقصود نہیں ہوسکتی کہ اس تک نہ پہنچ سکنا اس کی ناکامی کا فیصلہ کردے اس کے لیے منزل مقصود تو صرف یہ ہے کہ حق کے راستہ میں چلتا رہے اور رکے نہیں۔اس کا ہر قدم جو چلتا رہا فتحمندی ہے اور ہر قدم جو رک گیا۔ وہ نامرادی ہے۔ بہرحال دو خوبیوں احدی الحسنیین سے معقود یہی حقیقت ہے یعنی فتح مندی یا شہادت۔ اور شہادت بھی فتح مندی ہے۔یہ مطلب نہیں کہ شہادت یا مال غنیمت" جیسا کہ کچھ لوگوں نے خیال کیا۔ اور حاشا کہ مال غنیمت ایک مومن کے لیے احدی الحسنیین ہو[1]

بزرگان سلف کی تشریحات سے احدی الحسنیین کی تفسیر فتح مندی اور شہادت منقول ہے حافظ ابن جریرؒ نے عبداللہ ابن عباس، مجاہد، ابن جریج اور قتادہ رضی اللہ عنہم سے جو تفسیر نقل کی ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کی راہ میں جان کا کام آنا اور دشمن پر غلبہ۔ تعبیر یہی ہے کہ القتل فی سبیل اللہ۔ والظھور۔ حافظ ابن کثیرؒ نے ان تین بزرگوں کے حوالہ سے یہی بات بتائی ہے شہادۃ او ظفر بکم۔ ابن الجوزیؒ نے بھی لکھا ہے الحسنیان النصر والشہادۃ علامہ آلوسی نے بھی المراد منھما النصرۃ والشھادۃ بتایا ہے۔ علامہ شوکانی نے بھی فتح القدیر میں اسی کو اپنایا۔ مدارک میں نسفی کا بھی یہی مختار ہے۔ غالباً امام محمد بغوی صاحب معالم التنزیل پہلے مفسر ہیں جنھوں نے احدی الحسنیین کی تفسیر اما النصر والغنیمۃ سے کی ہے اور ان ہی کی پیروی میں دوسرے شارحین قرآن نے اس کی تشریح میں نصرت و غنیمت کے

[1] ترجمان القرآن

الفاظ لکھنے شروع کر دیئے جیسے نواب صدیق حسن خان ورنہ متقدمین سے اس باب میں جو کچھ منقول ہے وہ سب جانتے ہیں۔ خبر نہیں علامہ قرطبی نے غنیمت اور شہادت کہہ کر عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور امام مجاہد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا حوالہ کہاں سے اور کیسے دیا ہے ورنہ جہاں تک ان بزرگوں کی تفسیر کا نقل سرمایہ مفسرین نے بالسند پیش کیا ہے اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ امام بغوی نے جو غنیمت اور شہادت سے تفسیر کی ہے وہ انھوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک حدیث سے استنباط کیا ہے یعنی ان کا اجتہاد ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جس حدیث سے انھوں نے یہ بات استنباط کی ہے وہ یہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے اس شخص کی ذمہ داری لے لی ہے جو اپنے گھر سے صرف جہاد کو مقصود بنا کر نکلا کہ اس کو جنت میں پہنچائے گا یا اسے اپنے گھر لوٹائے گا۔ اس چیز کے ساتھ جو اسے اجر یا غنیمت کی صورت میں حاصل ہوا ہے۔

اس حدیث میں لفظ غنیمت بے شک آیا ہے مگر ایک ثانوی درجہ میں ہے اصل اور بنیادی چیز تو اجر ہے اجر سے دنیا کا اجر نہیں بلکہ آخرت میں اللہ کی جانب سے ثواب مراد ہے۔ بہرحال عام شارحین قرآن کی رائے میں احدی الحسنیین کی تفسیر نصرت یا شہادت ہے۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ
قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ
اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا
وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا
تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا
فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾
وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ
قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا
لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ
فِى الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ
يُعْطَوْا مِنْهَاۤ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ
اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع ۱۷ (۵ / ۱۳)

اے پیغمبر کہہ دو کہ تم راہ خدا میں مال بخوشی خرچ کرو یا ناخوش ہو کر تمہارا خرچ ہرگز قبول
نہ کیا جائے گا کیونکہ تم بدکار قسم لوگ ہو[۵۵]۔ اور خرچ کی قبولیت سے ان کو صرف اس لیے
محروم کیا ہے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا کفر کیا ہے اور وہ نماز کے لیے

نہیں آتے مگر کاہلی اور سستی سے اور وہ خرچ نہیں کرتے مگر بڑی ناگواری سے[۵۶]۔ آپ کو ان کا مال و اولاد والا ہونا تعجب میں نہ ڈالے۔ اس مال و اولاد کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ اس کے ذریعے ان کو دنیوی زندگی میں سزا دے اور کفر ہی کی حالت میں ان کی جانیں نکلیں گی[۵۷]۔ وہ خدا کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں بلکہ ایک گروہ ہے ڈرا اور سہما ہوا۔ اگر انہیں پناہ کی کوئی جگہ مل جائے یا غار اور یا گھس جانے کا کوئی مقام تو پلٹ جائیں گے اس کی طرف ایسے جیسے رسہ تڑا کر بھاگے جا رہے ہیں[۵۸]۔ اور ان میں کچھ ایسے ہیں کہ آپ پر صدقات کے بارے میں نکتہ چینی کرتے ہیں اگر ان صدقات میں سے ان کو دے دیا جائے تو خوش ہوتے ہیں اور ان صدقات میں سے اگر ان کو نہ دیا جائے تو اچانک بگڑ جاتے ہیں[۵۹]۔ اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ اللہ و رسول کی عطا پر خوش ہوتے اور کہتے ہمارے لیے اللہ کافی ہے۔ اللہ ہمیں اپنے فضل سے ضرور دے گا۔ اور اللہ کا رسول بھی۔ بلاشبہ ہمارا مقصود صرف اللہ ہے[۶۰]۔

معانی مفردات

طوعا فرماں برداری، انقیاد یہ مصدر ہے اس کے معنے فرمانبرداری کرنے کے ہیں کرہ اس کی ضد ہے۔ اس کا فعل باب نصر اور سمع سے آتا ہے۔ طاع یطوع طاعا اور طاع یطاع طوعا۔ جیسے کہ ازہری نے جو لغت کے مشہور امام میں کچھ اہل عرب سے نقل کیا ہے اور طاع یطاع کے لیے تصریح کی ہے کہ لغت جیدہ ہے۔ یہاں معنے بخوشی ہیں۔

تعجب اعجاب سے مضارع ہے تعجب میں ڈالتی ہے پسند آتی ہے حیران کرتی۔ واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اصل مادہ عجب ہے یہ باب سمع سے عجب یعجب آتا ہے اسی سے عجیب چیز عجیب بات اور واقعہ کے لیے اعجوبۃ آتا ہے۔ تزھق مضارع کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہے باب فتح سے آتا ہے مصدر زھوق زا کے پیش کے ساتھ اگر

زبر کے ساتھ فعول کے وزن پر ہو تو صفت مشبہ کا صیغہ ہے فُعول پیش کے ساتھ ... وزن پر ہو تو مصدر ہے اور فعول زبر کے ساتھ کے وزن پر ہو تو صفت کا صیغہ زہوق مصدر کے معنے غم سے جان نکلنا اور کسی چیز کے مٹ جانے کے ہیں۔

ملجأ پناہ گاہ لجأ یلجأ باب فتح سے آتا ہے پناہ میں آنا ہے اس سے اسم ظرف پناہ کی جگہ کے معنے میں ملجأ آتا ہے حدیث میں لا ملجأ من الله الا الیہ۔ اسی سے ہے۔ ایسی جگہ جہاں آدمی موت کی حالت میں بچنے کے لیے پناہ لے جیسے پہاڑ کی چوٹی۔ قلعہ۔ سمندر میں جزیرہ۔

مغارات۔ اس کا واحد مغارۃ ہے۔ اصل میں غور سے ہے جس کے معنی گہرا ہونے کے ہیں۔ غار کو کہتے ہیں بعض مغارۃ اور غار میں فرق کرتے ہیں پہاڑ میں گہرے گڑھے کو غار اور زمین میں گہرے گڑھے کو مغارہ کہتے ہیں مغارۃ کی جمع تو مغارات آتی ہے لیکن غار کی جمع غیران آتی ہے جیسے نار کی نیران مدخل یہ دخول سے باب افتعال سے اسم ظرف ہے اصل میں مدتخل تھا تا کو دال بنا کر ادغام کر دیا گیا۔ زمین میں ایسی سرنگ جس میں آدمی مشکل سے جا سکے۔

یجمحون۔ جمع ہے فعل مضارع کا جمع مذکر غائب ہے باب فتح اصل میں گھوڑے کی سرکشی کے لیے بولتے ہیں .... جمح الفرس اور سرکش گھوڑے کو جموح کہتے ہیں عرب کے ایک شاعر نے اسی معنے میں استعمال کیا ہے غالباً امرؤ القیس ہے۔

سبوحًا جموحًا واحضادھا کھمعۃ السعف الموھد

یہاں مراد دوڑنا اور تیزی ہے۔

یلمز لمز سے مضارع کا واحد مذکر غائب باب ضرب سے آتا ہے۔ دو لفظ ہیں ایک لمز اور دوسرا ھمز۔ ہمز کے معنے کچوکے لگانے کے ہیں مہمیز کا لفظ اردو میں اسی سے بنا ہے سوار کے جوتے میں کیل ہوتی ہے گھوڑے کو ایڑ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے تو اسی سے کچوکے لگانے کا کام لیتا ہے قریب قریب لمز کا بھی یہی مفہوم ہے منتھی الادب میں مارنے اور جلانے کے معنی بھی لکھے ہیں۔ افعال واقوال سے دل میں کچوکے لگانے کو کہتے ہیں۔

منافقین کے خاص احکام

اسلام ایک ایسے مضبوط اور مستحکم عقد کا نام ہے جس میں جزم واعتقاد کے لحاظ سے ذرا بھی تردد کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جو لوگ اسے اپناتے ہیں ان کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جن اصول وعقائد کی طرف انہیں دعوت دی گئی ہے وہ کسی انسان کے خود ساختہ و پرداختہ نہیں ہیں بلکہ ان کا صدور ایسی ذات سے ہوا ہے جو ہمہ تن حق وصداقت ہے۔ جس کی عقل کائنات کے ہر گوشہ پر حاوی اور جس کی ہمہ بیں آنکھ زمین و آسمان کی ہر شے کو محیط ہے۔ جب تک یہ یقین نہ پیدا ہو جائے کوئی شخص دعوت

ایمان کو حق و صداقت کے ساتھ قبول نہیں کر سکتا اور نہ قرآن و سنت کے سامنے تسلیم و رضا کا سر جھکا سکتا ہے۔ اسی طرح جن اصولوں اور جن مقاصد و غایات کو وہ قبول کرتا ہے وہ اس کی آزاد مرضی اور غیر پابند قوت فیصلہ پر مبنی اور جبر و تشدد سے پاک ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ وہ ان مقاصد اور اصولوں پر یہ سمجھ کر ایمان لاتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں اس لیے اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ وہ کبھی ان سے اختلاف کرے کیونکہ اس سے اختلاف کرنے کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ اسلام سے منکر ہو گیا اور اس کے ساتھ وہ اس سوسائٹی سے خارج ہو جاتا ہے جس کا وہ اس بنا پر رکن بنا کہ اس نے اصول و مقاصد کو بلا تردد تسلیم کر لیا تھا جس پر مذکورہ سوسائٹی قائم ہوتی تھی ان کا حکم ان آیات میں بیان ہوا کہ ایسے لوگوں کا انفاق قبول نہ کیا جائے۔ اُخروی نجات سے یہ لوگ محروم رہیں گے جو بغیر توبہ مر جائیں گے۔ بخشے نہ جائیں گے اگرچہ خود حضور بھی ان کے لیے دعا کریں۔ حضرت حذیفہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم خاص خاص منافقوں کے لیے ہوا تھا اور حضور اقدس ﷺ نے ان کے نام بتا دیئے تھے۔ جبیر بن مطعم سے مروی ہے کہ یہ بارہ آدمی تھے۔ (فتح الباری)

(۵۵) اے پیغمبر کہہ دو کہ تم راہ خدا میں مال بخوشی خرچ کرو یا ناخوش ہو کر ہرگز قبول نہ کیا جائے گا کیونکہ تم بدکار قسم لوگ ہو۔ جد بن قیس رومی عورتوں کے فتنہ کا بہانہ کر کے یہ بھی کہا تھا کہ حضرت میں بذاتِ خود نہیں جا سکتا لیکن مالی اعانت کر سکتا ہوں۔ اس کا جواب دیا کہ بے اعتقاد کا مال قبول نہیں خواہ خوشی سے خرچ کرے یا ناخوشی سے خدا کے راستے میں خرچ کرنے کی ان کو توفیق کہاں ولاینفقون الا وھم کارھون۔ تاہم اگر بالفرض خوشی سے خرچ کرتے تو اللہ اسے قبول نہ کرے گا۔[۱]

اس سے معلوم ہوا کہ جو افراد جماعت کے مقاصد کو نقصان پہنچائیں امام کو چاہیے کہ ان کی مالی اعانت قبول کرنے سے انکار کر دے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کا مال قبول کرنا انہیں بدعملیوں اور شرارتوں پر جرات دلاتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم روپیہ خرچ کر کے اپنے منافقانہ اعمال کی پردہ پوشی کرتے رہیں گے۔ ان کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو خطرہ میں نہ ڈالیں اور نمائشی طور پر لوگوں کی نگاہوں میں نام بھی جانبازوں میں آ جائے اور مسلمانوں میں عزت بنی رہے اس لیے وہ کہتے تھے کہ ہم جنگی خدمت انجام دینے سے تو اس وقت معذرت چاہتے ہیں لیکن مالی امداد کے لیے حاضر ہیں اس لیے فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ تمہارا کوئی انفاق بھی خواہ طوعاً ہو یا کرہاً جناب الٰہی میں قابلِ قبول نہیں ہے انفاق تو ان کا قبول ہوتا ہے جو اللہ و رسول کے وفادار ہوں جو بدعہد اور غدار ہیں اور محض نمائش کے لیے خرچ کرتے ہیں ان کے انفاق کی اللہ کے یہاں کوئی قدر نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ کو کسی کے مال کی ضرورت نہیں ہے وہ صرف ان کا ہی مال قبول کرتا ہے جو سچے اور پورے جذبہ اخلاص سے اس کے دین کی خدمت کرتے ہیں۔

علامہ قرطبی نے یہاں یہ بات خوب لکھی ہے کہ انفقوا اگرچہ امر ہے مگر اہلِ عرب ایسے شرط و جزا کے ہم معنے بنا کر بولتے

[۱] افادات شیخ الاسلام

ایک شاعر کہتا ہے۔

آسیئی بنا او احسنی لاملومۃ　　لدینا ولا مقلیۃ ان تقلت

نیکی کرو یا برائی ہمارا تو تمہیں پتہ ہی ہے۔ اب آیت کا مطلب یہ ہے کہ خوش ہو کر خرچ کرو یا ناخوش کسی صورت میں قبول نہ کیا جائے گا۔ خطیب نے یہ بات کہہ کر آیت کی عمومی معنویت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آیت اگرچہ منافقین کے بارے میں ہے مگر ہر وہ شخص اس کی ضرب کا نشانہ ہے جو مال کو لوجہ اللہ خرچ نہیں کرتا ہے بلکہ دکھاوے اور ریاکاری کے لیے کرتا ہے۔ قاضی بیضاوی نے قبول کے معنے بھی یہاں دو بتائے ہیں ایک یہ کہ ان سے لیا نہ جائے دوسرے یہ کہ اللہ کے یہاں قابل اجر و ثواب نہیں۔ دوسری صورت کا وجود پہلی صورت کے بعد ہے۔ یعنی ان سے لے لیا جائے تو ان کا انفاق قابل اجر نہیں ہے۔

منافقین کے خصائص

(۵۶) اور خرچ کی قبولیت سے ان کو صرف اس لیے محروم کیا ہے کہ انھوں نے اللہ و رسول کا کفر کیا ہے اور وہ نماز کے لیے نہیں آتے مگر کاہلی اور سستی سے اور وہ خرچ نہیں کرتے مگر بڑی ناگواری سے۔ عدم قبول کا اصل سبب تو ان کا کفر ہے جیسا کہ ہم پہلے متعدد مواقع میں اشارہ کر چکے ہیں کہ کافر کا ہر عمل مردہ اور بے جان ہے۔ باقی نمازیں ہارے جی سے آنا یا برے دل سے خرچ کرنا یہ سب کفر کے ظاہری آثار ہیں[1]۔ یہ بھی ان خاص منافقین کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے جن کے حضور اقدس نے نام بتائے تھے ان کے فکر و اعتقاد اور دین کے نام پر ان کی عملی زندگی۔ اس آیت میں دونوں لحاظ سے ان منافقین کا بھرپور حال ہے فرمایا فکر و اعتقاد تو یہ ہے کہ ان میں اللہ اور اس کے رسول کا کھلا کفر پایا جاتا ہے کفروا باللہ و رسولہ۔ یہی سب سے بڑی بنیاد ہے اس پر اعمال کی جو عمارت اٹھائی جائے وہ بودی اور ناپائدار ہوگی۔ اس کے تقاضے ایمان سے بالکل الگ ہیں۔ اعمال کی صحت کا مدار ایمان ہے کفر کے ساتھ اعمال خواہ کتنے اچھے ہوں قطعاً بے وزن اور بے قیمت ہیں۔ اس لیے فکری طور پر ان کے دعویٰ ایمان کا کھوکھلا پن ظاہر کیا۔ اور ایمان کے تقاضوں میں جو دو بنیادی چیزیں نماز اور زکوٰۃ ہیں ان میں ان کا حال یہ ہے کہ نماز کی ادائیگی بندھے بندھائے دوسروں کو دکھانے کے لیے ہارے جی کے ساتھ کرتے ہیں اور انفاق مال بھی بے دلی اور کراہت کے ساتھ صرف نمائش کے لیے کرتے ہیں۔ اعتقاد بھی غلط اور اعمال بھی غلط اور اس پر ان کا دعویٰ ہے مسلمان ہونے کا۔ حالانکہ ایمان نام ہے نبوت کے لائے ہوئے ہدایت نامہ کو ماننے اور اس کے تقاضے پورا کرنے کا۔ فرمایا اعتقاد کے اس کفر اور اعمال کے لیے ان کی بے دلی اور کراہت خدا کے نام پر دیتے ہوئے مال کی قبولیت

[1] افادات شیخ الاسلام

میں پہاڑ بن کر کھڑے ہو گئے ہیں۔

قبول کے جو معنے قاضی بیضاوی نے بتائے ہیں ایک یہ کہ ان سے نہ لیا جائے دوسرے یہ کہ اللہ کے یہاں قابل پذیرائی نہیں۔ ان میں واقعیت اس طرح ہے کہ وہ ایمان کا بھی دعوی کرتے تھے۔ نمازیں بھی ہارے جی سے پڑھتے صدقات بھی ناگواریوں سے دیتے تھے لیکن ان میں سے کوئی چیز ان کے کفر کی وجہ سے اللہ کے یہاں قابل پذیرائی نہ تھی۔ ان نیکیوں کا دنیا میں وجود اور ظہور بے شک تھا لیکن آخرت میں ان کے نتائج کا قطعاً ظہور نیکیاں بنا کر نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا عکس ہوگا۔ کیونکہ کفر کی زمین میں نیکی کا کوئی پودا بار آور نہیں ہوتا ہے۔

مال واولاد نیکی کا پیمانہ نہیں

(۵۷) آپ کو ان کا مال واولاد والا ہونا تعجب میں نہ ڈال دے۔ اس مال واولاد کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ اس کے ذریعے سے ان کو دنیوی زندگی میں سزا دے۔ اور کفر ہی کی حالت میں ان کی جانیں نکلیں گی۔ شبہ گذر سکتا تھا کہ جب ایسے مردود ہیں تو ان کو مال واولاد وغیرہ نعمتوں سے کیوں نوازا ہے۔ اس کا جواب دیا ہے کہ یہ نعمتیں ان کے حق میں بڑا عذاب ہیں جس طرح ایک لذیذ اور خوشگوار غذا تندرست آدمی کی صحت وقوت بڑھاتی ہے۔ اور فاسد الاخلاط مریض کو ہلاکت سے قریب تر کر دیتی ہے۔ یہ ہی حال ان دنیوی نعمتوں کا ہے۔ ایک کافر کے حق میں یہ چیزیں سوء مزاج کی وجہ سے زہر ہلاہل ہیں چونکہ کفار دنیا کی حرص ومحبت میں غرق ہوتے ہیں اس لیے اول اس کے جمع کرنے میں بیحد کوفت اٹھاتے ہیں پھر ذرا نقصان یا صدمہ پہنچ گیا تو جس قدر محبت ان چیزوں سے ہوتی ہے اسی قدر غم سوار ہوتا ہے۔ اور کوئی وقت اس کے فکر و اندیشہ اور ادھیڑ بن سے خالی نہیں ہوتا۔ پھر جب موت ان محبوب چیزوں سے جدائی کرتی ہے اس وقت کے صدمے اور حسرت کا تو اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ غرض دنیا کے عاشق اور حریص کو کسی وقت حقیقی چین اور اطمینان میسر نہیں۔ چنانچہ یورپ وامریکہ وغیرہ کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے اقوال اس پر شاہد ہیں۔ باقی مومنین جو دولت اور اولاد کو معبود اور زندگی کا اصل مقصود نہیں سمجھتے۔ چونکہ ان کے دل میں حب دنیا کا مرض نہیں ہوتا اس لیے یہی چیزیں ان کے حق میں نعمت اور دین کی اعانت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر کفار کثرت مال واولاد پر مغرور ہو کر کفر وطغیان میں اور زیادہ تند ہو جاتے ہیں جو اس کا سبب بنتا ہے کہ اخیر دم تک کافر ہی رہیں۔ نیز منافقین مدینہ جن کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں ان کا حال یہ تھا کہ بادل ناخواستہ جہاد وغیرہ کے موقعہ پر ریا ونفاق سے مال خرچ کرتے تھے۔ اور ان کی اولاد میں بعض لوگ مخلص مسلمان ہو کر نبی کریم ﷺ کے ہمراہ جہاد میں شریک ہوتے تھے۔ دونوں چیزیں منافقین کے منشائے قلبی کے بالکل خلاف تھیں۔ اس طرح اموال واولاد ان کے لیے دنیا میں عذاب بن گئے تھے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں یعنی

یہ تعجب کر کر بے دین کو اللہ نے نعمت کیوں دی بے دین کے حق میں اولاد اور مال وبال ہے کہ ان کے پیچھے دل پریشان رہے اور ان کی فکر سے چھوٹنے نہ پائے مرتے دم تک نہ توبہ کرے نہ نیکی اختیار کرے [1]

یہاں شارحین قرآن نے چند اہم اور ضروری باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اعجاب جو تعجب کا مصدر ہے اس کے معنے کچھ نے تعجب کرنے کے بتائے کچھ نے اعجاب کے معنے پسند آنے اور اچھا لگنے کے بتائے ہیں چنانچہ علامہ قرطبی نے لا تعجبك کی تفسیر لا تستحسن سے کی ہے یعنی تمہیں یہ بات اچھی نہ لگے اور علامہ آلوسی نے اس کی تفسیر میں لا یسروك لکھا ہے یعنی پسند نہ آئے اور نہ بھاوے تم کو۔ خطاب میں بھی کچھ نے حضور کو مخاطب بتایا ہے اور کچھ نے خطاب عام رکھا ہے۔ ہمارے خیال میں خطاب عام ہے اور اعجاب پسند کرنے کے معنے میں ہے مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب تجھے نعمتوں کی بہتات ان میں مال و اولاد کی صورت میں پسند نہ آئے۔

بہرحال اس آیت میں ایک اجتماعی قانون بیان ہوا ہے کہ باغیوں اور سرکشوں پر جو بے پایاں انعامات کی بارش ہوتی ہے اس کا پس منظر اللہ کے یہاں ان کی مقبولیت اور محبوبیت نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ انعامات ان پر بطور سزا انتقاماً ان کی مجرمانہ غفلتوں میں اضافہ کی خاطر کیے جاتے ہیں اور یہ اقوام ہی کو نہیں بلکہ افراد کے ساتھ بھی معاملہ ہوتا ہے۔ یعنی اموال اور اولاد کی صورت میں نعمتوں کی بہتات کی جاتی ہے بطور سزا تاکہ ان میں غفلتوں کا اضافہ ہوتا جائے مقصود اس داد و دہش سے یہی اور صرف یہی ہوتا ہے کہ ان کو دولت کی بے پایانی سے مخمور کر دیا جاتا ہے تاکہ پھر نیکی کی راہیں ان کو نظر بھی نہ آئیں۔ وہ اپنی جگہ مگن رہیں کہ قدرت کے پیارے وہی ہیں اور ان کو ہی اللہ سبحانہ نے نعمتوں سے استفادہ کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ قرآن کی یہ آیت ان کے اسی مغالطہ پر تنبیہ کے لیے ہے کہ ان کا حال کہیں لوگوں کے ایمان کو نہ لرزا دے صاف اور کھلے لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ الاموال اور الاولاد کی یہ وہی قسم ہے جس سے اللہ سبحانہ ان لوگوں کو سزا دیتے ہیں اور اس سے غرض یہی ہوتی ہے کہ اسی ناشکری اور کفران کی حالت میں ان کی روحیں بدن سے فرسودہ ہو کر نکلیں۔ اور اس طرح مریں کہ ان کو چونکنے اور سنبھلنے کا بھی موقعہ نصیب نہ ہو۔

قوموں کی حد تک تو یہ سزائی قانون ایسا نہیں جس کا دیکھنے والوں کو پتہ نہ ہو۔ دنیا میں ایسی قومیں جن کی زندگی کی ہر شاخ ناقدر شناسی بلکہ کھلم کھلا بغاوت نہ کر رہی ہوں۔ سب کی نگاہوں میں ہیں لیکن یہ بغاوت ان کے سامنے ایسے دنوں کو بھی لا رہی ہے جس میں کسی نہ کسی برتری اور نعمت مزید کا دروازہ ان پر کھول دیا جاتا ہے۔ اپنی سرکشیوں اور اللہ سبحانہ کی بغاوتوں میں وہ جس حد تک آگے بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر ان میں نعمتوں کی بہتات ہوتی جاتی ہے۔

ایسی قوموں کے بارے میں قرآن کا طالب علم تو یہی جانتا ہے کہ یہ انعامات کی بارش ان پر اللہ سبحانہ کا انتقامی تازیانہ

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے تاکہ وہ اپنی غفلتوں میں بدمست ہو کر خوب چھوٹ اور بے لگام ہو جائیں اور خوب اترا جائیں یعنی ان کو خوب انعامات کے ذریعے پہلے ترقی وعروج ارتقاء واعتلاء کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا جائے پھر ان ساری ترقیوں اولوالعزمیوں کے بعد اللہ سبحانہ مخفی تدبیر سے ان کو پکڑ لیتا ہے اور اس طرح پکڑتا ہے کہ ان کا کیا کرایا سب کا سب دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے لیکن سرکش اور طاغی قوموں کے ساتھ اللہ سبحانہ کا یہ برتاؤ ان لوگوں کے لیے بڑا صبر آزما ہوتا ہے اور انتہائی خطرات کا سبب ہوتا ہے جنہیں انجام سے پہلے ان کے انتقامی دور میں زندگی گذارنی پڑتی ہے۔

بہرحال قوموں کی حد تک تو یہ مسئلہ صاف ہے۔ البتہ افراد کا مسئلہ ذرا مشکل ہے۔ ان لوگوں کو جن پر نعمتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور کھلتے جا رہے ہیں۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ اللہ سبحانہ اور ان کی مرضیات کا ان کی زندگی سے کیا تعلق ہے اگر حال یہ ہے کہ جس حد تک وہ اللہ سبحانہ اور اس کے قوانین سے ٹکرا رہے ہیں اسی حد تک ان پر انعامات کی افزونی ہو رہی ہے۔ غرور سرکشی کے میدان میں جس قدر آگے بڑھ رہے ہیں اسی حد تک دنیا اور دنیا کی نعمتیں ان کے قدم چومتی جا رہی ہیں تو ایسی حالت میں ان کو یقین کر لینا چاہیے کہ انعامات کا یہ تاج ان کے سر پر اس لیے نہیں رکھا گیا کہ اللہ سبحانہ ان سے خوش ہے بلکہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ اندھے ہو کر زندگی گذاریں اور اندھے ہی دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ الاموال اور الاولاد کی یہ کثرت نشانی ہے اس بات کی کہ اللہ سبحانہ ان سے انتقام لینا چاہتا ہے اور ایسا انتقام کو چونکنے کی ساری راہیں ان پر بند کر دی گئی ہیں۔

اگر مسلمان ہونے کے باوجود کوئی مغالطہ کا شکار ہے تو اس کی منطق ناقابل فہم ہے جو قرآن کو مانتے ہیں اور اسلام کو انسانی دماغ کا خود تراشیدہ نظام نہیں سمجھتے بلکہ نسل انسانی کے جینے اور مرنے کا قدرتی اور لاہوتی دستور مانتے ہیں ان کی منطق اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے جس کی خبر قرآن نے دی ہے۔ اگر قرآن وحی ہے تو قرآن میں آمدہ مسئلہ کے سمجھنے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے۔

بہرحال قرآن سمجھا رہا ہے کہ اس مال واولاد کی محبت میں گرفتار ہو کر جو منافقانہ رویہ انھوں نے اختیار کیا ہے اسی کی وجہ سے وہ معاشرہ میں انتہائی ذلیل وخوار ہو کر رہیں گے۔ اور وہ ساری شان ریاست وعزت ونام وری اور مشیخت جو اب تک ان کو حاصل تھی نئے اسلامی نظام اجتماعی میں خاک ہو کر رہ جائے گی اور ان کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ اور اس ذلت ورسوائی سے بڑھ کر عذاب ان کے لیے یہ ہو گا کہ جن منافقانہ ذمائم کو یہ اپنے اندر پرورش کر رہے ہیں ان کی بدولت مرتے دم تک صدق ایمانی کی دولت نصیب نہ ہو گی۔

آیت میں دنیا میں جس عذاب کے ہونے کی ان کے لیے خبر دی گئی ہے اس سے بڑا دردناک وہ عذاب ہے جو نفاق وبخل کی وجہ سے مال کا غم وبالِ جان ہو رہا ہے اور اولاد کو اپنے سے برگشتہ اور اسلام میں ثابت قدم دیکھ کر شب وروز جل رہے ہیں

کچھ کہتے ہیں کہ ان کو مصائب میں مبتلا کرے گا۔ حسن بصری کہتے ہیں کہ ان پر زکوٰۃ اور انفاق کی ذمہ داری کا بوجھ ڈالا جائے گا۔ اور کچھ کے خیال میں عذاب کی صورت یہ ہے کہ فتح کے وقت جب مال غنیمت تقسیم ہوگا اور منافقین کو نہ ملے گا تو اس نہ ملنے کا حزن وغم ان کے لیے عذاب ہوگا۔

شارحین قرآن کو یہاں پہلی آیت میں کفر کے ساتھ نماز اور انفاق کا پیوند حیرت میں ڈالے ہوئے ہے۔ اور یہ بھی حیرت کی بات کہ ایک طرف کافر کہا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ جو جوابات انھوں نے دیئے ہیں وہ تسلی بخش نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں منافقوں کا ذکر ہے اس لیے کفر یہاں بمعنے انکار نہیں بلکہ کفران ہے بمعنی ناشکری ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اسلام کی نعمت پا کر ان لوگوں نے اللہ ورسول کی قدر نہیں کی بلکہ ناشکری کی ہے۔ اسی لیے دنیا میں ان کے عذاب کے بارے میں قدماء کے افکار مختلف ہیں بلکہ حسن بصری نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ دنیا میں ان کو عذاب زکاۃ وصول کر کے اور راہ جہاد میں سرمایہ لے کر دیا جائے گا اور جیسا کہ قرطبی نے لکھا ہے کہ حافظ ابن جریر کا یہی مختار ہے۔ یہ کہنا کہ

دنیا میں عذاب سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول اللہ　　　کے مکذبین کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔

قطعاً غلط ہے اور شارحین قرآن کے یکسر خلاف ہے اس کہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

بہر حال اس آیت میں اللہ سبحانہ نے انعامات کے لیے جماعتوں اور افراد میں سنت الٰہی بیان　　فرمائی ہے یہی یرید اللہ کی تعبیر یہی بتا رہی ہے۔

منافقین کی نفسیاتی بیماری

(۵۸) وہ خدا کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں نہیں بلکہ ایک ڈرا سہما گروہ ہے۔ اگر انہیں پناہ کی کوئی جگہ مل جائے یا غار یا گھس جانے کا کوئی مقام تو پلٹ جائیں گے اس کی طرف ایسے جیسے رسہ تڑا کر بھاگے جا رہے ہیں یعنی صرف اس اندیشہ سے کہ کفر ظاہر کریں گے تو ان سے کافروں جیسا معاملہ ہوگا قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تو تمہاری جماعت یعنی مسلمانوں میں سے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر آج ان کو کوئی پناہ کی جگہ مل جائے یا کسی غار میں چھپ کر زندگی بسر کر سکیں یا کم از کم کسی جگہ سر گھسانے کی جگہ ہاتھ آ جائے۔ غرض حکومت اسلامی کا خوف نہ رہے تو سب دعوے چھوڑ کر بے تحاشا اسی طرف بھاگنے لگیں چونکہ اسلامی حکومت کے مقابلے میں کسی کی طاقت نہیں ہے اور نہ کوئی پناہ کی جگہ ملتی ہے اس لیے قسمیں کھا کھا کر جھوٹی باتیں بناتے ہیں [1]

قرطبی نے لکھا ہے کہ قسمیں کھا کر اپنے کو مومن بتانے کا یقین دلانا منافقین کا اخلاقی پیمانہ ہے اور حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ اللہ سبحانہ نے حضور اقدس ﷺ کو ان منافقین کی گھبراہٹ، بے چینی اور بے قراری کے بارے میں مطلع فرمایا ہے۔
دراصل یہ مدینے کے منافق زیادہ تر بلکہ تمام تر مالدار اور سن رسیدہ لوگ تھے حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان کے ناموں کی فہرست دی ہے۔ ان میں صرف ایک نوجوان کا ذکر ہے اور غریب ان میں کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ مدینے میں جائدادوں اور پھیلے ہوئے کاروبار کے مالک تھے۔ ان کے ذاتی مصالح اور مفادات نے ان کو ابن الوقت بنا دیا تھا۔ اسلام جب مدینے میں آیا اور آبادی کے ایک بڑے حصے نے پورے اخلاص اور جوش ایمانی کے ساتھ اسے قبول کر لیا تو یہ لوگ عجیب چکر میں پھنس گئے انھوں نے دیکھا کہ ایک طرف تو خود ان کے اپنے قبیلے کی اکثریت بلکہ ان کے بیٹے اور بیٹیاں تک کو اس نئے دین نے ایمان کے نشے سے سرشار کر دیا ہے۔ ان کے خلاف اگر وہ کفر و انکار پر قائم رہتے ہیں تو ان کی ریاست عزت شہرت سب خاک میں مل جاتی ہے حتیٰ کہ ان کے اپنے گھروں میں ان کے خلاف بغاوت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ دوسری طرف اس دین کا ساتھ دینے کے معنے یہ ہیں کہ وہ سارے عرب سے بلکہ اطراف و نواح کی قوموں اور سلطنتوں سے بھی لڑائی مول لینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اغراض نفسانی کی بندگی کی وجہ سے وہ دنیا کے سارے معاملات پر صرف مفاد اور مصلحت ہی کی بنیاد پر نگاہ ڈالتے تھے اس لیے ان کو مفاد کے تحفظ کی بہترین صورت یہی نظر آئی کہ ایمان کا دعویٰ کریں۔ لیکن چونکہ دعویٰ ایمان کے ساتھ ایمان کے تقاضے پورے نہ کرتے تھے اس لیے اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لیے اکثر جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے اور اپنے اخلاقی خلا کو جھوٹی قسموں سے پر کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ مسلمانوں کو مطمئن رکھنے کے لیے ان کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے کہ ہم آپ ہی میں سے ہیں ہمارے بارے میں کسی کو کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے۔ قرآن نے بتایا کہ یہ تم میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ محض ڈر کی وجہ سے تم میں ملے ہوئے ہیں۔ اب ان کے سامنے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مکے کے کفار کا حشر ان کے سامنے ہے مدینے کے یہود کا انجام ان کو معلوم ہے۔ جائیں تو کہاں جائیں ملک چھوڑ کر اپنے مفادات کی وجہ سے باہر جا نہیں سکتے۔ اس صورتحال نے ان کو ایسے بھنور میں ڈال دیا تھا کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ قرآن نے بتایا ہے کہ ان کو آج اگر کوئی پناہ گاہ مل جائے۔ جہاں اپنے مفادات کے ساتھ یہ اپنے کو محفوظ کر لیں تو ایک روز بھی تمہارے ساتھ رہنا پسند نہ کریں بلکہ رسی تڑا کر بھاگ جائیں۔

منافقین کی خوشی، ناخوشی کا پیمانہ

(۵۹) اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں کہ آپ پر صدقات کے بارے میں نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اگر صدقات میں سے ان کو دے دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں اور ان صدقات میں سے اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں کچھ منافقین اور اعراب صدقات و غنائم کی تقسیم کے وقت دنیوی حرص اور خود غرضی کی راہ سے حضور کی نسبت زبان طعن کھولتے ہیں کہ تقسیم میں

انصاف کا پہلو ملحوظ نہیں رکھا گیا مگر یہ اعتراض اسی وقت تک تھا جب تک ان کی خواہش کے موافق صدقات وغیرہ میں سے حصہ نہ دیا جائے۔ اگر انہیں خوب جی بھر کر خواہش و حرص کے موافق دے دیا گیا تو خوش ہو جاتے اور کچھ اعتراض نہ رہتا تھا۔ گویا بہر صورت مال و دولت کو قبلہ مقصود ٹھہرا رکھا تھا۔ آگے بتلاتے ہیں کہ ایک مدعی ایمان کا مطمح نظر یہ نہ ہونا چاہیے[1]

یہاں تک تو سرمایہ دار منافقین کا ذکر تھا۔ اب غریب اور نادار منافقین کا ذکر ہو رہا ہے۔ صحیح مسلم میں اُس منافق کے نام کی بھی نشاندہی کی ہے جو اس غریب طبقہ کی نمائندگی کرتا تھا لیجئے پوری بات سن لیجئے۔

ایک بار حضور اقدس ﷺ کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے اتنے میں ایک شخص نامی حرقوص آیا جو ذوالخویصرہ تیمی کر کے مشہور تھا حضور اقدس کو مخاطب کر کے بولا کہ انصاف کیجئے یا رسول اللہ۔ حضور اقدس نے جواباً ارشاد فرمایا ارے تیری خرابی ہو میں اگر انصاف نہ کروں گا تو پھر کون انصاف کرے گا۔ حضرت عمر نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔ فرمایا رہنے دو اس سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جن کی نمازوں کے مقابلے میں تم اپنی نمازیں اور جن کے روزوں کے سامنے تم اپنے روزوں کو حقیر سمجھو گے لیکن اس کے باوجود دین سے ایسے باہر ہو جائیں گے جیسے کمان سے تیر۔

یہ حدیث صحیح بخاری میں بھی بحوالہ ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئی ہے۔ بخاری و مسلم کے علاوہ دوسرے ارباب روایت نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ حضور اقدس ﷺ ان منافقین کو زکوٰۃ وغیرہ صدقات عطا کرتے تھے۔ پہلی آیت میں سرمایہ دار منافقوں کے بارے میں ہے کہ وہ مساجد میں نمازیں آتے تھے اور زکوٰۃ بھی ادا کرتے تھے نماز میں آتے بڑی بے دلی سے اور زکوٰۃ دیتے بڑی ناگواری سے۔ اس سے یہ بات بالکل بے غبار ہو جاتی ہے کہ اس دور میں ان کو کافر نہیں بلکہ مسلمان سمجھا جاتا تھا۔ ان کو ایمان کا دعویٰ تھا لیکن وہ اس دعوے کے مطابق ایمان کے تقاضے پورے نہ کرتے تھے اگر وہ کافر ہوتے تو ان کو صدقات نہ دیئے جاتے وہ مساجد میں نہ آتے۔ یہ صحیح ہے کہ سب کا نفاق ایک درجہ کا نہ تھا کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ عبداللہ ابن ابی کا نفاق ہر منافق کا نفاق نہ تھا۔ وہ بڑھتے بڑھتے انکار قطعی تک پہنچ گیا لیکن ایسے لوگ گنتی کے تھے۔ سب ایسے نہ تھے۔ ان کی بہت سی قسمیں تھیں۔ قرآن نے منھم کی تعبیر منافقین کی انواع ہی بتانے کے لیے اختیار کی ہے۔

اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد نماز کی طرح زکوٰۃ کے لیے بھی قانونی طور پر اجتماعی نظم قائم ہو گیا تھا اور اس کی تقسیم

[1] افادات شیخ الاسلام

سرکاری طور پر ہوتی تھی سارے ملک میں باقاعدہ زکوٰۃ عائد کی گئی تھی۔ سب کی زرعی پیداوار سے ان کے مویشیوں سے ان کے اموالِ تجارت سے معادن سے اور ان کے سونے چاندی کے ذخائر سے ۲½ فیصدی ۵ فیصدی ۱۰ فیصدی ۲۰ فیصدی زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اور سرکاری طور پر نظم کے ساتھ ان اموال کو خرچ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح حضور اقدس کے پاس اتنی دولت سمٹ کر آتی اور آپ کے ہاتھوں خرچ ہوتی تھی۔ دنیا پرست منافقین دولت کی اس فراوانی کو دیکھ کر ریجھ گئے وہ تقسیم صدقات کو دیکھ کر دلوں میں گھٹتے اور ہر تقسیم کے موقعہ پر طرح طرح کے اعتراضات الزامات سے آوازے کستے۔ ان کی اصل خواہش تو یہ تھی کہ یہ مال سارا کا سارا ہمیں کیوں نہیں ملتا مگر اسے چھپا کر وہ یہ بات بناتے کہ انصاف ٹھیک نہیں ہوتا اور اس میں جانبداری سے کام لیا جاتا ہے۔

مالدار منافقین اپنے کو مسلمانوں سے خوف کی وجہ سے وابستہ رکھے ہوئے تھے اور یہ غربا طمع اور لالچ کی وجہ سے مردم شماری کے مسلمان بنے ہوئے تھے۔

یہ مختلف اطوار اور مختلف اقدار نفاق ہیں جو مختلف قسم کے لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی شخص میں اعمال کے یہ سارے نمونے ہوں۔ کسی میں کوئی کسی میں کوئی احادیث میں جو علامتیں منافقین کی بیان ہوئی ہیں ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ کسی میں کوئی ایک علامت ہو گی کسی میں دو کسی میں تین۔ یہ مطلب نہیں کہ ہر منافق میں یہ ساری علامتیں موجود ہوں۔ مثلاً مسند احمد میں بحوالہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کی ایک سے زیادہ علامتیں بتائی ہیں

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ منافقوں کی چند علامات ہیں مثلاً۔

۱۔ سلام کی جگہ زبانوں پر لعنت ہوتی ہے۔

۲۔ لوٹ مار کا مال وہ کھاتے ہیں۔

۳۔ خیانت کے مال کو وہ غنیمت سمجھتے ہیں۔

۴۔ مسجدوں میں بکواس کرتے رہتے ہیں۔

۵۔ نمازوں میں دیر سے آتے ہیں اتراتے ہوئے۔

۶۔ وہ خود کسی سے محبت نہیں کرتے ہیں۔

۷۔ ان سے کوئی الفت نہیں کرتا ہے۔

۸۔ رات کو شہتیر کی طرح بستروں پر پڑے رہتے ہیں۔

۹۔ دن میں شور مچاتے پھرتے ہیں۔

یہ علامتیں بتائی بھی اس لیے جا رہی ہیں کہ منافقین کی ظاہری سطح ہمیشہ مسلمانوں ہی کے ساتھ ملتی ہے اگرچہ بالکل

کافر ہوں تو اسے منافق کون کہے اس لیے نبوت نے ان کی علامات بتائی ہیں ۔ان علامات کا خلاصہ بد اخلاقی ،مطلب پرستی ۔ بے ایمانی خیانت اور دین سے بیزاری ہے جب انسانی اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو اس کی زبان گندی ہو جاتی ہے ۔استہزاء و تمسخر ، و طنز عیب چینی ، گالیاں ، یاوہ گوئی ، چرب زبانی آوازے کسنا ، تہمتیں لگانا اور اس جیسے ناپاک اطوار نمایاں ہو جاتے ہیں ۔جب امانت نہیں رہتی تو لوٹ کا مال اسے طیب مال لگتا ہے اور خیانت کرنا اس کی نظر میں مال غنیمت کی طرح محبوب ہوتا ہے ۔جب اس میں مطلب پرستی اور خود غرضی آتی ہے تو اس کا دل ہر ایک کی ہمدردی اور محبت سے خالی ہو جاتا ہے اور اس لیے دوسروں کے لیے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے خود غرضی کا ہمیشہ انجام یہی ہوتا ہے ۔اور جب دل دین سے بیزار ہوتا ہے تو نہ خانہ خدا کا احترام رہتا ہے اور نماز کے لیے چستی رہتی ہے ۔

یہ منافقین کی اخلاقی ، معاشرتی ، معاشی اور روحانی پستی کی ایسی بھرپور تصویر ہے کہ اگر کوئی شخص ان کی اس سے بہتر تصویر بنانا چاہے تو بنا نہیں سکتا ۔ایک ایک عمل ایمان کے تقاضوں کے منافی ہے ۔ایمان امن اور امانت سے مشتق ہے وہ خیانت خود غرضی اور ایذا رسانی کو برداشت نہیں کرتا ۔نماز کو تو خود قرآن ہی نے ایمان سے تعبیر کیا ہے ۔ ما کان اللہ لیضیع ایمانکم اس میں سستی ایک مومن کیسے کر سکتا ہے ۔

بلاشبہ ایسا مسلمان جو اپنی زندگی میں کھلے منافق سے کوئی امتیاز نہیں رکھتا ارشاد نبوت میں بلا ریب وہ منافق ہے اندر کا حال اللہ کے سوا جاننے والا کوئی نہیں یہ سرگذشت نفاق کی دنیا کی ہے جسے دعوت حق نے مخاطب کیا تھا لیکن آج خود ہمارا کیا حال ہے ۔افسوس ہے کہ ہم اس بیماری سے بچ نہ سکے ۔اور ہم نے اسلام کی عملی زندگی میں ایمان کے تقاضوں کو نفاق کے حوالہ کر دیا ۔اعتقاداً نہیں عملاً اور سوال یہاں عمل ہی کا ہے نہ کہ اعتقاد کا ۔نتیجہ یہ نکلا کہ عملی زندگی پوری کی پوری اسلام سے بیگانہ ہو گئی اور سب سے بڑا فساد یہ رونما ہوا کہ صدیوں سے مسلمانوں کی اجتماعیت ختم ہو گئی ۔اور نفاق نے اجتماعیت کی راہوں سے انہیں دور کر دیا ۔ انا للہ فالی اللہ المشتکیٰ ۔

ایمان کا صحیح تقاضا

(٦٠) اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ اللہ و رسول کی عطا پر خوش ہوتے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے ۔اللہ ہمیں اپنے فضل سے ضرور دے گا اور اللہ کا رسول بھی ۔بلاشبہ ہمارا مقصود صرف اللہ ہے یعنی بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ خدا پیغمبر کے ہاتھ سے دلوائے اس پر آدمی راضی اور قانع ہو ۔اور صرف اللہ سبحانہ پر توکل کرے اور سمجھے کہ وہ چاہے گا تو آیندہ اپنے فضل سے بہت کچھ عطاء فرمائے گا ۔غرض دنیا کی متاع فانی کو نصب العین نہ بنائے صرف خداوند رب العزت کے قرب و رضا کا طالب ہو ۔ اور جو ظاہری و باطنی دولت خدا اور رسول کی سرکار سے ملے اسی پر مسرور و مطمئن ہو ۔ (افادات شیخ الاسلام)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ:

یہ آیتِ کریمہ ایک طرف ایک عظیم ادب کی تعلیم دے رہی ہے تو دوسری طرف یہ شاندار راز بھی بتا رہی ہے کہ اللہ و رسول کے دینے پر خوش ہو اور صرف اللہ سبحانہ پر اعتماد و بھروسہ کرے اور ایسے ہی یہ آیت بتا رہی ہے کہ طاعت رسول اور اس کے اوامر و نواہی کے امتثال اور اس کی باتوں کی تصدیق اور اس کے نشان قدم پر چلنے کی توفیق مانگنے کے لیے رغبتوں اور چاہتوں کا قبلہ صرف اللہ ہو۔

امام بغوی معالم التنزیل میں لکھتے ہیں:

اگر وہ اللہ و رسول کی تقسیم پر راضی ہو جاتے اور کہتے کہ اللہ ہمیں کافی ہے اللہ ہمیں ہماری ضرورت کی چیزیں اپنے کرم اور اللہ کا رسول ضرور دے گا۔ ہم تو صرف اللہ کے فضل کی وسعتوں کے لیے اللہ کی طرف راغب ہیں۔ وہی وسعت دے کر ہمیں صدقوں سے بے نیاز کر دے گا۔ اگر وہ ایسا کہتے تو ان کے حق میں مفید ہوتا۔

امام رازی اس کی تشریح میں فرماتے ہیں:

غنیمت کا مال جو حضور نے ان کو دیا ہے اگر وہ اس پر خوش ہو جاتے چاہے وہ تھوڑا ہے اور کہتے کہ ہمیں یہ کافی ہے اور اللہ ہمیں اگر اور غنیمت کا موقع نصیب فرمائے گا تو اللہ کا رسول اس سے زیادہ دے گا۔ ہم تو بس اللہ کی طاعت اس کے انعام و اکرام کے خواہاں ہیں۔

آیت کا مطلب ان تشریحات کی روشنی میں یہ ہے کہ مال غنیمت میں سے جو حصہ حضور اقدس ﷺ نے ان کو دیا ہے اس پر قناعت کرتے اور خدا کے فضل سے جو کچھ خود کماتے ہیں اور اللہ سبحانہ کے دیئے ہوئے ذرائع آمدنی سے جو خوش حالی انہیں میسر ہے۔ اس کو اپنے لیے کافی سمجھتے۔ تو ان کے لیے مفید ہوتا۔ انا الی اللہ راغبون۔ یعنی ہماری نظر دنیا اور اس کی حقیر متاع پر نہیں بلکہ اللہ اور اس کے فضل و کرم پر ہے۔ اسی کی خوشنودی ہم چاہتے ہیں۔ اسی سے امید رکھتے ہیں جو کچھ وہ دے اس پر ہم راضی ہیں مال کی محبت دراصل آثار کفر کا بقیہ ہے اور غنا دبے نیازی ایمانی برکات کی ابتداء۔ جو لوگ آپ کی پہلی ہی صحبت میں ایمان کا کیف حاصل کر چکے تھے یا بتدریج اس کی لذت سے آشنا ہو چکے تھے وہ رضا کے پیکر تھے۔ ہر شخص کی صلاحیت ایک نہیں ہوتی اور ہر شخص کا مزاجی پیمانہ یکساں نہیں ہوتا بلند طبیعتیں جو ہر حقیقت کی متلاشی ہوتی ہیں اور بہت حسن سلوک اور ظاہری ہمدردی کا اثر زیادہ قبول کرتی ہیں۔ یہاں فیاض فطرت ہر ایک کے ساتھ معاملہ ان کی فطرت کے مناسب کیا کرتا تھا ایک موقع پر آپ نے اشارا فرمادیا تھا کہ مال کی تقسیم کو میری محبت کی تقسیم کا معیار تصور کرنا غلط ہے

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ
الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾

صدقات تو صرف فقیروں، مسکینوں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر لگے ہوں اور وہ جن کے دلوں میں اسلام کی الفت مقصود ہو[۶۱] اور غلاموں کی گلو خلاصی میں، نیز قرضداروں کی مدد کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے ہیں۔ فرض ہے اللہ کی جانب سے۔ اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت رکھنے والا ہے[۶۲]

مفردات کے معانی

الصدقات۔ صدقہ کی جمع ہے زکوٰۃ خیرات امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ صدقہ وہ ہے جس کو انسان اپنے مال میں سے بطور عبادت نکالتا ہے جیسے زکوٰۃ۔ لیکن صدقہ نفلی خیرات کے لیے بولا جاتا ہے اور زکوٰۃ کے لیے۔ اور کبھی واجب کو صدقے سے موسوم کر دیا جاتا ہے جبکہ اس کا ادا کرنے والا اپنے فعل میں صادق ہو۔ یہاں دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں ایک کہ زکوٰۃ انبیا علیہم السلام پر بالاتفاق فرض نہیں۔ مفتی ابوالسعود نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ یہ حضرات اپنے پاس ہر چیز کو بطور ودیعت رکھتے تھے خرچ کے موقع پر اسے صرف کر دیتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ طہارت ہے اُس شخص کے حق میں کہ جو آلودہ گناہ ہو اور ذاتِ پیغمبر گناہوں سے پاک ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ زکوٰۃ نہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حلال تھی اور نہ آپ کے خانوادے بنی ہاشم کے لیے۔

الفقراء۔ فقیر کی جمع ہے۔ مادہ فقر ہے۔ فقرہ اصل میں کمر کی ہڈی کو کہتے ہیں فاقرہ وہ افتاد جو کمر کی ہڈیاں توڑ

دے فقیر وہ جس کی کمر کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہوں یا ان میں بیماری ہو اور کمر شکن محتاجی کی وجہ سے فقیر کہتے ہیں یہ غنی کے مقابلے میں بولا جاتا ہے واللہ الغنی وانتم الفقراء

مساکین یہ مسکین کی جمع ہے یہ دو وزن پر ہو سکتا ہے اگر اس کا مادہ سکون ہے تو مفعیل کے وزن پر ہے اور اگر مادہ مسکنت ہو تو فعلیل کے وزن پر ہے اور اگر مفعیل کے وزن پر ہو اور سکون سے نکلا ہو تو سکون و اطمینان والے کے معنے میں ہے اور اسی معنے میں یہ لفظ حدیث میں آیا ہے اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین اور اگر فعلیل کے وزن پر ہو تو اس کے معنے ذلیل و ضعیف کے ہیں قرآن میں ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ مسکنت اسی کا مصدر ہے عاجزی بیچارگی کے معنے ہیں۔ اس لیے مسکین کے معنے عاجز ذلیل اور نادار کے ہیں۔ اسی لیے ناداری، بیچارگی کے معنے میں مسکنت بولتے ہیں۔ فیروز آبادی نے یہ کہہ کر اس طرف اشارا کیا ہے انما لحقہ اسم المسکین من جھۃ الذلۃ فمن لم تکن مسکنۃ من جھۃ الفقر فالصدقۃ علیہ حرام۔ بلکہ قاضی بیضاوی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کان النبی صلی اللہ علیہ یسأل المسکنۃ اور یہ اسی دعاء کا جس میں مسکین کا لفظ آیا ہے ان بزرگوں نے مطلب بتایا ہے گویا جو چیز یہود و اول پر عذاب بنا کر ماری گئی تھی حضور اسی کو معاذ اللہ۔ دعاء کے ذریعے مانگ رہے تھے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ یہ فقیر و مسکین کی صرف لغوی تحقیق ہے۔ ان کے اصطلاحی معنے آگے آ رہے ہیں۔

العاملین۔ کام کرنے والے عمل کرنے والے عمل سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر اس سے محکمہ زکوٰۃ کے کارندے مراد ہیں۔ جن کے ذمہ اسلامی حکومت میں زکوٰۃ و صدقات کی وصولیابی ہوتی ہے کیونکہ عامل کے معنے متولی امور اور کارندے کے بھی آتے ہیں۔ اور اسی رعایت سے محصل زکوٰۃ کو بھی عامل کہتے ہیں [1]

صدقات کے مصارف کی تحدید

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے مصارف زکوٰۃ کی تعیین و تحدید کی ہے وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کو زکوٰۃ مانگنے کی ہمت نہ ہو اور کوئی اسے اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ کا پچھلی آیت میں ذکر ہو چکا ہے جنھوں نے صدقات ہی کو اپنے ایمان و اسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا ——— ایک بار ایک شخص نے حضور اقدس ﷺ سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ لینے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا۔ اے شخص اللہ تعالیٰ نے مال زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ اور اس کے آٹھ مصرف مقرر فرمائے

---

[1] تاج العروس

ہیں اگر تم ان آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں لہ

اس تحدید و تعیین کے دو مقصد ہیں ایک تو یہ بھیک مانگنے والوں کی حوصلہ شکنی ہو کیونکہ وہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی لیں گے اس لیے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں۔ اصل توجہ ان مستور الحال مساکین کی طرف ہونی چاہیے جو صبر و قناعت کے ساتھ فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں کہ ان کی خبر بہتوں کو نہیں ہوتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہتے ہیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ اسلام اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ پیشہ ور گداگروں کی عزت اس کی نگاہ میں کم ہے اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتا ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف کی تحدید سے مقصود یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ہر قسم ان سب میں وجوباً تقسیم کی جائے یا یہ ہے کہ خرچ انہی میں کی جا سکتی ہے جس مصرف میں خرچ کرنا ضروری ہو؟ تو اس بارے میں فقہا کا اختلاف ہے لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے کہ تمام مصارف میں بیک وقت تقسیم کرنا ضروری نہیں ہے جس وقت جیسی حالت اور جیسی ضرورت ہو اسی کے مطابق خرچ کرنا چاہیے۔ اور یہی مذہب قرآن و سنت کی تصریحات اور روح کے مطابق ہے۔ ائمہ اربعہ میں صرف امام شافعیؒ اس کے خلاف گئے ہیں۔

یہ آٹھ مصارف جس ترتیب سے بیان کئے ہیں۔ اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ قدرتی ترتیب یہی ہے۔ سب سے پہلے ان دو گروہوں کا ذکر کیا جو استحقاق میں سب سے زیادہ مقدم ہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ کا اولین مقصود انہی کی اعانت ہے یعنی فقرا اور مساکین۔ پھر اس گروہ کا ذکر کیا جس کی موجودگی کے بغیر زکوٰۃ کا نظام نہیں چل سکتا۔ لیکن اس کو چونکہ استحقاق بالذات نہیں تھا اس لیے اسے پہلے نہیں ذکر کیا۔ پھر المولفۃ قلوبھم کا درجہ ہے کہ ان کا دل ہاتھ میں لینا ایمان کی تقویت اور حق کی اشاعت کے لیے ضروری تھا۔ پھر غلاموں کو آزاد کرانے اور قرضداروں کو بار قرض سے سبکدوش کرانے کے مقاصد نمایاں ہوئے جو نسبتہ موقت اور محدود ہے پھر فی سبیل اللہ کا مقصد رکھا کہ اگر مستحقین کی کسی وقت جماعتیں مفقود ہوں یا کم ہوں یا حالات نے ان کی اہمیت کم کر دی ہو۔ یا مال زکوٰۃ کی مقدار بہت زیادہ ہو گئی ہو تو ایک جامع مقصد کا دروازہ کھول دیا جائے جس میں دین و امت کے مصالح کی ساری باتیں آ جائیں سب سے آخر میں ابن السبیل کا ذکر کیا کیونکہ تقدم میں یہ سب سے کم اور مقدار کے لحاظ سے بہت ہی محدود صورت میں پیش آنے والا مصرف تھا لہ

چونکہ تقسیم صدقات کے معاملہ میں پیغمبر پر طعن کیا گیا تھا اس لیے تنبیہہ فرماتے ہیں کہ صدقات کی تقسیم کا طریقہ خدا کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اس لیے صدقات وغیرہ کے مصارف متعین فرما کر فہرست حضور اقدس ﷺ کے ہاتھ میں دے دی ہے آپ اسی کے موافق تقسیم کرتے ہیں اور کریں گے۔ کسی کی خواہش کے تابع نہیں ہو سکتے۔ حدیث میں آپ نے فرمایا کہ خدا

لہ ابو داؤد

لہ ترجمان القرآن

نے صدقات کی تقسیم کو نبی یا غیر نبی کسی کی مرضی پر نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ بذات خود اس کے مصارف متعین کر دیئے جو آٹھ ہیں فقراء جن کے پاس کچھ نہ ہو مساکین جن کو بقدر حاجت میسر نہ ہو عاملین جو اسلامی حکومت کی جانب سے تحصیل صدقات کے کام پر مقرر ہوں مؤلفۃ القلوب جن کے اسلام لانے کی امید ہو یا جو اسلام میں کمزور ہوں وغیر ذالک من الانواع اکثر علماء کے نزدیک حضور کی وفات کے بعد یہ مد نہیں رہی رقاب یعنی غلاموں کا بدل کتابت ادا کر کے آزادی دلائی جائے۔ یا خرید کر آزاد کیے جائیں یا قیدیوں کا فدیہ دیا جائے۔ غارمین جن پر کوئی حادثہ پڑا اور مقروض ہو گئے یا کسی کی ضمانت وغیرہ کے بارمیں دب گئے۔ سبیل اللہ جہاد میں جانے والوں کی اعانت کی جائے ابن السبیل مسافر جو حالت سفر میں نصاب کا مالک نہ ہو اگرچہ مکان پر دولت رکھتا ہو۔ حنفیہ کے نزدیک تملیک ہر صورت میں ضروری ہے تفصیل فقہ میں ملاحظہ کی جائے[1]

(۶۱) صدقات تو صرف فقیروں، مسکینوں اور ان لوگوں کے لیے ہیں جو صدقات کے کام پر لگے ہوئے ہوں اور وہ جن کے دلوں میں اسلام کی الفت مقصود ہو۔ آیت کی پیشانی پر کلمہ حصر انما لگا کر زکوٰۃ کے مصارف مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ یعنی جن مصارف کی صراحت کر دی گئی ہے ان کے علاوہ زکوٰۃ کی رقم کسی اور مصرف میں نہیں لگائی جا سکتی۔ علامہ شوکانی رقمطراز ہیں:

صدقات کی یہ جنس صرف ان قسموں کے لیے ہے جن کا ذکر آیت قرآنی میں ہے ان کے سوا کسی کو نہ دی جائے یعنی صدقات کی آمدنی ان ہی مدوں میں خرچ ہونی چاہیے۔ کسی اور مد میں اس کو خرچ نہ کیا جائے۔ قرآن نے یہ مصارف آٹھ بتائے ہیں۔

مساکین و فقراء زکوٰۃ کے مستحق ہیں

ان میں سب سے پہلے فقراء ہیں۔ اس کے بعد مساکین ہیں۔ فقہاء کے ان دونوں کی تشریح میں خیالات مختلف ہیں علامہ قرطبی نے اس موضوع پر نو اقوال نقل کیے ہیں۔ اہل لغت میں سے یعقوب بن السکیت، یونس بن حبیب اور اہل فقہ میں سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور قاضی عبدالوہاب رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ فقراء سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے پاس ابتدائی ضروریات کی تکمیل کا سامان تو ہو لیکن اس کے علاوہ کچھ نہ ہو اور مساکین وہ ہیں جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ ابوبکر الجصاص نے ابوالحسن کرخی سے بھی یہی بات نقل کی ہے۔ الجصاص نے امام زہری سے اسی بات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ فقیر وہ ہے جو سوال نہ کرے اور مسکین وہ ہے جو سوال کرے اور لکھا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ بھی یہی فرماتے ہیں ــــ اس کے برعکس کچھ بزرگوں کا خیال اس کے بالکل برعکس ہے فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو اور مسکین

[1] افادات شیخ الاسلام

وہ ہے جس کے پاس کچھ ہو۔ لیکن اس خیال کی بنیاد کچھ زیادہ پائدار نہیں ہے۔ صرف ایک دور کی قسم کی فکری روش ہے۔
ان کی سوچ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فقر سے تو اللہ کی پناہ مانگی ہے لیکن مسکین ہونے کی اللہ سے دعا مانگی ہے
مراد ابن ماجہ اور حاکم کی وہ حدیث ہے جو ابو سعید خدری کے حوالہ سے اور ترمذی میں انس بن مالک کے حوالہ سے آئی ہے کہ
حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی ہے اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ
المساکین وہ کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مسکین فقیر سے اچھا ہوتا ہے اگر فقیر سے برا ہوتا تو حضور یہ دعا نہ فرماتے
لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ:

اوّلاً: تو حدیث کی امام نووی نے تضعیف کی ہے اور ابن الجوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ ترمذی کی
روایت انس کی بھی سند ضعیف ہے۔

ثانیاً: اگر حاکم کی تصحیح اور علامہ ذہبی کی تقریر پر اسے تاریخی طور پر صحت کا سارٹیفکیٹ بھی دے دیا جائے تو
دعا میں لفظ مسکین فعیل کے وزن پر مسکنت سے نہیں بلکہ مفعیل کے وزن پر سکون سے ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ مجھے سکون
و المینان والا زندہ رکھ۔ یہی دعا کا پس منظر قرآن نے بھی پیش کیا ہے ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ۔ پہلے معنے
میں مسکین تو محتاج، کمزور، عاجز اور ذلیل کے معنی میں ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس کی دعا حضور ؐ نے نہیں مانگی۔

بہر حال فقیر ہو یا مسکین مقصود ایسے لوگ ہیں جو محتاج ہوں لیکن فقر عام ہے اور مسکنت خاص ہے فقیر اسے کہیں
گے جس کے پاس کچھ ہو مگر گذارہ نہ ہوتا ہو۔ اس کی خبر گیری کی جائے۔ مثلاً ایک طالب علم متعدد کتابوں کا مالک ہے جن کی مجموعی
قیمت مقررہ نصاب سے زیادہ ہے۔ اب اگر اس طالب علم کے پاس صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی معمولی ضروریات کی تکمیل کر سکتا
ہے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں رکھتا ہے وہ تو کتابوں کی ملکیت کے باوجود زکوٰۃ کا مستحق ہے۔ مسکین وہ ہے جس کی معاشی
حالت فقیر سے بھی زیادہ گری ہوئی ہو نہ بدن پر اُجلے کپڑے ہیں نہ گھر میں سامان ہے۔

فقیر اور مسکین میں اس لحاظ سے بھی فرق ہے کہ فقیر سوال نہیں کرتا ہے لیکن مسکین سوال کرنے میں اپنے اضطرار
کی وجہ سے عار محسوس نہیں کرتا۔ قرآن نے فقرا کا چہرہ ہی یہ پیش کیا ہے۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربًا فی الارض یحسبھم الجاھل
اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم لا یسئلون الناس الحافا۔

صدقات ان فقرا کا حق ہے جو اللہ کے راستہ میں گھر گئے ہوں ان کو یہ طاقت نہیں کہ اپنے ذاتی کسب و
معاش کے لیے زمین پر چل سکیں ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف خیال کرتا ہے کہ یہ مالدار ہیں۔ تم ان
کے چہرے دیکھ کر ان کی حالت پہچان سکتے ہو لیکن وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر سوال نہیں کرتے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے صحیح میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں

المسکین الذی لا یجد غنی یغنیہ ولا یفطن فتصدق علیہ ولا یقوم فیسال الناس

مسکین وہ ہے جسے ایسے وسائل میسر نہیں کہ تونگر کر دیں جس کا فقر ظاہر نہیں کہ اسے خیرات دی جائے جو خود سوال کے لیے کھڑا نہیں ہوتا کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

مسکین کا واقعی چہرہ نہیں پیش کیا بلکہ گداگر اور غیر گداگر کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے ارشاد ہے

لیس المسکین الذی یطوف علی الناس ترده اللقمۃ واللقمتان والتمرۃ والتمرتان۔

منشا پیشہ ور گداگر کے مقابلہ میں واقعی گداگر کا چہرہ بتانا ہے اور مسکین سے فقیر ہی مراد ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں حضور کا ارشاد لا یجد غنی یغنیہ پیش کرنے کے بعد قرآن کی یہ آیت درج کی ہے للفقراء الذین احصروا۔ اس سے اشارا کر دیا کہ ارشاد نبوت میں مسکین سے مراد فقیر ہے۔ کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ قرآن جو چہرہ فقیر کا بتائے اسی کے مقابلے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وہی چہرہ مسکین کا بتائیں۔

حیرت ہے اور تو اور مولانا آزاد بھی امام بخاری کے منشا کو نہ سمجھ سکے اور مسکین کو فقیر سے اچھا بتانے کے شوق میں آیت قرآنی اور ارشاد پیغمبر میں ایک طرح کا معارضہ بنا دیا۔

بہرحال فقیر سے مراد قرآن کے مطابق ایسے لوگ ہیں جو محتاج ہوں جو اپنے کسب و معاش کے لیے چل پھر نہ سکتے ہوں۔ اللہ کے راستے میں محبوس ہوں ان کی خود داری دیکھ کر ناواقف لوگ ان کو غنی خیال کرتے ہوں۔ لوگوں سے چپکے پڑ کر سوال نہ کرتے ہوں۔ بلاشبہ ایسے علمائے دین جو دین کی تعلیم کے لیے وقف ہوں اور فکر معیشت کے لیے وقت نہ نکال سکیں فقرا میں داخل ہیں۔ نیز وہ تمام افراد جو ان کی طرح خدمت دین و امت کے لیے وقف ہو جائیں اور معیشت کا کوئی سامان نہ رکھتے ہوں۔

قوم کے تمام ایسے افراد جن پر وسائل معیشت کی تنگی کی وجہ سے معیشت کے دروازے بند ہیں یقیناً مساکین میں داخل ہیں اور اس مد کے اولین مستحق ہیں بلکہ یہ تمام مندرجہ زکوٰۃ کے قانونی حقدار ہیں۔

۱۔ ایسے تمام یتیم بچے، بچیاں جن میں یہ شرطیں ہوں۔

الف۔ باپ مر چکا ہو۔

ب۔ عمر ۱۸ سال سے زیادہ نہ ہو۔

ج۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔

د۔ خاندان میں قانونی طور پر ذمہ داری اٹھانے والا کوئی نہ ہو۔

۲۔ وہ بیوہ عورتیں جن میں یہ شرطیں ہوں۔

الف۔ شوہر کی وفات کے بعد شادی نہ کی ہو۔

ب۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔

ج۔ خاندان میں قانونی طور پر ذمہ دار کوئی نہ ہو۔

۳۔ طلاق والی عورتیں جن میں یہ شرطیں ہوں۔

الف۔ عدت کی مدت ختم ہو گئی ہو۔

ب۔ شادی نہ کی ہو۔

ج۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔

د۔ اخراجات کا کوئی قانونی ذمہ دار نہ ہو۔

۴۔ بوڑھا مرد، بوڑھی عورت جن میں یہ شرطیں ہوں۔

الف۔ عمر ۶۰ سال سے زیادہ ہو۔

ب۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔

ج۔ خاندان میں اس کا شرعاً ذمہ دار کوئی نہ ہو۔

۵۔ ایسے کمزور لوگ جن میں یہ شرطیں ہوں۔

الف۔ آفت زدہ ہو۔ موذی مرض کا شکار ہو۔

ب۔ ۱۸ سال سے زیادہ عمر کا ہو۔ ۶۰ سے زیادہ نہ ہو۔

ج۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔

د۔ شرعاً اس کے اخراجات کا کوئی ذمہ دار نہ ہو۔

۶۔ ایسے بیمار جن میں یہ شرطیں ہوں۔

الف۔ کسی ایسی بیماری کا شکار ہو جس کی وجہ سے کام نہ کر سکے۔

ب۔ ۱۸ سال سے عمر زیادہ ہو۔ ۶۰ سے زیادہ نہ ہو۔

ج۔ ذریعہ آمدنی کوئی نہ ہو۔

۷۔ کم آمدنی والے جن میں یہ شرطیں ہوں۔

الف۔ آمدنی بالکل معمولی ہو۔ جو اخراجات پورے نہ کر سکے۔

ب۔ عمر ۱۸ سال سے زیادہ اور ۶۰ سے متجاوز نہ ہو۔
ج۔ معاشی زندگی کے لیے کسی کام پر قدرت نہ رکھتا ہو۔
د۔ قانونی طور پر اخراجات کا کفیل کوئی نہ ہو۔

۸۔ طلبہ جن میں یہ شرطیں ہوں۔
الف۔ کسی درسگاہ میں تعلیم پاتے ہوں۔
ب۔ عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہو۔
ج۔ گھر والے اس کی کفالت نہ کرتے ہوں۔

۹۔ نکمے جو کوئی کام نہ کرتے ہوں۔ جن میں یہ شرطیں ہوں۔
الف۔ کام نہ کرنا غیر ارادی سبب کی وجہ سے ہو۔
ب۔ عمر ۱۸ سال سے زیادہ اور ۶۰ سال سے کم ہو۔
ج۔ کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی کا نہ ہو۔

۱۰۔ قیدیوں یا مفقود کا بے سہارا خاندان۔
الف۔ گھر والوں کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو۔
ب۔ آمدنی کا کوئی وسیلہ نہ ہو۔
ج۔ قانونی طور پر کسی پر ذمہ داری نہ ہو۔

یہ سب حضرات مساکین میں داخل ہیں اور ضروری ہے کہ زکوٰۃ کی مد سے ان کی خبر گیری کی جائے بشرطیکہ بنی ہاشم نہ ہوں۔ یعنی سید نہ ہوں۔

زکوٰۃ کی قانونی تنظیم

تیسری قسم صدقات کے ہشتگانہ مصارف میں سے قرآن نے یہاں العاملین علیہا بتائی ہے یعنی ان صدقات کی وصولی پر متعین ہونے والوں کی تنخواہیں بھی زکوٰۃ ہی کی مد سے دی جائیں گی۔ یہاں عاملین کا منطوق تو یہی ہے۔ کہ عاملوں کی تنخواہیں زکوٰۃ سے دی جائیں گی مگر اس کے مدلول میں یہ بات بھی داخل ہے کہ زکوٰۃ کا نظام اجتماعی ہے۔ اس کا جماعتی نظم ہونا چاہیے جیسے نماز ایک اجتماعی عمل ہے باجماعت ہونا چاہیئے ٹھیک اسی طرح زکوٰۃ بھی ایک اجتماعی عمل ہے اسے اجتماعی نظم سے ہونا چاہیے فرق باریک سا ہے نماز کی باجماعت ادائیگی کے لیے امامت صغریٰ

کافی ہے لیکن زکوٰۃ کے اجتماعی نظم کے لیے امامت کبریٰ ضروری ہے ہو لے کر تو نماز بھی بغیر جماعت کے ہو ہی جاتی ہے مگر یہاں
سوال ہونے کا نہیں قانونی ذمہ داری کا ہے۔ عاملین کا لفظ بتا رہا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے اور حکومت
کے سربراہ کی جانب سے مسلمانوں سے زکوٰۃ کے وصول کرنے کا نظام ہونا چاہیے۔ اسی سربراہی کا نام امامت کبریٰ ہے
اس موضوع پر تفصیلی بحث انشاء اللہ گیارہویں پارے کے پہلے رکوع میں آیت

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم میں آئے گی۔

اے پیغمبرؐ ان کے مالوں سے زکوٰۃ لیجئے یہ ان کی جسم و روح کی طہارت کرے گی۔

اور میں کا پتہ نہیں مگر الجصاص نے جو لکھا ہے وہی پیش کرنا چاہتا ہوں کہ:

یہ آیت بتا رہی ہے کہ صدقات کی وصولی کا کام حکومت کے سپرد ہے۔

یعنی یہ مسلمان حکومت کا کام ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے عاملوں کے ذریعے زکوٰۃ وصول کرے اور پھر ضروریات کے
مطابق جس مصرف کو مقدم دیکھے اس میں صرف کرے۔ جب ایک شخص نے حکومت کے مقرر کردہ عامل کو زکوٰۃ دیدی
اس کی زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ اسی وجہ سے عاملوں کی تنخواہوں کا بوجھ بھی اسی فنڈ پر ڈالا گیا اگر ادائیگی کے لیے حکومت ضروری نہ
ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مصارف کی مد میں مستقلاً عمال حکومت کا ذکر کیا جاتا۔ اسی لیے صاف اور کھلے طور پر مسلمانوں کو
ہدایت کی گئی ہے کہ اس معاملہ میں عمال حکومت کی طاعت کریں اور بلا عذر زکوٰۃ ان کے حوالے کر دیں۔ اگرچہ عمال حکومت
ظالم ہی ہوں اور بیت المال کا سرمایہ غلط استعمال ہو رہا ہو۔ پھر بھی اصلاح حال کی کوشش کے ساتھ ادائیگی ضرور
کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ زکوٰۃ بطور خود بانٹ دی جائے بشیر بن خصاصہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا کہ
عمال کا ایک گروہ زیادتی کرتا ہے صدقات لینے میں کیا ہم ان کا مقابلہ کریں فرمایا نہیں (ابوداؤد) سعد بن ابی وقاص کی
روایت میں ہے جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں زکوٰۃ ان کو دو۔

امویوں کے زمانے میں جب نظام خلافت امارت میں بدل گیا۔ اور حکام ظلم و تشدد پر اُتر آئے تو کچھ لوگوں کو خیال
ہوا کہ ایسے لوگوں کو زکوٰۃ نہ دینی چاہیے۔ لیکن تمام صحابہ نے یہی فیصلہ کیا کہ زکوٰۃ انہی کو دینی چاہیے۔ یہ کسی نے نہیں کہا کہ خود
اپنے ہاتھ سے خرچ کر ڈالو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے پوچھا کہ اب زکوٰۃ کسے دیں۔ کہا کہ وقت
کے حاکموں کو اس نے کہا کہ وہ کپڑوں اور خوشبو میں اُڑا دیں گے فرمایا اگرچہ ایسا کریں لیکن زکوٰۃ انہی کو دو (ابن ابی شیبہ)
کیونکہ زکوٰۃ کا معاملہ بغیر نظام کے قائم نہیں رہ سکتا۔ ایسا کیوں ہوا۔ اور ان کی سوچ کا انداز یہ کیوں تھا۔ اس کا جواب اس
کے سوا کیا ہے کہ والعاملین کا مطالبہ مسلمانوں سے یہی تھا کہ مسلمانوں کو یہ کام سیاسی نظام کے تحت باجماعت ادا
کرنا چاہیے۔ انفرادی حیثیت سے اس فرض کی ادائیگی ایسی ہے جیسے بغیر جماعت نماز کی ادائیگی۔ یہ ادائیگی نہیں سر سے

بوجھ پھینکنے والی بات ہے نماز ہو یا زکوٰۃ دونوں میں ہم آہنگی ہے قرآن نے دونوں کو ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے دونوں اللہ سبحانہ کی شانِ محبوبیت کی نہیں بلکہ شان حاکمیت کے مظاہر ہیں۔ دونوں کا اللہ سبحانہ کی پرستش سے نہیں اللہ کی بندگی سے تعلق ہے دونوں اسلام کی اجتماعی زندگی کا نشان ہیں۔ جیسے نماز جماعت چاہتی ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی اجتماعیت چاہتی ہے نماز کی اجتماعیت اگر امامت صغریٰ سے وابستہ ہے تو زکوٰۃ کی اجتماعیت کا شیرازہ امامتِ کبریٰ کا رہین منت ہے مسلمانوں کی آبادی اگر نماز باجماعت چھوڑ دے تو آبادی سے قتال واجب ہے ایسے ہی اگر مسلمان آبادی زکوٰۃ دینا امامت کبریٰ کو بند کر دے تو سربراہ پر ان سے قتال واجب ہے۔ دونوں کی یہی یکجہتی ہے۔ اسلامی زندگی میں اجتماعیت کے شاہکار ہیں۔ اسی ربط باہمی کی وجہ سے قرآن نے تکرار واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ کی ندا بلند کی ہے۔

العالمین کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اپنی ذات اور اپنے خاندان بنی ہاشم پر زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا تھا چنانچہ آپ نے خود بھی صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام ہمیشہ بلامعاوضہ کیا اور دوسرے بنی ہاشم کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ اس سرکاری کام کو بلامعاوضہ انجام دیں تو جائز ہے۔ لیکن معاوضہ لے کر اس محکمہ کی کوئی خدمت کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ آپ کے خاندان کے لوگ اگر صاحب نصاب ہوں تو زکوٰۃ دینا ان پر فرض ہے۔ لیکن اگر غریب، مسکین، مسافر، قرض دار ہوں تو زکوٰۃ لینا ان پر حرام ہے علامہ آلوسی نے روح المعانی میں یہ بات صاف لکھی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی یہی لکھا ہے۔ ولایجوز ان یکونوا من اقرباء رسول اللہ الذین لتحریم الصدقۃ علیھم۔ یعنی حضور اقدس ﷺ کے اقرباء کو اس محکمہ سے تنخواہ لینی جائز نہیں ہے۔

المؤلفۃ قلوبھم کون ہیں؟

مصارف زکوٰۃ میں چوتھی قسم المولفۃ قلوبھم ہے اس سے مراد وہ لوگ جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوں اور ان کو اسلام سے وابستہ رکھنے اور اس کی خدمت پر آمادہ کرنے کے لیے مال دیا جائے۔ اور وہ غیر مسلم جن کو اسلام سے مانوس کرنے اور اس میں داخل ہونے پر آمادہ کرنے کے لیے مال دیا جائے یا اس لئے مال دیا جائے کہ ان کی قوم میں جو لوگ مسلمان ہوئے ہوں ان کی دشمنی نہ کریں۔ غیر مسلموں کو اسلام کی دشمنی سے باز رکھنے دوسرے غیر مسلموں کے مقابلے میں ان کی مدد حاصل کرنے اور فی الجملہ اسلامی ریاست کے مفاد کی ترویج کے لیے بھی مال دینا اس مد کے تحت آتا ہے۔ (السیاسۃ الشرعیہ۔)

اس موضوع پر تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ زمانہ نبوت میں بہت سے لوگوں کی تالیف قلب کے لیے امداد کی جاتی تھی۔ لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ آپ کے بعد بھی یہ مد باقی رہی یا نہیں۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ:

حضرت عمر، اور عامر الشعبی رضی اللہ عنہما اور ایک جماعت کی رائے ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے وصال مبارک کے بعد یہ مد باقی نہیں رہی کیونکہ اللہ سبحانہ نے اسلام اور مسلمانوں کو سیاسی قوت عطا فرمادی ہے اور کفر کی طاقت ختم کر دی۔ ان کے مقابلے میں دوسرے لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ اس مد کا مصرف اب بھی باقی ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے فتح مکہ اور ہوازن کی شکست کے بعد بھی اس مد سے لوگوں کو وظیفے دیئے ہیں۔

احناف میں سے ابو بکر الجصاص احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ احناف کا مسلک اس موضوع پر یہی ہے کہ یہ مد اب باقی نہیں ہے یہ اس وقت کی بات ہے جب آغازِ اسلام میں مسلمانوں کی تعداد تھوڑی اور کفر کی عددی طاقت زیادہ تھی۔ اب یہ مد باقی نہیں رہی حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے سے یہ مد ساقط ہو چکی ہے۔ اور اب مؤلفۃ القلوب کو کچھ دینا جائز نہیں ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کمزور مسلمانوں کی اس مد سے مدد کی جاسکتی ہے لیکن کافر کو مدد نہیں دی جاسکتی، امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مؤلفۃ القلوب کو اس مد میں سے نہ دیا جائے لیکن اگر کسی شہر میں یا سرحد پر ضرورت پیش آجائے تو سربراہ مملکت ایسا کرنے کا مجاز ہے امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے۔

جیسے اس بات پر اتفاق ہے کہ مؤلفۃ القلوب مصارف زکوٰۃ میں ایک مد ہے ایسا ہی اس بات پر بھی محدثین و فقہاء متفق ہیں کہ اس مد میں سے حضور اقدس ﷺ نے کبھی کسی غیر مسلم ... کو کچھ نہیں دیا۔ غیر مسلموں کی تالیف قلب زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے اموال سے کی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب صرف مسلمان ہیں جن کو اس مد سے مالی امداد دی گئی۔ یہ بات البتہ قابلِ غور ہے کہ اس مد سے مسلمانوں کو جو امداد دی گئی ہے اس کی بنیاد کیا ہے فقر یا کچھ اور اگر فقر ہے تو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس بنیاد پر اب بھی اس مد سے امداد دی جاسکتی ہے۔ اختلاف صرف اس پر ہوگا جب یہ غنی اور صاحب نصاب ہوں امام شافعی اور امام احمد کے خیال میں چونکہ تمام مصارفِ زکوٰۃ میں فقر شرط نہیں اس لیے وہ مؤلفۃ القلوب میں ایسے لوگوں کو بھی داخل کرتے ہیں جو غنی اور صاحب نصاب ہوں۔ امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک عاملینِ زکوٰۃ کے علاوہ باقی تمام مصارف میں فقر شرط ہے۔

قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں مؤلفۃ القلوب کی مد ائمہ اربعہ کے نزدیک منسوخ نہیں ہے

فرق صرف یہ ہے کہ کچھ بزرگوں نے فقراء مساکین کے علاوہ کسی دوسرے مصرف میں فقر کو شرط نہیں قرار دیا اور کچھ نے فقر کو ضروری شرط کے درجہ میں بتایا ہے۔ جن بزرگوں نے العاملین کو چھوڑ کر المولفۃ قلوبھم، الغارمین ابن السبیل اور فی سبیل اللہ میں فقر کی شرط لگائی ہے وہ صرف ان مسلمانوں کو مؤلفۃ القلوب کی وجہ سے امداد دیتے ہیں جو فقیر ہوں۔ مسلمان اغنیاء کو اس کا حقدار نہیں سمجھتے۔

قاضی صاحب کا مفاہمت کا یہ فارمولا قابلِ داد ہے لیکن اس صورت میں العاملین کو چھوڑ کر ان کو زکوٰۃ میں سے تنخواہ ان کے عمل کی وجہ سے دی جائے گی چاہے وہ غنی ہوں مگر المولفۃ کو تالیفِ قلب رقاب کو غلام ہونے کی بنا پر غارمین کو تاوان کی وجہ سے مجاہدین کو اللہ کی راہ میں کام کرنے کی بنا پر اور ابن السبیل کو مسافر ہونے کی بنیاد پر زکوٰۃ نہیں دی جائے گی بلکہ فقیر ہونے کی وجہ سے دی جائے گی۔ اس کا نتیجہ لازماً یہ ہے کہ مصارف زکوٰۃ آٹھ نہیں بلکہ صرف دو ہیں ایک فقراء اور دوسرے العاملین۔ سوال یہ ہے کہ جب دو ہی زکوٰۃ کے مصارف ہیں تو قرآن نے آٹھ کی یہ فہرست کیوں پیش کی ہے؟۔ بات یہ ہے کہ اگرچہ مدات آٹھ ہیں۔ لیکن حضور اقدس نے خود ان ہشتگانہ مدات سے زکوٰۃ کے مال کی اصولی نوعیت یہ بتائی ہے۔

ان اللہ افترض علیھم صدقۃ فی اموالھم توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم

اللہ نے ان کے مالوں میں زکوٰۃ فرض کی ہے ان کے اغنیاء سے لی جائے اور فقراء کو دی جائے

اس وضاحت کی روشنی میں زکوٰۃ کی نوعیت ایک ایسے محصول کی ہے جس کے ذریعے اہلِ حاجت کی حاجت برآری کی خاطر تقسیم دولت کے اندر ایک گونہ ہمواری پیدا کرنا ہے۔ اصل بنیاد فقر اور حاجت مندی ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس کی خاطر زکوٰۃ فرض ہوئی ہے۔ زکوٰۃ اس قسم کا کوئی محصول نہیں جو آج کل حکومتیں اپنی رعایا پر عائد کرتی ہیں۔ موجودہ زمانے کا ہر محصول کسی نہ کسی صورت میں ان معاشرتی خدمات کے معاوضہ میں عائد کیا جاتا ہے جو حکومت رعایا کی خاطر انجام دیتی ہے مگر زکوٰۃ وہ محصول ہے جو امراء اور صاحب استطاعت افراد سے صرف اس لیے وصول کیا جاتا ہے کہ اس سے حاجت مند افراد کی حاجت براری کی جائے۔ موجودہ دور میں حکومت سے شہری زکوٰۃ سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم سے اتنے محصولات لیے جاتے ہیں لہٰذا حکومت کو انہی محصولات کی آمدنی سے فقراء کی مدد کرنی چاہیے۔ اس کا جواب حکومت یہی دے گی کہ جتنے محصولات تم سے لیے جاتے ہیں ان سے تمہارے ہی فوائد وابستہ ہیں قیام امن۔ جان و مال کا تحفظ، رسل و رسائل اور حمل و نقل کے وسائل کی ترقیاں ان محصولات ہی سے پوری ہو رہی ہیں۔ تعلیم کی اشاعت طبی امداد کی فراہمی اور دوسری

آسانیاں انہی محصولات کی رہین منت ہیں۔ لیکن زکوٰۃ وہ محصول ہے جو ان فائدوں سے قطع نظر خدا نے تم پر اس لیے عائد کیا ہے کہ اس سے غرباء اور فقراء فائدہ حاصل کریں۔ اس لیے ان تمام طبقوں میں جن کا قرآن نے مصارفِ زکوٰۃ میں ذکر کیا ہے بنیادی وصف اگر فقر ہے تو زکوٰۃ دی جائے گی ورنہ نہیں۔

المولفۃ قلوبہم میں اگر ایسے نومسلم ہوں جو نادار ہوں اور ناداری اور غربت کی وجہ سے کفر کی طرف ان کے پلٹنے کا یا غیر مسلموں سے رابطہ قائم کرنے کا اندیشہ ہو تو آپ ان کی مدد ان کی حاجت کی بناء پر کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ چاہیں کہ ان نومسلموں کے گاؤں میں ان کی تالیف قلب کی خاطر زکوٰۃ کے مال سے کنواں بنا دیں، سڑک بنا دیں تو بلاریب یہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہے۔ ایسے ہی دوسرے مصارف کو سمجھ لیجئے بہرحال اصل بنیاد فقر ہے اور شائد بنیاد ہی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے قرآن نے تمام مصارف پر للفقراء کو مقدم رکھا ہے اور اسی تقدیم سے جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات سمجھی ہے ترد علی فقرائھم اور اسی کو ائمہ اربعہ نے پیش نظر رکھا ہے اس بنا پر یہ وسوسہ کچھ وزنی اور جاندار نہیں ہے کہ مصارف صرف دو ہی رہ جائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ احناف کا استدلال اس واقعہ سے کہ حضور اقدس ﷺ کے وصال مبارک کے بعد عیینہ ابن حصن اور اقرع بن حابس حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کے پاس آئے اور انہوں نے ایک زمین آپ سے طلب کی اور آپ نے ان کو فرمان لکھ دیا۔ انہوں نے چاہا کہ مزید پختگی کے لیے دوسرے اعیان صحابہ بھی اس فرمان پر گواہیاں ثبت کر دیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے پاس اسی مقصد کی خاطر گئے تو انہوں نے اس فرمان کو پھاڑ دیا اور فرمایا کہ بلاشبہ حضور اقدس ﷺ تالیفِ قلب کے لیے تمہیں دیا کرتے تھے مگر وہ اسلام کی کمزوری کا زمانہ تھا اب اللہ نے اسلام کو تم سے بے نیاز کر دیا ہے اس پر وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کے پاس شکایت لے کر آئے لیکن نہ تو اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کچھ کہا اور نہ دوسرے صحابہ میں سے کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اس بنیاد پر احناف کہتے ہیں کہ مولفۃ القلوب کی مد مصارف زکوٰۃ سے ختم ہو گئی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد دلیل کی بنا پر ہے دلیل یہ ہے اعز اللہ الاسلام۔ خود فقہائے احناف نے بھی اسی کو مرکز قرار دیا ہے۔

دراصل المؤلفۃ قلوبہم کی مد الصدقات کے مصارف میں ان لوگوں کے لیے جو محض مالی کمزوریوں کی وجہ سے اسلامی حکومت اور اسلام کی مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ اس زمانے میں سیاسی شورش پسندوں کے ایک گروہ کا یہی حال ہے۔ ان لوگوں کو چپ کرانے کے لیے بھی الصدقات کے مصارف میں قرآن نے مولفۃ القلوب کی ایک مد رکھی ہے۔ اگرچہ عام طور پر فقہا کہتے ہیں کہ یہ مصرف صرف ابتداء اسلام میں تھا جیسا کہ آپ سن آئے

ہیں اور اس سلسلے میں ان کی دلیل بھی اب سن چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مولفۃ القلوب کے بعض افراد کو دینے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ اب اسلام اتنا قوی ہو چکا ہے کہ ان لوگوں کی تالیفِ قلب کی ضرورت نہیں رہی مقصد صرف اس قدر ہے کہ چند خاص لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان اللہ اعز الاسلام اس کا یہ مطلب بتانا کہ ہر شخص کے لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور ہمیشہ کے لیے ساقط کر دیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا قرآن نے جس مصرف کو منصوص کیا ہے اس کو اوّلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ منسوخ بھی کیسے کر سکتے ہیں۔ نیز ایک ایسی خبر واحد سے قرآن کے ایک قانون پر خط تنسیخ نہیں پھیرا جا سکتا۔ بلکہ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ یہ امام اور حکومت وقت کے صوابدید پر موقوف ہے۔ جس وقت جن لوگوں کے لیے اس کی ضرورت سمجھے دے جن کے لیے ضرورت نہ سمجھے نہ دے۔ اس دلیل کا تعلق ایک تو وقت و زمان کے احوال سے اور دوسرا اشخاص کے احوال سے ہے۔ اس وقت کے حالات میں مصالح اجتماعی کا تقاضا نہ تھا۔ احوال میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ اگر حالات بدل جائیں اور وقت کا تقاضا بھی یہ ہو تو قرآن کی دی ہوئی گنجائش سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کی ضرور رعایت رکھی جائے کہ جسے مدد دے رہے ہیں وہ مدد کا مستحق ہو اور مسلمان ہو۔ بلکہ اس مادی دور میں جبکہ روحانی حقائق کو بیگانے تو بیگانے یگانے بھی مادیت کی ترازو میں تول رہے ہیں اس کا دائرہ وسیع ہونا چاہیے۔ عیسائی مشنریوں کے مقابلے میں زکوٰۃ کے فنڈ سے نومسلموں کی حوصلہ افزائی۔ ان کی امداد۔ ان کی رہائش۔ ان کے خورد و نوش اور ان کی تعلیم و تربیت کا اجتماعی طور پر تنظیمی ڈھانچہ قائم کریں تو وقت کا تقاضا ہے۔

غلاموں کے آزاد کرنے میں

اور غلاموں کی گلو خلاصی میں نیز قرضداروں کی مدد کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے ہے۔ فرض ہے اللہ کی جانب سے اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ مصارف زکوٰۃ میں پانچواں مصرف فی الرقاب ہے رقاب جمع رقبہ کی ہے مطلب یہ ہے کہ گردنیں چھڑانے میں زکوٰۃ سے مدد کی جائے۔ غلامی انسانی تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر ہے۔ یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی۔ غلاموں کو آزاد کرنے کے فضائل بتائے۔ ان کے ساتھ نیکی احسان حسنِ سلوک کی تاکید کی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک حصہ اس کے لیے نامزد کر دیا کہ اس سے غلاموں کو آزاد کرایا جائے چونکہ غلاموں کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زر فدیہ ہر ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور پر اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی۔ انسانوں کے درماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے جس کی نظیر دنیا

کے محسنین کی فہرست میں نظر نہیں آتی۔ حضور اقدس ﷺ نے صرف اس لیے کہ انسانوں کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرادی کہ اس کے ذریعے سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائیں یا اس رسم کا دنیا کی تمام قوموں سے خاتمہ نہ ہو جائے۔[1]

غلاموں کی آزادی میں مال زکوٰۃ خرچ کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ جس غلام نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کیا ہو کہ اگر میں تمہیں اتنی رقم ادا کر دوں تو تم مجھے آزاد کر دو اسے بدل کتابت آزادی کی قیمت ادا کرنے میں مدد دی جائے حضرت علی ابن ابی طالب، سعید بن جبیر، لیث رضی اللہ عنہم الثوری احناف اور شوافع اور اہل علم کی اکثریت فی الرقاب کا یہی مطلب بتاتی ہے۔

دوسری یہ کہ خود زکوٰۃ کی مد سے غلام خرید کر آزاد کیے جائیں عبداللہ بن عباس، الحسن البصری۔ امام مالک اور امام احمد فی الرقاب کا یہی مطلب بتاتے ہیں امام بخاری کا صحیح میں میلان بھی اسی طرف ہے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ آیت کی مراد دونوں ہیں۔ یہ یاد رہے کہ احناف کے نزدیک زکوٰۃ کی مد سے صرف مکاتب غلام کا بدل کتابت دیا جا سکتا ہے۔ غلام خرید کر آزاد نہیں کیا جا سکتا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ غلام خرید کر آزاد کرنے میں اختلاف ہے۔

تعبیر میں اختلاف

آیت میں اس تعبیری اختلاف سے اہل علم نے لطائف علمی کی نکتہ آفرینی کی آیت کا آغاز للفقراء میں لام سے کیا ہے اور یہاں پہنچ کر لام کی جگہ فی آیا ہے و فی الرقاب ادب و بلاغت کے مشہور نکتہ شناس علامہ زمخشری لکھتے ہیں یہ تنوع یہ بتانے کے لیے ہے کہ غلام، اور قرضدار بہ نسبت مذکورین کے صدقہ و زکوٰۃ کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ فی ظرفیت کے لیے آتا ہے گویا ان کو صدقات کے لیے بمنزلہ برتن بنا دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ برتن زیادہ حقدار ہے کہ تمہارے صدقات پہلوں کے مقابلے میں ان میں رکھے جائیں۔ کیونکہ رقاب اور غارمین دونوں ہی جکڑے ہوئے ہیں ایک غلامی میں اور دوسرا تاوان و قرض میں اور دونوں چھٹکارا اور خلاصی کے محتاج ہیں اور آگے فی سبیل اللہ، ابن السبیل لا کر اشارا کر دیا کہ بے سہارا مجاہد اور گھر سے دور بے مایہ مسافر ان دونوں سے بھی زیادہ صدقات کے مستحق ہیں۔

علامہ ناصر نے انتصاف میں اس سے بھی زیادہ وزنی بات لکھی ہے کہ:

[1] سیرۃ النبی

پہلی چاروں مدوں فقیر، مسکین، عامل اور المولفۃ قلوبہم کو اگر زکوٰۃ دی جاتی ہے تو انفرادی طور پر ان کو مالک بنایا جاتا ہے ملکیت کو ظاہر کرنے کے لیے لام لے کر آئے برخلاف رقاب اور غارمین کے ان کو جو مال دیا جائے گا وہ ان کو نہیں بلکہ غلام کے آقا اور قرض خواہ کو ملے گا۔ چونکہ ان کو شخصی طور پر مال نہ ملے گا بلکہ ان کی مصالح میں مال کو صرف کیا جائے گا اس لیے لام کی جگہ فی آیا ہے۔

صاحب انتصاف ہی نے اپنے دادا ابوالعباس احمد بن الفارس کے حوالہ سے ایک علمی نکتہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

انما الصدقات اگر مبتدا ہے للفقراء اس کی خبر ہے لیکن متعلق کی ضرورت ہے امام شافعیؒ کے ذہن کے مطابق اس کا متعلق اگر مملوکہ نکالا جائے تو یہ لام کی حد تک صحیح ہوگا لیکن آگے عبارت میں فی آرہا ہے اس کے لیے جداگانہ فعل کی ضرورت ہوگی۔ امام مالک کے نظریہ کے مطابق آیت قرآنی صرف مصارف بیان کر رہی ہے اس لیے متعلق مملوکہ کی بجائے مصروفۃ ہوگا للفقراء اور فی الرقاب دونوں کا تعلق اس سے بغیر کسی تکلف کے صحیح ہو جائے گا۔

قرض داروں کی قرض سے سبکدوشی

یہ مد زکوٰۃ کا چھٹا مصرف ہے۔ الغارمین کے معنے ہیں تاوان اٹھانے والے اس سے مراد وہ نیک لوگ ہیں جنھوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لیے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کی جا سکتی ہے یا ایسا قرض دار جو اپنے مال سے اگر پورا قرض چکا دے تو ان کے پاس قدر نصاب سے کم مال رہ جائے خواہ کسب کرتے ہوں یا بے روزگار ہوں خواہ عرف میں فقیر ہوں یا نہ دونوں صورتوں میں ان کی مد زکوٰۃ کی مد سے کی جا سکتی ہے۔ ابوبکر الجصاص لکھتے ہیں۔

جابر بن ابی جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں ایسا قرضدار جس کے بے جا اور بے محل اخراجات نہ ہوں اس کے قرض کی ادائیگی حکومت کی ذمہ داری ہے اور سعید کہتے ہیں کہ جن لوگوں پر معتدل معیشت میں بغیر مسرفانہ طرز زندگی کے قرض ہو جائے تو اللہ سبحانہ نے ان کے لیے مال زکوٰۃ میں حصہ رکھا ہے۔ قرض میں ان بزرگوں نے اسراف نہ کرنے کی قید اس لیے لگائی ہے کیونکہ جو شخص فضول خرچیوں میں ڈال کر اپنے کو مقروض بناتا ہے وہ اس لائق نہیں ہے کہ آئندہ کے لیے اس پر اعتماد کیا جائے۔ امام مجاہد نے جس کا گھر دوکان، کھیتی، مویشی سیلاب کی نذر ہو جائیں یا جس کے گھر دکان میں آگ لگ جائے اس کو بھی الغارمین کا مصداق بتایا ہے لیکن الجصاص فرماتے ہیں کہ یہ لوگ فقیر تو ہیں مگر غریم

نہیں غالباً امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی مراد یہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں وہ مقروض ہو جائے گا۔

فی سبیل اللہ زکوٰۃ کا مصرف

قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام کام جو براہ راست اسلام کی حفاظت و تقویت کے لیے ہوں سبیل اللہ کے کام ہیں اور چونکہ اسلام کی حفاظت کا سب سے زیادہ ضروری کام دفاع ہے اس لیے زیادہ تر اطلاق اسی پر ہوا لہٰذا اگر دفاع درپیش ہے اور امام وقت اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ مد زکوٰۃ سے مجاہدین کی مدد کی جائے تو اس میں خرچ کیا جائے گا ورنہ دین و امت کے عام مصالح میں زکوٰۃ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اگر ساری مدات میں فقر کی ضروری قید ملحوظ ہے اور اس مد میں بھی اس کو ملحوظ رکھا جائے تو بلا استثناء دین کے سارے شعبوں میں قرآن اور علوم دینیہ کی ترویج و اشاعت میں مدارس کے اجراء و قیام میں دعاۃ و مبلغین کے قیام و ترسیل میں ہدایت و ارشاد امت کے تمام مفید وسائل میں اس مد سے کام لیا جا سکتا ہے۔ فقر کی قید کے بعد مجاہد اور حاج کی تخصیص کے کوئی معنے نہیں ہیں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے۔

> جب مصارف کی ساری قسموں میں فقر کی ضروری قید ہے تو پھر فی سبیل اللہ کو حج اور جہاد کے ساتھ خاص کرنے میں کوئی معنویت نہیں ہے بلکہ اس میں سارے ابواب خیر داخل ہوں گے۔ لہٰذا جو شخص طالبان علم پر مال خرچ کر رہا ہے وہ یقیناً راہ خدا میں خرچ کر رہا ہے۔

کچھ علماء نے آیت فی سبیل اللہ کا مصداق میدان جنگ کے سپاہیوں اور حج میں جانے والے حاجیوں کو قرار دیا ہے چنانچہ امام شافعی قاضی ابو یوسف اور اہل علم کی رائے عامہ کہتی ہے کہ اس سے مراد وہ مجاہدین ہیں جن کے پاس سامان نہ ہو امام احمد اور امام محمد فرماتے ہیں وہ حاجی ہیں جن کے پاس اثاثہ نہ ہو۔ لیکن فقہاء نے فقر کی قید لگا کر اس تخصیص کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چنانچہ علامہ کاشانی نے بدائع الصنائع میں تصریح کی ہے ـــــ کہ وہ تمام کام جو نیکی و خیرات کے ہوں اس میں داخل ہیں اور فتاویٰ ظہیریہ میں اس کا مصداق طلبہ علم کو قرار دیا ہے۔

مسئلہ تملیک اور زکوٰۃ

جیسے تمام ائمہ کے نزدیک عاملین کو چھوڑ کر تمام مصارف میں زکوٰۃ لینے والوں کے لیے فقر شرط ہے ٹھیک اسی طرح ائمہ اربعہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک بھی شرط ہے نہ فقر کے بغیر

زکوٰۃ کی ادائیگی ہے اور نہ تملیک کے بغیر زکوٰۃ ادا ہوتی ہے۔ فقراء ہوں یا مساکین۔ المؤلفۃ قلوبہم ہوں یا رقاب غارمین ہوں یا ابناء السبیل اور آخر میں تمام نیکی کے کام ہوں سب میں تملیک بنیادی اور اہم شرط ہے آپ زکوٰۃ کی مد سے خیر سگالی کے جذبے کے تحت محتاج خانے۔ دارالمساکین۔ دارالتالیف، دارالتحریر اور قرض خواہوں یا مسافروں کے لیے سرائے مسافر خانے نیکی کے کاموں کے لیے مساجد اور مدارس تعمیر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان میں انفرادی ملکیت نہیں ہے۔ یہ کام سارے کے سارے نیکی اور خیرات کے کام ہیں اور یہ بھی رفاہ عام کے لیے لیکن یہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہیں ان کاموں کا کرنا زکوٰۃ سے الگ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ یتیم خانوں میں یتیم بچوں مدارس میں طلبہ کو مساجد میں غریب نمازیوں، سرائے میں غریب مسافروں کو آپ شخصی اور انفرادی طور پر زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ یہ بات یاد رہے کہ زکوٰۃ کے فرض ہونے کی شرطیں اور زکوٰۃ کے ادا ہونے کی شرطیں الگ الگ ہیں۔ زکوٰۃ کے فرض ہونے کی شرط اگر نصاب زکوٰۃ کا ہونا اور اس پر سال گذرنا ہے تو زکوٰۃ کی ادائیگی کی شرط زکوٰۃ لینے والے کا فقیر ہونا اور اسے مالک بنانا ہے۔ اگر یہ دونوں شرطیں نہ پائی جائیں تو زکوٰۃ کی ادائیگی نہ ہوگی۔ مثلاً

اگر آپ نے اپنی زکوٰۃ کسی میت کے کفن دفن پر خرچ کر دی یا آپ نے میت کا قرض ادا کر دیا۔ یا آپ نے میت کو ثواب پہنچانے کے لیے لوگوں کو گھر بلا کر کھانا کھلایا۔

اگر آپ نے کوئی شفاخانہ زکوٰۃ کے مال سے بنا دیا اور اس میں آپ نے مریضوں کا مفت علاج شروع کر دیا۔

اگر آپ نے زکوٰۃ کی رقم سے کوئی مسجد تعمیر کر دی اور اس میں نمازی نماز پڑھنے لگے۔ اگر آپ نے رفاہ عام کے لیے کوئی نلکا ٹیوب ویل یا نہر بنا دی۔ اگر آپ نے کوئی پل۔ سڑک رفاہ عام کے لیے بنا دی۔ اور اس سے لوگ متمتع ہونے لگے ان سب صورتوں میں آپ کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی اور اسی میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر آپ نے کسی لائبریری میں زکوٰۃ کی رقم سے کتابیں وقف کر دیں یا کوئی مسافر خانہ یا سرائے بنا دی تو آپ کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ تملیک ہو۔ زکوٰۃ ہی پر تمام صدقات کو بھی قیاس کر لیجئے۔ اگر آپ نے کچھ لوگوں کو گھر بلا کر کھانا کھلایا تو یہ صدقہ نہیں یہ ضیافت ہے صدقہ کے لیے تملیک شرط ہے۔ اسی سے آپ میت کے ایصال ثواب کے لیے دیئے جانے والے کھانوں کا حکم معلوم کر سکتے ہیں۔ بہرحال زکوٰۃ ہو یا صدقہ اور یا ہبہ سب کے لیے اسلامی قانون تملیک ہے اور تملیک کے لیے قبضہ شرط ہے۔

ان مسائل میں چاروں ائمہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد اور امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ متفق ہیں جمہور امت میں اس موضوع پر کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔

مصارف زکوٰۃ پر ایک نظر

اگرچہ ملک کے غریبوں، فقیروں اور معذوروں کا مسئلہ مدینہ میں اسلامی حکومت کی نگاہ میں شروع سے تھا۔ لیکن آغاز میں غنیمت کے پانچویں حصے سے جو حصہ ان لوگوں کے لیے مقرر ہوا تھا اس وقت اجمالاً تین ہی تک بات محدود تھی۔ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل۔ لیکن اب زکوٰۃ فرض ہونے کے بعد قرآن میں باقاعدہ حاجت مندوں کی ایک تفصیلی فہرست نازل ہوگئی جس کا دائرہ ان تین کے علاوہ جن کا ذکر غنیمت کے پانچویں حصہ میں تھا یعنی یتامیٰ مساکین اور ابن السبیل آٹھ تک پھیلا دیا گیا۔ اور آغاز ہی میں للفقراء والمساکین کہہ کر مخاطب کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا کہ معاشی قوت حاصل کرنے کے لیے جن جسمانی اور عقلی قوتوں کی ضرورت ہے۔ اس سے وہ یکسر محروم ہیں۔ اسی طرح ایسے لوگ جن میں یہ قوتیں ابھری ہوں لیکن بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے جدوجہد کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے اور سوسائٹی میں وہ عاجز، کمتر اور مسکنت کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی حصول معاش کی قوتیں جن میں نہ ہوں یا حصول معاش کی قوتیں اور ذرائع بالکل مفقود تو نہ ہوں لیکن کچھ حالات اتفاقی کے شکار ہو کر معاشی ذرائع سے محروم ہوگئے ہوں مثلاً ناگہانی طور پر کسی بیماری کا حملہ ہوا اور علاج معالجہ میں کسی کا سارا سرمایہ ختم ہو جائے یا کاروبار میں یا زراعت میں اسے نقصان پہنچا ہو یا ایسے حوادث کے جو شکار ہوئے ہوں جیسے حضور اقدس کے زمانہ میں مہاجرین کا حال تھا۔ حوادث زمانہ میں ان ہی مبتلا ہونے والے ناداروں کو الفقراء کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن میں مہاجرین کے ساتھ فقراء کی صفت لائی گئی ہے حالانکہ حصول معاش کے لیے جن جسمانی و عقلی قوتوں کی ضرورت ہے وہ سب ان میں موجود تھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر ملک ہر سوسائٹی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ باوجود عدم معذوری کے کچھ کرنا بھی چاہیں تو کر نہیں سکتے کیونکہ کرنے کی ساری راہیں اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے بیروزگار تعلیم یافتہ طبقہ کی نوعیت کچھ ایسی ہی ہے یعنی باوجود سب کچھ رکھنے اور سب کچھ ہونے کے معاشی ذرائع ان پر بند ہیں۔ اسلام نے جہاں مانگنے والوں کے لئے سوال کو اس وقت تک حرام کیا ہے جب تک اضطرار کی حالت نہ ہو لیکن اسی کے ساتھ دینے والوں کو حکم ہے جیسا کہ فاطمہ بنت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مانگنے والے کا حق ہے خواہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے (البیہقی)

کیا معلوم گھوڑے سوار کی کیا حالت ہے جب کہ اس زمانے کے سائیکل سواروں کے بیشتر حالات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ اس فہرست میں قرآن نے پہلے الفقراء والمساکین کا ذکر کیا اور دونوں الفاظ

ان تمام لوگوں کو عام ہیں جو مندرجہ بالا سے موصوف ہوں۔ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاتح مصر سے کسی نے ان الفاظ کی تفسیر دریافت کی تو بطور مثال کے ان چند طبقات کا ذکر کر دیا۔

العمیان	اندھے
العرجان	لنگڑے
الکسحان	اپاہج
الیتامیٰ	یتامیٰ

اور فرمایا کل منقطع بہ ہر وہ شخص جو وجوہ معاش سے محروم ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ان حاجت مندوں پر یوں ہی لوگوں کی نگاہ پڑتی ہے ہر قوم اور ہر ملک کے ارباب ثروت ان کی امداد اپنا اخلاقی اور دینی فرض سمجھتے ہیں اگرچہ حکومتوں نے اپنی آمدنی میں ان کا کوئی مستقل حصہ نہیں رکھا ہے مگر خوشی و مسرت کے مواقع پر اندھوں لنگڑوں غریبوں کو جمع کر کے کھانا کھلا دیا جاتا ہے یا کچھ پیسے بانٹ دیئے جاتے ہیں لیکن اسلام کی نظر اس سے آگے پہنچی اس نے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کی اس کی وصولیابی کی ذمہ داری حکومت پر رکھ کر زکوٰۃ کی آمدنی کے اخراجات کے لیے اس کے آٹھ مصارف مقرر کر دیئے اور بتا دیا کہ ان مصارف کے سوا زکوٰۃ کی آمدنی کو خرچ کرنے کی حکومت مجاز نہیں ہے۔

ان مصارف میں ایک ضروری اور وقت کے تقاضے کے مطابق اہم مصرف غلاموں کی آزادی رکھا وفی الرقاب آج ابراہم لنکن اور ان جیسوں کا نام غلاموں کے آزاد کرانے میں بڑی عزت سے لیا جاتا ہے حالانکہ یورپ نے غلاموں کو آزاد کرنے یا کرانے کا بیڑہ اس وقت اٹھایا جب ترکوں اور عربوں اور دیگر مسلمان قوموں کے مقابلے میں ان کو اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا کہ جب تک ہم ہی لوگ غلامی کے انسداد پر رضامند نہ ہوں گے بری اور بحری راستوں سے یورپ کے بچوں اور عورتوں کو غلام بنانے کا طریقہ مسلمان نہ چھوڑیں گے آخر اس پر اتفاق ہوا۔ مسلمانوں کے خلیفہ کے سامنے مسئلہ پیش ہوا شیخ الاسلام نے نحن احق بمکارم الاخلاق کے ساتھ اس نیک کام پر لبیک کہا۔ خلیفہ کے دستخط ہو گئے کیونکہ ظاہر ہے کہ غلام بنانا اسلام میں نہ فرض ہے نہ واجب سنت اور نہ مستحب بلکہ دنیا کی قوموں نے جنگی تجربات کی وجہ سے قیدیوں کو قتل کرنے سے غلام بنا لینا آسان سمجھا تھا۔ غلام چونکہ ہمیشہ دشمن قوم کے افراد ہوتے تھے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ طبعاً نہ کیا جاتا تھا۔ جس کی داستان درد سے بھری ہوئی ہے اس جنگی صورت حال کے پیش نظر اسلام نے جنگی قیدیوں کے غلام بنانے کو جائز قرار دیا مگر اتنی ترمیم کر دی کہ جب تک وہ غلام رہیں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے حتیٰ کہ

کھانے پینے کی حد تک برابر رکھا جائے اور جب اس کا زمانہ آجائے تو اسلام میں صرف یہی نہیں بلکہ بیسیوں شکلیں قانونی اور اخلاقی مثلاً کفارات وغیرہ کے ذریعے غلام آزاد کرائے جاتے ہیں بلکہ قرآن نے نیکی کی ایک بہت اہم مد فك رقبة قرار دیا۔

اس کے ساتھ اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے کتابت کی بھی حوصلہ افزائی کی یعنی معاوضہ لے کر غلاموں کو آزاد کرنا ان سب آزادی کی تجاویز کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مصرف فی الرقاب بھی رکھ دیا۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ فی الرقاب سے بدل کتابت میں مدد کے ذریعے غلاموں کی خلاصی میں ہاتھ بٹانا ہے مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ:

الرقاب سے وہ غلام مراد ہیں جنہیں الزکوۃ کی مد سے خریدا جاتا ہے اور اس کے بعد آزاد کیے جاتے ہیں۔

یہ تو خیر غلاموں کی آزادی کی بات ہے لیکن ہر ملک اور ہر آبادی میں غلاموں سے بھی بدتر ایک اور طبقہ بھی ہے یہ اس لیے زیادہ قابلِ رحم ہے کہ اوروں کے ساتھ حکومت نہ سہی عوام انفرادی طور پر حسن سلوک کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں لیکن انسانیت کے جس طبقہ کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ بےکس محروم طبقہ ہے۔ جس کو کسی زمانے میں حکومتی یا انفرادی ہمدردی کا مستحق نہیں سمجھا گیا میری مراد مقروضوں کا طبقہ ہے یہ دنیا کا وہ مظلوم طبقہ ہے جس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک تو درکنار دنیا میں حکومتیں ان سے زبانی ہمدردی کی بھی روادار نہیں ہیں۔ ہر حکومت اپنے قوانین کے تحت اس تاک میں رہتی ہے کہ مقروضوں کے ذمے قرض خواہوں کا جو مطالبہ ہے صرف اصل ہی نہیں بلکہ سود در سود کے ساتھ اس سے وصول کرا دیا جائے اس راہ میں مقروضوں کی ساری جائداد گھر کا سارا اثاثہ ہی کیوں نہ فروخت ہو جائے مقروضوں کا یہ طبقہ خبر نہیں کن مشکلات میں مبتلا ہو کر قرض لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ مشکلات سے نجات دلانا تو درکنار بلکہ سود در سود کی زنجیر میں اور پھنستا جاتا ہے اور حکومت کی ساری مشینری اس کے درپے ہوتی ہے جب سب قرض خواہوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں قرآن نے قرضداروں سے ہمدردی کی ہے قرض کو دنیاوی کاروبار یا معاملہ سے نکال کر اوّل تو مقروض کو ایک اہم ترین انسانی ہمدردی کا مظہر قرار دیا اور پھر بالآخر زکوٰۃ کے مصارف کی مد میں الغارمین کے عنوان کے ساتھ قرضداروں کے مسئلہ کو حکومت کے ہاتھ میں دے دیا۔

اسلام کے قانون دان طبقہ کا اتفاق ہے کہ جو مقروض ہوں یا زراعت و تجارت یا اسی قسم کے کاروبار میں جن کو نقصان پہنچ گیا ہو بیت المال میں ہر سال ایک مد الغارمین ہونی چاہیے۔ مقروضوں کے متعلق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سربراہ مملکت کی حیثیت سے اعلان فرما دیا تھا۔

مرنے کے بعد جو مال چھوڑ جائے وہ تو اس کے ورثہ کا ہے لیکن اگر قرض چھوڑ کر مرا ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر یعنی حکومت پر ہے۔

ان اہم مدوں کے علاوہ ہر شہر اور ہر آبادی میں ایک اور طبقہ بھی ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں جب مواصلات کے ذرائع اتنے وسیع اور آسان نہ تھے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو مختلف کاروبار کے سلسلے میں اپنے ملک یا شہر سے پردیس جاتے ہیں۔ ان میں بسا اوقات حالات کے تحت کبھی ایسی صورت پیش آتی ہے کہ وطن میں خواہ کتنے امیر ہوں لیکن پردیس میں وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چونکہ پردیسی ہوتے ہیں اس لئے کسی سے ان کی نہ آشنائی ہوتی ہے اور نہ شناسائی۔ ایسی صورت میں ان کی حالت نہایت قابل رحم ہوتی ہے یوں تو پہلے زمانہ میں ایسے پردیسیوں کے ساتھ انفرادی طور پر حسن سلوک کرتے تھے اور عرب میں تو مہمان نوازی اور مسافروں سے ہمدردی کا خاص ذوق تھا لیکن جن قوموں اور ملکوں میں ذات پات یا قومیت اور وطنیت کا مرض شدت پذیر ہو جاتا ہے ان کے یہاں غریب مسافر کی بہت ہی درگت بن جاتی ہے اور یہ بیماری موجودہ تمدن مغربی کی وجہ سے اگرچہ بہت عام اور خطرناک ہو گئی ہے بہرحال انسانیت کا یہ طبقہ ہر ملک اور ہر قوم میں قابل توجہ بنا رہا ہے قرآن نے مصارف زکوٰۃ کی فہرست میں ابن السبیل کے نام سے اضافہ کیا اور اسلامی حکومت کے لیے قرآن نے ان کی خبر گیری کو بھی ایک اہم مسئلہ قرار دیا۔

آخر میں فی سبیل اللہ کے لفظ سے معاشرے کے ایسے افراد کو بھی مصارف زکوٰۃ میں داخل کر دیا جو زندگی کے مختلف گوشوں میں جماعت کا کوئی کام کرنا چاہتے ہیں لیکن فقر کی وجہ سے ان کے بس سے باہر ہے جہاد میں جانا چاہتے ہیں۔ حج کرنا چاہتے ہیں۔ بیرون ملک جا کر یا اپنے ہی ملک میں علم کی طلب میں جانا چاہتے ہیں۔ ان کے اخراجات کی کفالت اسی مد سے کی جانی چاہیے۔

دراصل یہ اسلام کا جدید اقدامی کارنامہ ہے کہ انسانیت کے اس کس مپرس پس ماندہ طبقہ کی باضابطہ اور منظم شکل میں صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ واقعی مالی اعانت کے لیے اسلامی حکومت کا کمر بستہ ہو جانا اور اس کو عملاً کر گذرنا انسانیت کی تاریخ میں دنیا کی حکومتیں اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسلام نے مصارف کی ان متعدد مدوں کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ کے نام سے جو محصول لوگوں پر عائد کیا ہے۔ یعنی خزانہ حکومت پر جب ان جدید اخراجات کا بوجھ ڈالا تو اسلام نے ان اخراجات کی پابجائی کے لیے زکوٰۃ کے نام سے محصول عائد کر دیا تاکہ خزانہ حکومت متاثر نہ ہو اور اس کی تعمیل میں کبھی کوئی کوتاہی نہ ہو لیکن اس محصول کے لیے جن حکمتوں اور مصلحتوں سے کام لیا ہے عام لکھنے والوں نے ان پر غور نہیں

کیا ہے۔ میں ان میں سے کچھ عرض کرتا ہوں۔

زکوٰۃ کے مصالح و نکات

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ان ہشتگانہ مصاریف کی بجا آوری کی خاطر اسلام جن لوگوں پر محصول عائد کرنا چاہتا ہے ان کے لیے اسلام نے اس رعایت کا اعلان کیا کہ جو لوگ اس کے ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں گے ان کو سرکار کے تمام مالی مطالبات سے سبکدوش کر دیا جائے گا یعنی زمین کا خراج جو ہر حکومت کا حق ہے اس سے اس مد کا محصول ادا کرنے والوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔

۲۔ اسلام یہ محصول ملک کے ہر باشندے پر عائد نہیں کرتا ہے بلکہ یہ تمام مطالبات صرف ان لوگوں تک محدود رکھے گئے ہیں جو اپنی اور اپنے زیر پرورش متعلقین کے روزمرہ معمولی مصارف کی تکمیل کے بعد اپنے پاس کچھ پس انداز کر سکتے ہوں۔ اصطلاحاً اسی کا نام نصاب ہے اور ہر چیز کا نصاب اسلام نے جدا جدا رکھا۔

۳۔ اس کے بعد بھی یہ مطالبات ہر قسم کی مملوک پر عائد نہیں ہوتے بلکہ صرف ان چیزوں پر عائد ہوتے ہیں جو نامی ہوں یعنی جن میں پیداواری صلاحیت ہو جیسے تجارت زراعت۔ بغرض افزائش نسل جن مویشیوں کی پرورش کی جاتی ہے یا نقد سرمایہ بہ شکل سونا ہو یا چاندی ظاہر ہے کہ آدمی ان کو بڑھا سکتا ہے اور ان سے پیداوار کر سکتا ہے بلکہ پیداوار کے عام ذرائع دنیا میں یہی ہیں اسی لیے ان کو نقدین کہتے ہیں۔

۴۔ زکوٰۃ میں اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ جن چیزوں کے حصول میں زیادہ محنت اور کدوکاوش ہوتی ہو اسی نسبت سے مطالبہ میں تخفیف کی جائے اور جس حد تک اس کی پیدائش میں محنت کم اور قدرتی وسائل کو زیادہ دخل ہو محصول میں اضافہ ہو گا۔ تجارتی اموال اور سونا چاندی سے آمدنی حاصل کرنے میں پورا وقت صرف کرنا پڑتا ہے اس لیے اس میں چالیس روپے میں ایک روپیہ لیا جاتا ہے۔ برخلاف کاشت کے کہ اگر اس کی سیرابی وغیرہ میں مصنوعی ذرائع سے کام لینا نہ پڑے بلکہ قدرتی بارش یا نہروں کے پانی سے سیرابی ہو جائے تو دس من میں سے ایک من یعنی دسواں حصہ اور اگر مصنوعی ذرائع سے کام لینا پڑے تو بیسواں حصہ یعنی دس من میں سے بیس سیر۔ اور اگر کسی کو خزانہ یا دفینہ مل جائے تو اس میں پانچواں حصہ اور یہی حکم کانوں یعنی سونے چاندی لوہے۔ سیسہ پیتل کی معادن کا ہے ہاں البتہ ایسے مویشی جن کا زیادہ وقت چراگاہ اور جنگل میں گذرتا ہو جن کو السوائم کہتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے ان میں ہر قسم اونٹ کا الگ گائے بیل کا الگ۔ بکریوں بھیڑوں کا الگ الگ نصاب مقرر کیا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی وہی چالیسویں حصہ کا عمل ہوا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ عرب میں

زیادہ تر ان ہی جانوروں کی پرورش بطور ذریعہ معاش کی جاتی تھی لیکن جب ایسے ممالک فتح ہوئے جہاں گھوڑوں کا کاروبار ہوتا تھا۔ جیسا کہ شیخ ابن الہمام کہتے ہیں۔

زمانہ نبوت میں مسلمانوں کے کسی طبقہ میں گھوڑوں کی پرورش افزائش نسل کی خاطر رواج نہ تھا بلکہ اونٹوں وغیرہ کا رواج تھا کیونکہ گھوڑوں کی پرورش کرنے والے اس زمانے میں یا مدائن کے باشندے تھے یا دشت کے یا ترکمانی اور ان علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ حضرت عثمان و عمر کے زمانے میں ہوا۔ لہ

بہر حال جب یہ ملک فتح ہوئے تو گھوڑوں پر زکوٰۃ کا مسئلہ سامنے آیا تو حضرت عمر نے فیصلہ کیا۔

اس قسم کے گھوڑوں کے پالنے والوں کو اختیار ہے۔ چاہیں تو ہر گھوڑے کی زکوٰۃ ایک دینار ادا کریں اور چاہیں تو یہ بھی کر سکتے ہیں کہ گھوڑے کی قیمت لگا کر ہر دو سو درہم سے پانچ درہم زکوٰۃ ادا کریں ——

جب دو سو درہم سے پانچ درہم کا یہاں بھی فیصلہ کیا تو وہی چالیسواں حصہ ہوا اس لیے قیاس یہی ہے کہ غالباً مویشیوں میں بھی چالیسویں حصے کے اصول کو ملحوظ رکھا ہو۔

۵۔ عام طور پر جن اموال پر محصول عائد کیا جاتا ہے عموماً ان کا محصول اسی وقت وصول نہیں کیا جاتا جس وقت مالک کی ملک میں وہ چیز آتی ہو بلکہ مالک ہونے کے بعد کامل ایک سال گزرنے کی ضرورت ہے یہ عام دستور ہے صرف زراعت اس سے مستثنیٰ ہے۔

۶۔ اس پر بڑی شدید تاکید ہے کہ حکومت کی خراجی وغیرہ آمدنیوں کو اس آمدنی سے بالکل الگ رکھا جائے یعنی مذکورہ بالا مصیبت زدہ طبقات کی امداد کے لیے جو آمدنی حاصل کی جاتی ہے۔ اس کا خاص نام الصدقات ہے اور الصدقات کے متعلق یہ حکم ہے کہ اس رقم کو حکومت کی دوسری آمدنیوں میں نہ ملایا جائے اور نہ خراجی مصارف میں اس آمدنی کا کوئی حصہ خرچ ہو سکتا ہے۔ قاضی ابو یوسف نے ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے سخت تہدیدی لہجے میں یہ فتویٰ دیا ہے۔

جائز نہیں ہے کہ خراج کی آمدنی الصدقات اور العشور کی آمدنی کے ساتھ جمع کی جائے۔ کیونکہ خراج تو ہر قسم کے مسلمانوں کی مشترکہ آمدنی ہے اور الصدقات تو صرف ان ہی لوگوں کے لیے ہیں جن کا ذکر قرآن میں اللہ سبحانہ نے کیا ہے۔

لہ فتح القدیر ج ۱ ص ۵۰۰

بلکہ قاضی ابو یوسف نے یہاں تک تاکید کی ہے کہ زکوٰۃ اور خراج کے عامل تحصیلدار بھی الگ الگ ہوں۔ لکھا ہے خراج کے تحصیلداروں کے ہاتھ میں الصدقات کی آمدنی کی وصولی کا مسئلہ نہ سپرد کیا جائے اور نہ یہ جائز ہے کہ الصدقات کی آمدنی کو خراج کی آمدنی میں ملایا جائے۔

۶۔ جس علاقہ یا تعلقہ سے زکوٰۃ وصول کی جائے سب سے پہلے ان صدقات کے مستحق اسی علاقہ کے مندرجہ بالا طبقات کے اہل حاجت ہیں۔

ایک شہر سے دوسرے شہر صدقات کو منتقل کرنا مکروہ ہے بلکہ ہر فریق کا صدقہ ان ہی لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔ (ہدایہ)

شیخ ابن الہمام نے بھی لکھا ہے۔

زکوٰۃ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آمدنی کس جگہ سے وصول ہوتی ہے۔

اس باب میں رسول اللہ ﷺ کی صحیح مشہور حدیث ہے۔

جس علاقہ کے اغنیاء سے صدقات وصول کیے جائیں اسی علاقہ کے غرباء میں تقسیم کیے جائیں۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ کسی جگہ الصدقات کے تحصیلدار بنا کر روانہ کیے گئے۔ کچھ روز کے بعد جب واپس ہوئے تو لوگوں نے دریافت کیا کہ مال کہاں ہے فرمایا۔

کیا آمدنی لانے کے لیے تم نے ہمیں روانہ کیا تھا۔ ہم نے تو جہاں سے لیا اسی جگہ تقسیم کر دیا۔ حضور اقدس ﷺ کے زمانہ مبارک میں یہی دستور تھا کہ جہاں سے لیتے وہیں تقسیم کر دیتے تھے۔ (سنن بیہقی)

البتہ اگر وہاں کی ضرورت سے بچ جائے تو باقی ماندہ حصہ مرکز کے خزانہ میں جمع کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یمن وغیرہ کے صدقات آتے تھے۔ بہر حال کلیہ یہی ہے کہ الصدقات کو پہلے اس مقام کے مستحقین میں تقسیم کیا جائے جہاں کے ارباب حیثیت سے وصول کیا گیا ہے۔ خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ بعض فقہاء نے تو مختلف حدیثوں کی وجہ سے یہاں تک بتا دیا ہے کہ:

یہ زیادہ بہتر ہے کہ الصدقات کی آمدنی کو جن سے وصول کیا گیا ہے ان کے محتاج بھائیوں میں تقسیم کیا جائے پھر اس کے بعد اس کا استحقاق بھائی کی اولاد کا ہے۔ پھر محتاج چچاؤں کا۔ پھر ماموؤں کا۔ پھر عام رشتہ دار پھر پڑوسی۔ پھر جو لوگ اس شہر میں رہتے ہوں جس پر صدقہ ادا کرنے والا رہتا ہے[1]

[1] فتح القدیر

زکوٰۃ کی وصولی اور مصارف کے بارے میں اسلام نے جو قانون بنایا ہے اس کی موٹی موٹی باتیں آپ کے گوش گذار ہو چکی ہیں۔ صرف دو چیزیں باقی ہیں آخر میں وہ بھی سن لیجئے۔

اغنیاء کو زکوٰۃ نہ دینی چاہیے

ایک تو یہ ہے کہ جس طرح زکوٰۃ کی آمدنی کو خراج اور جزیہ کی آمدنیوں سے بالکل جدا رکھنے کا حکم ہے اسی طرح یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اس مد کی آمدنی کا ایک حصہ کسی ایسے آدمی کو نہیں مل سکتا جو اسلامی نقطہ نظر سے غنی اور صاحب حیثیت ہو۔ غنی سے مراد یہ نہیں کہ وہ ہزاروں کا مالک ہو بلکہ ملک کا ہر ایسا باشندہ جو اپنی اور اپنے اہل عیال کے روزمرہ مصارف کے سوا دو سو درہم یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کے برابر کسی سرمائے کا مالک ہو، اس کے لیے زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک حصہ بھی حرام ہے۔ اس معاملہ میں کتنی شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی مشکیزے میں دودھ لیے آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی ایک پیالہ اس میں سے ملا۔ دودھ کچھ مزے دار تھا۔ آپ نے پوچھا کہ کہاں سے لائے ہو۔ بولا کہ فلاں گاؤں کی چراگاہ پر گیا تھا۔ وہاں الصدقات کے اونٹ چر رہے تھے۔ ایک اونٹنی کا لوگ دودھ دوہ رہے تھے۔ میں نے بھی تھوڑا سا مانگ کر اپنی چھاگل میں رکھ دیا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی راوی کا بیان ہے۔

اپنی انگلی منہ میں ڈالی اور زور لگا کر قے کر ڈالی۔

بہرحال قانونی غنی کے لیے اس مال کا ایک ایک پیسہ حرام ہے لیکن جو لوگ قانونی طور پر تو غنی نہیں ہیں لیکن شب و روز کی خوراک سے زیادہ ان کے پاس سامان ہو۔ ایسے لوگوں کے لیے حرام تو نہیں لیکن زکوٰۃ میں سے مانگنا اس کے لیے بھی حرام ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف ان مصیبت زدہ طبقات کے لیے اسلامی حکومت نے اپنے خزانے میں یہ انتظام کر رکھا تھا لیکن اس کے ساتھ اس کی نظر اس پر بھی تھی کہ کہیں خزانے کی اس مد پر بھروسہ کر کے بے کاری کے لوگ عادی نہ ہو جائیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر خاص نظر تھی۔ جب کوئی زکوٰۃ کی مد سے مانگنے والا آتا تو آپ ایک خاص نظر سے اس کو دیکھتے اور نرمی سے مختلف پیراؤں میں اسے سمجھاتے جس کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ حتی الوسع صدقات کے مال سے صاحب استطاعت لوگوں کو پرہیز ہی کرنا چاہیے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ پر اور میرے اہل و عیال پر ایک وقت بڑی ہی عسرت کا آگیا میں گھبرا کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا کہ الصدقات کی مد سے کچھ میری مدد فرمائی جائے۔

کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے میرے عرض کرنے پر ارشاد فرمایا:

جو بے نیازی کا رویہ اختیار کرے گا خدا اسے بے نیاز رکھے گا اور جو دوسروں سے لینے میں احتیاط برتے گا۔ خدا بھی اس کی آبرو کی حفاظت کرے گا۔

حضرت ابوسعید پر حضور اقدس ﷺ کی اس نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ:

میں دوسروں سے مانگنے میں احتیاط کروں گا خدا میری آبرو بچائے گا اور میں اپنے کو لوگوں سے بے نیاز رکھوں گا اللہ مجھے غنی بنا دے گا۔

کہتے ہوئے واپس ہوئے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اپنے اس استعفاف اور استغنا کے نتائج بالآخر اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھے کہ:

ہم پر دنیا کی دولت کا سیلاب آگیا اور ہمیں غرق کر ڈالا صرف وہ ہی بچے جن کو اللہ نے بچالیا۔

اس کاہلی اور بے عملی کے خطرے کے انسداد کے لیے حضور اقدس ﷺ عام مجلسوں میں جہاں اور باتیں فرماتے ایک فقرہ یہ بھی ارشاد فرماتے۔

الید العلیا خیر من الید السفلی	اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے

حتی الامکان لوگوں کو بتایا جاتا کہ زکوٰۃ لینے سے بچنے کی کوشش کرو اور اس پر اصرار فرماتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی خداداد قوتوں سے روزی حاصل کی جائے۔

حضور اقدس ﷺ کے رشتہ داروں پر زکوٰۃ

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور آپ ﷺ کے اقارب کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی ہے۔ یعنی آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے رشتہ داروں پر زکوٰۃ کی آمدنی حرام ہے۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میرا خیال ہے کہ جس وقت الصدقات کا فریضہ نازل ہوا بدگمانوں کو شائد اندیشہ ہو سکتا تھا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی اور اپنے خاندان والوں کی معاشی مشکلات پر قابو پانے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی ہے۔ اسلام سے پہلے مذہبی نمائندگی کے لیے صفات سے زیادہ ذاتی اور نسبی خصوصیات کو زیادہ دخیل سمجھا جاتا تھا ہندوستان میں بھی یہ عہدہ صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو برہمنوں کی نسل سے ہوں۔ اور یہی حال اکثر تقریباً غیر اسلامی سوسائیٹیوں کا ہے غالباً یہی ایک مصلحت تھی جس کی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے خود اپنے اوپر اور اپنے خاندان والوں پر خواہ وہ غربت و فقر کے کسی حال میں ہوں زکوٰۃ کی آمدنی کو قطعی طور پر حرام کر دیا۔ اس سلسلہ میں

حضور اقدس ﷺ کے احساسات اس قدر لطیف تھے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام بچے تھے۔ زکوٰۃ کی کھجور کا ایک ڈھیر سامنے تھا۔ ڈھیر کے پاس پہنچ گئے اور صرف ایک کھجور منہ میں ڈال لی۔ حضور اقدس ﷺ کی نگاہ پڑ گئی۔ جھپٹ کر دوڑے اور فرمانے لگے۔

کخ کخ ارم بھا۔ تھو تھو اسے پھینک دے۔

اور فرمانے لگے

کیا تجھے پتہ نہیں ہے کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے ہیں۔

بعض روایات میں الفاظ ہیں۔ ہم لوگوں کے لیے صدقہ کا مال جائز نہیں ہے حضور اقدس ﷺ کے جن اقارب پر زکوٰۃ کا مال حرام ہے ان میں حضرت علی حضرت عباس حضرت جعفر اور عقیل اور حارث بن عبدالمطلب ﷺ کی اولاد ہیں ان سب پر زکوٰۃ کی آمدنی سے استفادہ حرام ہے ـــــ بلکہ قانون دانوں نے یہاں تک بتایا ہے کہ ہاشمی کی زکوٰۃ ہاشمی کے لیے بھی جائز نہیں ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تو بنو ہاشم کے موالی کے لیے زکوٰۃ کی آمدنی پر قدغن قائم کرتے ہیں۔ یہی امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کی رائے ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ فریضۃ من اللہ واللہ علیم حکیم یہ بات کو موکد بنانے کے لیے ہے یعنی تقسیم زکوٰۃ کا یہ قانون اور زکوٰۃ کی آمدنی کے یہ مصارف اللہ نے مقرر فرمائے ہیں۔ اس میں کسی انسان کی رائے کو دخل نہیں ہے۔ شائد ابوداؤد میں زیاد بن الحارث کی روایت میں حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد گرامی آیت میں اسی انداز بیان سے مستنبط ہے کہ

اللہ سبحانہ نے صدقات کے موضوع پر نبی اور غیر نبی کے فیصلہ کو پسند نہیں فرمایا خود فیصلہ فرما کر ہشتگانہ مصارف مقرر فرما دیئے۔

واللہ علیم یعنی لوگوں کے اموال اور ان کے مرتبہ استحقاق کو اللہ سبحانہ خوب جانتا ہے۔ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ اپنے علم کی وجہ سے کیا ہے۔ اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے ضوابط اور قوانین میں بندوں کے مصالح کی رعایت کرتا ہے۔ اللہ کے علم و حکمت تک مخلوق کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۚ
قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ
وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ
اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦١﴾ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ
وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَن يُرْضُوهُ إِن كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٦٢﴾
أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَن يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ
الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ﴿٦٣﴾ يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَن تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ
سُورَةٌ تُنَبِّئُهُم بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلِ اسْتَهْزِئُوا إِنَّ
اللَّهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ﴿٦٤﴾ وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ
إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ
كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ﴿٦٥﴾ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ
إِيمَانِكُمْ ۚ إِن نَّعْفُ عَن طَائِفَةٍ مِّنكُمْ نُعَذِّبْ
٨ ع ١٣ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٦٦﴾

اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں اور کہتے ہیں وہ تو سب کچھ
سنتا ہے اور سب کی سنتا ہے کہہ دو کہ وہ سب کچھ اور سب کی سنتا ہے مگر تمہاری بہتری

کے لیے سنتا ہے وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان کی بات مانتا ہے اور وہ تم میں سے اہل ایمان کے لیے سراپا رحمت ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کریں۔ حالانکہ اگر یہ واقعی مومن ہوتے تو سمجھتے کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حقدار ہے کہ اسے راضی رکھیں [۶۳]۔ کیا ان کو پتہ نہیں ہے کہ جو بھی اللہ و رسول کا مقابلہ کرتا ہے اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ سدا رہے گا اور یہ بڑی رسوائی ہے [۶۴]۔ منافقوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ان کے بارے میں کوئی ایسی سورت نازل ہو جائے جو ان کے دلوں کی باتوں کو علانیہ ظاہر کر دے اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم مذاق کرو بلاشبہ اللہ ان چیزوں کو ظاہر کر کے رہے گا جن کا تمہیں اندیشہ ہے [۶۵]۔ اور اگر آپ ان سے دریافت کریں تو وہ ضرور کہیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ کیا تم اللہ، اللہ کے احکام اور اللہ کے رسول سے ہنسی مذاق کر رہے تھے [۶۶]۔ بہانے نہ بناؤ تم نے ایمان کے بعد راہ کفر اختیار کی ہے۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف بھی کر دیں تاہم کچھ کو ضرور سزا دیں گے کیونکہ اصل میں یہی لوگ جرائم پیشہ تھے [۶۷]۔

مفردات کے معانی

اذن کان جیسے آذان جمع اور مجازاً اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو کان لگا کر سنے اور سن کر مانے اور علامہ جوہری

فرماتے ہیں کہ رجل اذن اس کے لیے بولا جاتا ہے جو ہر ایک کی بات سن لے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے جاسوس کو عین کہتے ہیں۔

یومن باللہ ویومن للمومنین ایمان کو با اور لام کے ساتھ استعمال کیا ہے ایمان کا صلہ جب بار ہو تو اس کے معنے تصدیق کرنا اور جب لام ہو تو اعتماد کرنا مان لینا ہوتا ہے

یحادد یہ مضارع کا واحد مذکر غائب ہے محادۃ سے مادہ حد ہے حد کے معنے سمت اور جانب کے ہیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہونا۔

الخزی ذلت رسوائی باب سمع سے خَزِیَ یخزٰی ہے وہ ذلت جس میں رسوائی اور بدنامی ہو۔

یحذر اندیشہ ناک ہونا ڈرنا حَذِرَ یحذر باب سمع سے آتا ہے۔ حذر محفوظ ہونا حِذر بچاؤ کو کہتے ہیں۔

سورۃ سورت علامہ زمخشری کشاف میں رقم طراز ہیں سورت قرآن کے متعینہ حصّہ کا نام ہے۔ یہ کم سے کم تین آیت کی ہے۔ اور اس میں واؤ اگر اصل ہے تو یا سورۃ المدینہ پر موسوم ہے جس کے معنے شہر پناہ کے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی قرآن کا ایک محدود ٹکڑا ہے اور یا اس لیے کہ فنون علمیہ اور انواع واقسام کے قواعد پر مشتمل ہے جس طرح شہر پناہ اپنے اندرون کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ اور یا اس سورۃ سے موسوم ہے جس کے معنے رتبہ کے ہیں۔ اس نام کی وجہ یا تو یہ ہے کہ سورتیں بھی بمنزلہ درجوں کے ہیں جن پر قاری ترقی کرتا جاتا ہے۔ نیز خود سورتیں طوال اوساط اور قصار پر مرتب ہیں ـــــ اور یا یہ کہ دین میں ان کی رفعت شان اور جلالت مرتبہ مسلم ہے۔ اور اگر اس کے واؤ کو ہمزہ سے بدلا ہوا کہا جائے تو جیسے سؤۃ کے معنے کسی چیز کے بقیہ حصّہ کے ہوتے ہیں۔ یہ بھی قرآن کا ایک ٹکڑا اور حصّہ ہے [1]

لاتعتذروا۔ تم عذر نہ کرو بہانے مت بناؤ صیغہ نہی ہے اعتذار سے جس کے معنے عذر بیان کرنے کے ہیں۔ عذر انسان کا کسی ایسی بات کو تلاش کرنا ہے جو اس کے گناہوں کو سمیٹ دے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں مثلاً یہ کہنے لگے کہ میں نے کیا ہی نہیں یا کیا تو ہے مگر اس لیے کیا ہے اور اس سلسلے میں ایسی بات پیش کرنے لگے جس سے بے گناہی ثابت کرے یا یوں کہے کہ کیا تو ضرور ہے مگر آئندہ نہ کروں گا۔ اس قسم کی باتیں عذر کہلاتی ہیں۔ اور اس آخری سورت کا نام توبہ ہے۔ پس ہر توبہ عذر میں داخل ہے لیکن ہر عذر توبہ نہیں ہے بلکہ بعض اعذار توبہ ہوتے ہیں۔

---

[1] الکشاف

نفاق کا حال اور استقبال

حضور اقدس ﷺ بعض مسلمانوں کا اخلاص پہچانتے اور انہیں قابلِ اعتماد سمجھتے تھے یہ بات منافقوں پر شاق گذرتی تھی حتیٰ کہ کچھ نے کہا وہ کان کے کچے ہیں لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی منافقانہ روش پر عام برہمی پیدا ہو گئی تو قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو یقین دلاتے اور انہیں اپنے سے راضی رکھنا چاہتے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی گمراہی کی بوالعجبیوں میں سے ایک عجیب بوالعجبی یہ ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھنے کا مدعی ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ تاہم ہر طرح کے گناہ کیے جاتا ہے اور ایک لمحہ کے لیے اسے خیال نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہا ہوں لیکن جونہی انسانوں کی نظر میں اس کے گناہ نمایاں ہونے ہیں اس کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں اور ہزار طرح کے جتن کرتا ہے کہ کہیں وہ اسے برا نہ سمجھنے لگیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا ایمان صرف علم کے درجہ تک کا ہے تصدیق کے درجہ کا نہیں۔ حالانکہ ایمان کے معنے جاننا اور سمجھنا نہیں بلکہ یقین کرنا باور کرنا ہیں۔ اگر ایمان تصدیق و یقین کے درجہ میں ہوتا۔ اس درجہ کا یقین جس درجہ کا یقین انسانوں کی موجودگی کا رکھتا ہے تو ممکن نہ تھا کہ اس سے بے پروا ہو جاتا۔ قرآن کے نزدیک یہی نفاق کی حالت ہے۔

حافظ ابن تیمیہ، حسن بصری سے نقل کرتے ہیں کہ ایمان صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ کا نام نہیں بلکہ ایمان وہ ہے جو کہ دل میں سرایت کر جائے اور اعمال بھی اس کی تصدیق کریں بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اعمال انسان کی کیفیات قلبیہ کا مظہر ہیں۔ اگر وہ نیک عملی کی زندگی بسر کرتا ہے تو یہ اس کی قلبی تصدیق کی دلیل ہے ورنہ اس کی گناہوں سے آلود زندگی خود اس کی بے ایمانی کی شاہد ہو گی۔

یہاں امام غزالی کی تحقیق حقیقت حال کی سب سے اچھی تعبیر ہے وہ فرماتے کہ باطن و ظاہر بالکل دو جداگانہ عالم نہیں ہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں بلکہ ہر دو کا باہمی ایسا گہرا تعلق ہے کہ ہمیشہ ایک کا دوسرے پر انعکاس ہوتا رہتا ہے۔ اگر اعتقاد باطن اعمال ظاہر کا مقتضی ہوتا ہے تو اعمال ظاہرہ اعتقاد باطن کے ممد و معاون رہتے ہیں۔ دیکھو اگر ایک شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ یتیم پر رحم کرنا انسان کا اولین فرض ہے تو اس کے اس عقیدہ کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ وہ اس کے لیے سراپا رحمت بن جائے۔ پھر جب اس کے اعضاء جوارح میں اس دلسوزی کے لیے حرکت ہوتی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اعتقاد میں ایک نئی روح داخل ہو رہی ہے اور جتنا جتنا اس کا تلطف و ترحم کا یہ عمل ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کے باطن میں شفقت و رحمت کا جوش زیادہ ہوتا جاتا ہے غرض صفات قلبیہ کا یہی حال ہے پہلے وہ اعضاء میں جنبش عمل کرتی ہیں اور جب جوارح مصروفِ عمل

ہو جاتے ہیں ان کے آثار لوٹ کر پھر ان صفات کو اور منور کرتے ہیں۔ ایمان وعمل کا یہی حال ہے ایمان ایک یقین لازم ہے اس کا ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ جوارح توحید خالص اور تصدیق رسالت کی اپنے عمل سے گواہی دیں اور جب اعضاء اس تقاضے کو پورا کرنا شروع کرتے ہیں تو ایمان اور راسخ ہو کر تر و تازہ اور سرسبز ہونے لگتا ہے۔ اب یہ آپکے اختیار میں ہے کہ آپ اعمال کو ایمان کے اجزاء کہیں جیسا محدثین کا مذہب ہے یا اعمال کو ایمان کے نتائج کہیں جیسا کہ فقہاء کا مذہب ہے۔

(۶۲) اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو کان ہیں۔ سب کچھ سنتے ہیں اور سب کی سنتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ سب کچھ اور سب ہی کی سنتے ہیں۔ مگر تمہاری بہتری کے لیے سنتے ہیں۔ اس کا اللہ پر ایمان ہے اور اہل ایمان پر اعتماد ہے۔ اور وہ تم میں سے اہل ایمان کے لیے سراپا رحمت ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ منافقین آپس میں بیٹھ کر اسلام و پیغمبر اسلام کے متعلق بدگوئی کرتے۔ جب کوئی کہتا کہ ہماری یہ باتیں پیغمبر ﷺ تک پہنچ جائیں گی تو کہتے کیا پرواہ ہے۔ ان کے سامنے ہم جھوٹی تاویلیں کر کے اپنی براءت کا یقین دلا دیں گے کیونکہ وہ کان ہی کان ہیں۔ جو سنتے ہیں فوراً تسلیم کر لیتے ہیں ان کو باتوں میں لے آنا کچھ مشکل نہیں۔ بات یہ تھی کہ حضرت اپنے حیاء، دوقار اور کریم النفسی سے جھوٹے کا جھوٹ پہچانتے تب بھی نہ پکڑتے۔ خلق عظیم کی بنا پر معاف فرماتے۔ وہ بیوقوف جانتے کہ آپنے سمجھا ہی نہیں ہے حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اگر وہ کان ہی ہیں تو تمہارے ہی بھلے کے واسطے ہیں۔ نبی کی یہ ادا تمہارے حق میں بہتر ہے۔ نہیں تو اول تم ہی پکڑے جاؤ گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور کی اس چشم پوشی اور خلق عظیم پر کسی وقت مطلع ہو کر تمہیں ہدایت ہو جائے۔ تمہاری جھوٹی باتوں پر حضور اقدس ﷺ کا سکوت اس لیے نہیں کہ انہیں واقعی تمہارا یقین آجاتا ہے۔ یقین تو ان کو اللہ پر ہے اور ایمانداروں کی بات پر۔ ہاں تم میں سے جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے حق میں آپ کی خاموشی و اغماض ایک طرح کی رحمت ہے کہ فی الحال منہ توڑ تکذیب کر کے ان کو رسوا نہیں کیا جاتا۔ باقی منافقین کی حرکات شنیعہ خدا سے پوشیدہ نہیں۔ رسول کی پیٹھ پیچھے جو بدگوئی کرتے ہیں یا ھو اذن کہہ کر آپ کو ایذا پہنچاتے ہیں اس پر سزائے سخت کے منتظر رہیں[1]

اس آیت میں بھی کچھ منافقین کا چہرہ پیش کیا گیا ہے سب میں ساری باتیں یک جا نہ تھیں۔ کچھ باتیں کچھ میں اور کچھ کچھ میں پائی جاتی تھیں سب کا کردار ایک نہ تھا۔ کردار کے اعتبار سے ان منافقین میں تنوع تھا۔ اسی تنوع کو بتانے کے لیے منہم کا تکرار ہوا ہے۔ یہاں جو کردار پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جناب نبوت میں ان کی بدگمانی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ تھی کہ ان کے خیال میں حضور اقدس ﷺ کو کچھ خبر نہیں ان سے جو کچھ کہہ دو اسے باور کر لیتے ہیں اس لیے وہ کہتے ہیں ھو اذن آپ تو نرے کان ہی کان ہیں آپ کو دھوکہ دینا بڑا آسان ہے یہ انداز تعبیر عربی میں اُس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کان کا کچا ہو اور دھوکہ میں آسکتا ہو۔ یہ یا تو مجاز مرسل ہے اذن بول کر ذات گرامی مراد ہے یا بطور مبالغہ کے زید عدل کے انداز پر مجاز عقلی ہے۔ اور مبالغہ ہر بات کے سن لینے میں ہے۔ اگر مجاز عقلی ہے تو جیسے زید عدل میں مدح کا پہلو ہے ٹھیک اسی طرح ھو اذن میں ہجو کا پہلو ہے یعنی بس وہ نرا کان ہے ہر ایک کی بات سن لیتا اور اسے مان لیتا ہے۔ ہجو اس لیے ہے کہ بڑے لوگوں پر حاسدین اور منافقین اسی انداز سے الزام لگایا کرتے ہیں کہ ہے تو بڑا آدمی مگر کان کا کچا ہے ہر ایک کی بات سن لینا جہاں کسی شخص کی شرافت کی دلیل ہے یہ اس کی سادگی بھولے پن اور عقل سے بیگانہ ہونے کی بھی دلیل ہے۔ منافقین یہ لفظ حضور اقدس کے لیے ان ہی معنے میں بولتے تھے۔ وہ اپنی نجی مجلسوں میں۔ اللہ، اللہ کے رسول اور احکام الٰہی کا مذاق اڑاتے اگر اسی مجلس میں کوئی منافق کہتا۔ ایسا نہ کرو کہیں ہمارے کرتوت کا حضورؐ کو علم نہ ہوجائے تو دوسرا جواب دیتا کہ اگر خبر ہو بھی جائے گی تو کچھ فکر نہیں آپ تو ہر بات اور ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں ہر ایک کے دھوکہ میں آجاتے ہیں اگر ایسا ہوا ہم جاکر باتیں بناویں گے اور دھوکہ دے کر کام نکال لیں گے۔

اس کے جواب میں قرآن نے بتایا کہ آپؐ ان سے کہہ دیجئے کہ ہوں تو میں سراپا گوش لیکن سراپا گوش تمہاری بھلائی کے لیے ہوں قل اذن خیر لکم یعنی میں فساد اور شر کی باتوں کو سننے والا نہیں بلکہ صرف انہی باتوں کو سنتا ہوں جن میں خیر اور صلاح ہے اور جن کی طرف توجہ دینا امت کی بہتری اور دین کی مصلحت کا تقاضا ہے ان کے کان ہر وقت اس تمنا میں کھلے ہوئے ہیں کہ ان میں تمہاری اچھی باتوں اچھے کاموں اچھے ارادوں کی خبریں آویں اور ان سے ان کو خوشی ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ کے خیر کے کان ہیں شر کے کان نہیں۔ حق و باطل اور خیر و شر کا فرق آپ پر مخفی نہیں ہے۔ نور نبوت کے ذریعے آپ سچ اور جھوٹ کو پہچان لیتے ہیں مگر بردباری اور چشم پوشی کی بنا پر سن کر خاموش ہوجاتے اور کریمانہ عادت کی بنا پر صراحۃً تکذیب نہیں کرتے۔ اور علانیہ طور پر ان کو رسوا نہیں کرتے۔

حضور اقدس کی یہ عادت مبارکہ تمہارے حق میں بہتر ہے ورنہ شروع ہی سے تمہاری گرفت ہوجاتی۔ ان منافقین نے آپ کی چشم پوشی اور مسامحت سے یہ سمجھا کہ حضور اقدس نے ہمارے جھوٹ کو سمجھا نہیں ہے اللہ سبحانہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا تمہاری باتوں کو سن لینا اور اس پر سکوت فرمانا اس کی دلیل نہیں کہ حضور اقدس کو تمہاری باتوں کا یقین آجاتا ہے۔ یہ تمہاری باتوں پر یقین نہیں کرتے بلکہ یومن

باللہ ویومن للمومنین ان کا ایمان اللہ پر ہے اور وہ صرف وہ بات باور کرتے ہیں جو سچے اور پکے اہل ایمان کے ذریعے ان کو پہنچتی ہے۔ اللہ سبحانہ اگر تمہارے بارے میں کوئی خبر دیں تو اس سے سچی اور پکی خبر اور کیا ہو سکتی ہے پیغمبر کو اس پر یقین ہوتا ہے اور کچھ اہل ایمان کے ذریعے پیغمبر کو تمہارے بارے میں کچھ باتیں معلوم ہوں تو اللہ کا رسول ان پر اعتماد کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے متعلق حضور اقدس کے معلوماتی ذرائع بے حد مضبوط ہیں ہوائی نہیں ہیں پیغمبر ایسے ہوتے نہیں کہ وہ ہوائی باتوں پر کان دھریں اور رائے قائم کریں۔

ورحمۃ للذین امنوا منکم حضور اقدس ﷺ کی ذات گرامی تم میں سے ان لوگوں کے لیے سراپا رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لے آئے اور انھوں نے ایمان کی روش اختیار کی۔ وہ تمہارے بدخواہ نہیں خیر خواہ ہیں وہ تمہاری فلاح صلاح چاہتے ہیں اور تمہاری دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی اس میں ہے کہ تم صحیح ایمان کی راہ روش اختیار کر کے پیغمبر کی رحمت و شفقت کے سزاوار بنو۔

آخر میں ارشاد ہوا والذین یوذون رسول اللہ لھم عذاب الیم یہ آیت ورحمۃ للذین امنوا منکم کے مقابلے میں ہے۔ بتایا ہے کہ اللہ کے رسول کو ایذا دینا گفتار سے یا کردار سے اس ایمان کے قطعاً منافی ہے۔ جو رحمت کا سبب بنتا ہے۔ لہٰذا اس کی سزا بھی سنگین ہے۔ لفظ رسول اللہ میں لطیف ارشارہ ہے کہ حضور اقدس کو ایذا اللہ کو ایذا ہے یعنی سنگین سزا کا سبب ہے جیسے حضور کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔

آیت سے یہ بھی مترشح ہو رہا ہے کہ اللہ کے رسول کی ایذا، صرف گناہ نہیں بلکہ کفر ہے۔ ایذا کے بھی دو درجے ہیں ایک یہ کہ جناب رسالت کی ایذاء ہو اس کے کفر ہونے میں کوئی شبہ نہیں دوسرے یہ کہ آپ کے مذاق کے خلاف کوئی کام ہو جیسے کھانا کھانے کے بعد حضور کے گھر میں بیٹھے رہنا یہ حرام ضرور ہے اور سنگین گناہ ہے لیکن کفر نہیں، اس کا تعلق آداب سے ہے۔ یہاں لفظ رسول ہی بتانے کے لیے لائے ہیں رسول کو ایذا پہنچانا کفر اور اس کی سزا بڑی سنگین ہے یہ کہنا کہ آپ کان کے کچے ہیں جس کا جی چاہتا ہے آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے آپ کے کان بھر دیتا ہے اور آپ اس کی بات کو مان لیتے ہیں۔ جناب رسالت میں گستاخی ہے اور گستاخی آپ کی ایذاء کا باعث ہے اور آپ کی ایذاء کفر ہے اور کفر کی سزا سنگین ہے۔

آگے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا یحلفون باللہ لکم لیرضوکم واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مومنین۔ اے مسلمانو! وہ تمہارے سامنے تمہیں خوش کرنے کے لیے قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ اگر ان کے پاس کسی درجہ میں بھی کچھ ایمان ہوتا تو وہ اللہ و رسول کو خوش کرنے کی فکر کرتے مطلب یہ ہے کہ یہ حرکت جو یہ منافقین اپنی بے ایمانی کو چھپانے کے لیے کر رہے ہیں خود ان کی بے ایمانی کی واضح دلیل ہے۔ یہ

عذر گناہ بد تر از گناہ ہے۔ انھوں نے اپنی صفائی کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ ان کو اور زیادہ مجرم ثابت کرنے والا بن گیا۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ کسی وقت حضرت ان کی دغابازی پکڑتے تو مسلمانوں کے روبرو قسمیں کھاتے کہ ہمارے دل میں بری نیت نہ تھی تاکہ ان کو راضی کر کے اپنی طرف کر لیں۔ نہ سمجھتے کہ یہ فریبکاری خدا اور رسول کے ساتھ کام نہیں آتی واقعی اگر دعویٰ ایمان میں سچے ہیں تو دوسروں کو چھوڑ کر اللہ ورسول کو راضی کرنے کی فکر کریں [1]

یعنی اگر وہ راست باز ہوتے تو اللہ ورسول کو راضی کرنے کی فکر کرتے نہ کہ جھوٹی قسموں کے ذریعے مسلمانوں کے سامنے اپنے کو معصوم اور حضور اقدس ﷺ کو کان کا کچا ثابت کرنے میں لگ جاتے۔ یہ تو حضور اقدس ﷺ کے خلاف نہایت عیاری اور مکاری پر مبنی سازش ہے۔

یرضوہ میں ضمیر رسول کی جانب بھی ہو سکتی ہے جو مرجع قریب ہے اور اللہ کی جانب بھی جو مرجع بعید ہے ایک ہی ضمیر سے دونوں کام نکالنے میں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ رسول کی رضا اللہ کی رضا سے منضم ہے۔ علامہ قرطبی نے اس کی ذرا تفصیل بتائی ہے وہ فرماتے ہیں۔

سیبویہ کے خیال میں یہ ایک جملہ نہیں بلکہ دو جملے ہیں پوری بات یوں ہے اللہ احق ان یرضوہ ورسولہ احق ان یرضوہ پہلے جملہ میں مبتدا و خبر دونوں موجود ہیں دوسرے جملہ میں مبتدا موجود ہے خبر محذوف ہے۔ عربی زبان میں اس قسم کی تعبیرات موجود ہیں۔ مثلاً ایک شعر ہے۔

نحن بما عندنا وانت بما عندك راض والرای مختلف

مبرد کہتے ہیں کہ خبر محذوف نہیں۔ ایک ہی جملہ ہے اصل میں یوں تھا واللہ احق ان یرضوہ ورسولہ۔

نحو کے مشہور امام فراء کہتے ہیں اصل تعبیر تو صرف یہ ہے کہ رسولہ احق ان یرضوہ اور لفظ اللہ تو آغاز میں محض افتتاحیہ ہے۔

نحاس کی رائے میں سیبویہ کی رائے زیادہ اچھی ہے۔ کیونکہ حضور اقدس ﷺ سے ماشاء اللہ و شئت جیسی تعبیر کی ممانعت آئی ہے۔ سیبویہ کی رائے کے مطابق فقرے کے معنے بالکل درست ہیں اور تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہے لیکن اگر سیبویہ کے خیال کو اپنا لیا جائے تو موجودہ تعبیر میں جو نکتہ بلاغت ہے وہ باقی نہیں رہتا۔ بتانا یہ ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کو خوش کرنا اللہ کو خوش کرنا ہے۔ کیونکہ رضائے الٰہی اتباع رسول میں ہے۔ ترکیب کے اعتبار سے تو سیبویہ کی بات بے غبار ہے لیکن اس میں نکتہ بلاغت نہیں ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

نحاس نے جس ممانعت کی طرف اشارا کیا ہے اس سے ان کی مراد غالبًا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی وہ حدیث ہے جسے امام نسائی نے سنن میں روایت کیا ہے کہ ایک بار کسی شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا ماشاء اللہ وشئت جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں۔ آپ نے خود اس کو منع کیا اور ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی جعلتنی للہ ندا تو نے مجھے اللہ کا ہمسر بنا دیا قل ماشاء اللہ وحدہ کہہ جو اکیلا اللہ چاہے مطلب یہ ہے کہ ایک مومن کی زبان کو شرک کے موہم کلمات سے بھی احتراز کرنا چاہیے اور اس کے قلب و زبان پر صرف ایک اللہ کی فاعلیت کا نقش ہونا چاہیے۔ یہ بھی بتا دیا کہ یہ بات کیسے کہنی چاہیے۔ امام احمد ابوداؤد اور نسائی وغیرہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تقولوا ماشاء اللہ وشاء فلان قولوا ماشاء اللہ ثم شاء فلان یہ نہ کہو کہ جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے بلکہ یوں بولو جو اللہ چاہے پھر فلاں چاہے یعنی سبب حقیقی کے ساتھ تم اگر سبب ظاہری کو بھی ظاہر کرنا چاہو تو اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے بالکل برابر اس شخص کا نام ذکر کرو جو ظاہر میں اس کا سبب بنا ہے بلکہ ادب یہ ہے کہ پہلے تم صرف اللہ کا نام لو اس کے بعد دوسرے نمبر پر اس شخص کا بھی نام لے سکتے ہو۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث آداب سے متعلق ہے عقائد سے نہیں چونکہ واو عربی زبان میں جمع اور شرکت کے لیے آتا ہے اور ثم ترتیب کے لیے ہے اس لیے آپ نے بتایا کہ اللہ کی مشیت کے ساتھ کسی اور کی مشیت کو حرف واو کے ساتھ جمع نہ کیا جائے بلکہ اللہ کی مشیت جیسا کہ تمام مشیتوں پر مقدم ہے اسی طرح اس کی تقدیم ثم حرف ترتیب کے ساتھ ظاہر بھی کرنا چاہیے۔ (کتاب الاذکار)

اس سلسلہ میں حافظ ابن تیمیہ نے ایک بلیغ تحقیق ذکر فرمائی ہے اس کا ملحوظ رکھنا ایمان و کفر میں امتیاز کا ایک اہم ترین نکتہ ہے۔

اللہ سبحانہ کی توحید اور حضور انور کی تعظیم دونوں اسلامی رکن ہیں لیکن اس موضوع پر ناپختہ کاروں نے اپنی بے خبری سے ایک تعبیری کشمکش پیدا کر دی ہے۔ کچھ توحید کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک رسول کی شان رفیع میں عامی زبان استعمال نہ کی جائے اس وقت تک گویا حق سبحانہ کی توحید کا حق ہی ادا نہیں ہوتا۔ اور حب رسول کا دعویٰ کرنے والے نادان یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ توحید خداوندی کی زیادہ توضیح سے بھی شان رسالت کو ٹھیس پہنچتی ہے وہ اگر اپنی زبان سے ایک مرتبہ یا اللہ کہتے ہیں تو جب تک سو مرتبہ یا رسول اللہ نہیں کہتے ہیں۔ ان کو مزہ نہیں آتا۔ یہ دونوں راستے افراط و تفریط ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے بڑی مفید باتیں لکھی ہیں اور بتایا ہے کہ تنقیص کے مواقع کیا ہیں اور تعظیم کے مواقع کیا؟ اور اس کی بڑی تفصیل بیان کی ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب گفتگو کا موضوع توحید ہو تو اللہ سبحانہ کی خصوصیات

کی خاص طور پر حضور اقدس ﷺ سے نفی کرنا موجب کسر شان اور حضور کی تعظیم کے منافی نہیں ہے کیونکہ اللہ سبحانہ کی ذات وہ بلند بارگاہ ہے جہاں وہ ہے وہاں کوئی نہیں ہے اس لیے اس کی ذاتی خصوصیات کی نفی میں کوئی کسر شان نہیں ہے مثلاً یہ کہا جائے اولاد دینا رزق دینا۔ اور گناہوں کو بخشنا رسول کا کام نہیں یہ صرف اللہ سبحانہ کی شان ہے تو یہ بات عظمت رسول کے ہرگز منافی نہیں ہے۔ کیونکہ جس صفت کی رسول سے نفی کی گئی ہے درحقیقت وہ رسول کے لیے ثابت ہی نہیں ہے ہاں بے ضرورت ان صفات کی نفی کو مشغلہ بنائے رکھنا ہی سوء ادب اور گستاخی ہے مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نصاریٰ نے خدا بنایا تو ان کی ذات سے خدائی صفات کی نفی کرنی عین حکمت ہے لیکن جن انبیاء کے بارے میں کسی کا یہ عقیدہ ہی نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی اندیشہ ہے ان کے حق میں یہ عبارتیں توہین کی حد میں داخل ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں جو انداز بیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختیار کیا ہے وہ اور رسولوں کے لیے اختیار نہیں کیا۔ حالانکہ جب متکلم خود اللہ سبحانہ ہو اور بات رسولوں کی آ جائے تو وہاں توہین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بہرحال آیت سیبویہ کے خیال میں دو جملوں پر مشتمل ہے۔ اور عربی انداز کے بھی زیادہ قریب ہے۔

اللہ و رسولؐ کی اپوزیشن اور اس کا انجام

(۶۴) کیا ان کو پتہ نہیں ہے کہ جو بھی اللہ و رسول کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے لیے دوزخ کا عذاب ہے جس میں وہ سدا رہے گا اور یہ بڑی رسوائی ہے یعنی جس رسوائی سے بچنے کے لیے نفاق اختیار کیا ہے اس سے بڑی رسوائی یہ ہے[1] مدینہ ہی کی زندگی میں ان مدعیان اسلام کے سامنے یہ بات پوری قوت اور وضاحت سے آ چکی ہے۔

ان الذین یحادون اللہ و رسولہ کبتوا کما کبت الذین من قبلھم۔

بلاشبہ جو لوگ اللہ و رسول کا مقابلہ کرتے ہیں ان کو ایسے ہی ذلیل و خوار کیا جائے گا جیسے ان سے پہلے لوگ ذلیل و خوار کیے گئے ہیں۔

اور اسی سورت میں یہ آیت:

ان الذین یحادون اللہ و رسولہ اولئک فی الاذلین

بلاشبہ جو لوگ اللہ و رسول کا مقابلہ کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگ ہیں۔

اور سورۂ نساء میں یہ آیت:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولیٰ ونصلہ جھنم۔

اور جو بھی اللہ کے رسول کی مخالفت پر راہ ہدایت واضح ہونے کے باوجود کربستہ ہو جاتا ہے اور اہل ایمان کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ پر چلتا ہے تو ہم اسے اسی طرف لے جائیں گے جس طرف اس کا رخ ہے اور ہم اسے دوزخ میں داخل کریں گے۔

جو ضابطہ اور جو قانون ان آیات میں بیان کیا گیا ہے اسی کا الم یعلموا میں حوالہ دے کر یہاں تکرار کیا گیا ہے۔
علامہ علاء الدین علی بن محمد خازن اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔

علمائے بلاغت کہتے ہیں کہ الم یعلموا کا انداز تعبیر وہاں اختیار کیا جاتا ہے جہاں کوئی چیز ماننے کے بعد فراموش کر دی جائے۔ یا جانتے ہوئے اس سے انجان بن جائے۔ اس وقت بولا جاتا ہے کیا تجھے پتہ نہیں، تجھے علم نہیں۔ حضور اقدس ﷺ مدینہ میں پورے نو سال گذار چکے ہیں اس دور میں آپ کے ذریعے ان کو دین اسلام کے قوانین وضوابط کا علم ہو چکا ہے اس لیے کہا جا رہا ہے الم یعلموا۔ کیا ان کو علم نہیں ہوا۔

گویا کہا جا رہا ہے کہ اس سے پہلے ان کو کھول کر بتایا جا چکا ہے کہ اللہ ورسول سے محادہ کا انجام تباہی اور ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ محادہ کے معنے مقابلہ مخالفت کے ہیں۔ مخالفت کرنے سے مراد اللہ سبحانہ کے مقرر کیے ہوئے فرائض اور حدود کو عملاً قبول نہ کرنا اور ان کے بجائے کچھ دوسرے حدود وفرائض کو اپنانا ہے علامہ آلوسی بغدادی کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ یخالف امر اللہ وامر رسولہ جو اللہ کے حکم اور رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں حافظ ابن جریر لکھتے ہیں انہ من یحارب اللہ ورسولہ ویخالفھما بالخلاف علیھما۔ جو اللہ اور رسول سے بر سر پیکار ہوگا اور ان کے مخالف ہو کر ان کا مقابلہ کرے گا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ من حاد اللہ ای شاقہ وحاربہ وخالفہ وکان فی حد واللہ ورسولہ فی حد جو اللہ کا مقابلہ کرے۔ اس سے بر سر پیکار ہو اس کی مخالفت کرے اللہ اور اس کا رسول ایک طرف۔ اور وہ ان کے مقابلہ میں ہو۔ قاضی بیضاوی نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے من یشاقق جو اللہ ورسول کی مخالفت کرتا ہے اس میں منافقین کا کردار بیان ہو رہا ہے جو دعوی تو ایمان واسلام کا کرتے تھے لیکن ان کا رویہ اللہ ورسول کے ساتھ مخالفانہ تھا۔ اسلام کی جو بات ان کو اپنے مفاد اور اپنی خواہشوں کے خلاف محسوس ہوتی۔ اس کے خلاف سرگوشیوں کی مہم شروع کر دیتے تاکہ مخلص مسلمانوں کے دلوں میں بھی وسوسہ اندازی کریں ان کے ایمان واسلام پر ہاتھ صاف کر سکیں دراصل وہ

قانونی تعلقات زندگی کے مختلف گوشوں میں یہودیوں کے ساتھ رکھتے تھے لیکن نجی زندگی میں وہ مسلمان بنے ہوئے تھے قرآن نے ایک مقام پر ان ہی کا چہرہ یہ پیش کیا ہے کہ ایمان تو یہ قرآن پر رکھتے ہیں لیکن زندگی کے مختلف اطوار میں قانونی تعلقات یہود سے رکھتے ہیں یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وہ مقدمات طاغوت کے پاس لے جاتے ہیں۔ قرآن یہاں بھی یہ بات سمجھا رہا ہے کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل اور ہمہ گیر نظام ہے جو مسلمانی کا دعویٰ کرنے کے باوجود اللہ ورسول کے مقابل، مخالف بنتے ہیں وہ دوزخ کا ایندھن ہیں ان کے ایمان کی بازار قیامت میں کوئی قیمت نہیں۔

ایمان کو جب انقیاد نصیب نہیں ہوتا وہ اسلام کے سیاسی نظام کی موجودگی میں دوسرے نظاموں کی طرف متوجہ رہتا ہے لیکن جب مقام انقیاد حاصل ہوتا ہے تو پھر قلب پر ہر طرف سے ہٹ کر اسلام ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے قرآن پر بھی ایمان ہو۔ رسول کی بھی تصدیق ہو۔ پھر اپنے معاملات میں اپنے تمدنی مسائل میں کسی اور کی طرف نظر بھی ہو۔ یہ ایک ہی میں ایمان و کفر کا اجتماع ہے۔ کیا وثوق واعتماد اسی کا نام ہے کہ قرآن جو راہ بتائے اور اللہ کا رسول جو کچھ پیش کرے اسے قبول نہ کیا جائے۔

اس آیت قرآنی کو بار بار پڑھیے اور سوچیے کہ قرآن کے نزدیک اس ایمان کی کیا قیمت ہے جس میں اسلام کے سیاسی نظام کے لیے محادہ اور مقابلہ ہو قرآن ظاہر و باطن کو ایسے دو جدا گانہ عالم نہیں مانتا جو ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں بلکہ دونوں کا ایسا باہم ربط ہے کہ ہمیشہ ایک کا دوسرے پر انعکاس ہوتا رہتا ہے۔ اگر اعتقاد باطن اعمال ظاہرہ کا مقتضی ہو تو اعمال ظاہرہ اعتقاد باطن کے لیے ممد و معاون ہیں۔ دیکھو اگر ایک شخص اعتقاد رکھتا ہے کہ ان الحکم الا للہ تو اس کے عقیدہ کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنے معاملات اور تمدنی مسائل میں اللہ کی بندگی کا نمونہ بن جائے۔

منافقین کو پردہ دری کا اندیشہ

(۶۵) منافقوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ان کے بارے میں کوئی ایسی سورت نازل ہو جائے جو ان کے دلوں کی باتوں کو علانیہ ظاہر کر دے۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم مذاق کر دو۔ بلاشبہ اللہ ان چیزوں کو ظاہر کر کے رہے گا جن کا تمہیں اندیشہ ہے۔ منافقین اپنی مجلسوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں بدگوئی کرتے۔ مومنین صادقین پر آوازے کستے۔ مہمات دین کا مذاق اڑاتے۔ پھر جب خیال آتا کہ ممکن ہے یہ باتیں حضور تک پہنچ جائیں تو کہتے کیا مضائقہ ہے۔ وہ تو کان ہی کان ہیں۔ ہم ان کے سامنے جو تاویل و توجیہ کر دیں گے سن کر اسی کو قبول کریں گے مگر چونکہ بسا اوقات وحی کے ذریعے ان کے نفاق و بدباطنی کی قلعی کھلتی رہتی تھی اس لیے یہ ڈر بھی لگا رہتا تھا کہ کوئی

سورت قرآن میں ایسی نازل نہ ہو جائے جو ہمارے مخاطبات سریہ دنیات خفیہ کا پردہ فاش کردے۔ اصل یہ ہے کہ منافقین کا قلب جبن وکمزوری سے کسی ایک طرف قائم نہ ہوتا تھا ان کے دل ہر وقت دغدغے میں رہتے تھے کبھی آنحضرت کی شان اغماض وکریم النفسی کو دیکھ کر کچھ تسلی حاصل کرتے مگر صاعقہ قرآنی کی گرج سے پھر دل ہلنے لگتے تھے اسی لیے فرمایا کہ بہتر ہے کہ تم ٹھٹھے کرتے رہو اور استہزار وتمسخر کا عمل جاری رکھو اور پیغمبر کی نسبت ہو اذن کہہ کر تسلی کرلو لیکن خدا اس چیز کو ضرور کھول کر رہے گا جس کا تم کو ڈر لگا ہوا ہے وہ تمہارے مکر وخداع کا تار تار بکھیر کر رکھ دے گا۔[1]

آیت قرآنی میں بات صرف یہ بتائی گئی ہے کہ دین کے بارے میں ان کی زبانیں چھوٹ اور بے لگام ہیں۔ لیکن جب منہ سے کوئی بات نکالتے ہیں تو ان کو یہ اندیشہ بھی ستاتا ہے کہ کہیں ہمارے کرتوت کی حضور اور مسلمانوں کو بذریعہ وحی خبر نہ ہو جائے۔ اسی اندیشے کے پیش نظر انھوں نے جھوٹی قسموں کے ذریعے اپنی صفائی کی مہم چلائی ہے فرمایا کہ ان کو خبردار کردو کہ اب تمہاری یہ پیش بندی کام نہ آئے گی۔ اللہ و رسول اور اللہ کی آیات کا جس قدر مذاق اڑانا ہے اڑالو۔ اب وقت آگیا ہے کہ جن چیزوں کے بے نقاب ہونے سے تم ڈر رہے تھے اللہ ان سب کو بے نقاب کر کے رہے گا۔

یہاں شارحین قرآن کو حیرت ہو رہی ہے کہ اگر یہ غیر مسلم ہیں تو ان کو یہ اندیشہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ یہ حضور کو نبی نہیں مانتے ہیں اور آپ پر وحی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ ابو مسلم خراسانی نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا ہے کہ انھوں نے اندیشہ کا اظہار بھی بطور استہزاء کیا تھا۔ لیکن اس کے برعکس دوسرے بزرگوں نے بتایا کہ ان منافقین خاص کے بارے میں ہے جن کی تعداد بیہقی کی روایت میں حضرت حذیفہؓ کے حوالے ۱۴-۱۵ بتائی گئی ہے اور صحیح مسلم میں حضرت حذیفہؓ کے حوالہ سے بارہ آئی ہے۔ ارشاد ہے۔ میری امت میں بارہ منافق ہیں جو جنت کی خوشبو نہ پائیں گے جن میں سے آٹھ آدمیوں کے دونوں شانوں کے درمیان میں آگ کے شعلہ کی طرح دنبل نکل کر ان کے سینہ سے پھوٹ پڑے گا۔ مشہور محدث امام بغوی نے بھی لکھا ہے کہ یہ آیت ان بارہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے غزوہ تبوک سے واپسی پر حضور اقدس ﷺ کے بارے ایک گھاٹی پر ارادہ بد کیا تھا اور آپ کو حضرت جبریل علیہ السلام نے بتا دیا تھا۔ یہی لوگ اپنے اس کرتوت کے بعد یہ اندیشہ کر رہے تھے کہ کہیں وحی الہی ہماری سازش کا انکشاف نہ کردے۔ تفسیر کے مشہور امام زجاج نے اپنی راہ سب سے الگ بنائی ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ خبریہ نہیں بلکہ جملہ انشائیہ ہے اور آیت میں یحذر مضارع بمعنے امر ہے اور منافقین سے کہا جا رہا ہے کہ ان کو اس

[1] افادات شیخ الاسلام

بات سے اندیشناک ہونا چاہیے۔ جیسے دوسرے موقع پر ہے فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ۔ لیکن اس میں کوئی خاص معنویت نہیں ہے۔

دراصل ایمان و کفر کی طرح نفاق کی تمام حالتیں یکساں نہیں ہیں چونکہ روح کے اعتبار سے نفاق کی حالت بھی انکار کی ایک اقراری صورت ہے اس لیے جب بڑھتی ہے تو انکار و کفر ہی کی طرف بڑھتی ہے۔ اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ چنانچہ زمانہ نبوت کے منافقوں کی حالت نفاق یکساں نہ تھی جن بارہ کا یہاں حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ کی زبانی ذکر ہوا ہے۔ ان کا نفاق ہر منافق کا نفاق نہ تھا۔ قرآن نے اسی سورت کے آخر میں اس طرف اشارا بھی کیا ہے ومن حولکم من الاعراب منافقون ومن اھل المدینۃ مردوا علی النفاق کسی نفاق کا رخ اس طرف تھا کہ ہجرت سے جی چراتے تھے کسی پر انفاق مال شاق تھا۔ کوئی جہاد سے بچنا چاہتا تھا۔ یہاں قرآن نے جن کا ذکر کیا ہے ان کا نفاق ذات نبوت سے عناد کی حد میں پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ مسند احمد میں ابو الطفیل سے بیہقی میں حضرت حذیفہ سے اور طبقات ابن سعد میں جبیر بن مطعم سے ابن ابی حاتم نے ضحاک سے جو واقعہ نقل کیا ہے اس سے ان کا ذات نبوت سے کھلا عناد معلوم ہو رہا ہے کہ:

> جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس آ رہے تھے تو رات کو بارہ منافق ایک گھاٹی پر ٹھہر گئے اور خفیہ مشورہ کر کے طے کیا کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزریں گے تو ہم اچانک خفیہ طور پر اوپر سے پتھر لڑھکا دیں گے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے اس کا علم ہو گیا اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بہ تعمیل حکم نبوی منافقوں کے اونٹوں کو مار مار کر ہٹا دیا مگر حضرت حذیفہ نے کسی کو نہ پہچانا۔ مگر حضور اقدس نے نام بنام سب کو بتا دیا۔

آیت میں یہی منافقین مراد ہیں۔

آیت کا مطلب تو یہی ہے کہ منافقین کو اندیشہ تھا کہ ان کے بارے میں قرآن میں کوئی سورت نازل ہو کر ان کی پردہ دری کر دی جائے گی اور اس طرح ان کے عزائم قبائح اور رذائل منظر عام پر آ جائیں گے اس صورت میں علیھم اور تنبئھم کی ضمیروں کا مرجع منافقین ہیں لیکن کچھ علماء نے ان ضمیروں کا مرجع مسلمانوں کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ منافقین کو یہ اندیشہ تھا کہ مسلمانوں پر ایسی کوئی سورت نازل ہو جائے گی کہ ذات نبوت مسلمانوں کو ہمارا کچا چٹھا بتا دے گی۔ دونوں معانی الگ الگ ہیں۔ اور دونوں میں باریک سا فرق ہے۔

ایک یہ کہ منافقین کے بارے میں کوئی سورت نازل ہو جائے اور نزول سورہ کے ذریعے ذات پیغمبر منافقین کو ان کے دلوں کے سارے عزائم بتا دے اس کا مقصد خود نبوت کا اپنے علم کو منافقین کو بتانا ہے یہ علم بلاغت کی

زبان میں لازم فائدۃ الخبر ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن نازل ہو کر ہمارے قبائح اور رذائل مسلمانوں کو بتادے گا ہمارے کرتوت کا مسلمانوں کو علم ہو جائے گا یہ علماء بلاغت کی اصطلاح میں فائدۃ الخبر ہے۔

آخر میں فرمایا استھزءوا ان اللہ مخرج ما تحذرون تم جھوٹی قسمیں کھا کر خوب مسلمانوں کو بنالو۔ تمہیں جس بات کا اندیشہ ہے اللہ کی جانب سے اس کا اظہار ہو کر رہے گا۔ استہزاء نفاق کی طبیعت ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تمہارے قبائح۔ تمہارے رذائل اور افکار منظر عام پر ضرور لائے گا۔ اس میں منافقین کو دھمکی دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب تمہارا معاملہ راز بن کر نہیں رہے گا بلکہ تمہیں بالکل ننگا کر دیا جائے گا۔

منافقین کا عذر گناہ بدتر از گناہ

(۶۶) اور اگر آپ ان سے دریافت کریں تو وہ ضرور کہیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے ہیں۔ کہہ دو کیا تم اللہ، اللہ کے احکام اور اللہ کے رسول ﷺ سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ تبوک میں جاتے ہوئے بعض منافقین نے ازراہ تمسخر کہا کہ اس شخص محمد ﷺ کو دیکھو کہ شام کے محلات اور روم کے شہروں کو فتح کر لینے کا خواب دیکھتا ہے انھوں نے رومیوں کی جنگ کو عربوں کی باہمی جنگ پر قیاس کر لیا ہے میں یقین کرتا ہوں کہ کل ہم سب رومیوں کے سامنے رسیوں میں بندھے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ یہ ہمارے قراء (صحابہ کرام) پیٹو، جھوٹے اور نامرد ہے ---- روم کی باقاعدہ فوجوں سے جنگ کر سکیں گے وغیر ذالک من الہفوات اس قسم کے مقولے جو مسلمانوں کو روم سے مرعوب اور ہیبت زدہ کرنے اور شکستہ خاطر بنانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں نقل ہوئے آپ نے بلا کر باز پرس کی تو کہنے لگے کہ حضرت ہم کہیں سچ مچ ایسا اعتقاد تھوڑا ہی رکھتے ہیں۔ محض خوش دقتی و دل لگی کے طور پر کچھ کہہ رہے تھے کہ باتوں میں بآسانی سفر کٹ جائے"۔ قرآن نے جواب میں بتایا کہ اے پیغمبر کہہ دو کہ کیا تم اللہ، اللہ کے احکام اور اللہ کے رسول سے مذاق کر رہے تھے یعنی کیا دل لگی وخوش وقتی کا موقع ومحل یہ ہے اللہ اور رسول کا استہزاء اور احکام الٰہیہ کا استخفاف تو وہ چیز ہے کہ اگر محض زبان سے دل لگی کے طور پر کیا جائے تو وہ بھی کفر عظیم ہے۔ چہ جائے کہ منافقین کی طرح ازراہ شرارت و بدباطنی ایسی حرکت سرزد ہو[1]۔ یہ بھی ایک خاص اور اہم نفاق کی علامت ہے کہ اللہ سبحانہٗ اللہ کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

احکام اور اللہ کے رسول کی باتوں کی مجلس میں تضحیک کرتے ہیں اور جب اس پر ان کی گرفت کی جاتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو ایسے ہی دل لگی کر رہے تھے یعنی فی الواقع تضحیک نہیں کر رہے بلکہ محض خوش طبعی کر رہے تھے۔ شعراء آج بھی اشعار میں اللہ، اللہ کے احکام اور اللہ کے رسول کو تفریح کا موضوع بناتے ہیں اور جب ان کی گرفت کی جاتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم کوئی ارادتاً تھوڑا ہی مذاق اڑاتے ہیں یہ تو صرف شاعرانہ انداز ہے اردو ادب کے بہانے برملا اللہ ورسول پر تنقید بلکہ تنقیص کی جاتی ہے اور اس کا نام اردو ادب کی خدمت رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر اگر کچھ لکھا جائے تو اوراق سیاہ ہو جاتے ہیں۔

اللھم اعذنا من منکرات الاخلاق وسوء الاعمال۔

شارحین قرآن نے اس کے پس منظر میں جن مناسبات کی نشاندہی کی ہے وہ ایک نہیں متعدد ہیں۔ سب کا خلاصہ یہ ہے کہیں تو وہی بات ہے جس کی نشاندہی حضرت شیخ الاسلام نے فرمائی ہے۔ کہیں یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ تبوک تشریف لے جا رہے تھے۔ اثناء راہ میں ودیعہ ابن ثابت اور مخشی بن عمیر وغیرہما منافقین نے باہم کہنا شروع کیا کہ تم لوگ رومیوں کی دلیری اور بہادری ایسی ہی سمجھتے ہو جیسے عرب باہم لڑتے ہیں واللہ ہمیں تو یہ نظر آ رہا ہے کہ کل کو لڑائی میں تم لوگ ان کی زنجیروں میں جکڑے جاؤ گے مخشی بولا ارے مجھے تو اندیشہ ہے کہ تمہاری اس گفتگو کے بارے میں کہیں قرآن نازل ہو جائے۔ اور مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک کے سو کوڑے مارے جائیں گے یہ باتیں نہ کرو۔ یہ لوگ اسی خرافات میں مبتلا تھے کہ ادھر حضور اقدس نے عمار بن یاسرؓ سے فرمایا جا کر قوم کی خبر لو وہ منافقوں کی آگ میں جل رہی ہے اور منافقوں سے پوچھنا کہ تم نے کیا باتیں کی تھیں۔ اگر وہ انکار کریں تو کہنا کہ تم نے ضرور یہ باتیں کہی تھیں چنانچہ حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ نے حکم کی تعمیل کی۔ اس وقت وہ لوگ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عذر کرنے لگے۔ کچھ نے کہا کہ ہم تو راستہ کاٹنے کے لیے دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔ مخشی بن عمیر سچے دل سے مسلمان ہو گئے اور دعا مانگی اے اللہ مجھے اسی جگہ شہید کر کہ کسی کو میری قبر بھی معلوم نہ ہو۔

مشہور مفسر قرآن علامہ بغوی نے مقاتل اور قتادہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حضور اقدس غزوہ تبوک میں جا رہے تھے اور آپ کے آگے تین منافق جا رہے تھے دونوں قرآن اور حضور کا مذاق کر رہے تھے اور تیسرا ان کی باتوں پر ہنس رہا تھا۔ اللہ سبحانہ نے حضور اقدس ﷺ کو بذریعہ وحی مطلع کر دیا حکم دیا کہ ان تینوں کو لاؤ چنانچہ حاضر کیے گئے آپ نے دریافت کیا کہ تم نے یہ کہا ہے بولے کہ ہم تو ذرا دل لگی کی باتیں کر رہے تھے اور اس طرح راستہ کی مسافت طے کر رہے تھے قرآن نے یہاں ان کا یہ اعتراف پیش کیا ہے انما کنا نخوض ونلعب۔ اس میں ان کی جانب سے استہزاء کا اقرار ہے اور بتانا یہ چاہتے ہیں کہ استہزاء ہماری گفتگو سے سمجھا جا رہا تھا لیکن باتیں

ہم دل سے نہیں بلکہ دل لگی سے کر رہے تھے۔

استہزاء اور لعب میں فرق ہے۔ استہزاء ایسا مذاق جس میں دوسرے کی تذلیل مقصود ہو اور لعب جس میں تذلیل نہیں بلکہ محض جسمانی یا زبانی ورزش مقصود ہو کتنا نحوض کہہ کر انھوں نے مان لیا کہ ہم استہزاء نہیں کر رہے تھے بلکہ ہم تو راستہ کاٹنے کے لیے باتیں کر رہے تھے اور دل لگی کر رہے تھے۔

شانِ نبوت میں استہزاء کفر ہے

(٦٧) بہانے نہ بناؤ تم نے ایمان کے بعد راہ کفر اختیار کی ہے اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف بھی کر دیں تاہم کچھ کو ضرور سزا دیں گے کیونکہ یہی لوگ فی الواقع جرائم پیشہ تھے یعنی جھوٹے عذر تراشنے اور حیلے حوالوں سے کچھ فائدہ نہیں جن کو نفاق و استہزاء کی سزا ملنی ہے مل کر رہے گی۔ ہاں جو اب بھی صدقِ دل سے توبہ کر کے اپنے جرائم سے باز آجائیں انہیں خدا معاف کرنے گا یا جو پہلے ہی سے باوجود کفر و نفاق کے اس طرح کی فتنہ انگیزی اور استہزاء سے الگ رہے ہیں انہیں استہزاء و تمسخر کی سزا یہاں نہیں ملے گی۔[1]

یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ منافقین کا گروہ کافروں کا کوئی ایسا خاص گروہ نہ تھا جو جاسوسوں کی طرح بھیس بدل کر مسلمانوں میں رہنے لگا تھا باہر نکلتا تو مسلمان بن جاتا اکیلے میں ہوتا تو اپنے اصلی بھیس میں لوٹ جاتا ایسا سمجھنا قرآن واحادیث کی تصریحات کے خلاف ہے۔ ان لوگوں نے اسلام بطور اپنے دین واعتقاد کے اسی طرح قبول کیا تھا جس طرح دوسرے مسلمانوں نے۔ یہ آیت قد کفرتم بعد ایمانکم ایمان لاکر پھر تم نے کفر کی باتیں کیں اس کی شہادت پیش کر رہی ہے وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ان کے گھر کا ہر فرد یقین کرتا تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ وہ نماز پڑھتے تھے۔ روزہ رکھتے تھے۔ اسلام کے طور طریقے پر اولاد کی پرورش کرتے تھے۔

ایسا سمجھنے کی اصلی وجہ بلاشبہ یہی ہے کہ کچھ اہل علم کا خیال یہ ہے کہ عہد نبوت کے بعد منافقین کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اب یا تو کوئی شخص کافر ہو سکتا ہے اور یا مسلمان۔ کسی کے منافق ہونے کا نہ اب کوئی موقع ہے اور نہ ضرورت کیونکہ منافق اس وقت ہوا کرتے تھے جب اسلام دنیوی اسباب کے لحاظ سے ناتواں اور کمزور تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں کفر کی مادی طاقت چاردانگ عالم پر چھائی ہوئی تھی۔

یہ شبہ دراصل نفاق اور منافق کی حقیقت اس کے محرکات اس کے مصالح اور اس کے مظاہر پر پوری وسعت اور سنجیدگی سے غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ حافظ ابن القیم جوزی نے نفاق کے جو معنے لکھے ہیں اس پر غور فرمائیے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نفاق وہ مہلک بیماری ہے جو موجود ہوتی ہے لیکن جس میں ہوتی ہے اسے پتہ نہیں ہوتا ہے۔ عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے۔ خود اس بیماری کے مریض پر بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔

آگے فرماتے ہیں۔

نفاق کی کھیتی میں پودہ دو نہوں والا ہوتا ہے اس کا ایک تنا جھوٹ کا اور دوسرا تنا نمائش اور ریاکاری کا ہوتا ہے اور نفاق دو چشموں کے پانی سے پیتا اور بڑھتا ہے ایک بصیرت کی کمزوری اور دوسرے عزیمت و ہمت کی کمزوری جب جھوٹ، نمائش، بصیرت اور عزیمت کی کمزوری یکجا ہو جاتے ہیں نفاق کی کھیتی پھلتی پھولتی اور بڑھتی ہے۔

یہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

منافقین کا چہرہ بیان کیا جائے تو بیحد طویل ہے اتنا کہ ان کی روئے زمین تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ممکن تھا کہ پورا قرآن ان کے ذکر سے بھرا ہوتا ——— حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دعا مانگتے سنا کہ اے اللہ منافقین کو ہلاک کر دے۔ حذیفہ، بھائی اگر منافقین نہ رہے تو قلت تعداد کی وجہ سے تمہارا سڑکوں میں جی گھبرا جائے گا[1]

نفاق کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ زبان سے خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت کا اقرار کیا جائے مگر دل میں خدا کے قانون اور رسول کی ہدایت سے کوئی لگاؤ نہ ہو۔ آئین قرآنی کے مقابلہ میں دنیوی مصالح۔ نفسانی رجحانات اور جسمانی لذائذ زیادہ مرغوب ہوں بلکہ انہیں مصلحتوں اور فائدوں کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کے لیے اسلام وایمان کو آڑ بنایا جائے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ باتیں نہ بناؤ تمہارا یہ عذر گناہ تمہارے گناہ سے بھی بدتر ہے۔ اگر کوئی گروہ اللہ اور اس کے رسول کو ہنسی دل لگی کا ذریعہ بناتا تو اس کے مجرم ہونے کے لیے یہ کافی ہے تو کھلے بندوں ایک مومن کی جانب سے اعلان کفر ہے۔ تم اگر ایمان لائے تھے تو ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ اپنے عمل سے اس کا ثبوت فراہم کرتے لیکن تم نے عمل سے ایمان کا نہیں کفر کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ ورسول سے استہزاء کفر ہے۔

یہاں امام رازی کی بات بیحد وزنی ہے کہ استہزاء دلیل استخفاف ہے اور ایمان میں سب سے بڑی اور اہم چیز اللہ ورسول کی تعظیم ہے۔ استخفاف بھی اور تعظیم بھی۔ ان دونوں میں یکجائی محال ہے۔

ایک شافعی عالم علامہ الکیا الہراسی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ یہ آیت ایک رہنما اصول ہے اس بات

[1] مدارج السالکین

کے یہ ہے کہ کفر کی بات میں جد و ہزل دونوں مساوی ہیں۔ یعنی بات آپ چاہے متانت سے کہیں یا مذاق سے دونوں کا مقام کفر میں ایک ہے۔

حافظ ابن حزم نے الملل والنحل میں لکھا ہے ہر وہ بات جس میں اللہ و رسول کا یا قرآن کی کسی آیت کا استخفاف ہو گستاخی اور بے ادبی ہو نہ اس کا سننا جائز ہے نہ بولنا جائز ہے اور نہ ایسی مجلس میں بیٹھنا جائز ہے۔

امام ابوبکر الجصاص رقسم طراز ہیں۔ اللہ سبحانہ نے اس آیت میں اپنے نبی کو بتا دیا ہے کہ یہ بات کفر ہے خواہ ان کے منہ سے کیسے نکلی ہو چاہے متانت سے کہی یا مذاق سے۔ کلمہ کفر کے اظہار میں دونوں حالتیں یکساں ہیں اور یہ بھی اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کی آیات اور دین کے قوانین سے متعلق کسی چیز سے مذاق کفر ہے۔

اور ابوبکر بن العربی لکھتے ہیں کہ ان منافقین کی زبانوں سے اللہ سبحانہ اور حضور اقدس ﷺ کی شان میں جو بات بھی نکلی ہے گستاخی ہے اور گستاخی کفر ہے اور کفر چاہے وقار کے انداز میں ہو یا مذاق میں کفر ہے اس موضوع پر امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے باوقار بات حقیقت اور علم سے تعلق رکھتی ہے جب کہ مذاق کا تعلق باطل اور جہالت سے ہے۔ اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے منافقو اب زیادہ بہانے نہ کرو۔ اب تک تو ظاہر میں تم مسلمان تھے مگر اس استہزاء اور تمسخر کے بعد وہ تمہارا ظاہری اسلام بھی جاتا رہا اور اس استہزاء و تمسخر سے تم نے اپنے کفر کا اعلان کر دیا لہٰذا ایسے جھوٹے عذر تراشنے اور حیلوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمہیں جرم کی سزا مل کر رہے گی۔

ارشاد کا آخری حصہ ان نعف عن طائفۃ۔ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ منافقین کے بہت سے گروہ تھے اور ان کے نفاق کی نوعیتیں مختلف تھیں۔ ان کی بعض جماعتیں نہایت خطرناک تھیں۔ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے بڑی سنگین چالیں چلیں۔ ایسی ہی کچھ جماعتوں کی طرف یہاں اشارا ہے کہ اگر ہم نے تمہاری کچھ ٹولیوں کو یہاں معاف بھی کر دیا ہے اور ان کے معاملہ کو آخرت پر رکھ دیا ہے تو مغالطہ میں نہ رہو کچھ ٹولیاں ضرور اس دنیا میں ہمارے عذاب کی زد میں آ کر رہیں گی اور ہم ان کے جرائم کی ان کو ضرور سزا دیں گے ——— یا یوں کہہ دیجئے کہ جن لوگوں نے جان بوجھ کر استہزاء و تمسخر کی باتیں اس لیے کی ہیں کہ وہ رسول اور اس کے لائے ہوئے دین کو اپنے دعوئے ایمان کے باوجود ایک مضحکہ سمجھتے ہیں اور جن کے اس تمسخر کا مدعا یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی ہمتیں پست ہوں اور وہ پوری قوت کے ساتھ جہاد کی تیاری نہ کر سکیں ان کو تو ہرگز معاف نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کا تمسخر ایک مجرمانہ سازش ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ تم سب کو معاف نہیں کیا جائے گا کچھ کو ان کے جرم کی سزا ضرور ملے گی یعنی جن

لوگوں نے تمسخر واستہزاء کا جرم کیا ہے۔ مطلب ہے کہ اگر تم میں سے کچھ کو توبہ وانابت کی وجہ سے معاف کریں گے تو کچھ کو ان کی مجرمانہ حالت کی وجہ سے ضرور سزا دیں گے۔ اس لیے معلوم ہوا کہ ان میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ کچھ نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ان کو معافی مل گئی اور کچھ کو اپنے جرائم کا احساس بھی نہ ہوا ان کو سزا کی دھمکی دی گئی اور لطف یہ ہے کہ تعذیب کا سبب بیان کر دیا گیا ہے لیکن معافی کے سبب کو ظاہر نہیں کیا اشارہ ہے کہ معافی کا سبب محض فضل ہے اور سزا کا سبب ان کی مجرمانہ زندگی ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ
يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ
اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٦٧﴾
وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾ كَالَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ
فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا
اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ
كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ
نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ
اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٧٠﴾

نفاق والے مرد اور نفاق والی عورتیں باہم ایک ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور

نیکی سے روکتے ہیں۔ اپنی مٹھیاں بند رکھتے ہیں وہ خدا فراموش ہو گئے اس لیے اللہ بھی ان کو بھول گیا۔ بلاشبہ منافقین ہی نافرمان ہیں ٦٨۔ اللہ نے منافق مردوں منافق عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ کیا ہے اسی میں پڑے رہیں گے۔ وہی ان کو بس ہے۔ اور اللہ نے ان پر لعنت کی ان کے لیے برقرار رہنے والا عذاب ہے ٦٩۔ منافقو! تم ان لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے وہ تم سے زیادہ طاقتور اور مال و اولاد میں تم سے زیادہ بہتات والے تھے لہذا وہ اپنے حصہ سے فائدہ اٹھا کر چلے گئے تم بھی اپنے حصہ سے فائدہ اٹھا لو۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے تم سے پہلے لوگ اپنے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھا چکے ہیں اور تمہاری سوچ بھی ویسی ہی ہے جیسی ان کی سوچ تھی ٦٩۔ دنیا و آخرت میں ان کے اعمال بالکل اکارت اور رائیگاں ہو گئے۔ گھاٹے میں رہنے والے لوگ یہی ہیں ٦٩۔ کیا ان سے پہلے جو قومیں قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ ابراہیم، مدین والے اور الٹی بستیوں والے گذر چکے ہیں ان کا پتہ ان کو نہیں ہوا ہے اُن کے پاس ان کے رسول خدا کی روشن دلیلیں لے کر آئے لہذا یہ اللہ کی شان نہ تھی کہ ان لوگوں پر ظلم کرتا بلکہ یہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے ٧٠۔

معانی مفردات

یقبضون ایدیھم قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ کنایہ ہے بخل سے اصل میں قبض الایدی نام ہے انگلیوں کو ہتھیلی کی طرف بند کرنے کا جسے ہم اپنی زبان میں مٹھی کہتے ہیں۔ عربی میں یہ کنایہ ہے خرچ نہ

کرنے سے جیسا کہ بسط ایدی ہاتھ کھلا ہونا کنایہ ہے خرچ کرنے اور سخی ہونے سے۔

خضتم کالذی خاضوا۔ پہلا جمع مذکر حاضر دوسرا جمع مذکر غائب ہے ماضی مصدر خوض ہے۔ خوض کے اصل معنے تو دریا میں گھس جانے کے ہیں لیکن بات کے تعلق سے آئے تو اس کے معنے بال کی کھال ادھیڑنا ہی ہوتا ہے اور مادیات کے تعلق سے ہو تو اس کے معنے مادیات کے ہو کر رہ جانے کے ہوتے ہیں یہاں باطل ضلالت کے کیچڑ میں گھس جانا ہے۔

نفاق کا محسوس چہرہ اور انجام

قرآن میں منافقین کی قسمیں اور منافقین کی علامات کھول کر بتائی ہیں اس پر تفصیلی بحث تو انشاء اللہ پارہ یازدہم میں آئے گی جہاں ہم قرآن کی روشنی میں منافقین کی بارہ قسمیں اور نفاق کی ۶۶ علامتیں بتائیں گے یہاں جو علامات و خصوصیات ذکر کی جارہی ہیں وہ منافقین کی بارہ قسموں کی مشترک خصوصیات ہیں۔ ان سب کو برائی سے دلچسپی اور بھلائی سے عداوت ہوتی ہے۔ کوئی شخص برا کام کرنا چاہے تو ان کی ہمدردیاں، ان کے مشورے ان کی ہمت افزائیاں، ان کی اعانتیں، ان کی سفارشیں۔ ان کی تعریفیں اور مدح سرائیاں سب اس کے لیے وقف ہوں گی دل و جان سے سب اس برے کام میں شریک ہوں گے۔ دوسروں کو اس میں حصہ لینے کی ترغیب دیں گے۔ کرنے والے کی ہمت بڑھائیں گے اور ان کی ہر ادا سے ظاہر ہوگا کہ اس برائی کے پروان چڑھنے سے کچھ ان کے دل کو راحت اور ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ بخلاف اس کے کوئی بھلا کام کر رہا ہو تو اس کی خبر سے ان کو صدمہ ہوتا ہے۔ اس کے تصور سے ان کا دل دکھتا ہے اس کی تجویز تک ان کو گوارا نہیں ہوتی ہے۔ اس کی طرف کسی کو بڑھتے دیکھتے ہیں تو ان کی روح بے چین ہو جاتی ہے۔ اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ اور ہر تدبیر سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح وہ اس نیکی سے باز رہ جائے اور باز نہیں آتا تو اس کام میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر یہ بھی ان سب کا مشترک خاصہ ہے کہ نیکی کے کام میں خرچ کرنے کے لیے ان کا ہاتھ کبھی نہیں کھلتا ہے خواہ وہ کنجوس ہوں یا بڑے خرچ والے۔ بہرحال ان کی دولت یا تو تجوریوں میں بھرتی ہے یا پھر حرام راستوں سے آتی ہے اور حرام ہی راستوں میں جاتی ہے۔ بدی کے لیے وہ اپنے وقت کے قارون بن جاتے ہیں مگر نیکی میں خرچ کرنے کے لیے ان سے زیادہ مفلس کوئی نہیں ہوتا۔

(۶۸) نفاق والے مرد نفاق والی عورتیں باہم ایک دوسرے کو برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے روکتے ہیں اور اپنی مٹھیاں بند رکھتے ہیں اور وہ فراموش ہو گئے اس لیے اللہ بھی ان کو بھول گیا۔ بلاشبہ منافقین ہی نافرمان ہیں یعنی سب سے بڑے نافرمان ہی باطن منافق ہیں

جن کے مرد اور عورتیں زبانی اقرار اور اظہار اسلام کے باوجود شب و روز اسی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں کہ ہر قسم حیلے اور فریب کر کے لوگوں کو اچھی باتوں سے بیزار اور برے کاموں پر آمادہ کریں۔ خرچ کرنے کے اصل موقعہ پر مٹھی بند رکھیں۔ غرض کلمہ پڑھتے رہیں لیکن نہ ان کی زبان سے کسی کو بھلائی پہنچے نہ مال سے جب خدا کو ایسا چھوڑ بیٹھے تو خدا نے بھی ان کو چھوڑ دیا چھوڑ کر کہاں گرایا اس کا ذکر آگے آرہا ہے لہ

بتایا جا رہا ہے کہ منافقین کی قسمیں اگرچہ متعدد ہیں لیکن تعدد کے باوجود یہ باتیں ان سب کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔ اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی ان کے ساتھ شریک ہیں۔ اور دونوں جرم میں برابر ہیں۔ منافقین قسمیں کھا کر کہہ رہے تھے کہ انھم لمنکم وہ تم میں سے ہیں قرآن بتا رہا ہے وہ تم میں سے نہیں بلکہ بعضھم من بعض باہم ایک ہیں۔ ان کے افکار میں ان کے اعمال میں اور ان کے اخلاق میں ہم آہنگی ہے برائی کے پھیلانے نیکی کی راہ میں رکاوٹیں قائم کرنے اور اسلام کی خاطر محنت سے گریز میں ایک دوسرے کے ہمنوا ہیں۔ علامہ نسفی لکھتے ہیں صفت نفاق میں سب شریک اور ایک جنس ہیں الجصاص فرماتے ہیں۔ نفاق پر ان کی اجتماعیت کو بتانے کے لیے یہ انداز اختیار کیا ہے۔ اب تک منافقین دعوی ایمان کی وجہ سے مسلمانوں میں رلے ملے تھے۔ یہاں ان کی علامات کی نشاندہی فرما کر ان کو اہل ایمان سے چھانٹ کر الگ کر دیا ہے اور اہل ایمان کو بتا دیا ہے کہ وہ ان خصائص کے مردوں اور عورتوں کو اپنے میں شامل نہ ہونے دیں یہ گویا اعمال و اخلاق کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ کی گندے عناصر سے تطہیر کا حکم ہوا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے کفار و مشرکین سے اعلان براءت کر کے علیحدگی اختیار کر لی ہے اسی طرح اپنے اندر کے ان نام نہاد مسلمانوں کو بھی چھانٹ کر الگ کر دیں جو اعمال و اخلاق میں کفار کے ہمنوا ہیں۔ اسلام کی اجتماعی مردم شماری کے رجسٹروں کی رہین منت نہیں۔ نہ یہ قومیت ہے جو وطن، زبان، رنگ و نسل کی ہم آہنگی اور اتحاد سے منصہ وجود پر آتی ہے۔ یہ امت ہے اس کی اساس اسلام اور صرف اسلام ہے افکار میں اعمال میں اسلام سے وفاداری اس کے ترکیبی عناصر ہیں۔ افرادی طاقت سے زیادہ ایمان و عمل کی طاقت درکار ہے۔

اسلامی معاشرہ کی تکوین

عام شارحین نے اس سے جو کچھ سمجھا ہے وہ تو صرف یہی ہے کہ منافقین میں ہم آہنگی اور ہم جنسی ہے لیکن شاہراہ عام سے ہٹ کر ذرا اس پر غور فرمائیے کہ قرآن اس کے ذریعے ہمارے ذہن میں یہ بات اتارنا

لہ افادات شیخ الاسلام

چاہتا ہے کہ جہاں تک اسلامی معاشرہ کے قیام اور وجود کا تعلق ہے وہ ایک ایسے محسوس ادائی عمل کا نتیجہ ہے جس کی موزوں تعبیر میثاق کے لفظ سے کی جاسکتی ہے۔ غور کیجئے کہ ایک فرد اسلامی معاشرہ کا رکن کیوں کر بنتا ہے۔ قبل اس کے کہ کوئی شخص اسلامی معاشرہ کا رکن بنے اسے اللہ سبحانہ کی وحدانیت اور محمد رسول اللہ کی رسالت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس اقرار کے لازمی نتائج کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ لفظ اسلام خود اس حقیقت پر گواہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں شرکت کرنا اپنے نفس کے جملہ حقوق سے دست بردار ہونا ہے۔ کیونکہ اسلام کے لفظی معنے ہیں اپنے تئیں کسی کے حوالہ کر دینا اور اس کی پوری پوری اطاعت بجالانا ایک شخص جب مسلمان ہوتا ہے تو وہ اس بات کا عہد کرتا ہے کہ اس کا ارادہ اس کی عقل اور اس کے جذبات و خواہشات قانون الہٰی اور احکام خداوندی کی اطاعت میں حائل نہ ہوسکیں گے اور خدا اور رسول کے حکم کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی دینے پر آمادہ رہے گا۔ اس طاعت و سپردگی کے مقابلے میں اسے رضائے الہٰی اور تقرب خداوندی کی بشارت دی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں کرتا ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر عہد و پیمان کو توڑتا ہے وہ اسلامی معاشرہ کا فرد نہیں ہوسکتا ہے اور اس عہد شکنی ہی کا نام قرآن کی زبان میں نفاق ہے کافر عہد قبول ہی نہیں کرتا ہے لیکن منافق عہد قبول کرتا ہے لیکن عہد سے وفاداری نہیں کرتا ہے اس لیے قرآن نے بتایا ہے کہ یہ عہد شکن طبقہ باہم ایک جنس ہیں۔ ان کا اسلامی معاشرہ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

آگے ان کی عہد شکنی کی نمایاں مثالیں دی ہیں فرمایا یامرون بالمنکر۔ برائی کا حکم دیتے ہیں تمام اخلاقی رذائل کیلئے قرآن میں سب سے زیادہ عام لفظ منکر ہے۔ اس میں عملی اور اخلاقی رذائل سب ہی داخل ہیں جھوٹ، خیانت، جھوٹی قسمیں وعدہ خلافی، بد دیانتی، غداری، دغا بازی، بہتان، چغل خوری، غیبت اور بدگوئی۔ دورخا پن، بدگمانی، بے ایمانی، چوری، ناپ تول میں کمی، رشوت، سود خواری، شراب نوشی، بغض و کینہ، ظلم، فخر و غرور، ریا، خود بینی، خود نمائی، فحش گوئی، لفظ منکر ان سب کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے وینھون عن المعروف۔ اور نیکی سے روکتے ہیں معروف کے معنے ہیں جس کی اچھائی جانی پہچانی ہو یہ بھی نیکیوں اور اچھائیوں کے لیے ایک عام لفظ ہے اس میں زبان کی سچائی۔ دل کی سچائی۔ عمل کی سچائی صفت پاکبازی دیانتداری، امانت، شرم، رحم، عدل، عہد کی پابندی، احسان، عفو، درگذر، حلم و رفق، تواضع و خوش کلامی، ایثار، درمیانہ روی، استقامت اور حق گوئی، یہ سب ہی معروف میں داخل ہیں۔

قرآن بتارہا ہے کہ منافقین لوگوں کو منکرات کی تلقین کرتے ہیں اور ترغیب دیتے اور معروف سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ یہ ایمان و اسلام کے تقاضوں کی کھلم کھلا بغاوت ہے۔ اس کے باوجود وہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں

بالکل آخر میں فرمایا ہے ویقبضون ایدیھم یعنی جہاد اور راہ خدا میں کچھ خرچ نہیں کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی منکرات ہی میں داخل ہے لیکن اسے نمایاں اس لیے کیا ہے کہ حالات کے تحت اسلام کی اجتماعی زندگی کے لیے یہ خطرے کی گھنٹی ہے۔ اور منافقت کی سب سے بڑی علامت ہے صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کی اس حالت کو ایک عجیب مثال سے سمجھایا ہے۔

منافق کی مثال اس بکری کی ہے جو نر کی تلاش میں دو گلوں کے درمیان کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف ماری ماری پھرتی ہے۔

مادیت کی پرستاری میں منافق کے لیے یہ مثال بڑی معنے خیز ہے۔ منافقوں کی بزدل جماعت کبھی اپنے نفع کی تلاش میں مسلمانوں میں اور کبھی کافروں میں مارے مارے پھرتی ہے۔ اس کا پس منظر، پیش منظر اور تہ منظر صرف دنیا کا مال ہوتا ہے اور مال ہی ان کا معبود ہوتا ہے اس بیماری سے نفرت پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ موثر تشبیہ اور کیا ہوگی۔

نسوا اللہ فنسیھم جس کردار کے ذریعے انھوں نے خدا فراموشی کا مظاہرہ کیا اور زندگی کی ہر شاخ میں ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت کی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اللہ سبحانہ نے ان انعامات سے محروم کر دیا ہے اب ان کو یاد الٰہی، طاعت خداوندی کی توفیق نہ ہوگی اللہ کی توفیق ان کی رفیق ہوتی ہے جو خدا فراموش نہیں ہوتے بلکہ قرآن نے قانون بتایا ہے کہ خدا فراموشی کے نتیجے میں ان پر شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے جو ان کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے کر ان کو کھینچتا پھرتا ہے عنایۃ القاضی میں لکھا ہے کہ خدا کا ان کو بھول جانا کنایہ ہے خدا کو یاد کرنے کی توفیق سلب ہونے سے۔

ان المنافقین ھم الفاسقون اس میں فاسق کے معنے غدار اور عہد شکن کے ہیں ـــــ یعنی ان منافقوں کو ان کے دعویٰ ایمان کی وجہ سے یہ نہ خیال کر لینا کہ یہ مسلمان ہیں ـــــ یہ اسلام کے نام لیوا ضرور ہیں مگر عہد شکن بے وفا اور غدار ہیں۔ انھوں نے طاعت کا عہد کر کے اسے توڑا ہے اور اسلام کا نام لے کر اسلام کے قدموں پر کلہاڑا مارا ہے اس لیے بد عہدی اور غداری میں جو درجہ ان کا ہے کسی کا نہیں ہے۔

آخرت میں منافقین کا انجام

(۶۹) اللہ نے منافق مردوں، منافق عورتوں اور کافروں کے لیے دوزخ کی آگ کا وعدہ کیا ہے۔ اسی میں پڑے

رہیں گے۔ وہی ان کو بس ہے اور اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے برقرار رہنے والا عذاب ہے یعنی یہ ایسی کافی سزا ہے اس کے بعد کسی سزا کی ضرورت نہیں رہتی۔ شاید یہ مطلب ہو کہ دنیا میں بھی خدا کی پھٹکار لعنت کا اثر برابر پہنچتا رہے گا۔ یا پہلے جملہ کی تاکید ہے[1]

اس آیت میں ان منافقین کو آخرت میں ملنے والی سزا کا ذکر ہے۔ یہاں چار سزائیں بتائی گئیں ہیں۔ اولاً، دوزخ کی آگ۔ دوسرے دوزخ میں ان کا خلود۔ تیسرے ان پر لعنت۔ چوتھے۔ عذاب کا دوام بتایا ہے کہ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود ان کو کافروں کے زمرے میں رکھا جائے گا اور ان سے کوئی رعایت نہیں کی جائے گی بلکہ ہمیشہ کے لیے کافروں کے ساتھ جہنم میں رہیں گے اللہ کی طرف سے ان پر لعنت ہوگی جس کے نتیجے میں امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ ایک دائمی عذاب ان پر مسلط ہو گا جس سے کبھی بھی ان کو رہائی نصیب نہ ہو گی۔

یہاں بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ تو ایک لمحہ ہوتا ہے پھر اس کی سزا اتنی طویل کیوں ہے سال دو سال یا عمر بھر کے گناہوں کی سزا صدہا اور ہزار ہا سال کے عتاب سے دینا مناسب نہیں حالانکہ یہ لوگ اگر دنیوی واقعات ہی پر غور کرتے تو ان کی تسلی ہو جاتی۔ دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاتا ہے۔ چوری یا قتل میں کتنی دیر لگتی ہے مگر سالہا سال کی سزا دی جاتی ہے اور اسے کوئی خلاف عقل نہیں بتاتا ——— دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان ذرا سی جسمانی بد پرہیزی سے کبھی ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک عرصہ دراز میں جا کر کہیں ان چند لمحوں کی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے اور آخر میں مر جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلے میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزار ہا گنا زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑتا ہے اس کی تلافی کی مدت غلطی کی نوعیت طبیعت کی صلاحیت اور خلاق عالم کی مصلحت کی بنا پر مختلف ہوتی ہے۔ اسی لیے عتاب طویل سے رہائی کی مدت بھی ہر گنہ گار کے یکساں نہیں ہو سکتی ہے۔

یہاں حضرت امام غزالی کی تحقیق بے حد لطیف ہے وہ فرماتے ہیں کہ انسان اگرچہ ازلی نہیں مگر ابدی ضرور ہے اس لیے اس کو ایک ابدی مستقر چاہیے۔ دنیا اس کا ابدی مستقر نہیں صرف عارضی ہے ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین۔ تمہیں خدا کی زمین پر صرف چند روز رہنا ہے اور ایک وقت مقرر تک اس کی نعمتوں سے کچھ فائدہ حاصل کرنا ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کا دائمی مستقر جنت یا دوزخ ہے۔ اللہ سبحانہ نے اس کی تقسیم اچھے بُرے اعمال پر نہیں رکھی بلکہ ایمان و کفر پر رکھی ہے اس لیے مومن خواہ کتنا ہی گنہ گار کیوں نہ ہو مگر اس کا ابدی مستقر جنت ہی ہوگا۔ اور کافر خواہ کتنے ہی اچھے اچھے کام کیوں نہ کرے لیکن اس کا ابدی مستقر دوزخ ہی ہوگا۔

رہی یہ بات کہ موقت ایمان و کفر کی جزا خلود کیوں رکھی گئی ہے تو اس کا سب سے بہتر جواب وہ ہے جو ابن قتیبہ نے تاویل مختلف الحدیث میں لکھا ہے۔ پھر اس کا خلاصہ حافظ بدرالدین عینی نے شرح بخاری میں اور عبدالوہاب الشعرانی نے الیواقیت والجواہر میں نقل کیا ہے۔

جنت میں خلود اور ابدی زندگی کی بنیاد عمل پر نہیں بلکہ بندہ کی نیت پر رکھی گئی ہے۔ اگر اس کی بنیاد عمل پر ہوتی تو آخرت کی زندگی کی مدت بھی عمل کے مطابق ہونی چاہیے تھی یا زیادہ سے زیادہ دگنی۔ لیکن چونکہ اس کی بنیاد نیت پر رکھی گئی اور اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر اسے ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ملے تو اللہ کی اطاعت ہمیشہ ہی کرے گا۔ اس نیت میں اگر کوئی چیز رکاوٹ بنتی ہے تو وہ صرف موت ہے اس لیے اسے اپنی نیت کے مطابق دوام و خلود ملتا ہے۔
یہی حال دوزخ میں کافر کے خلود و دوام کا ہے[1]

لیکن یاد رہے کہ یقین اور اعتقاد جازم ایمان کی جان ہے۔ اللہ سبحانہ کی جس قدر نعمتیں ہیں وہ سب اس نعمت سے کمتر ہیں۔ اور منافق یقین کی اس نعمت سے محروم ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن مسعود کا ارشاد آیا ہے الیقین الایمان کلہ یقین ہی ایمان کی روح ہے۔ مسند امام احمد میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ دعا آتی ہے۔ اللھم زدنا ایمانا ویقینا وفقھا اے اللہ ہمارے دلوں میں ایمان و یقین اور دین کی سمجھ زیادہ کردے۔ جامع ترمذی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دعائیہ کلمات آئے ہیں واقسم لنا من الیقین ما تھون بہ علینا مصائب الدنیا۔ اے اللہ ہمارے حصہ میں اتنا یقین عطا فرما دیجیے کہ جس سے مصائب کا برداشت کرنا آسان ہو جائے۔ سفیان ثوری محدث بھی ہیں اور فقیہ بھی انھوں نے یہ بات بڑے نکتہ کی فرمائی ہے لو ان الیقین وقع فی القلب کما ینبغی لطار اشتیاقا الی الجنۃ وھربا من النار اگر یقین پوری واقعیت کے ساتھ دل میں سما جائے تو جنت کے اشتیاق اور دوزخ کے ڈر کے مارے دل اڑنے لگے[2]

بہر حال ایمان کی حقیقت صرف جزم و یقین ہے۔ یہی یقین الفاظ کے قالب میں ہو تو ایمان کا وجود لفظی ہے

[1] عمدۃ القاری ج ا ص ۱۴۲
[2] فتح الباری ج ا ص ۱۱

اور جب ترقی کر کے دل میں داخل ہوتا ہے تو ایمان کا وجود ذہنی ہے اور جب پختگی اور رسوخ کے بعد اس میں کیفیت شہود رونما ہو یعنی آپ کی زندگی کے اعمالِ اخلاق میں اس کی نمائش ہو تو یہ ایمان کا وجود خارجی ہے۔ یہی عین ایمان ہے اور ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ اس کے حاصل کرنے میں پوری جدوجہد کرے اگر وہ اس راہ میں قدم نہیں اٹھاتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایمان کے وجود لفظی پر قانع ہے۔

تاریخ کے حوالہ سے کفر و نفاق کو دھمکی

(۷۰) منافقو! تم ان لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے وہ تم سے زیادہ طاقتور اور مال و اولاد میں تم سے زیادہ بہتات والے تھے لہذا وہ اپنے حصے سے فائدہ اٹھا کر چلے گئے۔ تم بھی اپنے حصے سے فائدہ اٹھاؤ۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے تم سے پہلے لوگ اپنے حصے سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اور تمہاری سوچ بھی ویسی ہے جیسی ان کی سوچ تھی۔ یعنی دنیوی لذائذ کا جو حصہ ان کے لیے مقدر تھا اس سے فائدہ اٹھا گئے اور آخری انجام کا خیال نہ کیا۔ تم بھی ان کی طرح آخری انجام کے تصور سے غافل ہو کر دنیا کی متاع فانی سے جتنا مقدر ہے حصہ پا رہے ہو۔ اور ساری چال انہی ہی جیسی رکھتے ہو تو سمجھ لو جو حشر ان کا ہوا وہ ہی تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے پاس مال و اولاد اور جسمانی قوتیں تم سے زیادہ تھیں۔ پھر انتقام الٰہی کی گرفت سے نہ بچ سکے تو تم کو کاہے پر بھروسہ ہے جو خدائی سزا سے اس قدر بے فکر بیٹھے ہو[1]

یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ نصیحت کے موقع پر انداز بیان یہ اختیار کیا ہے کہ اولاً نہایت نرمی سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے باز رہنے کی خوبیاں بیان کرتا ہے اگر مخاطب کی کج فہمی تعمیل میں رکاوٹ بن جاتی ہے اور ماننے کو تیار نہیں ہوتا تو اعمال کی خرابیاں بیان کرتا ہے ممکن ہے کہ وہ خرابیاں سن کر باز آجائے اس کے بعد بھی اگر مخاطب ضد کرتا ہے تو اعمال کا نتیجہ پیش کر کے اس کو جھنجھوڑتا ہے۔ اس پر بھی اگر وہ باز نہیں آتا تو تاریخ سے ان قوموں کے نمونے پیش کرتا ہے جو ان اعمال کی پاداش میں اس تباہی کا شکار ہوتی ہیں چنانچہ یہاں بھی قرآن عزیز نے سب سے پہلے منافقوں کو نرمی سے سمجھایا۔ پھر افعال شنیعہ بیان کیے۔ اس کے بعد ان اعمالِ بد کے نتائج سے خبردار کیا آخر میں ان قوموں کی داستان سے ان کی داستان کو مشابہ بتایا۔ جن کے اعمال ان کی طرح تھے۔ پھر ان قوموں کے نتائج اعمال بتائے اور بتایا کہ ان کی ہی خصوصیت نہیں جو بھی اعمال کی کاشت ان کی طرح کرے گا اس کا انجام یہی ہے۔ اب تک منافقین کو غائب کے صیغوں کے

[1] افادات شیخ الاسلام

ذریعے سے سمجھایا جا رہا تھا۔ یہاں تہدید و تشدید کی خاطر روئے سخن غیبت سے ہٹا کر خطاب کی طرف موڑ دیا۔ بلاغت کی اصطلاح میں اس کا نام التفات ہے کالذین من قبلکم سب سے پہلے حرف تشبیہ لا کر منافقین کے احوال و اطوار کو ماضی کے تاریخی اطوار و احوال کے ساتھ تشبیہ دی ہے یہ بات تو ظاہر ہے کہ منافقین مشبہ ہیں اور الذین من قبلکم مشبہ بہ ہیں اور کاف حرفِ تشبیہ ہے۔ لیکن یہاں وجہ تشبیہ کیا ہے۔ اس میں شارحین قرآن کے خیالات مختلف ہیں۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں تمہارا کردار وہی ہے جو تم سے پہلوں کا ہے۔ اور قرطبی نے زجاج سے نقل کیا ہے کہ اللہ نے ان سے جہنم کا ایسا ہی وعدہ کیا جیسا ان سے پہلوں سے کیا تھا حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ ان پر بھی اللہ کی گرفت عذاب کی ویسی ہی آئے گی جیسے ان سے پہلی قوموں پر آئی ہے۔ حافظ ابن جریر لکھتے ہیں اے پیغمبر ان منافقین سے کہہ دیجئے جو کہتے ہیں انما کنا نخوض و نلعب کہ کیا تم پہلی قوموں کی طرح اللہ کی اہانت اور اس کے رسول کا مذاق کر رہے تھے۔ دراصل کالذین من قبلکم مبتدائے محذوف کی خبر ہے یعنی تم بھی ویسے ہی ہو جیسے تم سے پہلے تھے یعنی تمہارے اور ان کے اعمال میں تشابہ ہے۔ بہر حال یہ دھمکی ہے فرمایا کہ مال و اولاد کی بہتات پر۔۔۔ تمہیں یہ جو دھوکہ ہے کہ تم اللہ کے لاڈلے ہو اور اس لیے چیزوں کی بہتات ہے۔ تم سے پہلے جو قومیں گذری ہیں۔ ان کو اللہ نے تم سے زیادہ دے رکھا تھا۔ ان کے لیے اس دنیا سے جتنا فائدہ اٹھانا مقدر تھا جب انھوں نے اتنا فائدہ اٹھا لیا تو اللہ سبحانہٗ نے ان کو ہلاک کر دیا ان ہی کی طرح اپنے حصے سے تم نے بھی فائدہ اٹھا لیا ہے اور ان ہی کی طرح بد اعمالیوں کا سرمایہ بھی تم نے جمع کر لیا ہے تو اب تمہاری تباہی کا بھی وقت آ گیا ہے جس طرح ان کے اعمال دنیا و آخرت میں کام نہیں آئے اور وہ نامراد ہوئے اسی طرح تمہارے اعمال بھی دنیا و آخرت میں کام نہ آئیں گے اور تم بھی نامراد ہو گے۔ مطلب یہ ہے کہ مال و اولاد کو نہیں اعمال کو دیکھو۔ مال و اولاد تو بدکرداروں اور بدعنوانوں کو بھی مل جاتا ہے۔ اللہ کے فیصلے مال و اولاد پر نہیں اعمال پر ہوتے ہیں۔

دونوں جہان کی محرومی

(۷) دنیا و آخرت میں ان کے اعمال بالکل اکارت اور رائیگان ہو جائیں گے گھاٹے میں رہنے والے لوگ یہی ہیں۔ یعنی کوئی دنیوی و اخروی برکت و کرامت ان کو نصیب نہ ہو گی۔ باقی دنیوی فوائد کا جو حصہ بظاہر ملا وہ فی الحقیقت ان کے حق میں استدراج تھا جیسا کہ دو رکوع پہلے فلا تعجبك اموالھم ولا اولادھم کے فوائد میں گذر چکا اور اس سے بیشتر بھی کئی مواقع پر لکھا جا چکا ہے لہ (افادات شیخ الاسلام)

مطلب یہ ہے کہ دونوں جہان میں کامیابی سے محروم رہیں گے ان کی محنت برباد اور ان کی کوششیں اکارت ہوجائیں گی۔ یہ بڑی معنی خیز تعبیر ہے۔ اس کے بیک وقت دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ دنیا کی زندگی میں دین کے نام پر جو نمائشی کام کیے ہیں وہ سارے کام بیکار ہوجائیں گے اور بیکار ہونے کا مطلب ہے کہ ان کو ان کے اعمال کی جو مسلمانی کا لبادہ پہن کر رہے تھے کوئی قیمت نہ ملے گی وجہ ظاہر ہے کہ اعمال کی مقبولیت کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ ایمان واقعی کی زمین پر ہوں۔ ایمان کے بغیر خواہ کیسا ہی اچھا عمل ہو وہ قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادے اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادے کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسن عمل کا دارومدار ہے۔ عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا۔ جس نے زمانہ جاہلیت میں رفاہ عام کے بڑے کام کیے مگر بایں ہمہ کافر تھا۔ اس کی نسبت حضور اقدس ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک بار دریافت کیا کہ یا رسول اللہ عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت کے زمانے میں جو نیکی کے کام کیے کیا اس کو ان کا ثواب ملے گا فرمایا نہیں، کیونکہ کسی روز اس نے یہ نہیں کہا اللھم اغفر لی۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی وہ کوششیں اور تدبیریں جو وہ قرآن اسلام یا دوسرے الفاظ میں اسلام کے نظام حیات کی مخالفت میں کر رہے ہیں دنیا ہی میں رائیگاں ہوجائیں گی اور اسلام کا بول بالا ہو کر رہے گا۔ اور خواہ کفر کی کتنی بڑی قوتیں متحدہ محاذ قائم کرلیں یہ اپنی کوششوں میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے اور جب دنیا اور آخرت دونوں جگہ ناکامیاں ہی ناکامیاں نظر آئیں گی تو ان کے علاوہ گھاٹے والا اور کون ہو سکتا ہے۔

اقوام ماضیہ کا انجام

(۷۰) کیا ان سے پہلے جو قومیں قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، مدین والے اور الٹی بستی والے گذر چکے ہیں۔ ان کو ان کا پتہ نہیں ہوا ہے؟ ان کے پاس ان کے رسول خدا کی روشن دلیلیں لے کر آئے۔ یہ اللہ کی شان نہ تھی کہ ان پر ظلم کرتا بلکہ یہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ قوم نوح طوفان سے عاد آندھی سے ثمود چیخ سے ہلاک ہوئے ابراہیم علیہ السلام کی عجیب و غریب طریقہ سے تائید فرمائی جنھیں دیکھ کر ان کی قوم ذلیل و ناکام ہوئی۔ ان کا بادشاہ نمرود نہایت بدحالی کی موت مارا گیا۔ اصحاب مدین چیخ زلزلہ وغیرہ سے تباہ ہوئے قوم لوط کی بستیاں الٹ گئیں۔ اوپر سے پتھروں کی بارش ہوئی ان سب قوموں کا قصہ بجز قوم ابراہیم کے سورۂ اعراف میں گذر چکا۔ (افادات شیخ الاسلام)

یہ الذین من قبلکم کے اجمال کی تفصیل ہے۔ یعنی حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت شعیب، اور حضرت لوط علیہم السلام کی قوموں اور دعوتوں کا ذکر کیا ہے۔ حضرت نوح ؑ کا ظہور دریائے دجلہ و فرات کے دوابہ میں ہوا تھا جو انسانی تمدن کا سب سے قدیم گہوارہ ہے قوم نوح کے بعد عرب میں قوم عاد کو عروج ہوا ان کی آبادیاں عمان سے لے کر حضرموت اور یمن تک پھیل گئی تھیں۔ حضرت ہود نے دعوت ان میں ہی پیش کی تھی۔ قوم ثمود عرب کے اس حصے میں آباد تھی جو حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ تک چلا گیا تھا۔ حضرت صالح علیہ السلام کا ظہور ان میں ہی ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ظہور فلسطین کے علاقہ میں ہوا۔ ان کی زندگی بہت ہمہ گیر اور ہمہ رس تھی مختلف ملکوں میں ان کی دعوت کی منادی ہوئی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا ظہور قبیلہ مدین میں ہوا جو جزیرہ نما سینا میں عرب سے متصل آباد تھا۔ حضرت لوط حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور مقام سدوم میں ان کا ظہور ہوا تھا۔

ان تمام قوموں کی سرگذشتیں سورہ اعراف میں گذر چکی ہیں۔ یہاں تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جتنے رسول جتنی قوموں میں آئے وہ کیسے وقتوں میں آئے اور کن لوگوں میں پیدا ہوئے ان کی دعوت کیا تھی؟ جس پر انھوں نے زور دیا ان کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کاربند رہے۔ انھوں نے اپنے قدم جہاں ٹکائے تھے وہ جگہ کونسی تھی اور سہارے کے لیے جس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا وہ کون تھا؟ پھر ان میں اور ان کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے وہ کس قسم کے تھے اور ان معاملات میں ان کا جو قول وفعل رہا وہ کس قسم کا تھا؟ ان ساری باتوں میں ہر رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا اور ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی۔ کسی بات میں بھی تم ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ سب اسی حال میں پیدا ہوئے کہ دنیوی طاقتوں اور حکمرانوں میں سے کچھ اپنے کو خدا کہتے تھے۔ سب کا ظہور ایسے ہی وقتوں میں ہوا جب خدا پرستی اور نیک عملی کی روشنی بجھ چکی تھی۔ سب انہی قوموں میں پیدا ہوئے جن قوموں کو انھوں نے مخاطب کیا تھا۔ سب کی زبانوں پر پکار ایک تھی۔ سب نے ایک طرح سے لوگوں کو بلایا۔ سب نے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سب نے کہا کہ ظلم و بدعملی سے باز آجاؤ۔ اس کا نتیجہ ہلاکت ہے سب نے کہا کہ ہماری جدوجہد ادائے فرض ہے۔ مزدوری کی طلب نہیں سب نے کہا کہ ہمارے پاس علم و یقین ہے۔ ہم تمہیں ظن و جہل سے بچانا چاہتے ہیں۔ سب نے کہا کہ ہمارا دعویٰ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایمان و عمل صالح کے نتائج کی بشارت دینے والے ہیں۔ انکار و بد عملی کے نتائج سے خبردار کرنے والے ہیں۔ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ سب نے کہا کہ تمہارا بھروسہ اپنی طاقتوں پر ہے۔ ہمارا اللہ سبحانہ پر ہے تم جو کچھ کر سکتے ہو کر لو ہم اپنے کام سے باز آنے والے نہیں۔ سب نے کہا کہ اگر مانتے نہیں تو کم از کم حق کے مقابلے

ہیں سرکشی کرنا چھوڑ دو کیونکہ سرکشی کا نتیجہ عذاب ہے۔

آیئے اب ان قوموں کو دیکھئے جن میں یہ انبیاء دعوت لے کر آئے۔ یہاں بھی ہر قوم اپنے طرز عمل میں ٹھیک ٹھیک دوسری قوم کی کاپی ہے اور کس طرح گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک ہی جیسا ہے۔ جس طرح ہدایت کا چہرہ ایک رہا ہے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس میں ظلم و فساد کی ایک نمود ظلم و فساد کی دوسری نمود سے ہم رنگ ہو۔ سب نے اپنی اپنی باری وہی کچھ کیا جو ان میں سے ایک نے کیا تھا۔ سب نے دعوت سے انکار کیا۔ سب نے انبیاء کا مذاق اڑایا۔ سب نے دلیلوں سے بے رخی کی۔ سب نے روشنیوں سے آنکھیں بند کرلیں۔ سب سرکشی کی چال چلے۔ سب نے جبر و تشدد سے دعوت کا مقابلہ کیا۔ سب نے موعظت و نصیحت کا جواب ظلم و تعدی سے دیا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی طرح کی صدائیں نکلیں۔ سب کے اعراض و انکار کا مزاج ایک طرح کا رہا۔ سب کو غرور و طغیان نے آخر وقت تک اس کی مہلت نہ دی کہ روشنی و تاریکی میں امتیاز کرتے۔ پھر انبیاء کی دعوت کو مانا تو کن لوگوں نے اور کتنوں نے مانا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ بے نواؤں اور درماندوں نے قبول کیا۔ اور سرداروں اور رئیسوں نے مقابلہ کیا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ جنھوں نے مانا وہ تھوڑے تھے جنھوں نے انکار کیا وہ بہت تھے۔ نتیجہ بھی ہمیشہ ایک رہا کہ مومنوں نے اپنے ایمان کی وجہ سے نجات پائی اور سرکشوں نے اپنی سرکشی اور ظلم و فساد کی سزا بھگتی۔

یہ گویا اس معاملہ کا قدرتی خاصہ تھا اور خاصہ کبھی بدل نہیں سکتا فما کان اللہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون۔ یعنی اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ لوگوں پر ظلم کرے یہ تو ان کے ظلم کا قدرتی خاصہ ہے کہ ہلاکت ہو۔ یہ آگ کے لیے گرمی اور برف کے لیے ٹھنڈک تھی۔ سنکھیا کے لیے ہلاکت تھی۔ آگ جب سلگے گی۔ گرمی ہی ہوگی۔ برف جب جمے گی ٹھنڈک ہوگی۔ سنکھیا جب کھائی جائے گی ہلاکت لائے گی [1]

توجہ طلب حقیقت

یہی صورت حال حضور اقدس کی بعثت کے وقت بھی پیش آئی۔ دعوت کی آواز مظلوم تھی۔ اس کا انکار جابر و سرکش معاند کر رہے تھے معاندین ہلاک ہوئے۔ مظلومی اور بے چارگی کو کامیابی ہوئی۔

غور فرمائیے کہ ناکامی کن کو ہوئی اور کامیابی کس کو ہوئی اور کتنے عرصہ میں ہوئی صرف ۲۳ سال کے قلیل عرصہ میں۔ معاملہ محض پیغام حق کی تبلیغ کا تھا جو صلح و امن کے ساتھ برابر جاری رہا کس طرح اور کیوں کر اس کے مفصل حالات ہمیں معلوم نہیں۔ یہاں تک کہ ہجرت کے آٹھویں سال عرب کی اندرونی کش مکش ختم ہوگئی۔

[1] ترجمان القرآن

اور تبلیغ نے پہلی منزل کامیابی سے طے کر لی یعنی عرب جوق در جوق گروہ در گروہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ جو وجود اقدس حق و باطل کی پہلی امتحان گاہ میں یعنی غزوہ بدر میں صرف ۳۱۲ جانباز لا سکا تھا۔ وہ تبوک کی جانب روانہ ہوا تو اس کا پرچم حق تیس ہزار سر فروشوں پر لہرا رہا تھا۔ آتنا بڑا لشکر اس سے پہلے عرب کی سرزمین سے کبھی نہیں اٹھا تھا۔

کیا حقیقۃً مسلمانوں اور مخالفوں کا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہزار جانوں کے نقصان کے ساتھ اتنا عظیم القدر کارنامہ انجام دینے کی کوئی مثال روئے زمین کی سرگذشت کے کسی حصے سے بھی پیش کی جا سکتی ہے۔

پھر یہ روشن حقیقت بھی پیش نظر رکھیے کہ اتنے سے معمولی نقصان سے صرف آٹھ نو سال میں یہ سب کچھ عملی صورت میں دنیا کے سامنے آ گیا اور آسمان سے کوئی پتھر نہیں برسے۔ زمین میں کوئی زلزلہ نہیں آیا۔ ہوا اور آندھی کا کوئی جھکڑ نہیں چلا اور مدینہ کی شہری مملکت حیاتِ طیبہ میں روزانہ ۲۷۴ میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی رہی۔ قریباً ہندو پاکستان کے برابر وسیع علاقہ فتح ہوا۔ کیا اس وجود اقدس کے رحمۃ للعالمین ہونے میں کسی کو کوئی شک ہو سکتا ہے۔ لوگ معجزوں کا انکار کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ پُر تاثیر اور ناقابل انکار معجزہ کون سا ہو سکتا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ
يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ
يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ
مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ
ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

ع ۹ ۱۵

اور مومن مرد اور مومن عورتیں باہم ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم رکھتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ و رسول کے حکم پر چلتے ہیں۔ یہی لوگ تو ہیں جن پر اللہ ضرور رحم فرمائے گا بلاشبہ اللہ بڑے غلبے اور حکمت والا ہے ۔ اللہ نے مومن مردوں اور عورتوں سے ایسے باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں سدا رہیں گے اور ان سے ہمیشگی کے باغات میں صاف ستھری رہائش گاہوں کا بھی وعدہ کیا ہے اور سب سے بڑی نعمت رضائے الٰہی ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے ۔

معانی مفردات

اولیاء: یہ ولی کی جمع ہے جیسے نبی کی جمع انبیاء آتی ہے۔ ولی فعیل کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔ اس کے دو مصدر آتے ہیں۔ ولی اور ولایۃ۔ ولی کے معنے لگاؤ، تعلق اور قربت کے ہیں۔ اور لگاؤ کے معنی کی رعایت سے اس کے معنے محبت، قرابت اور رفاقت کے آتے ہیں۔ اسی وجہ سے علماء نے اس کے معنے محبت کرنے والے کے کیے ہیں۔ نکاح اور جنازے کے موقعہ پر عورت کا ولی اور میت کا ولی اسی معنے میں بولا جاتا ہے۔ اس آیت میں بھی اسی معنے میں ہے اردو میں رفاقت اور مددگاری اسی کے لیے آتا ہے

جنات: جنت کی جمع ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جنات بلفظ جمع قرآن میں اس لیے آیا ہے کہ جنتیں سات ہیں (۱) جنۃ الفردوس (۲) عدن (۳) جنۃ النعیم (۴) دار الخلد (۵) جنۃ الماویٰ۔ (۶) دار السلام (۷) علیین۔

رضوان: رضامندی۔ خوشنودی، مرضی۔ رضا، رضی یرضی کا مصدر ہے رضا کثیر یعنی بڑی رضامندی اللہ کی رضامندی ہے اور نہایت خوشنودی کو رضوان کہتے ہیں اور چونکہ سب سے بڑی رضامندی اللہ کی رضا ہے اس لیے قرآن میں رضوان کا لفظ جہاں بھی استعمال ہوا ہے رضائے الٰہی کے لیے خاص ہے۔

اہلِ ایمان کا چہرہ

اس سے پہلے مردم شماری کے ان مسلمانوں کا چہرہ پیش کیا گیا تھا جو ایمان کا دعوے کرتے تھے مگر ایمان کا کوئی تقاضا پورا نہ کرتے تھے بلکہ ان کی زندگی کفر کے تقاضوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ اب ان منافقین کے مقابلہ ان مخلصین کا چہرہ پیش ہو رہا ہے جو زندگی کی ہر شاخ میں ایمان کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ باہم محبت و وداد سے دل جڑے ہوئے ہیں سب کے پیش نظر ایک مقصد ہے اور مقصد کی خاطر سب کی لگن ایک ہے، ان میں اتحاد بھی ہے ایتلاف بھی ہے اور ان میں پورا پورا نظم بھی ہے وہ ایک مرکز سے وابستہ ہیں۔ اس سے زیادہ بھرپور چہرہ پیش نہیں کیا جا سکتا جو ان چند جملوں میں پیش کر دیا گیا ہے بلکہ اس سے زیادہ خوبصورت بات کسی انسانی گروہ کی مدح و ستائش میں نہیں کی جا سکتی۔ جو ان جملوں میں کہہ دی گئی ہے ایمان۔ باہمی محبت معروف کے حکم اور منکر کی روک تھام، نماز، زکوٰۃ کے ساتھ پوری زندگی میں طاعت کی سرشاریوں کے بعد کون سی چیز باقی رہ گئی۔ خواہ اس کا دائرہ کوئی ہو۔

(۷۲) اور مومن مرد اور مومن عورتیں باہم ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ و رسول کے حکم پر چلتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ ضرور رحمت فرمائے گا۔ بلاشبہ اللہ بڑے غلبے اور حکمت والا ہے۔ ابتدائے رکوع میں منافقین کے اوصاف بیان ہوئے ہیں یہاں بطور مقابلہ مومنین کی صفات بیان ہوئی ہیں یعنی جب کہ منافقین لوگوں کو بھلائی سے روک کر برائی کی ترغیب دیتے ہیں مومنین بدی کو چھڑا کر نیکی کی طرف آمادہ کرتے ہیں۔ منافقین کی مٹھی بند ہے مومنین کا ہاتھ کھلا ہوا ہے وہ بخل کی وجہ سے خرچ کرنا نہیں جانتے یہ اموال میں سے باقاعدہ حقوق زکوٰۃ وغیرہ ادا کرتے ہیں انھوں نے خدا کو بالکل بھلا دیا یہ پانچ وقت خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اور تمام معاملات میں خدا اور رسول کے احکام پر چلتے ہیں اسی سے وہ مستحق لعنت ہوئے اور یہ رحمت خصوصی کے امیدوار ٹھہرے[1]

آیت کی تشریح سے پہلے ذرا اس پر غور فرمائیے کہ یہاں نفاق و ایمان کا ایک جامع اور اہم تقابل مطالعہ پیش کیا ہے۔

(۱) نفاق کے مقابلے میں ایمان۔
(۲) ان کی ہم آہنگی کے مقابلے میں اہل ایمان کی ولایت۔
(۳) امر بالمنکر کے مقابلے میں امر بالمعروف۔
(۴) نہی عن المعروف کے مقابلے میں نہی عن المنکر۔
(۵) قبض ایدی کے مقابلے میں ایتاء زکوٰۃ۔
(۶) خدا فراموشی کے مقابلے میں اقامت صلاۃ۔
(۷) فسق کے مقابلے میں اطاعت۔
(۸) لعنت کے مقابلے اللہ کی رحمت۔
(۹) نار کے مقابلے میں جنات۔
(۱۰) عذاب مقیم کے مقابلے میں رضوان من اللہ اکبر۔

یہ ایمان و کفر میں باہمی تقابل نہیں بلکہ ایمان و نفاق میں تقابل ہے۔
حکیم الامت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔

[1] افادات شیخ الاسلام

حضور اقدس ﷺ کی بعثت پوری مخلوق کی طرف چونکہ اس لیے ہوئی ہے کہ آپ کا دین دنیا کے سارے ادیان پر غالب و برتر ہو۔ اس لیے آپ کے دین میں چند قسم لوگوں کا ہونا ناگزیر ہوا۔ ان اقسام میں ایک امتیازی کسوٹی آپ نے بتائی ہے پہلی کسوٹی تو ان لوگوں کے لیے ہے جو دین کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں امتیاز بتائے۔ دوسری کسوٹی ان کے لیے جو دین میں پوری بشاشت اور اخلاص سے داخل ہیں اور ان میں جو دین میں داخل ہیں لیکن ان میں بشاشت ایمان نہیں ہے۔ اس لیے حضور اقدس نے ایمان کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وہ ایمان جس پر احکام دنیا کا مدار ہے یعنی جسے اختیار کرنے کے بعد اس کی جان مال آبرو محفوظ ہو جائے۔ دوسرا وہ ایمان جس پر آخرت کی نجات موقوف ہے پہلے ایمان کا مقابل کفر ہے جب کہ دوسرے ایمان کا مقابل نفاق ہے چاہے اندر تصدیق نہ ہو تلوار کے خوف سے ظاہر میں مسلمان ہوا ور چاہے تصدیق کرتا ہو مگر عملی زندگی میں ایمان کے تقاضے پورے نہ کرتا ہو۔ پہلا اصلی منافق ہے دوسرا عملی نفاق ہے اسی کو فاسق بھی کہتے ہیں۔

ان آیات میں کفر و ایمان کا نہیں بلکہ ایمان و نفاق کا مقابلہ پیش کیا ہے۔ منافقین کے مقابلے میں ان کے دس اوصاف بتائے گئے ہیں۔

صحابہ کرام میں صفتِ ایمان

اوّل ایمان۔ نام ہے اس یقین جازم کا جس میں شک کا کوئی کانٹا نہ ہو۔ ایسا یقین جازم جس کے نتیجے میں انقیاد باطن۔ التزام طاعت اور عہد وفاداری نمایاں ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ صرف تصدیق قلبی نہیں بلکہ انقیاد قلبی اور التزام طاعت بھی اس کا ایک اہم جز ہے اگر ایک شخص تصدیق رکھتا ہے مگر عہد وفاداری نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور اسلام کے قانون پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی مصمم ہو گویا شرعی تصدیق اسی کا نام ہے۔

امام حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ایمان صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ اور آرزوئں کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان اسے کہتے ہیں جو دل میں سرایت کر جائے اور اعمال بھی اس کی تصدیق کریں۔

صحابہ کرام کا ایمان صرف ایمان نہیں بلکہ نمونہ کا ایمان ہے امنوا کما امن الناس میں اس کی طرف

اشارا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعویٰ ایمان کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار صرف صحابہ کرام کا ایمان ہے۔ جو اس کے مطابق نہیں وہ قرآن کی نظر میں ایمان نہیں۔ اس ایمان کو نفاق کے مقابلے میں لایا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کا ایمان صرف زبانی دعویٰ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے انھوں نے واقعی اپنا لیا ہے جو ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے اور وہ اس پر خوش ہیں کہ اللہ ان کا رب ہے اسلام ان کا دین ہے اور حضور اقدس اللہ کے رسول ہیں۔ اور اس میں اس قدر سرشار ہیں کہ اس سرشاری میں ان کو ایمان کی حلاوت محسوس ہوتی ہے ارشاد ہے۔

جس شخص میں تین باتیں ہوں گی اسے ایمان کا مٹھاس محسوس ہوگا اللہ و رسول اسے سب سے زیادہ محبوب ہوں جب وہ کسی سے محبت کرے تو بس اللہ کے لیے کرے۔ کفر میں واپس جانے کو ایسا ہی برا مانے جیسا آگ میں گرنے کو۔

صحابہ کرام میں صفتِ ولایت

دوسری صفت صحابہ کرام کی یہ بتائی گئی ہے۔ بعضھم اولیاء بعض اولیاء ولی کی جمع ہے ولی کے معنے محبت، مددگار بھائی کے ہیں یعنی صحابہ میں باہم محبت ہے۔ یہ محبت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے محبت کی تصویر صحیحین کی حدیث میں یہ بتائی گئی ہے۔

مسلمانوں کی باہم محبت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اس کے مختلف اعضاء ایک عضو میں اگر درد ہو تو سارا جسم درد محسوس کرتا ہے اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں اس محبت کی یہ مثال دی ہے۔

مسلمان کی مسلمان کے لیے مثال دیوار کی سی ہے ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا لیتی ہے۔

پھر تشبیک اصابع سے اس کی تصویر بتلا دی یعنی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر کہ اس طرح ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور متصل ہے۔ ان احادیث میں بھی بتایا گیا کہ مسلمانوں کی محبت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے دیوار کا نام ہے الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ ہے تو اجتماعی وجود ہے منافقین کے تذکرے میں بعضھم من بعض اور یہاں بعضھم اولیاء بعض فرمایا۔ اشارا ہے کہ مومنین میں تعلق اخوت مودۃ اور بھائی چارے کا ہے جب کہ منافقین میں ہم آہنگی صرف شکوک اور

تذبذب میں ہے۔ اہلِ ایمان کا باہم تعلق اصول و مقاصد کی بنا پر ہے جب کہ منافقین میں ہم آہنگی اغراض کی بنیاد پر ہے۔ اہلِ ایمان زبان کی سچائی دل کی سچائی اور عمل کی سچائی کی تصویر ہیں جبکہ منافقین رذائل کی نمائندگی کرتے ہیں

صحابہ کرام میں امر بالمعروف

تیسری بات صحابہ کرام کے بارے میں یہ بتائی گئی ہے کہ یہ جماعت امر بالمعروف کرتی ہے اور چوتھی یہ کہ یہ جماعت برائیوں سے روکتی ہے۔ تمام ایسی خوبیاں، بھلائیاں، نیکیاں جو سب کی جانی پہچانی ہوں معروف کہلاتی ہیں۔ ان کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اہلِ ایمان کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ قرآن نے اسی کو اہلِ ایمان کے دوسری امتوں کے مقابلے میں برتر اور بہتر ہونے کا معیار قرار دیا ہے۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر۔ دیکھو آلِ عمران جلد چہارم کا نوٹ ۱۹۲-۲۰۳۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں ہر وہ اچھی بات حالت عادت اور کام جسے عقل پسند کرے اور اس پر جی مطمئن ہو۔ معروف کہلاتا ہے قرآن میں یہ لفظ کئی بار آیا ہے اور اس میں بڑی جامعیت ہے اس کے معنے میں ہر نیک کام جس میں اللہ کی اطاعت یا لوگوں سے حسنِ سلوک ہو یا جس کام کی اخلاق نے ترغیب دی ہو داخل ہے۔ معروف حسن صحبت اور حسنِ معاشرت کو بھی کہتے ہیں۔ مروت اور احسان کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں حسن اخلاق، حسنِ گفتار، حسنِ کردار، حسنِ معاملہ، حسن سلوک، حسنِ ادا اور انسانی اقدار سے متعلق ہر نیکی کو معروف کہا گیا ہے۔ گویا قرآن و سنت کی زبان میں لفظ معروف تمام اخلاقی، مالیاتی، انتظامی، معاشی، تمدنی، تہذیبی، سیاسی فضائل اور خوبیوں کے لیے ایک جامع لفظ ہے اور معروف کی طرح منکر میں بھی جامعیت ہے یہ لفظ تمام اخلاقی، تمدنی، تہذیبی، مالیاتی، معاشی سیاسی اور انتظامی رذائل کے لیے بولا جاتا ہے۔ مطلب ہے کہ اہلِ ایمان کے سارے احوال، اطوار اور اقدار میں معروف ہی معروف ہے منکر کا کہیں نام و نشان نہیں بلکہ وہ دنیا میں معروف پھیلا رہے ہیں اور منکرات کو روک رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو منکرات کو پھیلا رہے ہیں اور خوبیوں پر قدغن قائم کر رہے ہیں۔ انصاف سے کہیے کہ زندہ رہنے کا حق کس کو۔ اس کو جس کا وجود انسانیت کی پیشانی پر داغ ہے یا اس کو جو انسانیت کے چہرے کا غازہ ہے۔

یہی تو وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کے اخلاق کی نگرانی کے لیے اصول کو ممتاز کرتی ہے اور قومی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی

اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

صحابہ کرام میں اقامتِ صلاۃ

پانچویں اور چھٹی بات یہ بتائی گئی ہے کہ یہ اہل ایمان نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ سے بندوں کے تعلقات دو طرح کے ہیں ایک محبت کے دوسرے محکومیت کے۔ محبت کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کے اللہ سبحانہ محبوب ہیں۔ محکومیت کا مطلب یہ ہے کہ بندے اللہ سبحانہ کے محکوم اور اللہ حاکم ہیں۔ محبت کے اعتبار سے اللہ کی پرستش کی جاتی ہے۔ جب کہ حاکم ہونے کے اعتبار سے اللہ کی بندگی کی جاتی ہے اسلامی عبادات میں دو عبادتیں روزہ اور حج، اللہ کی محبوبیت کا مظہر ہیں جب کہ نماز اور زکوٰۃ، اللہ کی بندگی کا شاہکار ہیں۔ اسی لیے قرآن نے کسی حکومت کے اسلامی ہونے کا پیمانہ یہ بتایا ہے۔

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں گے تو نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں گے۔

اس کا مطلب ہے کہ اہل ایمان کا اللہ سے محکومانہ تعلق ہے۔ ان کے قلب و دماغ پر اللہ سبحانہ کی حاکمیت کا سکہ ہے۔ جب کہ منافقین کا اللہ سے محکومانہ تعلق مخلصانہ نہیں ہے۔ منافقین خدا فراموش ہیں اور اہل ایمان میں یاد الٰہی کی سرشاریاں اقامتِ صلاۃ کی صورت میں موجود ہیں۔ منافقین راہ خدا میں خرچ کرنے میں بخیل ہیں جب کہ اہل ایمان حُبِّ مال سے دور ہیں اور راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔

ان ہی دو کو توبہ کے بعد اسلامی زندگی کی نشانی قرار دیا ہے۔ قرآن میں ہے۔

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین۔

اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں دینی اخوت کا پیمانہ بھی نماز اور زکوٰۃ ہیں۔

اسلام کی تعلیم اور قرآن میں نماز اور زکوٰۃ کو یک جا ذکر کیا گیا ہے نماز اگر حقوق اللہ سے تعلق رکھتی ہے تو زکوٰۃ کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ ان دونوں فریضوں کا باہم لازم و ملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ہم آہنگی رکھی گئی ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں نماز کا ذکر

ہے اس کے ساتھ ہی زکوٰۃ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن کے جس مقام پر دونوں کو یکجا ذکر کیا گیا ہے۔ بارگاہ نبوت میں آکر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کیے تو ہمیشہ آپ نے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کو بیان فرمایا صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں بلکہ کبھی کبھی ان دونوں کو اسلام کی شرائط بیعت ہی میں داخل کر لیا۔ چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت تین باتوں پر کی تھی نماز، زکوٰۃ اور ہر مسلمان کی خیر خواہی۔ اسی پر بس نہیں ایک قدم بڑھا کر اس پر بھی غور فرمائیے کہ اسلام میں جنگ کے خاتمہ کے لیے بھی توبہ کے بعد ان دو کو اساس قرار دیا ہے۔ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ:

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مجھے حکم ہوا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک وہ یہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ نمازیں ادا کریں زکوٰۃ دیں۔ جب یہ کرلیں تو میری جانب سے ان کو ان کی جانوں اور مالوں کے تحفظ کی ضمانت ہے سوائے اس کے کہ قانون ہی گرفت کرے اس کے بعد ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

اس کے بعد یہ تحقیق ہی نہ کی جائے گی کہ یہ نمازیں اور زکوٰتیں حقیقی ہیں۔ یا ناشی اور وقتی، بہرحال اسلام میں ان دونوں کو خاص اہمیت ہے ان میں سے ایک کا انکار اسلام میں فوجداری جرم ہے۔

صحابہ میں طاعت کی سرشاریاں

اہل ایمان میں اللہ ورسول کے لیے طاعت کی سرشاریاں ہیں۔ طاعت اللہ سبحانہ کی شان حاکمیت کا تقاضا ہے جیسے عبادت اللہ کی شان محبوبیت کا تقاضا ہے۔ حاکمیت میں نیابت ہو سکتی ہے اس لیے خدا کی نیابت سے میں رسول کی طاعت کا حکم ہے۔ اور رسول کی طاعت کو بھی خدا کی طاعت کہا گیا ہے۔ اسی نیابت کی وجہ طاعت کا دائرہ قرآن میں وسیع کر دیا گیا ہے خدا کے رسول کی اطاعت کے ساتھ مسلمان اولی الامر کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے۔

یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔

اسی لیے ارشادات میں یہ بات پوری قوت سے سمجھائی گئی ہے۔

من اطاعنی فقد اطاع اللہ من اطاع امیری فقد اطاعنی من عصی امیری

نقد عصانی۔

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، جس نے میرے امیر کی اطاعت کی، میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

یعنی امیر المومنین کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔

اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی۔

ایک حقیر صورت حبشی بھی امیر ہو تو چاہیے اس کی سنو اور طاعت کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بار بار اور کثرت سے آپ خطبوں میں ارشاد فرماتے تھے۔ اس سے مختلف لفظوں میں اور مختلف مواقع کی نسبت مروی ہے۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا۔

لو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب اللہ اسمعوا واطیعوا۔ (مسلم)

اگر کوئی غلام بھی تم پر امیر ہو اور وہ کتاب اللہ کی ساتھ تم پر حکومت کرے تم اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔

اطاعت امیر کی اسی زندگی کو احادیث میں جماعت اور اسلامی زندگی قرار دیا ہے اور اس کے عکس کو جاہلیت

صحیح بخاری ومسلم میں ہے۔

جس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا اور خلافت کی طاعت سے باہر ہو گیا اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

اس کے علاوہ بے شمار احادیث ہیں جن میں یہی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ بہر حال آیت قرآن کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کی زندگی سر تا سر اسلامی ہے وہ جماعت میں منسلک ہیں اور حضور اقدس کی پر خلوص طاعت کرتے ہیں، منافقین کی طرح نہیں کہ صرف اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے طاعت کرتے ہیں اور مفادات کو خطرے میں دیکھ کر اطاعت کا جوا اتار کر پھینک دیتے ہیں۔ مقدمات یہودی عدالتوں میں لے جاتے ہیں اور قرآن پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت نبوت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن نبوت کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے۔

اہلِ ایمان اللہ کی رحمت کے حقدار ہیں

ان اہلِ ایمان پر جن کے یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں کہ وہ نعمت ایمان سے مالا مال ہیں۔ اور آپس میں اتحاد ایتلاف امتزاج اور نظم رکھتے ہیں۔ زندگی میں نیکیوں کی تلقین کرتے ہیں۔ برائیوں کو مٹاتے اور ان سے روکتے ہیں۔ خدا کی بندگی کے لیے اقامتِ صلاۃ اور ایتاء زکوٰۃ کرتے ہیں اور سب خوبیوں کے ساتھ زندگی کے ہر گوشہ اخلاق۔ خاندان۔ معاشرت۔ معاش۔ سیاست۔ قانون اور روحانیت میں اللہ اور نائب کی حیثیت سے اس کے رسول کی اطاعت کی سرشاریوں سے مالا مال ہیں۔ ان پر اسی دنیا میں اللہ ضرور رحمت فرمائے گا سیرحمھم میں س تاکید کے لیے ہے۔

اہلِ ایمان۔ اور منافقین کا کردار الگ الگ آپ نے پڑھ لیا اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اگرچہ ایمان کے ظاہری افراد کی حد تک دونوں میں ہم آہنگی ہے اور اسلام کی پیروی کے خارجی اظہار میں دونوں مشترک ہیں لیکن دونوں کے مزاج اخلاق، اطوار، عادات اور طرز فکر و عمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جہاں زبان پر ایمان کا دعویٰ ہے مگر دل سچے ایمان سے خالی ہیں وہاں زندگی کا سارا ڈھنگ ایسا ہے جو اپنی ایک ایک ادا سے دعویٰ ایمان کی تکذیب کرتا ہے۔ لیبل تو ایمان کا لگا رکھا ہے۔ مگر کردار و اخلاق سے اس نمائشی لیبل کی تائید نہیں ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے جہاں ایمان اپنی اصل حقیقت کے ساتھ موجود ہے وہاں ایمان اپنی صورت اپنی مہک اپنی خاصیت سے اپنے تقاضے سے ہر آزمائش اور ہر معاملہ میں اپنا کھرا پن ظاہر کر رہا ہے۔ اسلام و ایمان کے عرفی نام نے بظاہر دونوں اہلِ ایمان اہلِ نفاق کو ایک امت بنا رکھا ہے مگر فی الواقع منافق مسلمانوں کا اخلاقی مزاج اور رنگ طبیعت کچھ اور ہے اور صادق الایمان مسلمانوں کا کچھ اور۔ اسی لیے منافقانہ خصائل و عادات والے مسلمان معاشرے میں خصوصی علامات سے پہچانے جاتے ہیں مثلاً یاد الہٰی سے غفلت۔ برائی سے دلچسپی۔ نیکی سے بعد اور خیر سے عدم تعاون کی مشترک خصوصیات نے ایک دوسرے سے وابستہ اور اہلِ ایمان سے عملاً بے تعلق کر دیا ہے۔ اور دوسری جانب سچے مرد و زن ایک دوسرا گروہ ہیں جس کے سارے افراد میں یہ خصوصیات مشترک ہیں کہ نیکی سے وہ دلچسپی رکھتے ہیں بدی سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ اللہ کی یاد ان کے لیے غذا کی طرح زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے۔ راہ خدا میں خرچ کرنے کے لیے ان کے دل اور ہاتھ کھلے ہیں اور خدا اور رسول کی اطاعت ان کی زندگی کا شعار ہے اس مشترک اخلاقی مزاج اور طرز زندگی نے ان میں باہم اتحاد ایتلاف اور امتزاج پیدا کیا ہوا ہے اور منافقین کے گروہ سے ممتاز کر دیا ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے اللہ کا وعدہ

(۷۲) اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں سدا رہیں گے اور ان سے ہمیشگی کے باغات میں صاف ستھری رہائش گاہوں کا وعدہ کیا ہے اور سب سے بڑی نعمت رضائے الٰہی ہے یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ یعنی تمام نعمائے دنیوی و اخروی سے بڑھ کر حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے جنت بھی اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ رضائے الٰہی کا مقام ہے۔ حق تعالیٰ شانہ مومنین کو جنت میں ہر قسم کی جسمانی و روحانی نعمتیں اور مسرتیں عطا فرمائے گا۔ مگر سب سے بڑی نعمت محبوب حقیقی کی دائمی رضا ہو گی۔ حدیث صحیح میں ہے۔ کہ حق تعالیٰ شانہ اہل جنت کو پکاریں گے۔ جنتی لبیک کہیں گے دریافت فرمائے گا هل رضیتم یعنی اب تم خوش ہو گئے جواب دیں گے کہ پروردگار خوش نہ ہونے کی وجہ کیا جبکہ آپ نے ہم پر انتہائی انعام فرمایا ہے ارشاد ہو گا هل اعطیكم افضل من ذالك۔ یعنی جو کچھ اب تک دیا گیا ہے کیا اس سب سے بڑھ کر ایک چیز لینا چاہتے ہو جنتی سوال کریں گے کہ اے پروردگار اس سے افضل اور کیا چیز ہو گی اس وقت فرمائیں گے۔ احل لكم رضوانی فلا اسخط عليكم بعده ابداً۔ اپنی دائمی رضا اور خوشنودی تم پر اتارتا ہوں جس کے بعد کبھی خفگی اور ناخوشی نہ ہو گی۔ رزقنا الله وسائر المومنين هذه الكرامة العظيمة الباهرة[1]

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے اہلِ ایمان سے یہ وعدے فرمائے ہیں۔

① باغات جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔
② ہمیشگی اور دوام۔
③ صاف ستھری رہائش جنت عدن میں۔
④ رضائے الٰہی۔

سب سے پہلے جنات تجری من تحتها الانهار ہے۔ آخرت کے خانہ عیش و عشرت کے لیے قرآن حکیم نے عموماً جنت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نادان اس کی وجہ یہ سمجھتے ہیں کہ عرب کے شور و بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے مگر سمجھنا یہ چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے اس لیے عرب کی تخصیص بے معنے ہے کیا دنیا کے سرسبز شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ وراغ اور رنگ وگل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان وگلستان کی تخصیص نہیں ہے یہ فطرت انسانی کی تصویر ہے۔ انسان کسی خطہ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز وشاداب قطعات باغ وبہار اور کنار آب ونہر کو عیش ومسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارے کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے اہل وعیال اور مال ودولت کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں مگر جب انسان سیر وتفریح کے لیے باغ وچمن کا رخ کرتا ہے تھوڑی دیر کے لیے وہ ہر غم کو بھول جاتا ہے اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم والم اس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے اس لفظ کو اس لیے استعمال کیا ہے تاکہ اس سے اخروی عیش ومسرت شادی وخوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر سامنے آجائے۔

دوسرا وعدہ یہ فرمایا ہے کہ اہل ایمان جنت میں سدا رہیں گے یعنی مکان جنت اور مکین اہل ایمان کو اس زندگی میں بقائے دوام حاصل ہوگا۔ یعنی جنت ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے۔ جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی، جہاں کی لذت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔

اس تاکید پر تاکید اور پُر زور طریقہ تعبیر پر نظر ڈالیے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ابداً فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلود جنت کی قطعیت کتنی ہے۔

فنائے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ راحت ومسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے پہلی صورت کی نفی تو قرآن نے فیہا مقیم۔ اکلہا دائم۔ اجر غیر ممنون۔ کہہ کر فرما دی اب رہ گئی دوسری صورت تو اگرچہ خالدین فیہا ابداً میں اس کی نفی بار بار فرما دی مگر ایک جگہ بالتصریح یہ کہہ دیا ہے کہ لا یذوقون فیہا الموت۔ ایک تیسری صورت یہی ممکن تھی کہ مسرت کے اسباب بھی رہیں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائمی ہو مگر کچھ دنوں کے بعد نکال دیا جائے تو اس کی بھی تصریح فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہل جنت کو ان کے عیش وآرام کی منزل گاہوں سے نکال سکے فرمایا وما ہم منہا بمخرجین یہ بھی ممکن ہے کہ خود اہل جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا کہ ان کی جبلت وفطرت ایسی ہوگی کہ وہ خود بھی اس مہمان خانہ الٰہی سے نکلنا پسند نہ

کریں گے خالدین فیھا لایبغون عنھا حولا۔ اب آخری بات رہ گئی کہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے لیکن اس کی ضمانت کیا ہے کہ اللہ سبحانہ اہل جنت سے ہمیشہ راضی رہیں ممکن ہے کہ اللہ سبحانہ ناراض ہوجائیں اور اس کی پاداش میں اس ابدی گھر سے بے گھر ہونا پڑے۔ اس امکان کو حضور اقدس ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعے امت کو سمجھایا۔ امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بتایا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہ اہل جنت سے فرمائیں گے کہ اے اہل جنت جنتی کہیں گے لبیک وسعدیک جی جی، اللہ سبحانہ فرمائیں گے کیا تم خوش ہوگئے؟ جنتی کہیں گے اے مولا خوش کیوں نہ ہوں۔ آپ نے ہم پر وہ انعامات نچھاور کیے ہیں جو مخلوقات میں سے کسی کو نہیں ملے۔ اللہ سبحانہ فرمائے گا کیا میں تمہیں اس سے زیادہ اپنی نعمت نہ دے دوں۔ جنتی کہیں گے اے مولا اس سے اونچی نعمت اور کیا ہوگی۔ اللہ سبحانہ فرمائے گا لو میں تم پر اپنی رضا اتارتا ہوں۔ اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔

تیسرا وعدہ یہ فرمایا کہ ان کو جنت میں صاف ستھری رہائش گاہیں ملیں گی۔ ومساکن طیبۃ صاف ستھری، رہائش گاہیں کیسی ہوں گی۔ حضور اقدس ﷺ نے ایک سے زیادہ احادیث میں ان مساکن کا چہرہ پیش کیا ہے، یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ مساکن طیبہ کے ساتھ فی جنات عدن کی بھی قید ہے۔ عدن کو بعض علماء عَلَم قرار دیتے ہیں وہ اس کو جنت میں خاص مقام کا نام بتاتے ہیں اور دلیل میں اس آیت شریفہ کو پیش کرتے ہیں۔

جنات عدن التی وعد الرحمان عبادہ بالغیب۔

کیونکہ یہاں معرفہ کو اس کی صفت لایا گیا۔ نیز بزاز اور دارقطنی اور ابن مردویہ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کی ہے۔ کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ہے عدن اللہ سبحانہ کا بنایا ہوا گھر ہے کہ جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی بشر کے دل پر اس کا خیال آیا ہے۔ اس میں انبیاء، صدیقین اور شہداء ان تینوں کے علاوہ کوئی نہ رہنے پائے گا اور اللہ سبحانہ فرمائیں گے اے عدن جو تجھ میں داخل ہوا اس میں خوبی ہے اور جو لوگ عدن کو علم نہیں بلکہ جنت کی صفت بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عدن کے معنے اصل میں استقرار اور ثبات کے ہیں محاورہ ہے عدن بالمکان یعنی اس نے اس جگہ قیام کیا اور عدن سے مراد اقامت علی وجہ الخلود ہے یعنی دائمی طور پر رہنا بسنا اور عدن کے یہی معنے مقام مدح کے مناسب ہیں یعنی جنات اقامت وخلود۔ اس معنے کے اعتبار سے تمام جنتیں جنات عدن ہیں۔ (روح المعانی)

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ جنات سات ہیں۔ دار الخلد، دار الجلال۔ دار السلام۔ جنت عدن۔ جنۃ الماویٰ۔ جنۃ نعیم۔ جنۃ الفردوس۔

امام بغوی نے تفسیر معالم التنزیل میں عدن پر اچھا تبصرہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ عدن جنت کا درمیانی حصہ ہے۔ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جنت میں ایک محل کا نام عدن ہے اور حضرت الحسن البصری کہتے ہیں جنت میں سونے کے محل کا نام عدن ہے اور عطاء ابن السائب کہتے ہیں کہ جنت میں ایک نہر کا نام عدن ہے۔ امام مقاتل کہتے ہیں کہ عدن جنت میں اعلیٰ درجہ کا نام ہے۔ بہرحال آیات و احادیث کے مجموعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عدن جنت میں ایک اعلیٰ مقام ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ حدیث جسے امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ارشاد ہے کہ:

جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ سبحانہ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے جنت میں تیار کیے ہیں ہر دو درجہ کی درمیانی مسافت اتنی ہے جتنی آسمان و زمین کے درمیان۔ لہٰذا جب تم اللہ سے جنت مانگو۔ تو جنت الفردوس مانگا کرو وہ جنت میں بہترین اور اعلیٰ جگہ ہے اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں اور اس سے بالا اللہ کا عرش ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوس ہی کا نام عدن ہے۔ ویسے علی الاطلاق جنت میں اعلیٰ ترین درجہ کا نام الوسیلہ ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی درجہ ہے۔ آپ اذان ختم ہونے پر دعا مانگتے ہیں۔

اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلاۃ القائمۃ آت محمد الوسیلۃ والفضیلۃ والدرجۃ الرفیعۃ وابعثہ مقاما محمودن الذی وعدتہ۔

آخر میں چوتھا وعدہ یہ فرمایا ہے ورضوان من اللہ اکبر اور رضائے الٰہی بہت بڑی چیز ہے۔ جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقام رضوان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے سے راضی ہونا ہے کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندے پر عتاب فرمائے گا نہ اس سے ناراض ہوگا بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا اس سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلی آیت میں جس قدر اوصاف اہل ایمان کے بتائے گئے۔ ایمان ولایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت صلاۃ، ایتاء زکوٰۃ، اور اللہ و رسول کی بے قید طاعت یہ صرف اوصاف نہیں بلکہ اہل ایمان کے فرائض ہیں۔ ان فرائض کی پابجائی میں اہل ایمان

پیش نہاد صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اطاعت کے تصور کے ساتھ اجر کا تصور اس طرح لازم ہے جس طرح سورج کے ساتھ روشنی اور گرمی کا تصور اس لیے اگر دین کا بنیادی تصور اور مسلمان کا فریضہ حیات اللہ کی طاعت ہے تو کوئی شک نہیں کہ اس طاعت سے اس کا مقصد و منشا اللہ سبحانہ سے اجر کا حصول ہوگا۔ پھر چونکہ کسی بالاتر ہستی کی خدمت و طاعت کا اجر حاصل اسی وقت ہوتا ہے جب وہ کار خدمت اور عمل طاعت کو پسندیدہ اور قابل قبول پا کر اس سے خوش ہو گیا ہو اس لیے فطری بات ہے کہ طالب اجر کی نظر اجر سے پہلے اپنے مالک کی خوشنودی پر جمے گی وہ اگر خوش ہو گیا تو گویا اجر حاصل ہو ہی گیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر قرآنی انداز بیان کا واضح تقاضا یہ ہوا کہ اہل ایمان کی غرض اللہ سبحانہ کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اور اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے ان کی نظر ہر وقت اسی مقصد پر جمی رہتی ہے۔ خود قرآن نے ان کے اعمال کے اس پس منظر کا ذکر کیا ہے۔ یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ جو بھی نیکی کرتا ہے اسی ارادہ سے کرتا ہے کہ اس سے اللہ سبحانہ خوش ہو جائے و مالاحد عندہ من نعمۃ تجزی الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلی۔ اور آخری بات یہ بھی فرما دی کہ ہر شخص کو اپنے عمل کا ہدف رضائے الٰہی کو بنانا چاہیے۔ ماکتبنا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٧٣﴾ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا ۚ وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَهُمْ ۖ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٧٤﴾

اے پیغمبر کافروں اور منافقین سے جہاد کر اور ان سے سختی کا برتاؤ کر۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور یہ بدترین لوٹنے کی جگہ ہے [۷۵] یہ منافق اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اُنھوں نے نہیں کہا ہے حالانکہ بلا ریب واقعہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ضرور کلمہ کفر کہا ہے اور وہ مسلمان ہونے کے بعد پھر راہ کفر پر چلے ہیں [۷۶] اور اُنھوں نے ایسے کام کی منصوبہ بندی کی جسے وہ پا نہیں سکے [۷۷] ان کی یہ انتقامی کارگزاری صرف اس لیے ہوئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو سرمایہ دار بنا دیا ہے لہٰذا اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ اگر توبہ نہ کریں گے تو اللہ ان کو دنیا و آخرت میں دردناک سزا دے گا اور رُوئے زمین میں

ان کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا ۷۴

معانی مفردات

اغلظ ۔ یہ امر کا واحد مذکر حاضر ہے غلظۃ سے سختی کرنا ۔ یہ قرآن میں لین کی ضد ہے ۔ خفض کی ضد بھی کچھ علماء نے بتائی ہے ۔ قرآن میں اسے لین کے مقابلہ میں لایا گیا ہے ۔ فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولك ۔ علامہ قرطبی نے اسے رافت کی ضد بھی لکھا ہے ۔

ما نقموا ۔ جمع مذکر غائب نقم سے نہیں انتقام لیا انھوں نے یہ باب ضرب اور باب سمع دونوں سے آتا ہے ۔ اس شعر میں ماضی بالکسر آئی ہے ۔

ما نقموا من بنی امیۃ الا　　　　انھم یحلمون ان غضبوا

زہیر کے ایک شعر میں مضارع مفتوح العین اور مکسور العین دونوں آئے ہے ۔

یوخر فیوضع فی کتاب فیدخر　　　　لیوم الحساب او یعجل فینقم

منافقین سے برتاؤ میں سختی

اس وقت تک منافقین سے زیادہ تر درگذر کا معاملہ ہو رہا تھا اور اس کے دو وجوہ تھے ایک یہ کہ مسلمانوں کی طاقت اتنی مضبوط نہ تھی کہ باہر کے دشمنوں کے ساتھ گھر کے دشمنوں سے بھی لڑائی مول لیتے ۔ دوسرے یہ کہ ان میں جو لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا تھے ان کو ایمان یقین حاصل کرنے کے لیے کافی موقع دینا مقصود تھا ۔ یہ دونوں وجوہ اب باقی نہیں رہے تھے ۔ مسلمانوں کی سیاسی طاقت اب تمام عرب کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی ۔ اور عرب سے باہر کی طاقتوں سے کش مکش کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ۔ اس لیے ان آستین کے سانپوں کا سر کچلنا اب ممکن بھی تھا اور ضروری بھی ہو گیا تھا تاکہ یہ لوگ بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر کے ملک میں کوئی اندرونی خطرہ کھڑا نہ کرسکیں ۔ پھر ان لوگوں کو پورے نو سال تک سوچنے اور سمجھنے اور دین حق کو پرکھنے کا موقعہ بھی دیا جا چکا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے ۔ اگر ان میں واقعی خیر کی کوئی طلب ہوتی ۔ اس کے بعد ان کے ساتھ مزید رعایت کی کوئی وجہ نہ تھی اس لیے حکم ہوا کہ کفار کے ساتھ ان منافقین کے خلاف بھی جہاد شروع کیا جائے اور جو نرم رویہ ان کے بارے میں اب تک رہا ہے اسے ختم کر کے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے کیونکہ گھر کے اندر ایک

دشمن باہر کے ستر دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے مشہور ہے عدو واحد داخل الباب انکی من سبعین عدوا خارج الباب۔ اور شائد اسی پس منظر میں حضور اقدس ﷺ نے تبوک سے واپسی پر فرمایا تھا کہ اب ہم چھوٹے جہاد سے فارغ ہو کر بڑے جہاد میں مشغول ہو گئے رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ غیروں سے مقابلہ آسان ہے دشواری تو اپنوں سے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ اور اس کے جہاد اکبر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ منافقین سے جہاد یہ نہیں کہ ان سے جنگ کی جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کی منافقانہ روش سے اب تک جو چشم پوشی برتی گئی ہے اس کو آئندہ کے لیے ختم کر دیا جائے اب جو شخص بھی مسلمانوں میں رہ کر منافقانہ روش اختیار کرے اور جس کے طرز عمل سے بھی یہ ظاہر ہو کہ وہ خدا اور رسول اور اہل ایمان کا مخلص رفیق نہیں ہے اسے کھلم کھلا بے نقاب کیا جائے۔ علانیہ اس کو ملامت کی جائے۔ سوسائٹی میں اس کے لیے کوئی عزت کا مقام باقی نہ رہنے دیا جائے۔ عدالتوں میں اس کی شہادت معتبر نہ ہو۔ عہدوں اور مناصب کا دروازہ اس کے لیے بند رہے۔ محفلوں میں اسے کوئی منہ نہ لگائے۔ ہر مسلمان اس سے ایسا برتاؤ کرے جس سے اس کو معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں اس کا کوئی وقار نہیں ہے اور کسی حال میں بھی اس کے لیے کوئی احترام کا گوشہ نہیں ہے۔

اے پیغمبر کافروں اور منافقین سے جہاد کر اور ان سے سختی کا برتاؤ کر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور یہ بدترین لوٹنے کی جگہ ہے۔ جہاد کے معنے ہیں کسی ناپسندیدہ چیز کے دفع کرنے میں انتہائی کوشش کرنا۔ یہ کوشش کبھی ہتھیار سے ہوتی ہے کبھی زبان سے کبھی قلم سے کبھی کسی اور طریق سے۔ منافقین جو زبان سے اسلام کا اظہار کریں اور دل سے مسلمان نہ ہوں ان کے مقابلہ میں جہاد بالسیف جمہور کے نزدیک مشروع نہیں ہے نہ عہد نبوت میں ایسا واقع ہوا۔ اسی لیے جہاد کا لفظ اس آیت میں عام رکھا گیا ہے یعنی تلوار سے زبان سے قلم سے جس وقت جس کے مقابلے میں جس طرح مصلحت ہو جہاد کیا جائے۔ کچھ علماء کی یہ رائے ہے کہ اگر منافقین کا نفاق بالکل عیاں ہو جائے تو ان پر بھی جہاد بالسیف کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال غزوہ تبوک نے چونکہ منافقین کا نفاق بہت کچھ آشکارا کر دیا تھا اس لیے اس آیت میں ان کی نسبت ذرا سخت رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے نبی کریم ﷺ فطری طور پر نہایت نرم خو واقع ہوئے تھے فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك۔ پھر حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے حکم تھا واخفض جناحك لمن اتبعك من المومنين۔ چونکہ منافقین بھی بظاہر مومنین کے زمرہ میں شامل تھے اس لیے حضور ان کے ساتھ درگذر چشم پوشی اور نرم خوئی کا معاملہ فرماتے تھے۔ تبوک کے موقع پر جب منافقین نے کھلم کھلا بیجائی

عناد اور دشمنی کا انداز اختیار کر لیا تو حکم ہوا کہ اب ان کے معاملے میں سختی اختیار کیجئے۔ یہ شریر خوش اخلاقی اور نرمی سے ماننے والے نہیں ہیں[1]۔ روئے سخن تو بالذات منافقین کی طرف ہے لیکن الکفار کا اضافہ کرکے اشارہ کر دیا کہ یہ مردم شماری کے مسلمان اہل ایمان کے زمرہ کے نہیں بلکہ یہ بھی کفر ہی کے پاسبان ہیں۔ یہاں جہاد سے جاہد آیا ہے جہاد جہد سے نکلا ہے جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعلۃ کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنے محنت اور کوشش کے ہیں۔ اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی ہیں یعنی حق کی بلندی، اس کی اشاعت کے لیے ہر قسم کی جدوجہد قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی مالی دماغی قوتوں کو جو اللہ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا۔ یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی اپنے عزیزوں کی، اہل وعیال کی خاندان وقوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا۔ ان کی تدبیروں کو رائگاں کرنا ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی پوری طرح تیار رہنا ہی جہاد ہے یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

اس آیت میں جہاد کفار اور منافقین سے کرنے کا حکم ہے دونوں کی نوعیت الگ الگ ہے۔ کفار سے جہاد تو قتال کے معنے میں ہے جس کا اس سورت میں پہلے قاتلوا کے ذریعے حکم معلوم ہو چکا ہے اور ان منافقین کے لیے جہاد کی دوسری انواع ہیں۔ ان کا احتساب کرو، دارو گیر کرو۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تشریح میں یہی بات فرمائی ہے کہ کافروں سے قتال کیا جائے گا۔ منافقین سے قتال نہیں بلکہ زبان اور حجت وبرہان سے، احتساب اور دارو گیر سے جہاد کیا جائے گا۔ ان کو کھلم کھلا بے نقاب کیا جائے گا۔ علانیہ ان کو ملامت کی جائے گی۔ معاشرے میں ان کو باعزت مقام نہ دیا جائے گا۔ معاشرتی تعلقات ان سے منقطع کیے جائیں گے۔ اسی تشریح کو جمہور شارحین قرآن نے قبول کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منافقین سے قتال ثابت نہیں ہے آپ نے منافقین سے قتال نہیں کیا ہے۔ ہاں اگر منافقین کا گروہ اسقدر کھل کر سامنے آجائے کہ خود اسلامی جماعت اور اسلامی نظام کے لیے چیلنج بن جائے تو پھر منافقین سے قتال بھی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد فتنہ نفاق نے سر اٹھایا اور متعدد قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو صحابہ کرام نے اسی حکم کی تعمیل کی اور ان سے قتال کرنے پر متفق ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفاق مسلمانوں میں اس حد تک پہنچ جائے کہ انکار زکوٰۃ۔ انکار نماز، انکار روزہ، انکار حج، اور انکار ختم نبوت کر دے تو اسلامی مملکت کے فرائض میں داخل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کہ ان کو سزا دے اگر جماعت کی صورت میں ہوں تو قتال کرے اور اگر افراد کی صورت میں ہوں تو تعزیر ضروری ہے۔ شائد اسی رعایت سے یہاں واغلظ علیھم کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

یہ قرآن کی ایک نہایت اہم ہدایت ہے جو اس مرحلہ پر جبکہ پورے ملک میں اسلام کا بول بالا ہو چکا ہے ساری سیاسی، قانونی اور معاشی قوتوں پر اسلام کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اس کے بغیر اسلامی سوسائٹی کو تنزل وانحطاط کے اندرونی اسباب سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کوئی جماعت جو اپنے اندر منافقوں اور غداروں کی پرورش کرتی ہو اور جس میں گھریلو سانپ عزت وتحفظ کے ساتھ آستینوں میں بٹھائے جاتے ہوں۔ اخلاقی زوال اور بالآخر کامل تباہی سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نفاق کا حال طاعون کی طرح ہے اور منافق وہ چوہا ہے جو اس وبا کے جراثیم لیے پھرتا ہے اس کو آبادی میں چلنے پھرنے کی آزادی دینا گویا پوری آبادی کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ ایک منافق کو مسلمانوں کی سوسائٹی میں عزت واحترام کا مرتبہ حاصل ہونے کے معنے یہ ہیں کہ ہزاروں آدمی غداری ومنافقت پر دلیر ہو جائیں اور یہ خیال عام ہو جائے کہ اس سوسائٹی میں عزت پانے کے لیے اخلاص خیر خواہی اور صداقت ایمانی کچھ ضروری نہیں ہے بلکہ جھوٹے اظہار ایمان کے ساتھ خیانت اور بیوفائی کا رویہ اختیار کرکے بھی یہاں پھل پھول سکتا ہے۔ یہی بات ہے جسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مختصر سے حکیمانہ انداز میں بیان فرمایا ہے جس شخص نے کسی صاحب بدعت کی تعظیم کی وہ اسلام کی عمارت گرانے میں مددگار ہوا۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے۔ وماواھم جھنم۔ یعنی یہ تو اس دنیا میں ان منافقین کی سزا ہے آخرت میں ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی

یہ منافق اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا ہے حالانکہ بلاریب واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ضرور کلمہ کفر کہا ہے اور وہ مسلمان ہونے کے بعد راہ کفر پر چلے ہیں۔ منافقین پیچھے بیٹھ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دین اسلام کی اہانت کرتے جیسا کہ سورہ منافقین میں آئے گا جب کوئی مسلمان حضور تک ان کی بات پہنچاتا تو اس کی تکذیب کرتے اور قسمیں کھا لیتے کہ ہم نے فلاں بات نہیں کہی۔ حق تعالیٰ نے مسلمان راویوں کی تصدیق فرمائی کہ بے شک وہ باتیں انھوں نے زبان سے نکالی ہیں۔ اور دعویٰ اسلام کے بعد مذہب اسلام اور پیغمبر اسلام کی نسبت وہ کلمات کہے ہیں جو صرف منکرین کی زبان سے نکل سکتے ہیں [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

جس کلمہ کفر کو کہہ کر وہ قسمیں کھا کر انکار کرتے تھے وہ کیا تھا قرآن نے متعین نہیں کیا۔ شارحین قرآن نے اس قسم کے ایک سے زیادہ واقعات کی نشاندہی کی حافظ ابن جریر اور حافظ ابن کثیر رحمہما اللہ تعالیٰ نے متعدد واقعات لکھے ہیں۔ عقلاً ممکن ہے کہ اس قسم کے واقعات متعدد ہوئے ہوں جن میں ان کی زبان سے کلمہ کفر نکلا ہو۔ یہ گویا جاھد المنافقین کی دلیل ہوئی اور مطلب یہ ہوا کہ اگر منافقین زبانوں سے کلمہ کفر کہہ دیں تو پھر ان سے جہاد کرنا چاہیے۔

یہاں علامہ قرطبی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے۔ کہ جیسے ایمان کے ثبوت کے لیے صرف لا الٰہ الا اللہ کہنا کافی ہے۔ کفر کے ثابت ہونے کے لیے صرف ایمان معرفت کے خلاف کچھ کہنا کافی ہے۔ اگر آپ کے سامنے کسی نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کا انکار کر دیا تو بس یہ کلمہ کفر ہے اب نہ دیکھا جائے گا۔ کہ اسلامی زندگی عمل میں موجود ہے۔ کلمہ کفر کہنے کے بعد پوری اسلامی زندگی کالعدم ہے۔

اس آیت میں ان کا صرف یہ جرم نہیں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے کلمۃ الکفر کہا ہے بلکہ اس میں تین جرائم بتائے گئے ایک یہ کہ انھوں نے کلمہ کفر کہا دوسرے یہ کہ کلمہ کفر کہہ کر جھوٹ بولا۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے جھوٹی قسمیں کھائیں۔

منافقین کا منصوبہ اور ناکامی

انھوں نے ایسے کام کی منصوبہ بندی کی جسے وہ پا نہ سکے غزوہ تبوک سے واپسی میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم لشکر سے علیحدہ ہو کر ایک پہاڑی راستہ کو تشریف لے جا رہے تھے۔ تقریباً بارہ منافقین نے چہرے چھپا کر رات کی تاریکی میں چاہا کہ آپؐ پر ہاتھ چلائیں اور معاذ اللہ پہاڑی سے گرا دیں۔ حضورؐ کے ساتھ حذیفہ اور عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہما تھے۔ عمار کو انھوں نے گھیر لیا تھا مگر حذیفہ نے مار مار کر ان کی اونٹنیوں کے منہ پھیر دیئے چونکہ چہرے چھپائے ہوئے تھے حذیفہ وغیرہ نے ان کو نہ پہچانا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نام بنام ان کے پتے بتا دیئے مگر منع فرما دیا کہ کسی پر ظاہر نہ کریں اسی واقعہ کی طرف وھموا بما لم ینالوا میں اشارہ ہے کہ جو ناپاک تصد انھوں نے کیا۔ خدا کے فضل سے پورا نہ ہوا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کسی موقعہ پر لشکر اسلام میں خانہ جنگی ہو گئی تھی منافقین نے اغوا کر کے مہاجرین و انصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے حضرت نے اصلاح فرما دی جیسا کہ سورہ منافقین میں آئے گا[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پورا واقعہ مسند امام احمد میں ابوالطفیل کے حوالہ سے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس طرح لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جب واپس ہوئے تو آپ نے اعلان کرا دیا کہ نبوت گھاٹی سے گذرے گا اس راستہ سے کوئی نہ جائے۔ آپ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اونٹنی کو آگے سے پکڑنے اور حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیچھے سے ہانکنے کے لیے ساتھ لے لیا۔ پیچھے سے اچانک ایک ٹولی منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے اونٹوں پر سوار آئی۔ حضرت عمار رضی پیچھے تھے ان کو گھیرے میں لے لیا لیکن عمار ان کی سواریوں کو مارنے لگے۔ حضور اقدس ص نے حضرت حذیفہ رضہ سے کہا کہ چلاؤ چلاؤ۔ حضور اقدس ص جب پہاڑ کے نیچے آگئے تو سواری سے اتر آئے اتنے میں عمار بھی آگئے۔ حضور اقدس نے حضرت عمار سے دریافت کیا عمار پتہ ہے کہ کون تھے ؟ بولے سواریوں کو تو پہچانتا ہوں مگر سوار ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے ان کا پتہ نہیں۔ حضرت اقدس ص نے فرمایا کہ پتہ ہے کہ کس ارادے سے آئے تھے۔ بولے اللہ و رسول ہی کو پتہ ہو۔ فرمایا اس ارادے سے آئے کہ اللہ کے رسول کو گرادیں۔ حضرت عمار نے ایک شخص سے دریافت کیا تمہیں خدا کی قسم یہ گھاٹی والوں کی تعداد کتنی ہے بولے کہ چودہ تھے۔ یہ روایت ذرا مفصل ہے لیکن امام بیہقی نے دلائل النبوت میں جو واقعہ لکھا ہے وہ ذرا اس سے مختلف ہے۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے اس کو آگے سے کھینچ رہا تھا اور عمار اس کے پیچھے پیچھے تھے یا معاملہ اس کے برعکس تھا کہ میں پیچھے تھا اور عمار آگے تھے۔ یہاں چلتے چلتے جب ایک گھاٹی پر پہنچے تو یکبارگی ہم کیا دیکھتے ہیں کہ بارہ اشخاص اونٹوں پر سامنے سے آرہے ہیں میں نے حضور اقدس کو ان کی آمد سے متنبہ کیا تو وہ پشت پھیر کر بھاگ گئے اس کے بعد آپ نے فرمایا تم نے ان کو پہچانا میں نے عرض کیا جی نہیں یہ لوگ اپنے منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے لیکن ان کے اونٹوں کو میں نے پہچان لیا ہے فرمایا یہ منافقین تھے جو ہمیشہ منافقین ہی رہیں گے اور تمہیں کچھ یہ بھی پتہ ہے کہ ان کا ارادہ کیا تھا۔ ہم نے عرض کیا جی نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کے رسول کو اس گھاٹی میں گرانے کے ارادے سے آئے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ ان سب کے قبائل کی طرف کہلا بھیجئے تاکہ وہ ان میں سے جو اس شرارت میں شریک تھا اس کا سر کاٹ کر آپ کی خدمت میں روانہ کردیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں ایسا نہ کروں گا۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے بارے میں عرب یہ چہ میگوئیاں کریں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم سے جنگ کی اور جب اللہ نے ان کو غالب کر دیا تو پھر وہ ان کو قتل کرنے لگے اس کے بعد آپ نے یہ بددعاء فرمائی کہ خدایا ان کو دبیلہ میں مبتلا فرما۔ ہم نے پوچھا یا رسول اللہ دبیلہ کیا ہے؟ فرمایا وہ ایک زہریلا پھوڑا ہے جو شعلہ کی طرح دل کی رگوں کو پھونک دیتا ہے اور موت کا باعث ہوتا ہے۔

طبرانی نے مسند حذیفہ میں ان اصحاب عقبہ کے نام پر ایک عنوان قائم کیا ہے۔ اور ان منافقین کے حسب ذیل نام روایت کیے ہیں۔ معتب بن قشیر۔ ودیعہ ابن ثابت۔ جد بن عبداللہ۔ حارث بن یزید۔ اوس بن قبطی۔ حارث بن سوید۔ سعد بن زرارہ۔ قیس بن فہد۔ سوید۔ دوعش۔ قیس بن عمرو۔ زید بن العصیت سلالہ بن الحمام۔ (تفسیر ابن کثیر)

ان منافقین کی صحیح تعداد وہ ہے جو امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت عمار اور حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالہ سے بتائی ہے۔

حضرت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عمار سے دریافت کیا فرمائیے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معاملہ میں جو روش آپ نے اختیار کی یہ آپ کی ذاتی رائے تھی یا آپ کے پاس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم تھا۔ فرمایا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے کوئی بات ایسی نہیں فرمائی جو عام مسلمانوں سے نہ کہی ہو لیکن حذیفہ نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ میری امت میں بارہ منافق ہوں گے آٹھ ان میں سے ایسے کٹر ہیں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذر جانا ممکن ہے۔ لیکن ان کا جنت میں جانا ناممکن ہے ان کی پشت پر ایک زہریلا پھوڑا نکلے گا اور وہی ان کے لیے کافی ہوگا اور چار کے متعلق مجھے یاد نہیں رہا کہ شعبہ راوی نے کیا کہا تھا۔[1]

بہرحال دو لفظوں میں نہایت بلاغت کے ساتھ قرآن نے ان کی دستاویزی جرم بیان کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان منافقین نے ایسی منصوبہ بندی سے سازش تیار کی تھی کہ اگر کامیاب ہو جائے تو ہدایت کا نقشہ ہی الٹ جاتا لیکن اللہ نے ان کو ان کے ارادوں میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

منافقین کی ناسپاسی

ان کی یہ انتقامی کارروائی صرف اس لیے ہوئی ہے کہ اللہ ورسول نے اپنے فضل سے ان کو سرمایہ دار بنا دیا ہے۔ لہذا اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہے اور اگر توبہ نہ کریں گے تو اللہ ان کو دنیا و آخرت میں دردناک سزا دے گا۔ اور روئے زمین میں ان کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا۔ حضور کی دعا سے خدا نے دولتمند کر دیا قرضوں کے بارے سبکدوش ہو گئے۔ مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہنے کی وجہ سے غنائم میں حصہ ملتا رہا۔ حضور کی برکت سے پیداوار بھی اچھی ہوئی۔ ان احسانات کا بدلہ یہ دیا کہ خدا اور رسول کے ساتھ دغابازی کرنے

---

[1] صحیح مسلم

لگے اور ہر طرح پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کو ستانے پر کمر باندھ لی۔ اب بھی اگر توبہ کر کے شرارتوں اور احسان فراموشیوں سے باز آجائیں تو ان کے حق میں بہتر ہے ورنہ خدا دنیا و آخرت میں سزا دے گا جس سے بچانے والا روئے زمین پر کوئی نہ ملے گا۔ بعض روایات میں ہے کہ جلاس نامی ایک شخص یہ آیات سن کر صدق دل سے تائب ہوا۔ اور آئندہ اپنی زندگی خدمت اسلام میں قربان کر دی[1]۔ حضور اقدس ﷺ کی مدینہ میں تشریف آوری سے پہلے مدینہ عرب کے قصبات میں سے یثرب کے نام سے ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور یہاں کے باشندے مال یا جاہ میں دوسروں کے مقابلہ میں بالکل بے نام تھے۔ لیکن جب کوکبہ نبوت کا اس قصبہ میں نزول ہوا اور انصار نے آپ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیا تو آٹھ نو سال کے اندر اندر یہی معمولی قصبہ تمام عرب کا دار السلطنت بن گیا۔ اور مدینہ کی شہری مملکت اس عرصہ میں روزانہ دو سو چوتھہر مربع میل کی وسعت اختیار کر رہی ہے۔ حنین میں تقسیم غنیمت کے موقعہ پر حضور اقدس ﷺ نے انصار کو مخاطب کر کے ایک تقریر میں فرمایا کنتم عالۃ فاغناکم اللہ یعنی تم سب نادار و غریب تھے اللہ نے میرے ذریعے تمہیں مالدار بنایا یہی یثرب کے اوس و خزرج جو انصار کے قبیلے تھے اور جو کاشتکاری کا کام کرتے تھے اس سلطنت کے اعیان و اکابر بن گئے۔ اور ہر طرف سے فتوحات اور غنائم اور کاروباری برکتیں اس شہر پر بارش کی طرح برسنے لگیں۔
اس آیت میں اسی انعام و احسان پر شرم دلائی جا رہی ہے کہ انعام و احسان کا تقاضا تو انقیاد و محبت تھا لیکن یہاں معاملہ بالکل الٹا ہو رہا ہے کہ احسان کے بدلے میں عداوت کو اپنا لیا گیا۔ عربی میں مثال ہے اتق شر من احسنت الیہ جس سے نیکی کرو اس کی برائی سے بچ کر رہو۔ کیا یہ نیکی کا بدلہ ہے۔ خباثت کی بھی کوئی حد ہے کہ اسلام نے ان کو دنیا میں تول دیا۔ اور وہ اسلام کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا یہ تبصرہ بالکل برموقعہ ہے۔ کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے ان کے کمال خبث کو ظاہر کیا ہے۔ اور آخر میں بتایا ہے کہ اگر یہ توبہ کر لیں تو انہی کے حق میں بہتر ہے ورنہ یاد رکھیں کہ خدا انہیں دنیا میں بھی عذاب دے گا اور آخرت میں بھی۔ یہ دنیا میں اس عذاب میں حصہ دار ہوں گے جو کفار و مشرکین کے لیے مقدر ہو چکا۔ اور آخرت میں بھی ان کے ساتھی ہوں گے۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ اس سرزمین میں وہ بے یار و مددگار ہوں گے۔

یہ بات یہاں سمجھنے کی ہے کہ ملک میں ان کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہو گا کیونکہ دنیا میں اسباب کی حد تک ان پر سارے دروازے بند ہو چکے ہیں اہل ایمان میں سے ان کا کوئی حمایتی اس لیے نہ ہو گا کہ قرآن نے

[1] افادات شیخ الاسلام

اہل ایمان پر یہ پابندی لگادی ہے کہ ان کی اخوت، مروت اور نصرت کی بنیاد پر تعلقات صرف اہل ایمان سے ہو سکتے ہیں۔ منافقین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا اپنے قبائل اور رشتہ داروں میں سے ان کا کوئی حمائتی نہیں ہوسکتا کیونکہ اسلام نے انسابی عصبیت کو ختم کردیا ہے۔ باہر کے لوگوں میں سے بھی ان کا کوئی حمایتی نہیں ہو سکتا کیونکہ اسلام نے جاہلیت کے سارے حلف اور جوار کے معاہدے کالعدم کردیئے۔ اہل کتاب میں سے بھی ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کو جلاوطنی کے ذریعے حجاز بدر کردیا گیا۔ عرب سے باہر بھی وہ بے یارومددگار ہوں گے کیونکہ اللہ سبحانہ نے قیصر وکسریٰ کی حکومتوں کے لیے اہل ایمان سے وعدہ کرلیا ہے۔ قرآن نے جیسا بتایا ویسا ہی ہوا۔

اس معنے کے اعتبار سے یہ خبر بھی حضور اقدس ﷺ کا اعجاز ہے۔ یہ مطلب ہے دنیا میں مددگاروں اور حمایتیوں سے ان کے محروم ہونے کا۔

وَمِنْهُم مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰهُم مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُم مُّعْرِضُوْنَ ۝ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝

اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ ہمیں اپنے فضل سے نوازے گا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور ہم ضرور نیکو کار بنیں گے۔ پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تو وہ اس مال میں کنجوس ہوگئے اور اپنے عہد سے پھر گئے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ہیں ہی روگردانی کرنے والے۔[۷۶] بعد ازیں اس کے نتیجے میں ان کے دلوں میں نفاق دائمی ہوگیا اس دن تک کے لیے کہ وہ اللہ سے ملیں۔ کیونکہ انھوں نے اللہ سے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور کیونکہ ان کا کام جھوٹ بولنا تھا۔[۷۸]

معانی مفردات

اعقب ماضی کا واحد مذکر غائب اعقاب سے ہے ان میں اثر رکھ دیا وارث بنا دیا۔ عقب کے معنی اصل میں پاؤں کے پچھلے حصے یعنی ایڑی کے ہیں کبھی قاف کے زیر سے اور کبھی سکون سے بولتے ہیں اس کی جمع اعقاب آتی ہے اسی سے عقب یَپیچھے کے معنے میں آتا ہے اعقاب، معاقبہ، تعاقب، تعقیب، تعقب سب اسی سے بنائے

گئے ہیں:۔

اخلفوا۔ جمع مذکر غائب ماضی کا مصدر اخلاف ہے۔ انھوں نے خلاف ورزی کی۔ خلف سے بنا ہے اس کے معنے پیچھے کے ہیں اسی سے خلافت، استخلاف، مختلف وغیرہ الفاظ آتے ہیں۔

انسان کی عجیب و غریب کمزوری

یہ انسان کی عجیب کمزوری ہے کہ جب تک ایک چیز اسے حاصل نہیں ہوتی ہے اس وقت تک تو یہ تمنا کرتا ہے کہ اگر مجھے یہ حاصل ہو جائے تو یہ کروں گا۔ دوسروں کی طرح کسی غلط مصرف میں استعمال نہ کروں گا بڑی بڑی دعائیں کرتا ہے کہ اگر اللہ نے اپنے فضل سے دولت دی تو میں یہ کروں گا وہ کروں گا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتا ہے۔ اور نیکی کے ہر راستے سے منہ موڑ لیتا ہے اور اسے یہ یاد ہی نہیں رہتا ہے کہ اس چیز کے لیے اس نے اپنے رب سے کیا قول و قرار کیا تھا اور کس کس طرح کی تمنا ول کا اظہار کیا تھا بلکہ اس پر دولت کا نشہ ایسا سوار ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھتا ہے اور خدا سے زیادہ اسے شیطان کے لیے استعمال کرتا ہے۔ بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو نعمت پا کر منعم کا حق پہچانیں اور احسان مانیں۔ اس کا سرچشمہ بخل ہے اور بخل ایسی بداخلاقی ہے جس سے بہت سی بداخلاقیاں جنم لیتی ہیں۔ خیانت بددیانتی، بے ایمانی اور بے مروتی۔ بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی اور دنارت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ حرص، طمع، لالچ تنگ نظری، کم فہمی، پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی شجرہ خبیث کی شاخیں ہیں قرآن آیا۔ جھوٹ کے بعد سب سے پہلے بخل کی جڑ پر کلہاڑا مارا اور بھوکوں کو کھلانا ننگوں کو پہنانا، محتاجوں کو دینا یتیموں کی خبر گیری اور مقروضوں کی امداد کو مسلمانوں پر فرض کیا ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ ہے

ان آیات میں اسی بیماری کی نشاندہی کی ہے۔ اس کا دنیوی انجام بتایا ہے کہ اس بخل کی پاداش میں خدا نے ان کے دلوں کے اندر نفاق کی جڑ جما دی اور صدقہ کر کے صالحین میں سے بننے کا جو موقع خدا نے ان کو عطا کیا تھا۔ وہ اس سے محروم ہو گئے۔

(۷۹) اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ ہمیں اپنے فضل سے نوازے گا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور ہم ضرور نیکوکار بنیں گے۔ پھر جب ان کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا تو اس حال میں کنجوس ہو گئے۔ اور اپنے عہد سے پھر گئے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ہیں ہی روگردانی کرنے والے

ایک شخص ثعلبہ ابن حاطب انصاری نے حضرت سے عرض کیا کہ میرے حق میں دولت مند ہو جانے کی دعا

فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ ثعلبہ تھوڑی چیز جس کا تو خدا کا شکر ادا کرے۔ اس بہت چیز سے اچھی ہے جس کے حقوق ادا نہ کر سکے۔ اس نے پھر وہی درخواست کی آپ نے فرمایا اے ثعلبہ کیا تجھے پسند نہیں ہے کہ میرے نقش قدم پر چلے آپ کے انکار پر اس کا اصرار بڑھتا گیا اس نے وعدہ کیا کہ اگر خدا مجھے مال دے گا میں پوری طرح حقوق ادا کروں گا۔ آخر حضور نے دعا فرمائی۔ اس کی بکریوں میں اس قدر برکت ہوئی کہ مدینہ سے باہر ایک گاؤں میں رہنے کی ضرورت پڑی اور اتنا پھیلاؤ ہوا کہ ان میں مشغول ہو کر رفتہ رفتہ جمعہ و جماعات بھی ترک کرنے لگا۔ کچھ دنوں بعد حضور کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے والے محصل پہنچے تو کہنے لگا کہ زکوٰۃ تو جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے۔ دو ایک دفعہ دے کر بالآخر زکوٰۃ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ حضور نے تین مرتبہ فرمایا ویح ثعلبۃ اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ جب اس کے بعض اقارب نے اس کی خبر پہنچائی تو با دل ناخواستہ زکوٰۃ لے کر حاضر ہوا۔ حضور نے فرمایا کہ خدا نے مجھے تیری زکوٰۃ قبول کرنے سے منع کر دیا۔ یہ سن کر اس نے بہت ہائے واویلا کیا کیونکہ حضور اقدس کا زکوٰۃ قبول نہ کرنا اس کے لیے بڑی عار کی بات تھی۔ بدنامی کے تصور سے سر پر خاک ڈالتا تھا مگر دل میں نفاق چھپا ہوا تھا۔ پھر حضور کے بعد ابو بکر صدیق کے پاس زکوٰۃ لے کر حاضر ہوا انھوں نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر حضرت عمر اور ان کے بعد حضرت عثمان ﷺ کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کی دونوں نے انکار کر دیا سب یہی کہتے تھے کہ جو چیز نبی کریم ﷺ نے رد کر دی ہم اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ آخر اسی حالت نفاق پر حضرت عثمان ﷺ کے زمانے میں اس کا خاتمہ ہوا[1]

عام شارحین قرآن کی روش کے مطابق حضرت شیخ الاسلام نے یہ واقعہ درج کیا ہے ورنہ جہاں تک اصول و قواعد حدیث کا تعلق ہے۔ روایتی اور تاریخی حیثیت سے یہ روایت صحیح نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ حافظ ابن جریر حافظ ابن کثیر اور دوسرے شارحین قرآن نے اس واقعہ کو اسی طرح پیش کیا ہے واقعہ کو طبرانی، بیہقی، ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے اور سب کا سرچشمہ علی بن یزید الالہانی ہیں۔ ان کے بارے میں علامہ ہیثمی کا کہنا ہے کہ متروک ہیں۔ حافظ عسقلانی نے تخریج احادیث کشاف میں لکھا ہے۔ ھذا اسناد ضعیف۔ حافظ السیوطی نے الاکلیل میں اسے ضعیف قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ واقعہ کی روایتی حیثیت اس لائق نہیں ہے کہ اسے شہادت کے طور پر موقعہ استدلال میں پیش کیا جائے آیت قرآنی اپنے معانی اور مطالب کے لیے کسی واقعہ کی محتاج نہیں۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ اس سے پہلے فرض تھی۔ اور سورہ برات کا نزول ۹ھ غزوہ تبوک کے بعد ہوا۔ معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ۹ھ میں فرض ہوئی۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس خیال کو ضعیف قرار دیا اور

[1] افادات شیخ الاسلام

اس واقعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تاریخی طور پر ضعیف ہے اس کو بطور دلیل نہیں پیش کیا جاسکتا۔ حافظ صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔ لکنہ حدیث ضعیف لا یحتج بہ۔ زکوٰۃ کی تاریخ پر ہم انشاء اللہ گیارہویں پارے میں بحث کریں گے۔ بہرحال روایتی نقطہ نظر سے یہ واقعہ صحیح نہیں ہے۔

آیت میں ایک نفسیاتی بیماری کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس بیماری کے مریضوں کا کھوج لگانا اور بتانا فلاں مریض تھا مفسر کا کام نہیں ہے۔ بتایا یہ جارہا ہے کہ یہ غریب تھے اس وقت ان کا یہ حال تھا کہ ہر جگہ یہ اپنے اس شوق اور اس تمنا کا اظہار کرتے تھے کہ اگر ہمارے حالات بھی اللہ نے ٹھیک کر دیئے تو ہم بھی اللہ کے راستہ میں خوب خرچ کریں گے اور دین کی بڑی بڑی خدمتیں کر کے صالحین میں اپنا نام کریں گے لیکن جب اللہ نے ان پر اپنا فضل فرمایا اور ان کی تمنا پوری ہوگئی اور دینے کا وقت آیا تو اس طرح منہ پھیر کر چل دیئے ہیں گویا اللہ و رسول سے ان کا کوئی قول و قرار ہی نہ تھا۔ چل دینا کبھی تو اس طرح ہوتا ہے جس کے بعد مڑ کر آنے کی توقع ہوتی ہے لیکن یہاں تولوا کے بعد جملہ حالیہ وھم معرضون آیا ہے اور حال جملہ میں مقید ہوتا ہے اس قید نے واضح کر دیا کہ انفاق کا نام سن کر وہ اس طرح چل دیتے ہیں کہ پھر مڑ کے دیکھتے ہی نہیں ہیں۔ ابوبکر الجصاص نے کچھ باریک قانونی باتیں اس آیت سے استنباط کی ہیں۔

اوّل اگر کوئی شخص کسی قربت کی نذر مان لے تو اس کا پورا کرنا واجب ہے مثلاً یوں کہے کہ اگر اللہ سبحانہ مجھے ایک ہزار روپے دے گا تو میں پانچ سو روپیہ صدقہ کروں گا۔ ایک ہزار ملنے پر پانچ سو کا صدقہ واجب ہے۔

دوم یہ کہ نذر معلق بھی جائز ہے مثلاً یوں کہے کہ اگر فلاں آئے تو اتنے روپے صدقہ کردوں گا۔

سوم نذر غیر موجود چیز کی جو ابھی ملک میں نہ آئی ہو مان لینی جائز ہے اگرچہ بالفعل چیز ملک میں نہ ہو۔ حدیث۔ لا نذر فیما لا یملك ابن ادم کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کی ملک کی نذر، نذر نہیں ہے لیکن مستقبل میں اپنی ملک کے موجود ہونے پر نذر کو موقوف کرنا اس میں داخل نہیں ہے۔

نفاق قلب میں کیسے جاگزین ہوتا ہے

(۸۰) بعد ازیں اس کے نتیجے میں ان کے دلوں میں نفاق دائمی ہوگیا اس دن تک کے لیے کہ وہ اللہ سے ملیں۔ کیونکہ اللہ سے وعدہ کی خلاف ورزی کی ہے اور کیونکہ ان کا کام جھوٹ بولنا تھا یعنی خدا سے صریح وعدہ خلافی کرنے اور جھوٹ بولتے رہنے کی سزا میں ان کے بخل و اعراض کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے نفاق کی جڑ ان کے دلوں میں قائم ہوگئی جو موت تک نکلنے والی نہیں اور یہی سنۃ اللہ ہے کہ جب کوئی شخص اچھی یا بری

خصلت خود اختیار کر لیتا ہے تو کثرت ممارست اور مزاولت سے وہ دائمی بن جاتی ہے۔ بری خصلت کے اسی دوام و استحکام کو کبھی کبھی ختم و طبع مہر لگانے سے تعبیر کر دیتے ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے نفاق کی پرورش پر ایک مدت صرف کر دی۔ یہ چیز ان میں اتفاقاً پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ ان کے ایک دانستہ نقض عہد طویل جھوٹ اور فریب کاری کا مولود فساد ہے جس سے ان کی جان اب مر کے ہی چھوٹے گی۔ یہ توقع نہ رکھو کہ ان کو توبہ اور اصلاح کی توفیق ہو گی۔ اب تو ان کے دلوں کا یہ کثیف پردہ اسی وقت ہٹے گا جب یہ اصل حقیقت کو سورج کی طرح سامنے دیکھ لیں گے۔ غالباً صحیحین میں جو ارشاد نبوت علامات منافق کے موضوع پر آیا ہے۔ اسی ارشاد ربانی کی ایک روشنی ہے۔ صحیحین میں ہے منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بات کرے جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے۔ جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے۔ صحیح مسلم میں یہ بھی ہے اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور اپنے کو مسلمان خیال کرتا ہو۔ صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے۔ کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے یہاں تک ان کو چھوڑ دے۔ جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے۔ جب بات کرے جھوٹ بولے۔ جب عہد کرے خلاف ورزی کرے۔ جب جھگڑے گالیاں دے۔

حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ نفاق کی صورتیں تو بہت ہیں مگر ان کے اصول صرف پانچ ہیں۔

۱۔ جھوٹ بولنا۔ ۲۔ امانت میں خیانت کرنا۔ ۳۔ وعدہ خلافی کرنا۔ ۴۔ غصہ میں بے قابو ہو جانا۔ ۵۔ عہد کر کے غداری کرنا۔

قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ منافقین نے یہ تمام چالیں جب اللہ سبحانہ اور اس کے رسول سے کیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیامت تک کے لیے نفاق کا روگ ان کے دلوں میں جاگزین ہو گیا۔ آیت سے معلوم ہوا کہ جیسے بخل کی شدت ایمان کو برباد کر دیتی ہے ایسے ہی وعدہ خلافی اور جھوٹ کا نتیجہ نفاق ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ان جرائم میں زیادہ شدت یہاں اس لیے آئی ہے کہ انھوں نے خدا اور رسول کے معاملہ میں بھی ان کا ارتکاب کیا بلکہ اسی کو اپنی عادت بنا لیا۔ اسی طرح ان کی دوسری بداطواریاں اللہ ورسول کے ساتھ تھیں ـــــ دونوں باتوں میں فرق سمجھ لیجئے۔

ایک یہ کہ لوگوں سے جھوٹ بولے۔ لوگوں سے وعدہ کر کے پورا نہ کرے۔ لوگوں کی امانت میں خیانت کرے۔ لوگوں سے معاہدوں میں غداری اور لوگوں سے لڑائی میں گالیوں پر اتر آئے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسرے یہ کہ یہ سارے کام اللہ اور اس کے رسول سے روا رکھے، آیت قرآن کا رخ پہلی بات کی طرف نہیں دوسری بات کی طرف ہے یعنی خدا اور رسول کی جناب میں یہ باتیں کفر خالص ہیں جب کہ باہم یہ باتیں کفر نہیں بلکہ گناہ ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ بات کا مطلب سمجھنے کے لیے اس کے ماحول کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے اس لیے جن احادیث میں علامات نفاق بتائی گئی ہیں اور جن کا تعلق مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے ہے ان کو بھی اس ماحول کی مدد سے سمجھنا چاہیے۔ غور فرمائیے کہ ایک طرف منافقین ہیں جو ان مذموم خصائل میں از سر تا پا غرق ہیں دوسری طرف مخلصین اہل ایمان کی وہ جماعت ہے جو ان کو انتہائی نفرت سے دیکھتی ہے اور ان کے بُرے اعمال سے اس درجہ بیزار ہے جتنا ان کو اپنے ایمانی تقاضوں کے تحت ہونا چاہیے۔ ان حالات میں ان احادیث کا منشا بالکل واضح اور صاف ہے۔ لیکن دور انحطاط میں جب ایک قدیم العہد مسلمان میں بھی یہ علامات موجود نظر آئیں تو سوچنا پڑا اور نفاق کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا ایک نفاق اصلی اور دوسرا نفاق عملی اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تقسیم پہلے سے موجود نہ تھی بلکہ منشا یہ ہے کہ سلف صالحین کی نظر میں نفاق عملی بھی نفاق اصلی کے برابر تھا۔ وہ اسلام کے خلاف معاشرہ کے اعمال میں ایسی تاویلات سوچنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ ان کے خیال میں اسلام کے ساتھ اسلام کے تقاضے ہونے ناگزیر تھے۔ وہ ایمان کے ساتھ کفر و نفاق کا تصور بھی نہ کرتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی میں عملی مظاہر وہی ہونے چاہئیں جو ایمان کا تقاضا ہیں اس لیے ان کے زمانہ میں نفاق اصلی اور نفاق عملی کی کوئی تقسیم نہ تھی وہ مجموعہ اسلام کو اسلام سمجھتے تھے اور اسلامی زندگی میں کفر و نفاق کی ایک ایک علامت سے بیزار تھے۔ نام نہاد مسلمانوں کو بچانے کے لیے تقسیمیں اور تاویلیں کرنا ان کے بلند مذاق کے خلاف تھا وہ اسلام کو بچانے کی فکر میں تھے۔ دراصل ان حدیثوں کا منشا یہ بتانا ہے کہ مسلمان کے لیے ہرگز یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان سے اسلام کا دعویٰ کرے اور اپنی عملی زندگی میں نفاق کی ترجمانی کرے اس کا فرض ہے کہ وہ مسلمان ہو کر نفاق کی ایک ایک علامت سے بیزار ہو، اگر وہ اسلام کا مدعی ہے تو ظاہر و باطن میں پوری ہم آہنگی پیدا کرے اور دورنگی سے بچے۔

بہر حال اس دور کے منافقین کی یہ بھی ایک قسم تھی جسے قرآن نے یہاں بیان کیا ہے کہ جب وہ غریب تھے تو بڑے بڑے اللہ سے عہد کرتے تھے خوب وعدے کرتے کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے انعامات سے نوازا تو ہم یہ کریں گے وہ کریں گے مگر اللہ تعالیٰ نے جب ان کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا تو سارے وعدے

بھول گئے اور نیکی کے راستہ سے منہ موڑ لیا۔ اور بخیل بن گئے۔ بخل کا نتیجہ یہ ہوا کہ نفاق نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔

قرآن جن امراض کی نشانیاں پیش کرتا ہے اور جن بیماریوں کو بیان کرتا ہے ان کو زمان و مکان سے مقید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت اگر اللہ سے وعدہ کی خلاف ورزی اور جھوٹ بولنے کا خوگر ہونے کا نتیجہ نفاق تھا تو آج بھی اس کا نتیجہ نفاق ہی ہوگا۔ زمان و مکان کی تبدیلی سے اعمال کے خواص و نتائج نہیں بدلتے ہیں۔ سنکھیا اگر زہر ہے تو ہر زمانے اور ہر جگہ زہر ہے نہ افراد و اشخاص کی تبدیلی سے سنکھیا کا اثر بدلے گا اور نہ زمان و مکان بدلنے سے تبدیل ہوگا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس موقعہ پر نکتہ آفرینی خوب ہے۔

چونکہ نفاق عمل اور اس کے مدمقابل اخلاص پوشیدہ تھے اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق عملی کی علامات بتا دی ہیں۔ نفاق کی جو علامتیں اس حدیث میں بتائی ہیں چار باتیں ہیں جس میں ہوں گی پورا منافق ہے اگر ان میں سے ایک ہوگی تو نفاق کی ایک نشانی ہوگی تا آنکہ اسے چھوڑ دے۔ بات میں جھوٹ۔ عہد میں غدر، لڑائی میں گالی، امانت میں خیانت؛ اور اخلاص ایمان کی اس حدیث میں علامات بتائی ہیں تین باتیں جس میں ہوں گی اسے ایمان کی شیرینی محسوس ہوگی۔

اول۔ اسے اللہ اور اللہ کا رسول سب سے محبوب ہوگا۔

دوم۔ جس سے محبت کرے اللہ کی خاطر محبت کرے۔

سوم۔ کفر میں واپسی ایسی ہی ناگوار ہو جیسے آگ میں گرنا اور حضور اقدس کا یہ ارشاد جب تم کسی کو مسجد سے چمٹا دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو۔ یا یہ ارشاد کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت ایمان کی نشانی ہے یا یہ ارشاد کہ انصار کی محبت ایمان کی نشانی ہے۔

لیکن یہ واضح رہے کہ جس طرح کفر دون کفر ہے اور جس طرح ایمان کامل اور ناقص ہے اسی طرح نفاق کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔ انشاء اللہ اس پر تفصیلی تبصرہ گیارہویں جلد میں آرہا ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ
وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۷۸﴾ اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ
الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ
لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ
مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۹﴾

کیا یہ لوگ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ ان کے رازوں اور ان کی سرگوشیوں کو جانتا ہے اور کیا ان کو پتہ نہیں کہ اللہ تمام غیبوں کی باتوں سے پوری طرح باخبر ہے[۸۱] یعنی ان لوگوں سے جو رضا و رغبت اہلِ ایمان یعنی وہ لوگ جو برضا و رغبت دی ہوئی اہلِ ایمان کی مالی قربانیوں پر عیب لگاتے ہیں اور جن اہلِ ایمان کو اپنی مشقت کے سوا کچھ میسر نہیں ہے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ ان کو مذاق کی جزا دے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔[۸۲]

معانی مُفردات

ستر چھپی ہوئی بات، بھید، راز، دل میں جو بات چھپی ہو اسے سر کہتے ہیں۔ جمع اسرار آتی ہے۔ کنائی زبان میں لفظ سر نکاح، جماع کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

نجویٰ۔ سرگوشی برائی پر مبنی شورہ کو کہتے ہیں اسی سے مناجات اور تناجی آتے ہیں۔ باھم سرگوشیاں کرنا۔

علام الغیوب۔ غیبوں کا خوب جاننے والا ہے۔ علم سے بر وزن فعّال مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یہاں اس کا استعمال حق تعالیٰ شانہ کے لیے بطور صفت ہوا ہے۔ اس طرح کر اس نے کوئی پوشیدہ سے

پوشیدہ چیز بھی چھپی ہوئی نہیں ہے، امام ابوبکر البیہقی کتاب الاسماء والصفات میں لکھتے ہیں۔ اس کے معنے ہیں ایسا زبردست جاننے والا جو ہر طرح کی معلومات کا ان کے گوناگوں ہونے کے باوجود علم رکھتا ہے جو اب موجود ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو آئندہ ہوگا اسے بھی جانتا ہے۔ اسی طرح جو چیز وجود میں نہیں آئی اس کا بھی اسے علم ہے اور اس کا بھی کہ وجود پذیر کیسے اور کیوں ہوگی۔

یلمزون۔ عیب نکالتے ہیں۔ جمع مذکر غائب مضارع لمز سے ہے اسی کے ساتھ ہمز ہے۔ سامنے منہ پر کسی کے عیب نکالنا لمز ہے اور پیٹھ پیچھے نکتہ گیری ہمز ہے بعض علماء ان لفظوں کی تشریح بالعکس کرتے ہیں۔ بہرحال مسخر پن کسی کے ساتھ کرنا۔ کسی کا ٹھٹھا اڑانا کسی کی نقل بنانی لمز اور ہمز میں یہ سب باتیں داخل ہیں اسی سے ہمزہ اور لمزہ بنے ہیں، منہ پر عیب نکالنے والے کو لمزہ اور پیٹھ پیچھے عیب نکالنے والے کو ھمزہ کہتے ہیں۔

عیب چینی منافقین کا کردار ہے

نفاق کے جراثیم اس قدر ہیں کہ ان کا احاطہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ آدمی اندر سے غلط اور خود کرنے کی توفیق نہ ہو تو دوسروں کو بھی کرتا دیکھ نہیں سکتا۔ نیکیوں سے چڑتا ہے جلے دل سے نیکیوں ہی میں عیب نکالنے لگتا ہے۔ نفاق ایک ایسی رذیلہ ہے جو سینکڑوں رذائل کو جنم دیتی ہے۔ جھوٹ، جھوٹی قسمیں وعدہ خلافی، خیانت، اور بددیانتی، غداری اور دغابازی، بہتان اور چغلخوری، غیبت اور بدگوئی، مداحی اور خوشامد، بخل اور حرص طمع، بے ایمانی اور چوری، غیظ وغضب اور کینہ، فخر وغرور، ریاکاری اور خود بینی، حسد اور فحش گوئی یہ سب رذائل نفاق کے پستان سے دودھ پی کر پلتے ہیں اور جوان ہوتے ہیں۔

دراصل نفاق اسلام کی نہیں بلکہ اسلامی نظام کی اپوزیشن ہے کیونکہ اسلامی مملکت قائم ہی اس مقصد سے ہوتی ہے کہ شخصیت کے نشوونما اور اجتماعی سیرت کے راستے میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی ہیں انہیں دور کرے اور وہ تمام ترغیبات اور ترہیبات فراہم کرے جو اس مقصد کے حصول میں مددگار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی مملکت کا تصور خدا کی ذات وصفات کے مرکزی تصور سے ماخوذ ہے۔ ایسی مملکت میں جس کا مقصود ہی فرد کا اخلاقی ارتقا اور اس کی تکمیل ذات ہے اعلیٰ شخصیتوں کی کسی وقت کمی نہیں ہو سکتی۔ نفاق اسی مقصد کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہاں قرآن تکرار اسی رکاوٹ کو دور کرنے پر زور دے رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ جب تک یہ آہنی دیوار یہاں سے نہ ہٹے گی اسلام کی اجتماعی زندگی کے خدوخال

جھکر سامنے نہ آئیں گے۔

(۸۱) کیا وہ لوگ جانتے نہیں کہ اللہ ان کے رازوں اور ان کی سرگوشیوں کو خوب جانتا ہے۔ اور کیا ان کو پتہ نہیں کہ اللہ سب غیبوں سے پوری طرح باخبر ہے۔

یہاں دو باتوں پر الگ الگ تنبیہہ مقصود ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کا ہر فرد اپنے سینے میں اسلامی نظام کے خلاف کدر رکھتا ہے۔ سازشیں اور اسکیمیں سوچتا رہتا ہے لیکن ان کا اعلان نہیں کرتا۔ ان کو زبان پر نہیں لاتا ہے۔ زبان پر کچھ ہوتا ہے اور دل میں کچھ۔ اللہ ان سب کے دل کے رازوں اور سینہ کے بھیدوں سے خوب باخبر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ آپس میں بیٹھ کر اسلامی نظام کے خلاف اجتماعی طور پر خفیہ میٹنگیں کرتے ہیں اور الگ الگ ہو کر جو کچھ سوچا جاتا تھا اس کے بارے میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ ان کی سرگوشیوں میں خیر کا کوئی پہلو نہیں ہوتا تھا۔ ان کی سرگوشی گناہ تعدی اور حضور اقدس ﷺ کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر ابھارنے کے لیے ہوتی تھی۔ یہ لوگ یہودیوں کے آلہ کار تھے اور ان کی تمام سرگوشیوں کا منتہا یہ تھا کہ جماعت میں کوئی ایسا فتنہ پیدا کریں کہ اسلامی نظام کا قیام پروان نہ چڑھ سکے۔ مدینہ طیبہ میں حضور اقدس ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اوس اور خزرج کے قبیلے باہمی خانہ جنگی سے اس قدر تنگ آچکے تھے کہ مجبوراً ان کو اس کے انتظام کے لیے ایک شخص کی قیادت پر متفق ہونا پڑا اور اس بات کی تیاریاں کر رہے تھے کہ کسی کو اپنا بادشاہ بنا کر باقاعدہ اس کی تاج پوشی کریں یہاں تک کہ انھوں نے تاج بھی بنوا لیا تھا۔ اس کے لیے قبیلہ خزرج کے رئیس عبداللہ ابن ابی بن سلول کو چن لیا تھا۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ قبیلہ خزرج میں اس کی عظمت مسلم تھی۔ اور اوس خزرج اس سے پہلے کسی کی قیادت پر جمع نہ ہوئے تھے۔[۱]

صورت حال یہی تھی کہ اسلام ایک نظام کی حیثیت سے قائم ہو رہا تھا اور جیسا کہ البقرۃ میں پڑھ چکے ہو کہ اسلام کا ہر ارتقائی قدم ان کے مرض نفاق میں اضافہ کا ذریعہ بن رہا تھا۔ اس آیت میں ان کے بارے میں بتایا ہے خواہ کیسے ہی وعدے کریں باتیں بنائیں۔ یا مجبور ہو کر مال کی پیش کش کریں اللہ سبحانہ ان کے ارادوں اور نیتوں کو خوب جانتا ہے۔ اور ہم مشیروں کے ساتھ بیٹھ کر جو مشورے کرتے ہیں ان سے پوری طرح آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ لنصدقن ولنکونن من الصالحین کا وعدہ اور گھبرا کر زکوٰۃ پیش کرنا کس دل اور کیسی نیت سے ہے۔[۲]

[۱] سیرۃ ابن ہشام		[۲] افادات شیخ الاسلام

حقیقت میں خدا کا اعتقاد و تصدیق بے معنے ہے اگر اس کی خوشنودی اور ناخوشی اس کی رحمت اور اس کے غضب و انتقام کے اصول انسان پر واضح نہ ہوں جس خدا کی پسند و ناپسندیدگی کا کوئی معیار نہ ہو جس کے متعلق انسان یہ علم نہ رکھتا ہو کہ وہ کس قسم کے عمل سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور کون سے مسائل اس کے غیظ و غضب کا موجب بنتے ہیں اس کی طرف سے دلوں میں خوف و محبت اور بیم و رجاء کے جذبات کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ منافق کی ساری کمزوری یہ ہے کہ وہ خدا کو زبان سے مانتا ہے لیکن جو کچھ وہ کہتا ہے اسے اس کا دل باور نہیں کرتا ہے۔ اس کے ظاہر و باطن میں ہم آہنگی کے فاصلے ہی فاصلے ہوتے ہیں۔

منافقین کی ذہنی پستی

(۸۲) یعنی ان لوگوں سے جو برضا و رغبت اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر عیب لگاتے ہیں۔ اور جن اہل ایمان کو اپنی مشقت کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ ان کو مذاق کی جزا دے گا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو صدقہ دینے کی ترغیب دی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چار ہزار دینار یا درہم دیئے۔ عاصم بن عدی نے ایک سو وسق کھجوریں جن کی قیمت چار ہزار درہم ہوتی تھی۔ پیش کیں۔ منافقین کہنے لگے کہ ان دونوں نے دکھلاوے اور نام و نمود کو دیا ہے۔ ایک غریب صحابی ابو عقیل حجابنے جو محنت و مشقت سے تھوڑا کما کر لائے تھے اس میں سے ایک صاع صدقہ کیا تو مذاق اڑانے لگے یہ خواہ مخواہ زور آوری سے لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ بھلا اس کی ایک صاع کھجوریں کیا بنائیں گی۔ غرض تھوڑا دینے والا اور زیادہ دینے والا کوئی ان کی زبان سے نہ بچتا تھا۔ کسی پر طعن کسی پر ٹھٹھا کرتے تھے حق تعالیٰ نے فرمایا سخر الله منهم اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے یعنی ان کے طعن و تمسخر کا بدلہ دیا ہے بظاہر تو وہ چند روز مسخرہ پن کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیئے گئے ہیں لیکن فی الحقیقت اندر ہی اندر رشک کی جڑیں کٹتی چلی جا رہی ہیں اور عذاب الیم ان کے لیے تیار ہے [1]

اس سے پہلے آیات میں یہ بتایا گیا تھا کہ منافقین اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے میں بخیل ہیں۔ اب اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ خود مال خرچ کرنے میں بخیل ہیں بلکہ دوسروں کو

[1] افادات شیخ الاسلام

بھی خرچ کرتے نہیں دیکھ سکتے۔ جس کو راہ خدا میں خرچ کرتے دیکھتے ہیں اس کو اپنے طعنوں اور آوازوں کا نشانہ بناتے ہیں جو فیاض اور مخلص آدمی فیاضی اور خوش طبعی سے راہ خدا میں دیتے ہیں ان پر ریاکاری کی پھبتی کستے ہیں محض دینداری کی نمائش کے لیے دے رہا ہے اور جو بیچارے غریب کچھ رکھتے نہیں جان جوکھوں میں ڈال کر محنت و مزدوری کر کے لاتے ہیں اس میں سے راہ خدا میں دیتے ہیں۔ ان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اور آوازے کستے ہیں کہ لو یہ بھی حاتم طائی کی گور پر لات مارنے آئے ہیں۔

دراصل یہ بخیل کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے کہ بخیل آدمی اپنی بخالت پر پردہ ڈالنے کے لیے چاہتا ہے کہ دوسرے بھی بخیل بن جائیں۔ اندھا دوسروں کو بھی اندھا دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے تاکہ اسے کوئی اندھا کہنے والا نہ رہے۔ یہی نفسیات ان منافقین کی تھیں اور اسی سے ان کی اسلام دشمنی کے جذبے کی تسکین ہوتی تھی نہ وہ خود اسلام کی خاطر ایثار کرتے تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی اسلام کی راہ میں خرچ کرے اس لیے جب وہ اسلام کی خاطر دریا دلی کرتے دوسروں کو دیکھتے تو دل کی جلن ان مخلصین پر آوازے کس کے نکالتے۔ یہاں لفظ ھمز کے استعمال پر بہت گہری معنویت ہے۔ قرآن میں ان ہی منافقین کے بارے میں کھلے لفظوں میں یہ بتایا ہے۔ الذین یبخلون و یامرون الناس بالبخل۔ خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کی تلقین کرتے ہیں اور ان ہی سرمایہ داروں کا قرآن نے ایک سورت میں ھمزہ لمزہ سے چہرہ پیش کیا ہے۔ ھمزہ ھمز سے لمزہ لمز سے بنا ہے دونوں میں باریک سا فرق ہے، ایک کے معنے منہ پر عیب لگانے دوسرے کے معنے پیٹھ پیچھے عیب نکالنے کے ہیں ویل لکل ھمزۃ لمزۃ الذی جمع مالا و عددہ ان لوگوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے سے آگے نکل جانے والوں کے سامنے عیب نکالتے ہیں اور جو منہ پر کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتے وہ پس پشت یاوہ گوئی کرتے ہیں۔

سخر اللہ منھم اس قسم کی تعبیر علمائے بلاغت کی زبان میں مشاکلت کہلاتی ہے عربی میں یہ طریقہ عام ہے یعنی اسی لفظ کو الٹ دینا مطلب یہی ہے کہ اللہ ان کو تمسخر کی سزا دے گا یعنی ان کے تمسخر کو ان پر ہی پلٹ دے گا۔ بجازیھم جزاء السخر۔ جیسے سیئہ کی جزا کو مشاکلت کی بنا پر سیئہ کہہ دیا جاتا ہے ایسے ہی تمسخر کی جزاء کو تمسخر کہہ دیا گیا ہے ورنہ اللہ سبحانہ کی ذات اقدس ہر قسم تمسخر سے پاک ہے تعالی من ذالک علوا کبیرا۔

آیت قرآنی کا پس منظر

آیئے اب آیت قرآنی کے اس پس منظر کو بھی پڑھ لیجئے جو آپ حضرت شیخ الاسلام کی زبانی سن آئے ہیں

شیخ الاسلام نے جو واقعہ بیان کیا ہے یہ حدیث کی کتابوں میں مختلف الفاظ میں آیا ہے۔ صحیح بخاری میں بحوالہ ابو مسعود انصاری یہ واقعہ اس طرح آیا ہے۔ کتاب الزکوٰۃ اور کتاب التفسیر میں ہے۔ کتاب الزکوٰۃ میں اس طرح ہے کہ:۔

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب آیت صدقہ نازل ہوئی ہم باہم ایک دوسرے کی مزدوری کرتے تھے۔ ایک شخص آیا اس نے بہت زیادہ صدقہ پیش کیا تو منافقین نے کہا کہ دکھاوا کر رہا ہے۔ ایک اور شخص آیا اس نے ایک صاع صدقہ دیا منافقین نے کہا کہ اللہ سبحانہ کی ذات اس سے بے پرواہ ہے قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

اور کتاب التفسیر میں اس طرح ہے۔

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ؐ نے جب ہمیں صدقہ کا حکم دیا تو ہم ایک دوسرے کی مزدوری کرتے۔ ابو عقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ صرف آدھا صاع لے کر آئے۔ ایک شخص بہت زیادہ لے کر آیا منافقین نے ابو عقیل کے بارے میں کہا کہ اللہ کو اس صدقہ کی کیا پروا ہے اور زیادہ والے کے متعلق کہا کہ یہ تو دکھاوے کے لیے لے کر آیا ہے قرآن کی یہ آیت الذین یلمزون المطوعین من المومنین نازل ہوئی۔

اصل ارشاد کے الفاظ کنا نحامل ہیں حافظ عسقلانی نے اس کے معنے یہ بتائے ہیں کہ باہم ایک دوسرے کا کام مزدوری پر کرتے۔ اور زیادہ صدقہ پیش کرنے والے کا نام عبدالرحمٰن بن عوف ؓ لکھا ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف ؓ کی پیش کردہ اس سے زیادہ مقدار کی تعیین میں اختلاف ہے بخاری و مسلم میں تو مقدار نہیں بتائی گئی۔ حدیث کی دوسری کتابوں میں اس کی تعیین آئی ہے۔ مسند بزاز میں ابو ہریرہ ؓ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ عبدالرحمٰن نے کہا:۔

یا رسول اللہ میرے پاس چار ہزار ہیں دو ہزار میں راہ خدا میں دیتا ہوں اور دو ہزار میں اپنے بال بچوں کے لیے رکھتا ہوں۔

لیکن یہ روایت متصل نہیں ہے یہی روایت عبد بن حمید نے مسند میں ابن ابی حاتم، طبری ابن مردویہ نے دوسری سند سے پیش کی ہے۔ محمد بن اسحاق نے اسی کو بلا سند لکھا ہے۔ ابن جریر طبری اور ابن ابی حاتم نے اس طرح روایت کیا ہے کہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک میں صدقہ کی ترغیب دی حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف

چار ہزار لے کر آئے اور بولے کہ یا رسول اللہؐ میرا مال آٹھ ہزار ہے میں نے آدھا آپؐ کی جناب میں پیش کر دیا اور آدھا میں نے بال بچوں کے لیے رکھ لیا۔ حضورؐ نے دعا فرمائی اور اسی روز عاصم بن عدی نے سو وسق کھجور دی اور ابو عقیل کھجور کا ایک صاع لے کر آئے۔

ابن جریر طبری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عوفی کے حوالہ سے بھی لکھا ہے لیکن عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بحوالہ علی ابن طلحہ بتایا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ چار سو اوقیہ سونا لے کر آئے اور بتایا کہ میری ملک میں آٹھ سو اوقیہ سونا ہے۔ اور عبدالرزاق صاحب مصنف حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ آٹھ ہزار دینار تھے۔ قاضی عیاض نے شفا میں لکھا ہے کہ نو سو اونٹ پیش کیے۔ بہر حال حضرت عبدالرحمٰن کے صدقہ کی مقدار میں بے حد اختلاف ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو بخاری و مسلم میں ہے کہ تصدق بشئ کثیر۔ حضرت عبدالرحمٰن رضؓ نے بہت صدقہ دیا تھا لیکن یہ کتنا تھا تاریخی طور پر اس کی تعیین مشکل ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

ع ۸ ۱۰ ۱۶

اے پیغمبر ﷺ تم ان کے لیے بخشش مانگو یا بخشش نہ مانگو۔ اور اگر تم ان کے لیے ستر بار بھی بخشش مانگو گے تو اللہ ان کی ہرگز بخشش نہ فرمائے گا۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ و رسول کا کفر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ بدکاروں کو راہ نہیں بتاتا[۸۳]

منافقین کا حکم

امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ منافقین کی متعدد قسمیں ہیں قرآن نے ان قسموں کی طرف ومنهم من يقول۔ منهم الذين يؤذون النبی۔ منهم من عاهد الله۔ سے اشارا بھی کیا ہے۔ قرآن نے اسی پارے میں منافقین کے اور طبقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس طرح آخری انجام کے اعتبار سے مسلمانوں کے مدارج مختلف ہیں بلکہ ان کے ایمان اور اعمال کے مراتب کے لحاظ سے انہیں مختلف مدارج عطا کیے جائیں گے اسی طرح منافقین سب ایک درجہ میں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے مراتب نفاق کے اعتبار سے ان کی سزاؤں کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ جس منافق کے اندر نفاق اپنی پوری شدت سے کارفرما ہوگا اس کے عذاب کی کیفیت اور کمیت کچھ اور ہوگی۔ اور جس کے اندر نفاق کی معمولی اور نسبتاً ہلکی خصوصیات ہوں گی اس کے عذاب کی نوعیت کچھ اور ہوگی یہی فرق ان احکام میں بھی ملحوظ ہے جو عام مسلمانوں کو منافقوں کے بارے میں دیئے گئے ہیں۔ خود اصول جزا کا یہی تقاضا ہے کہ مختلف طبقات منافقین کے درمیان یہ فرق

ملحوظ رکھا جائے۔ قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے مثلاً وہ لوگ جو خدا اور رسول خدا اور آیات قرآنی کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں ان کے بارے میں ارشاد ہے۔

لا تعتذروا قد کفرتم بعد ایمانکم ان نعف عن طائفۃ منکم نعذب طائفۃ بانھم کانوا مجرمین۔

منافقو! باتیں نہ بناؤ یقیناً تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا اگر تم میں سے ایک گروہ کو معاف بھی کر دیں تو دوسرے گروہ کو ضرور عذاب دیں گے کیونکہ وہ ہی مجرم ہیں۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نفاق جو جان بوجھ کر اختیار کیا جائے اس کا مقام اور ہے۔ اور محض جہالت قلت اعتناء یا ضعف نفس کی بنا پر ہو اس کا مقام اور ہے اور کیا عجب ہے کہ رحمت الٰہی کا دائرہ کسی وقت وہاں تک وسیع ہو جائے۔

منافقین کے طبقات

اس نقطہ نظر سے جب ہم عام منافقین کے حالات وصفات پر نگاہ ڈالتے ہیں اور ان کی کیفیات نفسی کا عام مطالعہ کرتے ہیں تو منافقین تین بڑے طبقات میں بٹے نظر آتے ہیں۔

منافقین کا طبقہ اول

ایک تو وہ اشرار ازلی ہیں جو اسلام اور کفر دونوں کی حقیقت دونوں کے نظریات اور دونوں کے نصب العین سے بخوبی واقف ہیں۔ پھر اس واقفیت کے بعد ان کا دل اسلام سے پوری طرح برگشتہ اور کفر کا فرانہ نظریات کا سچا عقیدت کیش ہے لیکن اس کے باوجود اس کے مصالح ہیں جو انہیں مجبور کیے ہوئے ہیں کہ اسلام سے علانیہ بے تعلقی کا اظہار نہ کریں بلکہ منافقت کے لباس میں اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کی کوشش کریں یہ منافقانہ طرز عمل خواہ کسی نے اپنی ذاتی اغراض اور مصلحتوں کی خاطر اختیار کیا ہو یا کسی مسلک کفر کے اعتقادات اور نظریات مسلم عوام میں کامیابی کے ساتھ پھیلانے کے لیے چال کے طور پر اختیار کیا ہو۔ یا مسلمانوں کے نظام ملی میں انتشار برپا کرنے کے لیے اور ان کے جماعتی رازوں کی جاسوسی کرنے اور درپردہ ان کی قوتوں کو فنا کر دینے کے لیے سیاسی حربے کے طور پر اختیار کیا ہو بہرحال اس قسم تمام منافقین ایک طبقہ ہیں۔

منافقین کا دوسرا طبقہ

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو گو حالتِ نفاق میں مبتلا ہیں لیکن ان کا باطن اتنا زنگ آلود نہیں ہے جیسا کہ مقدم الذکر طبقہ کا ہے۔ ان کا نفاق یا تو ناواقفیت پر مبنی ہے یعنی ان کے سامنے اسلامی اور غیر اسلامی اصول و معتقدات اچھی طرح ایک دوسرے سے متمیز نہیں ہیں اور اس وجہ سے وہ ناداستہ کفر کی حالت میں مبتلا ہیں یا پھر ان کے نفس کی کمزوری نے انہیں منافقین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ کفر کی بہ نسبت اسلام سے زیادہ قریب ہیں مگر ان کے اسلام میں اتنی قوت نہیں ہے کہ اپنے اصول و مسلک کی خاطر اپنے مادی علائق اپنی طبعی لذات اور اپنی دنیوی مصالح کو قربان کر سکیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اسی طبقہ کا حجۃ اللہ البالغہ میں چہرہ پیش کیا ہے۔

> سلف کی زبان میں اسی کا نام نفاق عمل ہے اور یہ اس طرح نشو و نما ہوتا ہے کہ طبیعت کی غلط اتباع، رسم و ماحول یا غلط معلومات کا پردہ سامنے آجاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں دنیا کی محبت میں خاندان اور اولاد کی محبت میں ڈوب جاتا ہے اس کے دل میں آخرت میں حساب کا فکر نہیں رہتا اور غیر شعوری طور پر گناہوں پر دلیر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ عقلی طور پر وہ سب کچھ مانتا ہے جو ماننا چاہیے۔

پہلا طبقہ نفاق کی آخری سرحد پر ہے۔ اس آیت میں اسی طبقہ کا حکم بیان ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے رکوع میں اسی طبقہ کا ذکر ہوا ہے ان کے اعمال اکارت ہو جائیں گے۔ حبطت اعمالھم اور اس کا حبط عمل یہ ہے کہ:۔

> اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں سے اور کفار سے نارِ جہنم کا وعدہ کر رکھا ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

ان منافقین و کفار کے لیے جہنم کی سزا تو ضرور ہے لیکن منافقین کے بارے میں ہے۔ ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار۔ اور یہ امتیازی سزا بالکل تقاضائے عدل ہے، اس آیت میں عذاب کی اسی سنگینی کو بتایا گیا ہے۔

(۸۳) اے پیغمبر ان منافقوں کے لیے تم خواہ دعائے مغفرت کرو یا نہ کرو تم چاہے ستر بار بھی ان کے لیے دعا مغفرت کرو گے تب بھی اللہ سبحانہ ان کی ہرگز بخشش نہیں فرمائے گا۔ اللہ بدکاروں کو ہدایت نہیں دیتا ہے

یعنی منافقین کے لیے آپ کتنی بار استغفار کیجئے ان کے حق میں بالکل بیکار اور بے فائدہ ہے۔ اللہ سبحانہ ان بدبخت کافروں۔ اور نافرمانوں کو کبھی معاف نہ فرمائے گا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ مدینہ میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کا انتقال ہوا۔ آپؐ نے قمیص مبارک کفن میں دی۔ لعاب مبارک اس کے منہ میں ڈالا نماز جنازہ پڑھی اور دعائے مغفرت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس معاملہ میں آڑے آتے تھے اور کہتے تھے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ وہی خبیث تو ہے جس نے فلاں فلاں وقت ایسی نالائق حرکات کیں ہمیشہ کفر ونفاق کا علمبردار رہا کیا حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ استغفر لھم او لا تستغفر لھم الخ۔ آپؐ نے فرمایا اے عمرؓ مجھے استغفار سے منع نہیں کیا گیا بلکہ آزاد رکھا گیا ہے کہ استغفار کروں یا نہ کروں۔ یہ اللہ سبحانہ کا کام ہے کہ اسے معاف نہ کرے یعنی ان کے حق میں میرا استغفار نافع نہ ہو سو ان کے حق میں نہ سہی ممکن ہے دوسروں کے حق میں میرا یہ طرز عمل نافع ہو جائے دوسرے لوگ سب سے بڑے موذی کے حق میں نبی کے اس وسعت اخلاق اور وفور رحمت وشفقت کو دیکھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام کے گرویدہ ہو جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر میں جانتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے اس کی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا۔ گویا اس جملہ میں حضور نے متنبہ فرمادیا کہ حضرت عمرؓ کی طرح آپؐ بھی اس کے حق میں استغفار کو غیر مفید تصور کرتے تھے فرق اس قدر ہے کہ حضرت عمرؓ کی نظر بغض فی اللہ کے جوش میں اس نقطہ پر تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میت کے فائدے سے قطع نظر فرما کر عام پیغمبرانہ شفقت کا اظہار اور احیاء کے فائدہ کا خیال فرما رہے تھے لیکن آخر کار وحی الٰہی و لا تصل علیٰ احد منھم مات ابداً۔ نے صریح طور پر منافقین کا جنازہ پڑھنے یا ان کے کفن دفن کے اہتمام میں حصہ لینے کی ممانعت فرمادی۔ کیونکہ اس طرز عمل سے منافقین کی ہمت افزائی اور مومنین کی دل شکستگی کا احتمال تھا اس کے بعد حضورؐ نے کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھی[1]

اسی قسم کی آیت سورہ منافقون میں آئی ہے۔ سواء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم لن یغفر اللہ لھم واللہ لا یھدی القوم الفاسقین۔ ترجمہ وہی ہے۔ اور یہ آیت سورہ توبہ سے تین سال پہلے نازل ہو چکی تھی ۔ فرق صرف یہ ہے کہ سورہ برارت میں سبعین مرۃ کے اضافہ سے اس میں زور پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ مغفرت نہ کرنے کا سبب اللہ ورسول کا کفر ہے۔ سبعین سے محاورے کی زبان میں عدد نہیں کثرت مراد ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے جس قدر

[1] افادات شیخ الاسلام

اور جتنی بھی زیادہ تم ان کے لیے مغفرت مانگو گے ان کے بارے میں تمہاری درخواست ہرگز قبول نہ کی جائے گی۔ اس آیت میں یہ دو اضافے اول سبعین مرۃ دوسرے ذالك بانھم کفروا باللہ و رسولہ بہت ہی خوبصورت اور برموقع ہیں۔ آیت میں خطاب اگرچہ بصورت امر ہے لیکن معنے کے لحاظ سے خبر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ منافقین کی اس جماعت کے لیے آپ کی دعاء مغفرت کرنا اور نہ کرنا دونوں یکساں ہیں۔ خواہ دعاء مغفرت کی کتنی بہتات ہو ان کے لیے باب رحمت ہرگز نہ کھلے گا۔

دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس ان کی ہدایت کی امید پر ان کے لیے دیر سے دعا کر رہے تھے جیسے آپ مشرکین کے لیے دست بدعاء رہتے تھے۔ اللھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔

یہاں یہ سوچ بے محل ہے کہ مشرکین کے لیے دعائے مغفرت سے قرآن میں منع کیا گیا ہے ماکان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین یہ ممانعت اس وقت ہے جب نبی ﷺ کو کسی کا جہنمی ہونا معلوم ہو جائے اور جس کی شرک و کفر ہی پر موت واقع ہو۔ زندہ کافروں کے لیے مغفرت کی دعا منع نہیں ہے۔ جن منافقین کا یہاں ذکر ہو رہا ہے وہ ہیں جن کے کفر کی خبر اللہ سبحانہ نے حضور اقدس ﷺ کو دے دی تھی۔ اور یہ ایک مقررہ تعداد تھی۔ جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ ان کی تعداد بارہ تھی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم خاص خاص منافقوں کے لیے ہوا تھا اور حضور اقدس ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے نام بتا دیئے تھے۔[1]

اسی لیے یہاں عدم مغفرت کا سبب بھی بیان کر دیا۔ ذالك بانھم کفروا باللہ ورسولہ۔ یعنی ان کی مغفرت نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہ مسلمان نہیں ہیں بلکہ ان میں اللہ و رسول کا کفر کھل کر سامنے آ گیا ہے بالفاظ دیگر مطلب یہ ہوا کہ ان کے نہ بخشے جانے کا سبب یہ نہیں کہ آپ کی استغفار میں قوت فاعلی نہیں ہے بلکہ بنیادی سبب یہ ہے کہ ان میں مغفرت کے لیے قابلیت نہیں ہے۔ اگر ان میں بخشے جانے کی قابلیت ہوتی تو آپ کے استغفار کے موثر ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوتی۔ آپ کی دعاء کے لیے رحمت کا دروازہ کشادہ رہتا ہے بشرطیکہ جن کے لیے کی جا رہی ہے ان میں اس فیضان کے لینے کی صلاحیت ہو قرآن نے حضور اقدس ﷺ کے لیے یہ ضابطہ بتایا ہے۔

لو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوك فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول

[1] فتح الباری

لوجدوا اللہ توابا رحیما۔

اگر وہ اپنی جانوں پر ظلم کر کے یعنی گناہوں کے ارتکاب کے بعد آپ کے پاس آئیں خدا کی جناب میں گناہوں کی معافی مانگیں اور آپ بھی ان کے لیے مغفرت کی درخواست اللہ سے کریں تو ایسے لوگوں کی اللہ توبہ قبول کرتا ہے اور ان پر رحمت کرتا ہے۔

یعنی آپ کی دعاء ان کے لیے کارآمد اور مفید ہوتی ہے جن میں اپنی خطا کاری کا احساس ہو اور گناہوں پر ندامت ہو اور وہ خود بھی اللہ کی جناب میں معافی کی درخواست کریں۔ وہاں ہرگز مؤثر و مفید نہیں ہوتی جہاں کفر ہی نہیں بلکہ کفر پر اصرار ہو۔ اور ایمان کے دائرے ہی سے نکل چکے ہوں ایسے ناخدا شناس اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت کرنے والوں میں یہ قابلیت ہی نہیں ہے کہ آپ کی قوت فاعلی ان میں مؤثر ہو اللہ کا قانون یہ ہے کہ بدکار و سرکش لوگوں کے لیے جو توبہ و ایمان کی استعداد ہی تج کر بیٹھے ہوں توفیق کا دروازہ ہی نہیں کھلتا توفیق الٰہی تو بقدر طلب و ارادہ آتی ہے۔

اس آیت میں سبعین مرۃ تعدید کے لیے نہیں تکثیر کے لیے آیا ہے زمخشری لکھتے ہیں لفظ سبعین عربی زبان میں تکثیر کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں استغفار کی ممانعت کے لیے آیا ہے۔ لیکن صحیح بخاری میں ہے کہ :۔

جس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ ابن ابی سلول پر جنازے کی نماز سے روکا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے اللہ نے اختیار دیا ہے کہ چاہے بخشش مانگو یا نہ مانگو میں ستر سے زیادہ بار مانگوں گا۔ سازیدہ علی السبعین۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سبعین کی تعبیر تکثیر کے لیے نہیں بلکہ تعدید کے لیے ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسے تکثیر کے معنے میں سمجھا ہے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تعدید کے معنے لیے ہیں زمخشری نے اس پر سوال قائم کر دیا ہے اور سوال اپنی جگہ اہم بھی ہے اور معقول بھی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب افصح العرب اور عربی انداز تعبیر کے سب سے زیادہ رمز شناس ہیں تو آپ پر یہ بات کیسے مخفی رہی ہے۔ کچھ علماء نے اس اشکال کی طاقت سے متاثر ہو کر حدیث کی صحت ہی سے انکار کر دیا ہے چنانچہ امام ابوبکر الباقلانی امام غزالی اور امام داودی نے یہ تصریح کر دی ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اور امام الحرمین تو یہاں تک کہہ گئے کہ یہ حدیث صحیح بخاری میں نہیں ہے۔ زمخشری نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ بلاشبہ ان امر کو آپ سے زیادہ سمجھنے والا کوئی نہ تھا لیکن اس انتہائی دلسوزی کی بنا پر جس کا جوش نبی کے سینے میں ہوتا ہے۔

نبوت ارادۂ الفاظ کی ظاہری گنجائشوں سے فائدہ اٹھالیتی ہے وہ امت کے معاملہ میں تاامکان دوسرے خلاف پہلو کو ذہن میں لاتا ہی نہیں ہے جب تک کہ الفاظ میں اس کے لیے آخری گنجائش بھی ختم نہ ہو جائے ٹھیک اسی طرح جیسے ایک ہمدرد وکیل آئین کی وسعتوں سے آخری حد تک فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر۔ چنانچہ اس واقعہ کی جب صراحۃً ممانعت آگئی تو آپ نے پھر کسی کی نماز نہیں پڑھائی ــــــ

لیکن علامہ ابن المنیر نے زمخشری کا یہ کہہ کر تعاقب کیا ہے کہ ایسی بات کی نبوت کی طرف نسبتہ بھی جائز نہیں۔ کیونکہ جب اللہ سبحانہ نے کافروں کے نہ بخشنے کی اطلاع دے دی تو مغفرت کفار کی ایک امر محال ہو گئی اور ذات نبوت اللہ سے محال کی دعا کبھی نہیں کر سکتی۔

حافظ عسقلانی نے کچھ علماء کی جانب سے یہ جواب بھی نقل کیا ہے کہ استغفار دو طرح کی ہوتی ہے ایک کہ قبولیت کی امید پر دعا کی جائے دوسرے یہ کہ مردہ کے لیے قبولیت کی امید پر نہیں بلکہ حالات موجودہ میں سازگاری پیدا کرنے کے لیے دعاء مانگی جائے۔ اس دعاء کے نتیجے میں دوسرے لوگ متاثر ہوں گے لیکن حافظ عسقلانی کو یہ جواب بھی پسند نہیں ہے۔

کچھ علماء کہتے ہیں کہ آیت قرآنی میں اللہ سبحانہ نے استغفار اور عدم استغفار میں برابری قائم کر کے عدم قبولیت کی خبر دی تھی۔ لیکن استغفار سے صراحۃً منع نہیں کیا گیا تھا۔ اس سے حضورؐ نے سمجھا کہ مجھے اختیار دیا گیا ہے یہ مطلب نہیں کہ حضورؐ نے حرف عاطف سے تخییر سمجھی۔ اور علامہ الشہاب نے عنایۃ القاضی میں اس سے زیادہ لطیف بات لکھی ہے کہ ان کو فائدہ نہ ہونے میں آپ کی استغفار اور عدم استغفار دونوں برابر ہیں۔ یہ تخییر کے منافی نہیں ہے استغفار اور عدم استغفار دو ضدیں ہیں دونوں کا کرنا جائز ہے اور نہ دونوں کا چھوڑنا جائز ہے۔ ان دونوں میں سے ایک کو اختیار کرنا ضروری ہے اختیار دو طرح سے ہو سکتا ہے کرنے میں یا نہ کرنے میں۔ کرنے میں جیسے سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لایومنون — آخر میں لایومنون کے باوجود آپ نے انذار کو ترک نہیں کیا یعنی آپ نے دعوت کا کام جاری رکھا اور نفی میں جیسے سواء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم یہ محتاج تشریح و بیان ہے اسی لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اختیار دیا گیا ہے۔ غالباً یہ رخصت و اختیار عبداللہ بن ابی کے لیے کسی حکمت کی بنا پر آپ کو ملی تھی۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے انذار و عدم انذار پر مخاطب کے حق میں بے فائدہ تھا ایسے ہی استغفار اور عدم استغفار مخاطب کے حق میں بے فائدہ ہونے کے باوجود آپ کے حق میں یا اسلام کے حق میں بے فائدہ نہ تھا۔ حضور

اقدس ﷺ نے اس فائدہ کا ذکر فرمایا: "مجھے تو یہ امید تھی کہ اس عمل سے شائد عبداللہ بن ابی کی قوم کے ایک ہزار افراد مسلمان ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہ فائدہ حاصل ہو گیا جب اس کی قوم نے آپ کی شفقت و رحمت کا یہ منظر دیکھا تو ہزار افراد نے اسلام قبول کر لیا۔

سید انور شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہاں صحیح بخاری کے درس میں بڑی لطیف بات بتائی۔ فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ کا آیت قرآنی سے تخییر کی بات سمجھنا اور سبعین کو تکثیر کے بجائے تحدید پر محمول کر لینا باب بلاغت سے ہے۔ بلاغت میں تلقی المخاطب بما لا یرضیہ المتکلم خاص انداز سے مخاطب کا فائدہ اٹھانے کے لیے کلام ہیں ایسا مطلب پیدا کر لینا جو متکلم کی مراد نہ ہو۔ حضور اقدس ؐ نے یہ فرما کر میں ستر سے زیادہ بار مغفرت مانگوں گا یہی فائدہ اٹھایا چونکہ صراحۃ ممانعت نہ تھی اس لیے آپ نے موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بادشاہ کسی مجرم سے کہے لاحملنك على الادهم (میں تجھے بیڑیاں ڈالوں گا) اور مجرم سن کر آگے سے بادشاہ سے کہے۔ الامیر یحمل علی الادھم والاشھب۔ امیر تو سیاہ اور سفید گھوڑے ہی پر سوار کرایا کرتے ہیں حضور اقدس ؐ نے ترحم کی خاطر اسی انداز کو اپنایا۔

اب بات بے غبار ہو کر سامنے آگئی جو بات حضور اقدس ؐ نے اختیار فرمائی وہ آپ کے مقام و منصب کے شایان ہے۔ جن لوگوں کو علوم بلاغت سے مس نہیں اس میں اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال اس آیت قرآنی اور حضور اقدس کے عمل کی تطبیق میں شارحین قرآن کو بڑی مشکلوں سے دوچار ہونا پڑا ہے لیکن فی الحقیقت معاملہ بالکل واضح ہے۔

اب تک صرف اس بات کی تشریح کی گئی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے قرآن میں سبعین مرۃ کے منطوق تکثیر کو تعدید پر کیوں محمول کیا ہے۔ باقی رہا پورا واقعہ جس کا ذکر شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں کیا ہے اس پر تبصرہ انشاء اللہ زیر آیت ولا تصل علی احد منھم ابدا آ رہا ہے۔

یہاں یہ بات ضرور گوش گزار کر لینی چاہیے کہ علامہ آلوسی نے امام رازی کی متابعت میں اس آیت کا سبب نزول یہ بتایا ہے کہ:

> حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب قرآن کی آیت سخر اللہ منھم نازل ہوئی تو ان آوازہ کسنے والوں اور عیب چینی کرنے والوں نے حضور ؐ سے درخواست کی کہ آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا فرمائیے۔ حضور اقدس ﷺ نے دعا کرنے کا ارادہ کیا تو یہ آیت استغفر لھم الخ نازل ہو گئی پھر حضور ؐ نے ان کے لیے بخشش کی دعا نہیں مانگی۔

یہ نقل کرنے کے بعد امام رازی نے اس پر سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا اور علامہ آلوسی بھی جواب الجواب کے میدان میں آ گئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس واقعہ کی روایتی و تاریخی حیثیت کیا ہے۔ شارحین قرآن میں سے تو کسی نے اس کا اشارتاً تک نہیں کیا۔ دونوں بزرگوں نے اس واقعہ کا تاریخی سرا کوئی نہیں بتایا نہ کسی محدث کا نام لیا اور نہ کسی مفسر کا۔ صرف ابن الجوزی نے بتایا ہے کہ یہ ابو صالح کا بحوالہ ابن عباس بیان ہے اور اس کے سوا نہ اس کی کوئی سند ہے نہ کسی روایت کرنے والے محدث کا نام ہے۔

اور پھر یہ روایت بخاری اور مسلم کی ان دونوں روایتوں سے معارض ہے جو بحوالہ ابن عباس اور ابن عمر آئی ہیں اور جن میں صاف بتایا ہے کہ استغفار عبد اللہ ابن ابی کی موت پر جنازے میں ہوئی ہے۔

بہر حال یہ آیت اس سختی اور سخت گیری کی تاکید کے لیے آئی ہے جس کا ذکر جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم میں ہوا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی مجسمہ رحمت و شفقت تھی اس لیے منافقین کی ان شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں کے باوجود ان کی اصلاح اور نجات آپ کو اس قدر عزیز تھی کہ جس طرح آپ اپنی تمام امت کے لیے لگاتار اللہ سبحانہ سے بخشش چاہتے رہتے تھے۔ اسی طرح منافقین کے لیے بھی برابر نجات کی دعاء کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان کی شقاوت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ یہ اس بات کو بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی دوسرا اسلام کی کوئی خیر خواہی کرے بلکہ ہر خیر خواہ کے حوصلہ کو پست کرنا انھوں نے اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔

اب اس آیت میں براہ راست حکم خداوندی سے آپ کو منافقین کے لیے دعاء مغفرت کرنے سے روک دیا گیا۔ کیونکہ اب یہ مستقل پالیسی مقرر کی جا چکی تھی کہ مسلمانوں کی جماعت میں منافقین کو کسی طرح نہ پنپنے دیا جائے۔ اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے اس گروہ کی ہمت افزائی ہو۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا
اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ
لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا
كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ
اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ
لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ
رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿٨٣﴾
وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى
قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨٤﴾

جن لوگوں کو پیچھے چھوڑ دیا گیا وہ اپنے رہ جانے پر حضور اقدس ﷺ کی چاہت کے خلاف اترائے اور ان کو مالوں اور جانوں کو اللہ کے راستہ میں کھپانا گوارا نہ ہوا۔[84] اور انھوں نے لوگوں سے کہا کہ اس گرمی میں گھروں سے نہ نکلو۔[85] اے پیغمبرؐ ان سے فرما دیجئے کہ دوزخ کی آگ کی گرمی اس گرمی سے کہیں زیادہ ہے۔ اے کاش ان کو اس بات کی سمجھ ہوتی۔[86] ان کو تو اپنی کمائی کی پاداش میں کم ہنسنا اور زیادہ رونا چاہیے۔[87] اے پیغمبرؐ بس اگر اللہ تم کو ان میں سے

کسی جماعت کی طرف اس جنگ سے واپس گیا پھر وہ آیندہ کسی جنگ میں تم سے نکلنے کی اجازت طلب کریں تو آپ فرما دیجئے کہ تم میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے جنگ کرو گے۔ تم نے پہلی بار بیٹھے رہنا پسند کیا لہذا اب بھی پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ ۸۳ اور اے پیغمبرؐ ان میں اگر کوئی مر جائے تو ان کے جنازے کی نماز نہ پڑھنا اور نہ قبر پر کھڑے ہونا۔ کیونکہ انھوں نے اللہ رسول کا کفر کیا اور ایسی حالت میں مرے ہیں کہ ہدایت کے دائرے سے باہر ہیں ۸۴

معانی مفردات

المخلفون۔ مخلف کی جمع وہ جو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ خلف مادہ ہے اگر معنے جانشین ہونے کے ہوں تو مصدر خلافت ہے اور اگر پیچھے آنے کے معنے ہوں تو مصدر خَلَفٌ ہے اس کا باب نصر ہے۔ یہاں خلف ہے جس کے معنے پیچھے آنے کے ہیں۔

خلاف۔ یہ لفظ قرآن میں دو معنے میں استعمال ہوا ہے۔ ایک بے ترتیبی کے معنے میں جیسے تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ دیئے جائیں۔ دوسرے بعد اور پیچھے کے معنے ہیں جیسے اذا لایلبثون خلافك الا قلیلا۔ تو تیرے پیچھے یہ بھی کچھ زیادہ نہ ٹھہریں گے۔ علامہ شہاب لکھتے ہیں کہ لفظ خلاف پیچھے کے معنے میں آتا ہے کیونکہ پیچھا آگے کے مخالف ہوتا ہے آگے کو امام اور پیچھے کو خلاف کہتے ہیں۔ خلاف باب مفاعلت کا مصدر بھی ہے جیسے قتال۔ مخالفت اور خلاف دونوں مصدر آتے ہیں۔ یہاں یہ مفعول فیہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اگر پیچھے کے معنی ہیں اور مقعد کا مفعول فیہ ہے اور اگر خلاف بمعنے مخالفت ہو اور مصدر ہو تو فرح کا مفعول لہ ہونے کی وجہ منصوب ہے۔

منافقین کے جرائم

یہ منافقین کے طبقہ اول کے جرائم کی داستان ہے۔ اس طبقہ کے بارے میں قرآن کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے کہ اہل ایمان اگر اللہ کی پارٹی ہیں تو اہل نفاق شیطان کی جماعت ہیں اولئک حزب الشیطان۔ اس لیے خواہ یہ لاکھ اظہار ایمان کریں امت اسلامیہ سے ان کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ یہ کبھی بھی جماعت میں شمار نہ کیے جائیں بلکہ ھم العدو فاحذرھم۔ یہ دشمن ہیں ان سے بچ کر رہو۔ کیوں کہ دشمن سے کبھی بھی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی بالخصوص ایسا دشمن جو دوست نما ہو اس کی خطرناکیوں کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ ایسے دشمنوں سے کھلے دشمنوں کفار کی بہ نسبت دوچند خبردار اور متنبہ رہنے کی ضرورت ہے ان لوگوں سے کامل علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔ انہیں اپنے معاشرتی، انتظامی، تعلیمی اور سیاسی معاملات سے بالکل دور رکھنا چاہیے اور ان کا مکمل بائیکاٹ کر کے اپنی جماعت سے الگ کر دینا چاہیے۔ اس بائیکاٹ میں کسی مداہنت کو راہ نہیں دی جاسکتی۔ خصوصاً سیاسی معاملات میں نہ تو ان سے کوئی مشورہ لیا جاسکتا ہے اور نہ اپنی جماعت کے اسرار اور رموز مملکت سے انہیں آگاہ کیا جاسکتا ہے اور کسی معاملہ میں ان کی قیادت اور رہنمائی قبول کرنے کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا جب ایک مرتبہ کسی آزمائش میں ان کی منافقت موقع پرستی بے نقاب ہو جائے تو حتی الوسع انہیں کسی جہاد میں عام مسلمانوں کے نہ شریک کیا جائے۔ کیونکہ اگرچہ ان کی شرکت سے بظاہر مسلمانوں کی افرادی قوت میں اضافہ ہوگا لیکن دراصل ان کی شرکت اسلامی مفاد میں نہ ہوگی اس لیے کہ وہ میدان میں اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں گے اور اسلامی جماعت کی کمزوری اور پراگندگی ہی کا سبب بنیں گے۔

ان آیات میں جو احکام بیان ہو رہے ہیں وہ ان منافقین کے بارے میں ہیں جو اسلام اور کفر دونوں کی ماہیت سمجھنے کے بعد کفر کی پیروی اختیار کریں اور خفیہ یا علانیہ اسلام کے مقابلہ میں کفر کو تقویت دیں۔ اور اس کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے رہیں۔

(۸۴) جن لوگوں کو پیچھے چھوڑ دیا گیا وہ اپنے رہ جانے پر حضور اقدس ﷺ کی چاہت کے خلاف اترائے اور ان کو اپنے مالوں اور جانوں کو اللہ کے راستہ میں کھپانا گوارا نہ ہوا۔ یہ ان منافقین کے متعلق ہے جو غزوہ تبوک کی شرکت سے علیحدہ رہے یعنی منافقین کا حال یہ ہے کہ برائی اور عیب کا کام کر کے خوش ہوتے ہیں نیکی سے گھبرا کر دور بھاگتے ہیں اور جیسا کہ پہلے گذرا کہ نیکی کرنے والوں پر طعن کرتے ہیں اور آوازے کستے ہیں۔ ایسی قوم کو نبی کے استغفار سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے یہاں سے بداعتقاد اور گنہ گار کے درمیان فرق معلوم ہوتا

ہے۔ گناہ ایسا کونسا ہے جو پیغمبر کے بخشوانے سے نہ بخشا جائے۔ ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوك فاستغفروا اللہ و استغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما۔ لیکن بد اعتقاد کو پیغمبر کا ستر بار استغفار بھی فائدہ نہیں دیتا ہے [1]

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے اس بات پر خوش ہیں کہ اللہ کا رسول تو اپنے جان نثاروں کے ساتھ میدانِ جنگ میں ہو اور یہ بہانے بنا کر گھروں میں بیٹھے رہیں حالانکہ یہ خوشی کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ سوچیں تو ان کی شامت کی دلیل ہے جو بات خوش ہونے کی تھی یعنی اللہ کے راستہ میں جان کھپانا وہ تو ان کو ناگوار ہوئی اور جو بات غمگین ہونے کی تھی اس پر یہ مگن ہو رہے ہیں۔ غرض ان اشقیائے ازل کا یہ بے ضمیر اور بزدل گروہ اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں اپنی کسی تدبیر کے استعمال سے دریغ نہ کرتا تھا لیکن چونکہ خودداری سے قطعًا بے بہرہ تھا اس لیے اپنے دل کے اصلی رجحانات کی پردہ پوشی میں بڑی احتیاط اور تن دہی سے کام لیتا تھا۔ ہاں اللہ سبحانہٗ کی افشائیوں کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا اور ہر لمحہ اسے اس امر کا کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ہمارے باطن کو عام مسلمانوں کے سامنے کھول کر رکھ دے۔ چنانچہ اس آیت میں ان لوگوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو اپنے اصرار کی وجہ سے لڑائی کے پیچھے چھوڑ دیئے گئے ان کے بارے میں اس آیت میں یہ باتیں بتائی گئی۔

① ان پیچھے رہنے والوں نے پیچھے رہنے پر اصرار کیا تھا اور یہ جنگ میں جانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے ان کو پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔

② یہ لوگ حضور اقدس ﷺ کے مخالف بن کر رہتے تھے۔

③ یہ لوگ جنگ میں نہ جانے پر خوشیاں منا رہے تھے۔

④ یہ لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال لگانے کو برا سمجھتے ہیں۔

ان جرائم کی موجودگی میں ان کے دعویٰ ایمان کی حقیقت بے نقاب ہو کر لوگوں کے سامنے آگئی۔ ایمان باللہ کا امتحان صرف جہاد میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس میں کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے۔ ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو دیکھ لو خدا کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی خواہش کتنی ہے۔ کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے۔ من مات ولم یغزولم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبۃ من النفاق۔ جس شخص کو اس طرح موت آجائے کہ نہ تو اس نے خدا کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

راہ میں جہاد کیا اور نہ اپنے دل میں جہاد کی خواہش کی تو وہ ایک طرح سے نفاق کی حالت میں مرا۔ غور کیجئے آج کتنے مسلمان ہیں جن کے قلوب میں جہاد فی سبیل اللہ کا شوق ہے۔ ایمان و نفاق کا یہی جوہری فرق ہے۔ اللہ سبحانہ ہمیں نفاق کی ہر نوع سے اپنی حفاظت میں رکھے۔

دوسروں کو ورغلانا نفاق ہے

(۸۵) اور انھوں نے لوگوں سے کہا کہ اس گرمی میں گھروں سے نہ نکلو یا تو منافقین آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے ــــــ اور یا کچھ مسلمانوں سے کہتے ہوں گے کہ ان کی ہمتیں پست ہو جائیں[۱] پڑھ چکے ہو کہ ۹ ہجری میں حضور اقدس ﷺ کو خبر ملی کہ قیصر روم نے مدینہ پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا ہے اور عرب کے عیسائی قبائل بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اسلام کو عرب سے باہر ایک بہت بڑی طاقت سے آمادہ پیکار ہونا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ بروقت مدافعت کا پورا سامان کیا جاتا۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے تیاری اور کوچ کا اعلان کر دیا لیکن ایک طرف ضرورت ناگزیر تھی تو دوسری طرف وقت کی ساری باتیں ناموافق ہو رہی تھیں مسلمان چند ماہ پہلے جنگ حنین و طائف کی لڑائی میں چور ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے فتح مکہ کا معاملہ پیش آ چکا تھا۔ پھر اچانک مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ پھر موسم بڑا ہی گرم تھا اور فصل کاٹنے کا موقعہ سر پر آ گیا تھا۔ مدینے کے منافقین میں سے ایک نے نہیں بلکہ متعدد نے کہا کہ اس چلچلاتی گرمی کے موسم میں نہ جانا چاہیے۔ موسم کی ناسازگاری کو راہ حق میں نکلنے کے لیے بہانہ بنایا اور کہا لا تنفروا فی الحر۔ گرمی بڑی شدید ہے اس وقت لڑائی کے لیے نہ نکلو۔ انھوں نے یہ بات غالباً جنگ تبوک کے بارے میں مشورہ کے موقعہ پر کہی ہو گی۔ محمد بن یوسف صالحی نے تاریخ میں یہ بھی بتایا ہے کہ یہ بات مشہور جد بن قیس نے جبار بن صخر اور خاندان مسلمہ کے دوسرے ان افراد سے کہی جو اس کے ہمنوا تھے مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ صرف اپنے ہی بیٹھے رہنے پر قانع نہیں ہوئے بلکہ موسم کے ڈراوے سنا کر دوسروں کو بھی ورغلانے کی کوشش کرتے تھے کہ گرمی کا شباب ہے اس آگ میں اس سفر کے لیے نہ نکلو۔

جہنم میں آگ کی گرمی کی شدت

(۸۶) اے پیغمبر ان سے فرما دیجئے کہ دوزخ کی آگ کی گرمی اس گرمی سے کہیں زیادہ ہے اے کاش انہیں

[۱] افادات شیخ الاسلام

اس بات کی سمجھ ہوتی۔ یعنی اگر سمجھ ہوتی تو خیال کرتے کہ یہاں کی گرمی سے بچ کر جس گرمی کی طرف جا رہے ہیں وہ کہیں زیادہ سخت ہے یہ تو وہی مثال ہوئی کہ دھوپ سے بھاگ کر آگ کی پناہ لے حدیث میں ہے کہ دوزخ کی آگ دنیا کی آگ سے ۹۹ درجہ زیادہ ہے[1]۔ دوزخ کی گرمی کی شدت کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ ارشادات پڑھیئے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ نے دوزخ کو ایک ہزار سال دھکایا دھکتے دھکتے وہ سرخ ہوگئی۔ پھر ایک ہزار سال دہکایا دھکتے دھکتے وہ سپید ہوگئی پھر ایک ہزار سال دھکایا دھکتے دھکتے وہ کالی ہوگئی اب وہ سیاہ رات کی مانند کالی ہے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دوزخیوں میں کم سے کم تر عذاب یہ ہے کہ آگ کے دو جوتے اور تسمے ایسے پہنا دیئے جائیں گے کہ دماغ اس طرح کھول جائے گا جیسے ہنڈیا میں کھد اڑتا ہے۔ جس پر حالت بیتے گی وہ خیال کرے گا کہ جہنم میں یہ سب سے سخت عذاب ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ دوزخ کا کم سے کم تر عذاب ہوگا۔ اخرجاہ فی الصحیحین من حدیث الاعمش[2]۔ خود قرآن نے بھی جو جہنم میں آتشِ جہنم کا چہرہ پیش کیا ہے وہ بھی بے حد دردناک ہے۔ اس آتش اور اس کی شدت کا ذکر بار بار کیا ہے بلکہ النار یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے۔ ان ہی معنوں میں السعیر یعنی جلتی آگ بھی بارہا استعمال ہوا ہے عذاب الحریق بھی دو تین جگہ آیا ہے اور ایک جگہ یہ ہے تلفح وجوھھم النار ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دے گی۔ دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے جس کے متعلق یہ ہے۔

ما ادراك ما سقر لا تبقی ولا تذر لواحۃ للبشر۔

کیا پتہ ہے کہ سقر کیا ہے نہ وہ رحم کھائے گی نہ چھوڑے گی انسانی چہروں کو جھلس دینے والی ہے۔

اور یہ بھی فرمایا ہے۔ انھا لظی نزاعۃ للشوی۔ وہ شعلہ والی آگ ہے منہ کی کھال ادھیڑنے والی۔ اور یہ بھی فرمایا ہے۔ انھا ترمی بشرر کالقصر کانہ جملت صفر۔ دوزخ محل کے برابر اونچی اتنی بڑی چنگاریاں پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ۔ وہاں سایہ نہ ہوگا بلکہ حکم یہ ہوگا۔ انطلقوا الی ظل ذی ثلاث شعب لا ظلیل ولا یغنی من اللھب۔ چلو ایک سائے کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی نہ گھن کی چھاؤں اور نہ تپش میں کام۔ وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی۔ لا یذوقون فیھا بردا و لا شرابا۔ اس میں نہ

[1] افادات شیخ الاسلام
[2] ابن کثیر

وہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا عذاب دوزخ کی شدت کو ایک سے زیادہ مقامات پر بنایا گیا ہے۔

۱۔ پینے کو گرم پانی ملے گا۔ جس سے آنتیں نکل پڑیں گی۔

سقوا ماً حمیما فقطع امعاء ھم۔ ان کو گرم پانی پلایا جائے گا وہ پانی ان کی آنتوں کے ٹکڑے کر دے گا۔

۲۔ پیپ ان کو پلائی جائے گی۔ الاحمیما وغساقا۔

۳۔ ان کے اوپر سے ان پر گرم پانی چھوڑا جائے گا۔ یصب من فوق رؤسھم الحمیم

۴۔ دوزخ میں کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا۔ ام شجرۃ الزقوم

۵۔ دوزخی کھانے کو نگل نہ سکیں گے۔ طعاماً ذا غصۃ

۶۔ آگ کے کپڑوں کا ان کا لباس ہوگا۔ قطعت لھم ثیاب من النار

۷۔ ان پر لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے۔ ولھم مقامع من حدید

۸۔ ان کے گلے میں طوق اور زنجیریں ہوں گی۔ الاغلال فی اعناقھم والسلاسل۔

۹۔ کلما ارادہ ان یخرجوا منھا من غم اعیدوا فیھا۔

جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں گے واپس دیئے جائیں گے۔

۱۰۔ عذاب سے ان کو چھٹکارا نہ ملے گا۔

۱۱۔ زخموں کا دھوون ان کی خوراک ہوگی۔ ولا طعام الا من غسلین۔

اسی ساری تفصیل کو اللہ سبحانہ نے بڑے ہی اچھوتے اور بلیغ انداز میں نار جھنم اشد حرا سے تعبیر کیا ہے۔ آخر میں ارشاد ہوا ہے لو کانوا یفقھون۔ یہاں لو تمنائیہ بھی ہو سکتا ہے اور شرطیہ بھی۔ اگر شرطیہ ہو تو حافظ ابن کثیر نے مطلب یہ بتایا ہے کہ اگر ان میں فقاہت ہوتی تو وہ ضرور اللہ کے رسول کے ساتھ اللہ کے راستہ میں روانہ ہو جاتے۔ اور گرمی کی پروانہ کرتے۔ اور دنیا کی تھوڑی سی وقتی گرمی برداشت کر کے ہمیشہ کی دوزخ کی گرمی سے بچ جاتے۔ لیکن انھوں نے جو کردار پیش کیا ہے وہ تو اس شخص کا کردار ہے جو دھوپ سے بچنے کی خاطر آگ میں کھڑا ہو جائے۔ یا بارش سے بچنے کے لیے پرنالہ کے نیچے جا کھڑا ہو۔ یہی ان کے آخرۃ پر ایمان نہ ہونے کی کھلی شہادت ہے اگر ان کو یقین ہوتا تو وہ یہ موقعہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے۔ جہاد کا میدان قوت ایمانی کی سب سے بڑی کڑی آزمائش ہے جہاں منافق کے لیے

اپنے زنگ باطن کا چھپانا یکسر ناممکن ہوجاتا ہے۔ منافقین کا یہ گروہ جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے ہر موقع پر اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ اسلامی معاملات پر ایمان و اخلاص کا پیکر بن کر آتش بیانی بھی کرتا۔ مسلمانوں کی قومی فلاح کے لیے تجاویز بھی پیش کرتا لیکن جب خدائی احکام ان کی جانوں کا مطالبہ کرتے وہ وقت ان کے لیے بڑا سخت ہوتا جس دنیا کے عشق میں اس نے دین اور اپنے ضمیر کو بیچا تھا اگر اسی کی نذر مانگی جائے تو وہ اس کو کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ادعائے ایمان کا راز فاش ہو جاتا اور لاکھ زیرِ نقاب ہونے کے باوجود بے نقاب ہو جاتا۔

مُنافقین کے کرتُوت کی پَاداش

(۸۷) ان کو اپنی کمائی کی پاداش میں کم ہنسنا اور زیادہ رونا چاہیے یعنی چند روز اپنی حرکات پر خوش ہولو اور ہنس لو پھر ان کرتوتوں کی سزا میں ہمیشہ رونا ہے[1]۔ اصل ارشاد میں فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرا آیا ہے اس میں تھوڑا ہنسنے اور زیادہ رونے کا حکم ان منافقین کو ہوا ہے۔ شارحین قرآن نے اس کی چند صورتیں بتائی ہیں

پہلا یہ کہ ان کو دنیا کی اس زندگی میں تھوڑا سا خوش ہو لینا چاہیے پھر آخرت میں ان کو ہمیشہ ہمیشہ رونا چاہیے یعنی اس کرتوت کا انجام یہ ہے اس صورت میں امر بمعنے خبر ہے۔ دنیا کی زندگی تھوڑی ہے۔ اس لیے ہنسنے کو تھوڑا کہا اور آخرت کی زندگی دائمی ہے اس لیے رونے کو زیادہ فرمایا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس نوع کے کردار کا تم نے مظاہرہ کیا ہے۔ کہ اگر ان کو اس بات کی سمجھ ہو کہ جنگ تبوک میں پیچھے رہ جانے اور حضور اقدس ﷺ کی خلاف ورزی سے کیا کچھ کھویا اور آخرت میں کیا کچھ نتائج رونما ہوں گے تو ان کو اس پر کم ہنسنا چاہیے اور زیادہ ماتم کرنا چاہیئے اس صورت میں بھی امر بمعنی خبر ہے۔

تیسرا مطلب مشہور مفسر ابن عطیہ نے یہ بتایا ہے کہ جو خطرہ اس اقدام سے انہوں نے مول لیا ہے ان کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا ہی کی زندگی میں ان کو خوشی کا وقت تھوڑا اور رنج و غم سے زیادہ دوچار ہونا پڑیگا۔

مطلب یہ ہے کہ جب یہ موسم کی گرمی سے گھبرا کر دوزخ میں کود رہے ہیں تو اپنی کرتوت کی پاداش میں ان کو ہنسنا کم اور رونا زیادہ چاہیئے۔ کیونکہ عمل اور جزا دونوں سامنے آچکے ہیں۔ اب اگر ان میں کچھ بھی بصیرت ہے تو اندازہ کر لیں کہ جیسا عمل ہے اسی کے مطابق جزا ہوگی۔ اگر عمل کے مطابق جزا ہوگی تو پھر ان کو دنیا میں کم خوش

[1] افادات شیخ الاسلام

ہونا چاہیے اور زیادہ رونا چاہیے۔ وقتی خوشی کے لیے پیمانہ مختصر اور بڑی تکلیف کے لیے پیمانہ کبیر ہی ہوتا ہے۔

منافقین کے لیے ایک اور سزا

(۸۸) اے پیغمبر پس اگر اللہ تم کو اس جنگ سے واپس لے گیا پھر وہ آئندہ کسی جنگ میں تم سے نکلنے کی اجازت طلب کریں تو آپ فرما دیجئے کہ تم میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے جنگ کرو گے۔ تم نے پہلی بار بیٹھنا پسند کیا لہٰذا اب بھی پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ حضور تبوک میں تھے اور منافقین مدینے میں ممکن تھا کہ کچھ منافقین آپ کی واپسی سے قبل مر جائیں اس لیے الیٰ طائفۃ منھم فرمایا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ کسی دوسرے غزوہ میں ساتھ چلنے کی اجازت مانگیں تو فرما دیجئے کہ بس تمہاری ہمت و شجاعت کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ چکا ہے اور تمہارے دلوں کا حال کھل کر سامنے آ چکا ہے نہ تم کبھی ہمارے ساتھ نکل سکتے ہو اور نہ دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں بہادری دکھا سکتے ہو۔ لہٰذا اب تم کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عورتوں، بچوں، اپاہج اور ناتواں بڈھوں کے ساتھ گھر میں گھسے بیٹھے رہو۔ اور جس چیز کو پہلی بار تم نے اپنے لیے پسند کیا ہے مناسب ہے کہ اسی حالت پر مرو۔ تاکہ اچھی طرح عذاب الٰہی کا مزہ چکھو۔[1]

۸۲ آدمی جو دکھاوے کے مسلمان تھے بہانے کر کے اپنے گھروں میں رہ گئے چونکہ مقابلہ بیزنطی شہنشاہی سے تھا جو مشرق میں رومۃ الکبریٰ کی عظمت کی جانشین تھی۔ اور ابھی حال میں ایران کو شکست دے چکی تھی اس لیے منافقوں کو یقین تھا مسلمانوں کے خاتمے کے دن آ گئے۔ عبداللہ بن سلول نے جو منافقوں کا سرغنہ تھا۔ لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ حضور اقدس ﷺ اس سفر سے لوٹنے والے نہیں ہیں۔ یہ آیتیں خود بتا رہی ہیں کہ ان کا نزول تبوک کے سفر ہی میں ہوا ہے اس لیے فرمایا کہ اگر تمہیں خدا لوٹائے اصل ارشاد میں رجع آیا ہے یہ لازم اور متعدی دونوں آتا ہے لازم ہو تو مصدر رجوع آتا ہے اور متعدی ہو تو مصدر رجع آتا ہے قرآن میں دونوں طرح آیا ہے لازم کی مثال رجع موسیٰ الی قومہ اور متعدی کی مثال فرجعناك الی امك اور پیچھے رہنے والوں کے ذکر میں الیٰ طائفۃ منھم کہہ کر یہ اشارہ کر دیا کہ سارے پیچھے رہنے والے منافق نہ تھے بلکہ ان میں ایک ٹولی تھی۔ غالباً یہی وہ بارہ آدمی ہیں جن کا ذکر جبیر بن مطعم نے کیا ہے۔ ان آیات سے یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ ان سے اس درجہ بیزار تھے کہ آپ کو ان کو دیکھنا

[1] افادات شیخ الاسلام

بھی گوارا نہ تھا۔ اس لیے فرمایا کہ اگر اللہ آپ کی اس سفر سے واپسی پر کسی جماعت سے ملاقات کرادے اور یہ جماعت منافقوں کی آپکے سامنے اپنے نہ جانے کے بہانے تراشے اور اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے آپکے کسی آئندہ جنگ میں شرکت کی درخواست بھی کرے تو آپ ان کی درخواست رد کردیں۔ یہ حکم اس وقت اور زیادہ موکد ہو جاتا ہے جب مقابلہ آسان ہو تکالیف کا اندیشہ کم ہو اور نتیجہ جنگ کے طور پر بہت کچھ فوائد حاصل ہونے کی توقع ہو۔ ایسے وقت میں منافق بڑی جاں فروشی کا اظہار کرتا ہے۔ سراپا پیکر اخلاص بن جاتا ہے اور جنگ میں سب سے آگے آگے چلنے کی سعی کرتا ہے۔ حالانکہ یہی ایمان کا جھوٹا مدعی کڑی آزمائشوں اور سخت قربانیوں کے وقت اس سے پہلے ہزاروں حیلے بہانے کرکے گوشہ عافیت میں روپوش ہو چکا ہوتا ہے اس لیے ایسے لوگوں کو جنگ میں ساتھ نہ لے جانا چاہیے۔

منافقین کی نماز جنازہ اور دعاء

(۸۷) اور اے پیغمبر ان میں اگر کوئی مر جائے تو ان کے جنازے کی نماز نہ پڑھنا اور نہ قبر پر کھڑے ہونا۔ کیونکہ انھوں نے اللہ و رسول کا کفر کیا ہے اور ایسی حالت میں مرے ہیں کہ ہدایت کے دائرے سے باہر ہیں۔ یہ آیت عبداللہ بن ابی کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی جیسا کہ چند آیات پہلے ہم مفصل بیان کر چکے ہیں۔ اس آیت کے نزول کے بعد منافقین کا جنازہ پڑھنا قطعاً ممنوع ہو گیا۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ احتیاطاً ایسے شخص کا جنازہ نہ پڑھتے تھے جس کی نماز میں حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ ہوں۔ کیونکہ ان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے منافقین کا نام بنام علم کرا دیا تھا۔ اسی لیے ان کا لقب صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوا۔ اور لا تقم علی قبرہ کا مطلب ہے کہ دعا و استغفار یا اہتمام دفن کے لیے کھڑے نہ ہوں[1] شیخ الاسلام نے جس آیت کا مجمل حوالہ دیا ہے اس سے ان کی مراد استغفر لھم ہے۔ اس آیت کے فوائد میں شیخ الاسلام نے عبداللہ ابن ابی کے جنازے کا واقعہ پیش کیا ہے۔ یہ واقعہ حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ واقعہ دو جلیل القدر صحابہ یعنی عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حوالہ سے آیا ہے۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالہ سے یہ واقعہ اس طرح آیا ہے کہ :۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ فرماتے

[1] افادات شیخ الاسلام

خود سنا ہے کہ جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو حضور اقدس کو ﷺ اس پر نماز جنازہ پڑھنے کے لیے بلایا گیا۔ آپ تشریف لے چلے جب نماز کے ارادہ سے کھڑے ہوئے تو میں آپ کے سامنے آ گیا اور میں نے عرض کیا۔ کہ کیا آپ اس کی نماز پڑھائیں گے جس نے فلاں فلاں دن ایسی باتیں کہی تھیں۔ حضرت عمر نے اس کے کفریات گن گن کر بتائے۔ راوی کہتا ہے کہ نبی کریم کھڑے سنتے رہے اور مسکراتے رہے یہاں تک کہ میں نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا کہ عمر جانے بھی دو جب مجھے دو باتوں کا اختیار دیا گیا ہے ان میں جو مناسب تھی وہ میں نے اختیار کر لی۔ میرے سے کہا گیا ہے۔ استغفر لھم او لا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرۃ اگر مجھے علم ہو جائے کہ میں ستر بار سے زیادہ استغفار کروں گا تو اس کی بخشش ہو جائے گی تو ضرور اس سے زیادہ استغفار کروں گا۔ یہ کہہ کر آپ نے نماز جنازہ پڑھا دی اور اس کے جنازہ کے ساتھ بھی تشریف لے گئے اور اس وقت تک برابر قبر پر کھڑے رہے جب تک اس سے فراغت نہ ہو گئی بخدا تھوڑی سی دیر کے بعد یہ دو آیتیں نازل ہو گئیں۔ لا تصل علی احد منھم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ اس کے بعد آپ نے کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اس جرات پر بڑی حیرت ہوئی۔

یہ حدیث مسند امام احمد ترمذی اور نسائی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے آئی ہے

دوسری حدیث بحوالہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما صحیح بخاری میں اس طرح آئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو عبداللہ کا بیٹا عبداللہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس کو اپنی قمیص دی اور حکم دیا کہ اسے کفن میں استعمال کرنا پھر آپ نماز جنازہ پڑھانے لگے تو حضرت عمرؓ نے آپ کا کپڑا پکڑ لیا اور بولے کہ یہ تو منافق ہے آپ اس کی نماز پڑھتے ہیں۔ اللہ نے آپ کو ان کے لیے استغفار سے منع فرمایا ہے حضور اقدسؐ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے یا اللہ نے مجھے خبر دی ہے کہ استغفر لھم او لا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم۔ آپ نے فرمایا میں ضرور ستر سے زیادہ بار بخشش مانگوں گا راوی کہتا ہے کہ آپ نے نماز جنازہ پڑھائی اور ہم نے بھی نماز جنازہ پڑھی۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی لا تصل علی احد۔

اور مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

حضور اقدس ﷺ عبداللہ ابن ابی کی قبر کی طرف آئے۔ ایک روایت میں ہے جب عبداللہ بن ابی کو قبر میں رکھا جا چکا تھا تو آپ تشریف لائے اور آپؐ نے اس کو قبر سے نکالا۔ نکالنے کے بعد آپؐ نے دونوں زانوں پر اسے رکھا منہ میں لعاب مبارک ڈالا اور اپنی قمیص اس کو پہنائی۔

اس موضوع پر حدیث کی کتابوں میں اور بھی روایات ہیں۔ ہم نے صرف صحیحین کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ ان کی سند صحت کے اعتبار سے بالکل بے غبار ہے۔ حدیث کی سند میں تو قطعاً کوئی کلام نہیں لیکن حدیث کا متن نہ صرف مضطرب ہے بلکہ قرآن کے معارض ہے۔

شراح حدیث میں سے حافظ عسقلانی نے اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ دوسرے اکابر نے جو کچھ کہا ہے حافظ صاحب نے فتح الباری میں سب کچھ یکجا کر دیا ہے آیئے پہلے وہ خدشات گوش گذار فرمایئے جو ان حدیثوں کے بارے میں پیش کیے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ حدیثیں بتا رہی ہیں کہ ان آیات کا نزول عبداللہ ابن ابی کے جنازے پر ہوا ہے۔ اور قرآن کا اندازِ بیان گواہی دے رہا ہے کہ ان آیات کا نزول سفر تبوک میں ہی ہوا ہے اور تبوک کا واقعہ ۸ھ میں پیش آیا ہے جب کہ عبداللہ ابن ابی کا انتقال ۹ھ میں ذی قعدہ کے مہینے میں ہوا ہے جیسا کہ حافظ صاحب نے فتح الباری میں حاکم کے حوالہ سے بتایا ہے۔

دوسری قابلِ غور یہ بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں قد نهاك ربك ان تصلی علیه آپ کے رب نے نماز پڑھنے سے آپؐ کو منع فرمایا ہے۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد بتا رہا ہے کہ اس پر نماز جنازہ کی ممانعت پہلے آچکی تھی۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ کہنا کہ اس کے بعد آپؐ نے نماز پڑھائی اور آیت لا تصل نازل ہوئی۔ بتا رہا ہے کہ یہ ممانعت کی آیت جنازہ پڑھانے کے بعد نازل ہوئی۔

تیسری بات یہ بھی سوچنے کی ہے کہ ابنِ عمر اور ابنِ عباس دونوں کی حدیثوں میں تعارض ہے۔ ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے سازيده على السبعين۔ جب کہ ابنِ عباس کی حدیث میں ہے لو اعلم انی لو زدت على السبعين غفر له لازدت عليها۔ ابوبکر الجصاص نے ابنِ عمرؓ کی روایت کے الفاظ سازيد على السبعين کو راوی کی خطا قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

تعبیر کا یہ پیمانہ راوی کی غلطی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ نے صاف بتا دیا ہے کہ یہ منافقین کافر ہیں

حضور اقدس ﷺ یہ جان کر کہ یہ کافر ہیں اور اللہ ان کی بخشش نہیں فرمائے گا دعاء مغفرت کر ہی نہیں سکتے۔ صحیح روایت یہی ہے کہ لو علمت انی لو زدت علی السبعین غفر لھم لزدت علیھا۔ عادت مبارکہ یہی تھی کہ لوگوں کے ظاہر کے مطابق دعائے مغفرت کرتے تھے۔ لوگ آپ سے میت پر نماز جنازہ کی درخواست کرتے۔ آپ دعاء فرما دیتے یہ جانتے ہوئے کہ مسلمان ہیں۔ آپ کو اللہ سبحانہ نے بتایا کہ یہ منافق ہیں ان کو آپ کی دعاء مفید نہ ہوگی۔

ابوبکر الجصاص کی اس علمی رائے نے راہ کی بہت بڑی مشکل حل کر دی اس صورت میں اب ، ، کے عدد میں تکثیر ہی کے معنے ہوں گے تعدید اور تحدید نہ ہوگی۔ اہل علم کا یہ اعتراض کہ حضور نے علم حقیقت کو کیسے برعکس سمجھا غلط ہو جائے گا۔

چوتھی بات یہ بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں ہے کہ حضور اقدس نے عبداللہ کے بیٹے نے قمیص مانگی اور حضور نے قمیص دی مگر جابر کی روایت بتاتی ہے کہ حضور خود قبرستان تشریف لے گئے اور قبر سے لاش نکال کر قمیص پہنائی۔

آیئے حافظ عسقلانی کا ان حدیثوں پر جامع تبصرہ گوش گذار فرمایئے۔

ظاہر تو یہی ہے کہ یہ آیت لا تصل علی احد الخ تمام منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن روایات سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ یہ خاص تعداد کے بارے میں ہے سب کا یہ حکم نہیں ہے۔ چنانچہ امام زہری کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ کا بیان ہے کہ میرے سے جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تجھے ایک راز بتاتا ہوں کسی سے ذکر نہ کرنا پھر آپ نے بتایا کہ مجھے فلاں فلاں منافقوں کی جماعت کی نماز جنازہ پڑھنے سے روک دیا گیا ہے اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی کی نماز پڑھنے کے لیے یہ دیکھتے کہ حذیفہ جاتے ہیں یا نہیں اگر حذیفہ جاتے تو آپ اس کے جنازے کی نماز پڑھتے ورنہ نہ پڑھتے۔ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ان کی تعداد بارہ تھی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان پہلے آچکا ہے کہ اب ان میں سے ایک کے سوا کوئی نہیں رہا اور غالباً ان بارہ کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کو ان کی کفر پر موت کا علم تھا برخلاف دوسروں کے کہ انھوں نے نفاق سے توبہ کر لی۔

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابن عمر کی اس حدیث کو ایک دوسری سند سے پہلے بھی ذکر کیا ہے یہاں اس میں حضور اقدس کا یہ ارشاد کہ اللہ نے مجھے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے کا اختیار دیا ہے

یا مجھے خبر دی ہے۔ اکثر روایات میں تخییر ہے۔ آیت کی روشنی میں تخییر کا سمجھنا بہت مشکل ہے یعنی قرآن کی آیت اور ارشادات نبویؐ میں مفاہمت بعید مشکل ہے۔ اسی لیے بڑے بڑے لوگوں کی ایک جماعت نے اس حدیث کی صحت پر اعتراض کیا ہے حالانکہ یہ حدیث کثرۃ طرف سے آئی ہے صرف شیخین ہی کا نہیں بلکہ ان تمام بزرگوں کا جو صحت کا التزام کرتے ہیں اس کی صحت پر اتفاق ہے۔

یہ گویا معترضین کے خلاف ایک کھلا چیلنج ہے کہ ان کی معلومات سطحی ہیں اور حدیث کا پتہ نہیں۔ ابن المنیر کہتے ہیں آیت قرآنی کے سمجھنے میں اچھے اچھوں کے قدم لغزش کھا گئے قاضی ابو بکر الباقلانی نے حدیث کی صحت کا انکار کر دیا اور لکھا ہے کہ یہ حدیث نہ قابل پذیرائی ہے اور نہ یہ صحیح ہے کہ حضور اقدسؐ کی زبان مبارک سے یہ بات نکلے ابو بکر الباقلانی نے تقریب میں لکھا ہے یہ حدیث اخبار احاد میں سے ہے اس کے ثبوت کا پتہ نہیں ہے۔ امام الحرمین نے حدیث کے صحیح بخاری میں ہونے ہی کا انکار کر دیا ہے اور برہان میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث محدثین کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ امام غزالی نے المستصفی میں اس کی صحت کا انکار کر دیا ہے۔

صحیح بخاری کے شارح علامہ داؤدی فرماتے ہیں کہ حدیث محفوظ نہیں ہے —— ابن المنیر کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل بے غبار ہے کہ آیت قرآنی ان تستغفر لھم سبعین مرۃ میں تعدید اور تخصیص مراد نہیں ہے۔ نیز آیت تعدید کا نہیں مبالغہ کا فائدہ واضح اور صاف ہے لہذا ساز یدعلی السبعین اس مطلب کی صورت میں بے معنے اور بے فائدہ اور مراد متکلم کے خلاف ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ متاخرین نے اس گرفت سے بچنے کے لیے یہ راہ نکالی ہے کہ حضور اقدسؐ نے سازید علی السبعین صرف عبداللہ ابن ابی کے خاندان کو اپنانے اور موہنے کے لیے فرمایا ہے ورنہ مقصد یہ نہیں کہ اگر آپ ستر مرتبہ سے زیادہ مغفرت مانگیں گے تو بخشش ہو جائے گی اور اس کی تائید ابن عباسؓ کی حدیث میں آئے ہوئے اس جملہ سے ہوتی ہے لو اعلم ان زدت علی السبعین یغفر لہ۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ اگر میں ستر بار سے زیادہ مانگوں گا تو یہ بخشا جائے گا۔ لیکن اس مطلب کی تائید سازید سے نہیں ہوتی ہے اور جبکہ بعض روایات میں لازیدن بھی تاکید میں مبالغہ آیا ہے۔ کچھ نے یہ جواب دیا ہے کہ دراصل حضور اقدسؐ نے یہ بات بطور یقین کے نہیں بلکہ بطور امکان کے فرمائی ہے۔ لیکن یہ جواب جو کچھ ہے وہ خود ہی بول بول رہا ہے۔ اور یہ بھی جواب دیا گیا ہے کہ استغفار کی حیثیت دعا کی ہے۔ اور دعا کا مقام بندے

کے لیے ذکر کا ہے۔ مغفرت خود ممکن ہے اس سے صرف مدعو کی تعظیم مقصود ہوتی ہے لیکن حافظ عسقلانی فرماتے ہیں یہ بھی قابل پذیرائی نہیں ہے اس لیے کہ اس کے لیے مغفرت کی طلب مقصود ہے جس کی شرعاً مغفرت محال ہے یہاں ایک شبہ اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت استغفر لهم او لا تستغفر لهم سے حدیث بھی یہ بتاتی ہے کہ مجھے بخشش مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کا اختیار دیا گیا ہے اور ان تستغفر لهم سبعين مرة میں عدد مراد لے کر فرمایا ہے کہ میں ضرور ستر سے زیادہ مانگوں گا۔ حالانکہ بہت مدت پہلے قرآن کی یہ آیت ما كان للنبي والذين امنوا ان يستغفروا للمشركين نازل ہو چکی تھی یہ آیت ابو طالب کے واقعہ میں نازل ہوئی تھی جب حضور اقدس نے فرمایا تھا لاستغفرن لك مالم انه عنك میں ضرور مغفرت کی دعا کروں گا جب تک مجھے نہ روک دیا جائے۔ ابو طالب کی وفات مکہ میں بالاتفاق ہجرت سے پہلے ہوئی ہے اور عبداللہ ابن ابی کا یہ واقعہ ۹ھ میں ہوا ہے۔ سوچئے کہ اس آیت میں منافقین کے کفر پر مہر لگنے کے باوجود ان کے لیے مغفرت کی دعا کیسے جائز ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ استغفار دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جس کی قبولیت کی امید ہو۔ دوسرے جو لوگوں کا دل خوش کرنے کے لیے کی جائے ممنوع پہلی ہے دوسری نہیں حافظ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ جواب مجھے پسند نہیں ہے۔

ایک جواب وہ ہے جو علامہ زمخشری نے دیا ہے لیکن اس کا بھی علامہ ابن المنیر نے تعاقب کیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ایک ہی جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں ذالك بانهم كفروا بالله ورسوله کا فقرہ پوری آیت کے ساتھ نازل نہیں ہوا بلکہ بعد میں نازل ہوا ہے لیکن تاریخی شہادت کے بغیر اس کی حیثیت صرف اندازے اور خیال کی ہے اور علمی مباحث میں خیالات کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

حافظ عسقلانی کی ساری بحث کا خلاصہ جو کچھ میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت اور ابن عباس اور ابن عمر کی حدیث میں مفاہمت ممکن نہیں ہے۔ اب حدیث کو مانتے ہیں تو قرآن کا منطوق ساتھ نہیں دیتا۔ اور قرآن کو مانتے ہیں تو حدیث کو پذیرائی کی گنجائش نہیں رہتی ہے۔

جن لوگوں کے نزدیک صحت حدیث کا مدار صرف رجال کی ثقاہت اتقان اور اتصال پر ہے ان کے لیے گنجائش ہے کہ وہ اسے قبول کر لیں لیکن جن کے نزدیک حدیث کے صحیح ہونے کے لیے اتصال، اتقان اور ثقاہت کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معانی قرآن کے خلاف نہ ہو کیونکہ قرآن قطعی ہے۔ حدیث کی صحت

خواہ کتنی منزلیں طے کر جائے ظنی ہے۔ لہٰذا ایک ظنی پر صحت کی کتنی مہریں لگ جائیں لیکن وہ اس وقت تک قابل قبول نہیں جب تک قطعی سے ہم آغوش نہ ہو۔ ظنی خواہ کسی درجہ کی صحیح ہو لیکن جب قطعی سے متصادم ہوگی تو ترجیح قطعی کو ہوگی۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے جس کی سند صحیح ہو اس کا متن لازماً صحیح ہوتا ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ جس کا متن صحیح ہو تو اس کی سند لازماً صحیح ہو۔ حقیقت یہی ہے کہ آیت قرآنی اور حدیث میں مفاہمت کوہ کندن کاہ برآوردن کا مصداق ہے۔

نماز جنازہ کے جواز کی شرط

کچھ علماء نے اس سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ نماز جنازہ کے جواز کی اہم اور بنیادی شرط میت کا اللہ اور رسول پر ایمان ہے۔ کیونکہ آیت میں جنازہ نہ پڑھنے کی علت انھم کفروا باللہ ورسولہ بتائی گئی ہے۔ اگر کفر نہ ہو بلکہ اس کی جگہ اللہ اور رسول پر ایمان کی نعمت سے مالا مال ہو تو اس کی نماز جنازہ پڑھنا چاہیے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے جنازہ کا وجوب ایسے ہی ثابت ہے جیسے کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون سے اہل ایمان کے لیے قیامت کے دن اللہ سبحانہ کا دیدار ثابت ہے۔ اور یہ بھی علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ کسی مسلمان کا جنازہ چھوڑنا جائز نہیں چاہے وہ نیک ہو یا بد۔ ابوبکر الجصاص نے بھی لکھا ہے کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان مُردوں پر نماز جنازہ پڑھنا چاہیے اور کافروں کے لیے نماز جنازہ نہ پڑھے جمہور علماء کے نزدیک جنازے کی چار تکبیریں ہیں۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب التکبیر علی الجنازۃ اربعاً کا عنوان کر کے اپنے مخاطبوں کو سمجھا دیا ہے کہ جنازے میں صرف چار تکبیریں ہوتی ہیں۔ حافظ عسقلانی نے الزین ابن المنیر کے حوالہ سے یہ نکتہ لکھا ہے کہ امام بخاری نے یہ عنوان قائم اس لیے کیا ہے کہ جنازے میں صرف چار ہی تکبیریں ہیں۔ چار سے زائد نہیں ہیں امام بخاری نے یہ بات اس لیے فرمائی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے صحابہ سے تین، چار، پانچ، چھ اور سات منقول ہیں لیکن چونکہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کو جمع کر کے چار کا فیصلہ فرما دیا تھا اس لیے اب صرف چار تکبیریں ہیں عسقلانی لکھتے ہیں۔ فجمع عمر الناس علی اربع۔

ان چار تکبیروں میں کیا پڑھا جائے۔ پہلی تکبیر میں اللہ سبحانہ کی حمد و ثنا۔ دوسری میں حضور اقدس پر درود۔ تیسری میں میت کے لیے دعاء اور چوتھی تکبیر میں سلام۔ حمد و ثناء کے موقعہ پر سورہ فاتحہ پڑھی جائے یا نہیں حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ:۔

یہ اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے محدث ابن المنذر نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن مسعود، الحسن بن علی، عبداللہ ابن الزبیر اور المسور بن مخرمہ جنازے میں سورہ فاتحہ کی مشروعیت کے قائل ہیں یہی امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب ہے اور صحابہ میں ابوہریرہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کی قراءت کو نہیں مانتے یہی امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اور تمام اہل کوفہ کا مذہب ہے۔

یعنی کوفہ کے تمام صحابہ، تمام تابعین، تمام فقہاء اور تمام محدثین کا مذہب یہی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ بھی جنازے میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے قائل ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ جنازہ قراءت کا نہیں دعاء کا مقام ہے جن کی نگاہ سورہ فاتحہ پر دعاء کی حیثیت سے پڑی انھوں نے سورہ فاتحہ کو ضروری بتادیا اور جن کی نگاہ سورہ فاتحہ کی قرآنیت پر ٹھہر گئی انھوں نے جنازے کے لیے سورہ فاتحہ کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اسی لیے احناف نے تصریح کی ہے۔ ولو قرأ الفاتحۃ بنیۃ الدعاء لاباس۔ اگر بطور دعاء نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھ لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے لا تقم علی قبرہ۔ عام شارحین قرآن نے اس کا مطلب یہی بتایا ہے کہ آپ منافقین کے دفن وغیرہ میں شریک ہوں۔ آلوسی لکھتے ہیں لا تتول دفنہ دوسرے شارحین نے بھی یہی لکھا ہے لیکن اس میں کوئی خاص قانونی معنویت نہیں۔ اگر اس کی علت کفر ہے تو کافر کے دفن میں شریک ہونے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے کہ چونکہ حضور اقدس میت کے دفن کے بعد قبر پر ٹھہرتے اور میت کے لیے دعاء فرماتے۔ اس لیے منافقین کی قبر پر کھڑے ہونے کی ممانعت آئی ہے۔

مشہور مفسر زجاج سے یہی تشریح منقول ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دفن میت کے بعد قبر پر ٹھہرتے اور میت کے لیے دعاء کرتے آیت میں اسی سے منع کیا گیا ہے۔

علامہ سید رشید رضا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسے المنار میں ذرا وضاحت سے لکھا ہے کہ:

یعنی قبر پر دفن کے وقت تثبیت کی دعاء کے لیے نہ کھڑے ہوں جیسا کہ آپ کی عادت شریفہ دفن کے وقت مسلمانوں کے لیے تھی اور اس ممانعت میں منافقوں کے جنازے کی تشییع بھی داخل ہے۔ ابوداؤد حاکم نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے یہ کردار ثبوت پیش کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب دفن سے فارغ ہوجاتے تو قبر پر کھڑے ہوجاتے اور فرماتے

کر اپنے بھائی کے لیے بخشش طلب کرو اور اس کے جماؤ کا سوال کرو۔ کیونکہ اس سے اب پوچھا جا رہا ہے
فقہاء نے اس حدیث پر عمل بتایا ہے ہمیں قبر پر کھڑے ہونے کے معنے ہیں اس مسنون پیمانہ کے علاوہ
اور کچھ معلوم نہیں کچھ لوگوں نے یہاں زیارت قبور کو بھی خواہ مخواہ داخل کر دیا ہے۔ لیکن بظاہر زیارت قبور کا اس سے
کوئی تعلق نہیں ہے اس موضوع پر متعدد حدیثیں زیارت قبور کے عنوان سے آئی ہیں۔ اس کے لیے قیام کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے [1]

اس کی روشنی میں آیت قرآنی کا مطلب واضح ہو کر سامنے آگیا ہے کہ ان منافقین کو جماعت سے علیحدہ کرنے کی ایک اور سخت ترضرب لگائی استغفار کی ممانعت پہلے آچکی تھی اب یہ ان کے جنازے کی نماز پڑھنے ان کے جنازے کو اٹھانے۔ ان کو دفن کرنے۔ دفن کرنے کے بعد ان کی قبروں پر دعاء استغفار کے لیے کھڑے ہونے کی ممانعت کر دی گئی۔ گویا زندگی اور موت دونوں میں ان سے قطع تعلقات کا اعلان کر دیا گیا۔ جماعتی زندگی سے آدمی کا آخری رشتہ بھی ہوتا ہے کہ مرنے پر اپنے جماعتی بھائیوں کے ہاتھوں دفن ہو اور ان کی دعاؤں کا زادراہ لے کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو۔ اس ممانعت نے حضور اقدس ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا یہ آخری رشتہ بھی ختم کر دیا ہے۔

آیئے اب آخری بات بھی گوش گذار فرمایئے۔ یہ تو آپ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے پہلے سن چکے ہیں کہ عبداللہ بن ابی کے کفن میں حضور اقدس ﷺ نے اپنی قمیص عطا فرمائی تھی۔ یہی قمیص کا واقعہ جو بخاری میں جابر اور عبداللہ بن عمر سے آیا ہے اسے امام رازی نے اپنی تفسیر میں بلا سند حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے اس طرح پیش کیا ہے۔ مجھے پوری کوشش کے باوجود اس کی سند نہیں ملی ہے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی جب مرض موت میں مبتلا ہوا تو حضور اقدس ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس نے درخواست کی کہ جب وہ مرجائے تو حضور اقدس ﷺ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں اور اس کی قبر پر بھی تشریف فرما ہوں۔ پھر اس نے ایک آدمی بھیجا اور عرض کی کہ کفن کے لیے اُسے قمیص مرحمت فرمائی جائے۔ حضور اقدس ﷺ نے اوپر والی قمیص بھیجی۔ اس نے پھر گذارش کی کہ مجھے وہ قمیص دی جائے جو آپ کے جسد اطہر سے لگی ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پاس بیٹھے تھے بولے یا رسول اللہ آپ اس ناپاک اور گندے آدمی کو اپنی پاک قمیص کیوں دیتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا بے شک اس منافق کو میری قمیص کوئی فائدہ نہ دے گی لیکن اس کے دینے میں حکمت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اس کی وجہ سے ہزار آدمیوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنائے گا۔ منافقوں کا انبوہ کثیر ہر وقت عبداللہ کے پاس رہتا تھا جب انھوں نے یہ دیکھا کہ یہ نابکار ساری عمر مخالفت کرنے کے بعد اپنی بخشش اور نجات کے لیے آپ کی قمیص کا سہارا لے رہا ہے تو ان کی

[1] المنار

آنکھوں سے غفلت کے پردے اُٹھ گئے اور یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ حضور اقدس کی رسالت کے بغیر کسی کی رسائی بارگاہ الٰہی میں ناممکن ہے چنانچہ اسی روز ایک ہزار منافق مسلمان ہوگئے۔ جب عبداللہ کا انتقال ہوگیا تو اس کا بیٹا حضور کی خدمت میں بتانے کے لیے آیا۔ حضور اقدس نے فرمایا جاؤ نماز پڑھو۔ اور دفن کردو۔ بیٹے نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر آپ نماز نہ پڑھیں گے تو اس کی نماز جنازہ کوئی مسلمان نہ پڑھے گا۔ حضور اقدس ﷺ نماز پڑھنے کے لیے آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوراً کھڑے ہوگئے اور حضورؐ کے اور قبلہ کے درمیان حائل ہوکر نماز میں رکاوٹ بن گئے اور یہ آیت نازل ہوئی اور جبریل علیہ السلام نے آپؐ کا پلہ پکڑ لیا اور کہا لا تصل علی احد منھم

یہ امام رازی کی بیان کردہ روایت ہے لیکن اس کا محدثین نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ البتہ ابن جریر نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت کی نشاندہی کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور کو نماز سے منع کیا تھا لیکن حافظ ابن کثیر نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور حافظ ابن کثیر نے قمیص ہی کے واقعہ پر مسند امام احمد کے حوالہ سے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی چند روایات پیش کی ہے کہ جب عبداللہ ابن ابی کا انتقال ہوگیا تو عبداللہ کا صاحبزادہ حضور اقدس کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا کہ یا رسول اللہ اگر آپ تشریف نہ لائیں گے تو ہمیشہ کے لیے ہمارے لیے عار کا باعث ہوگا۔ حضور اقدسؐ تشریف اس وقت لے گئے جب عبداللہ کی میت کو قبر میں اتارا جا چکا تھا۔ آپ نے فرمایا کیا قبر میں داخل کرنے سے پہلے نہیں بتایا اس کے بعد عبداللہ کی لاش کو قبر سے نکالا اور اپنا لعاب آپ نے اس کے سر سے قدم تک تھوکا اور اسے قمیص پہنائی۔ امام نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے کہ امام بخاری نے اسی حدیث کو حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے پیش کیا ہے اس میں ہے کہ حضور اقدس عبداللہ ابن ابی کے جنازے پر عبداللہ کے قبر میں داخل ہونے کے بعد تشریف لائے۔ آپ نے میت کو قبر سے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ اس کو نکالا گیا آپ نے دونوں زانوں پر رکھ لیا اور لعاب دہن ڈالا اور اپنی قمیص پہنائی۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث کتاب الجنائز میں ہے۔

بہرحال واقعہ کے متن میں اصول محدثین کے مطابق اضطراب ضرور ہے اور یہ اضطراب بھی راویوں کی وجہ سے ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اصل واقعہ نہیں ہے۔ اصل واقعہ ضرور ہے۔ نماز جنازہ بھی ضرور پڑھی گئی ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ درمیان میں آڑے بھی آئے ہیں۔ بیٹے نے دعوت بھی دی ہے اور حضور اقدس ﷺ نے کفن کے لیے قمیص بھی دی ہے اور لعاب بھی ڈالا ہے۔ صرف راویوں کی جانب سے تعبیری اختلاف ہے۔

یہ سوال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس میت کے ساتھ یہ امتیازی

سلوک کیوں کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے کتاب الجہاد میں۔ حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں اور امام رازی مفاتیح الغیب میں متعدد روایات دی ہیں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ:

حضور اقدس ﷺ نے کفن میں قمیص مبارک اس لیے دی ہے کہ بدر کے قیدیوں میں حضرت عباس بن عبدالمطلب آپ کے چچا قید ہو کر آئے تو ننگے بدن تھے قد آور تھے اس لیے کسی کا کرتا ان کو نہ آتا تھا۔ عبداللہ بن ابی بھی طویل القامت تھا۔ اس لیے اس کا کرتہ حضرت العباس کے بدن پر ٹھیک آیا۔ عبداللہ بن ابی کا کرتہ چونکہ حضرت العباس کو اس وقت پہنایا گیا تھا۔ اس لیے حضور اقدس نے بدلہ اتارنے کے لیے کفن میں اپنا کرتہ عبداللہ کو دیا۔[1]

امام رازی نے اس کے ساتھ اور بھی وجوہ بتائی ہیں مثلاً

۱۔ یہ کہ مشرکین نے حدیبیہ والے روز کہا تھا کہ ہم آپ کا کہا نہیں مانتے ہیں عبداللہ ابن ابی کی بات مانتے ہیں۔ عبداللہ نے جواباً کہا تھا کہ نہیں میرے لیے تو حضور اقدس ہی نمونہ ہیں آپ نے کرتہ عطا فرما کر اس کا بدلہ دیا۔

۲۔ اللہ سبحانہ نے حضور اقدس کو حکم دیا تھا کہ سائل کو رد نہ کرنا۔ عبداللہ نے چونکہ قمیص مانگی تھی اس لیے آپ نے عطا فرمادی۔

۳۔ عبداللہ بن ابی کا صاحبزادہ مخلص مسلمان تھا حضور نے اس کی عزت افزائی کی۔

۴۔ غالباً اللہ سبحانہ نے وحی کے ذریعے اطلاع دی ہو کہ آپ اگر قمیص دیں گے تو آپ کا یہ اقدام ہزاروں منافقوں کے اسلام کا ذریعہ بنے گا۔

۵۔ حضور انور کی ذات اقدس سراپا رحمت تھی اسی جذبہ رحمت کے اظہار کے لیے آپ نے مدارات کا یہ عملی پہلو اختیار فرمایا۔

شارحین بخاری نقل کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے اپنی قمیص اتار کر ضرور دی مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا تھا۔ وما یغنی عنہ قمیصی وصلاتی من اللہ۔ واللہ انی کنت ارجوان یسلم الف من قومہ بارگاہ خدا میں میری قمیص اور نماز اسے کیا فائدہ دے سکتی ہے مجھے تو یہ امید تھی کہ میرے اس عمل سے متاثر ہو کر شاید اس کی قوم کے ایک ہزار افراد اسلام قبول کر لیں گے۔ چنانچہ لکھنے والوں نے لکھا ہے اور بتانے والوں نے بتایا ہے کہ جب اس کی قوم نے رحمت و شفقت کا یہ منظر دیکھا تو ہزار افراد نے اسلام قبول کر لیا۔

---

[1] ابن کثیر

ان تصریحات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا یہ عمل کس جذبے کے تحت تھا آپ ان لوگوں کے اسلام کی آس لگائے بیٹھے تھے یا یہ کہ درحقیقت اس کی مغفرت کے خیال میں تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اصرار پر آپ کا خاموش رہنا اور آخر میں مسکرا دینا گیا اس کی غمازی نہیں کر رہا تھا کہ آپ یہاں ایک اہم مقصد کے پیش نظر محض آئینی وسعتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ عمر کو اپنی طبعی جلادت کی وجہ سے اس طرف مائل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ عمیق حکمت تک کہاں پہنچ سکتے تھے۔ جس کا ظہور بعد میں ہوا اور جس کی بدولت ایک جماعت اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئی۔ اسی کے قریب جنگ بدر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ وہ بھی حضور اقدس ﷺ کی حد سے بڑھتی ہوئی الحاح وزاری سے آپ کو روک رہے ہیں اور تسلی دے رہے ہیں مگر نبی کریم ﷺ تھے کہ اپنے پروردگار کے سامنے اتنے بے اختیار ہوئے چلے جاتے تھے کہ آپ کی ردائے مبارک بھی آپ کے شانوں سے گری جارہی تھی۔ مقام نبوت والے اس اضطراب کو یا اس واقعہ میں ان کے میلان کو پہچان سکتے ہیں۔

وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ
أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ
كَافِرُونَ ﴿٨٥﴾ وَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَ
جَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُو الطَّوْلِ مِنْهُمْ
وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُنْ مَعَ الْقَاعِدِينَ ﴿٨٦﴾ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا
مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٨٧﴾
لَٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنْفُسِهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٨٨﴾
أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ
فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٨٩﴾

ع ١١ ١٧

اے پیغمبرؐ ان کی دولت اور ان کی اولاد آپؐ کو حیرت میں نہ ڈالے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ اس کے ذریعے ان کو دنیا میں سزا دینا چاہتا ہے۔ ان کی جانیں کفر ہی کی حالت میں نکلیں گی[٩٠]۔ اور جب کوئی سورت یہ موضوع لے کر نازل ہوتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسولؐ کی معیت میں ہو کر جہاد کرو تو ان میں دولت مند لوگ آپ سے جہاد میں نہ جانے کی رخصت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجئے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں[٩١]۔

انھوں نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے
ساتھ رہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اس لیے وہ کچھ نہیں سمجھتے
ہیں[۹۲] لیکن اللہ کا رسول اور اس کی ہمرکابی میں اہل ایمان نے اپنی جانوں اور
اپنے مالوں سے جہاد کیا ہے اور ان ہی حضرات کے لیے خوبیاں ہیں اور یہی
لوگ بامراد ہیں[۹۳] اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے
نیچے نہریں بہتی ہیں یہ ہمیشہ ان میں رہیں گے یہی عظیم الشان کامیابی ہے[۹۴]

مفردات کے معانی

تزھق وہ نکلے گی واحد مؤنث مضارع زہق یزہق زہوقا باب فتح سے آتا ہے اس کے معنے غم سے جان نکلنا اور کسی چیز کے مٹ جانے کے ہیں۔

سورۃ (سورت) علامہ زمخشری کشاف میں لکھتے ہیں۔ سورۃ قرآن کے مقررہ حصہ کا نام ہے یہ کم سے کم تین آیت ہوتی ہے۔ اور اس کا واو اگر اصلی ہے تو یہ سورۃ المدینہ سے منقول ہو کر آیا ہے جس کے معنے شہر کی چار دیواری کے ہیں کیونکہ یہ بھی قرآن کے ایک حصہ کو اپنے اندر ایسے ہی گھیرے ہوئے جیسے شہر پناہ شہر کو اور یا اس لیے سورت کہا گیا ہے کہ حقوق علیہ اور انواع و اقسام کے فوائد پر حاوی ہوتی ہے جیسے شہر پناہ اندرون شہر کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ اور یا اس سورت سے منقول ہے جس کے معنے مرتبہ اور درجے کے ہیں۔ اور یہ دو طرح ہو سکتا ہے ایک یہ کہ سورتیں بھی بمنزلہ درجہ کے ہیں کہ جن پر قاری قدم بقدم ترقی کرتا جاتا ہے اور یا اس لیے کہ دین میں ان کی رفعت شان اور جلالت مسلم ہے۔

اولو الطول۔ اولو ذو کی جمع ہے والے طول مال دولت تونگری انعام وسعت گنجائش، مقدور، قدرت یہ طال یطول کا مصدر ہے۔ اس کا استعمال دو معنے میں ہوتا ہے۔ ایک درازی اور فضیلت میں غلبہ کرنا دوسرے کسی شخص کے ساتھ احسان کرنا اور اس کو انعام دینا۔ علامہ راغب فرماتے ہیں طول فضیلت و احسان کے معنے میں خاص ہے یہاں معنے ہیں مالدار اور مقدار والے۔

الخوالف۔ خالفۃ کی جمع ہے تیچھے رہنے والیاں۔ خالفۃ اصل میں خیمہ کے پچھلے ستون کو کہتے ہیں۔ اور عورت سے بھی کنایہ ہے کیونکہ وہ کوچ کرنے والوں سے تیچھے رہتی ہے۔

الخیرات۔ نیکیاں، بھلائیاں، خوبیاں، نیک عورتیں، اچھی عورتیں فیھن خیرات حسان میں بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ اصل میں خیترات ہے۔

نفاق اور ایمان کا تقابلی مطالعہ

قرآن کے آغاز میں بھی انسان کے عقائد و اعمال کی تین حالتیں بتائی ہیں ایمان کفر اور نفاق۔ فی الواقع یہ ایک طبعی تقسیم ہے۔ زندگی کے تمام گوشوں میں یہ تین حالتیں ہیں۔ صرف معانی میں نہیں مادیات اور اجسام میں بھی یہی تین حالتیں ہیں یا تو اصلاح کی حالت ہوگی یا افساد کی یا پھر دونوں کی درمیانی حالت۔ انسان کی جسمانی زندگی بھی ان تین حالتوں سے دوچار ہوتی ہے صحت ہے یا موت ہے اور یا پھر دونوں کے درمیان بیماری ہے۔ پھر جیسے صحت کے مدارج ہیں بیماری کے بھی مدارج ہیں۔ بیماری کو نہ تو زندگی کی صحیح حالت کہہ سکتے ہیں نہ موت ہی قرار دے سکتے ہیں۔ دونوں کے بین بین ہے قلب و روح کا بھی یہی حال ہے ایمان حیات ہے موت کفر ہے اور نفاق بیماری۔ قرآن میں استعارے کی زبان میں ایک سے زیادہ مقامات پر ایمان کو زندگی اور کفر کو موت سے تعبیر کیا ہے جیسے ہر بیماری علامات سے پہچانی جاتی ہے ایسے ہی نفاق کی بیماری کی بھی علامات ہیں جنہیں قرآن نے منافقین کے معاملات بیان کرتے وقت ان کی امتیازی خصوصیت کی حیثیت سے پیش فرمایا ہے۔ یہ علامتیں منافقین کے اعمال اور کیفیات نفسانی ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر منافق میں یہ علامتیں ساری کی ساری موجود ہوں کسی منافق کے اندر ان میں سے دو چار ہوں گی تو دوسرے میں دس ہو سکتی ہیں۔

(۹۰) اے پیغمبر ان کی دولت اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ اس کے ذریعے ان کو دنیا میں سزا دینا چاہتا ہے۔ ان کی جانیں کفر ہی کی حالت میں نکلیں گی چار رکوع پہلے اسی مضمون کی آیت گزری ہے اس کا فائدہ وہاں ملاحظہ کر لیا جائے لہ بتایا ہے کہ ان لوگوں پر جو اموال و اولاد کی بہتات رکھتے ہیں حیرت یا پسند کی نگاہ نہ ڈالیے۔ ان میں مال و اولاد کی بہتات اس لیے نہیں کہ خدا اور خدا کی مرضیات کے ساتھ ان کا تعلق ہے۔ بلکہ جس حد تک وہ خدا اور خدا کی مرضیات سے ٹکراتے ہیں اسی حد تک معیشت کے پیمانہ میں کشادگی پیدا ہو رہی ہے تمرد اور سرکشی کے میدانوں میں ان کے قدم جتنے آگے بڑھتے جاتے ہیں اسی حد تک دنیا اور دنیاوی نعمتیں بھی ان کے قدم چومتی جاتی ہیں تو ایسی حالت میں آپ کو حیرت نہ ہونی چاہیے بلکہ یقین کرنا چاہیے

لہ افادات شیخ الاسلام

دنیاوی انعامات کی جو ٹوپی ان کے سروں پر اس لیے منڈھی گئی ہے تاکہ وہ اندھے ہی ہو کر جئیں اور اندھے ہی بنے ہوئے مر جائیں۔ الاموال اور الاولاد کی یہ کثرت نشانی ہے اس بات کی کہ قدرت ان سے انتقام لینا چاہتی ہے اور ایسا انتقام کہ چونکنے کی ساری راہیں ان پر بند کر دی گئی ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ مال و اولاد ان کو انعاماً نہیں بلکہ ان کو سزا اور انتقاماً ان کی مجرمانہ غفلتوں کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ تاکہ ان کی غفلتوں میں اور اضافہ ہو۔ منصب، مرتبہ اور رتبہ ہے کہ ان کو اندھا بنایا جاتا ہے۔ اور دولت و ثروت کی ڈاٹیں ان کے کانوں میں اسی لیے ٹھونسی جاتی ہیں تاکہ پھر نیکی کی راہوں پر ان کی نظر نہ پڑے لیکن اپنی جگہ وہ اس خیال میں مگن ہیں کہ وہی اللہ کے پیارے ہیں۔ قرآن کی اس آیت میں اسی کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کا مال کہیں لوگوں کے ایمان کو نہ لرزا دے صاف لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ الاموال اور الاولاد کی یہ وہی قسم ہے جس کے ذریعے اللہ سبحانہ ان لوگوں کو سزا دینا چاہتا ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ اسی ناشکری اور کفران کی حالت میں بدن سے ان کی جان نکلے اور اس طرح نکلے کہ چونکنے اور سنبھلنے کا پھر ان کو موقعہ نہ ملے۔ اس آیت کے تکرار میں بتایا گیا ہے کہ قوموں اور افراد دونوں کا حکم یہی ہے۔ اور یہ سزائی تالب دونوں کے لیے ہے اور اس لیے بھی تکرار کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کے ذہن کو صاف کرنا ہے جو ایک طرف تو اللہ کو بھی مانتے ہیں اللہ کے رسول کو بھی مانتے ہیں لیکن اللہ کے باغیوں اور سرکشوں اور رسولوں کے دشمنوں کی انعامات کا انتقامی دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر انعام و اکرام کا تمغہ قرار دیتے ہیں۔ انا للہ و الی المشتکی۔

جہاد سے گریز نفاق ہے

(۹۱) اور جب کوئی سورت یہ موضوع لے کر نازل ہوتی کہ اللہ پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے رسول کی معیت میں ہو کر جہاد کرو تو ان میں سے دولت مند لوگ آپ سے جہاد میں نہ جانے کی رخصت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجئے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں۔ یعنی قرآن کی کسی سورت میں جب تنبیہ کی جاتی ہے کہ پوری طرح خلوص و یکسوئی سے ایمان لاؤ جس کا بڑا اثر یہ ظاہر ہونا چاہیے کہ حضور اقدس ﷺ کے ساتھ خدا کے راستے میں جہاد کریں تو یہ منافقین جان چرانے لگتے ہیں اور ان میں کے استطاعت و مقدور والے بھی جھوٹے عذر تراش کر اجازت طلب کرنے آتے ہیں کہ حضرت! ہمیں تو یہیں مدینے میں رہنے دیجیے [1]

اسی کے ہم معنے قرآن میں سورۂ محمد میں بھی ایک آیت آئی ہے۔ ویقول الذین اٰمنوا لولا نزلت سورۃ۔ فاذا انزلت سورۃ محکمۃ و ذکر فیہا القتال رایت الذین فی قلوبھم

[1] افادات شیخ الاسلام

مرض ینظرون الیک نظر المغشی علیہ من الموت فاولیٰ لھم۔

جو لوگ ایمان لائے وہ کہتے ہیں کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل ہوتی جس میں جنگ کا حکم ہو مگر جب ایک محکم سورت نازل کر دی گئی۔ جس میں جنگ کا حکم تھا تو تم نے دیکھ لیا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر سخت موت چھا گئی ہو بس افسوس ہے ان کے حال پر۔

مطلب یہ ہے کہ جن حالات سے اس وقت مسلمان گذر رہے تھے اور کفار کا جو رویہ اس وقت اور مسلمانوں کے ساتھ تھا اس کی وجہ سے جنگ کا حکم آنے سے پہلے ہی اہل ایمان کی عام رائے یہ تھی کہ اب ہمیں جنگ کی اجازت ملنی چاہیے مگر جو لوگ منافقت کے ساتھ مسلمانوں کے گروہ میں شامل تھے ان کا حال مومنوں کے حال سے بالکل مختلف تھا وہ اپنی جان و مال کو خدا اور اس کے دین سے عزیز تر رکھتے تھے اور اس کے لیے کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ جنگ کے حکم نے آتے ہی ان کو اور سچے اہل ایمان کو ایک دوسرے سے چھانٹ کر الگ کر دیا۔ جب تک حکم نہ آیا تھا ان میں اور عام اہل ایمان میں بظاہر کوئی فرق و امتیاز نہ پایا جاتا تھا۔ نماز وہ بھی پڑھتے تھے اور یہ بھی ——— روزے رکھنے میں بھی انہیں تامل نہ تھا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا اسلام ان کو قبول تھا۔ مگر جب اسلام کے لیے بازی لگانے کا وقت آتا تو ان کے نفاق کا حال کھل جاتا اور نمائشی ایمان کا وہ لبادہ اُتر جاتا جو انھوں نے اُوپر سے اُوڑھ رکھا تھا۔ یہاں بھی یہی بات بتائی گئی ہے کہ جب کوئی سورہ نازل یہ مطالبہ لے کر ہوتی ہے کہ آمنوا اپنے ایمان کے تقاضے پورے کر دیا اپنے دعوی ایمان کی دلیل پیش کرو۔ ایمان کا سب سے اہم اور بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی خاطر اللہ کے رسول کی ہمرکابی میں جہاد کرو کہ جہاد ایمان کی کسوٹی ہے تو ان کا طرز کیا ہوتا ہے ——— یہی کہ استاذنک اولوا الطول۔ یہ اور صرف یہ کہ ان کا دولت مند طبقہ حضور اقدس کی خدمت میں آکر جہاد میں نہ جانے کے لیے درخواستیں پیش کرتا جب دولت مندوں کا یہ حال ہے تو غریبوں اور مسکینوں کا کیا ذکر۔ ان میں جو مالدار ہیں تندرست بھی ہیں وسائل بھی رکھتے ہیں اور سامان جنگ فراہم کرنے کا وافر ذریعہ ان کا حال یہ ہے کہ عذر اور بہانہ بنا کر حضورؐ کے پاس رخصت مانگنے آتے ہیں اور کہتے ہیں ذرنا نکن مع القاعدین ہمیں جنگ سے مستثنیٰ کر دیجئیے یہ ان کے دل کے ارادوں کو الفاظ کے لبادے میں پیش کیا گیا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ اگرچہ ان منافقین نے پیش تو عذر ہی کیے تھے لیکن ان عذروں کی تہ میں ان کی دل بیماری یعنی نفاق کام کر رہی تھی۔ وہ اس نفاق کی وجہ سے نکلنے والے غازیوں کے ساتھی نہیں بلکہ بیٹھنے والوں بزدلوں نا کاروں، معذوروں کے ساتھی بننا چاہتے

تھے۔ ان کے عذروں اور بہانوں کی اصل علت کو قرآن نے ان کے قول سے تعبیر کیا ہے۔ اور قرینہ مقام آیت کی پیشانی پر اذا ہونے کی وجہ سے بتا رہا ہے کہ منافقین کی جہاد کے موقعہ پر بہانے بنانے اور عذر تراشنے کی ہمیشہ کی عادت تھی یہ کوئی وقتی حادثہ نہ تھا۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں۔ اذا ینبئی التکرار یہ بھی منافقین کی ایک نشانی ہے کہ اسلام پر افتاد کے وقت میں محنت اور جہاد سے جان چراتے ہیں۔ یہ عام منافقین کی علامات میں سے ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے یہی علامت بتائی گئی ہے۔

جو شخص مرگیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد نہیں کیا اور نہ اس کے دل میں کبھی جہاد کا ولولہ رونما ہوا تو وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام کی خاطر جدوجہد ہی سے ایمان خالص اور نفاق کے درمیان پورا امتیاز ہوتا تھا۔ اہل ایمان واخلاص تو پروانہ وار آتش جنگ میں کود پڑتے تھے اور جو منافق تھے وہ دم چرلتے تھے۔ درحقیقت ایک مومن کی شان یہی ہونی چاہیے کہ وہ خدا اور رسول کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے لیے بے چین نظر آئے اور یہی اس کا ثبوت ہوگا کہ اللہ ورسول کی محبت اس کے دل میں تمام محبتوں پر غالب آچکی ہے اور اگر بالفرض ایسا کوئی موقعہ اس کے ہاتھ نہ آئے تو کم ازکم اس تمنا میں تو اس کا دل تڑپتا رہے۔ اگر ایسا بھی نہیں تو یہ اس کی علامت ہوگی کہ اس کا دعویٰ ایمان صرف زبانی ہی زبانی ہے۔ اس کا قلب جذبات محبت سے یکسر خالی ہے۔ یہ ظاہر و باطن کا ایک قسم کا اختلاف ہے اس سے اس کو نفاق ہی کا شعبہ کہا جائے گا۔

نفاق بھی زمان ومکان کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے حافظ ابن رجب حنبلی نے مسند امام احمد سے بروایت حذیفہ اس کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

تم آج ایسی باتیں منہ سے نکالتے ہو جن کو ہم زمانہ نبوت میں نفاق سمجھتے تھے۔

اللہ اکبر کتنی جلدی زمانہ کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے۔ جو بات کل تک نفاق سمجھی جارہی تھی آج وہ زبانوں پر بے محابا آرہی ہے۔ بہرحال نفاق کا بیج ایسا شجرہ خبیثہ بنتا ہے جس کی شاخیں ان گنت ہیں۔ پھر شاخوں پر پتے اور پتوں پر پھول اور پھل بھی ان گنت ہوتے ہیں۔

مرد ہو کر عورتوں کا کردار بے غیرتی ہے

(۹۲) انھوں نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں۔ اور ان کے دلوں پر مُہر لگ چکی ہے اس لیے وہ کچھ نہیں سمجھتے ہیں۔ گویا کمال بے غیرتی اور نامردی سے اس پر راضی ہیں کہ لڑائی یا خطرہ کا

نام سنتے ہی خانہ نشین عورتوں کے ساتھ گھروں میں گھس کر بیٹھ رہیں۔ ہاں جس وقت جنگ کا خطرہ نہ رہے اور امن وامان کا زمانہ ہو تو باتیں بنانے اور قینچی کی طرح زبان چلانے میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں فاذا جاء الخوف رأیتھم ینظرون الیك تدور اعینھم کالذی یغشی علیہ من الموت۔ فاذا ذھب الخوف سلقوکم بالسنۃ حداد۔ جب ڈر کا وقت آئے گا تو آپ ان کو دیکھیں گے کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں کہ ان کی نگاہیں گھوم رہی ہیں اس شخص کی طرح جس پر موت کی بے ہوشی ہو جب ڈر کا وقت نکل جائے تو چڑھ چڑھ کر بولتے ہیں تیز تیز زبانوں سے —— مطلب ہے کہ کذب ونفاق نکول عن الجھاد اور تخلف عن الرسول ﷺ کی شامت سے ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی کہ اب موٹے موٹے عیب بھی ان کو عیب نظر نہیں آتے اور انتہائی بے غیرتی و بزدلی پر بجائے شرمانے کے نازاں و فرحاں ہوتے ہیں۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ اچھے خاصے ہٹے کٹے تندرست صاحب استطاعت لوگ مدعی ایمان ہو کر وقت آنے پر میدان میں نکلنے کے بجائے گھروں میں گھس کر بیٹھ جائیں اور عورتوں میں جا شامل ہوں۔ لیکن چونکہ ان لوگوں نے خود جان بوجھ کر اپنے لیے یہ رویہ پسند کیا تھا اس لیے قانون فطرت کے مطابق ان سے وہ پاکیزہ احساسات چھین لیے گئے جن کی بدولت آدمی ایسے ذلیل اطوار اختیار کرنے میں شرم محسوس کیا کرتا ہے۔ یعنی ان کی ایمانی اور اخلاقی موت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگ گیا نہ اب وہ کوئی صحیح بات سوچتے ہیں نہ کسی عزم و ہمت کے کام کے لیے ان میں کوئی حوصلہ ہوتا ہے۔

یہاں ارشاد ہوا ہے طبع علی قلوبھم فھم لا یفقھون اس قسم کی آیتوں میں یہ بات خوب سمجھ لینی چاہیے کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ سبحانہ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے مہر لگانا مؤخر ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ کی جانب سے مہر کا لگنا علت اور انسانوں کا کفر و نفاق معلول نہیں بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کا نفاق پہلے ہوتا ہے اور اللہ کی جانب سے مہر کا لگنا بعد کو ہوتا ہے یعنی نفاق مہر لگنے کی علت ہے اور یہی طبعی اصول ہے انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے اگر کوئی اس کو اُلٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی یہاں بھی یوں ہی سمجھ لیجئے کہ ان کا رسول کے ساتھ جہاد میں نہ جانے کے لیے بہانے تراشنا اور مرد ہو کر عورتوں کے ساتھ رہ جانا علت ہے ان کے دلوں پر مہر لگنے کی اب ہزار ان کو کوئی سمجھائے ان کی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ گویا عدم فقاہت کی علت طبع ہے اور طبع کی علت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کا نفاق ہے۔ نفاق پیوست ہوتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ طبع ہے۔ اس کی توضیح ان علامات سے ہوتی ہے جو نفاق کے لیے حضور اقدس ﷺ نے بتائی ہیں۔ مثلاً مسند احمد کے حوالہ سے حافظ ابن کثیر نے کہا ہے:۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے منافقوں کی کچھ نشانیاں ہیں جن کے ذریعے ان کو پہچانا جاسکتا ہے۔

۱۔ سلام کی جگہ ان کی زبانوں پر لعنت ہوتی ہے۔

۲۔ لوٹ مار کا مال ان کی خوراک ہوتا ہے۔

۳۔ خیانت کا مال ان کا مال غنیمت ہوتا ہے۔

۴۔ مساجد کے پاس آتے ہیں تو بیہودہ بکواس کرتے ہیں۔

۵۔ نمازوں میں سب سے بعد میں آتے ہیں اتراتے ہوئے۔

۶۔ نہ خود کسی سے محبت کرتے ہیں اور نہ ان سے کوئی محبت کرتا ہے۔

۷۔ رات کو شہتیر کی طرح بستروں پر دراز رہتے ہیں اور دن میں شور مچاتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے حوالہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد لکھا ہے کہ:۔

منافق کی تین نشانیاں ہیں۔

۱۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

۲۔ جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔

۳۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے خیانت کرے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔

چار نشانیاں ہیں جس میں چاروں ہوں گی پورا منافق ہے اور جس میں ایک ہو گی اس میں نفاق کی ایک عادت ہو گی۔

۱۔ جب امانت رکھی جائے خیانت کرے۔

۲۔ جب عہد کرے غداری کرے۔

۳۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

۴۔ جب جھگڑا کرے گالیوں پر اُتر آئے۔

اس سورہ برارت میں بھی علامتیں بتائی گئی ہیں۔ انشاء اللہ سورہ برارت کے آخر میں ہم اس پر تفصیلی تبصرہ کریں گے۔

ایمان میں اخلاص والوں کا کردار

(۹۳) لیکن اللہ کا رسول اور اس کی ہمرکابی میں اہل ایمان نے اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ جہاد کیا ہے۔ اور ان ہی حضرات کے لیے خوبیاں ہیں اور یہی لوگ بامراد ہیں۔ منافقین کے بالمقابل مومنین مخلصین کا بیان فرمایا ہے۔ کہ دیکھو یہ ہیں خدا کے وفادار بندے جو اس کے راستے میں نہ جان سے ہٹتے ہیں نہ مال سے۔ کیسا ہی خطرے کا موقعہ ہو۔ اسلام کی حمایت اور پیغمبر اسلام کی معیت میں ہر قربانی کے لیے تیار رہتے ہیں۔ پھر ایسوں کے فلاح و کامیابی نہ ہوگی تو اور کس کے لیے ہوگی[1]۔ اس آیت میں سچے اور پکے اہل ایمان کا چہرہ پیش کیا جارہا ہے اور مقصود اس سے اہل ایمان کے اخلاص کی تحسین ہے اور ساتھ ہی ان منافقین پر طنز بھی ہے جو دعوئی ایمان کے باوجود ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی دستور پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں اگر ایسا نہ ہو تو نہ تو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس و ضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ تمام اعمال دل کے تابع ہیں۔ اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا۔ ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا یعنی اعمال کی اصلاح تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے اور ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے کہ اگر درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور اہل ایمان کا وصف لازم بتاتا ہے۔ ہر اہم موقعہ پر اس نے مسلمانوں کو یَـٰٓأَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوا سے مخاطب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو نعمت ایمان سے مالا مال ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے یہ نہ ہو تو نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے۔ نفاق اخلاص کی ضد ہے اس لیے اخلاص کی عدم موجودگی میں عمل کی عمارت کھوکھلی رہتی ہے۔ نمائشی طور پر نظر آتی ہے مگر حقیقت میں اس کا وجود نہیں ہوتا ہے۔

جہاد ایمان کی سب سے بڑی کسوٹی ہے اس سے کھرے اور کھوٹے کا علی روس الاشہاد سب کو پتہ لگ جاتا ہے۔ محبت الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے والذین آمنوا اشد حبًا للہ مال اور اولاد کے مقابلے میں جب اللہ سے محبت ہوتی ہے تو مومن جان اور مال کی بازی لگا دیتا ہے ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حبِ الٰہی ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

اور یہ وہ دولت ہے جو اہل ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی۔ اس نشہ محبت پر باپ۔ ماں۔ اولاد۔ بھائی۔ بیوی۔ جان۔ مال۔ خاندان سب کو انہوں نے نثار اور قربان کر دیا تھا۔ یہ حقیقت ہے اور قرآن نے اس کا بار بار اعلان کیا ہے کہ اگر حُبِ ایمانی اور غیر ایمانی میں مقابلہ ہو جائے تو مومن وہ ہے جس کی حُبِ ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت اور علاقہ بھی غالب نہ آسکے۔ قرآن کی یہ آیت گواہی دے رہی ہے کہ محبتِ ایمانی کی اس آزمائش میں صحابہ کرام جس طرح پورے اُترے۔ بلاشائبہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ نے کسی انسان کے ساتھ اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح سے ایسی محبت نہیں کی ہوگی جیسی صحابہ کرام نے اللہ کے رسول کے ساتھ راہِ حق میں کی۔ انہوں نے اس محبت کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا جو انسان کر سکتا ہے اور پھر اسی کی راہ سے سب کچھ پایا جو انسانوں کی کوئی جماعت پا سکتی ہے دنیا میں اللہ نے الخیرات عطا کیں۔ اور اس کے ساتھ ان کو بامراد کامران اور کامیاب ہونے کی خوشخبری دی اور صرف خوشخبری نہیں بلکہ اعلان کیا پہلے اسم اشارہ لائے۔ پھر ضمیر متصل اور اس کے بعد المفلحون کو معرفہ بنا کر لائے۔ اور بتا دیا کہ ان میں الخیرات اور فلاح کے علاوہ کسی اور چیز کا تصور بھی نہیں اور یہ اس میں منفرد ہیں۔

صحابہؓ کی آخرت میں کامیابی

(۹۴) اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں یہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ یہ عالمِ شہادت میں کامیابی کی بشارت کے بعد عالمِ غیب اور آخرت میں کامران ہونے کی شہادت ہے۔ اگر ذالک الفوز العظیم۔ کا اشارہ مجموعہ کی طرف ہے تو مطلب یہ ہے کہ دنیا و آخرت میں سرخروئی میں سب سے بڑی کامیابی ہے۔ یہودیوں کی طرح نہیں۔ کہ صرف دنیا میں سرخروئی کا نام کامیابی رکھ لیا اور عیسائیوں کی طرح نہیں کہ رہبانیت اختیار کر کے صرف آخرت میں سرخروئی کا نام کامیابی رکھ لیا بلکہ دونوں دنیا اور آخرت میں سرخروئی کا نام الفوز العظیم ہے۔ یہاں اگر الخیرات ان کا استقبال کریں گی تو آخرت میں جنات ان کا استقبال کریں گی۔ اس موجودہ زندگی میں بھی گو لذتیں ہیں۔ مسرتیں اور خیرات ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے یہاں کی ہر لذت عارضی اور مسرت آنی ہے۔ یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو۔ یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے ہیں روشنی کے ساتھ تاریکی۔ ہر وجود کے ساتھ فنا۔ ہر سیری کے بعد بھوک ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے غرض اس دنیا کی ہر چیز آنی جانی ہے اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں جہاں حیات ہے مگر موت نہیں۔ راحت ہے مگر تکلیف نہیں لذت ہے مگر الم نہیں مسرت ہے مگر غم نہیں جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں اور وہ شادمانی ہے جس کے بعد رنج و غم نہیں۔ یہ ہمیشگی کے باغات

وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی۔ جہاں کی لذت بے انتہا۔ جہاں کی زندگی غیر منقطع جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاودانی ہے۔ قرآن میں سولہ مقامات پر اس کی مختلف طریقوں سے تصریح کی گئی ہے۔ ایک جگہ ہے خالدین فیہا ابدًا وعد اللہ حقًا ومن اصدق من اللہ قیلا۔ اس تاکید پر تاکید اور پر زور اندازِ بیان پر غور کیجئے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ساتھ ہی ابدا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی بتایا۔ اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلودِ جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے۔

کتابت: محمد نواز عابد کیلانی حضرت کیلیانوالہ۔ ضلع گوجرانوالہ

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ
الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ
رَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٩٠﴾
لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ
لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ
مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩١﴾
وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ
مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ
حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿٩٢﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى
الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا
مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٣﴾

اور اے پیغمبرؐ عرب کے بادیہ نشینوں میں سے عذر پیش کرنیوالے تمہارے پاس آئے تاکہ اُنہیں بھی (جنگ میں نہ جانے کی) اجازت مِل جائے۔ اور جن لوگوں نے اللہ و رسولؐ سے جھوٹ بولا تھا وہ گھروں میں بیٹھے رہے ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ضرور دردناک سزا مِلے گی۔[٩٠] اُن ناتوانوں اور ایسے لوگوں پر جنہیں خرچ کے لیے کچھ میسّر نہیں ہے کوئی گناہ نہیں ہے جب اِن میں اللہ و رسولؐ

کی خیر خواہی ہو۔ نیکو کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ سبحانہ بخشنے والا مہربان ہے۔[96] اور ان لوگوں پر بھی کوئی الزام نہیں ہے جو آپؐ کے پاس آئیں کہ آپؐ ان کے لیے سواری کا انتظام کریں اور آپؐ ان سے کہہ دیں کہ تمہاری سواری کا میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے وہ آپ سے آنسوؤں سے ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ اس رنج میں کہ ان کے پاس خروج کے لیے کچھ نہیں ہے واپس جائیں۔[97]

معانی مفردات

الاعراب۔ گنوار، بدو راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد عرب ہے۔ اور اعراب دراصل اسی کی جمع ہے جو صحرا نشینوں کا علم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن صاحب قاموس نے تصریح کی ہے۔ کہ اعراب بادیہ نشین عربوں کو کہتے ہیں۔ اس کا واحد نہیں جمع اعاریب آتی ہے۔ علامہ شوکانی فتح القدیر میں رقم طراز ہیں کہ اعراب وہ ہیں جو صحراؤں میں سکونت گزیں ہوں۔ اس کے برخلاف لفظ عرب کے مفہوم میں وسعت ہے کیونکہ اس کا استعمال تمام انسانوں کے لیے عام ہے جو ریگستان عرب کے باشندے ہوں۔ خواہ وہ صحراؤں میں بستے ہوں یا آبادیوں میں رہتے ہوں۔ اہل لغت کا بیان یہی ہے۔ اسی لیے سیبویہ نے کہا ہے کہ اعراب صیغہ جمع تو ہے مگر لفظ عرب کی جمع نہیں ہے۔ علامہ نیشاپوری فرماتے ہیں کہ اہل لغت رجل عربی اس شخص کو کہتے ہیں جس کا عرب سے نسبی تعلق ہو جس طرح مجوس مجوسی کی یہود یہودی کی جمع آتی ہے اسی طرح عرب عربی کی جمع آتی ہے جب کسی اعرابی کو یا عربی کہا جاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے اور جب کسی عربی کو یا اعرابی کہا جاتا ہے تو وہ غصہ میں آجاتا ہے ایسا کیوں ہے اس لیے کہ عرب کے شہریوں کو عربی اور بادیہ نشینوں کو اعرابی کہتے ہیں [1]

حرج۔ تنگی۔ مضائقہ۔ گناہ۔ تنگ اصل میں تو حرج کے معنے کسی چیز کے مجتمع ہونے کی جگہ کے ہیں اور ایک جگہ جمع ہونے ... میں چونکہ تنگی ہوتی ہے اس لیے تنگی اور گناہ کو حرج کہا جاتا ہے۔

تفیض۔ وہ بہتی ہے وہ جاری ہوتی ہے ——— فیض باب ضرب سے اس کا استعمال جب آنسو اور پانی کے لیے ہوتا ہے تو جاری ہونے اور بہنے کے معنے آتے ہیں یہاں آنکھوں کے لیے اس کا استعمال ہوا ہے۔

---

[1] فتح القدیر

بادیہ نشین منافق

اب تک جن کا ذکر ہوا وہ سب کے سب یا تو کسی مادی منفعت کی خاطر اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے تھے یا اسلام اور مسلمانوں کی در پردہ بیخ کنی کرنے کے لیے مسلمانوں کے گروہ میں شامل تھے۔ لیکن ایک گروہ ایسے منافقوں کا بھی تھا جو اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور مسلمانوں کی روز افزوں طاقت و شوکت سے مرعوب ہو کر مجبوراً اپنے اسلام کا اظہار کرتا تھا یعنی جو چیز اندر سے اسلام کا اعلان کرا رہی ہے وہ کوئی یقین و اذعان کا جذبہ نہیں ہے بلکہ ان کی وہ بزدلی ہے جو انہیں دہشت زدہ کر کے مجبور کر رہی ہے کہ اپنے ایمان کا اور اسلامی ملت کی پیروی کا جھوٹا مظاہرہ کریں کیونکہ انہیں خوف ہے کہ اسلامی شوکت کا یہ امنڈتا ہوا سیل بے پناہ جو تمام منکرین اسلام کو بے دست و پا کر رہا ہے ایک روز انہیں بھی اپنی زد میں لے لے گا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب کبھی انہیں مسلمانوں کی طاقت بد گرفت سے نکلنے کی کوئی صورت نظر آتی فوراً وہ اسلامیت کا ماتشی جوا گردن سے اتار پھینکتے۔ جیسا کہ پڑھ آئے ہو۔

لو یجدون ملجأ او مغارات او مدخلا لولوا الیہ وھم یجمحون۔ اگر کوئی جائے پناہ پاجائیں یا غار یا گھس بیٹھنے کی کوئی جگہ تو سرکشانہ اس کی طرف دوڑیں۔

یہ اسلام جس کا یہ بد کیش منافق اظہار کیا کرتے تھے غرض اور مجبوری کا اسلام تھا۔ اعتراف حق اور شرح صدر کا اسلام ہرگز نہ تھا۔ قرآن نے اس کے بارے میں ایک جگہ زیادہ واضح لفظوں میں بتایا ہے۔

قالت الاعراب امنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔

بادیہ نشین کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اے پیغمبرؐ ان سے کہہ دو تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یہ کہو کہ ہم مسلمان ہوئے ایمان کا تو ابھی تمہارے دلوں میں گذر بھی نہیں ہوا۔

گویا ان کے ایمان کی بنا اور علت ان کی بزدلی تھی۔ دل تو صداقت قرآنی کے منکر تھے لیکن طاقت کے ڈر سے زبان اس کی صداقت کا بار بار اقرار کرتی رہتی تھی۔ چونکہ یہ لوگ محض اسلامی سطوت کے دباؤ سے مجبور ہو کر اپنے اوپر مسلمانی کا لبادہ ڈالے ہوئے تھے اس لیے اندر اندر یہ مسلمانوں کے سخت بدخواہ تھے۔ ان کی خوشحالی انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انہیں مسلسل غلبہ اور تمکن حاصل ہوتا دیکھ کر یہ کڑھتے تھے اور یہ رات دن اس تمنا میں رہتے کہ انقلاب کا کوئی جھونکا ان مسلمانوں کی جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دے تاکہ ہم ان کی قاہرانہ گرفت کے خطرات سے بے خوف ہو کر آزادی کا سانس لے سکیں۔ غزوہ تبوک میں بھی یہی تمنائیں ان کے دلوں میں موجزن تھیں۔

(۹۰) اور اے پیغمبر ان بادیہ نشینوں میں سے تمہارے پاس عذر پیش کرنے والے آئے تاکہ انہیں بھی (جنگ میں نہ جانے کی) اجازت مل جائے۔ اور جن لوگوں نے اللہ و رسول سے جھوٹ بولا تھا وہ گھروں میں بیٹھے رہے۔ ان ہی میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ضرور ان کو دردناک سزا ملے گی یعنی جس طرح مدینے کے رہنے والوں میں منافقین بھی ہیں اور مخلصین بھی۔ اسی طرح دیہاتی گنواروں میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے یہاں دو قسموں کا ذکر فرمایا۔ مخلص دیہاتیوں کا ذکر اس رکوع کے خاتمہ پر ومن الاعراب من یومن باللہ والیوم الاخر میں آئے گا۔ یہاں دیہاتیوں کی جن دو جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔ معذرون اور قاعدون۔ ان میں سے پہلی جماعت معذرون کے مصداق میں شارحین قرآن کا اختلاف ہے کہ آیا اس سے جھوٹے بہانے بنانے والے منافق مراد ہیں جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے یا سچے عذر کرنے والے مسلمان جو واقعی جہاد کی شرکت سے معذور تھے۔ اگر پہلی شق اختیار کی جائے تو آیت میں منافقین کی دو قسموں کا بیان ہوگا۔ معذرون تو وہ ہوئے جو باوجود نفاق کے محض ظاہرداری نباہنے کے لیے جھوٹے حیلے بنا کر حضورؐ سے اجازت طلب کرتے تھے اور قاعدون سے وہ منافق مراد ہوں گے جنھوں نے اول دعویٰ ایمان میں جھوٹ بولا پھر ظاہرداری کی بھی پروا نہیں کی۔ جہاد کا نام سن کر گھروں میں بیٹھے رہے۔ بالکل بے باک اور بے حیا ہو کر عذر کرنے بھی نہیں آئے اس صورت میں سیصیب الذین کفروا منھم۔ دونوں جماعتوں کو۔ . . . شامل ہوگا اور معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ دونوں جماعتوں میں سے اپنے کفر پر اخیر تک جمے رہیں گے ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ جن کو توبہ کی توفیق ہو جائے گی۔ وہ اس وعید میں داخل نہیں ہیں۔ اور اگر معذورون سے مراد مومنین صادقین ہوں جو واقعی معذور تھے تو قاعدون سے مراد منافقین ہوں گے۔ اور سیصیب الذین کی وعید صرف ان کے ہی حق میں ہوگی۔ پہلی جماعت کا ذکر گویا قبول عذر کے طور پر ہوگا[۱]

جیسا کہ تمہید میں بتایا جا چکا ہے کہ اب یہاں منافقین کے ایک اور گروہ کا چہرہ پیش ہو رہا ہے اور وہ بادیہ نشینوں کی جماعت ہے اور بتایا ہے کہ ان میں بھی منافقین ہیں۔ بادیہ نشینوں کا بڑا حصہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا اور شہر میں نہ رہنے کی وجہ سے ابھی اسلامی زندگی کی تربیت نہیں ملی تھی غزوہ تبوک کے لیے نفیر کا اعلان ہوا تو کچھ لوگ آئے اور عذر پیش کیے۔ کچھ ایسے تھے جو چپکے بیٹھے رہے معذرت کے لیے بھی نہیں آئے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عذر پیش کرنے والے عامر بن الطفیل کے قبیلے کے لوگ تھے انھوں نے کہا تھا اگر ہم آپ کے ہمراہ گئے تو قبیلہ طے کے بدو ہمارے مویشی اور اولاد پر آ پڑیں گے (ابن جریر) چنانچہ ان کے لیے وعید آئی ——— حافظ ابن جریر نے آیت کا یہ مطلب بتایا ہے۔

[۱] افادات شیخ الاسلام

حضور اقدس ﷺ سے اجازت لینے کی خاطر دیہاتی معذرتیں لے کر حاضر ہوئے اور کچھ گھروں میں بیٹھے رہے۔ جنھوں نے اللہ و رسول ؐ سے جھوٹ بولا اور غلط اعذار پیش کیے ان میں سے جنھوں نے اللہ و رسول کا کفر کیا ان کو دردناک سزا ملے گی۔

اور حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ نے اس آیت میں پہلے عذر والوں کا ذکر کیا ہے یہ لوگ جہاد میں نہ جانے کے لیے معذرتیں لے کر حضور اقدس ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ مدینے کے ارد گرد کے بادیہ نشین تھے۔ اس کے بعد بتایا کہ کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو گھروں میں بیٹھے رہے اور شریک جہاد نہیں ہوئے اور ان کو معذرت پیش کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔

ان دونوں مفسرین کا رجحان اس آیت کی تشریح میں وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے افادات میں اختیار کیا ہے لیکن آیت میں اس مطلب کی بنیاد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت پر ہے کہ آیت میں لفظ معذرون بتشدید الذال نہیں بلکہ تخفیف ہے یعنی باب تفعیل سے تعذیر نہیں بلکہ باب افعال سے اعذار ہے اور یہ اعذار سے اسم فاعل کی جمع ہے۔

اعذار و تعذیر میں فرق

اعذار اگر واقعی اور حقیقی عذر ہونے کو کہتے ہیں تو تعذیر کے معنے بہانہ سازی اور عذر تراشی کے آتے ہیں۔ ازہری لغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ معذرین وہ لوگ ہیں جو عذر شرعی رکھتے ہوں اور عذر پیش کریں۔ علامہ مرتضی زبیدی شارح قاموس لکھتے ہیں ھم الذین لا عذر لھم لکن یتکلفون عذراً۔ جن کا عذر کوئی نہ ہو اور بتکلف عذر بنادیں۔ اور امام رازی فرماتے ہیں معذر وہ ہے جو بلا عذر کے بہانے بنائے۔ معتذر اور معذر میں بھی یہی فرق ہے کہ معتذر کا عذر ممکن ہے صحیح ہو۔ لیکن معذر کا عذر ہمیشہ غلط اور بناوٹی ہوتا ہے۔ عبداللہ بن عباس ؓ نے اس آیت میں معذرین کی جگہ معذرون پڑھا ہے اور اس کے معنے واقعی عذر رکھنے والوں کے بتائے اس بنیاد پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ حضور اقدس ؐ کے پاس واقعی معذور مسلمان بادیہ نشین آئے۔ لیکن اس مطلب کی صورت میں وعید سیصیب الذین کفروا کا تعلق اس طبقہ سے بالکل نہ رہے گا اس لیے محققین کے نزدیک معذرون تعذیر میں سے ہے۔ در آیت میں بتایا گیا ہے کہ غزوہ میں پیچھے رہنے والے بادیہ نشین دو قسم کے تھے۔

ایک وہ جنھوں نے بارگاہ نبوت میں جھوٹے بہانے بنا کر رخصت مانگی اور نہیں گئے۔

دوسرے وہ جو اس قدر بے باک تھے کہ ظاہرداری بھی نہ برتی اور جھوٹا عذر بھی کرنے نہیں آئے۔ الجصاص نے یہی مطلب بتایا ہے فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ نے غزوہ تبوک میں نہ جانے پر رخصت کی درخواست پیش کرنے والوں کی بلا عذر اس آیت میں مذمت کی ہے اور معذورین اہلِ ایمان کا حال لیس علی الضعفاء اگلی آیت میں بتایا ہے

عبداللہ بن عباس کی وہ روایت جس میں المعذرون بالتشدید کی جگہ معذرون آیا ہے اس بارے میں نحاس لکھتے ہیں کہ اس روایت کا مدار کلبی پر ہے کلبی کا پورا نام ابوالنضر محمد بن السائب بن بشیر بن عمرو بن عبدالحارث بن عبدالعزیٰ کلبی ہے ۱۴۶ھ ان کی وفات کا سال ہے۔ یہ قبیلہ بنو کلب سے تعلق کی وجہ سے کلبی کہلاتے ہیں۔ کیونکہ کوفہ کے باشندے تھے۔ تاریخ وانساب اور تفسیر میں مشہور ہیں۔ علماء ان کے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار ہونے پر متفق ہیں۔

ان پر سب سے زیادہ سنگین اعتراض جھوٹی روایتیں بیان کرنے کا ہے۔ سلیمان کہتے ہیں کہ کوفہ میں دو کذاب تھے۔ ان میں سے ایک کلبی ہیں۔ تفسیر میں ان کی بیشتر روایات حضرت عبداللہ بن عباس کی بروایت ابوصالح مروی ہیں۔ اور جناب کلبی کا بیان ہے کہ ان کے استاد تفسیر ابوصالح نے قسم کھا کر بتایا کہ میں نے کلبی کو کوئی بات تفسیر کے متعلق نہیں سنائی۔ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ کلبی نے خود ایک بار اعتراف کیا کہ میں نے ابوصالح سے ابن عباس کی جو روایتیں بیان کی ہیں وہ جھوٹ ہیں تم ان کو روایت نہ کرو۔

ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ انتہائی غالی قسم کے شیعہ تھے۔ حضرت ابوخیر کہتے ہیں کہ میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آئے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام سے اٹھ کر چلے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں بیٹھے تھے تو جبریل علیہ السلام نے وہ وحی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر نازل کر دی۔ ابوخیر کا یہ قول مشہور محدث یزید بن زریع کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے کلبی سے یہ بات تو نہیں سنی لیکن یہ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ سینہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہا تھا کہ میں سبائی ہوں۔ میں سبائی ہوں۔ حافظ ابن حبان کہتے ہیں۔ کلبی سبائی تھا۔ اور ان لوگوں میں سے جو کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات نہیں ہوئی۔ دوبارہ واپس آئیں گے۔ حافظ ذہبی اس کا طویل تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ لا یحل ذکرہ فی الکتب فکیف الاحتجاج۔ کتابوں میں اس کا ذکر بھی نہ ہونا چاہیے چہ جائے کہ اس کو استدلال کی شخصیت بنایا جائے۔

بہرحال اس روایت کے سہارے معذرون بالتشدید کو معذرون باب افعال سے پڑھا گیا ہے۔ اگر باب تفعیل سے

ہو تو مطلب یہ ہے کہ بہانے بنا کر آتے تھے اور واقع میں وہ معذور نہ تھے۔ یہی قرینِ قیاس ہے اور یہی قراءت متواترہ ہے ابنِ کثیر نے اسی کو اظہر قرار دیا ہے۔ علامہ نسفی نے اسی کو اپنایا ہے۔ مشہور مفسر ضحاک نے اس کا جو پس منظر بیان کیا ہے کہ:

> عامر بن الطفیل کے قبیلے کے لوگ خدمتِ گرامی میں حاضر ہوئے اور تبوک میں نہ جانے کے لیے یہ عذر بار دپیش کیا کہ ہم اگر آپ کے ساتھ جائیں گے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ طے کے بادیہ نشین ہماری بیویوں، بچوں اور مویشیوں پر آپڑیں گے۔ حضور اقدس نے فرمایا تمہارے حالات کی اللہ نے مجھے خبر دے دی ہے۔ اللہ سبحانہ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ بھی اسی مطلب کی تائید کرتا ہے۔ امام رازی نے ابو عمرو بن العلاء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ دونوں جماعتیں غلط کار ہیں جنھوں نے بناوٹی عذر پیش کیے اور جو گھر ہی بیٹھے رہے اور معذرت بھی نہیں کی۔ دونوں کورے منافق ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ منافقانہ اظہارِ ایمان جس کی تہ میں فی الواقع تصدیق، تسلیم، اخلاص اور اطاعت نہ ہو اور جس کے ظاہری اقرار کے باوجود انسان خدا اور اس کے دین کی بہ نسبت اپنے مفاد اور اپنی دنیوی دلچسپیوں کو عزیز رکھتا ہو اصل حقیقت کے اعتبار سے کفر و انکار ہی ہے۔ اللہ سبحانہ ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ فرمائیں گے جو منکروں اور باغیوں کے ساتھ ہوگا۔ چاہے دنیا میں اس قسم کے لوگ کافر نہ ہوں اور ان کے ساتھ مسلمانوں کا معاملہ ہوتا رہے اس دنیوی زندگی میں جس قانون پر مسلم سوسائٹی کا نظام قائم کیا گیا ہے اور جس ضابطہ کی بنا پر اسلامی حکومت اور اس کے قاضی احکام کی تنفیذ کرتے ہیں۔ اس کے لحاظ سے تو منافقت پر کفر کا اشتباہ کفر کا حکم صرف انہی صورتوں پر لگایا جا سکتا ہے جب کہ انکار و بغاوت یا غداری و بیوفائی کا اظہار صریح طور پر ہو جائے اس لیے منافقت کی بہت سی صورتیں اور حالتیں ایسی رہ جاتی ہیں جو قضائے شرعی میں کفر کے حکم سے بچ جاتی ہیں لیکن قضائے شرعی میں کسی منافق کا حکم کفر سے بچنا ہرگز یہ معنے نہیں رکھتا ہے کہ قضائے خداوندی میں بھی آخرت میں وہ اس حکم اور اس کی سزا سے بچ جائے گا۔

پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن بادیہ نشینوں کی اکثریت نے اگرچہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کی سیادت تسلیم کر لی تھی لیکن اسلام ان کے اندر رچا بسا نہیں تھا۔ اول تو یہ لوگ اسلام کی طرف اس کی روحانیت کی جاذبیت سے زیادہ اس کی ابھرتی ہوئی طاقت سے زیادہ متاثر ہو کر آئے تھے۔ ثانیاً مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم و تربیت کا کما حقہ انتظام نہ تو ممکن تھا اور نہ یہ اپنی معاشی مصروفیتوں سے کچھ وقت اس کی

خاطر نکالنے پر آمادہ تھے کہ مرکز میں آکر حضور اقدس ﷺ کی بابرکت صحبت سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو اسلام کا تو نام لیتے تھے لیکن اسلامی زندگی کے خطوط سے بالکل بے پرواہ تھے۔ ابن الوقتی اور مفاد پرستی ان کو اسلام کے مقابلہ میں زیادہ محبوب تھی۔ ان کے اندر کے کچھ بہانہ ساز آئے اور عذر پیش کرنے لگے اور رخصت مانگنے کے لیے آتے اور کچھ جو اللہ و رسول سے سمع و طاعت کا عہد کرنے میں بالکل ہی جھوٹے تھے انھوں نے کوئی جھوٹا سچا عذر پیش کرنے کی بھی زحمت نہیں اٹھائی بلکہ دعوتِ جہاد کی پرواکیے بغیر یوں ہی گھروں میں بیٹھے رہے۔ سیصیب الذین کفروا منھم عذاب الیم۔ چونکہ ان بادیہ نشینوں میں سچے مخلصین بھی تھے اس وجہ سے فرمایا کہ ان بادیہ نشینوں میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے یعنی اظہارِ اسلام کے باوجود اس کے واجبات و فرائض میں سے جھوٹے بہانے بنا کر یا ان کو دیدہ دلیری سے نظر انداز کرکے گھروں میں بیٹھے رہے ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ صرف اس سے وہ لوگ مستثنیٰ رہیں گے جو اللہ و رسول سے کیے ہوئے عہد پر قائم ہیں یا وہ واقعی معذور رہیں۔

(۹۱) ان ناتوانوں اور ایسے لوگوں پر جنھیں خرچ کے لیے کچھ میسر نہیں ہے کوئی گناہ نہیں ہے جب کہ ان میں اللہ و رسول کی خیر خواہی ہو۔ نیکوکاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ سبحانہ بخشنے والا مہربان ہے۔

جھوٹے عذر کرنے والوں کے بعد سچے معذورین کا بیان فرماتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ عذر کبھی تو شخصی طور پر لازم ذات ہوتا ہے مثلاً بڑھاپے کی کمزوری جو عادتاً کسی طرح آدمی سے جدا نہیں ہو سکتی۔ کبھی عارضی ہوتا ہے پھر عارضی یا بدنی ہوتا ہے جیسے بیماری وغیرہ یا مالی جیسے افلاس و نقدان اسباب سفر۔ چونکہ غزوۂ تبوک میں مجاہدین کو بہت دور دراز مسافت کرکے پہنچنا تھا اس لیے سواری نہ ہونے کا عذر بھی معتبر و مقبول سمجھا گیا جیسے آگے آتا ہے آخر میں فرمایا واللہ غفور رحیم یعنی جو لوگ واقعی معذور ہیں۔ اگر ان کے دل صاف ہوں اور خدا اور رسول کے ساتھ ٹھیک معاملہ رکھیں مثلاً خود نہ جا سکتے ہوں تو جانے والوں کی ہمتیں پست نہ کریں بلکہ اپنے مقدور کے موافق نیکی کرنے اور اخلاص کا ثبوت دینے کے لیے مستعد رہیں ان پر جہاد کی عدم شرکت سے کچھ الزام نہیں ہے۔ ایسے مخلصین سے اگر بمقتضائے بشریت کوئی کوتاہی ہو تو حق تعالیٰ کی بخشش و مہربانی سے توقع ہے کہ وہ درگذر فرمائے گا۔[1]

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگر دفاع کے لیے نفیر عام ہو تو کن کن لوگوں کو معذور تصور کیا جا سکتا ہے فرمایا ناتوان آدمی یعنی جو لوگ جسمانی طور پر مجبور ہوں مثلاً بہت بوڑھے اندھے اپاہج دوسرے بیمار تیسرے ایسے لوگ جو سفر کی لازمی ضروریات کے انتظام کی قدرت نہ رکھتے ہوں۔ ان تینوں میں قید لگا دی۔ اذا نصحوا للہ ورسولہ

[1] افادات شیخ الاسلام

جب کہ اللہ ورسول سے مخلصانہ وفاداری رکھتے ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ بظاہر معذور ہوں ان کے لیے بھی مجرد ضعف و بیماری یا محض ناداری کافی وجہ معافی نہیں ہے بلکہ ان کی یہ مجبوریاں صرف اس صورت میں ان کے لیے معافی کا سبب ہو سکتی ہیں جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے سچے وفادار ہوں۔ ورنہ اگر وفاداری موجود نہ ہو تو کوئی شخص صرف اس لیے معاف نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ادائے فرض کے موقعہ پر بیمار و نادار تھا۔ اللہ سبحانہ صرف ظاہر کو نہیں دیکھتا ہے۔ کہ ایسے سب لوگ جو بیماری طبی سارٹیفکیٹ پیش کر دیں وہ معذور قرار دیئے جائیں وہ تو ان میں سے ایک ایک شخص کے دل کا جائزہ لے گا اس کے پورے مخفی اور ظاہر برتاؤ کو دیکھے گا اور یہ جانچے گا کہ اس کی معذوری ایک وفادار بندے کی معذوری ہے یا ایک غدار اور باغی کی معذوری ہے۔ ایک شخص ہے کہ جب اس نے فرض کی پکار سنی تو دل میں خوش ہوا کہ بڑے اچھے موقع پر بیمار ہو گیا ورنہ یہ بلا ٹالے نہ ٹلتی۔ اور خواہ مخواہ مصیبت بھگتنی پڑتی دوسرے شخص نے بھی پکار سنی تو تلملا اٹھا کہ ہائے موقع پر اس کم بخت بیماری نے آ پکڑا ہے جو وقت میدان میں نکل کر خدمت انجام دینے کا تھا۔ وہ کس بری طرح یہاں بستر پر ضائع ہو رہا ہے۔ ایک نے اپنے لیے خدمت سے بچنے کا بہانہ پایا ہی تھا مگر اس کے ساتھ اس نے دوسروں کو بھی اس سے روکنے کی کوشش کی۔ دوسرا اگرچہ خود بستر علالت پر تھا مگر وہ برابر اپنے عزیزوں، دوستوں اور بھائیوں کو جہاد کا جوش دلاتا اور اپنے تیمار داروں سے بھی کہتا رہا کہ میرا اللہ مالک ہے۔ میری خاطر تم اس قیمتی وقت کو ضائع نہ کرو جسے دینِ حق کی خدمت میں صرف ہونا چاہیے۔ یہ دو قسم کے معذور اللہ سبحانہ کی نظر میں کسی طرح یکساں نہیں ہو سکتے۔ خدا کے یہاں معافی اگر ہے تو صرف اس کے لیے جو اذا نصحوا للہ ورسولہ۔ کے پیمانہ پر پورا اتر رہا ہے اور جو اس پیمانہ پر پورا نہیں اترتا وہ معذور ہونے کے باوجود غداری اور بے وفائی کا مجرم ہے۔

نصیحت و خیر خواہی کیا ہے؟

احادیث میں خیر خواہی اور وفاداری کو دین کا خلاصہ بتایا ہے۔ صحیح مسلم میں تیم داری کے حوالہ سے جناب رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔

تین بار فرمایا کہ نصیحت خیر خواہی وفاداری دین ہے صحابہ کہتے ہیں ہم نے دریافت کیا کہ کس سے وفاداری؟ فرمایا اللہ سبحانہ سے اللہ کے رسول سے۔ اللہ کی کتاب سے مسلمانوں کے سربراہوں سے اور مسلمان عوام سے۔

قرآن کی آیت میں بھی اسی خیر خواہی وفاداری کے جذبے کو اعذار کے قبول ہونے کی بنیادی ضروری اور اہم شرط قرار دیا ہے۔

لغت میں نصحت العسل اس وقت بولا جاتا ہے۔ جب شہد کو موم سے صاف کر لیا جائے۔ امام رازی فرماتے ہیں نصح کے معنی کسی چیز کا کھوٹ نکال دینے کے ہیں یہ معنے نصحت العسل سے لیے گئے۔ محکم میں ہے۔ کہ نصح کھوٹ کی ضد ہے۔ ابن طریف لکھتا ہے کہ نصح قلب الانسان۔ اس وقت بولتے ہیں جب دل میں کوئی کھوٹ باقی نہ رہے۔

اللہ کے لیے نصیحت کے معنے یہ ہیں کہ بندہ اپنے اور خدا کے درمیان کوئی کھوٹ کا معاملہ نہ رکھے۔ سب سے بڑا کھوٹ یہ ہے کہ پرستش یا بندگی میں کسی کو اس کا شریک ٹھہرائے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ ان اللہ لا یغفر ان یشرك بہ کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہو اور جدی راہ چلے یہ آیت قرآنی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا۔ تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے پس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے۔ اگرچہ پوجنے میں شرک کرتے ہوں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ منافقین پرستش میں اللہ سے تعلقات رکھتے تھے لیکن فوجداری اور دیوانی معاملات مالیاتی مسائل میں اللہ سے قانونی تعلقات نہ رکھتے تھے فرمایا سارے معاملات کے لیے قانون اسلام کا ہے۔ اسلام کے سوا ہر قانون شرک ہے یہی بندگی میں شرک ہے اور سورۃ انعام میں زیر آیت وان اطعتموھم انکم لمشرکون پر تشریحی نوٹ میں شاہ صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ:

شرک فقط یہی نہیں ہے کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجئے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔

علماء نے لکھا ہے کہ نصیحت للہ کا حاصل اپنے ہی نفس کی نصیحت اور اپنی خیر خواہی ہے کتاب اللہ سے نصیحت و خیر خواہی یہ ہے کہ پورے عزم و ہمت کے ساتھ اس کے اوامر و نواہی کے سامنے اعتراف و طاعت کا سر خم کر دیا جائے پورے آداب کے ساتھ اس کی تلاوت کی جائے بدل و جان اس کے معانی کی تصدیق کی جائے اس کے علوم کی نشر و اشاعت کی جائے۔ اس کی پیروی کی تمام عالم کو دعوت دی جائے۔

اللہ کے رسول کے ساتھ نصیحت و خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی رسالت کی تصدیق کی جائے۔ جو دین وہ لے کر آیا ہے اس کو پورے طور پر مانا جائے۔ نبی کی مکمل اطاعت کی جائے۔ نبی کی اطاعت شرط ایمان ہے دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ بھی کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چوں نہ کرے خواہ اس کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

ائمہ مسلمین کی نصیحت و خیر خواہی یہ ہے کہ ہر حق معاملے میں ان کی اعانت کی جائے۔ ان کے ساتھ جہاد میں شرکت کی جائے۔ ان کے پیچھے نمازیں ادا کی جائیں جو صدقات بیت المال کا حق ہیں وہ سرکاری خزانہ میں داخل کیے جائیں۔ ان کی بغاوت نہ کرے۔ اور ان سے غداری نہ کرے۔

عام مسلمانوں سے خیر خواہی اور نصیحت یہ ہے کہ ان کو ایذا نہ دی جائے۔ ان کے عیوب کی پردہ پوشی کی جائے اور خیر خواہی کا ان کو اپنے برابر سمجھا جائے۔

حافظ ابن رجب فرماتے ہیں کہ حدیث بالا میں نصیحت و خیر خواہی کو دین فرمایا گیا ہے اور حدیث جبریل میں ایمان، اسلام اور اعمال کے مجموعہ کو دین کہا ہے دونوں کو ملا کر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایمان اسلام اور احسان سب نصیحت ہی کے اجزاء ہیں۔

محمد بن مروزی نے اس آیت گرامی سے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ نصح للہ کی دو قسمیں ہیں ایک فرض دوسرے نفل۔ فرض یہ ہے کہ اس کی حرام کردہ چیزوں سے پرہیز کیا جائے اور اس کے احکام کی بجا آوری میں دل سے سعی کی جائے۔ اگر کسی عذر کی وجہ سے ادا نہ کر سکے۔ تو اس کا عزم رکھے کہ جب کبھی موقعہ ملے گا۔ اس کی تلافی کرے گا۔

قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں اللہ سبحانہ اور اس کے رسول کی وفاداری ہو وہ جہاد میں شریک نہ ہو کر بھی محسنین کی فہرست سے خارج نہیں ہوتے۔ اور یہ بھی بتا رہی ہے کہ عذر کی بنا پر اعمال جوارح اور فریضہ جہاد جیسا اہم فرض بھی ساقط ہو سکتا ہے مگر نصح للہ کا مطالبہ کسی وقت بھی ساقط نہیں ہوتا۔ ایک معذور شخص ہے نماز جیسے اہم فرض کی ادائیگی مؤخر ہو سکتی ہے مگر وفاداری اور قلبی ندامت آیندہ ادائیگی کا عزم اس کے ذمہ سے ساقط نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا نصح للہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی رضا کو پیش نہاد بنائے نصیحت نافلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے اوپر اتنی غالب کرے کہ جب کسی معاملہ میں اپنے نفس اور شریعت کا مقابلہ ہو جائے تو شریعت ہی کو ترجیح دے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی تمام مرضیات کو اللہ سبحانہ کی رضا پر قربان کر دے[1]

آیئے اس موضوع پر چند ارشادات نبوت اور سن لیجئے۔

طبرانی محدث نے بحوالہ حذیفہ ابن الیمان یہ ارشاد نبوت نقل کیا ہے۔

جو شخص مسلمانوں کے معاملات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اس کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں اور جس شخص نے صبح سے شام تک یا شام سے صبح تک اللہ سبحانہ اس کے رسول اس کی کتاب اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی سے غفلت اختیار کی اس کا بھی مسلمانوں سے کوئی رشتہ نہیں۔ (طبرانی)

[1] ۵۵ امہ الادہ الحکم

ایک اور ارشاد ہے۔

ابوامامہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ آپ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے کہ وہ سب سے زیادہ پیارا طریقہ جو میرا بندہ میری فرمانبرداری کے لیے اختیار کرتا ہے میری خیر خواہی ہے۔ (مسند احمد)

ایک اور ارشاد ہے۔

جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے منیٰ کی مسجد خیف میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تین باتیں ایسی ہیں جن پر مسلمان کا دل کبھی کھوٹا نہیں ہوتا ہے ایک یہ کہ عمل میں اللہ کے لیے اخلاص دوسرے یہ کہ وقت کے مسلمان حکمرانوں کی خیر خواہی اور تیسرے یہ کہ مسلمان جماعت سے وابستگی۔ (دار قطنی۔ مسند احمد)

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے ایک اور ارشاد ہے کہ:

اللہ سبحانہٗ تمہارے لیے تین کاموں کو پسند کرتا ہے۔ پہلا کام یہ ہے کہ تم اس کی عبادت کرو کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو۔ دوسرا یہ کہ متحد ہو کر سب اللہ کی رسی کو تھام لو اور اس سے علیحدہ نہ ہو۔ تیسرا یہ کہ اللہ نے جس کو حاکم بنا دیا ہے اس کی خیر خواہی کرتے رہو۔

صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے ہے۔

میں نے حضور اقدس ﷺ سے نماز قائم کرنے زکوٰۃ ادا کرنے اور ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی پر بیعت کی تھی۔

نفاق کے مقابلے میں ایمان کا مرقع

(۹۲) اور ان لوگوں پر بھی کوئی الزام نہیں ہے جو آپ کے پاس آئے کہ آپ ان کے لیے سواری کا انتظام کریں۔ اور آپ نے ان سے کہا کہ تمہارے لیے سواری کا میرے پاس کوئی انتظام نہیں ہے وہ آپ کے آنسوؤں سے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس رنج میں کہ ان کے پاس خرچ کے لیے کچھ نہیں ہے۔ واپس گئے۔ سبحان اللہ حضور اقدس ﷺ کی صحبت نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے دلوں میں عشق الٰہی کا وہ نشہ پیدا کر دیا تھا جس کی مثال کسی قوم و ملت کی تاریخ میں موجود نہیں۔ مستطیع اور مقدور والے صحابہ کو دیکھو تو جان و مال سب کچھ خدا کے راستہ میں لگانے کو تیار ہیں اور سخت سے سخت قربانی کے وقت بڑے ولولہ اور اشتیاق سے آگے بڑھتے ہیں۔ جن کو مقدور نہیں وہ اس غم میں

رو رو کر جان کھوئے لیتے ہیں کہ ہم میں اتنی استطاعت کیوں نہ ہوئی کہ اس محبوب حقیقی کی راہ میں قربان ہونے کے لیے اپنے کو پیش کر سکتے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ آپؐ نے مجاہدین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم مدینہ میں ایسی قوم کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہر قدم پر تمہارے اجر میں شریک ہیں۔ تم جو قدم خدا کے راستہ میں اٹھاتے ہو یا کوئی جنگل قطع کرتے ہو یا کسی پگڈنڈی پر چلتے ہو وہ قوم برابر ہر موقع پر تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں واقعی مجبوریوں نے تمہارے ہمراہ چلنے سے روکا۔ حسن بصری کے مرسل میں ہے کہ یہ مضمون بیان فرما کر آپؐ نے یہ آیت تلاوت کی [1]

کوئی بات دنیا میں اس سے زیادہ عجیب نہیں ہو سکتی کہ وحشی اور بہائم صفت انسان اچانک محبت، اخلاص وایثار اور خود فروشی کے فرشتے بن جائیں لیکن قرآن حکیم نے ایسا ہی انقلاب بپا کیا۔ اوپر گذر چکا ہے کہ غزوۂ تبوک بڑے ہی ناموافق حالات میں پیش آیا تھا۔ حتیٰ کہ لوگوں کی افسردگی پر اللہ کا عتاب آیا۔ لیکن اس پر بھی لوگوں کا کیا حال تھا۔ یہ تھا کہ شدت درد وغم سے بے اختیار ہو کر رونے لگتے تھے۔ کس بات پر؟ اس پر کہ عیش و راحت میں ان کو حصہ نہیں ملا —— نہیں بلکہ اس پر کہ راہ حق کی مصیبتوں اور قربانیوں میں شریک ہونے سے رہ گئے۔

اس عہد میں نہ تو سرکاری فوج وجود میں آئی۔ نہ رضاکاروں کی کوئی الگ قسم تھی۔ نہ سپاہیوں کے مصارف کے لیے حکومت کا کوئی خزانہ تھا۔ سبھی رضاکار تھے اور سب کے لیے ضروری تھا کہ اپنا خرچ خود ہی اٹھائیں بلکہ بن پڑے تو دوسروں کے لیے بھی خرچ کریں۔ پس فرمایا کہ جو لوگ مقدور نہیں رکھتے کوئی وجہ نہیں کہ ان پر الزام آئے۔ خصوصاً وہ لوگ جن کے ایمان واخلاص کا حال یہ ہے کہ جب ان کے لیے سواری کا انتظام نہ ہو سکا اور تیرے ادب واحترام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی کہ زیادہ اصرار کریں تو خاموش اٹھ کر لوٹ گئے لیکن آنکھیں جو درد دل کی غماز ہیں خاموش نہ رہ سکیں حسرت وغم کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

زچشم آستیں بردار وماشکم راتماشا کن

یہ قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔ پہلے بے مقدوروں کا ذکر کیا۔ پھر خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا اور ان کی محبت ایمانی کی تصویر کھینچ دی۔ تاکہ نفاق کے مقابلے میں ایمان کا بھی ایک مرقع سامنے آجائے یعنی یا تو وہ جن کو قدرت رکھنے پر بھی حیلے بہانے نکالتے ہیں۔ یا یہ ہیں کہ مقدرت نہ رکھنے پر بھی دل کی لگن چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپک رہی ہے —— غزوۂ تبوک میں سواریوں کی بڑی قلت تھی۔ اٹھارہ آدمیوں کے حصہ میں ایک اونٹ آیا تھا۔

احادیث سے معلوم ہوتا تھا کہ صحابہ کی ایک جماعت نے جو زاد راہ کی قدرت نہیں رکھتی تھی حضور اقدس

[1] افادات شیخ الاسلام

ﷺ سے عرض کیا ہمارے لیے سواری کا بندوبست کر دیجئے آپ نے فرمایا کہاں سے کروں۔ کوئی سامان نہیں ہے۔ اس پر وہ روتے ہوئے چلے گئے اور ان کے درد و غم کا یہ حال تھا کہ البکائین کے نام سے مشہور ہوئے تھے یعنی بہت رونے والے (ابن جریر)

سبحان اللہ ان چند آنسوؤں کی قدر و قیمت جو ایمان کی تپش سے بہے تھے۔ کہ ہمیشہ کے لیے ان کا ذکر کتاب اللہ نے محفوظ کر دیا۔ آج بھی تیرہ صدیاں گذرنے پر ممکن نہیں کہ ایک مومن یہ آیت پڑھے اور ان آنسوؤں کی یاد میں خود اس کی آنکھیں بھی اشکبار نہ ہوں[1]

گویا اس آیت نے اہل ایمان کے لیے جو پیمانہ مہیا کر دیا کہ ایسے لوگ جو خدمت دین کے لیے اپنے ایمان کے تقاضے کے تحت بے تاب ہوتے ہیں اور اگر کسی حقیقی مجبوری کے سبب سے یا ذرائع نہ پانے کی وجہ سے عملاً خدمت نہ کر سکیں تو ان کے دل کو اتنا ہی صدمہ ہو جتنا کسی دنیا پرست کو روزگار چھوٹ جانے یا کسی بڑے نفع کے موقع سے محروم رہ جانے کا ہوا کرتا ہے۔ ان کا شمار خدا کے یہاں خدمت انجام دینے والوں ہی میں ہوگا اگرچہ انھوں نے عملاً کوئی خدمت انجام نہ دی ہو اس لیے وہ چاہے ہاتھ پاؤں سے کام نہ کر سکے ہوں لیکن دل میں ایمانی جذبات کی وجہ سے وہ برسر خدمت ہی رہے ہیں۔ یہی بات ہے جو غزوہ تبوک میں واپسی پر حضور اقدس ﷺ نے اثنائے سفر میں اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمائی تھی۔ ان بالمدینۃ اقواما ما سرتم سیرا ولا قطعتم وادیا الا کانوا معکم۔ مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے کوئی وادی طے نہیں کی اور کوئی کوچ نہیں کیا جس میں وہ تمہارے ساتھ نہ رہے ہوں۔ صحابہ نے تعجب سے کہا کیا مدینہ میں بھی رہتے ہوئے۔ فرمایا ہاں مدینہ میں رہتے ہوئے کیونکہ مجبوری نے ان کو روک لیا تھا۔ ورنہ وہ خود رکنے والے نہ تھے۔

جن رونے والوں کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور جن کو تاریخ میں البکائین کہا گیا ہے۔ ان کے نام حافظ ابن حزم نے لکھے ہیں۔ سالم بن عمر، علیہ ابن زید، ابولیلی عبدالرحمن بن کعب، عمرو بن الحمام، عبداللہ بن المغفل، ہرمی بن عبداللہ، عرباض بن ساریہ الفزاری

بعض نے عبداللہ بن مغفل کی جگہ عبداللہ بن عمرو المزنی کا ذکر کیا ہے[1]۔

کاغذ کے نو سو چوبیس ۹۲۴ صفحات سیاہ ہو چکے ہیں۔ سیاق و سباق کی رعایت سے پارہ دہم کی آخری آیت کی تشریح بالارادہ گیارہویں جلد کے لیے چھوڑ دی ہے۔ الحمد للہ آج مورخہ ۱۰ ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۹۸۵ء بروز دوشنبہ بوقت ۶ بج کر ۳۵ منٹ پر بعد نماز مغرب پارہ دہم کے تشریحی مطالب پورے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو میرے لیے ذخیرۂ آخرت اور میری نجات کا ذریعہ بنائے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ اجمعین

[1] ترجمان القرآن

[1] جوامع السیرۃ